بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر مظہری جلد ہشتم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ۔ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد ہشتم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
	مولانا محمد انور مگھالوی
	فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۂ سبا

اٰیاتھا ۵۴ | سُوْرَۃُ سَبَاٍ مَکِّیَّۃٌ ۳۴ | رکوعاتھا ۶

سورۂ سبا مکی ہے، اس میں چون آیات اور چھ رکوع ہیں

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید العالمین و خاتم النبیین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَۃِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ①

''سب تعریفیں اللہ کے لئے جو مالک ہے ہر اس چیز کا جو آسمانوں میں ہے اور ہر اس چیز کا جو زمین میں ہے ۱؎ اور اسی کے لئے ساری تعریفیں ہیں آخرت میں ۲؎ اور وہی بڑا (دانا) ہر بات سے باخبر ہے ۳؎ ''

۱؎ یعنی سب حمد وستائش اس ذات اقدس کے لئے ہے جو ملکیت اور تخلیق کے اعتبار سے ہر چیز کا خالق بھی ہے اور مالک بھی ہے۔ سراً اور جہراً توصیف وتعریف کا صرف وہی مستحق ہے اس کے علاوہ جس کسی کی بھی تعریف کی جاتی ہے وہ مجازی ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ہے کیونکہ اس نے غیر کو کوئی ظاہری نعمت پہنچائی ہے ورنہ حقیقت میں ہر کمال و بلندی، جمال وجلال اس ذات بے مثل کا پرتو ہے۔

۲؎ یعنی آخرت کی نعمتیں بھی اس کی ملکیت اور تخلیق ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کے جملہ کا **لہ الحمد** کے جملہ پر عطف مطلق پر مقید کا عطف نہیں ہے بلکہ مقید کا عطف مقید پر ہے معطوف علیہ اس بات سے مقید ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی نعمتوں کی وجہ سے محمود ہے کیونکہ اسم موصول اور صلہ کے ساتھ صفت بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دنیوی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے کمال قدرت اور اتمام نعمت کی وجہ سے دنیا میں بھی وہی حمد وتعریف کا مستحق ہے اور اسی طرح آخرت میں بھی وہی ستائش کے لائق ہے کیونکہ آخرت کی نعمتیں بھی اس کی پیدا کردہ ہیں اور اسی کی ملکیت ہیں دوسرے جملہ (اَلْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَۃِ) میں ظرف کو اس لئے مقدم فرمایا تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ دنیا میں کبھی اللہ تعالیٰ کی حمد بالواسطہ ہوتی ہے کہ اس شخص کی تعریف کی جاتی ہے جس کے ذریعے نعمت الٰہیہ میسر آتی ہے تو اس کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کی دنیا میں حمد ہوتی ہے لیکن آخرت میں چونکہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اس کے سوا نہ کوئی حقیقت میں کسی چیز کا مالک ہوگا اور نہ مجازاً اس لئے وہاں صرف اسی کی حمد ہوگی (اسی حصر کے لئے خبر کو مقدم فرمایا اور مبتدا کو مؤخر فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اَلْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَۃِ سے مراد اہل جنت کی حمد ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ (ترجمہ) اور کہیں گے ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی اور ہم ہدایت یافتہ نہیں ہو

ستائشیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (واندوہ)

لہ اس کی شان یہ ہے کہ امور دین کو پختہ فرماتا ہے اور اشیاء کے ظاہر و باطن کو بخوبی جانتا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۚ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ۝

''وہ جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتا ہے۔ اور جو اس سے نکلتا ہے نیز وہ جانتا ہے جو آسمان سے نازل ہوتا اور جو آسمان کی طرف عروج کرتا ہے لہ اور وہی ہمیشہ رحم فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے ۲ ۔''

لہ یہ تعلیل کے مقام میں حال یا استیناف ہے۔ یعنی وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے مثلاً بارش کے قطرے جو زمین کے مسام میں داخل ہوتے ہیں اور وہ ان مردوں اور خزانوں کو بھی جانتا ہے جو زمین کی تہہ میں دفن کیے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ زمین سے نکلتا ہے اس سے بھی واقف ہے مثلاً نباتات' کنوؤں اور چشموں کے پانی اور وہ ان مردوں کو جانتا ہے جو قیامت کے روز اٹھائے جائیں گے اور وہ ان چیزوں سے بھی آشنا ہے جو آسمان سے نیچے اترتی ہیں مثلاً بارشیں' بجلیاں' ملائکہ' صحیفے' تقادیر' رزق' قسم قسم کی برکات اور مختلف قسم کے مصائب و آلام وغیرہ۔ اور اسے ان چیزوں کا بھی علم ہوتا ہے جو آسمان میں عروج کرتی ہیں مثلاً فرشتے' اور بندوں کے اعمال اور ان کی عجز و نیاز میں ڈوبی ہوئی دعائیں وغیرہ۔

۲ وہ رحیم ہے، بندوں کی ہر ضرورت کو اتارتا ہے اور وہ غفور ہے، نعمتوں پر ناشکری میں کوتاہی کرنے والوں کو بھی معاف فرما دیتا ہے۔ یہ جملہ یعلم پر معطوف ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۗ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

''اور کفار کہتے ہیں ہم پر قیامت نہیں آئے گی لہ آپ فرمائیے ضرور آئے گی مجھے اپنے رب کی قسم جو عالم الغیب ہے تم پر قیامت ضرور آئے گی ۲ نہیں چھپی ہوئی اس سے ذرہ برابر کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں ۳ اور نہ کوئی چھوٹی چیز ذرہ سے اور نہ کوئی بڑی چیز مگر وہ کتاب مبین میں (درج) ہے ۴ ۔''

لہ کفار جو قیامت کے وقوع کے منکر تھے۔ یہاں ان کے انکار کا ذکر ہے۔ اور یہ جملہ ایک متعدد جملہ پر معطوف ہے جو له الحمد فی الاخرة و هو الرحیم الغفور کے ارشاد سے مفہوم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنی حمد کرنے والوں کی مغفرت فرمائے گا اور ان پر اپنی رحمت فرمائے گا۔

۲ بلیٰ کے کلمہ سے ان کے کلام کا اور جس چیز کی انہوں نے نفی کی تھی اس کا اثبات فرمایا ہے۔ اور دیہی قسم ہے بلیٰ کے کلمہ سے جو

ہے کہ قیامت کا وقوع غیب ہے اوراس کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔اس کے اثبات کے لئے شہادت الہیہ کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے غیب کی کسی چیز کا (ثابت کرنا) اورنفی کرنا جائز نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کے بتانے سے اورتعلیم دینے سے کوئی دوسرا غیب کی خبر دے سکتا ہے۔

حمزہ اور کسائی نے فعال کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ علام پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فاعل کے وزن پر عالم پڑھا ہے نافع اور ابن عامر نے عالم الغیب کو مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ یا یہ مبتدا ہے اور اس کا مابعد خبر ہے۔باقی قراء نے اسے مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ رب کی صفت ہے۔ جس طرح انکار شدید تھا اسی طرح ان کا رد بھی بڑے زوردار انداز میں فرمایا ہے۔ انکے انکار کی بنیاد ان کی جہالت اور حماقت پر تھی اور وہ دوسری ممکنات کی طرح وقوع قیامت کے امکان کو بھی بعید از عقل سمجھتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس قیامت کو ثابت کرنے والا عالم الغیب ہے جو ہر ذرہ اور ہر قطرہ کو جانتا ہے۔اس لئے اس کے لئے قیامت کا لانا ممکن ہے۔

؎ کسائی نے یعزبُ کو زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے زاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اوران دونوں قراءتوں کا معنی ایک ہے یعنی آسمانوں اور زمین میں ذرہ برابر کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے، خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو یا مستقبل سے ہو یا حال سے ہو۔ یہ قول درست نہیں ہے کہ فی الحال جو چیز آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس سے مخفی نہیں ہے کیونکہ یہ جملہ عالم الغیب کی تاکید کے طور پر واقع ہوا ہے اور اس مفہوم کو بیان کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ اس رب کریم کا علم کائنات کی ہر چیز کو شامل ہے خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہے یا مستقبل سے ہے۔ فی الحال تمام اشیاء بعض مخلوق کے لئے بھی حاضر ہوتی ہیں جیسے ہم نے سورۂ انعام میں آیت کریمہ توفته رسلنا کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں عرض کیا گیا یا رسول اللہ! ملک الموت ایک ہے جبکہ مشرق ومغرب میں دو لشکر آپس میں لڑتے ہیں۔ درمیان میں کچھ بچے پیٹوں سے گرتے ہیں اور ہلاکتیں ہوتی ہیں (ان سب کی روحیں بیک وقت وہ کیسے قبض کرتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا ملک الموت ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ اس طرح ہے جیسے میرے سامنے تھال ہے کیا اس سے کوئی چیز چھپ سکتی ہے۔ اس آیت کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ تمام زمانے اور جو کچھ ماضی حال مستقبل میں ہے سب اللہ تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہیں اور وہ خود زمانہ سے خارج ہے جیسا کہ تمام امکنہ اور مکانیات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہیں اور وہ خود مکان سے خارج ہے نہ اس پر زمانہ جاری ہوتا ہے اور نہ کوئی مکان اسے گھیرتا ہے۔ پس زمانہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور حادث ہے اور اس کا حدوث بھی ذاتی ہے، اسی طرح مکان بھی اس کی مخلوق ہے۔ پس ماضی اور مستقبل اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر ہیں جیسا کہ تمام مکان اس کی نسبت سے برابر ہیں۔ اس نظریہ پر بعض اکابر علماء نے تنبیہ فرمائی ہے۔ حضرت جلال دوانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ الزوراء میں فرماتے ہیں جب تو امتداد زمانی کو حوادثات کونیہ کے ساتھ یکبارگی دیکھے گا جو امتداد زمانی تغیر و تبدل کا محل اور حوادث کونیہ کا عرض ہے تو تو اسے علت اولی کی شانوں میں سے ایک شان پائے گا جو شان تمام شیون متعاقبہ کو محیط ہے پھر جب تو مزید عمیق نظر سے دیکھے گا تو تجھے اس امتداد کی حدود کا حضور اور غیبوبت زمانیات کی نسبت سے اس شان کے احاطہ میں نظر آئے گا اور مراتب عالیہ کی نسبت سے حوادث متعاقبہ میں کوئی تعاقب نہیں ہے بلکہ مراتب عالیہ کی نسبت سے تمام حوادث حضور میں برابر ہیں پس جو بلندیوں کے انتہائی مرتبہ پر فائز ہیں ان کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کریمہ منزہ [illegible]

حتیٰ کہ آنکھ اس کے تمام اجزاء کے احاطہ سے عاجز آ جائے تو وہ مختلف رنگ حدقہ کی تنگی کی وجہ سے حضور میں متعاقب نہ ہوں گے بلکہ تیرے احاطہ کی قوت کی وجہ سے حضور میں متقارب ہوں گے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ۔

فائدہ: کبھی کبھی اللہ کے کسی نیک بندے پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ زمانے کی قید سے نکل جاتا ہے اور وہ ماضی اور مستقبل کو اپنے ہاں برابر دیکھتا ہے۔ اس کی دلیل بخاری اور مسلم کی وہ روایت ہے جو عبداللہ بن عباس سے مروی ہے' فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں میں سورج گرہن لگا' تو رسول اللہ ﷺ اور لوگوں نے نماز کسوف پڑھی' آپ ﷺ نے اس نماز میں بہت طویل قیام فرمایا آگے طویل حدیث ہے' آخر میں ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم دیکھ رہے تھے کہ آپ اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر کسی چیز کو پکڑ رہے ہیں پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے جنت دیکھی اور اس سے انگور کا ایک گچھا پکڑا۔ اگر میں وہ گچھا توڑ لیتا تو تم اس سے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے اور میں نے آگ دیکھی' بس آج کے دن کی طرح میں نے کبھی بھیانک منظر نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ دوزخ میں زیادہ عورتیں ہیں (الحدیث)(1) یہ ایک حقیقت ہے کہ عورتوں کا آگ میں دخول قیامت کے بعد ہوگا حالانکہ نبی کریم ﷺ نے وہ منظر اس وقت دیکھا تھا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ شاید نبی کریم ﷺ نے دوزخ اور جنت کی صورت عالم مثال میں دیکھی ہو جیسے خواب میں سونے والا دیکھتا ہے' کیونکہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''اگر میں توڑ لیتا تو تم رہتی دنیا تک کھاتے رہتے'' بالکل صریح ہے کہ آپ ﷺ نے جنت اور دوزخ کو حقیقۃً دیکھا تھا' ان کی مثالیں نہیں دیکھی تھیں۔ اسی طرح امام مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے' کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے جنت کو دیکھا اور میں نے ابوطلحہ کی بیوی کو دیکھا اور میں نے اپنے سامنے چلنے کی آواز سنی تو وہ حضرت بلال کے چلنے کی آواز تھی(2)۔ اسی طرح امام احمد' ابوداؤد اور الضیاء نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میرے رب عزوجل نے مجھے معراج عطا فرمائی تو میں ایک قوم کے پاس سے گزرا جن کے ناخن تانبے کے تھے۔ وہ اپنے چہروں اور سینوں کو خود نوچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا اے جبریل یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے بتایا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزتیں لوٹتے تھے(3)۔ حضرت جابر سے مروی ہے' فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر آگ پیش کی گئی میں نے اس میں بنی اسرائیل کی ایک عورت دیکھی جسے ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا جا رہا تھا جس کو اس نے باندھ دیا تھا۔ نہ اسے کھانا کھلاتی اور نہ اسے چھوڑتی کہ وہ حشرات ارض کھائے(4)۔ حتیٰ کہ وہ بھوک کی وجہ سے مر گئی۔ میں نے عمر بن عامر الخزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی انتڑیاں آگ میں گھسیٹ کر جل رہا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے سانڈھ چھوڑنے کی رسم نکالی تھی۔

ج۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں لا یعزب عنہ کا معنی یہ ہے کہ اس کے علم سے ذرہ برابر کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور نہ ذرہ سے کوئی چھوٹی اور نہ ذرہ سے کوئی بڑی چیز مخفی ہے۔ یہ جملہ عزوب (چھپنے) کی نفی کی تاکید کے لئے ہوگا۔ اگر عزوب سے مراد اس کے علم سے عزوب (چھپنا) ہو۔ یا کتاب مبین سے مراد اللہ کا علم ہو یا لوح محفوظ جو اس کے علوم غیر متناہیہ کا بعض ہے۔ اگر لا یعزب عنہ کا مطلب یہ ہو کہ اس کی ذات سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے تو یہ جملہ تاسیس ہوگا' تاکید نہ ہوگا۔ اصغر اور اکبر مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہیں اور اس کی تائید الفتح کی قرأت کرتی ہے جس میں لا نفی جنس کو عمل کرایا گیا ہے۔ اصغر اور اکبر کا مثقال پر مرفوع کی حیثیت سے اور ذرہ پر محل جر

میں مفتوح کی حیثیت سے عطف جائز نہیں ہے' (محل جر کی صورت میں فتحہ اس لئے ہوگا کیونکہ یہ دونوں غیر منصرف ہیں) مثقال اور ذرہ پر عطف اس لئے جائز نہیں ہے کیونکہ استثناء کی وجہ سے معنی میں فساد واقع ہوتا ہے' اور اِلَّا حرف استثناء کو لکن کے معنی میں کر کے مستثنیٰ منقطع بنانا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ استدراک اور استثناء منقطع نفی کے بعد اثبات ہوتا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ذرہ برابر کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے اور نہ کوئی چھوٹی بڑی چیز اس سے پوشیدہ ہے لیکن جو کتاب مبین ہے وہ پوشیدہ ہے' یہ معنی فاسد ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ایک صورت میں معنی صحیح ہوسکتا ہے کہ ''عنہ'' کی ضمیر کا مرجع غیب کو بنایا جائے اور لوح محفوظ میں جو ثابت ہے اس کو غیب سے خارج کیا جائے کیونکہ وہ دیکھنے والوں (فرشتوں) پر ظاہر ہوتا ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ غیب سے کوئی چیز جدا نہیں ہے مگر وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے(۱)' یہ توجیہہ ضعیف ہے جیسا کہ امام بیضاوی کے انداز کلام سے ظاہر ہے کیونکہ لوح محفوظ میں ہونا اس کو غیب سے خارج نہیں کرتا اور سلسلہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو شامل ہے۔ اور اس توجیہہ کا مدعیٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور سورۂ یونس میں یہ آیت کریمہ اس طرح ہے لَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ۝ (ترجمہ) اور نہیں چھپا ہوتا آپکے رب سے ذرہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہیں کوئی چھوٹی چیز اس ذرہ سے اور نہ بڑی مگر وہ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے۔ وہاں امام بیضاوی کی اس توجیہہ کی کوئی مناسبت نہیں بنتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ کلام مدح بما یشبہ الذم (۱) کے طریقہ پر ہے' جیسا کہ اس ارشاد میں وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُّؤْمِنُوا بِاللّٰهِ (ترجمہ) اور نہیں ناپسند کیا تھا انہوں نے مسلمانوں سے بجز اس کے کہ وہ ایمان لائے تھے اللہ پر۔ اسی طرح عرب بولتے ہیں زَيْدٌ لَا عَيْبَ فِيْهِ إِلَّا أَنَّهُ عَالِمٌ (زید میں کوئی عیب نہیں ہے مگر وہ عالم ہے) یعنی اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اور آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ذرہ برابر چیز پوشیدہ نہیں ہے مگر کتاب میں اس کا حکم موجود ہے پھر وہ اس سے غائب و پوشیدہ کیسے ہوسکتی ہے۔

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

''(قیامت آئے گی) تاکہ اللہ تعالیٰ جزاء دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ۱؎ یہی وہ (نیک بخت) لوگ ہیں جن کے لئے بخشش اور رزق کریم ہے ۲؎''

۱؎ یہ قیامت کے آنے کی حکمت بیان ہورہی ہے۔ اور یہ لتاتینکم کے قول کی علت ہے۔

۲؎ عبودیت کے وہ حقوق جن کی ادائیگی ممکن نہ تھی ان کی ادائیگی میں قصور کو معاف کرنے کا یہ مژدہ ہے۔ اور جو انہوں نے نیکیاں اور اچھے اعمال کیے ان کی جزاء کے طور پر جنت میں عمدہ رزق عطا کیا جائے گا' جس پر نہ کوئی مشقت برداشت کرنی پڑے گی اور نہ اس پر احسان جتلایا جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝

''اور جو (بدبخت) کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ہماری آیتوں کو جھٹلا کر ہمیں ہرا دیں یہی ہیں جن کے لئے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے ۱؎۔''

۱؎ اس کا عطف الذین امنوا پر ہے اور یہ لیجزی کا مفعول ہے۔ یعنی قیامت برپا کی جائے گی تا کہ جو لوگ اپنی ساری توانائیاں ہماری آیتوں کو جھٹلانے اور ان سے لوگوں کو متنفر کرنے میں کوشاں ہیں ان کو سزا دی جائے۔ معاجزین کو ابن کثیر اور ابوعمرو نے معجزین باب تفعیل سے جیم کی شد کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی جو ایمان لانے کا ارادہ کرے اسے اس سے روکیں) باقی قراء نے باب مفاعلہ سے پڑھا ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو عاجز کرنا چاہتے ہیں اور قدرت خداوندی کو مغلوب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ وہ ہم سے آگے نکلنا چاہتے ہیں اس گمان سے کہ ہماری ان لچر باتوں سے شاید قیامت برپا کرنے کا ارادہ بدل جائے گا اور عقاب وسزا کا قول تبدیل ہو جائے گا۔

قتادہ فرماتے ہیں رجز سے مراد سخت عذاب ہے اور من بیانیہ ہے۔ (1) الیم سے مراد ذو الیم ہے۔ یعنی دردناک عذاب۔ ابن کثیر، حفص اور یعقوب نے یہاں بھی اور سورۃ الجاثیہ میں الیم کو مرفوع پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ عذاب کی صفت ہے۔ باقی قراء نے رجز کی صفت ہونے کی بناء پر مجرور پڑھا ہے۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿٦﴾

''اور جانتے ہیں وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ۱؎ کہ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے وہی (عین) حق ہے ۲؎ اور عزت والے سب خوبیوں سراہے (خدا) کا راستہ دکھاتا ہے ۳؎''

۱؎ یہاں یری بمعنی یعلم ہے۔ اور یہ بلی لتاتینکم کے مضمون پر معطوف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یجزی پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اوتوالعلم سے مراد اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے علماء ہیں۔ جیسے عبداللہ بن سلام اور آپ کے دوسرے ساتھی۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد صحابہ کرام (2) اور ان کے بعد آنے والے مومنین ہیں۔ یعنی جس طرح صاحب علم لوگ اب دلائل کے ذریعے یقین رکھتے ہیں کہ قیامت ضرور برپا ہوگی اسی طرح قیامت کے برپا ہونے کے وقت وہ اس کے حق ہونے کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے۔

۲؎ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ سے مراد قرآن حکیم ہے اور یہ یری کا مفعول اول ہے اور الحق مفعول ثانی ہے اور ضمیر فصل ہے اور جنہوں نے الحق کو مرفوع پڑھا ہے ان کے نزدیک ھو مبتدا اور الحق خبر ہے، پھر پورا جملہ یری کا مفعول ثانی ہے۔ اور یری کا جملہ مستأنفہ ہے، اس کا ماقبل کلام سے تعلق نہیں ہے (اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ صاحب علم لوگوں کے متعلق خبر دے رہے ہیں کہ وہ قرآن کو حق تسلیم کرتے ہیں اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ قرآن حکیم صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے اور وہ ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت واقع ہوگی اور اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے۔ جبکہ جاہل لوگ آیات کی تکذیب میں کوشاں ہیں) تو اس جملہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ جاہل اور آیات کو جھٹلانے والوں پر صاحب علم لوگوں کے ذریعے استشہاد فرمار ہے ہیں۔

۳؎ یھدی کا فاعل یا اللہ تعالیٰ ہے یا الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ ہے صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ سے مراد اسلام ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ

اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۞

''اور منکرین (قیامت) کہتے ہیں (اے یارو!) کیا ہم پتہ بتائیں تمہیں اس شخص کا جو تمہیں خبردار کرتا ہے کہ جب تم (مرنے کے بعد) ریزہ ریزہ کر دیئے جاؤ گے تو تم ازسرنو پیدا کیے جاؤ گے؟ ۱؎''

۱؎ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا عطف سابق قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر ہے اور ان کے درمیان جملے معترضہ ہیں۔ یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرمایا تاکہ حکم کے مدار (کفر) پر تصریح ہو جائے۔ یعنی منکرین قیامت تعجب کرتے ہوئے آپس میں یہ کہتے۔ رجل سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ ینبئکم، رجل کی صفت ہے۔ یعنی یہ شخص عجیب و غریب خبریں دیتا ہے۔ کل مصدریت کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ مصدر میمی کی طرف مضاف ہے۔ یعنی جب تم مر جاؤ گے اور تمہارے جسم پوری طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے حتیٰ کہ مٹی بن جائیں گے۔ یا کل پر نصب ظرفیت کی بناء پر ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوگا کہ جب تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے اور سیلاب تمہیں ہر راستہ پر بہا کر لئے جائیں گے اور دور دور پھینک دیں گے۔ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ینبئکم کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس میں قول کا معنی متضمن ہے۔ یعنی یقول انکم لفی خلق جدید اذ امزّقتم۔ ظرف کو مقدم کیا گیا ہے اس کی وجہ بُعد اور مبالغہ پر دلالت ہے، ظرف کا عامل محذوف ہے جس پر مابعد کلام دلالت کر رہی ہے۔ اس کے عامل کو محذوف نکالنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ماقبل اس سے متصل نہیں ہے اور اس کا مابعد ان ہے جو اپنے ماقبل میں عمل نہیں کرتا ہے۔ تجاہل عارفانہ کے طور پر انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نکرہ ذکر کیا حالانکہ آپ قریش میں مشہور و معروف تھے اور آپ کا قیامت کی خبر دینا بالکل عام تھا۔ اور دوسری وجہ نکرہ ذکر کرنے کی یہ تھی کہ وہ اس کو بہت بعید سمجھتے تھے اور تیسری وجہ آپ کی (نعوذ باللہ) تحقیر کرنا تھا۔

اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۞

''یا تو اس نے (یہ کہہ کر) اللہ پر جھوٹا بہتان لگایا ہے ۱؎ یا یہ دیوانہ ہے (میرا حبیب نہ مفتری ہے نہ دیوانہ ہے) ۲؎ بلکہ وہ جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ (کل) عذاب میں اور (آج) دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں ۳؎''

۱؎ اَفْتَرٰى سے پہلے ہمزہ استفہام ہے اور جب ہمزہ استفہام ہمزہ وصلی پر داخل ہوا تو ہمزہ وصلی لفظاً ساقط ہو گیا کیونکہ خبر کے ساتھ کوئی التباس نہیں ہے اور اس کی یہاں ضرورت بھی نہیں ہے اور یہاں ہمزہ وصلی مکسور تھا۔ لیکن جب ہمزہ وصلی مفتوح ہو تو پھر ہمزہ استفہام کے دخول کے باوجود ہمزہ وصلی ساقط نہیں ہوتا۔ جیسے آ اللہ ایسے مقامات پر ہمزہ وصلی حذف نہیں کیا جاتا بلکہ تسہیل کیا جاتا ہے یا الف سے بدل جاتا اور مد کی صورت میں پڑھا جاتا ہے اور خطاءً ایسی صورت میں بھی ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سقوط خلاف قیاس ہوتا ہے۔ کذباً، افتریٰ کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ افتریٰ بھی کذب (جھوٹ) کی ایک قسم ہے۔ اور وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولنا ہے۔

۲؎ یا یہ جنون کی مرض میں مبتلا ہے جو اس کے دماغ میں وہم ڈالتا ہے اور پھر وہ ایسی خلاف عقل باتیں زبان پر لاتا ہے۔ بعض علماء کا

ئے لوہا آپ کے ہاتھوں میں موم اور آٹے کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور آپ بغیر آگ اور ہتھوڑے کی ضربیں لگانے کے اس سے جو چاہتے بنا لیتے تھے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ لوہے کا آپ کے ہاتھوں میں نرم ہونا اس وجہ سے تھا کہ آپ کو جب بنی اسرائیل کی بادشاہی عطا کی گئی تو آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ غیر معروف صورت بنا کر باہر نکل جاتے پھر جب کوئی انجان آدمی دیکھتے تو اس کے پاس جا کر پوچھتے کہ تم اپنے والی (بادشاہ) کے متعلق کیسا گمان رکھتے ہو، وہ کیسا آدمی ہے' تو لوگ آپ کے سامنے تعریفی کلمات کہتے۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے انسانی شکل میں ایک فرشتہ نازل فرمایا۔ آپ نے معمول کے مطابق اس کے پاس آکر پوچھا تو اس فرشتے نے کہا داؤد اچھا آدمی ہے لیکن اس کی ایک عادت اچھی نہیں ہے۔ داؤد علیہ السلام یہ جملہ سن کر گھبرا گئے۔ پوچھا وہ کونسی عادت ہے؟ فرشتے نے کہا وہ بیت المال سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے اہل وعیال کو بھی کھلاتا ہے (اور یہی کام اچھا نہیں ہے) آپ نے اس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کی کہ روزگار کا کوئی ایسا سبب پیدا فرمادے کہ میں بیت المال کے پیسے سے مستغنی ہو جاؤں اور اپنے روزگار سے خود بھی کھاؤں اور اپنے عیال کو بھی کھلاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور آپ کے ہاتھوں میں لوہے کو نرم فرما دیا اور آپ کو زرہ سازی کا ہنر سکھا دیا۔ سب سے پہلے زرہ سازی کا کام آپ نے شروع فرمایا۔ روایت ہے کہ آپ ایک زرہ چار ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ اس سے خود کھاتے تھے اور اپنے اہل وعیال کو بھی کھلاتے تھے اور اس سے کچھ فقراء ومساکین پر صدقہ فرما دیتے تھے۔ یہ بھی ذکر ہے کہ آپ ہر روز ایک زرہ بناتے تھے جسے چھ ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ دو ہزار درہم اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے تھے اور چار ہزار درہم غرباء ومساکین پر صدقہ کرتے تھے(1)۔

حضرت مقدام بن معدیکرب سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا جاتا ہے۔ اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے(2)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے بھی یہ روایت لکھی ہے لیکن اس کے الفاظ مختلف ہیں اگرچہ مفہوم ایک ہے(3)۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱﴾

''اور (حکم دیا) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور (ان کے) حلقے جوڑنے میں اندازے کا خیال رکھو اور (اے آل داؤد!) نیک کام کیا کرو بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو میں انہیں خوب دیکھ رہا ہوں [1]۔''

[1] اعمل سے پہلے ان مصدریہ یا مفسرہ ہے۔ سٰبِغٰتٍ سے مراد مکمل اور کشادہ زرہیں ہیں جنہیں پہننے والے زمین پر گھسیٹ کر چلیں۔ السرد کا معنی زرہ بننا ہے۔ یعنی زرہیں ایسی بناؤ جن کے حلقے مناسب ہوں اور ان کے کیل بڑے مہارت سے لگائے گئے ہوں۔ وہ زرہیں نہ تو اتنی نرم ہوں کہ خود بخود اکٹھی ہو جائیں اور نہ اتنی سخت ہوں کہ حلقے ٹوٹ جائیں۔ صالحاً مفعولیت یا مصدریت کی بناء پر منصوب ہے۔ آخر میں فرمایا جو تم کرتے ہو میں وہ دیکھ رہا ہوں، میں تمہیں اس کی جزاء دوں گا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اس لئے وہ پاک چیز کو پسند فرماتا ہے۔ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کا حکم دیا جس کا اس نے انبیاء کرام کو حکم دیا تھا۔ فرمایا یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا

اور ہماری بادشاہی سے خروج پر قادر نہیں ہیں، یعنی جب اپنی مجبوری اور اپنا نرغے میں ہونا دیکھ چکے ہیں تو اب انہیں ڈرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کہیں انہیں زمین میں دھنسا نہ دے جیسا کہ اس نے قارون کے ساتھ کیا تھا۔ یا ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے جیسے اس نے قوم لوط پر آسمان سے پتھر برسائے تھے جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول اور آیات کی تکذیب اور انکار کیا تھا۔

۲؎ یہ آسمان اور زمین جس کا وہ مشاہدہ کر رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت، مرنے کے بعد اٹھنے اور منکرین خدا کو عذاب دینے کے جواز پر کھلی دلیل ہیں لیکن اس شخص کے لئے جو توجہ دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ کیونکہ ایسا شخص ہی قدرت کی نشانیوں میں کثرت سے غور و فکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝

''بے شک ہم نے داؤد کو اپنی جناب سے بڑی فضیلت بخشی ۱؎ (ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو! تسبیح کہو اس کے ساتھ مل کر ۲؎ اور پرندوں کو بھی یہی حکم دیا ۳؎ نیز ہم نے لوہے کو اس کے لئے نرم کر دیا ۴؎ ''

۱؎ یعنی حضرت داؤد کو ہم نے بہت سے اپنے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے جہاں بندوں پر فضیلت دینے کا ذکر ہے الحمد الله الذی فضلنا علی کثیر من عباده المومنین ۔

ان کرم نوازیوں اور کرم گستری میں نبوت، کتاب، بادشاہی، حسن صوت اور لوہے کا نرم ہونا سب شامل ہیں۔ فضلاً آتینا کا مفعول ہے اور ''منا'' اس کا حال ہے۔

۲؎ یہ فضلاً سے بدل ہے یا قول کی تضمین کے ساتھ اتینا سے بدل ہے، تقدیر یوں ہوں گی قلنا یا جبال اوبی معه۔ یعنی اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح بیان کرو۔ اایاب کا معنی لوٹنا ہے، یعنی جب داؤد علیہ السلام تسبیح کریں تو تم بھی تسبیح کرو۔ یا ایاب کا معنی تسبیح کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں اَوَّبَ ۔ جب کوئی تسبیح بیان کرے کیونکہ تسبیح کرنے والا ہر غیر سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ قتیبی کہتے ہیں یہ التاویب فی السیر سے مشتق ہے، جس کا معنی پورا دن چلنا ہے اور رات کو نزول کرنا ہے۔ گویا اس طرح فرمایا جب دن چڑھے تو تم اس کے ساتھ تسبیح کرتے ہوئے چلو۔ وہب فرماتے ہیں اوبی معه کا معنی نوحی معه ہے یعنی اس کے ساتھ نوحہ کرو۔

۳؎ الطیر ۔ الجبال پر معطوف ہے یعقوب نے لفظ پر محمول کرتے ہوئے الطیر کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے محل کا اعتبار کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے اور فضلاً پر عطف کے اعتبار سے یا اوبی کے مفعول معہ کے اعتبار سے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اوبی کی ضمیر پر عطف ہو۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اصل عبارت اس طرح تھی ولقد آتینا داؤد منا فضلاً و هی تاویب الجبال و الطیر ۔ لیکن عظمت الٰہیہ اور شان کبریائی کے اظہار پر دلالت کرنے کے لئے اسلوب بیان کو تبدیل فرما دیا گویا پہاڑ اور پرندے بھی عقلاء کی طرح اس کے حکم کے سامنے سر افگندہ ہیں اور ہر چیز میں اس کی مشیت کارفرما ہے(1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب حضرت داؤد علیہ السلام تسبیح کرتے ہوئے پہاڑوں کے درمیان سے گزرتے تو وہ بھی آپ کی طرح تسبیح کرتے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب حضرت داؤد علیہ السلام کو کمزوری لاحق ہوتی تو آپ کو چوکنا اور آپ کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ انہیں پہاڑوں کی تسبیح سناتے۔

ہے لوہا آپ کے ہاتھوں میں موم اور آٹے کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور آپ بغیر آگ اور ہتھوڑے کی ضربیں لگانے کے اس سے جو چاہتے بنا لیتے تھے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ لوہے کا آپ کے ہاتھوں میں نرم ہونا اس وجہ سے تھا کہ آپ کو جب بنی اسرائیل کی بادشاہی عطا کی گئی تو آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ غیر معروف صورت بنا کر باہر نکل جاتے پھر جب کوئی انجان آدمی دیکھتے تو اس کے پاس جا کر پوچھتے کہ تم اپنے والی (بادشاہ) کے متعلق کیسا گمان رکھتے ہو، وہ کیسا آدمی ہے' تو لوگ آپ کے سامنے تعریفی کلمات کہتے۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے انسانی شکل میں ایک فرشتہ نازل فرمایا۔ آپ نے معمول کے مطابق اس کے پاس آ کر پوچھا تو اس فرشتے نے کہا داؤد اچھا آدمی ہے لیکن اس کی ایک عادت اچھی نہیں ہے۔ داؤد علیہ السلام یہ جملہ سن کر گھبرا گئے۔ پوچھا وہ کونسی عادت ہے؟ فرشتے نے کہا وہ بیت المال سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے اہل وعیال کو بھی کھلاتا ہے (اور یہی کام اچھا نہیں ہے) آپ نے اس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کی کہ روزگار کا کوئی ایسا سبب پیدا فرما دے کہ میں بیت المال کے پیسے سے مستغنی ہو جاؤں اور اپنے روزگار سے خود بھی کھاؤں اور اپنے عیال کو بھی کھلاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور آپ کے ہاتھوں میں لوہے کو نرم فرما دیا اور آپ کو زرہ سازی کا ہنر سکھا دیا۔ سب سے پہلے زرہ سازی کا کام آپ نے شروع فرمایا۔ روایت ہے کہ آپ ایک زرہ چار ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ اس سے خود کھاتے تھے اور اپنے اہل وعیال کو بھی کھلاتے تھے اور اس سے کچھ فقراء ومساکین پر صدقہ فرما دیتے تھے۔ یہ بھی ذکر ہے کہ آپ ہر روز ایک زرہ بناتے تھے جسے چھ ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ دو ہزار درہم اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے تھے اور چار ہزار درہم غرباء ومساکین پر صدقہ کرتے تھے(1)۔

حضرت مقدام بن معد یکرب سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا جاتا ہے۔ اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے(2)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے بھی یہ روایت لکھی ہے لیکن اس کے الفاظ مختلف ہیں اگرچہ مفہوم ایک ہے(3)۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ⓾

"اور (حکم دیا) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور (انکے) حلقے جوڑنے میں اندازے کا خیال رکھو اور (اے آل داؤد!) نیک کام کیا کرو بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو میں انہیں خوب دیکھ رہا ہوں[1]"

[1] اعمل سے پہلے ان مصدریہ یا مفسرہ ہے۔ سٰبِغٰتٍ سے مراد مکمل اور کشادہ زرہیں ہیں جنہیں پہننے والے زمین پر گھسیٹ کر چلیں۔ السرد کا معنی زرہ بننا ہے۔ یعنی زرہیں ایسی بناؤ جن کے حلقے مناسب ہوں اور ان کے کیل بڑے مہارت سے لگائے گئے ہوں۔ وہ زرہیں نہ تو اتنی نرم ہوں کہ خود بخود اکٹھی ہو جائیں اور نہ اتنی سخت ہوں کہ حلقے ٹوٹ جائیں۔ صالحاً مفعولیت یا مصدریت کی بناء پر منصوب ہے۔ آخر میں فرمایا جو تم کرتے ہو میں وہ دیکھ رہا ہوں، میں تمہیں اس کی جزاء دوں گا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اس لئے وہ پاک چیز کو پسند فرماتا ہے۔ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کا حکم دیا جس کا اس نے انبیاء کرام کو حکم دیا تھا۔ فرمایا يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے مسخر کر دی سلیمان کے لئے ہوا [1] اس کی صبح کی منزل ایک ماہ کی اور شام کی منزل ایک ماہ کی ہوتی [2] اور ہم نے جاری کر دیا ان کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ [3] اور کئی جن (ان کے تابع کر دیئے) جو کام میں جتے رہتے ان کے سامنے ان کے رب کے اذن سے [4] اور جو سرتابی کرتا ان میں سے ہمارے حکم (کی تعمیل) سے تو ہم اسے چکھاتے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب [5]''

[1] ابوبکر نے عاصم کی روایت سے الریح کو مرفوع پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ اس کی خبر محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے' ولسلیمان الریح مسخرة۔ جملہ اسمیہ ذکر فرمایا تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ حضرت سلیمان کے لئے ہوا کا مسخر ہونا عوام الناس میں ثابت شدہ امر تھا اور زبان زد عام تھا۔ یا الریح اس بناء پر مرفوع ہے کہ یہ سخر فعل مجہول کا نائب الفاعل ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے سخر السلیمان الریح ۔ باقی قراء نے الریح کو منصوب پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ فعل محذوف سخرنا کا مفعول ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے سخرنا لسلیمان الریح۔ پھر یہ جملہ یا جبال اوبی معه والطیر کے کلام سے مفہوم انه سخرنا مع داود الجبال یسبحن والطیر پر معطوف ہے۔ اور ان الفاظ کے ساتھ سورۃ الانبیاء میں ذکر بھی ہے۔

[2] یہ جملہ مستانفہ ہے، یعنی صبح سے زوال تک ایک ماہ کی منزل طے کرتی اور زوال سے شام تک بھی ایک ماہ کی منزل طے کرتی۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں حضرت سلیمان صبح دمشق سے چلتے تو قیلولہ اصطخر میں فرماتے اور ان دونوں شہروں کے درمیان ایک ماہ کی مسافت ہے۔ پھر اصطخر سے چلتے اور رات بابل میں گزارتے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان بھی ایک تیز رفتار سوار کے لئے ایک ماہ کی مسافت ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ صبح کا کھانا ریہ میں تناول فرماتے اور شام کا کھانا سمرقند میں کھاتے(1)۔

[3] القطر کا معنی پگھلا ہوا تانبا ہے۔ واسلنا الخ کا عطف سخرنا لسلیمان الریح کے جملہ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ جاری فرما دیا ہے۔ چونکہ وہ تانبا پانی کی طرح کان سے نکلتا تھا اس لئے اسے ''عینا'' (چشمہ) فرمایا ہے' امام بغوی لکھتے ہیں کہ اہل تفسیر فرماتے ہیں تانبے کا چشمہ آپ کے لئے یمن کی طرف پانی کی طرح جاری کیا گیا تھا۔ اب بھی یمن کے باشندے اس سے منفعت حاصل کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جاری فرمایا تھا(2)۔

[4] الریح کی مرفوع تقدیر کی صورت میں مَنْ موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہوگا اور خبر مسخرة محذوف ہوگی اور من الجن۔ یعمل کی ضمیر مستتر سے حال ہوگا اور اس جملہ اسمیہ کا عطف ''الریح مسخرة'' جملہ اسمیہ پر ہوگا۔ اور الریح کی منصوب تقدیر کی صورت میں اسم موصول الریح پر معطوف ہوگا اور من الجن اسم موصول سے حال مقدم ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی سخرنا له من یعمل بین یدیه من الجن۔ باذن ربه' یعمل کے متعلق ہے۔ اور اس کا معنی بامره و حکمه (یعنی اللہ تعالیٰ کے امر اور حکم سے) یا بارادته و تسخیره (یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی تسخیر سے)۔

۵؎ اور جنوں میں سے جو حضرت سلیمان کی فرمانبرداری اور تابعداری میں کوتاہی کا مظاہرہ کرتا، ہم اسے آگ کے عذاب کا مزہ چکھاتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عذاب سے مراد عذاب آخرت ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد دنیا میں آگ سے جلانا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر اذن اور امر سے مراد امر تکلیفی ہو تو پھر عذاب کی تفسیر عذاب آخرت سے مناسب ہے کیونکہ آخرت ہی دار جزاء ہے اور اگر اذن سے مراد ارادہ اور تسخیر ہو جیسا کہ ظاہر ہے تو پھر عذاب سے مراد عذاب دنیا ہوگا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جنوں پر ایک فرشتہ مسلط فرمایا تھا جس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا تھا، جو جن حضرت سلیمان کے حکم سے سرتابی کرتا تو وہ فرشتہ اسے آگ کا کوڑا مارتا جو اسے جلا دیتا(۱)۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے جنوں سے کام کا ارادہ کیا تھا تو پھر جنوں سے عدول اور نافرمانی کیسے ممکن تھی کیونکہ ان کی سرتابی اور عدول تسلیم کیا جائے تو ارادہ الٰہیہ سے مراد کا تخلف ہونا لازم آتا حالانکہ ارادہ الٰہیہ سے مراد کا تخلف محال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ من الجن میں مِن تبعیضیہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ بعض جن حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت بجالائیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر فرمایا تھا جو اس جن کو عذاب دیتا تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے اعراض کرتا۔ ظاہر میں اکثر جنوں کا حضرت سلیمان کی خدمت کرنے کا یہی سبب ہے۔ یا یہ معنی ہوگا کہ جو ان میں سے عدول اور نافرمانی کا ارادہ کرتا تو فرشتہ اسے سزا دیتا حتی کہ وہ انحراف چھوڑ دیتا اور مطیع و فرمانبردار بن جاتا۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾

''وہ بناتے آپ کے لئے جو آپ چاہتے پختہ عمارتیں ۱؎۔ مجسمے ۲؎ بڑے بڑے لگن جیسے حوض ہوں اور بھاری دیگیں جو چولہوں پر جمی رہتیں ۳؎ اے داؤد کے خاندان والو! (ان نعمتوں پر) شکر ادا کرو ۴؎ اور بہت کم ہیں میرے بندوں سے جو شکر گزار ہیں ۵؎۔''

۱؎ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ۔ یا تو سابقہ آیت میں یعمل کے فاعل سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔ محاریب سے مراد مضبوط قلعے اونچی اور بلند و بالا مساجد اور خوشنما محلات ہیں۔ ان کو محاریب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان پر آسانی سے قبضہ نہیں دیا جاتا بلکہ ان کا دفاع کیا جاتا ہے اور ان کی خاطر جنگ کی جاتی ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ جنوں نے جو عبادت گاہیں حضرت سلیمان کے حکم سے بنائی تھیں ان میں بیت المقدس بھی تھا۔ اس کی بنیاد حضرت داؤد علیہ السلام نے رکھی تھی اور آدمی کے قد کے برابر دیواریں کھڑی بھی کی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے اس گھر کی تعمیر تیرے ہاتھوں مکمل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا لیکن تیرے بعد تیرے بیٹے کو اقتدار عطا کروں گا اور اس کے ہاتھوں اس کی تکمیل کروں گا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا وصال ہوا اور حضرت سلیمان ان کی مسند پر آئے تو انہوں نے بیت المقدس کی تکمیل کا پروگرام بنایا۔ آپ نے جنوں اور شیطانوں کو جمع کیا اور ان میں کام اور ڈیوٹی کو تقسیم فرما دیا۔ ہر گروہ کو وہ کام سونپا گیا جو وہ کر سکتا تھا۔ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں اور شیطانوں کو بھیجا کہ سفید سنگ مرمر لے آؤ۔ پھر آپ نے سنگ مرمر اور چٹانوں سے شہر کی بنیادیں بنانے کا حکم دیا۔ آپ نے بارہ محلے بنائے اور ہر محلے میں ایک ایک قبیلہ کو بسایا۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے۔ جب آپ شہر کی

چاندی اور یاقوت معادن سے اور سچے موتی سمندر سے ڈھونڈ کر لے آئیں۔ ایک گروہ کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ جواہر اور پتھر لے آئیں۔ ایک گروہ کو کستوری، عنبر اور دوسری پاکیزہ خوشبوئیں لانے پر مقرر فرمایا۔ پس آپ کے حکم سے اتنا خام مال اکٹھا ہو گیا کہ اس کی مقدار صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم تھی۔ اس کا شمار انسانی عقل سے وراء تھا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے معماروں کو بلایا اور انہیں بلند اور بڑے بڑے پتھروں کے گھڑنے اور تراشنے کا حکم دیا۔ اور ان کی تختیاں اور پلیٹیں بنانے کا ارشاد فرمایا۔ پھر جواہر کی اصلاح اور موتیوں کے سوراخ نکالنے کا کام شروع فرمایا۔ مسجد کی تعمیر اس طرح ہوئی کہ اس میں سفید، زرد، سبز پتھر استعمال ہوا اور اس کے ستونوں پر صاف شفاف پتھر کی پلیٹیں لگائی گئیں اور چھت پر قیمتی جواہر کی تختیاں لگائی گئیں۔ چھت اور دیواروں پر موتی اور یواقیت اور دوسرے جواہر لگائے گئے۔ فرش پر فیروزج کی تختیاں بچھائی گئیں۔ اس زمانہ میں بیت المقدس سے زیادہ منور اور خوش منظر کوئی دوسری عمارت نہ تھی۔ وہ اس طرح چمکتی تھی جیسے چودھویں کی رات چاند چمکتا ہے۔ جب تعمیر وتزیین کا سلسلہ مکمل ہو گیا تو آپ نے بنی اسرائیل کے علماء کو اکٹھا کیا اور انہیں بتایا کہ یہ گھر خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے بنایا گیا ہے اور اس میں ہر چیز خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جس دن آپ اس عظیم کام سے فارغ ہوئے تو اس دن کو بطور عید منایا(1)۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو آپ نے رب کریم کی بارگاہ سے تین چیزوں کا سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عطا فرمادیں اور مجھے امید ہے کہ تیسری چیز بھی اس کو عطا فرمادی ہوگی۔ پہلی درخواست یہ تھی کہ وہ ایسا فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو پُر از حکمت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمنا پوری فرمادی۔ دوسری گزارش یہ کی کہ انہیں ایسی بادشاہی عطا کی جائے جو کسی غیر کو پھر کبھی میسر نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خواہش بھی قبول فرمالی۔ تیسری عرض یہ کہ جو اس مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرے وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جائے جیسے بچہ اس دن گناہوں سے پاک ہوتا ہے جس دن والدہ اسے جنم دیتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز بھی عطا کر دی ہوگی۔ علامہ بغوی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے(2)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا انسان کی اپنے گھر میں نماز ایک نماز کا ثواب رکھتی ہے اور مسجد قبا میں پچیس نمازوں کا ثواب رکھتی ہے۔ اور جامع مسجد میں ایک نماز پانچ سو نمازوں کا ثواب رکھتی ہے۔ اور مسجد اقصیٰ کی ایک نماز ہزار نمازوں کا ثواب رکھتی ہے اور میری مسجد کی ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کا ثواب رکھتی ہے اور مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کا ثواب رکھتی ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ثواب کی کثرت کی نیت سے سفر نہ کرو مگر تین مساجد کی طرف ثواب کی زیادتی کی نیت سے سفر کرو۔ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد۔ (بخاری، مسلم)

مسئلہ: کیا سونے اور چاندی یا اس جیسی دوسری چیزوں سے مساجد کی آرائش اور تزیین جائز ہے یا نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں مسجد کی آرائش اور تزیین مکروہ ہے کیونکہ اس میں مال کا ضیاع ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے مساجد کو پختہ کرنا کتنا برا ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا مساجد کی ضرور آرائش ہوگی جیسا کہ یہود نے اپنے عبادت

علماء فرماتے ہیں تزیین و آرائش کرنا قربت ہے کیونکہ اس میں مسجد کی تعظیم ہے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیت المقدس کی مسجد کی تزیین کرنا اس قول کی تائید کرتا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں مسجد کی تزیین اور آرائش اس وقت جائز ہے جب کوئی اپنے مال سے خرچ کر کے ایسا کرے۔ مسجد کے متولی کے لئے صرف اتنا جائز ہے کہ وہ مسجد کی مضبوطی کے لئے وقف مال سے خرچ کرے۔ تزیین و آرائش اور زیب و زینت کے لئے خرچ نہ کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو ضامن ہوگا۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ مسجد کی آرائش پر خرچ کرنے کی بنسبت فقیر کو مال دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک مسجد میں گچ، ساج اور سونا کے پانی کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علماء کا لاباس (کوئی حرج نہیں) فرمانا اشارہ ہے کہ مسجد کی تزیین پر خرچ کرنے سے اجر نہیں ملے گا لیکن خرچ کرنے سے گنہگار بھی نہ ہوگا، ہدایہ میں اسی طرح لکھا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کراہت باریک باریک نقش و نگار بنانے میں ہے خصوصاً محراب میں دقیق نقوش بنانا مکروہ ہے یا کراہت اس صورت میں ہے کہ تزیین تو کی جائے لیکن نماز ترک کی جائے۔ یا تزیین تو ہو لیکن حقوق مسجد ادا نہ کئے جائیں مثلاً لوگ مسجد میں دنیا کی باتیں کرتے ہوں اور آوازوں کو بلند کرتے ہوں۔ جیسا کہ سرکار کی حدیث میں اشارہ ہے" کہ انکے دل ایمان سے خالی ہیں" میں کہتا ہوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کو تزیین مسجد کے لئے دلیل بنانے سے نبی کریم ﷺ کی حدیث کی اتباع بہتر ہے کیونکہ سابقہ شریعتوں پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ لیکن جب ہماری شریعت میں سابقہ کسی شریعت کے حکم کے مخالف کوئی قول نہ ہو تو پھر سابقہ شریعت کے حکم پر عمل کرنا جائز ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا مسجد کی تزیین کرنا ایک خاص غرض پر مبنی تھا اور وہ غرض یہ تھی کہ شیطان اس کام میں مصروف رہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی انہیں فرصت ہی نہ ملے۔ واللہ اعلم۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں مؤرخین فرماتے ہیں کہ بیت المقدس حضرت سلیمان کی بنیادوں پر قائم رہا اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوا حتی کہ بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا اور شہر کو توڑ پھوڑ دیا اور مسجد کے نقش و نگار کو بھی اکھیڑ دیا اور جو کچھ اس کی چھت اور دیواروں پر قیمتی جواہر و موتی اور سونا، چاندی لگا تھا وہ سب اٹھا کر ساتھ لے گیا۔ اس وقت اسکا دار الخلافہ عراق تھا۔

یمن میں جنوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے بڑے عظیم الشان پتھروں سے قلعے تیار کئے تھے(1)۔

تماثیل جنوں کا ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ تانبے، پیتل، شیشے اور سنگ مرمر سے بت اور مجسمے بناتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ درندوں اور پرندوں کے مجسمے بناتے تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ وہ مساجد میں ملائکہ، انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام اور نیک لوگوں کی تصویریں اور مجسمے بناتے تھے تاکہ لوگ انہیں دیکھیں اور ان کے شوق عبادت میں اضافہ ہو۔ مصوری ان کی شریعت میں مباح تھی۔ میں (مفسر) کہتا ہوں شاید تماثیل سے مراد غیر ذی روح کی تصاویر ہوں (جو ہماری شریعت میں بھی جائز ہیں) کیونکہ انسان کے بت اور مجسمے کی عبادت تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے بھی کی جاتی تھی مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۔

صحیحین میں ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہر مصور آگ میں ہوگا(2)۔

[illegible] کی تصویر بنایا کرے(3)۔ اس حدیث کو بخاری

نسخ اور تبدیلی کا احتمال نہیں رکھتی۔ حضرت ابن عباس سے مرفوع روایت ہے کہ جو شخص کوئی تصویر بنائے گا اسے عذاب دیا جائے گا اور اسے قیامت کے روز اس تصویر میں روح پھونکنے پر مجبور کیا جائے گا اور وہ اس میں روح نہیں پھونک سکے گا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے روز ایک گردن نکلے گی جس کی دو آنکھیں ہونگی جو دیکھ رہی ہوں گی۔ دو کان ہوں گے جو سن رہے ہوں گے۔ اور زبان ہوگی جو بول رہی ہوگی وہ کہے گی، مجھے تین قسم کے آدمیوں پر مسلط کیا گیا ہے۔ (1) ظالم جابر۔ (2) جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو الٰہ پکارتا ہے۔ (3) مصورین (2)۔

اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو میری تخلیق کی مثل تخلیق کرنے کی (ناکام) کوشش کرتا ہے' وہ چیونٹی پیدا کریں' دانہ پیدا کریں' جو پیدا کریں(3) (وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ ان احادیث کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تصویر کی حرمت اس امت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ حرمت سب امتوں کیلئے ہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی تو مٹی سے مجسمے بناتے تھے کیونکہ آپ کا صورتیں بنانا باذن الٰہی تھا کان **يخلق من الطين كهيئة الطير فينفخ فيه طيراً باذن الله**۔

تصویر بنانا اس کے لئے حرام ہے جو اس میں روح پھونکنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اسے قیامت کے روز اس تصویر میں روح پھونکنے پر مجبور کیا جائے گا لیکن وہ اس میں پھونک نہیں سکے گا۔

ے **جفنة** کی جمع جفان ہے اور اس کا معنی بڑے بڑے پیالے ہیں۔ جواب' جابية کی جمع ہے۔ جس کا معنی بڑا حوض ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے، یہ جبی **الخراج** سے مشتق ہے۔ بڑے حوض کو جابیہ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں پانی جمع ہوتا ہے۔ یہ صفات غالبہ میں سے ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں وہ پیالے اتنے بڑے تھے کہ ایک پیالہ سے ہزار آدمی بیک وقت کھاتے تھے(4)۔ ابن کثیر نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں یاء کے اثبات کے ساتھ **الجوابی** پڑھا ہے' ورش اور ابوعمرو نے صرف وصل کی صورت میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے **قدور راسيات** سے مراد بڑی بڑی بھاری بھرکم دیگیں ہیں جو جسامت اور بڑائی کی وجہ سے اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں جا سکتی تھیں اور سیڑھیوں کے ذریعے ان کے اوپر چڑھا جاتا تھا اور یہ سب چیزیں یمن میں تھیں۔

ے ہم نے داؤد اور آل داؤد کو حکم دیا کہ ہماری ان بے شمار نعمتوں پر شکر ادا کرو۔ شکراً پر تنوین' قلت بیان کرنے کے لئے ہے کیونکہ کثرت سے شکر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں کم ہے اور تمام نعمتوں کا شکر بشری طاقت سے وراء ہے۔ بلکہ ساری مخلوق بھی شکر کی صحیح ادائیگی سے قاصر ہے۔ شکراً یا تو مفعول لہ کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یعنی میری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لئے میری اطاعت میں اعمال کرو۔ یا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ طاعت کا عمل بھی شکر ہے۔ یا مصدر کی صفت کے اعتبار سے منصوب ہے۔ یعنی **اعملوا عملا شكراً**۔ یا حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یعنی شکر کرتے ہوئے نیک اعمال کرو۔ یا مفعول بہ کی حیثیت منصوب ہے یعنی **اعملوا عملا شكراً** (شکر ادا کرو) جعفر بن سلیمان کہتے ہیں میں نے ثابت کو یہ فرماتے سنا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے رات دن کے اوقات کو ...

داؤد کا کوئی فرد عبادت میں مصروف نہ ہو(1)۔

5 حمزہ نے عبادی کو یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ شکور وہ شخص ہوتا ہے جو زبان اور جوارح کے ساتھ اکثر اوقات شکر کرتا ہے اور دل کے ساتھ ہمیشہ شکر میں مصروف رہتا ہے۔ اور یہ کیفیت دل کے فناء ہونے اور دوام حضوری کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس فنائیت اور استغراقیت کے باوجود شکر کا حق ادا نہیں ہوسکتا کیونکہ شکر کی توفیق بھی ایک نعمت ہے اس کے لئے پھر شکر کرنا ضروری ہے۔ گویا یہ سلسلہ لاالی نھایۃ تک چلا جاتا ہے اسی لئے علماء فرماتے ہیں شکور وہ ہے جو اپنے آپ کو شکر کی ادائیگی سے عاجز سمجھے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿١٤﴾

"پس جب ہم نے سلیمان پر موت کا فیصلہ نافذ کر دیا1 نہ پتہ بتایا جنات کو آپ کی موت کا مگر زمین کے دیمک نے جو کھاتا رہا آپ کے عصا کو پس جب آپ زمین پر آ رہے تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کو جانتے ہوتے تو (اتنا عرصہ) نہ رہتے اس رسوا کن عذاب میں 2۔"

1 قَضَيْنَا کا معنی حکمنا ہے، یعنی ہم نے فیصلہ کیا۔ علیہ کی ضمیر سے مراد سلیمان علیہ السلام ہیں۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ اہل علم فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس میں ایک سال یا دو سال یا ایک ماہ یا دو ماہ یا اس سے کم وبیش عرصہ کے لئے گوشہ نشین ہو جاتے تھے، آپ کے لئے کھانا اور پانی بھی وہاں پہنچایا جاتا تھا۔ پس ایک دفعہ آپ اپنی عبادت گاہ میں داخل ہوئے اور باہر نہ آئے، اندر ہی آپ کا وصال ہو گیا۔ اس سلسلہ کا آغاز اس طرح ہوا کہ ہر صبح بیت المقدس میں جہاں آپ عبادت میں مصروف رہتے تھے ایک بوٹی پیدا ہو جاتی۔ آپ اس بوٹی سے اس کا نام پوچھتے اور اس کا فائدہ پوچھتے تو وہ اپنا نام اور اپنی خاصیات بتا دیتی۔ پھر اگر وہ لگانے والی بوٹی ہوتی تو آپ اسے زمین میں لگوا دیتے۔ اور اگر وہ دواء کیلئے استعمال ہونے والی ہوتی تو آپ لکھ لیتے۔ حتیٰ کہ خروبہ کا درخت اگا۔ آپ نے پوچھا تو کون سا درخت ہے؟ اس نے کہا خروبہ (املتاس) پھر آپ نے پوچھا تو کس لئے پیدا ہوا ہے؟ اس نے کہا آپ کی مسجد کو خراب کرنے کے لئے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا اللہ کریم کی یہ شان نہیں کہ میری زندگی میں اس مسجد کو بے آباد کر دے۔ تو ہے وہ جس کی وجہ سے میری ہلاکت ہوگی اور بیت المقدس کی خرابی ہوگی۔ آپ نے اسے اکھیڑا اور اپنے باغ میں لگا دیا۔ اور پھر دعا فرمائی اے اللہ جنوں پر میری موت کو پوشیدہ رکھ تاکہ انسانوں کو معلوم ہو جائے کہ جن غیب نہیں جانتے۔ جن یہ لافیں مارتے تھے کہ ہم غیب کا علم رکھتے ہیں یا جو کچھ کل ہونا ہے اسے بھی جانتے ہیں۔ اس کے بعد آپ اپنی عبادت گاہ میں داخل ہوئے اور عصا پر سہارا لے کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ آپ کا کھڑے کھڑے انتقال ہو گیا۔ آپ کی عبادت گاہ کے آگے پیچھے روشندان تھے۔ کٹھن اور مشقت طلب کاموں میں جو جن آپ کی زندگی میں مصروف تھے، روشندانوں سے دیکھتے تو یہ گمان کرتے کہ آپ زندہ ہیں۔ انہوں نے آپ کی نماز کی طوالت اور لوگوں کی طرف باہر نہ آنے کو عجیب نہ سمجھا اور آپ کے وصال کے بعد بھی اپنے اپنے کاموں میں جتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ

جنوں نے دیمک کا شکر یہ ادا کیا۔ اور وہ اب بھی لکڑی کے خول میں دیمک کے لئے پانی اور مٹی لاتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ابن یزید سے روایت کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا کہ جب تجھے میری روح قبض کرنے کا حکم ملے تو کچھ عرصہ پہلے مجھے آگاہ کرنا۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے کہا اے سلیمان مجھے تیری روح قبض کرنے کا حکم مل گیا ہے۔ اب تھوڑا عرصہ باقی ہے۔ حضرت سلیمان نے تمام جنوں کو اکٹھا کیا اور انہیں حکم دیا کہ ان پر شیشے کا کمرہ بنادو' جس کا دروازہ نہ ہو۔ آپ اس کے اندر اعصا پر ٹیک لگا کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ اسی حالت میں آپ کی روح قبض ہو گئی (1)۔ لیکن آپ اسی حالت میں کھڑے رہے۔ حتیٰ کہ دیمک عصا کو کھا گئی اور آپ گر پڑے۔ انہوں نے وہ شیشہ کا کمرہ کھولا اور آپ کی موت کا وقت جاننے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے عصا پر دیمک کو رکھا اور ایک دن اور ایک رات میں جتنا اس نے عصا کو کھایا۔ اس سے انہوں نے حساب لگایا' اس اندازہ سے پتہ چلا کہ آپ ایک سال سے وصال فرما چکے ہیں۔

۲۔ دلھم میں ھم ضمیر سے مراد جن یا سلیمان علیہ السلام کی آل ہے' دابۃ الارض کو فارسی میں دیوک کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا کیڑا ہے جو لکڑی کو کھا جاتا ہے۔ اور الارض سے مراد گیلی مٹی ہے۔ دابۃ کو الارض کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الارض' ارضت الخشبۃ کا مصدر ہے یعنی لکڑی کو دیمک کھا گئی۔ یہ کسی شی کو اپنے فعل کی طرف مضاف کرنے کے قبیل سے ہے' جیسے بقرہ الحرث اور رجل الحرب میں اسم کو فعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ تاکل' دابۃ الارض سے حال ہے۔ منسأۃ کا معنی عصا ہے' اور یہ نسأت الغنم سے مشتق ہے جس کا معنی بکریوں کو ہانک کر لیجانا ہے۔ اسی سے نساء اللّٰہ فی اجلہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر میں تاخیر فرمائی۔ نافع اور ابوعمرو نے منساۃ میں ہمزہ کی جگہ الف ساکن پڑھا ہے۔ اور ابن ذکوان نے ہمزہ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اصل پر ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ تاکل کا مفعول ہے اور حمزہ جب وقف کرتے ہیں تو اسے بین بین پڑھتے ہیں۔ خو کا معنی گرنا ہے، یعنی جب سلیمان علیہ السلام زمین پر گر پڑے تو جنوں پر ظاہر ہوا۔ ان مخففہ من مثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ عذاب مھین سے مراد مشقت طلب کام ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو چکا تھا لیکن وہ آپ کو زندہ گمان کر رہے تھے۔ اَنَّ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر الجن سے بدل اشتمال ہے، یعنی لوگوں پر ظاہر ہو گیا کہ جنوں کو غیب کا علم نہیں ہے کیونکہ وہ پہلے انسانوں پر مسائل کو مشتبہ کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ان کا پول کھول دیا۔ اور اس طرح لوگوں کو انکی ڈینگوں کا علم ہو گیا۔ اسی مفہوم کی تائید حضرت ابن مسعود اور ابن عباس کی قراءت کرتی ہے تبینت الانس۔ یعنی انسانوں کو پتہ چل گیا کہ اگر جن غیب جانتے ہوتے تو اس تکلیف میں مبتلا نہ رہتے۔ بعض علماء نے آیت کا یہ معنی لکھا ہے کہ جنوں نے جان لیا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے الخ یہ تاویل انتہائی غریب اور بعید ہے کیونکہ جن اپنی جہالت تو جانتے تھے لیکن انسانوں کے سامنے وہ اپنی علمیت کا دعویٰ کرتے تھے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی عمر ترپن سال تھی اور بادشاہی کی مدت چالیس سال تھی۔ آپ جب بادشاہ بنے تو آپ کی عمر تیرہ سال تھی۔ اور بادشاہ بننے کے چار سال بعد بیت المقدس کی تعمیر کا آغاز فرمایا تھا (2)۔

ابن ابی حاتم نے علی بن رباح سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مجھے ایک شخص نے بتایا کہ فروہ بن مسیک الغطفانی بارگاہ رسالت

جائیں کیا وہ انکار کریں تو میں ان سے جنگ کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ابھی تک مجھے انکے متعلق کوئی حکم نہیں ملا ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾

''قوم سبا کے لئے ان کے مسکن میں ہی نشانی موجود تھی (وہاں) دو باغ تھے ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف[1] کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو[2] اتنا پاکیزہ شہر اور ایسا رب غفور! (اہل سبا! تمہاری خوش بختی کا کیا کہنا)[3]''

[1] یعنی قوم سبا کے مسکن میں ایک ایسی نشانی تھی جو ہماری قدرت کے کمال اور ہمارے شکر کے وجوب کی دلیل تھی۔ البزی اور ابوعمرو نے سبا کو بغیر تنوین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ قبیلہ کا نام ہے اور غیر منصرف ہے اور اس میں دو سبب تانیث اور علمیت ہیں۔ قنبل نے وقف کی نیت سے ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تنوین کے ساتھ مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ آدمی کا نام ہے۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے مَسْكَنِهِمْ کو سین کے سکون اور بغیر الف کے مفرد کا صیغہ پڑھا ہے لیکن حمزہ اور حفص قیاس کے مطابق کاف کو فتحہ دیتے ہیں اور کسائی کسرہ دیتے ہیں ان الفاظ پر محمول کرتے ہوئے جو خلاف قیاس آتے ہیں جیسے مسجد مطلع وغیرہ۔ باقی قراء نے سین کے فتحہ اور الف کے ساتھ جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں، ابوسبرہ نخعی، فردہ بن مسیک الغطیفی سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ! سبا کے متعلق ارشاد فرمائیے وہ مرد تھا یا عورت تھی یا کسی جگہ کا نام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ عربوں میں سے ایک مرد تھا جس کے دس بیٹے تھے، ان میں سے چھ یمن میں سکونت پذیر تھے اور چار شام میں آباد تھے۔ جو یمن میں تھے ان کے نام یہ ہیں 1۔ کندہ 2۔ اشعریوں 3۔ ازد 4۔ مذحج 5۔ انمار 6۔ حمیر۔ ایک شخص نے پوچھا انمار کون تھے؟ فرمایا جن میں سے خثعم اور بجیلہ ہیں۔ اور وہ چار جو شام میں آباد تھے ان کے نام یہ ہیں۔ 1۔ عاملہ 2۔ جذام 3۔ لخم 4۔ غسان۔ اسی طرح احمد وغیرہ نے ابن عباس سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ سبا کا نسب اس طرح ہے سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان (1)۔ جنتان۔ آیة سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے آلایة جنتان۔ اور جنتان سے بہت سے باغات مراد ہیں۔ یعنی شہر کی دائیں جانب بھی باغات تھے اور بائیں جانب بھی باغات تھے یا یہ معنی کہ ہر شخص کا اپنے مسکن اور رہائش کے دائیں بائیں ایک ایک باغ تھا۔

[2] ان کو نبی کے ذریعے یہ کہا گیا کہ ان باغات کے پھلوں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق دیا ہے اس سے کھاؤ اور جو نعمتیں تمہیں میسر ہیں ان پر اس منعم حقیقی کا شکر ادا کرو۔ یا دلالت حال تقاضا کر رہی تھی کہ انہیں شکر کرنے اور ان باغات سے پھل کھانے کو کہا گیا ہے۔

[3] یا تو یہ مستقل کلام ہے اور شکر کے موجب پر دلالت کرتی ہے، یعنی تمہارا یہ شہر بہت پاکیزہ ہے اسمیں ان گنت پھل ہیں اور اس کی زمین شورزدہ نہیں ہے۔ سدی اور مقاتل فرماتے ہیں کہ ایک عورت ٹوکرا سر پر رکھ کر باغات کے اندر سے گزرتی تو وہ ٹوکرا خود بخود مختلف

جوئیں خود بخود مرجاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بلدة طیبة سے مراد فضاء اور ہوا کی پاکیزگی ہے (1)۔ رب غفور کے متعلق مقاتل فرماتے ہیں وہ رب گناہوں پر قلم عفو پھیرنے والا ہے۔ اگر تم اس کی ادا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرو (2)۔ وہب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سبا کی طرف تیرہ انبیاء کرام مبعوث فرمائے تھے۔ ہر ایک نے انہیں دعوت توحید دی اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں انہیں یاد دلائیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انہیں ڈرایا (3) (لیکن)

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ سَیْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَیْهِمْ جَنَّتَیْنِ ذَوَاتَیْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ ﴿۱۶﴾

"پھر انہوں نے منہ پھیر لیا تو ہم نے ان پر تند و تیز سیلاب بھیج دیا۔ اور ہم نے بدل دیا ان کے دو باغوں کو ایسے دو باغوں سے جن کے پھل ترش اور کڑوے تھے اور ان میں جھاؤ کے بوٹے اور چند بیری کے درخت تھے۔"

لے اس ناشکری قوم نے انبیاء کرام کی روشن تعلیمات سے اعراض کیا اور انہیں جھٹلا دیا اور کہنے لگے ہمارے پاس جو کچھ سامان داد و عیش موجود ہے یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی نعمت نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی محنت اور کوشش کا ثمر ہے۔ انبیاء کرام کو کہنے لگے اگر یہ تمہارے رب کی عطا ہے تو اسے کہو کہ طاقت ہے تو ہم سے یہ نعمتیں روک لے۔ اس گستاخانہ رویہ پر اللہ تعالیٰ نے ان پر تند و تیز سیلاب بھیج دیا۔ العرم کا معنی مشکل ہے اور یہ عرم الرجل سے مشتق ہے جس کا معنی یہ کہ اس کا خلق برا ہے اور سخت ہے' یا عرم سے مراد شدید بارش ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر سرخ پانی کا سیلاب بھیج دیا تھا۔ بعض فرماتے ہیں العرم کا معنی وادی ہے۔ اس کی اصل العرامہ ہے جس کا معنی شدت اور قوت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی پانی کو روکنے کا بند ہے' بعض فرماتے ہیں اس کا معنی جنگلی چوہا ہے اور سیل کو اس کی طرف مضاف اس لئے کیا گیا کیونکہ چوہے نے اس بند میں سوراخ کیا تھا جو بلقیس نے لوگوں کی صلاح کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ قاموس میں ہے عرمہ' فرحة کے وزن پر ہے' اور اس سے مراد وہ بند ہے جو وادی کے سامنے بنایا جاتا ہے اور اس کی جمع عرم ہے یا یہ ایسی جمع ہے جس کا واحد نہیں ہے' یا اس سے مراد پانی کے وہ ذخیرے ہیں جو وادی کے اندر مختلف مقامات پر بنائے جاتے ہیں یا اس کا معنی جنگلی چوہا ہے۔ یا تیز بارش ہے یا وادی ہے۔ یہاں ہر معنی مراد ہو سکتا ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں ابن عباس' اور ابن وہب وغیرہما نے فرمایا عرم سے مراد وہ بند ہے جو ملکہ بلقیس نے تعمیر کرایا تھا اور اس کا سبب یہ ہوا کہ لوگ وادی کے پانی پر جنگ و جدل کرتے تھے۔ تو ملکہ بلقیس نے فساد کو دور کرنے کے لئے ایک ڈیم (بند) تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ دو پہاڑوں کے درمیان بڑی بڑی چٹانوں اور تارکول کے ذریعے بند بنایا گیا تھا۔ اوپر نیچے اس کے تین دروازے تھے، اس کے نیچے ایک بہت بڑا تالاب تھا جس سے بارہ نہریں نکالی گئیں تھیں۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کے گیٹ کھولتے اور بند کرتے تھے جب بارش ہوتی تو یمن کی ساری وادی کا پانی اس ڈیم میں جمع ہو جاتا تھا اور پہلے ضرورت کے مطابق اوپر والا گیٹ کھولا جاتا جس سے ڈیم کا پانی نیچے والے تالاب میں پہنچتا اور وہاں سے حسب ضرورت نہروں میں پانی چھوڑا جاتا پھر جب پانی کی سطح کم ہوتی تو دوسرا گیٹ کھولا جاتا پھر جب پانی مزید کم ہوتا تو نیچے والا گیٹ کھولا جاتا۔ پانی اتنا جمع ہوتا تھا کہ پورے سال کی ضروریات

پر چلنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے راہ روی اور کفران نعمت کی پاداش میں ان کو تباہ کرنے کے لئے ان پر ایک جنگلی چوہا مسلط کر دیا۔ اس نے نیچے سے اس ڈیم میں سوراخ کر دیا جس کی وجہ سے پانی باغات اور فصلوں میں سیلاب کی طرح بکھر گیا اور ساری زمین کی زرخیزی اور سبزی کو ضائع کر دیا(1)۔

وہب فرماتے ہیں ان کے اپنے کاہنوں نے بتایا تھا کہ ان کے بند کو ایک چوہا توڑ دے گا تو انہوں نے ہر دو پتھروں کے درمیان ایک بلی باندھ دی تھی تاکہ چوہے کوئی سوراخ نہ کر سکیں۔ جب قدرت خداوندی نے ان کو غرق کرنے کا فیصلہ فرمایا اور ان کے غرق ہونے کا وقت پہنچ گیا تو ایک بڑا سرخ رنگ کا چوہا آیا اور اس نے بلیوں پر حملہ کر دیا' بلیاں ڈر کے مارے پتھروں کے اندر چھپ گئیں اور اس طرح وہ چوہا ایک سوراخ کے اندر داخل ہوا اور اس بند کو اندر سے کھودنا شروع کر دیا حتی کہ وہ بند کمزور ہو گیا، جبکہ انہیں اس خفیہ تدبیر کا علم نہ تھا۔ جب بارشوں کا پانی آیا تو وہ اس سوراخ میں داخل ہو گیا حتی کہ اس بارشی پانی کی کثرت کی وجہ سے بند ٹوٹ گیا اور ہر چیز کو تنکوں کی طرح بہا کر لے گیا اور ان کے گھروں اور محلوں کو ریت میں دفن کر دیا۔ وہ سب کے سب غرق ہو گئے اور ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ اور ان کی جمعیت مختلف علاقوں میں تتر بتر ہو گئی۔ حتی کہ وہ عرب میں ضرب المثل بن گئے۔ عرب کہتے **صار هو فلان ايدى سبا او ايادى سبا** یعنی فلاں قبیلہ اس طرح بکھر گیا جس طرح قوم سبا کو راستوں نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ **فارسلنا عليهم سيل العرم** کا یہی مفہوم ہے۔ حمیر کی لغت میں بند کو عرم کہتے ہیں(2)۔

ع۔ نافع اور ابن کثیر نے کاف کے سکون کے ساتھ ''اُكُل'' پڑھا ہے اور باقی قراء نے کاف کے ضمہ کے ساتھ ''اُكُل'' پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ قاموس میں ہے **الاكل بالضم وبالضمتين الثمر والرزق**۔ یعنی صرف ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہو یا ہمزہ اور کاف دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہو دونوں کا معنی پھل اور رزق ہے۔ جمہور نے اُكُلِ پڑھا ہے اور ابو عمرو نے اس کو خمط کی طرف مضاف کیا ہے۔ جمہور کی قرأت پر **خمط**، اکل کی صفت ہے۔ اور اس کا معنی ترش یا کڑوا ہے یا خمط' اکل کا عطف بیان یا بدل ہے اور اس کا معنی پیلو کا پھل ہے اور ابو عمرو کی قراءت پر ہر وہ بوٹی مراد ہو گی جس کا ذائقہ کڑوا ہو۔ یا پیلو کا درخت اور اس جیسا کوئی اور درخت مراد ہے' اور یہ لفظ مشترک ہے۔ قاموس میں الخمط کے معانی لکھے ہیں ہر چیز کا کڑوا یا ترش حصہ اور ہر بوٹی جس کا ذائقہ کڑوا ہو(3)۔ ایسا درخت جس کی بوبیری کی طرح ہو' ایک قاتل درخت۔ ہر ایسا درخت جس کے کانٹے نہ ہوں۔ پیلو کا پھل۔ بعض نے اس کا معنی پیلو کا درخت لکھا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں تقدیر کلام اس طرح ہے **اُكُل اكل خمط**، مضاف کو حذف کیا گیا اور مضاف الیہ کو بدل یا عطف بیاں ہونے میں مضاف کے قائم مقام رکھا گیا(4)۔ یہ ترکیب اس وقت ہو گی جب جمہور کی قراءت کا اعتبار کیا جائے اور خمط سے درخت مراد لیا جائے۔ امام بغوی نے اکل کا معنی پھل اور **خمط** کا معنی پیلو اور اس کا پھل لکھا ہے جسے بریر کہا جاتا ہے۔ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ مبرد کہتے ہیں خمط سے ہر وہ بوٹی مراد ہے جس کا ذائقہ کڑوا ہو۔ ابن الاعرابی فرماتے ہیں اس درخت کا پھل مراد ہے جسے **فسوة الضبع** کہا جاتا ہے، یہ خشخاش کی شکل میں ہوتا ہے اور خود بخود جھڑ جاتا ہے۔ اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا

ہیں اثل ایک درخت ہے جو جھاؤ کے مشابہ ہوتا ہے لیکن اس سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ سدر کی صفت قلیل ذکر فرمائی کیونکہ یہ بیری کا عمدہ درخت ہے اور اس کا پھل بھی اچھا ہے' اسی وجہ سے باغات میں اسے لگایا جاتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں سدر سے مراد وہ عمدہ بیری کا درخت نہیں ہے جو باغات میں لگایا جاتا ہے بلکہ یہ جنگلی بیر ہے جو کسی کام میں مفید نہیں ہوتی اور نہ اس کے پتے کسی ضرورت میں کام آتے ہیں(۱)۔ پھلدار باغوں کے مقابلہ میں ترش درختوں اور چند بیری کے درختوں کو بھی جنتین فرمایا ہے تو یہ مشاکلت کے طور پر ہے (مشاکلہ بلاغت کا ایک قاعدہ ہے کہ جس میں ایک کام کی سزا کو بھی اس کام کے الفاظ میں تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسے ارشاد ہے جزاء سیئة سیئة) نیز یہ ان سے استہزاء کرنے کے لئے کہا ہے۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۗ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾

''یہ بدلہ دیا ہم نے انہیں بوجہ ان کی احسان فراموشی کے اور بجز احسان فراموش کے ہم کسے ایسی سزا دیتے ہیں ۱ ''

۱ ذالک مفعول مطلق کی حیثیت سے محل نصب میں ہے یا مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور مابعد کلام اس کی خبر ہے۔ اور ذالک سے مراد عقاب اور بدلہ دینا ہے۔ ان کے کفر سے مراد یا تو کفران نعمت ہے' یا رسولوں کی تکذیب ہے۔ حفص' حمزہ اور کسائی نے نجازی کو نون اور زاء کے کسرہ کے ساتھ متکلم معروف پڑھا ہے اور کفور پر مفعولیت کی بناء پر نصب پڑھی ہے، جبکہ باقی قراء نے یجازی' یعنی یاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور الکفور کو نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دیا ہے۔ یعنی مناقشہ صرف ایسے ناشکرے شخص سے ہوگا۔ متکلم کے صیغہ کی صورت میں یہ معنی ہوگا کہ ہم مناقشہ صرف ایسے ناشکرے اور احسان فراموش سے کریں گے۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ۗ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿۱۸﴾

''اور ہم نے بسا دی تھیں ان کے درمیان اور ان شہروں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی اور کئی بستیاں سر راہ اور ہم نے منزلیں مقرر کر دی تھیں ان میں آنے جانے کی ۱۔ سیر و سیاحت کرو ان میں (جب چاہو) رات یا دن کے وقت امن و امان سے ۲۔''

۱ جَعَلْنَا کا عطف بدلنا پر ہے۔ اگرچہ عیش و نشاط کا سلسلہ اور زمانہ تبدیلی سے پہلے کا ہے لیکن یہاں تبدیلی کے بعد ان کے عیش و آرام کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں واو مطلق جمع کے لئے ہے، ترتیب کے لئے نہیں ہے۔ اس لئے اس اسلوب میں کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے بینھم میں ھم ضمیر کا مرجع اہل سبا ہیں۔ بارکنا فیھا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ان بستیوں میں نہریں جاری کی تھیں اور پھل دار درخت اگائے تھے۔ ان بستیوں کے مکینوں کو خوشحال بود و باش عطا فرمائی تھی، ان بستیوں سے مراد شام کی بستیاں ہیں۔ قریٰ ظاھرۃً سے مراد یہ ہے کہ ہر بستی دوسری کے قریب ہونے کی وجہ سے' آمنے سامنے تھی۔ ان بستیوں میں سفر کی منزلیں مقرر تھیں۔ جب وہ چلتے تو رات ایک بستی میں گزارتے تو قیلولہ دوسری بستی میں کرتے۔ انہیں سفر میں زاد راہ ساتھ لے جانے کی بھی زحمت نہ اٹھانا پڑتی تھی (ہر بستی میں آرام و سکون اور خورد و نوش کے لئے سرائیں اور شاندار ہوٹل اور ریسٹورنٹ موجود تھے)
بعض

چرخہ (تکلا) ہاتھ میں لئے اور ٹوکرا سر پر اٹھائے گزرتی تو اپنے چرخہ کے ساتھ ان آبادیوں کو طے کرتی اور ابھی سفر مکمل نہیں ہوا ہوتا تھا کہ ٹوکرا خود بخود مختلف پھلوں سے بھر جاتا تھا۔ یمن اور شام کے درمیان سارا راستہ اسی طرح پھلدار درختوں سے آباد تھا (1)۔

۲؎ یعنی ہم نے انہیں حکم دیا کہ ان بستیوں میں بلاخوف دن رات سیر و سیاحت کرو۔ یا زبان حال سے کہا تم ان میں بلا روک ٹوک صبح و شام سیر و تفریح کرو کیونکہ جب ان کو سیر و سیاحت پر قدرت دی گئی تو گویا انہیں ان میں سیاحت کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی یہاں سفر جب چاہو کرو، صبح و شام کی کوئی پابندی نہیں ہے، رات ہو یا دن ایسا ماحول بنا دیا گیا ہے کہ نہ کسی ڈاکو کا خطرہ ہے اور نہ کسی ڈنڈے کا۔ نہ بھوک کا اندیشہ ہے اور نہ پیاس کا۔ لیکن کم ظرفوں کو نعمتوں کی یہ بھرمار راس نہ آئی سرکشی اور ناشکری کرنے لگے اور کہنے لگے اگر ہماری یہ سفر کی منزلیں کچھ مسافت پر ہوتیں تو زیادہ مناسب تھا۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

"پھر وہ بولے اے ہمارے رب! دور دراز کر دے ہماری مسافتوں کو (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ پس ہم نے انہیں افسانہ بنا دیا اور ہم نے ان (کی جمعیت) کو پارہ پارہ کر دیا (سبا کی اس داستان) میں عبرت کی نشانیاں ہیں ہر بہت صبر بہت شکر کرنے والے کے لئے ۲؎۔"

۱؎ قالوا کا عطف جعلنا پر ہے، ابن کثیر، ابو عمرو اور ہشام نے باعد کو بعّد یعنی عین کی تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے الف کے ساتھ باب مفاعلہ سے پڑھا ہے۔ یعنی انہوں نے یہ دعا کی کہ ہمارے درمیان اور شام کے درمیان سنسان صحراء اور چٹیل میدان بنا دے تاکہ ہم سواریوں پر سفر کریں اور زادِ راہ ساتھ لے جائیں اور تجارت میں نفع اٹھائیں اور لوگوں پر فخر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمالی (اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات اور قابل نظارہ سرسبز و شاداب مناظر قدرت نے فوراً ختم کر دیئے) یعقوب نے ربنا کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اور بعد کو عین اور دال کے فتحہ کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے گویا انہوں نے شرارۃً اور تکبراً ان منازل کے اتنے قریب ہونے کے باوجود ان کی دوری کا شکوہ کیا۔ ظلموا کا عطف قالوا پر ہے۔ فجعلناهم احادیث یعنی ہم نے ان کی عظمت وار جمندی کو قصہ پارینہ بنا دیا۔ لوگ فقط ان کا اظہار تعجب کے لئے تذکرہ کرتے ہیں اور بطور ضرب المثل ان کا نام استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں تفرقوا ایدی سبا یعنی کہتے ہیں فلاں قوم اس طرح بکھر گئی اور پارہ پارہ ہو گئی جیسے قوم سبا کو راستوں نے ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا تھا۔ کل ممزق مفعول مطلق ہے، یعنی ہم نے ان کی جمعیت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور ان کو پوری طرح تتر بتر کر دیا ہے۔ شعبی فرماتے ہیں جب قوم سبا کی بستیاں غرقاب ہو گئیں تو وہ مختلف ممالک میں بکھر گئے، قبیلہ غسان شام میں، قبیلہ ازد عمان میں، خزاعہ تہامہ میں اور خزیمہ عراق میں آباد ہو گیا۔ اوس و خزرج مدینہ چلے گئے (2)۔ اوس و خزرج آل انمار ہیں، سب سے پہلے ان کا بزرگ جو مدینہ پہنچا تھا وہ عمرو بن عامر تھا۔

... لوگ سبق حاصل کر سکتے ہیں جو گناہوں سے اپنے نفسوں کو روکنے والے ہوں،

بدرجہ اتم موجود ہو۔ مقاتل فرماتے ہیں صبار شکور سے مراد اس امت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے ایماندار لوگ ہیں جو مصیبتوں پر شکوہ اور آہ وفغاں نہیں کرتے بلکہ صبر کا دامن پکڑے رہتے ہیں اور نعمتوں کے ملنے پر کم ظرفوں اور دوں ہمت لوگوں کی طرح اپنے منعم حقیقی کو بھول نہیں جاتے بلکہ ہر لحہ زبان اور دل سے شکر ادا کرتے رہتے ہیں (1)۔ مظہری نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں صبار اور شکور سے مراد وہ شخص ہے جو ہمیشہ صبر وشکر کا مظاہرہ کرنے والا ہو کیونکہ دنیا دار المحن اور دار البلاء ہے حتی کہ اس میں نعمتیں بھی آزمائش ہیں۔ بندے کو نعمت کے ذریعے آزمایا جاتا ہے کہ شکر کرتا ہے یا نہیں اس میں موت وحیات دونوں امتحان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا "جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تا کہ وہ تمہیں آزمائے تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔ پس صبار سے مراد وہ شخص ہے جو ہمیشہ گناہوں سے اپنے نفس کو روکے رکھتا ہے مصائب پر صبر کرتا ہے اور طاعات پر قائم رہتا ہے۔ ہر مصیبت اور آزمائش گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہر آزمائش جس طرح صبر کا موجب ہوتی ہے اسی طرح شکر کی بھی مقتضی ہوتی ہے پھر صبر کی توفیق بھی اللہ کی نعمت ہے جو پھر شکر کا تقاضا کرتی ہے۔ حضرت مجدد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اِيْلَامُ الْمَحْبُوْبِ اَلَذُّمِنْ اِنْعَامِهٖ فَهُوَ اَوْلٰى بِالشُّكْرِ یعنی محبوب کی طرف سے تکلیف اس کے انعام سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے۔ پس وہ شکر کا زیادہ تقاضا کرتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

فَاِنِّیْ فِی الْوِصَالِ عَبِیْدُ نَفْسِیْ وَفِی الْهِجْرَانِ مَوْلَى الْمَوَالِیْ

(وصال کی حالت میں میں اپنے نفس کا ادنیٰ غلام ہوتا ہوں اور ہجر وفراق کی حالت میں سرداروں کا بھی سردار ہوتا ہوں)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایمان کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ صبر ہے اور دوسرا حصہ شکر ہے (2)۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت فرمایا ہے میں کہتا ہوں مومن مکمل ایمان والا ہوتا ہے اور ہمیشہ ان دونوں صفات سے متصف ہوتا ہے، کسی ایک صفت سے محروم نہیں ہوتا۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۰

"اور بیشک سچ کر دکھایا ان (ناشکروں) پر شیطان نے اپنا گمان ۱؎ سو وہ اس کی تابعداری کرنے لگے بجز مومنوں کے ایک گروہ کے (جو حق پر ڈٹا رہا) ۲؎"

۱؎ عَلَيْهِمْ کی ضمیر کا مرجع بقول مجاہد تمام لوگ ہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مرجع قوم سبا کے کافر ہیں۔ یعنی ابلیس نے ان پر اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ شیطان نے مہلت ملنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ ڈینگ ماری تھی کہ تیری عزت کی قسم! میں تمام کو گمراہ کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ اس وقت اسے یہ یقین نہ تھا لیکن جب اس نے ان ناشکروں کو اپنے دام ہمرنگ زمیں میں پھنسا لیا اور وہ اس کے متبع اور پیروکار بن گئے تو اس نے اپنے گمان کو سچ کر دکھایا یا اپنے گمان کو سچا پا لیا۔ یہ معنی اہل کوفہ کی قرأت پر ہے جنہوں نے صدق کو باب تفعیل سے دال کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی پہلے تو اس نے ان کے متعلق گمان کیا تھا لیکن پھر ان کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہونے کے ساتھ اپنے گمان کی تصدیق کر دی۔

دوسرے قراء نے صدق کو دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ ... [illegible]

مفعول کی طرف بغیر صلہ کے متعدی کرنا جائز ہے جیسا کہ صدق وعدہ ہے' کیونکہ یہ قول کی ایک قسم ہے۔تنبیہ کہتے ہیں جب ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت عطا فرمادی، اس وقت اس نے کہا لاضلنھم و لاغوینھم (میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور راہ راست سے بھٹکاؤں گا) یہ بات کرتے وقت اس کو یقین نہ تھا کہ وہ اس دعویٰ کو پورا کر بھی سکے گا۔اس نے یہ گمان کے ساتھ کہا تھا لیکن جب اہل سبا اس کے پنجہ میں پھنس گئے اور انہوں نے اس کی اتباع شروع کر دی تو اس کا گمان درست ہو گیا(1)۔

۲؎ اہل سبا میں سے یا تمام لوگوں میں کچھ ایسے خوش نصیب تھے جو اس کی گمراہی سے بچ گئے تھے۔سدی نے حضرت ابن عباس سے نقل فرمایا ہے کہ من المومنین سے مراد تمام مومنین ہیں (اس صورت میں من بیانیہ ہوگا) یعنی کسی مومن نے اصل دین میں شیطان کی اتباع نہیں کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (ترجمہ) بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔(یعنی اس آیت میں عبادی سے مراد مومنین ہیں(2) اور مومنین پر شیطان کو تسلط نہیں ہے۔اس لئے ثابت ہوا کہ مومنین میں سے کسی نے اصل دین میں اس کی پیروی نہیں کی) بعض علماء فرماتے ہیں'' من'' بعضیہ ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ بعض مومنین اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔

وَ مَا كَانَ لَهٗ عَلَیْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِیْ شَكٍّ ؕ وَ رَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۲۱﴾

'' اور نہیں حاصل تھا شیطان کو ان پر ایسا قابو (کہ وہ بے بس ہوں) ۱؎ مگر یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم دکھانا چاہتے تھے کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں مبتلا ہے ۲؎ اور (اے حبیب!) آپ کا رب ہر چیز پر نگہبان ہے ۳؎۔''

۱؎ کان فعل ناقص ہے اور من زائدہ اور سلطان اس کا اسم ہے۔لہ ظرف مستقر کان کی خبر ہے علیھم ظرف کے متعلق ہے۔یعنی شیطان کو ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنے اور جھوٹی امیدیں اور آرزوئیں دلانے کی قدرت نہ تھی مگر ہم نے جب اسے ان پر مسلط کر دیا اور اسے کہا وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَ عِدْهُمْ (ترجمہ) اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے اور دھاوا بول دے ان پر اپنے گھوڑ سواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ اور شریک ہو جا ان کے مالوں میں اور اولاد میں اور ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا رہ۔تو اس میں یہ وسوسہ ڈالنے اور بہکانے کی قدرت پیدا ہوئی۔

۲؎ لنعلم کا معنی لنمیز ہے،یعنی ہم تمیز کر دیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں مبتلا ہے تاکہ ہم ہر کسی کو اپنے عمل اور کردار کے مطابق جزاء و سزا دیں۔حضرت حسن فرماتے ہیں ابلیس نے نہ تو بندوں پر تلوار سونتی، نہ ان کو کوڑا لگایا بلکہ اس نے تو صرف جھوٹے وعدے اور جھوٹی آرزوئیں دلائیں اور لوگ بیچارے اس کے مکر و فریب کے جال میں پھنس گئے(3)۔اس آیت پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس آیت کا مفہوم تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم حادث ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ

تعالیٰ کا علم ازلی قدیم اور سرمدی ہے، حادث نہیں ہے لیکن معلوم چیز کے ساتھ علم کا تعلق حادث ہے اور یہاں حصول علم سے مراد تعلق علم ہے۔ پھر اس پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے علم جب تک معلوم کے متعلق نہ ہو تو معلوم عالم پر منکشف نہیں ہوتا کیونکہ علم معلوم سے تعلق سے پہلے علم بالقوہ ہوتا ہے، علم بالفعل نہیں ہوتا۔ پس تعلق علم کا حادث ہونا' وجود شی سے پہلے جہالت کے پائے جانے کا مقتضی ہے اعتراض پھر باقی رہتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ کا علم حادث کے وجود سے پہلے بھی اس کے ساتھ متعلق تھا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا موجود ہونا بھی منکشف تھا۔ یہ چیز پہلے بے علمی کا تقاضا نہیں کرتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کے معدوم ہونے کے وقت جس طرح اس کے متعلق تھا اسی طرح اب اس کے وجود کے متعلق ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ موجود کے ساتھ ہمارا علم متعلق ہو جائے جس طرح اس کے معدوم ہونے کے ساتھ ہمارا علم متعلق تھا۔ اس پر پھر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تغیر کو قبول کرتی ہے (پہلے اس کے علم کا تعلق معدوم سے تھا، اب اس کے علم کا تعلق وجود سے ہو گیا) بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ زمانہ اپنے تمام اجزاء کے ساتھ اور جو کچھ زمانہ میں موجود ہے سب کا سب اللہ کی بارگاہ قدس میں حاضر ہے، اس کا علم زمانہ اور زمانیات کے متعلق قدیم اور سرمدی ہے۔ تقدیم و تاخیر کا تعلق زمانہ کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً زید جو ایک وقت میں موجود ہے اور ایک وقت میں غائب ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں حالتوں میں حاضر ہے۔ اسی طرح اس کا پہلے ایک جگہ ہونا اور دوسری جگہ نہ ہونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر مقام پر حاضر و موجود ہے' اس کے مکان کی تبدیلی سے اللہ کی ذات میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ پس آیت کا معنی یہ ہے تاکہ ہم اپنے علم قدیم سے جان لیں کہ کون مومن ہے اور کون شک میں مبتلا ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے علم کی مسبوقیت کی مقتضی نہیں اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ سابقیت اور مسبوقیت تو وہاں متصور ہوتی ہیں جہاں زمانہ کا اجراء ہو، اسی طرح فوق و تحت اس چیز میں ہوتا ہے جس کو کوئی مکان گھیرے ہوئے ہو۔ وہ ذات جو زمان و مکان کی خالق ہے وہ ان صفات (سابقیت' مسبوقیت' فوق اور تحت) سے منزہ اور مبرا ہے۔ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ علم معلوم کے تابع ہوتا ہے اور معلوم کا حادث ہونا علم کے حادث ہونے کا مقتضی نہیں ہے کیونکہ معلوم زمانہ کے ساتھ گھرا ہوا ہوتا ہے اور علم اس کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ پس ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ع اللہ تعالیٰ زمانہ اور زمانیات' مومن و کافر ہر چیز کو تاڑنے والا ہے اور ہمیشہ اس کی محافظت کرنے والا ہے، وہ کسی چیز سے بے خبر نہیں ہے اس لئے ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزاء و سزا دے گا۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾

"آپ فرمائیے (اے مشرکو!) تم پکار دیکھو جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا معبود خیال کرتے ہو۔ یہ تو ذرہ برابر کے بھی مالک نہیں ہیں۔ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا زمین و آسمان میں کچھ حصہ ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا ان میں سے کوئی مددگار ہے [1]"

[1] زَعَمْتُمْ کے دونوں مفعول هم اور الهه محذوف ہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے زعمتوهم الهه۔ پہلے مفعول "هم" کو تخفیف

موصوف کومقدر مانا جائے)اسی طرح لایملکون بھی مفعول ثانی نہیں ہوسکتا کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا جن کوتم گمان کرتے ہو کہ وہ مالک نہیں ہیں ۔حالانکہ ان کا یہ گمان نہیں تھا۔آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہوتو تو جو جی میں آتا ہے ان سے منفعت کا حصول یا دفع مصیبت طلب کرو شاید وہ تمہاری بات قبول کرلیں ۔گویا یہ کلام قیاس استثنائی سے شرطیہ پر دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے، یعنی اگر تمہارا دعویٰ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا یہ خدا ہیں تو پھر جب تم پکارو گے تو وہ تمہاری پکار کا جواب دیں گے ۔لیکن وہ بے بس مورتیاں تو کسی چیز کی مالک ہی نہیں ۔لا یملکون کا جملہ مستانفہ ہے جو استثناء پر دلالت کررہا ہے۔یعنی وہ خیر و شر کسی کے بھی مالک نہیں ہیں ، وہ تمہیں جواب نہیں دیتے تو ثابت ہو گیا کہ تمہارا ان کے متعلق الہہ (خدا) ہونے کا خیال باطل ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے زمین آسمان کا ذکر فرمایا کہ ان میں وہ بت کسی ذرہ برابر کے مالک نہیں ہیں ۔تو ان کا یہ ذکر عرف کی حیثیت سے ہے ورنہ وہ تو کسی امر کے کہیں بھی مالک نہیں ہیں ۔یا اس لئے زمین و آسمان کا ذکر فرمایا کہ ان کے بعض الہ سماوی تھے جیسے ملائکہ اور ستارے اور بعض زمینی تھے جیسے بت ۔یا اس لئے ان کا ذکر فرمایا کیونکہ خیر و شر کے ظاہری اسباب آسمانی اور ارضی ہیں ۔شرک سے پہلے من زائدہ ہے اور شرک بمعنی شرکت (حصہ) ہے۔**مالھم فیھما من شرک کا جملہ لا یملکون کے جملہ پر معطوف ہے۔ومالہ منھم** میں لہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے اور منہم کی ضمیر کا مرجع شرکاء ہیں ۔یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور تدبیر میں تمہارے ان بتوں میں سے اللہ تعالیٰ کا کوئی معاون و مددگار نہیں ہے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ حَتّٰٓی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ۝۲۳

’’اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لئے اس نے اجازت دی ہو[1] یہاں تک کہ جب دور کر دی جاتی ہے گھبراہٹ ان کے دلوں سے تو پوچھتے ہیں کیا ارشاد فرمایا تمہارے رب نے[2] وہ کہتے ہیں اس نے حق فرمایا ہے اور وہی بڑی شان والا سب سے بڑا ہے[3]‘‘

[1] یعنی وہی شفاعت کرے گا جسے شفاعت کرنے کا اذن ملے گا۔اس صورت میں مَنْ سے مراد شافع (شفاعت کرنے والا) ہوگا اور اس پر لام ایسے ہوگا جیسے الکرم لزید میں ہے یا معنی یہ ہے کہ شفاعت نفع نہیں دے گی مگر جس کے لئے سفارش کرنے کا اذن ہوگا۔اس صورت میں ’’من‘‘ کا کلمہ مشفوع لاجلہ سے عبارت ہوگا اور اس پر لام لام الاجل ہوگا جیسے اس جملہ میں ہے جئتک لزید۔ابوعمرؒ حمزہ اور کسائی نے اذن کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔جب کفار نے علی سبیل التنزل کہا کہ ہم مان لیتے ہیں کہ ملائکہ اور بتوں کو زمین و آسمان کی کسی چیز پر ملکیت نہیں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے کسی چیز میں حصہ دار بھی نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری سفارش کریں گے۔اللہ تعالیٰ ان کے اس زعم باطل کو رد کرتے ہوئے فرمار ہے ہیں کہ کسی کو کسی کی شفاعت نفع نہیں دے گی مگر جس کو شفاعت کا اذن ملے گا صرف وہی سفارش کرے گا اور اس کے لئے سفارش ہوگی جن کے لئے

۱؎ ابن عامر اور یعقوب نے فزع کو فاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے اور اس میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کو بنایا ہے۔ باقی قراء نے فاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور عن قلوبھم جار مجرور کو نائب الفاعل بنایا ہے۔ تفزیع کا معنی خوف اور گھبراہٹ کو دور کرنا ہے جیسا کہ تمریض کا معنی ازالۃ المرض ہے اور قلوبھم میں ضمیر کا مرجع شافعین اور مشفوع لہم میں جو سابق کلام سے مفہوم ہیں۔ اور حتیٰ سابق کلام لا تنفع الشفاعۃ عندہ الا لمن اذن لہ سے مقدر جملہ کی غایت بیان کر رہا ہے۔ کیونکہ سابق کلام سے یہ مفہوم مترشح ہو رہا ہے کہ شفاعت کرنے والے اور مشفوع لہم (جن کی سفارش کی جاتی ہے) سب اذن شفاعت کے منتظر ہوں گے اور گھبراہٹ وخوف طاری ہوگا کہ ہو سکتا ہے اذن شفاعت نہ ملے۔ یا جب شفاعت کا اذن ملے گا تو کلام الٰہی کو سننے کے وقت ہیبت الٰہی اور جلال الٰہی کی وجہ سے ان پر سراسیمگی طاری ہوگی۔ میں کہتا ہوں اسی طرح جب بھی اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کا فیصلہ فرمائے گا تو انسانوں پر غشی طاری ہوگی۔ امام بخاری نے حضرت ابوھریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ آسمان میں فیصلہ فرماتے ہیں تو فرشتے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پر مارتے ہیں گویا چٹان پر کوئی زنجیر لگ رہی ہے۔ پھر جب ان کی گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کیا فرمایا تمہارے رب نے؟ کہتے ہیں حق فرمایا، وہی بلند و بالا ہے اس کو چوری چھپے سننے والوں (جنوں) نے سنا اور چوری چھپے سننے والے اس طرح ایک دوسرے کے اوپر تھے۔ سفیان نے اپنے ہاتھ کو ترچھا کر کے ترتیب اور انگلیوں کو الگ الگ کر کے بتایا کہ ہر ایک کلمہ سنتا ہے اور پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو پہنچاتا ہے پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو پہنچاتا ہے حتیٰ کہ سب سے نیچے والا وہ کلمہ جادوگر یا کاہن کی زبان پر ڈالتا ہے۔ بسا اوقات دوسرے کی طرف وہ کلمات پہنچانے سے پہلے شہاب اسے جا لگتا ہے اور کبھی شہاب کے لگنے سے پہلے وہ دوسروں کو القاء کر دیتا ہے اور وہ اس کلام کے ساتھ سو (100) جھوٹ ملاتا ہے پھر کہا جاتا ہے کیا فلاں دن اس جادوگر یا کاہن نے ہمیں ایسا ایسا بتایا نہیں تھا۔ پس اس کلمہ کی وجہ سے جو آسمان سے بن گیا تھا اس کاہن کی تصدیق کی جاتی ہے (1)۔

مسلم نے ابن عباس سے اور انہوں نے ایک انصاری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا۔ ہمارا رب جس کا نام بڑا برکت والا ہے جب وہ کوئی فیصلہ فرماتا ہے تو حاملین عرش (فرشتے) تسبیح بیان کرتے ہیں پھر اس آسمان کے مکین تسبیح کرتے ہیں جو ان عرش اٹھانے والوں کے قریب ہوتے ہیں (پھر ان کے قریب والے) اسی طرح یہ سلسلہ چلتا جاتا ہے حتیٰ کہ آسمان دنیا کے مکین فرشتوں تک تسبیح پہنچ جاتی ہے۔ پھر حاملین عرش فرشتوں سے قریب والے فرشتے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ تو حاملین عرش (فرشتے) انہیں وہ سب کچھ بتاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہوتا ہے۔ پھر اسی طرح ہر نیچے والے آسمان کے فرشتے اوپر والوں سے پوچھتے ہیں حتیٰ کہ وہ بات پہلے آسمان والوں تک پہنچ جاتی ہے، وہاں سے جن چوری چھپے سن لیتے ہیں اور پھر وہ اپنے دوستوں کو وہ بات بتاتے ہیں اور جنوں کو شہاب مارے جاتے ہیں۔ پس آسمان کی جو بات وہ صحیح صحیح پہنچاتے ہیں وہ حق ہوتی ہے لیکن وہ اس کے ساتھ بہت زیادہ جھوٹ کی ملاوٹ کرتے ہیں (2)۔

بغوی نے نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی امر کی وحی کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے، آسمان اس کلام الٰہی کی ہیبت سے لرز جاتے ہیں۔ جب آسمان کے مکین (فرشتے) اس کلام

اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اس سے اپنی وحی کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے۔ پھر جبریل وہ وحی لے کر ملائکہ کے پاس سے گزرتے ہیں۔ جب بھی کسی آسمان سے گزرتے ہیں تو اس آسمان کے ملائکہ پوچھتے ہیں ہمارے رب نے کیا فرمایا؟ تو جبریل بتاتے ہیں اس نے حق فرمایا اور وہ بلند عظمت اور شان رفیع کا مالک ہے۔ یہ سن کر سب فرشتے وہی کہتے ہیں جو جبریل کہتے ہیں۔ پھر جبریل وہ وحی وہاں پہنچا دیتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے پہنچانے کا حکم فرمایا ہوتا ہے(1)۔

اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ، ما بعد قالوا کے متعلق ہے، یعنی جب لاحق گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے سے اذن شفاعت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ شفاعت کے متعلق تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ دوسرے جواب دیتے ہیں ہمارے رب نے حق فرمایا ہے۔ یعنی مومنین کے متعلق جو اس نے شفاعت کا اذن فرمایا ہے وہ حق ہے۔

سے اللہ تعالیٰ کی شان بہت بلند اور ارفع ہے اور وہ بہت بڑا ہے۔ کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی اس کی اجازت کے بغیر لب کشائی نہیں کر سکتا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں بعض علماء نے لکھا ہے کہ قیام قیامت کے خوف سے فرشتے گھبرا جائیں گے۔ مقاتل، کلبی اور سدی نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کے درمیان 550 سال کا زمانہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں چھ سو سال کا زمانہ ہے۔ ملائکہ نے اس درمیانی عرصہ میں وحی کی آواز نہ سنی۔ پھر جب محمد ﷺ کو رسالت کے تاج زرنگار کے ساتھ مبعوث کیا گیا تو ملائکہ نے وحی کی آواز سنی اور انہوں نے اس کو قیامت تصور کیا کیونکہ آسمان والوں کے نزدیک محمد ﷺ کی بعثت و آمد کا قیامت کی علامات میں سے ہونا مسلم تھا۔ پس وہ وحی کی آواز سنتے ہی قیام قیامت کے خوف سے بیہوش ہو گئے۔ پھر جب وحی لے کر جبریل نیچے اترے تو جس آسمان سے گزرتے تو ان کی غشی دور ہوتی اور وہ اپنے سر اوپر اٹھا کر ایک دوسرے سے پوچھتے تمہارے رب نے کیا کہا؟ تو دوسرے جواب دیتے کہ اس نے حق فرمایا ہے۔ حق سے ان کی مراد وحی تھی(2)۔ اگر یہ کہا جائے کہ مقاتل اور دوسرے علماء نے اس آیت کی جو توجیہہ فرمائی ہے اس کے لحاظ سے حَتّٰی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ کا سابقہ کلام سے ربط اور تعلق کیسے ہوگا۔ تو میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ حَتّٰی اِذَا فُزِّعَ کا ارشاد ویری الذین اوتو العلم الذی انزل الیک من ربک ھو الحق و یھدی الی صراط العزیز الحمید سے متعلق ہے اور الذین اوتو العلم سے مراد ملائکہ ہیں۔ اور درمیان میں کلام معترض ہے۔ معنی یہ ہے کہ ملائکہ جانتے ہیں کہ جو آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے قرآن نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے۔ اسی وجہ سے اس قرآن کے نزول کے وقت وہ قیام قیامت کے خوف سے گھبرا گئے کیونکہ ان کے نزدیک اس کا نزول علامات قیامت میں سے تھا۔ حتیٰ کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوئی تو کہنے لگے کیا فرمایا تمہارے رب نے؟ تو دوسروں نے کہا حق فرمایا، وہی بلند عظمت اور بڑی شان والا ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے وہ مشرک ہیں۔ الحسن اور ابن زید فرماتے ہیں مشرکوں پر حجت قائم کرنے کے لئے ان کی موت کے وقت ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کی جاتی ہے اور فرشتے ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے اپنے رسولوں کی زبانی دنیا میں کیا ارشاد فرمایا تھا؟ تو مشرک کہتے ہیں اللہ نے حق ارشاد فرمایا تھا۔ اس وقت وہ اقرار کرتے ہیں، جبکہ ان کا اقرار ان [illegible]

کراقرار کرتے ہیں لیکن اس وقت اقرار بے سود ہوتا ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

''آپ فرمائیے کون روزی دیتا ہے تمہیں آسمانوں اور زمین سے خود ہی فرمائیے اللہ! ۱؎ اور ہم یا تم (دونوں میں سے ایک) ہدایت پر ہے اور (دوسرا) کھلی گمراہی میں ہے ۲؎ ''

۱؎ آپ اے حبیب ان مشرکوں سے پوچھئے کہ بارش کے قطرات اور زمینی فصلوں کے ذریعے تمہیں رزق کے انبار کون پہنچاتا ہے۔ یہاں استفہام تقریری ہے، یعنی مخاطب کو برانگیختہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا رازق نہیں ہے۔ یہ جملہ لا یملکون کی تاکید ہے اور قل ادعوا کے ساتھ متصل ہے۔ اللّٰہ فعل محذوف کا فاعل ہے، یعنی اے محبوب خود ہی فرمائیے کہ تمہیں رزق اللہ تعالیٰ پہنچاتا ہے کیونکہ ان کے پاس بھی اس جواب کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اگر چہ یہ مشرک الزام اور سفید جھوٹ کے خوف سے جواب میں توقف اختیار کرتے ہیں لیکن دلوں میں اسی بات کے اقراری ہیں۔

۲؎ ہم توحید کے پرستار ہیں اور تم خدا کے شریک ٹھہراتے ہو یقیناً ہم میں سے ایک گروہ ہدایت پر ہے اور دوسرا گمراہی کی دلدل میں گرا ہوا ہے۔ کیونکہ توحید اور شرک ایک دوسرے کے متضاد اور مخالف نظریات ہیں، ہدایت اور گمراہی ایک دوسرے کی نقیض ہیں، ارتفاع نقیضین بھی محال ہے اور اجتماع نقیضین بھی محال ہے۔ پس یہ قضیہ منفصلہ عنادیہ ہے اور سابق کلام سے یہی مفہوم ہے کہ رزق صرف اللہ تعالیٰ ہی باہم پہنچاتا ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اہل توحید ہدایت کی شاہراہ پر گامزن ہیں اور مشرک کھلی گمراہی میں ہیں قیاس استثنائی کی یہ مثال ہے کہ موحدین (توحید کے داعی) یا ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں۔ لیکن وہ ہدایت پر ہیں کیونکہ رزق عطا کرنے والا صرف اللہ ہے پس ثابت ہوا کہ وہ گمراہی میں نہیں ہیں۔ یا اس طرح کہ وہ گمراہی میں نہیں پس وہ ہدایت پر ہیں یا اس طرح کہا جائے کہ مشرک یا تو ہدایت پر ہیں یا گمراہی میں ہیں لیکن چونکہ وہ ہدایت پر نہیں ہیں پس وہ گمراہی میں ہیں یا وہ گمراہی میں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رازق نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مشرک ہدایت پر نہیں ہیں۔ یہ کلام شک پر مبنی نہیں ہے بلکہ مختلف احتمالات کے حصر اور ایک نقیض کے ابطال اور دوسری کے اثبات یا ایک کے اثبات اور دوسرے کے ابطال کے لئے اس طرح ذکر کی گئی ہے جیسا کہ مناظرہ کا اصول ہوتا ہے۔ ھدیً سے پہلے علیٰ حرف جر اور ضلال سے پہلے فی حرف جر ذکر فرمایا ہے۔ اس اختلاف حرف جارہ کی وجہ یہ ہے کہ گویا ہدایت یافتہ ہدایت پر اس طرح سوار ہے جس طرح سوار اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور اسے اپنی مرضی سے دوڑاتا ہے اور گمراہ شخص گویا تاریکیوں اور تیرگیوں میں غوطہ زن ہے، اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کدھر جائے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَ لَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

''فرمائیے تم سے باز پرس نہیں ہوگی ان جرموں کی جو ہم نے کئے اور نہ ہم سے باز پرس ہوگی تمہارے کرتوتوں کی ۱؎ ''

۱؎ یعنی تمہیں جو توحید کی پیروی اور شرک کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہ فقط تمہاری خیر خواہی کے لئے ہے۔ ورنہ اگر تم شرک سے چمٹے

خیر خواہی کا اظہار ہے اور اس میں تعصب و تعنت (ہٹ دھرمی) کا شبہ تک نہیں ہے۔

قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ ﴿۲۶﴾

''فرمائیے ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا پھر وہ فیصلہ کرے گا ہمارے درمیان حق (و انصاف) کے ساتھ وہی بہترین فیصلہ کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے [1]''

[1] یَفْتَحُ' بمعنی یحکم و یفصل ہے۔ یعنی قیامت کے روز ہمارا رب فیصلہ فرمائے گا اور اس کا فیصلہ عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ حق کے پرستاروں کو جنت میں داخل کرے گا اور باطل کے طرف داروں کو آگ میں ڈالے گا۔ الفتاح کا معنی فیصلہ فرمانے والا ہے۔ اور لا ینحل مسائل کا حل عطا فرمانے والا ہے العلیم جو مناسب فیصلہ کرنا ہوتا ہے اسے وہ جانتا ہے۔ سابقہ آیت میں مناظرہ کے طریقہ پر کفار کو الزام دیا گیا اور اس کے بعد نصیحت کا انداز تھا اور اس آیت میں تنبیہ کا اسلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کا فیصلہ فرمائے گا۔

قُلْ اَرُوْنِیَ الَّذِیْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۷﴾

''فرمائیے مجھے بھی دکھاؤ تو وہ شریک جنہیں تم نے اللہ کے ساتھ ملا دیا ہے ہرگز ایسا نہیں بلکہ فقط وہی اللہ ہے جو زبردست بڑا دانا ہے [1]''

[1] اَرُوْنِیَ کا پہلا مفعول ضمیر متکلم منصوب متصل ہے، دوسرا مفعول اسم موصول مع صلہ ہے اور تیسرا مفعول شُرَكَآءَ ہے، یعنی جن بتوں کو تم نے عبادت کے استحقاق میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملا دیا ہے، مجھے بتاؤ کس صفت کی وجہ سے تم نے انہیں اللہ کا شریک بنایا ہے؟ کیا انہوں نے کسی چیز کو پیدا فرمایا ہے، یا کسی کو رزق دیتے ہیں یا کسی کو کوئی نفع پہنچاتے ہیں یا کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں، یعنی ان کو خدا کا شریک کہنے کی کوئی بھی وجہ جواز نہیں ہے۔ اس آیت کریمہ میں ان کو لاجواب کرنے میں زیادتی کرنے کے لئے برھان کی اقامت اور حجت کے الزام کے بعد اس کے شبہ کے بارے استفسار کیا جا رہا ہے۔ کلا حرف ردع ہے، یعنی جب وہ کسی صفت میں بھی خدا کے شریک نہیں ہیں تو پھر اتنی بڑی واضح دلیل کے بعد تم انہیں خدا کا شریک کیوں کہتے ہو۔ (ضد اور ہٹ دھرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے) مستحق عبادت تو صرف وہی ذات ہے جو زبردست قوت والا ہے اور حکمت بالغہ کا مالک ہے۔ اس کی صفات کمال اور صفات جلال میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے، تو ان پتھروں کو کیسے اس کا شریک ٹھہراتے ہو جو ساری ممکنات سے ادنیٰ ترین ہیں اور علم و قدرت کو کلی طور پر قبول ہی نہیں کرتے۔ ھو ضمیر مبتدا ہے جس کا مرجع المستحق للعبادہ ہے اور اسم جلالت اللہ خبر ہے، حصر اسی ترکیب سے مستفاد ہے۔ العزیز اور الحکیم اسم جلالت اللہ کی صفات ہیں، یا ھو کی دوسری دو خبریں ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ھو ضمیر شان ہو، اسم جلالت مبتدا العزیز اس کی صفت اول اور الحکیم صفت ثانی ہو اور متوحد لاستحقاق العبادۃ خبر محذوف ہو۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام انسانوں کی طرف بشیر اور نذیر بنا کر [1] لیکن (اس حقیقت کو) اکثر لوگ نہیں

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کافۃ خطاب کی ک ضمیر سے حال ہو اور تاء مبالغہ کے لئے ہو۔ اس صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وما ارسلناک الا جامعا لھم فی الابلاغ یعنی ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر اس حال میں کہ آپ لوگوں کو تبلیغ کرنے والے ہیں۔

حضرت جابر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَّ جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا فَاَيُّمَا رَجُلٍ مِّنْ اُمَّتِيْ اَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ يُحَلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً (بخاری و مسلم) (1) یعنی اللہ نے مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا فرمائی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی و رسول کو عطا نہیں کی گئیں۔ اس نے رعب سے میری مدد فرمائی ایک مہینہ کی مسافت پر دشمن میری ہیبت سے لرزہ براندام ہوتا ہے۔ میرے لئے تمام روئے زمین کو مسجد اور ذریعہ طہارت بنایا۔ میرے امتی کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے وہ وہاں نماز پڑھ لے اور میرے لئے مال غنیمت کو حلال فرمایا حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھا۔ مجھے شفاعت کا منصب عطا فرمایا۔ ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام انبیاء پر چھ باتوں میں فضیلت دی ہے۔ مجھے اس نے جوامع الکلم عطا فرمائے (یعنی قلیل الفاظ میں کثیر معانی کو بیان کرنا) اس نے رعب سے میری مدد کی، میرے لئے مال غنیمت کو حلال فرمایا۔ میرے لئے تمام روئے زمین مسجد قرار دی اور طہارت کا ذریعہ بنایا اور مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور مجھ پر سلسلہ نبوت ختم فرمایا (2)۔

آیت کا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ تمام لوگوں کو دنیا میں کفر و عصیان سے روکیں اور آخرت میں دوزخ کی آگ میں گرنے سے روکیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی اور پھر جب اس کا ارد گرد روشن ہو گیا تو کیڑے پتنگے اس میں گرنے لگے۔ وہ انہیں آگ میں گرنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ غالب آجاتے ہیں اور آگ میں گھس جاتے ہیں، بالکل اسی طرح میں تمہیں آگ میں گرنے سے بچانے کے لئے پکڑتا ہوں لیکن تم اس میں گھس جاتے ہو (3)۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے نقل کی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں للناس ارسلناک کے متعلق ہے اور کافۃ الناس سے حال ہے اہتمام کی وجہ سے حال کو مقدم کیا گیا ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو سرخ و سیاہ تمام لوگوں کی راہنمائی کے لئے بھیجا ہے۔ اکثر نحوی مجرور پر حال کو مقدم کرنا درست نہیں سمجھتے۔ اور ما ارسلناک کا جملہ قل اور نبی کے فاعل سے علی سبیل التنازع حال ہے، یعنی آپ کفار پر حجت کے الزام اور ان کو ہدایت کرنے کیلئے یہ ارشادات فرمایئے جبکہ آپ کو تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے یا ان کو روکنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ آپ مومنین کو جنت کی خوشخبری دینے والے ہیں اور کافروں کو آگ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔ بشیراً و نذیراً دونوں کاف خطاب سے حال ہیں کیونکہ یہ کافۃ کے مترادف ہیں۔ اس تقدیر پر کہ یہ دونوں حال ہوں ایک حرف کے تحت استثناء کے تحت داخل ہوں جیسا کہ اس مثال میں ہے ماضربتک الا ضرباً شدیداً قائماً۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بشیراً اور نذیراً۔ کافۃ کی ضمیر سے حال ہوں جبکہ وہ ک ضمیر سے حال ہو۔

ﱞ لیکن اکثر لوگ یعنی کفار حقیقت کا عرفان نہیں رکھتے اور وہ آپ کی رسالت عامہ اور آپ کی بشارت و نذارت پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ آپ کی راہنمائی اور شفقت [illegible]

ہے ان کی سوچ پر!)

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

"اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ وعدہ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو [1]"

[1] کفار فرط جہالت وحماقت کی وجہ سے قیامت کے نظریہ پر مزاح کرتے تھے۔ اور اس کو عقلاً بعید سمجھتے تھے اس لئے پوچھتے تھے کہ جس جنت کی تم بشارت دیتے ہو اور جس دوزخ سے ڈراتے ہو وہ کب ملیں گی یا یہ معنی کہ تم جو صبح وشام ہمیں سناتے رہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جمع فرمائے گا اور ہمارے درمیان فیصلہ فرمائے گا وہ وعدہ کب پورا ہوگا۔ کفار کا یہ خطاب رسول مکرم ﷺ اور مومنین سے تھا۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے، یعنی ان کنتم صادقین فی الوعد فانبئونی عن وقتہ (اگر تم اپنے اس وعدہ میں سچے ہو تو اس کا بتاؤ)

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾

"فرمائیے (اے منکرو!) تمہارے لئے وعدہ کا دن مقرر ہے نہ تم اس سے ایک لحہ پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ (ایک لحہ) آگے بڑھ سکو گے [1]"

[1] یہ ان کے سوال کا جواب ہے اور میعاد سے مراد وعدہ کا زمانہ یا وعدہ کا مکان ہے لیکن یہاں وعدہ کے زمانہ کے لئے استعمال ہوا۔ یا میعاد مصدر ہے اور اپنے زمانہ کی طرف مضاف ہوا ہے اور یوم کی طرف میعاد کی اضافت بیانیہ ہے (کیونکہ یہ عام کی خاص کی طرف اضافت ہے جیسا کہ ثوب خز میں ہے) اور وعدہ کے دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں موت کا وقت مراد ہے، یعنی تمہاری عمر میں نہ اضافہ ہوگا اور نہ کمی ہوگی، تمہارے لئے وقت مقرر ہے (1)۔ انہوں نے جو اپنے سوال کے ذریعے قیامت کے نظریہ کا مذاق اڑایا تھا اور انکار کیا تھا اس کے جواب میں یہ دھمکی اور وعید ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

"کفار (اب تو) کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اس قرآن پر اور نہ ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل ہوئیں۔ کاش! تم (وہ منظر) دیکھو جب یہ ظالم کھڑے کئے جائیں گے اپنے رب کے روبرو اسوقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے کہیں گے وہ لوگ جو (دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے ان سے جو بڑے بنا کرتے تھے اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایماندار ہوتے [1]"

[1] الذی بین یدیہ سے مراد تورات اور انجیل ہے، جب کفار نے اہل کتاب سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا [illegible] کفار اہل کتاب کا یہ جواب سن کر غصہ سے لال پیلے ہوگئے اور یہ کہا کہ ہم نہ قرآن

الذی بین یدیه سے مراد قیامت، جنت، دوزخ ہے۔ قَالَ الَّذِيْنَ الخ کا جملہ ویقولون متی هذ الوعد پر معطوف ہے۔ ولو تری میں خطاب محمد ﷺ کو ہے یا ہر مخاطب کو ہے۔ تری کا مفعول الظالمین محذوف ہے، اِذِ الظّٰلِمُوْنَ الخ تری کے متعلق ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِذِ الظّٰلِمُوْنَ، تری کا مفعول ہو۔ معنی یہ ہو کہ اگر آپ ان کے محاسبہ کی جگہ کو دیکھیں۔ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الخ کا جملہ مَوْقُوْفُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے یا الظالمون کی خبر ثانی ہے۔ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے مراد رعایا ہے اور الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا سے مراد سردار اور رؤساء ہیں۔ لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ہمیں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے سے باز نہ رکھتے اور ہمیں کفر کی طرف نہ بلاتے تو ہم نبی کریم ﷺ پر ایمان لاتے۔ تم بدبختوں نے ہمیں عذاب کی بھٹی میں جھونکا ہے۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾

''جواب دیں گے متکبر ان کمزوروں کو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا ہدایت (قبول کرنے) سے جب (نور ہدایت) تمہارے پاس آیا تھا درحقیقت تم خود مجرم تھے [1]۔''

[1] أنحن میں ہمزہ استفہامیہ انکار کے لئے ہے، یعنی ہم نے تمہیں ہدایت کو قبول کرنے سے نہیں روکا تھا بلکہ تم نے خود اپنے آپ کو ہدایت کے نور سے محروم کیا تھا کیونکہ تم نے اندھی تقلید کی تھی اور کفار کی مطابقت کو بغیر کسی دلیل کے اختیار کیا تھا اور رسول مکرم ﷺ کی متابعت کو ترک کیا تھا جس کی تائید میں صبح وشام معجزات کا تم مشاہدہ کرتے تھے۔ اسی انکار پر دلالت کرنے کے لئے انہوں نے نحن اسم ضمیر پر ہمزہ ذکر کیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾

''کہیں گے وہ کمزور لوگ ان مغروروں سے (یوں نہیں) بلکہ تمہارے شب و روز کے مکر و فریب نے ہمیں ہدایت سے باز رکھا جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کو ماننے سے انکار کر دیں اور (بتوں کو) اس کا ہمسر بنائیں اور دل ہی دل میں پچھتائیں گے جب دیکھیں گے عذاب کو اور ہم ڈال دیں گے طوق ان لوگوں کی گردنوں میں جنہوں نے کفر کیا (خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے) کیا انہیں بدلہ دیا جائیگا بجز اس کے جو وہ کیا کرتے تھے [1]۔''

[1] کمزور وضعیف لوگ اپنے رؤساء سے کہیں گے کہ ہم نے خود اپنے آپ کو گمراہی میں نہیں ڈالا بلکہ دن رات تمہاری مکاریوں اور حیلہ سازیوں نے ہمیں گمراہی کے گرداب میں ڈبویا ہے چونکہ لیل ونہار ان کی سازشوں کے لئے ظرف زمان ہیں اس لئے مکر کی نسبت ان کی طرف مجازاً فرمادی۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ سے مراد طویل سلامتی اور لمبی آرزوئیں ہیں، یعنی ان دو چیزوں نے ہمیں اسلام قبول کرنے سے روکے رکھا۔ اذ تامروننا: الَّيْلِ وَالنَّهَارِ سے بدل ہے۔ ان نکفر میں ان مفسرہ ہے جو امر کی تفسیر بیان

ندامت کو چھپائے ہوئے ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں عار دلانے اور شرمندہ ہونے کا خدشہ تھا یا وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ کا معنی شرمندگی کو ظاہر کرنا ہے کیونکہ اسرّ میں ہمزہ اثبات اور سلب دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے جیسا کہ اشکیتہ کا معنی شکایت ثابت کرنا بھی ہے اور شکایت دور کرنا بھی ہے۔ جعلنا کا عطف تَرَاَوُا الْعَذَابَ پر ہے۔ کفار کی ندمت کے اظہار اور زنجیروں میں جکڑے جانے کے موجب کو بیان کرنے کے لئے الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اسم ظاہر ذکر فرمایا ہے۔ اسم ضمیر ذکر نہیں فرمایا۔ یجزون کو دو متعدی مفعولوں کی طرف فرمایا حالانکہ یہ بغیر واسطہ کے متعدی بدو مفعول نہیں ہوتا۔1۔ اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں حرف جر کو مفعول سے پہلے حذف کیا گیا ہے2۔ اَسَّر افضٰی کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔

ابن المنذر اور ابن حاتم نے سفیان عن عاصم عن ابی رزین کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ دو شخص آپس میں شریک تھے۔ ایک ان میں سے شام چلا گیا اور دوسرا (مکہ میں) ہی مقیم رہا۔ جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو مقیم شخص نے اپنے ساتھی کو خط میں آپ ﷺ کے اعلان نبوت کے متعلق لکھا، پھر مسافر ساتھی نے خط لکھ کر پوچھا کہ آپ ﷺ کی دعوت کا کیا حال ہے، مقیم نے جواباً لکھا کہ چند نادار اور مساکین لوگوں نے اس کی اتباع کی ہے۔ مسافر ساتھی نے اپنی تجارت اور کاروبار چھوڑا اور اپنے ساتھی کے پاس پہنچ گیا اور پوچھا مجھے اس شخص کے متعلق بتایئے۔ یہ مسافر شخص کسی آسمانی کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ وہ شخص حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور پوچھا حضور! آپ کا پیغام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے احکام شریعت بتائے تو وہ شخص فوراً کہنے لگا اشهد انک رسول الله میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا تجھے میری صداقت کا کیسے علم ہوا؟ اس نے عرض کی کوئی نبی مبعوث نہیں ہوتا مگر اس کے پیروکار مساکین اور معاشی لحاظ سے کمزور لوگ ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی(1)۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

"اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا مگر یہ کہ برملا کہہ دیا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے ہم اس (دین) کا جو دے کر تم بھیجے گئے ہو انکار کرتے ہیں ۱۔"

۱۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کی طرف پیغام بھیجا کہ اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق فرما دی ہے مِّنْ نَّذِيْرٍ میں مِن زائدہ ہے اور نذیر، مفعولیت کی بناء پر محل نصب میں ہے الاقال مترفوها، قد کی تقدیر کے ساتھ مِّنْ نَّذِيْرٍ سے حال ہے۔ یعنی جب بھی کوئی انجام بد سے ڈرانے والا تشریف لاتا ہے تو اس شہر کے امراء اور خوشحال لوگ اس خبر کے داعی کی تکذیب کرتے ہیں، یہاں آسودہ حال اور طبقہ امراء کا تکذیب کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، کیونکہ عام طور پر تکذیب اور انکار کرنے والے اسباب تکبر اور مفاخرت ہوتے ہیں، اور دنیا دار دنیا کی چمک دمک اور پیسے کی ریل پیل پر اتراتے ہیں اور فخر کرتے ہیں، نفسانی خواہشات کو پورا کرنے میں ہر وقت مگن رہتے ہیں اور غریب لوگوں کی تذلیل اور اہانت ان کا وطیرہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں جو تم پیغام ہدایت اور دین طہارت و نظافت لائے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

''اور کہتے (تم کون ہو ہمیں ڈرانے والے) ہمارا مال بھی (تم سے) زیادہ ہے اور اولاد بھی اور ہمیں عذاب نہیں دیا جا سکتا [1]''

[1] نیز وہ امراء کہتے ہیں ہم تم سے ہزار درجے بہتر ہیں ذرا چشم ہوش کھول کر تو دیکھو محل وماڑیاں ہماری ہیں زرق برق لباس ہمارے ہیں اولاد کی کثرت ہماری ہے۔ اگر ہم غلط راستے پر ہوتے تو ہمیں یہ سب نعمتیں قطعاً نہ عطا کی جاتیں ان سب نعمتوں کا ہمارے پاس ہونا واضح دلیل ہے کہ ہم اللہ کے پیارے ہیں۔ اور ہمیں کوئی عذاب وغیرہ نہیں دیا جائے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عذاب ہوگا ہی نہیں۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق قیامت برپا ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ ہمیں رسوا اور ذلیل نہیں کرے گا بلکہ وہاں بھی ہمیں عزت وعظمت سے نوازے گا کیونکہ دنیا میں وہ ہمیں احترام واکرام عطا فرما چکا ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٦﴾

''آپ فرمائیے بیشک میرا رب کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لئے چاہتا ہے) لیکن اکثر لوگ (ان حکمتوں کو) نہیں جانتے [1]''

[1] اللہ تعالیٰ اس آیت میں کفار کے اس زعم باطل کو رد فرما رہے ہیں کہ مال کی کثرت اور اولاد میں اضافہ ہدایت کی علامت ہے فرمایا اے محبوب ان دولت کی کثرت پر گھمنڈ کرنے والوں کو بتا دو کہ دولت اس علیم وحکیم رب کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ اپنی حکمت سے دنیا میں بطور آزمائش کسی کو زیادہ دیتا ہے اور کسی کو کم دیتا ہے۔ رزق کی کشادگی اور کثرت توہین اور تکریم کا معیار نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دنیا آزمائش کا دور ہے۔ دار جزاء نہیں ہے اسی وجہ سے دنیا میں خصائص وصفات میں ہم مثل افراد کے احوال مختلف ہوتے ہیں لیکن کفار اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ مال کی کثرت اور اولاد کی زیادتی باعث عزت وکرامت ہے۔

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿٣٧﴾

''اور (یاد رکھو) نہ تمہارے اموال اور نہ ہی تمہاری اولاد ایسی چیزیں ہیں جو تمہیں ہمارا قرب بخش دیں مگر جو ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا (اسے ہی ہمارا قرب نصیب ہوگا) [1] پس یہی لوگ ہیں جن کے لئے دوگنا صلہ ہے ان کے عملوں کا اور وہ بالا خانوں میں امن وامان سے رہیں گے [2]''

[1] زلفی اسم مصدر ہے گویا عبادت اس طرح ہے یقربکم عندنا تقریباً(۱)۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ التی سے پہلے با زائدہ ہو اور التی اموال کی جماعت کے ارادہ سے اموال پر محمول ہو۔ الا من عمل مستثنیٰ منقطع ہے۔ یعنی لیکن جو ایمان لایا اور نیک اعمال کرتا رہا اس کو اس کا ایمان اور نیک عمل ہمارا قرب بخشے گا مال واولاد ہمارے قرب کا باعث نہیں ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یقربکم کے مفعول سے مستثنیٰ متصل ہو۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اموال اور اولاد کسی کو اللہ کا قرب نہیں بخشتے مگر مومن نیک صالح شخص جو اپنا مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے اور اپنی اولاد کو خیر کی تعلیم [illegible]

مضاف محذوف ہے، یعنی مال واولاد نفع بخش نہ ہوں گے مگر اس کے اموال واولاد نفع بخش ہوں گے جو ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا۔
۳؎ یعقوب نے جزاء کو تمیز یا مصدر کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے' مصدر کی صورت میں یہ اس فعل کا مصدر ہوگا جس پر یہ خود دلالت کر رہا ہے۔ اور الضعف کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور لھُمْ اس کی خبر ہے۔ پھر یہ جملہ اولئک کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ اولئک لھم الضعف۔ یجزون جزاءً یعقوب سے ایک روایت یہ بھی مروی ہے کہ الضعف اور جزاء دونوں کو انہوں نے مرفوع پڑھا ہے' الجزاء کو مبتدا اور الضعف کو بدل بنایا ہے اور لھم کو خبر بنایا ہے۔ جمہور قراء نے جزاء کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع اور الضعف کو مضاف الیہ کے اعتبار سے مجرور پڑھا ہے۔ یعنی مصدر مفعول کی طرف مضاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کو اللہ تعالیٰ اعمال حسنہ کا کئی گناہ زیادہ اجر عطا فرمائے گا۔ ایک نیکی کے بدلہ میں دس سے سات سو تک اجر عطا فرمائے گا۔ کئی لوگوں کو ان کی اخلاص کے انتہائی مقام کی وجہ سے بے شمار و بے انتہا نیکیاں عطا فرمائے گا۔ اور فردوس بریں کے بالا خانوں میں انہیں امن و آرام عطا فرمائے گا جہاں ان کی زندگی میں کوئی بے اطمینانی اور پریشانی کا کانٹا اور کوئی چبھن نہ ہوگی۔ حمزہ نے غرفات کو الغرفہ پڑھا ہے اور جنس کا ارادہ کیا ہے اور باقی قراء نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ الغرف کا معنی کسی چیز کا بلند کرنا ہے۔ یہاں اس سے مراد جنت کے بلند و بالا محلات ہیں۔ ہم نے اس آیت کی تفسیر اولئک یجزون الغرفہ بما صبروا کے تحت سورۂ فرقان میں ذکر کردی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

''اور جو لوگ کوشاں ہیں ہماری آیتوں کی تکذیب میں تاکہ ہمیں ہرادیں وہی لوگ عذاب میں ہمیشہ گرفتار رہیں گے۔''

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

''آپ فرمائیے بے شک میرا پروردگار کشادہ کر دیتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے ۱؎ اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے ۲؎ اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے ۳؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو کبھی کشادگی اور خوشحالی عطا فرماتا ہے اور کبھی اسی شخص کو تنگی اور غربت میں مبتلا کر دیتا ہے' اس آیت اور سابقہ آیت میں تکرار نہیں ہے کیونکہ یہ ایک شخص کے متعلق ہے جبکہ پہلی آیت دو شخصوں کے متعلق ہے۔ صاحب البحر المواج فرماتے ہیں پہلی آیت کریمہ ان کے فخر و غرور کے رد کے لئے ہے اور یہ آیت ان کے بخل کے رد کے لئے ہے۔
۲؎ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ میں ما شرطیہ محل نصب میں ہے اور مِنْ شَیْءٍ' ما کا بیان ہے اور جواب شرط فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ہے۔ یعنی جو تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اسکی جگہ یا تو دنیا میں اور عطا فرما دے گا یا آخرت میں اس کا نعم البدل عطا فرمائے گا' جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنا فیاضی اور قدر دانی کا مظاہرہ ہے تو تم اپنے اموال کو اللہ کے راستے میں خرچ کیوں نہیں کرتے اور کنجوسی و بخل کیوں کرتے ہو۔

الرّٰزِقِیْنَ میں حقیقت ومجاز دونوں جمع ہیں' ہم کہیں گے یہاں مجاز کا عموم مراد ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ أَهَٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٤٠﴾

''اور جس روز وہ ان سب کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہاری پوجا کیا کرتے تھے [1]''

[1] ھُم ضمیر کا مرجع کفار ہیں، یعنی متکبرین اور ضعیف لوگوں کو جمع فرمائے گا۔ یَقُوْلُ کا عطف یَحْشُرُ پر ہے۔ یعقوب ابوجعفر اور حفص نے یَحْشُرُ اور یَقُوْلُ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں کو نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ کفار فرشتوں کی پرستش کرتے تھے اور کہتے کہ (نعوذ باللہ) یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ مشرکین کو شرمندہ کرنے کے لئے ملائکہ سے پوچھیں گے کہ یہ لوگ تمہاری پوجا کرتے تھے۔ تو یہ سوال کفار کو رسوا کرنے اور ان کی شفاعت سے انہیں مایوس کرنے کے لئے کیا جائے گا۔ یہاں ملائکہ کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ جن ذوات کی یہ کفار پوجا کرتے تھے اور جن کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے ان میں سب سے معزز یہ ہوں گے اور ان تمام میں خطاب کے اہل بھی یہ ہوں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شرک کی ابتداء ان کی عبادت سے ہوئی تھی۔

قَالُوا سُبْحَٰنَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِم ۖ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۖ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾

''فرشتے عرض کریں گے تو پاک ہے ہر شرک سے۔ ہمارا مالک تو ہے ہمارا ان سے کیا واسطہ بلکہ یہ تو جنوں کی عبادت کیا کرتے تھے ان میں سے اکثر ان پر ایمان رکھتے تھے [1]''

[1] فرشتے عرض کریں گے ہم تجھے ہر شرک سے پاک سمجھتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق اور دوستی فقط تیرے ساتھ ہے' ان بدبختوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے' ہمارے اور ان کے درمیان کوئی مراسم نہیں ہیں۔ گویا فرشتے براءت کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہم ان کی عبادت سے خوش نہ تھے۔ یہ شیطانوں کی عبادت کرتے تھے جنہوں نے ان کے سامنے فرشتوں کی عبادت کو مزین کر کے پیش کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ شیطان ان کے سامنے ایسی شکلوں میں آتے تھے کہ وہ انہیں فرشتے سمجھتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ اکثرھم سے مراد یا کفار ہیں یا اکثر سے مراد کل ہے اور ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں۔ بھم کی ضمیر کا مرجع جن ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَلَا ضَرًّا وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿٤٢﴾

''پس آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ نقصان کی اور ہم کہیں گے جنہوں نے ظلم کیا تھا کہ چکھو آتش (جہنم) کا عذاب جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے [1]''

[1] چونکہ قیامت کے روز حکم صرف اللہ تعالیٰ کا نافذ ہوگا اس لئے جن' انس اور فرشتے ایک دوسرے کو بذات خود نفع یا نقصان' ثواب' شفاعت اور عذاب نہ پہنچا سکیں گے۔ اور مشرکوں نے ان کی عبادت کر کے جو لائق عبادت نہیں تھے' اپنے اوپر ظلم کیا اس لئے انہیں عذاب نار میں جھونک دیا جائے گا اور کہا جائے گا تم جس عذاب کو جھٹلاتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَن يَصُدَّكُمْ

كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾

''اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں انہیں ہماری آیتیں درآں حالیکہ وہ بالکل واضح ہیں کہتے ہیں نہیں ہے یہ مگر ایسا شخص جس نے ارادہ کر لیا ہے کہ روک دے تمہیں ان (معبودوں) سے جن کی تمہارے باپ دادا پوجا کیا کرتے تھے نیز کہتے ہیں نہیں ہے یہ قرآن مگر جھوٹ گھڑا ہوا اور کفار کہتے ہیں حق کے بارے میں جب وہ ان کے پاس آیا کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا کھلا ۱؎ ''

۱؎ عَلَيْهِمْ کی ضمیر کا مرجع اہل مکہ ہیں۔ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ سے مراد قرآن کی آیات ہیں جو محمد ﷺ کی زبان پر واضح ہیں۔ افک سے مراد ایسی بات جو واقع کے مطابق نہ ہو۔ الحق سے مراد نبوت یا اسلام یا قرآن ہے۔ یعنی کفار بلا سوچے سمجھے حق کو کھلا جادو کہہ دیتے ہیں۔ معنی کے اعتبار سے حق کا معنی نبوت اور اسلام ہوگا اور لفظ اور اعجاز کے اعتبار سے قرآن مراد ہے۔ قالوا کے فعل کو مکرر اور صراحۃً کفار کا دوبارہ ذکر کرنا اور الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں اسم موصول کا لام اور للحق پر لام تعریف' ان تمام چیزوں میں اشارہ ہے کہ یہ باتیں کہنے والے کافر تھے اور ان کے کفر نے انہیں اس بات پر برانگیختہ کیا کہ وہ اس کے نبی مکرم ﷺ اور اس کی کتاب مبین اور اس کے دین حنیف کے متعلق ایسی بے تکی اور لایعنی باتیں منسوب کریں جو تھوڑی سی عقل والا بھی نہیں کہہ سکتا اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس چیز کے متعلق ایسی بات انہوں نے کہی ہے وہ حق مبین ہے، اس پر صرف معاند اور مکابر طعن کرتا ہے۔ سلیم الفطرت سے ایسی بات کا ہونا ناممکن ہے' اور یقیناً ان کی یہ بات انتہائی قبیح ہے' اس اسلوب بیان میں اس بات پر آگاہی کرنا مقصود ہے کہ ان کی یہ بات انتہائی ناروا اور انتہائی تعجب خیز ہے۔

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ﴿۴۴﴾

''اور نہ ہی ہم نے انہیں کوئی کتابیں دیں جن کا یہ مطالعہ کرتے ہوں اور نہ ہی ہم نے بھیجا ان کی طرف آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا ۱؎ ''

۱؎ ھم ضمیر کا مرجع کفار مکہ ہیں' یعنی ہم نے کفار مکہ کو کوئی ایسی کتاب نہیں دی جس میں شرک کی صحت کی کوئی دلیل ہو۔ اور نہ ہم نے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا بھیجا ہے جو انہیں شرک کی طرف بلاتا ہو اور شرک کے ترک پر انہیں ڈراتا ہو' پس یہ کس بناء پر شرک کا دعویٰ کرتے ہیں اور کس بنیاد پر قرآن پر' کبھی جھوٹ کا' کبھی سحر کا الزام لگاتے ہیں اور کونسی ان کے پاس حجت ہے جس کے سہارے یہ نبی کریم ﷺ کو جھٹلاتے ہیں' اس ارشاد میں ان کی جہالت اور سفاہت کو آشکارا کیا گیا ہے اور انہیں دھمکی دی گئی ہے۔ یہ آیت کریمہ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے حال ہے۔

وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾

''اور (انبیاء کی) تکذیب کی جو ان سے پہلے گزرے اور یہ (کفار مکہ) نہیں پہنچے دسویں حصہ کو بھی جو (قوت' دبدبہ) ہم

کے ساتھ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سے حال ہے یا قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا پر معطوف ہے۔ یعنی کفار مکہ کے پاس تو ان نعمتوں کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے جو ہم نے پہلی قوموں کو عطا کی تھیں، مثلاً تعداد ان کی ان سے کئی گنا زیادہ تھی، معیشت ان کی ان سے ہزار درجہ بہتر تھی، عمریں بھی ان کی ان سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے میرے رسولوں سے بدتمیزی کی اور ان کی تکذیب کی تو میرا ان پر ایسا عذاب آیا جس نے ان کی ساری نخوتیں اور غرور خاک میں ملا دیا۔ ان کو جو سزا ملی اس کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے اور اس پر کیسے اعتراض ہوسکتا ہے کیونکہ وہ بالکل اپنے مقام پر واقع ہوئی تھی اور جو اس سزا کے مستحق تھے بالکل ان پر ہی مسلط ہوئی تھی۔ یہ استفہام توبیخ کے لئے ہے۔ پس جو ان کی مثل اب میرے نبی الانبیاء کی تکذیب کر رہے ہیں انہیں ایسی حرکات سے باز آ جانا چاہئے۔ کذب کے فعل میں تکرار نہیں ہے کیونکہ پہلا کذب تکثیر کے لئے ہے اور دوسرا فعل تکذیب کے لئے ہے یا پہلا فعل مطلق ہے، مفعول کے ساتھ مقید نہیں ہے، یعنی اس کے لئے مفعول لہ مقدر نہیں ہے بلکہ لازم فعل کے قائم مقام ہے اور دوسرا کذب مفعول کے ساتھ مقید ہے اور اجمال کے بعد تفصیل ہے، اسی وجہ سے ان کے درمیان حرف عطف فاء ذکر کیا گیا ہے۔ صاحب البحر المواج کہتے ہیں فکذبوا رسلی کی ضمیر کا مرجع کفار مکہ ہیں اور اس کا عطف ما بلغو پر ہے۔ پس اس صورت میں تکرار ہوگا ہی نہیں۔ ورش نے نکیری کو صرف وصل کی صورت میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور علماء نے وصل و وقف دونوں حالتوں میں یا کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ ﴿۴۶﴾

"(اے حبیب!) آپ (انہیں) فرمائیے میں تمہیں صرف ایک نصیحت کرتا ہوں (یہ تو مان لو) تم اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ دو دو یا اکیلے اکیلے پھر خوب سوچو (تمہیں ماننا پڑے گا) تمہارے اس رفیق میں جنون کا شائبہ تک نہیں ہے۔ نہیں ہے وہ مگر بروقت خبردار کرنے والا تمہیں سخت عذاب کے آنے سے پہلے [1]"

[1] اس آیت کریمہ میں قیام سے مراد وہ قیام نہیں جو بیٹھنے اور سونے کے مقابلہ میں ہوتا ہے بلکہ یہاں قیام سے مراد کسی کام کے لئے تیار ہونا ہے جیسے اس ارشاد میں ہے اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ۔ یعنی تم تعصب کی عینک اتار کر اور اندھی تقلید سے ہٹ کر رضا الٰہی کے لئے کبھی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر یا اپنے کسی دوست اور ساتھی سے مل بیٹھ کر انصاف کی نظر سے محمد ﷺ کے متعلق سوچو تو تم پر حق کا روئے تاباں بالکل عیاں ہو جائے، حقیقت اپنا نقاب خود بخود الٹ دے گی اور تم پر واضح ہو جائے گا کہ تمہارا بچپن کا ساتھی جسے کائنات ارضی محمد (ﷺ) کے اسم مبارک سے یاد کرتی ہے اس میں آسیب و جنون کی کوئی علامت نہیں ہے بلکہ وہ صاحب عقل اور صاحب دانش ہے، اس کی فکر صائب ہے، اس کے اقوال و افعال کو دیکھ کر کوئی بھی سلیم الفطرت اور شعور رکھنے والا اس کی رسالت اور اس کے جذبات خیر کا منکر نہیں ہوسکتا۔ ہاں اس کا منکر اور اس کو مجنوں کہنے والا وہی ہوسکتا ہے، جس کی اپنی عقل میں خلل ہو۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں یہ کتنا عام فہم معاملہ ہے کہ کیا کوئی شخص تنہا اور بغیر کسی ظاہری طاقت و ثروت کے بغیر کسی دلیل اور وثوق کے ایسا کام شروع کرسکتا ہے یا کوئی ایسا نظریہ پیش کرسکتا ہے جس کی

فَهُوَ لَكُمْ ۔ (جو معاوضہ میں نے تم سے مانگا ہے وہ تم اپنے پاس رکھو) اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے پیش نظر جلب زر اور اموال و جواہر جمع کرنا نہیں ہے' اس کے پیغام اور اس کے نظریات میں کبھی کوئی ایسی کلام اور کوئی ایسا انداز نہیں ملے گا کہ جس سے تم ثابت کر سکو کہ ان کو کوئی معاشی خوشحالی مطلوب ہے' اسی طرح ان کے انداز فکر سے کبھی تم یہ بیان نہیں کر سکتے کہ یہ کوئی عوامی اقتدار کے ذریعے کسی دشمن کا ضرر و نقصان دور کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ تم نظر انصاف سے اس کی سورج سے زیادہ روشن سیرت' چاند سے زیادہ چمکدار صورت اور شبنم سے پاکیزہ تر زندگی میں غور کرو گے تو تم پر بالکل عیاں ہو جائے گا محمد ﷺ تمہارے بہی خواہ ہیں' تمہیں گرداب بلاکت سے بچانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے مقدمات آپ کی اتباع کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں جبکہ معجزات کثیرہ بھی آپ کی تائید و سچائی پر واضح دلیل ہیں۔ ان تقوموا واحدۃ بدل یا بیان کی حیثیت سے محل جر میں ہے یا ھو ضمیر کے اضمار کے ساتھ محل رفع میں ہے' یا اعنی فعل کے اضمار کے ساتھ محل نصب میں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب آیت کریمہ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو آپ ﷺ صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور ندا دی اے بنی فہر! اے بنی عدی آپ یہ ندا دیتے رہے حتی کہ سب لوگ جمع ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں بتاؤں کہ ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم میری بات مان لو گے؟ تو سب نے بیک زبان ہو کر کہا بالکل مان لیں گے کیونکہ ہم نے تو تمہیں اپنی ہر بات میں سچا پایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید میں تمہیں بروقت سخت عذاب کے آنے سے پہلے خبردار کرنے والا ہوں' ابولہب (لعنۃ اللہ علیہ) نے کہا تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں کیا تو نے ہمیں اس لئے جمع کیا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ یہ حدیث متفق علیہ ہے (1)۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۞

"فرمایئے (لوگو!) جو معاوضہ میں نے تم سے مانگا ہے وہ تم اپنے پاس رکھو میری (دلسوزیوں) کا اجر تو (میرے) اللہ کے ذمہ ہے [1] اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے [2]"

[1] میں تمہیں پیغام توحید پہنچانے پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے جو تمہیں یہ کہا ہے مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِیْلًا میں نہیں مانگتا تم سے اس (خیر خواہی) پر کچھ اجرت مگر میری اجرت یہ ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے اور جو میں نے کہا ہے لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى ؕ (ترجمہ) میں نہیں مانگتا اس (دعوت حق) پر کوئی معاوضہ بجز قرابت کی محبت کے۔ اس پر میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا بلکہ یہ چیزیں بھی تمہارے فائدہ اور بھلے کے لئے ہیں کیونکہ جو تم میں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ کو اپنائے گا تو اس میں بھی اس کا بھلا ہو گا اور میری قرابت تمہاری قرابت ہے۔ میں کہتا ہوں نبی کریم ﷺ کے قرابتداروں سے مراد علماء ظاہر و باطن ہیں خواہ اہل بیت سے ہوں یا کوئی

میرے رب سے اجر عظیم نہ ملتا ہوتا تو میں یقیناً ایسی اذیتیں اور مشقتیں کبھی نہ اٹھاتا۔ پس تمہارے لئے ضروری ہے کہ میری اتباع کرو اور ایسے اعمال حسنہ کرو جو تمہارے لئے جناب الٰہی میں اجر کو ثابت کر دیں اور نیک اعمال کا جو اس نے وعدہ فرمایا ہے تم اسکی مہربانی سے مستحق قرار پاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے معاذ تجھے علم ہے کہ اللہ کا بندوں پر حق کیا ہے؟ اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر کیا ہے؟ حضرت معاذ فرماتے ہیں میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے' آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اسے وہ عذاب نہ دے (1)۔ یہ حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت معاذ سے روایت کی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے پس وہ ہر شخص کو اس کے اعمال اور اعتقاد کے مطابق اجر عطا فرمائے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾

"فرمائیے بیشک میرا رب (باطل پر) حق سے ضرب لگاتا ہے ۱۔ وہ سب غیبوں کو جاننے والا ہے ۲۔"

۱۔ یعنی آپ اعلان فرمادیں کہ میرا رب وہ ہے جو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے حق کا نزول فرماتا ہے۔ یا یہ معنی کہ حق کے ساتھ باطل طاغوتی قوتوں پر حق کے ساتھ ضرب لگاتا ہے اور انہیں پاش پاش کر دیتا ہے یا یہ معنی کہ آفاق عالم میں حق کو پہنچائے گا اور غلبہ اسلام کا جو اس نے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ امام احمد نے حضرت مقداد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سطح زمین پر کوئی مٹی کا گھر اور کوئی اون کا خیمہ نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ عزیز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ اس میں کلمہ اسلام کو داخل فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ جن کو عزت دے گا ان کو عزت والوں سے بنادے گا اور جن کو ذلیل کرے گا وہ ذلیل ہو کر دین کی اطاعت کریں گے (2)۔

۲۔ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ صفت ہے جو اِنَّ کے اسم محل پر محمول ہونے یا یقذف کی ضمیر سے بدل یا اِنَّ کی دوسری خبر یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر مرفوع ہے' یعنی وہ سب غیوب کو جانتا ہے اور وہ یہ بھی خوب جانتا ہے کہ وحی کی اہلیت کس میں ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ دین اسلام کا اچھا انجام کیسے ہوگا؟ وہ دین اسلام کے ساتھ کفر کو دفع کرے گا اور اس کا پرچم شرق و غرب میں لہرائیگا۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾

"(اے محبوب!) اعلان کر دیجئے حق آ گیا اور باطل کی قوت کا خاتمہ ہو گیا ۱۔"

۱۔ اے پیارے محمد ﷺ اپنی زبان حق ترجمان سے اعلان فرمائیے کہ قرآن' اسلام اور توحید کو غلبہ نصیب ہوگا اور شرک و باطل ختم ہو جائے گا' نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا تا کہ وہ کوئی نیا کام شروع کر سکے اور کسی کام کا اعادہ کر سکے گا۔ ارشاد فرمایا۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ (ترجمہ) بلکہ ہم تو چوٹ لگاتے ہیں حق سے باطل پر پس وہ اسے کچل دیتا ہے اور وہ یکا یک نابود ہو جاتا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں باطل سے مراد ابلیس ہے (3) یعنی ابلیس نہ کسی کو پیدا کر سکے گا اور نہ کسی کو قیامت کے روز اٹھا سکے گا۔ کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں باطل سے مراد بت ہیں (4)۔ امام بغوی فرماتے ہیں کفار مکہ

نبی کریم ﷺ کو کہتے کہ آپ راہ راست سے بھٹک گئے ہیں کیونکہ آپ نے اپنے آباءواجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے(1)' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِیْ ۚ وَ اِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْۤ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ﴿۵۰﴾

''فرمائیے (تمہارے گمان کے مطابق) اگر میں بہک گیا ہوں تو اس کا وبال میری جان پر ہوگا اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو (محض) اس وحی کے باعث جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے 1 بے شک وہ سب کچھ سننے والا' بالکل نزدیک ہے۔ 2''

1 اے محبوب مکرم (ﷺ) ان عقل کے دشمنوں سے کہو کہ اگر میں نے جو دین اختیار کیا ہے یہ گمراہی ہے تو میری گمراہی کا وبال میرے نفس پر ہی لوٹے گا' اور میں اپنے نفس پر اس وبال کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں کیونکہ نہ تو میں دیوانہ ہوں اور نہ مجھے کوئی سیاسی یا معاشی غرض ہے اور اگر میں دین حق اور دین ہدایت پر ہوں تو یہ بھی میرے نفس کا کمال نہیں ہے اور یہ ہدایت نہ میں نے اس شہر کے کسی عالم سے سیکھی ہے کیوں کہ تم سب کو معلوم ہے کہ میں نہ لکھنا جانتا ہوں اور نہ میں نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہے (ان سب مقدمات کو جمع کرو تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ میں اللہ کا سچا نبی ہوں اور مجھے تمہاری خیر خواہی مطلوب ہے) پس تم پر لازم ہے کہ میری اتباع کرو' ہدایت پا جاؤ گے جیسا کہ میں نے ہدایت پائی ہے۔ یہ نبوت پر استدلال ہے۔ اس اسلوب میں دو شرطوں کے درمیان مقابلہ ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ان دونوں شرطوں کے درمیان مقابلہ صرف معنی کے اعتبار سے ہے' کیونکہ ان ضللت فانما اضل علی نفسی کا معنی یہ ہے کہ میں اگر گمراہ ہوں تو اپنے نفس کے سبب ہوں اور میری گمراہی کا وبال میرے نفس پر ہے کیونکہ وہی میرا نفس ہی گمراہی کا سبب ہے اور بالذات گمراہ اور جاہل ہے اور برائی کا حکم دینے والا ہے(2) اور اگر میں ہدایت یافتہ ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور توفیق سے ہے۔ (ان دونوں شرطوں کے درمیان ظاہراً مقابلہ تب ہوتا جب دونوں شرطوں میں ''علی'' کا کلمہ ذکر ہوتا یا باء کا کلمہ ذکر ہوتا) گویا یہ آیت کریمہ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ کی طرح ہے۔

2 وہ سب کچھ سننے والا اور بالکل قریب ہے۔ ہر گمراہ اور ہدایت یافتہ کے قول و فعل کا ادراک رکھتا ہے اگر چہ وہ اسے کتنا ہی مخفی رکھے۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ ﴿۵۱﴾

''کاش! تم دیکھو جب یہ گھبرائے ہوں گے' بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے 1''

1 تَرٰۤى کا فاعل عام مخاطب ہے۔ کفار کی گھبراہٹ اور سراسیمگی کے وقت سے مراد ان کی موت کا وقت ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں قیامت کے روز اٹھنے کا وقت ہے(3) لو کا جواب لرایت امرا فظیعا محذوف ہے۔ یعنی موت کے وقت یا قیامت کے روز ان کی حالت دیدنی ہوگی' ان کی خواہش تو ہوگی کہ اللہ تعالیٰ سے کہیں بھاگ جائیں، کسی مضبوط مکان میں اپنے آپ کو محفوظ کر لیں یا اپنی

جائے گا یا روز محشر موقف سے دوزخ میں ڈالے جانے تک پکڑ لیا جائے گا اور ضحاک فرماتے ہیں یہ بدر کے دن کفار سے سلوک ہو چکا ہے، انہیں قریب کے مکان سے عذاب دینے کے ساتھ پکڑ لیا گیا تھا۔ لیکن بعد والا قول اس تاویل کی تائید نہیں کرتا۔

وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۝۵۲

''اس وقت کہیں گے ہم ایمان لے آئے ان پر[1] لیکن اب کیونکر وہ پا سکتے ہیں ایمان کو[2] اتنی دور جگہ سے[3] ''

[1] بِهٖ کی ضمیر کا مرجع محمد ﷺ ہیں، آپ کا ذکر پہلے مابصاحبکم کے ارشاد میں ہو چکا ہے 'انہوں نے بدر کے دن تو یہ نہیں کہا تھا کہ ہم محمد ﷺ پر ایمان لائے ہیں بلکہ ابوجہل کو جب قتل کیا جا رہا تھا اور اس کی زندگی میں کچھ رمق باقی تھی' حضرت ابن مسعود نے اس کی داڑھی سے پکڑا اور کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَخْزَاکَ یَا عَدُوَّ اللّٰهِ سب تعریفیں اس ذات کے لئے ہے جس نے تجھے رسوا کیا۔ ابو جہل نے کہا اس نے مجھے کیسے رسوا کیا ہے۔ جس کو اپنی قوم ہی قتل کر دے اس کی رسوائی کیسے ہوتی ہے۔ کفار موت کے وقت (جب آنکھیں کھلی ہونگی اور عزرائیل علیہ السلام سختی سے انگ انگ سے روح نکال رہے ہوں گے) کہیں گے ہم محمد ﷺ پر ایمان لائے اور جب قبور سے نکل کر عذاب کا مشاہدہ کریں گے اور عذاب سامنے نظر آ رہا ہوں گا تو کہیں گے ہم محمد ﷺ پر ایمان لائے۔ (اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ سابقہ آیت کی ضحاک نے جو تاویل بیان کی ہے وہ درست نہیں ہے)

[2] نافع' ابن کثیر' ابن عامر اور حفص نے التناوش کو واؤ کے ضمہ اور بغیر مد کے پڑھا ہے اور اس کا معنی کسی چیز کو لے لینا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس وقت ایمان اور توبہ کا پانا ان کے لئے کہاں سے ہوگا۔ باقی قراء نے واؤ کی جگہ ہمزہ اور مد کے ساتھ پڑھا ہے اور حمزہ جب وقف کرتے ہیں تو اسے بین بین کرتے ہیں کیونکہ یہ النئش (بالہمزہ) سے مشتق ہے اور اس کا معنی آہستہ آہستہ حرکت کرنا ہے۔ یعنی ان کے لئے حرکت کرنا اور ایمان و توبہ کو طلب کرنا کیسے ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ النوش سے مشتق ہو جس کا معنی التناوش ہو۔ اور اس کی اصل واؤ ہو۔ پھر واؤ کے ضمہ کے لزوم کی وجہ سے واؤ ہمزہ سے بدل گئی ہو، اسی وجہ سے حمزہ واؤ کے ضمہ کے ساتھ وقف کرتے ہیں۔ اور یہ اپنی اصل پر وارد ہے الدانی نے التیسیر میں اسی طرح لکھا ہے۔ قاموس میں النأش (بالہمز) کا معنی 'لینا' پکڑنا' اٹھنا، تاخیر کرنا لکھا ہے(1)۔ اور یہاں تاخیر کرنے والا معنی درست نہیں ہے لیکن باقی سب معانی یہاں چسپاں ہو سکتے ہیں۔ النوش (بالواؤ) کا معنی کسی چیز کو لینا' طلب کرنا' چلنا اور اٹھنے میں جلدی کرنا ہے۔

[3] ایمان کا قبول کرنا اس وقت ہوتا ہے جب انسان مکلف ہو۔ اب تکلیف کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب تو جزاء و سزا کا زمانہ شروع ہو گیا ہے۔ ایمان قبول کرنے اور توبہ کرنے کا وقت فوت ہو جانے کے بعد کفار کے خلاصی طلب کرنے کو محال ہونے میں اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو دور والی چیز کو اس طرح حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جیسے وہ ایک ہاتھ کے فاصلہ پر ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں کفار قیامت کے روز دنیا کی طرف لوٹنے کا سوال کریں گے تو انہیں کہا جائے گا آخرت سے دنیا کی طرف لوٹنا کیسے ہو سکتا ہے(2)۔

وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۝۵۳

1. بِہٖ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے یا محمد ﷺ ہے جن کا ذکر مابصاحبکم میں ہو چکا ہے یا قرآن ہے جس کا ذکر جاء الحق کے ضمن میں ہوا ہے یا عذاب ہے جو اخذوا سے مفہوم ہے۔ یہ جملہ قالوا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی اس سے پہلے جبکہ توحید ٔ رسالت اور قرآن کو قبول کرنے اور ماننے کا وقت تھا اس وقت تو ان کے شب و روز اسی مشغولیت میں سرہوئے کہ کبھی توحید باری تعالیٰ کا انکار' کبھی میرے نبی پر لایعنی الزامات و اعتراضات کبھی قرآن کی روشن آیات پر اور عقیدہ قیامت پر پھبتیاں۔

2. بغیر کسی دلیل کے بن دیکھے نبی کریم ﷺ کی شان اقدس میں ہذیان بکتے تھے اور آخرت کے تصور اور نظریہ کے متعلق مختلف شبہات بیان کرتے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ شاید ان کی حالت کو ایک ایسے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جو اندھیرے میں تیر مار رہا ہے اور دور کھڑا ہے جہاں سے اسے نشانہ بھی نظر نہیں آرہا ہے' کیا ایسے شخص کا تیر اپنے نشانہ پر پہنچ سکتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ بدبخت محمد ﷺ کے متعلق ایسی لایعنی باتیں بکتے جن کا انہیں خود بھی علم نہیں ہوتا تھا(1) کبھی کہتے ساحر ہے کبھی کہتے مجنون ہے۔ ان ہرزہ سرائیوں پر ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہ تھی۔ لایعنی باتیں اور ہرزہ سرائی کرنے کے لئے عرب کہتے ہیں یقذف بالغیب۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ اپنے گمان سے کہتے کہ نہ قیامت قائم ہوگی، نہ جنت ہے اور نہ دوزخ ہے(2)۔ یقذف بالغیب کا یہی معنی ہے۔ ویقذفون الخ کا عطف کَفَرُوْابِہٖ پر ماضی کی حالت کی حکایت کی بناء پر ہے۔ یا اس کا عطف قالوا پر ہے۔ اس عطف کی صورت میں ان کی حالت کی تشبیہ ایسے شخص سے ہوگی جو لایعنی باتیں کرتا ہے' دنیا میں ایمان ضائع کرنے کے بعد اب اس کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾

''اور رکاوٹ کھڑی کر دی جائے گی ان کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جو وہ دل سے چاہتے ہوں گے جیسے ان کے ہم مشرب لوگوں کے ساتھ پہلے کیا گیا تھا وہ ایسے شک میں مبتلا تھے جو دوسروں کو بھی شک میں ڈالنے والا تھا۔1''

1. یعنی ایمان کے نفع' دوزخ سے نجات یا دنیا کی طرف لوٹنے' یا دنیا کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی خواہش کریں گے لیکن ان کے درمیان اور ان کی امیدوں کے درمیان ایسا دبیز پردہ حائل ہوگا، ایسی مضبوط اور بلند دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس کا کراس کرنا ان کے لئے ناممکن ہوگا۔ بَيْنَهُمْ ظرف حِيل کے نائب فاعل کے قائم مقام ہے یا حِيل اپنے مصدر کی طرف منسوب ہے یعنی حِيل الحيلولة۔ ابن عامر اور کسائی نے حاء کو ضمہ کے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے کسرہ کے اخلاص کے ساتھ پڑھا ہے۔ اشیاع سے مراد گذشتہ منکر قومیں ہیں۔ یعنی اس سے پہلے وہ قیام قیامت اور عذاب میں مبتلا کیے جانے کے بارے میں شک کرتے تھے۔ مریب: یا تو اسم فاعل ہے یا ذی ریبۃ کے معنی میں ہے اور یہ مشکک یا شاک سے منقول ہے۔ اور مبالغہ کے لئے شک کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی شفیع المذنبین۔

سورۂ فاطر

آیاتھا ۴۵ | سُوْرَةُ فَاطِرٍ مَكِّيَّةٌ ۳۵ | رکوعاتھا ۵

سورۂ فاطر مکی ہے اس میں پینتالیس آیات اور پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا [1] جس نے بنایا ہے فرشتوں کو پیغام رساں جو پردار بازوؤں والے ہیں کسی کے دو کسی کے تین اور کسی کے چار وہ زیادہ کرتا ہے بناوٹ میں جو چاہتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے [2]''

[1] یعنی اللہ تعالیٰ بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے زمین اور آسمانوں کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ فاطر الفطرہ سے مشتق ہے جس کا معنی نیست سے ہست کرنا ہے۔ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اضافت معنوی ہے کیونکہ فاطر اسم فاعل بمعنی ماضی ہے اور یہ اسم جلالت کی صفت ہے۔

[2] فرشتے اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام اور نیک لوگوں کے درمیان پیغام رسانی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے وحی لے کر انبیاء کرام اور رسولوں تک پہنچاتے ہیں اور الہام والقاء یا سچے خوابوں کے ذریعے اولیاء کرام کو مشرف فرماتے ہیں یا یہ فرشتے اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان قدرت الٰہیہ کے کرشمے ظاہر کرنے پر مامور ہیں۔ جاعل کی ملائکہ کی طرف اضافت لفظی ہے کیونکہ جاعلٌ رسلاً میں عمل کر رہا ہے اور یہ دوسرے مفعول میں عامل ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ پہلے مفعول میں عامل نہ ہو کیونکہ یہ افعال قلوب کے ملحقات سے ہے اور ان میں ایک مفعول پر اقتصار جائز نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حال یا استقبال میں محمد ﷺ اور آپ کی امت کے خواص تک کے لئے پیغام رساں بنایا ہے۔ جاعلٌ اسم جلالت سے بدل ہے، صفت نہیں ہے۔ اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ، رسلاً سے بدل ہے مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ، اجنحة کی صفات ہیں۔ قتادہ اور مقاتل فرماتے ہیں فرشتوں میں سے کسی کے دو کسی کے تین اور کسی کے چار پر ہیں (1) یہ چار تک حصر نہیں ہے اسی حصر کے وہم کو دور کرنے کے لئے ارشاد فرمایا يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ۔ یعنی اپنی مخلوق میں سے جس کے لئے چاہتا ہے اس میں اضافہ فرما دیتا ہے۔ امام مسلم نے ابن مسعود سے لقد رای من آیاته الکبری کی آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل کو اس کی اصلی صورت میں دیکھا اس کے چھ سو پر تھے (2)۔

تھے اور اس کے پروں سے موتی اور یاقوت جھڑ رہے تھے۔ یہ جملہ (یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ) مستانفہ ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ مخلوق میں تفاوت مشیت الٰہی اور حکمت الٰہی کا مقتضی ہے۔ مخلوق کے اجسام بذات خود اس تفاوت کا تقاضا نہیں کرتے۔ یہ آیت کریمہ جسامت اور معانی جیسے چہرہ کی ملاحت، حسن صوت، سماحت نفس، عقل و دانش وغیرہ کو شامل ہے، یعنی جس کے لئے چاہتا ہے ان چیزوں میں زیادتی پیدا فرما دیتا ہے۔ ابن شہاب فرماتے ہیں اس اضافہ سے مراد حسن الصوت ہے(1) قتادہ فرماتے ہیں آنکھوں کی ملاحت ہے۔ بعض فرماتے ہیں عقل و دانش مراد ہے(2)۔ یہ تمام چیزیں بطور تمثیل ہیں۔

مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَ مَا یُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۲

"جو عطا فرمائے اللہ تعالیٰ لوگوں کو (اپنی) رحمت سے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو روک دے، تو اسے کوئی دینے والا نہیں اس کے روکنے کے بعد [1] اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے [2]"

[1] یَفْتَحِ کا اصل معنی کسی بند چیز کو کھول دینا ہے لیکن یہاں بطور مجاز یعطی (عطا کرنا) کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ سبب کا اطلاق مسبب پر کیا گیا ہے۔ رحمت سے مراد نعمت دینیہ ہے جیسے ایمان، علم، نبوت اور نیکیوں کی توفیق وغیرہ یا نعمت دنیویہ مراد ہے جیسے بارش، رزق، امن و سکون، صحت، جاہ و حشمت، مال اور اولاد وغیرہ۔ پہلے (فَلَا مُمْسِكَ لَهَا فرمایا) یعنی ضمیر مونث ذکر فرمائی اور فلا مرسل له میں ضمیر مذکر ذکر فرمائی۔ ضمیروں کا یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ پہلے اسم موصول کی تفسیر رحمت سے کی گئی ہے اس لئے وہاں اس کے معنی کی رعایت کی گئی ہے، اور دوسری جگہ اسم موصول مطلق ہے جو رحمت اور غضب دونوں کو شامل ہے، اس لئے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ضمیر مذکر ذکر فرما دی۔ اس آیت میں رحمت کے پہلے ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔

[2] وہ عزیز ہے، یعنی جو اس کا ارادہ اور مشیت ہوتی ہے اس کے کر گزرنے پر غالب ہوتا ہے، کوئی اس سے اس کے ارادہ میں جھگڑ نہیں سکتا۔ وہ حکیم ہے، اس کا ہر کام علم اور اتقان کے ساتھ ہوتا ہے۔ بخاری اور مسلم نے صحیحین میں مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد یہ کلمہ پڑھتے تھے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ(3)۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ وہ تمام اشیاء کا خالق ہے، جیسے چاہتا ہے اپنی مخلوق میں تصرف فرماتا ہے، اس لئے تمام لوگوں کو اپنے بے پایاں انعامات پر شکر کرنے کا حکم فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ٘ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳

"اے لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو اس نے تم پر فرمائی (بھلا یہ تو بتاؤ) کیا اللہ کے بغیر کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں

تمہیں حرم میں رہائش اور سکونت عطا فرمائی۔ تمہیں ہر قسم کے حملوں سے محفوظ فرما دیا' زمین کو تمہارے لئے بچھونا فرمایا۔ آسمان کو تمہارے سروں پر بغیر ستون کے بلند فرمایا۔ نیز تمہاری تخلیق فرمائی۔ اور وہ اپنی مخلوق سے جو زیادتی چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ اس نے رزق کے دروازے کھول دیے جنہیں کوئی بند کرنے والا نہیں ہے' کسی غیر کو ان نعمتوں کے عطا کرنے میں کچھ دخل نہیں ہے۔ تاکہ اسے خدا کا شریک بنایا جائے۔ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ایسا خالق ہے جو تم پر آسمان سے بارش برساتا ہو اور زمین سے گوناں گوں پودے اور اناج اگاتا ہو۔ خالق سے پہلے من زائدہ ہے کیونکہ استفہام نفی کے معنی میں انکار کے لئے ہے۔ اور خالق مبتدا ہے۔ غیر اللہ رفع کی قرأت کے مطابق خالق کا فاعل ہے۔ یا خالق مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ۔ یا خالق کی خبر غَيْرُ اللّٰهِ ہے یا خالق کی خبر یرزقکم ہے اور غَيْرُ اللّٰهِ خالق کی صفت ہے یا بدل ہے۔ حمزہ اور کسائی ؒ نے غَيْرُ اللّٰهِ کو لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے اور باقی قراء نے محل پر محمول کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے یا خالق فعل محذوف کا فاعل ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی هل یرزقکم من خالق غیر اللّٰه اور یرزقکم خالق کی صفت کے اعتبار سے محل جر یا رفع میں ہوگا۔ یا حال کی حیثیت سے محل نصب میں ہوگا یا یرزقکم 'مضمر فعل یرزق کی تفسیر ہے یا یرزقکم علیحدہ نئی مستقل کلام ہے اور ترکیب میں اس کا کوئی محل نہیں ہے۔ جب اس کے علاوہ کوئی معبود حقیقی نہیں ہے تو تم کس وجہ سے توحید سے منہ موڑ کر شرک کی گہری وادی بھی سرکش گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑے جا رہے ہو' جبکہ تم خود اعتراف بھی کرتے ہو کہ صرف وہی خالق ہے اور وہی رازق ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی تخلیق کرنے والا ہے اور نہ سامان رزق مہیا فرمانے والا ہے۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ④

"اور (اے حبیب!) اگر یہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں (تو کوئی نئی بات نہیں) آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا [1] اور (آخرکار) اللہ کی طرف ہی سارے کام لوٹائے جاتے ہیں [2]"

1۔ اگر انہوں نے تیری دعوت توحید اور نظریہ قیامت اور ثواب وعقاب کو جھٹلایا تو اس میں کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ آپ سے پہلے انبیاء کرام کے ساتھ بھی یہ سلوک روا رکھا گیا ہے۔ اس لئے آپ ان کی دلخراش باتوں پر صبر کیجئے اور رنجیدہ خاطر نہ رہا کریں۔ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ کی جزاء کو حذف کر کے اس کے قائم مقام فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ کو رکھا گیا ہے۔ یعنی مسبب کی جگہ سبب کو رکھا گیا ہے۔ رسلٌ پر تنوین تعظیم کے لئے ہے جو تسلی اور صبر پر برانگیختہ کرنے پر دلالت کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ یعنی اے حبیب مکرم! ان کے انکار پر دکھی نہ ہوا کریں کیونکہ آپ سے پہلے بھی انبیاء کرام اپنی اپنی قوموں کے پاس تشریف لائے جن کے پاس اپنی صداقت کے کئی معجزات اور نشانیاں تھیں اور وہ اپنی طویل عمروں میں پوری دلسوزی کے ساتھ لوگوں کی شاہراہ حق کی طرف راہنمائی کرتے رہے۔ وہ بھی بڑے مضبوط ارادہ اور بلند عزائم کے مالک تھے لیکن ازلی بدبختوں نے ان کی ہر کوشش کو ٹھکرا دیا اور گمراہی کے گھپ اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔

2۔ تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ وہ تمہیں تمہارے صبر پر اپنی نصرت کے ساتھ جزاء دے گا' نیکیوں پر ثواب عطا فرمائے گا۔

يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٝ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝

”اے لوگو! (یاد رکھو) یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے پس دھوکہ میں نہ ڈال دے تمہیں دنیوی زندگی اور نہ فریب میں مبتلا کردے تمہیں اللہ کے بارے میں وہ بڑا فریبی لے“

لے اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وقوع قیامت کا وعدہ فرمایا ہے۔ وہ یقیناً پورا ہوگا، اس میں خلف کا قطعاً احتمال نہیں ہے۔ پس تمہیں دنیا کی رنگینیاں اور لذتیں اس طرح مشغول نہ کردیں کہ تمہیں آخرت کا تصور ہی بھول جائے' اور آخرت کو سنوارنے کی کوشش سے غافل ہو جاؤ اور یاد رکھو کہ کہیں شیطان مردود تمہیں آخرت کا عذاب بھلا نہ دے یا تمہیں بخشش اور مغفرت کی امیدیں دلا کر معصیت پر اصرار کی روش پر نہ چلا دے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے اور ممکن بھی ہے کہ اس رب کریم کی رحمت بڑے بڑے مجرموں کو معاف کردیتی ہے لیکن بخشش کے احتمال اور مغفرت کی امید پر بھی گناہ کا ارتکاب اس چیز کے مشابہ ہوجاتا ہے جو تریاق کے احتمال پر زہر کو کھاتا ہے۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝

”یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو لے وہ فقط اس لئے (سرکشی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو تاکہ وہ جہنمی بن جائیں ٢ے“

لے شیطان تمہارا ازلی اور قدیمی دشمن ہے کیونکہ اس نے دربار الٰہی سے نکلنے کے وقت قسم اٹھا کر کہا تھا فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (تیری عزت کی قسم میں ان تمام کو راہ راست سے بھٹکاؤں گا) جب وہ تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو اس کی عداوت اور دشمنی پر یقین رکھو کسی وقت بھی اس کی وسوسہ اندازی سے غافل نہ رہو ہر حال میں چوکنا رہو اور اس ظالم کی اتباع و اطاعت نہ کرو اس کو ذلیل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرو۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر وہ کام کرے جو محبوب کو پسند ہو اور اس سے خوش ہو۔ اور دشمنی کا مقتضی یہ ہے کہ انسان وہ کام کرے جو دشمن کو ناپسند ہو اور اس کو غصہ دلاتا ہو۔ یہ جملہ سابق نہی کی علت بیان کر رہا ہے۔

٢ے وہ بدبخت اپنے گروہ کو گناہوں' خواہشات نفس اور دنیا کی طرف میلان و اشتغال کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ دوزخی بن جائیں۔ لِيَكُوْنُوْا، يدعو کے متعلق ہے اور یہ اس کی عداوت کا ثبوت اور اس کے مقصود کا بیان ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

”جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے لے“

لے آیت میں شیطان سے موافقت اور مخالفت رکھنے والوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے، یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا اور شیطان کی

اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۫ۖ فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَیۡهِمۡ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ⊙

’’پس کیا وہ شخص جس کے لئے مزین کر دیا گیا ہے اس کا برا عمل اور وہ اس کو خوبصورت نظر آتا ہے (اس کے لئے آپ آزردہ کیوں ہوں) [1] بیشک اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے پس نہ گھلے آپ کی جان ان کے لئے فرط غم سے بیشک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔ جو (کرتوت) وہ کیا کرتے ہیں [2]‘‘

[1] راہ حسناً کا عطف زین پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جسے رسوا اور ذلیل فرمانا چاہتا ہے تو اس کی خواہش نفس اس کی عقل پر غالب آ جاتی ہے اور شیطان اس کے دل میں وسوسہ اندازی کرتا ہے حتیٰ کہ وہ برائی کو اچھائی سمجھتا ہے اور باطل کا قبیح چہرہ اسے حق کا رخ زیبا نظر آتا ہے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ جس کی حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے اور شیطان اپنے تمام فریب اور فسوں استعمال کرنے کے باوجود اسے پچھاڑ نہیں سکتا ہے حتیٰ کہ وہ حق و باطل میں تمیز کرتا ہے، اچھے اعمال کو مستحسن اور برے اعمال کو قبیح جانتا ہے چونکہ فَاِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ کا ارشاد جواب شرط پر دلالت کر رہا ہے اس لئے جواب شرط کو حذف کیا گیا ہے۔ اَفَمَنۡ زُیِّنَ میں ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے **اتطمع ان تهتدی کل رجل فیکون المخذول من اللّٰه والمهدی سواء لا تطمع ذالک فان اللّٰه یضل من یشاء و یهدی من یشاء**۔ یعنی کیا آپ ہر شخص کو ہدایت دینے کی خواہش رکھتے ہیں پھر تو اللہ کی طرف سے ہدایت سے محروم شخص اور ہدایت یافتہ برابر ہوں گے آپ ایسی خواہش نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

[2] آپ ان کی گمراہی اور غوایت پر افسوس اور حسرت کرتے ہوئے اپنے نفس کو نہ گھلائیں (یہ اس دردمندی اور ہمدردی کے مظاہرہ کے مستحق ہی نہیں ہیں) **حسرات** علیت کی بناء پر منصوب ہے۔ حسرة کا معنی اس چیز پر انتہائی غم اور حزن کا اظہار کرنا جو مفقود ہو گئی ہو اور حسرة کی جمع حسرات ہے۔ حسرات یعنی جمع کا لفظ ذکر فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ محبوب کریم ﷺ ان کے حالات پر بہت زیادہ غم کھاتے تھے۔ یا ان کے ان برے افعال پر افسردہ خاطر ہوتے تھے جو افسوس کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ **علیهم**، **حسرات** کے متعلق نہیں ہے کیونکہ مصدر کا صلہ مصدر سے مقدم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تذهب کا صلہ ہے یا متحسر علیہ (جس پر حسرت کا اظہار کیا جائے) کا بیان ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے **اتغتم بکفرهم فمن زین له سوء عمله فاضله اللّٰه تذهب نفسک علیهم حسرة**۔ یعنی آپ ان کے کفر سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں اور ان پر اظہار حسرت نہ فرمائیں۔ **فلا تذهب** محذوف جواب پر دلالت کر رہا ہے اور فَاِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ تعلیل کے طور پر جملہ معترضہ ہے۔ الحسین بن الفضل فرماتے ہیں اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے۔ **افمن زین له سوء عمله فراه حسناً فلا تذهب نفسک علیهم حسرات فان اللّٰه یضل من یشاء ویهدی من یشاء**۔ یعنی جس کے لئے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا ہے اور وہ اس کو خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ پس آپ ان پر اظہار حسرت نہ فرمائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسکو چاہتا

ہے(1)۔ جویبر نے عن الضحاک عن ابن عباس کے سلسلہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اَعِزَّ دِیْنَکَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَوْ بِاَبِیْ جَھْلِ بْنِ ھِشَامٍ (اے اللہ عمر بن خطاب یا ابوجہل کے ذریعے اپنے دین کو تقویت عطا فرما۔ پس آپ کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے عمر بن خطاب کو ہدایت عطا فرمائی اور ابوجہل کو گمراہ کر دیا تو یہ آیت کریمہ ان دونوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ بدعتی اور خواہش نفس کے پجاریوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ ان خوارج کے متعلق نازل ہوئی ہے جو مسلمانوں کا خون بہانا حلال سمجھتے تھے اور ان کے مال لے لینا بھی جائز سمجھتے تھے۔ لیکن گناہ کبیرہ کے مرتکب ان میں سے نہیں ہیں کیونکہ وہ گناہ کبیرہ حلال نہیں سمجھتے(2) بلکہ باطل کو باطل تسلیم کرتے ہیں اگرچہ اس کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے' پس وہ اس پر انہیں جزاء و سزا دے گا۔

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ⑨

''اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو وہ اٹھا لاتی ہیں بادل کو' پھر ہم لے جاتے ہیں بادل کو مردہ شہر کی طرف پھر ہم زندہ کر دیتے ہیں اس بادل (کے مینہ) سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد[1] یونہی (انہیں) قبروں سے اٹھایا جائے گا[2]''

[1] وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ کا عطف ان وعد اللہ حق پر ہے۔ ابن کثیر' حمزہ اور کسائی نے جنس کے ارادہ سے الریح (مفرد) پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے الریاح (جمع) پڑھا ہے۔ پہلے ارسل ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا آگے فَتُثِيْرُ مضارع کا صیغہ ہے۔ اس اختلاف افعال کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کمال حکمت پر اس صورت بدیعہ کو ذہن میں حاضر کیا جائے' کیونکہ مقصود ہوا کو اس خصوصیت کے ساتھ پیدا کرنے کو بیان کرنا ہے۔ اسی وجہ سے فعل کی نسبت ہوا کی طرف فرما دی کہ وہ بادل کو اٹھا لاتی ہیں۔ اختلاف افعال کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ استمرار امر پر دلالت مقصود ہو۔ فسقناہ میں غیبت سے تکلم کی طرف التفات ہے کیونکہ تکلم کے صیغہ میں کرشمہ سازی میں جو شان کمال ہے اس کا زیادہ اظہار ہوتا ہے۔ میت کو نافع' حمزہ' کسائی اور حفص نے یاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ فاحیینا بہ۔ یعنی ہم بارش کے قطرات سے مردہ زمین کو زندہ کرتے ہیں۔ بادل کا ذکر بارش کے ذکر کی طرح ہے یا بادل' چونکہ زمین کے احیاء کے سبب کا سبب ہے اس لئے اس کو ذکر فرمایا۔ یعنی وہ زمین جو خشک سالی کے باعث اجاڑ اور نری غبار بنی پڑی تھی' اس کی سرسبزی نام کی بھی باقی نہ تھی' ہمارے ان حیات بخش قطرات کے برسانے سے سرسبز و شاداب ہو گئی' زمین کے پودوں اور سبزی کی موت و حیات کی نسبت زمین کی طرف مجازی ہے۔

[2] جس طرح ہماری قدرت کی کاری گری سے خشک اور اجاڑ زمین میں آثار حیات نمودار ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح قبور سے تمہیں زندہ کرنا ہماری قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں کام ہماری قدرت کے تحت داخل ہیں۔ صرف مقیس اور مقیس علیہ کے مادہ میں اختلاف ہے لیکن اختلاف مادہ کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ زندہ کرنے کی کیفیت کی تمثیل ہے کیونکہ

کے قطرات کی طرح ہوں گے پس اس کی وجہ سے لوگوں کے اجسام اگ جائیں گے۔ ابوالشیخ نے العظمۃ میں حضرت وھب سے روایت کیا ہے کہ بحر مسجور (آگ کا سمندر) اس کی ابتداء اللہ کے علم سے ہوگی اور اس کا آخر اللہ کے ارادہ سے ہوگا' اس میں مردہ کے مادہ منویہ کے مشابہ گاڑھا پانی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس سمندر سے مخلوق پر چالیس روز راجفہ اور رادفہ (زلزلے) کے درمیان بارش برسائے گا۔ جنت کے پودے' سیلابی زمین کے سبزہ کی طرح اگیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی جنتوں سے مومنین کی روحوں کو اور دوزخ سے کافروں کی روحوں کو جمع فرمائے گا' تاکہ ان کے جسموں میں ڈالے' پھر وہ اسرافیل کو صور پھونکنے کا حکم فرمائیگا۔ (پس اس کے صور پھونکنے سے) ہر روح اپنے جسم میں داخل ہو جائے گی (الحدیث) بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دونوں صوروں کے درمیان چالیس (کا فاصلہ) ہے۔ حاضرین مجلس نے پوچھا چالیس دن مراد ہیں فرمایا میں یہ نہیں کہتا' پھر انہوں نے پوچھا چالیس مہینے مراد ہیں۔ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا' پھر انہوں نے پوچھا چالیس سال مراد ہیں۔ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا' پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش برسائے گا جس سے لوگ اس طرح اگ پڑیں گے جیسے سبزیاں اگتی ہیں اور انسان کا سوائے ریڑھ کی ہڈی کے سب کچھ بوسیدہ ہو چکا ہوگا۔ قیامت کے روز اسی سے انسان کی تخلیق کو مکمل کیا جائے گا(1)۔ ابن المبارک نے سلیمان سے روایت کیا ہے کہ دوبارہ اٹھائے جانے سے چالیس دن پہلے گاڑھے پانی کی بارش نازل ہوگی۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عرش کے نیچے سے دونوں صوروں کے درمیان پانی کی ایک وادی بہے گی اور ان دونوں صوروں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہے' اس پانی سے انسان' پرندہ اور ہر چوپائے کا جسم پیدا ہو جائے گا اگر اس سے پہلے ان کا کوئی شناسا ان کے جسموں کے اوپر سے گزرے گا تو وہ ان کو سطح زمین پر پڑا ہوا دیکھ کر فوراً پہچان لے گا پس وہ سب جسم پیدا ہو جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کی روحوں کو آزاد فرمائے گا تو وہ اپنے اپنے جسم کے اندر داخل ہو جائیں گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ⑩

''جو عزت کا طلبگار ہو (وہ جان لے) کہ ہر قسم کی عزت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے [1] اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام [2] اور نیک عمل پاکیزہ کلام کو بلند کرتا ہے [3] اور جو لوگ فریب کاریاں کرتے ہیں برے کاموں کیلئے ان کیلئے شدید عذاب ہے [4] اور انکا مکر (وفریب) تباہ ہو کر رہے گا [5]''

[1] یعنی جو دنیا اور آخرت میں عزت کا خواستگار ہے تو اسے جاننا چاہئے کہ عزت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ فراء نے اس ارشاد کا یہ مفہوم بیان کیا ہے جو یہ جاننا چاہتا ہے کہ عزت کس لئے ہے تو اسے جان لینا چاہئے کہ عزت سب کی سب اللہ کے لئے ہے(2)' آیت کا ظاہر اس مفہوم کا مقتضی ہے کہ جو عزت کا متلاشی ہے تو اسے عزت کا تاج زرنگار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے طلب کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کی پیروی کے ذریعے عزت حاصل کرے۔ کیونکہ ملکیت اور تخلیق کے اعتبار سے ہر قسم کی عزت اللہ کے لئے ہے جسے چاہتا ہے عزت عطا فرماتا ہے۔ اس آیت میں کفار کے اوہام باطلہ کا رد ہے کہ وہ بتوں کی عبادت کر کے عزت کے متلاشی

کہ وہ ان کے لئے مددگار بنیں۔ اور یہ منافقین کے زعم فاسد کا بھی رد ہے جو کفار سے عزت کے طالب تھے۔ ان کی اسی کیفیت کو اسی ارشاد میں بیان فرمایا اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا پھر فرمایا جس عمل اور عقیدہ سے عزت ملتی ہے وہ عقیدہ توحید اور عمل صالح ہے۔

۲۔ اَلْکَلِمُ الطَّیِّبُ سے مراد سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ واللّٰہ اکبر و لا الہ الا اللّٰہ وتبارک اللّٰہ وغیرھا کے کلمات ہیں۔ صعود کلام (کلام کے بلند ہونے) سے مراد مجازاً اس کی مقبولیت ہے۔ قتادہ سے بھی یہی مفہوم مروی ہے۔ یا صعود کلام سے مراد ان فرشتوں کا چڑھنا ہے جو کلمات خیر کو عرش الٰہی کی طرف لے کر چڑھتے ہیں جیسا کہ عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے کہ جو شخص ان پانچ کلمات کا ورد کرتا ہے سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر وتبارک اللّٰہ۔ تو ایک فرشتہ ان کلمات کو اپنے پروں کے نیچے رکھ لیتا ہے۔ اور پھر اوپر بلند ہوتا ہے۔ فرشتوں کے جس مجمع سے گزرتا ہے تو وہ فرشتے ان کلمات کے کہنے والے کے لئے استغفار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ لے کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد عبداللہ بن مسعود نے قرآن کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ (1)۔ اس حدیث کو بغوی اور حاکم وغیرہما نے روایت کیا ہے۔ ثعلبی اور ابن مردویہ نے ابو ہریرہ سے یہی حدیث مرفوع روایت کی ہے۔

۳۔ کلبی کہتے ہیں **یرفع** میں ضمیر مستکن کا مرجع الکلم ہے اور ضمیر مفعول کا مرجع العمل الصالح ہے مطلب یہ ہے کہ کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا جب تک عقیدہ توحید کی موجودگی میں صادر نہ ہو۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ مستکن ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔ یعنی صرف وہ عمل مقبول ہوتا ہے جس میں ریاکاری نہ ہو اور خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو۔ ایسے عمل کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے کیونکہ اخلاص اعمال اور اقوال کی قبولیت کا سبب ہے۔ کلام کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ ضمیر مستکن کا مرجع عمل صالح ہے۔ کیونکہ یہی قریب ترین ہے۔ اور ضمیر منصوب کا مرجع الکلم ہے۔ الکلم مفرد ہے جمع نہیں ہے اور اس سے مراد جنس ہے۔ اسی وجہ سے اس کی صفت الطیب ذکر فرمائی ہے یا یہ کہا جائے گا کہ تقدیر کلام اس طرح ہے الیہ یصعد بعض اَلْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ اور یہ وہ اقوال ہوں گے جو اخلاص پر مبنی ہوں۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، حسن، عکرمہ اور اکثر مفسرین نے ضمیر کو اس آخری قول کے مطابق لوٹایا ہے۔ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں الکلم الطیب سے مراد ذکر الٰہی ہے اور عمل صالح سے مراد فرائض کی ادائیگی ہے پس جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے لیکن فرائض ادا نہیں کرتا ہے تو اس کے کلام کو اس کے عمل کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ ایمان صرف تمنا اور آرزو کا نام نہیں، اسی طرح صرف تجلی کا نام نہیں بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں قرار پذیر ہو اور اعمال اس کی تصدیق کرتے ہوں جو شخص باتیں تو اچھی کرتا ہے لیکن اعمال اچھے نہیں کرتا (یعنی اس کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے) تو اس کی اچھی باتوں کو بھی رد کر دیا جاتا ہے اور جو شخص باتیں بھی اچھی کرتا نیک اعمال بھی کرتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ اس کی اچھی باتوں کو بلندی اور سرفرازی عطا کرنے کا موجب بنتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ۔ حدیث شریف میں ہے اللہ تعالیٰ کسی قول کو عمل کے بغیر قبول نہیں فرماتا اور کسی قول اور عمل کو بغیر نیت کے قبول نہیں فرماتا (2)۔

میں کہتا ہوں اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ ایمان بغیر عمل کے قبول نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے یہ

وَ كَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَّ النَّارُ حَقٌّ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اس کی بندی کے بیٹے ہیں، اللہ کے اس کلمہ کا اثر ہیں جو مریم کی طرف اس نے القاء فرمایا تھا، اور اللہ کی طرف سے روح تھے۔ جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے) تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جنت میں داخل فرمائے گا خواہ اس کا عمل کچھ بھی ہو (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے عبادہ بن الصامت سے روایت کیا ہے۔ بلکہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ پاکیزہ کلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف باریابی حاصل کرتا ہے، پھر اگر اس کے ساتھ عمل صالح بھی ہو تو وہ عمل صالح اس کی شان کو اور چار چاند لگا دیتا ہے اور اس کے ثواب میں کئی گنا زیادتی کا باعث بنتا ہے۔ اور حضور ﷺ کے ارشاد لا یقبل اللہ قولاً الا بعمل (اللہ تعالیٰ بغیر عمل کے کوئی قول قبول نہیں فرماتا) کا مطلب یہ ہے کہ منافق کا قول جو دل اور جوارح کے عمل سے خالی ہوتا ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا، اسی طرح'' وہ قول جو عمل سے متصل ہو بغیر نیت کے قبول نہیں ہوتا۔ اس ارشاد کا معنی یہ ہے کہ جو قول وعمل دل کے اخلاص سے محروم ہوتا ہے وہ قابل ذکر نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ عمل صالح، قائل کے درجہ کو بلند کرتا ہے۔

ے وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ میں السَّيِّاٰت مصدر محذوف کی صفت ہے، یمکرون کا مفعول بہ نہیں ہے کیونکہ یہ فعل لازم ہے۔ یعنی یمکرون المکرات السیئات۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں مکرات سے مراد دار الندوہ میں قریش کا نبی کریم ﷺ کے خلاف سازشی منصوبے بنانا ہے جیسا کہ سورۂ انفال میں گزر چکا ہے وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ (ترجمہ) اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا تا کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں یا آپ کو جلا وطن کر دیں(2)۔ کلبی کہتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے الذین یعملون السیئات (جو برائیاں کرتے ہیں) مجاہد اور شہر بن حوشب کہتے ہیں اس سے مراد ریاکار لوگ ہیں(3)۔

ے یبور کا معنی یبطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی فریب کاریوں اور سازشوں کو باطل فرما دے گا۔ یا آیت کریمہ کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ریاء کاروں کے اعمال کو رائیگاں کر دے گا۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

'' اور اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تمہیں مٹی سے، پھر پانی کی بوند سے پھر تمہیں بنا دیا جوڑے جوڑے اور نہیں حاملہ ہوتی کوئی عورت اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کو اس کا علم ہوتا ہے اور نہ لمبی زندگی دی جاتی ہے کسی طویل العمر کو اور نہ کم رکھی جاتی ہے کسی کی عمر، مگر (اس کی تفصیل) کتاب میں درج ہے بیشک یہ بات اللہ کے لئے بالکل آسان ہے لہ ''

لہ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ کا عطف واللہ ارسل پر ہے۔ یہ ارشاد دوبارہ اٹھائے جانے پر قدرت کی دلیل ہے کیونکہ مشکل تو بدء الخلق [illegible]

کی ابتداء سے زندگی کے آخری لمحات تک تمہارے حالات وواقعات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور عمر کی زیادتی اور کمی لوح محفوظ یا کراماً کاتبین کے صحیفوں میں درج ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں ہر کسی کی عمر لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے کہ اس نے اتنے سال زندہ رہنا ہے پھر اس کے نیچے لکھا جاتا ہے ایک دن گزر گیا' دو دن گزر گئے' تین دن گزر گئے حتیٰ کہ اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے(1) بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی عمر میں اضافہ یا کمی نہیں ہوتی مگر وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہوتی ہے کہ فلاں شخص کی عمر اتنے سال ہے پھر بعض نیکیوں کی وجہ سے اس کی عمر میں اضافہ کیا جائے گا یا بعض گناہوں کی وجہ سے کمی کی جائے گی۔ یہ سب چیزیں لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ''لا یرد القضاء الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا البر'' (قضا کو کوئی چیز دور نہیں کرتی مگر دعا اور عمر میں اضافہ نہیں کرتی مگر نیکی) اس قول کی تائید کرتا ہے۔ اس حدیث کو سلمان فارسی سے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ لمبی عمر والے کی عمر میں طوالت اور کم عمر والے کی عمر میں کمی اس طرح نہیں ہوتی کہ ناقص عمر والے کی عمر کا کچھ حصہ لمبی عمر والے کو عطا کیا جائے اور ناقص عمر والے کی عمر میں کمی کر کے اسے کم کیا جائے۔ من عمرہ میں ہ ضمیر کا مرجع منقوص عمرہ ہے۔ اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں ہے لیکن چونکہ اس کے مقابل کے ذکر کی وجہ سے اس پر دلالت موجود ہے۔ اس لئے ضمیر لوٹانا جائز ہے اور لہ کی ضمیر کا مرجع معمر کو بنانا بھی جائز ہے۔ اور مطلب یہ ہو کہ جس کو لمبی عمر عطا کی گئی اور اس میں سامع کے فہم پر اعتماد کیا گیا ہے کیونکہ اس بات میں کوئی التباس نہیں ہے کہ معمر ثانی سے مراد دوسرا معمر ہے جیسا کہ اس مثال میں ہے کہ لَا یُثِیبُ اللّٰهُ عَبْداً وَّلَا یُعَاقِبُهٗ اِلَّا بِحَقٍّ (اس مثال میں اللہ تعالیٰ کے جس بندے کو ثواب دینے کا ذکر ہے وہ اور ہے اور جس کو سزا دینے کا ذکر ہے وہ اور ہے) ان ذالک علی اللّٰہ یسیر میں ذالک کا مشار الیہ عمروں اور اعمال کا لکھنا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۖ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور یکساں نہیں ہو سکتے پانی کے دو ذخیرے یہ (ایک) میٹھا ہے بہت شیریں اس کا پینا بڑا خوشگوار ہے اور یہ (دوسرا) سخت نمکین' کھاری تلخ ۱؎ اور دونوں میں سے تم کھاتے ہو تر و تازہ گوشت ۲؎ اور نکالتے ہو زینت کا سامان جسے تم پہنتے ہو ۳؎ اور تو دیکھتا ہے کشتیوں کو پانی میں کہ اسے چیرتی شور مچاتی چلی جا رہی ہیں تا کہ تم تلاش کرو اس کے فضل کو ۴؎ اور (یہ سب نوازشات اس لئے) تا کہ تم شکر ادا کرو ۵؎''

۱؎ فرات کا معنی انتہائی میٹھا اور شیریں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو پیاس کو بجھا دے۔ سائغ جس کا پینا خوشگوار ہو، خود ہی گلے سے نیچے اترتا چلا جائے۔ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ اپنے معطوفات سے مل کر البحرین کی صفت ہے جیسے امر علی اللئیم یسبنی میں جملہ اللئیم کی صفت ہے۔ اجاج از حد کھاری' بعض فرماتے ہیں جو اپنے کھارے پن کی وجہ سے جلا ڈالے۔ یہ مومن اور کافر کی مثال ہے اور اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت کا بیان ہو رہا ہے کہ ایک جنس سے دو چیزیں پیدا فرمائیں جن کے خواص آپس میں مختلف ہیں۔

دونوں سمندروں کے برابر نہ ہونے کے بیان میں بھی اس کا کوئی تعلق نہیں تا کہ یہ کہا جائے کہ یہ هذا عذبٌ فرات اور هذا ملح اجاج کا تتمہ ہے۔ جب ثابت ہو گیا کہ آیت جس مقصود کے لئے ذکر کی گئی اس میں اس جملہ کا کوئی دخل نہیں ہے تو واضح ہو گیا کہ یہ جملہ استطرا داً ذکر کیا گیا ہے۔ استطر اد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام اس انداز میں ذکر کی جائے کہ اس سے ایک دوسری کلام لازم آئے اور مراد بھی دوسری کلام لی جائے) یا یہ بطور استطر اد نہیں بلکہ تمثیل کی تکمیل کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کہ یہ دونوں سمندر جس طرح بعض فوائد میں مشترک ہونے کے باوجود جو چیز ان میں مقصود بالذات ہے، یعنی پانی اس میں مساوی نہیں ہیں اسی طرح مومن اور کافر بھی بعض خواص انسانی میں مشترک ہونے کے باوجود جو چیز ان کی تخلیق میں مقصود بالذات ہے، یعنی معرفت الٰہی اور عبادت الٰہی اس میں برابر نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ ۔ (ترجمہ) اور نہیں پیدا فرمایا میں نے جن وانس کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں یا یہ جملہ اس لئے ذکر فرمایا کہ کافر پر کھاری پانی کو بھی فضیلت حاصل ہے کیونکہ کھاری پانی تو منافع میں میٹھے پانی کے ساتھ شریک ہے لیکن کافر میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۳؎ تم کھاری پانی سے موتی اور مرجان نکالتے ہو جنہیں تم پہنتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں موتیوں کے نکالنے کی نسبت دونوں قسم کے سمندروں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ موتی اور جواہر صرف کھاری سمندر میں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھاری سمندر میں میٹھے چشمے بھی ہوتے ہیں جو نمکین پانی کے ساتھ مل جاتے ہیں اور بعض اوقات میٹھے چشموں کا پانی کھاری پانی پر غالب آ جاتا ہے۔ پس اتفاق سے وہاں سے کوئی موتی مل جاتا ہے تو وہ موتی حقیقت میں کھاری پانی کی جگہ سے ہوتا ہے۔

۴؎ تَرَى الْفُلْكَ کا عطف من کل تاکلون پر ہے۔ فیہ کی ضمیر کا مرجع ہر سمندر ہے۔ مواخر جمع ہے ماخرة کی اور یہ الخر سے مشتق ہے جس کا معنی چیرنا ہے۔ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ میں فضل سے مراد تجارت ہے۔ لتبتغوا کا لام مواخر کے متعلق ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لام اس فعل کے متعلق ہو جس پر مذکورہ افعال دلالت کر رہے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سمندر کو اس طرح بنا دیا ہے تا کہ تم تجارت کرو۔

۵؎ یہ سب انعامات تم پر اس لئے فرمائے تا کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔ لعلکم کا عطف لتبتغوا پر ہے کیونکہ حرف ترجی (لعل) استعارۃً لام کے معنی میں ہے اور حرف ترجی کا ذکر کرنا اس کے ظاہر حال کے تقاضا کے مطابق ہے۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝

''وہ داخل کرتا ہے (کبھی) رات (کے ایک حصہ) کو دن میں اور (کبھی) داخل کرتا ہے دن کے (ایک حصہ) کو رات میں اور اس نے پابند حکم کر دیا سورج اور چاند کو ہر ایک رواں ہے مقررمیعاد تک ۱؎ یہ ہے اللہ جو تمہارا رب ہے اسی کی ساری بادشاہی ہے ۲؎ اور وہ (بت) جن کی تم پوجا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا وہ تو گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ۳؎''

یستوی واالا جملہ معترضہ ہے۔ اجلٌ مسمی سے مراد سورج اور چاند کا اپنی اس مدت میں چلنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر فرمائی ہے (چاند ایک ماہ میں آسمان کی مسافت طے کرتا ہے اور سورج ہر سال میں ایک مرتبہ یہ مسافت طے کرتا ہے) یا اجل مسمی سے مراد ان میں سے ہر ایک کا اپنے دورانیے میں اپنی منزل کی منتہیٰ کو پہنچنا ہے، یا اجل مسمی سے مراد قیامت کا وقت ہے، یعنی چاند، سورج، دن اور رات دنیا میں اپنی عادت معروضہ کے مطابق چلتے رہیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے چلنے کی عادت کو توڑ دے گا۔ کُلٌّ یَّجْرِیْ تسخیر کا بیان ہے۔

۲۔ ذٰلِكُمْ مبتدا ہے اور اللّٰهُ رَبُّكُمْ اور لَهُ الْمُلْكُ اخبار مترادفہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ان تمام چیز کا فاعل ہونا ان اخبار کے ثبوت کا موجب ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لہ الملک علیحدہ مستقل کلام ہو۔

۳۔ جن بتوں وغیرہ کی تم عبادت کرتے ہو چہ جائیکہ زمین و آسمان کے خالق اور مالک ہوں یہ تو گٹھلی کے اوپر جو سفید باریک پردہ ہوتا ہے اس کے بھی مالک نہیں ہیں، قطمیر سے پہلے مِن زائدہ ہے اور قطمیر اس باریک پردہ اور جھلی کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی پر ہوتی ہے جو اتنی معمولی چیز کا مالک و خالق نہیں تو وہ عبادت کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں۔

إِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾

"اگر تم انہیں پکارو تو نہ سن سکیں گے تمہاری پکار اور اگر وہ بالفرض سن بھی لیں تو وہ تمہاری التجا قبول نہیں کر سکیں گے اور روز قیامت (صاف) انکار کر دیں گے تمہارے شرک کا ۱۔ اور (حقیقت حال سے) تجھے کوئی آگاہ نہیں کر سکتا خدائے خبیر کی مانند ۲۔"

۱۔ اگر تم انہیں اپنی حاجات کے حل کے لئے پکارو تو یہ تمہاری چیخ و پکار اور فریاد کو قطعاً نہیں سنیں گے کیونکہ یہ بے جان پتھر اور تراشے ہوئے بت ہیں اور اگر بالفرض سن بھی لیں تو تمہیں کچھ نفع پہنچانے پر قادر نہ ہوں گے۔ یا یہ تسلیم کیا جائے کہ ان کے بعض معبود تو ذی شعور تھے مثلاً ابلیس یا فرشتے یا عیسیٰ، عزیز علیہما السلام تو یہ اس لئے جواب نہیں دیں گے کیونکہ ان کے متعلق انہوں نے الوہیت کا دعویٰ کیا تھا، حالانکہ وہ اس سے قطعاً بری تھے۔ قیامت کے روز وہ ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے، وہ کہیں گے مَّا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ۔ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے (بلکہ تم تو اپنی خواہشات نفس کے پجاری تھے)

۲۔ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن چیز سے آگاہ ہے اس لئے اس مخبر حقیقی کی مانند حقیقت حال سے اور کوئی تجھے آگاہ نہیں کر سکتا۔ یا یہ معنی کہ اے اسباب غرور کے چنگل میں گرفتار شخص تجھے دوسرا حقائق اشیاء سے باخبر نہیں کرے گا جس طرح اللہ تعالیٰ آگاہ فرمائے گا جو خود اشیاء کے حقائق سے باخبر ہے۔

ان تدعوھم کا جملہ شرطیہ اسم موصول کی خبر ثانی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾

بھی اس کی نوازشات وعنایات عام ہیں۔ مخلوق کے ہر فرد کو شامل ہیں۔ وہ اس بات کا بذات خود مستحق ہے کہ مخلوق اس کی حمد ونعت میں ہر وقت رطب اللسان رہے۔

انتم مبتدا ہے اور الفقرا خبر ہے' خبر کو معرفہ ذکر فرمانے کا مقصود کمال فقر کو انسان کے ساتھ خاص کرنا ہے' یعنی کائنات کی ہر چیز اپنی بقاء اور نشو ونما میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے لیکن انسان کا افتقار باقی چیزوں سے زیادہ ہے' کیونکہ انسان مکلف ہے اسے، امور تکلیفیہ کی سرانجام دہی کے لئے اصلاح احوال کی زیادہ احتیاج ہے۔ اس نے ضعیف ظلوم اور جھول ہونے کے باوجود امانت خاص (وحی الٰہی) کو اٹھالیا تھا۔ پس اپنی ذمہ داریوں سے بحسن وخوبی عہدہ براہونے کے لئے اسے نظر رحمت کی ہر لحہ زیادہ ضرورت ہے۔

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٦﴾ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿١٧﴾

''اگر اس کی مرضی ہو تو سب کو نابود کردے اور لے آئے ایک نئی مخلوق اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ پر قطعاً دشوار نہیں لہ''

لہ یہ اللہ تعالیٰ کے تم سے بے نیاز ہونے کی دلیل ہے' اگر وہ چاہے تو چشم زدن میں تمہیں نیست ونابود کردے اور ایسی قوم لے آئے جو تم سے زیادہ اطاعت شعار ہو یا یہ کہ وہ ایسا عالم اور جہاں پیدا فرمادے جس سے تم ناواقف ہو۔ اس کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ﴿١٨﴾

''اور بوجھ نہیں اٹھائیگا کوئی گنہگار کسی دوسرے کا بوجھ لہ اور اگر بلائے گا پشت پر بوجھ اٹھانے والا (کسی کو) اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے' تو نہ اٹھائی جاسکے گی اس کے بوجھ سے کوئی شے اگر چہ کوئی قریبی رشتہ دار ہی ہو ۲ آپ صرف ان کو ڈرا سکتے ہیں جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز ۳ اور جو پاکیزگی اختیار کرتا ہے سو وہ اپنی بھلائی کے لئے ہی اختیار کرتا ہے اور (یاد رکھو آخرکار) اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے ۴''

لہ وَازِرَةٌ صفت ہے اور اس کا موصوف نفس محذوف ہے۔ اسی طرح اخریٰ بھی صفت ہے اور اس کا موصوف نفس محذوف ہے' وزر کا معنی بوجھ ہے' یعنی کوئی گنہگار نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ لیکن سورۂ عنکبوت کی آیت میں ہے وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ۖ یعنی وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے علاوہ اور بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ تو اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے' تو ان کی پشتوں پر دوسروں کو گمراہ کرنے خود گمراہ ہونے کا بوجھ ہوگا۔ گمراہ ہونا جس طرح ان کا فعل تھا اسی طرح دوسرں کا گمراہ کرنا بھی ان کا کرتوت تھا۔ اس لئے ان پر حقیقتاً کسی دوسرے کا بوجھ نہ ہوگا۔ اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز مسلمان پہاڑوں کی مثل گناہ لے کر آئیں گے، ان کو بخش دیا جائے گا اور ان گناہوں کو یہودیوں اور نصرانیوں پر ڈالا جائے گا(1)۔ ایک دوسرے طریق سے یہی حدیث اس طرح ہے جب قیامت

طبرانی اور حاکم نے اس حدیث کو ابوموسیٰ سے پہلی روایت کی طرح روایت کیا ہے' جبکہ ابن ماجہ اور طبرانی نے دوسری روایت کی طرح روایت کی ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت انس سے اس طرح روایت کی ہے جب قیامت کا دن ہوگا تو مسلمانوں کے ہر شخص کی طرف ایک مشرک کو بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا یہ تیری طرف سے آگ کے عذاب سے فدیہ ہے(1)۔ میرے نزدیک ان احادیث کی تاویل یہ ہے کہ ان گناہوں سے مراد جو کفار پر ڈالے جائیں گے' وہ ہیں جو انہوں نے امت محمد ﷺ میں داخل ہونے سے پہلے کئے تھے اور غلط کاریوں کا آغاز کیا تھا۔ پھر متاخرین ان برائیوں میں ان کے نقش پر چلے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کرم نوازی سے مؤمنین کے گناہ تو معاف فرما دیئے تھے لیکن ان لوگوں کے گناہ باقی رہے جنہوں نے ان گناہوں کا آغاز کیا تھا۔ اور ان کو دوہرا گناہ ملے گا کیونکہ ایک تو انہوں نے خود ان گناہوں کا ارتکاب کیا اور دوسرا انہوں نے اس برائی کا آغاز کیا جس پر بعد میں آنے والے عمل کرتے رہے۔ حدیث میں وضع کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ کافر نے جس برائی کو ایجاد کیا اس کو خود کرنے کا گناہ بھی اس پر باقی رہے گا اور جن مسلمانوں نے ان کی پیروی میں گناہ کیا ان کا گناہ بھی اس کافر پر لادا جائے گا۔

۲؎ اگر گناہوں سے بوجھل نفس کسی دوسرے کو اپنا گناہ اٹھانے کے لئے بلائے گا تو اس سے کچھ بھی نہیں اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے نفی فرما دی کہ کسی دوسرے کا گناہ کسی پر نہیں لادا جائے گا۔ اگرچہ جس کو پکارا جائے گا وہ پکارنے والے کا رشتہ دار بھی ہوگا، اس کے باوجود وہ اس کے بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا' ماں باپ' اپنے بیٹے سے کہیں گے بیٹا! ہمارے کچھ گناہ تو اٹھا لے (ہم بھی تو دنیا میں تیرے لئے سب کچھ کرتے رہے) بیٹا کہے گا میرا اپنا بوجھ زیادہ ہے، میں تمہارے بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا(2)۔

۳؎ اخفش نے انما تنذر کا معنی یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ اپنے ڈرانے کے ساتھ انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں (جو ان اوصاف مذکورہ کے حامل ہیں) بالغیب یا تو یخشون کے فاعل سے حال ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جو عذاب سے غائب ہونے کی حالت میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں یا لوگوں سے چھپ کر خلوت میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ یا بالغیب' مفعول محذوف العذاب سے حال ہے۔ پہلے یخشون مضارع اور پھر اقاموا فعل ماضی ذکر فرمایا۔ اختلاف افعال استمرار پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ یعنی آپ کے انذار سے فقط وہی نفع حاصل کرتے ہیں جو ہر زمانہ میں عذاب الٰہی کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں اور نیکیوں پر عمل پیرا رہتے ہیں۔

۴؎ جو پاکیزگی اور طہارت کو اختیار کرتا ہے تو اس میں اس کا اپنا بھلا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں ان کے تزکیہ پر بہتر جزاء عطا فرمائے گا۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور مؤمنین کی خشیت کی تاکید کے لئے ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ﴿٢١﴾

''اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا' اور نہ (یکساں ہیں) اندھیرے اور نور اور نہ (یکساں ہے) سایہ اور تیز دھوپ ۱؎''

۱؎ اعمی سے مراد کافر اور جاہل ہے' البصیر سے مراد مومن اور عالم ہے۔ الظُّلُمٰتُ سے مراد کفر ہے' النور سے مراد ایمان' ظل سے مراد جنت اور ثواب ہے۔ اور الحرور سے مراد آگ اور عقاب ہے۔

بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾

''نہ ایک جیسے ہیں زندے اور مردے ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ سناتا ہے ۲؎ جس کو چاہتا ہے اور آپ نہیں سنانے والے جو قبروں میں ہیں ۳؎''

۱؎ یہ بھی مومنین اور کافرین کی ایک دوسری مثال ہے جو پہلی مثال سے زیادہ بلیغ ہے۔ اسی وجہ سے فعل کو دوبارہ ذکر فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ علماء اور جہلاء کی مثال ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے آیات کی سمجھ اور نصیحت حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرماتا ہے۔

۳؎ کفر پر اصرار کرنے والوں کو مردوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور ان سے بالکل مایوس کرنے کے لئے یہ فرمایا کہ جس طرح قبور والوں کو تم نہیں سنا سکتے اسی طرح آپ ان کفار کو ہدایت کا فائدہ نہیں پہنچا سکتے (کیونکہ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے)

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾

''نہیں ہیں آپ مگر بروقت ڈرانے والے ۱؎''

۱؎ اے پیارے محمد ﷺ آپ انہیں دوزخ کی آگ سے ڈراتے ہیں (اور آپ کے ذمہ یہی صرف یہی فریضہ) آپ ان کو ہدایت کی منزل پر پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ؕ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾

''ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو ۱؎''

۱؎ بِالْحَقِّ یا تو ضمیر مرفوع نا سے یا ضمیر منصوب ک سے حال ہے یا محذوف کی صفت ہے، یعنی ارسالاً ملتبساً بالحق۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ بشیراً کے متعلق ہو یا نذیراً کے متعلق ہو لیکن ان کے متعلق علی سبیل التنازع ہوگا، یعنی جس کے یہ متعلق ہوگا دوسرے کے لئے مقدر ماننا پڑے گا۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے درآں حالیکہ آپ مومنین کو وعدہ حق کی خوشخبری سنانے والے ہیں اور کافروں کو وعید حق سنانے والے ہیں اور سابقہ قوموں اور گروہوں میں سے کوئی ایسا گروہ نہیں گزرا مگر اس میں نبی یا اس کا نائب کوئی عالم دین آیا ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا تھا۔ یہاں صرف نذیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے ہر شخص جانتا ہے کہ نذارت اور بشارت ہر جگہ اکٹھے ہوتے ہیں اور کئی مقامات پر اس سے پہلے بشارت اور نذارت کو متصل ذکر کیا گیا ہے۔ یا صرف نذیر کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ ڈرانا بشارت سنانے کی نسبت زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے کیونکہ تکلیف کا دور کرنا جلب نفع سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ

''اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو کوئی تعجب نہیں) بیشک جھٹلاتے رہے جو ان سے پہلے تھے۔ تشریف لائے تھے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں آسمانی صحیفے اور نورانی کتاب لے کر[1]۔''

[1] اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو تسلی اور اطمینان قلبی عطا کرنے کے لئے فرما رہے ہیں اے پیارے اگر یہ ناہنجار اور بدمزاج آپ کو جھٹلاتے ہیں تو کوئی انہونی بات نہیں۔ ان سے پہلے لوگ بھی انبیاء کرام کو جھٹلاتے رہے، پس آپ ان کی جگر پاش پاش کرنے والی باتوں پر افسردہ خاطر نہ ہوا کریں بلکہ اپنے پیشرو انبیاء کرام کی طرح ان کی اذیتیوں پر صبر کریں۔ جاء تھم، قد کی تقدیر کے ساتھ کذب کے فاعل سے حال ہے۔ بینٰت سے مراد معجزات ہیں جو انبیاء کرام نبوت کی صداقت کے شاہد عادل تھے۔ الزبر سے مراد صحیفے ہیں جیسے صحف ابراہیم۔ اور الکتاب المنیر سے مراد تورات اور انجیل ہیں اور اس سے تفصیل کا ارادہ کرتے ہوئے الکتاب المنیر فرمایا ''یعنی بعض ان میں سے بینٰت اور زبر لائے اور بعض دوسرے بینات اور کتاب منیر لائے۔ (یہ مفہوم اس صورت میں ہوگا جب الزبر اور الکتاب میں فرق تسلیم کیا جائے) یا الزبر اور الکتاب سے ایک ہی چیز مراد ہے اور ان کے درمیان عطف صفات کے تغایر کے اعتبار سے ہے۔

ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٢٦﴾

''پھر (جب ان کی سرکشی کی حد ہوگئی) تو میں نے پکڑ لیا کفار کو پس (ساری دنیا جانتی ہے) میرا عذاب کیسا تھا[1]۔''

[1] چونکہ نبی کریم ﷺ کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ کفار پر حد درجہ انکار فرمایا تھا اس لئے تسلی کے مقام پر استفہام کا انداز بہتر ہے۔ نکیر سے مراد عقوبت ہے۔ نکیر کو ورش نے صرف وصل میں یاء کے ثبات کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے وصل و وقف دونوں صورتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿٢٧﴾

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اتارتا ہے آسمان سے پانی پس ہم نکالتے ہیں اس کے ذریعے طرح طرح کے پھل جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور پہاڑوں سے بھی رنگ برنگ ٹکڑے ہیں[1] کوئی سفید کوئی سرخ۔ مختلف رنگوں میں (کوئی شوخ کوئی مدہم) اور بعض حصے سخت سیاہ[2]۔''

[1] کلام میں غیبت سے تکلم کی طرف التفات ہے، یعنی پہلے غائب کا صیغہ انزل فرمایا پھر فاخرجنا متکلم کا صیغہ ذکر فرمایا۔ قدرت کی صفت گری اور کرشمہ سازی میں غور و خوض کی دعوت دی جا رہی ہے کہ دیکھو پانی ایک ہے لیکن ہماری قدرت سے مختلف اجناس یا مختلف اصناف کے پھل پیدا ہوتے ہیں، ہر صنف ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے یا ہیئت میں مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی زرد کوئی سبز اور کوئی سرخ ہوتا ہے۔ اور پہاڑ ہیں ان کا اپنا رنگ ہے اور ان میں راستے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں۔ یہ جملہ اسمیہ، اخرجنا کے فاعل سے حال ہے۔ جس طرح اس مثال میں ہے اتیتک و الشمس طالعۃ۔

[2] کچھ سفید ہیں اور کچھ سرخ ہیں پھر ان کی سفیدی کی شدت اور ضعف میں بڑا فرق ہے۔ غرابیب سود کا عطف بیض پر ہے۔

الطیر مذکور کررہا ہے' اس طرح کا اسلوب اس لئے اختیار کیا جاتا ہے تاکہ تاکید میں زیادتی ہو جائے۔ کیونکہ اس طرح ایک چیز پر اضمار اور اظہار دونوں طریقوں سے دلالت ہوتی ہے۔ امام بیضاوی نے یہی توجیہ لکھی ہے(1)۔

الجلال المحلی فرماتے ہیں اکثر سود غرابیب کہا جاتا ہے اور بہت کم غرابیب سود کہا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں قلیل طور پر مزید تاکید کے لئے ایسے کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ غرابیب کا عطف جدد پر ہو۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں میں سے بھی کچھ رنگ برنگے ہیں اور کچھ سیاہ ہیں جن کا رنگ ایک جیسا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۭ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۞

''اور انسانوں' چارپایوں اور جانوروں کے رنگ بھی اسی طرح جدا جدا ہیں اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ سب پر غالب' بہت بخشنے والا ہے ۲؎ ''

۱؎ مِنَ النَّاسِ کا عطف من الجبال پر ہے اور ضمیر مِن کی وجہ سے مذکر ذکر فرمائی بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے و من الناس والد واب والانعام ما ھو مختلف الوانہٗ۔ کذالک مصدر محذوف اختلافا کی صفت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی گوناں گوں مخلوق کا ذکر فرمایا جو اپنے صانع کی ذات اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہے تو اس کے بعد فرمایا صرف وہی اللہ سے ڈرتے ہیں جو اس کی مخلوق میں غور وفکر کرتے ہیں لیکن مکہ کے کفار جہال کی کیفیت مختلف ہے۔ اور اسی طرح وہ لوگ ہیں جو جان بوجھ کر جاہل بنے رہے اور اپنے علوم کو اپنے دلوں اور نفسوں میں راسخ نہ کیا جیسے یہود ونصاری کے علماء۔ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس آیت میں اشارہ ہے کہ جس کے دل میں خشیت الٰہی نہیں وہ عالم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں' اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور اسکی صفات کمالیہ کی معرفت خشیت کو مستلزم ہے۔ اور جہاں خشیت نہیں ہے تو وہاں علم بھی نہیں ہے' کیونکہ لازم کی نفی ملزوم کی نفی کو مستلزم ہے۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس آیت کا مفہوم و مراد یہ ہے کہ جو میرے قہر' عزت اور سلطنت کو جانتا ہے وہی مجھ سے ڈرتا ہے(2) جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی زیادہ معرفت رکھتا ہے وہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہے۔ امام بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کوئی کام کیا اور دوسروں کو بھی اس کے کرنے کی رخصت عطا فرمائی' بعض لوگ اس کام سے پرہیز کرنے لگے' جب رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچی (کہ بعض لوگ اس کام سے اجتناب کررہے ہیں جو آپ (ﷺ) نے کیا ہے) تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا جس میں آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور پھر فرمایا اس قوم کا کیا حال ہوگا جو اس کام سے پرہیز کرتے ہیں جس کو میں خود کرتا ہوں۔ قسم بخدا میں ان سے اللہ تعالیٰ کی زیادہ معرفت رکھتا ہوں اور ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں(3)۔ دارمی نے مکحول سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم کی عابد پر اس طرح فضیلت ہے جس طرح میری فضیلت تم میں سے ایک ادنی فرد پر ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت

فرمائی اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا(1)۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم وہ کچھ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم روتے زیادہ اور ہنستے کم(2)۔ سب سے زیادہ خشیت انبیاء کرام کو ہوتی ہے پھر اولیاء کو (اور یہی لوگ علماء حقیقت ہیں) اور پھر جو ان سے مرتبہ میں کم لوگ ہوتے ہیں۔ مسروق کہتے ہیں اللہ کا خوف پیدا ہو جائے تو انسان کے لئے اتنا علم کافی ہے اور یہی جہالت کافی ہے کہ انسان خدا سے غرور کرنے لگے۔ شعبی فرماتے ہیں عالم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ عزیز اور غفور ہے۔ یہ جملہ خشیت کے وجوب کی تعلیل ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ غالب ہے اس پر جو سرکشی اور گمراہی میں اصرار کرتا ہے، وہ اسے سزا دینے پر قادر ہے اور جو گناہوں سے مغفرت طلب کرتا ہے اس کی بخشش فرما دیتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ أَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُونَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿٢٩﴾

''بیشک جو (غور و تدبر سے) تلاوت کرتے ہیں اللہ کی کتاب کی اور نماز قائم کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے، رازداری سے اور اعلانیہ، وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو ہرگز نقصان والی نہیں ۱؎''

۱؎ یعنی جو خوش نصیب ہمیشہ ہمیشہ قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور اس کے احکام کی اتباع کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ ان کی پہچان بن جاتی ہے۔ کتاب اللہ سے مراد یا تو قرآن ہے یا اللہ کی کتب کی جنس مراد ہے۔ دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ آیت سابقہ امتوں کے علماء و قراء کی تعریف ہوگی۔ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ۔ یعنی نماز کو اپنے ظاہری و باطنی حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ سراً اور علانیةً کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اتفاق ہو وہ خرچ کرتے ہیں، علانیہ یا سراً کا وہ ارادہ نہیں کرتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نفلی صدقات سراً اور فرضی، واجبی صدقات علانیہ دینا بہتر ہے۔ یرجون بتجارة یعنی طاعت کے ذریعے ثواب طلب کرتے ہیں۔ لن تبور، تجارة کی صفت ہے یعنی ایسی تجارت جس میں خسارہ نہ ہو۔

لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ إِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿٣٠﴾

''تا کہ اللہ انہیں پورا پورا اجر عطا فرمائے ۱؎ اور مزید اضافہ کرے ان کے اجر میں اپنے فضل سے ۲؎ بیشک وہ بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے ۳؎''

۱؎ لِيُوَفِّيَهُمْ یا تو لن تبور کے معنی کے متعلق ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوگا کہ وہ ایسی نفع بخش تجارت کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں پورا پورا اجر ملے۔ یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے، جس پر مذکورہ افعال دلالت کر رہے ہیں، یعنی انہوں نے یہ اعمال کئے تا کہ انہیں اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے پورا پورا اجر عطا فرمائے۔ یا یہ یرجون کے متعلق ہے۔ اس صورت میں لام عاقبت کے لئے ہوگا معنی یہ ہوگا، کہ وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں کبھی خسارہ اور گھاٹا نہ ہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا اجر عطا فرما دے۔

کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اس شخص کی سفارش کا اذن دیا جائے گا جس نے کبھی دنیا میں ان نیک سیرت لوگوں سے کوئی بھلائی کی ہوگی اگر چہ اس کے دوسرے کرتوتوں کی وجہ سے اس پر دوزخ واجب ہو چکی ہوگی۔

۳؎ وہ بہت بخشنے والا اور قدردان ہے۔ یہ جملہ پورا اجر عطا کرنے اور مزید بخشش فرمانے کی علت ہے اور یہ جون، اِنَّ کی خبر ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ اِنَّ کی خبر ہو اور ضمیر عائد مقدر ہو تقدیر کلام اس طرح ہو انه غفور لفرطاتهم شكور لطاعاتهم۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ رب کریم اپنے پارسا بندوں کے بڑے بڑے گناہ معاف فرماتا ہے اور چھوٹے چھوٹے نیک اعمال پر قدردانی فرماتے ہوئے اجر عظیم عطا فرماتا ہے (۱) جب اِنَّهُ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ کو اِنَّ کی خبر بنایا جائے گا تو یرجون، انفقوا کے فاعل سے حال ہوگا۔ عبد الغنی نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ حصین بن الحارث بن عبد المطلب بن عبد مناف کے بارے نازل ہوئی ہے۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝۳۱

"اور جو کتاب بذریعہ وحی ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے وہی سراسر حق ہے وہ تصدیق کرتی ہے پہلی کتابوں کی ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے سارے احوال سے باخبر ہے (اور) دیکھنے والا ہے ۲؎"

۱؎ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے اور اس سے پہلے من بیان یا جنس کے لئے ہے یا من بعضیہ ہے اور کتاب کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ پہلی کتب سماویہ کی تصدیق کرتی ہے۔ مصدقا حال مؤکدہ ہے کیونکہ قرآن کی حقیقت سابقہ کتب کی عقائد، احکام کے اصول اور اخبار میں موافقت کو مستلزم ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ اشیاء کے ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے۔ پس وہ جانتا ہے کہ آپ عظمت وحی کے لائق ہیں کیونکہ آپ کی طرف ایسی کتاب وحی فرمائی ہے جو معجز ہے اور تمام کتب کی صداقت کا معیار ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝۳۲

"پھر ہم نے وارث بنایا اس کتاب کا ان کو جنہیں ہم نے چن لیا تھا اپنے بندوں سے ۱؎۔ پس بعض ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں ۲؎ اور بعض درمیانہ رو ہیں ۳؎ اور بعض سبقت لے جانے والے ہیں نیکیوں میں اللہ کی توفیق سے ۴؎ یہی (اللہ تعالیٰ کا) بہت بڑا فضل (وکرم) ہے ۵؎"

۱؎ ارث کا معنی ہے کسی شی کا ایک شخص سے منتقل ہو کر دوسرے کے پاس جانا اور بعض علماء فرماتے ہیں اور ثنا کا معنی اخرنا ہے۔ اسی سے میراث ہے کیونکہ وہ بھی پچھلے شخص کو ملتی ہے' آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہم نے سابقہ امتوں سے قرآن کو مؤخر کیا اور ہم نے انہیں عطا فرمایا جو ہمارے بندوں میں سے چنے ہوئے تھے۔ من عبادنا میں من بعضیہ ہے اور اصْطَفَيْنَا کے متعلق ہے یا اسم موصول کا بیان ہے اور ضمیر منصوب محذوف سے حال ہے جو ضمیر اسم موصول کی طرف راجع ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی [illegible]

کے علماء صحابہ کرام اور ان کے بعد والے لوگ ہیں۔ یا ساری امت مراد ہے (ابن عباس نے اسی طرح فرمایا ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو تمام امتوں سے چن لیا ہے اور اسے امت وسط بنایا ہے تا کہ وہ تمام لوگوں پر قیامت کے روز گواہ بن جائیں اور سب سے بڑی فضیلت اس امت کی یہ ہے کہ یہ سید الانبیاء کی طرف منسوب ہے۔

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا من العنایۃ رکنا غیر منہدم
لما دعا اللہ داعینا لطاعتہ باکرم الرسل کنا اکرم الامم

ترجمہ: اے اسلام کے نام لیواؤ! ہمیں مبارک ہو کہ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے ہمارا ایک ایسا سہارا ہے جو گرنے والا نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی اطاعت کے لئے سب رسولوں سے معزز رسول کے ذریعے دعوت دی تو ہم بھی ساری امتوں سے بہتر امت بن گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جملہ ان الذین یتلون پر معطوف ہے اور والذی اوحینا کلام معترض ہے۔ میرے نزدیک یہ جملہ والذی اوحینا الیک کے مضمون پر معطوف ہے۔ یعنی ہم نے آپ کی طرف کتاب حق نازل فرمائی پھر ہم نے تیری طرف سے اس کتاب کا ان لوگوں کو وارث بنایا جو ہمارے بندوں میں سے چیدہ تھے۔

۲۔ جن کو ہم نے کتاب حکیم کی میراث کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ ان میں سے کچھ اعمال میں کوتاہی اور سستی کی وجہ سے اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ (ترجمہ) اور دوسرے لوگ ہیں (جن کا معاملہ) ملتوی کر دیا گیا ہے اللہ کا حکم (آنے) تک چاہے وہ عذاب دے انہیں اور چاہے تو بہ قبول فرمالے ان کی۔ ایک اور مقام پر فرمایا یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۝ (ترجمہ) اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو۔ بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

۳۔ اور کچھ ان میں سے وہ بندے ہیں جو کتاب کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں لیکن اس کی حقیقت تک رسائی نہیں کر پاتے۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ ۔ (ترجمہ) کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اعتراف کر لیا ہے اپنے گناہوں کا انہوں نے ملا جلا دیئے ہیں کچھ اچھے اور کچھ برے عمل امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ان کی توبہ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

۴۔ اور بعض وہ ہیں جو توفیق الٰہی سے نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں۔ یعنی ارادہ الٰہیہ سے حقائق قرآن تک پہنچنے والے ہیں، ان کے متعلق ارشاد فرمایا وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (ترجمہ) اور سب سے آگے آگے سب سے پہلے پہلے ایمان لانے والے مہاجرین اور انصار سے اور جنہوں نے پیروی کی ان کی عمدگی سے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اس سے(۱)۔ ایک اور مقام پر فرمایا وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ۝ اُولٰٓئِكَ

(۱) [illegible] نے رسول اللہ ﷺ کو مہاجرین کے متعلق یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ سبقت لے جانے والے ہیں،

الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ ۔(ترجمہ)اور(تیسرا گروہ ہر کارِ خیر میں) آگے رہنے والوں کا وہ(اس روز بھی) آگے آگے ہوں گے وہی مقرب بارگاہ ہیں۔پہلی دونوں قسمیں اصحاب المیمنہ (دائیں طرف والے) ہیں۔بعض علماء فرماتے ہیں مقتصد وہ ہوتا ہے جو غالب اور اکثر اوقات میں قرآن کے احکام پر عمل کرتا ہے اور السابق وہ ہوتا ہے جو عمل کے ساتھ دوسروں کو تعلیم وارشاد کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔

علامہ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوعثمان النہدی سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں میں نے عمر بن خطاب کو سنا کہ انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم میں سے سبقت لے جانے والا تو' سابق ہی ہے اور ہم میں سے جو درمیانہ رو ہیں وہ بھی نجات پانے والے ہیں اور جو ہم میں سے اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں ان کی بخشش ہو جائے گی(1) ابوقلابہ فرماتے ہیں میں نے یہ حدیث یحییٰ بن معین کے سامنے بیان کی تو وہ متعجب ہوئے۔اس حدیث کو علامہ بغوی نے مرفوع روایت کیا ہے۔سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت عمر پر موقوف روایت کی ہے۔بغوی نے اپنی سند سے ابوثابت سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا تو یہ دعا مانگی اے اللہ میری غریب الوطنی پر رحم فرما اور میری وحشت کو انس سے بدل دے اور کسی نیک دوست کو میرے پاس پہنچا دے۔حضرت ابودرداء نے فرمایا اگر تو سچا ہے تو میں تیری ملاقات کی وجہ سے تجھ سے زیادہ سعادت مند ہوں۔میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا سابق بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا۔مقتصد کا آسان حساب ہوگا۔اور اپنی جان پر ظلم کرنے والے کو اپنی جگہ روک لیا جائے گا حتی کہ اسے غم لاحق ہوگا۔پھر اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرما دے گا۔پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۝ (2)۔

اس حدیث کو احمد' ابن جریر' طبرانی' حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔اور ان کی روایت میں اس طرح ہے کہ ظالموں کو محشر کی مدت روک لیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی کوتاہیوں کی تلافی فرمائے گا۔اس وقت وہ کہیں گے الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۝ (ترجمہ) سب ستائشیں اللہ کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (واندوہ) یقیناً ہمارا رب بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں یہ حدیث حضرت ابودرداء سے کسی طرق سے مروی ہے۔اور جب کسی حدیث کے طرق کثیر ہوں تو یقیناً اس حدیث کی اصل ہوتی ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں اسامہ بن زید سے اس آیت کے متعلق مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تمام (تینوں گروہ) اس امت سے ہوں گے(3)۔بیہقی نے اسامہ بن زید سے اسی طرح نقل کی ہے۔اسی طرح حضرت کعب اور عطاء سے

1۔تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 248 (التجاریۃ) 2۔تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 248 (التجاریۃ) 3۔تفسیر خازن، جلد5، صفحہ 248 (التجاریۃ)

بلند کریں گے اور یوں عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار ہمارا ابھی حساب ہوگا، جبکہ ہم نے تیری رضا کے لئے اہل، مال اور اولاد چھوڑے تھے۔اللہ تعالیٰ ان کے بازو سونے کے لگا دے گا اور ان پر زبرجد اور یاقوت جڑا ہوا ہوگا۔وہ ان بازوؤں سے پرواز کر کے جنت میں تشریف لے جائیں گے۔اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وقالوا الحمد للّٰه الذی اذهب عنا الحزن ...... ولا یمسنا فیها لغوبٌ کا یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔وہ اپنی جنت کی منازل اور رہائشوں کو دنیا کے گھروں سے زیادہ جانتے ہوں گے۔حضرت عثمان بن عفان

روایت کیا ہے کہ یہ تینوں گروہ جنت میں ہوں گے۔ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ امت محمد ﷺ کا تذکرہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسے ہر اس کتاب کا وارث بنایا جو اس نے نازل کی ہے۔ پس اس امت کے وہ لوگ جو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں ان کو بخش دیا جائے گا اور جو درمیانہ رو ہیں ان کا آسان طریقہ پر حساب لیا جائے گا اور اس امت کے سابقین کو اللہ تعالیٰ بغیر حساب کے جنت میں داخل فرمادے گا(1)۔امام احمد، ترمذی اور بیہقی نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کریمہ کے متعلق ارشاد فرمایا یہ تمام لوگ ایک جماعت کے قائم مقام ہوں گے اور سب جنت میں ہوں گے(2)۔الفریابی نے براء بن عازب سے **فمنهم ظالم لنفسه** کے متعلق روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت میں داخل فرمائے گا(3)۔ابن ابی عاصم اور الاصبہانی نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندوں کو دوبارہ اٹھائے گا پھر علماء کو علیحدہ فرما کر ارشاد فرمائے گا اے علماء کے گروہ میں نے تم میں اپنا علم نہیں رکھا مگر مجھے تمہارے متعلق علم تھا۔اور نہ میں نے تمہیں اس لئے علم عطا فرمایا کہ میں تمہیں عذاب دوں جاؤ میں نے تمہاری بخشش فرمادی ہے۔طبرانی نے ثقہ راویوں کے حوالہ سے حضرت ثعلبہ بن الحکم سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب بندوں کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی شان کے لائق اپنی کرسی پر بیٹھے گا تو علماء سے فرمائے گا میں نے اپنا علم اور حکمت تم میں نہیں رکھا مگر اس لئے کہ میں تمہاری بخشش کا ارادہ رکھتا تھا خواہ تم سے کوئی بھی اعمال صادر ہوئے۔اور مجھے کوئی پروا نہیں (اگر چہ میں نے تمہارے سب گناہوں کو معاف فرمادیا)(4)ابن عساکر نے ابو عمر الصنعانی (حفص بن میسرہ) سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں جب قیامت کا دن ہوگا تو علماء کو الگ کیا جائے گا پھر جب اللہ تعالیٰ کو دوسرے لوگوں کے حساب سے فراغت ہو جائے گی تو ارشاد ہوگا میں نے تمہارے اندر اپنی حکمت صرف ایک بھلائی کی خاطر رکھی تھی جو آج میں تمہارے ساتھ کرنا چاہتا ہوں، تم سے جو کچھ بھی ہوا اس کے باوجود تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔

عقبہ بن صہبان فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت (اورثنا الکتاب الخ) کے متعلق پوچھا تو حضرت عائشہ نے فرمایا یہ سب لوگ جنتی ہیں۔نیکیوں میں سبقت لے جانے والے وہ ہیں جو عہد نبوی میں تھے۔ان کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے اور جو میانہ رو ہیں، انہوں نے آپ ﷺ کی اتباع کی اور آپ کے ساتھ لاحق ہو گئے اور جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا وہ مجھ جیسے اور تم جیسے ہیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے (کسر نفسی کرتے ہوئے) اپنے آپ کو ہمارے ساتھ ملا دیا(5)۔میں کہتا ہوں ان تینوں گروہوں کو اس امت کے نیک اور چیدہ لوگوں پر محمول کرنا بھی ممکن ہے۔یعنی کچھ اولیاء کرام ایسے ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو ان کے جائز حقوق سے بھی روک دیا اور ان کی خواہشات کی پیروی سے روک دیا جیسے ریاضتیں اور مجاہدہ کرنے والے لوگ۔یہ رہبانیت ہے جس کو انہوں نے ایجاد کیا۔بعض ایسے اولیاء کرام ہیں جو اپنے نفس کو لذتوں سے تو روکے رکھتے ہیں اور افطار بھی کرتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں، سوتے بھی ہیں، نکاح بھی کرتے ہیں اور کھاتے پیتے بھی ہیں جو شرعاً مباح ہوتا ہے۔ایسے گروہ کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کی پیروی کی اور آپ کے ساتھ

مستغرق ہوتے ہیں اور یہ لوگ صحابہ کرام اور صدیقین ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا۔ حضرت عائشہ نے اپنے نفس کو روندنے کے لئے اپنے آپ کو ظالموں میں شمار فرمایا اور مخاطبین کو اس لئے اس گروہ میں شامل فرمایا کیونکہ وہ سخت ریاضت کرتے تھے۔ یہ تمام احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ تینوں گروہ مومنین سے ہیں یا علماء سے ہیں۔ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ ظالم لنفسہ سے مراد کافر یا منافق ہیں۔ ان کا یہ قول مردود ہے۔ حضرت امام ابو یوسف سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ تینوں گروہ مومن ہیں۔ اور کفار کی صفت اس کے بعد بیان ہو رہی ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ (کافروں کے لئے جہنم کی آگ ہے) اور ان تینوں طبقات کے مومنین میں سے ہونے کا قرینہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک گروہ کے لئے فرمایا منھم اور ھم ضمیر کا مرجع الذین اصطفٰی من عبادہ (یعنی وہی چیدہ بندے ہیں) اور وہ اہل ایمان ہیں۔ جمہور کا یہی مسلک ہے۔ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ وہ زیادہ ہوتے ہیں اور نیکیوں پر سبقت کرنے والے کم ہوتے ہیں ان کا ذکر آخر میں فرمایا۔ درمیانہ رو متوسط تعداد میں ہوتے ہیں اس لئے ان کا ذکر درمیان میں فرمایا۔ یا یہ وجہ ہے کہ ظلم بمعنی میلان نفس ہے اور میلان نفس ہر ایک میں پایا جاتا ہے۔ اقتصاد (میانہ روی) اور سبق لاحق ہونے والی کیفیتیں ہیں لیکن اقتصاد دونوں طرفوں کے درمیان ہے۔

۵ یہ توریث یا الاصطفاء بہت بڑا فضل ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾

''سدا بہار باغات! یہ ان میں داخل ہوں گے پہنائے جائیں گے انہیں وہاں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار ۱ اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہوگی ۲ ''

۱ جَنّٰتُ عَدْنٍ، مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر لھم محذوف ہے۔ يَّدْخُلُوْنَهَا، جنت کی صفت ہے یا جنت مبتدا ہے اور يَّدْخُلُوْنَهَا خبر ہے۔ ابو عمرو نے یدخلون کو یاء کے ضمہ اور خاء کے فتحہ کے ساتھ باب افعال سے مجہول پڑھا ہے اور باقی قراء نے مجرد فعل سے یاء کے فتحہ اور خاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یدخلون میں ضمیر مرفوع تینوں اصناف کی طرف راجع ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہو چکا ہے۔

يُحَلَّوْنَ، یدخلون کے فاعل سے حال مقدر ہے یا بدل اشتمال ہے۔ یدخلون سے یا یہ جملہ مستانفہ ہے یا جَنّٰتُ عَدْنٍ کی دوسری خبر ہے یا دوسری صفت ہے۔ لؤلؤ کا اساور کے محل پر عطف ہے۔

۲ ان کا لباس وہاں ریشمی ہوگا۔ یہ يُحَلَّوْنَ پر معطوف ہے یا جَنّٰتُ عَدْنٍ پر معطوف ہے یا يُحَلَّوْنَ کے فاعل سے حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ حضرت ابو سعید الخدری سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جَنّٰتُ عَدْنٍ الخ کی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا جنتیوں کے سروں پر ایسے تاج ہوں گے جن کا ادنی موتی مشرق و مغرب کو روشن کر دے گا(۱)۔ اس حدیث کو ترمذی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی لکھا ہے اور بیہقی نے بھی روایت کی ہے۔ علامہ قرطبی نے فرمایا کہ مفسرین فرماتے ہیں ہر جنتی کے ہاتھ میں تین

زیور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کیا جاتا ہے(1)۔(بخاری ومسلم) حضرت حذیفہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ریشم اور دیباج نہ پہنو اور سونے' چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور نہ سونے چاندی کی رکابیوں میں کھانا کھاؤ کیونکہ کافروں کے لئے یہ دنیا میں ہیں اور تمہارے لئے آخرت میں ہیں (بخاری ومسلم)(2) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو دنیا میں حریر (ریشم) پہنے گا آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا (بخاری ومسلم)(3)

طیالسی نے صحیح سند کے ساتھ اور اسی طرح ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت فرمایا ہے لیکن ان کی روایت میں یہ زائد ہے کہ اگرچہ وہ جنت میں داخل بھی ہو جائے گا پھر بھی وہ ریشم کا لباس نہیں پہنے گا۔ ابن ابی حاتم' ابن ابی الدنیا نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا اگر جنت کے کپڑوں میں سے کوئی کپڑا آج پہن لیا جائے تو اسے دیکھنے والا بے ہوش ہو جائے اور لوگوں کی آنکھیں اسے دیکھنے کی متحمل نہ ہوں۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۴﴾

"(شکر نعمت کے طور پر) کہیں گے سب ستائشیں اللہ کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (واندوہ)[1] یقیناً ہمارا رب بہت بخشنے والا بڑا قدردان ہے[2]"

[1] قَالُوا، ماضی کا صیغہ ہے لیکن مراد مستقبل ہے، یعنی قیامت کے روز یہ کہیں گے جیسا کہ گزشتہ احادیث اور آئندہ آیت الذی احلنا دار المقامة دلالت کر رہی ہے۔ اسی طرح وہ یہی کلمات اپنی قبور سے اٹھنے کے وقت کہیں گے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے لا الہ الا اللہ کہنے والوں پر نہ موت میں وحشت ہے، نہ قبور میں اور نہ نشور میں۔ گویا میں صور پھونکنے کے وقت انہیں دیکھ رہا ہوں کہ وہ مٹی سے سر جھاڑتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ(4)۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اَلْحَزَنَ سے مراد آگ کا غم ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں موت کا حزن ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں ان کو غم اس لئے ہوگا کیونکہ انہیں معلوم نہیں کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ عکرمہ فرماتے ہیں حزن سے مراد گناہوں اور خطاؤں کا ڈر اور عبادتوں کے مسترد ہونے کا خوف ہے' کلبی فرماتے ہیں حزن سے مراد وہ غم ہے جو دنیا میں انہیں قیامت کے روز کے متعلق تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں دنیا میں روٹی کا غم مراد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں معاش اور معاد کا غم مراد ہے(5)۔ حق یہ ہے کہ جنس حزن مراد ہے۔

[2] وہ کہیں گے ہمارا رب واقعی اپنے بندوں کی سیاہ کاریوں اور عصیاں طرازیوں کو بخشنے والا ہے' اور میانہ رو اور سابقین کی شب خیزیوں اور سجدہ ریزیوں کی قدردانی فرمانے والا ہے۔

الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾

"جس نے ہمیں بسایا ہے ابدی ٹھکانے پر اپنے فضل (واحسان) سے نہ چھوئے گی ہمیں یہاں کوئی تکلیف اور نہ چھوئے گی ہمیں تھکن"

[1] الْمُقَامَةِ مصدر میمی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذات کتنی کریم ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں یہ راحت و سکون کا دائمی ٹھکانا مرحمت فرمایا۔ ورنہ اس پر یہ واجب تو نہ تھا۔ یہ فقط اس کی بندہ نوازی ہے۔ امام بیہقی نے البعث میں اور ابن ابی حاتم نے نقیع بن الحارث عن عبداللہ بن ابی اوفی کے طریق سے روایت فرمایا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! دنیا میں نیند کے مزے سے اللہ تعالیٰ ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک عطا فرماتا ہے، کیا جنت میں بھی نیند ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ کیونکہ نیند موت کی شریک ہے (موت کے مشابہ اور موت کا ایک حصہ ہے) جنت میں موت نہیں ہے' اس شخص نے عرض کی حضور! پھر راحت کیسے ملے گی حضور ﷺ کو ان کی یہ بات اچھی نہ لگی اور فرمایا وہاں کوئی تھکن نہ ہوگی وہاں تو راحت ہی راحت ہوگی۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جنت میں کوئی تھکن' اضمحلال اور پژمردگی نہ ہوگی(1)۔ نصب کے بعد لغوب کا ذکر اس لئے فرمایا تا کہ ہر قسم کی درماندگی اور خستگی کی صراحۃً نفی ہو جائے اور مزید تاکید پیدا ہو۔ لا یمسّنا کا جملہ احلنا کے مفعول سے حال ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۚ﴿۳۶﴾

''اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لئے دوزخ کی آگ (تیار) ہے۔ نہ ان کی قضا آئے گی کہ وہ مر جائیں [1] اور نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے دوزخ کا عذاب [2] اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر ناشکر گزار کو [3]''

[1] وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا عطف ثم اورثنا پر ہے۔ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ کا معنی لا یحکم علیھم الموت ہے، یعنی ان پر موت کا فیصلہ نہیں ہو گا تا کہ مر کر اس عذاب سے نجات و راحت حاصل کر لیں۔ فَيَمُوْتُوْا میں فاء کے بعد ان مقدرہ ہے کیونکہ یہ نفی کے جواب میں ہے۔ تقدیر کلام اسطرح ہے لا یکون علیھم قضاء بالموت فیموتوا۔ شیخین نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے تو موت کو جنت اور دوزخ کے درمیان لا کر ذبح کر دیا جائے گا پھر اعلان ہوگا اے جنت کے مکینو! اب کوئی موت باقی نہیں ہے۔ اے دوزخیو! آئندہ کوئی موت نہ ہوگی۔ اس اعلان سے اہل جنت کو مزید فرحت وانبساط نصیب ہوگا اور دوزخیوں کے غم میں اضافہ ہوگا(2) بخاری اور مسلم نے ابوسعید سے یہی حدیث نقل کی ہے اس میں یہ ہے کہ موت کو قیامت کے روز لایا جائے گا اور وہ چتکبرے مینڈھے کی طرح ہوگی۔

[2] پلک جھپکنے کی مقدار بھی عذاب میں تخفیف نہ ہوگی۔ جب ان کی کھالیں پک جائیں گی تو انہیں دوسری کھالوں سے بدل دیا جائے گا تا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کڑے عذاب میں مبتلا رہیں اور دوزخ جب بجھنے لگے گی تو اسے پھر بھڑکا دیا جائے گا۔

[3] کذالک' مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر ناشکرے اور منکر کو یہی سزا دیں گے۔ كَفُوْرٍ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ کیونکہ اللہ کے منکر کا کفر اس سے زیادہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے منعم کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے۔

ابوعمرو نے نجزی کو واحد غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور کل کو رفع دیا ہے، جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور کل کو مفعولیت کی بناء پر نصب دی ہے۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ۖ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۳۷﴾

"اور وہ اس میں چیختے چلاتے ہوں گے (فریاد کریں گے) اے ہمارے رب! (ایک بار) ہمیں یہاں سے نکال ہم بڑے نیک کام کریں گے ایسے نہیں جیسے ہم پہلے کیا کرتے تھے [1] (جواب ملے گا) کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بآسانی) نصیحت قبول کر سکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا [2] اور تشریف لے آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا (تم نے اس کی بات نہ مانی) [3] پس اب (اپنے کئے کا) مزہ چکھو ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں [4]"

[1] فیھا میں ضمیر کا مرجع نار (آگ) ہے، اس جملہ کا عطف لھم نار جھنم پر ہے یا لھم کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ یصطرخون' باب افتعال سے ہے اور یہ صراخ سے مشتق ہے جس کا معنی چیخنا چلانا ہے۔ ربنا الخ کا جملہ یقولون محذوف کا مقولہ ہے اور یصطرخون کا بیان ہے۔ عمل صالح کو صفت مذکور سے مقید کیا ہے اس لئے کہ وہ اپنے کرتوتوں پر اظہار افسوس کریں گے یا اس کا اعتراف کریں گے۔ اور اس قید میں یہ بھی شعور ملتا ہے کہ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب دنیا میں ہم جو عمل کرتے رہے پہلے ہم انہیں اچھے اور نیک اعمال سمجھتے تھے اب حقیقت ظاہر ہوئی ہے کہ وہ اعمال تو برے تھے اس لئے ہماری گزارش ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ دنیا میں بھیجا جائے ہم ان خطاؤں کی تلافی کریں گے۔ جواب ملے گا۔

[2] کیا ہم نے تمہیں اتنی مہلت نہیں دی تھی جس میں نصیحت قبول کرنے والا نصیحت قبول کر سکتا تھا۔ ہمزہ انکار کے لئے ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی الم نترککم في دار التكليف ولم نعمركم ما يتذكر۔ یعنی کیا ہم نے دنیا میں تمہیں عرصہ دراز تک مہلت نہیں دی تھی اور طویل عمر عطا نہیں کی تھی جس میں تو سوچ سکتے تھے۔ اتنی عمر میں ایک مومن تو نصیحت حاصل کر لیتا ہے (لیکن اس وقت تو تم دنیا کی لذتوں اور نفسانی خواہشات میں یوں مگن تھے کہ ہمارے احکام کی طرف کان بھی نہیں لگاتے تھے) علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ' عطاء اور کلبی فرماتے ہیں آیت میں مذکور عمر سے مراد اسی سال ہے۔ الحسن فرماتے ہیں چالیس سال ہے' ابن عباس فرماتے ہیں ساٹھ سال ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی عمر تک انسان کو عذر پیش کرنے کا موقع عطا فرماتے ہیں(1)۔ حضرت ابو ہریرہ نے نبی کریم سے روایت فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو عذر پیش کرنے کی مہلت عطا فرمائے رکھتا ہے۔ حتی کہ اس کی عمر چالیس سال ہو جاتی ہے(2) اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح' البزار' احمد' عبد ابن حمید نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے' طبرانی' اور ابن جریر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو کہا جائے گا ساٹھ سال کی عمر والے کہاں ہیں۔ یہی وہ عمر ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ(3)۔ میں کہتا ہوں ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ارشاد ہر اس عمر کو شامل ہے جس میں انسان غور و فکر کر سکتا ہے۔ شاید حدیث کا یہ مطلب ہو کہ جب انسان کی عمر چالیس سال ہو جاتی ہے تو اس سے ہر عذر [illegible] کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ ساٹھ سال کے بعد اس کی طبعی عمر کا کچھ باقی نہیں رہتا۔

میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر (سال) کے درمیان ہیں۔ اس سے زیادہ عمر والے بہت کم ہوں گے(1)۔ ورنہ بلوغت کے بعد انسان کے لئے نماز کو چھوڑنے اور دوسرے فرائض کو ترک کرنے کا کوئی معقول عذر نہیں ہوسکتا خصوصاً اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لانے کا تو کوئی بہانہ نہیں ہوسکتا۔ اگر میری تاویل نہ مانی جائے کہ ما یتذکر کا ارشاد ہر اس عمر کو شامل ہے جسمیں غور و فکر کرنا ممکن ہے تو پھر قیامت کے روز اس ارشاد کے مخاطب تمام کافر نہ ہوں گے بلکہ صرف وہی ہوں گے جنہوں نے ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر پائی ہوگی (حالانکہ یہ حکم تمام کافروں کو ہوگا)

سے تمہارے پاس ڈرانے والا آیا مگر تم نے اس کی تبلیغ کو تسلیم نہ کیا۔ نذیر سے مراد جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے اور ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے زید سے یہی قول روایت کیا ہے۔ اکثر مفسرین کا بھی یہی خیال ہے کہ نذیر سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ بعض فرماتے ہیں نذیر سے مراد قرآن ہے۔ علماء کی مختلف تفاسیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے نذیر محمد ﷺ اور قرآن ہیں اور دوسرے انبیاء کرام اور دوسری کتب دوسری امتوں کے لئے نذیر ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں النذیر سے مراد عقل ہے۔ یہ قول ان علماء کی رائے پر ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ ایمان باللہ کے لئے صرف عقل کافی ہے۔ حتیٰ کہ ان علماء کے نزدیک ہر بالغ شخص کافر ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے گا اگر چہ وہ تنہا پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتا ہو اور اسے کسی نبی کی دعوت نہ پہنچی ہو۔

یہ جملہ (جاءکم النذیر) سابقہ کلام کے مفہوم پر معطوف ہے۔ یہ عطف دلالت کرتا ہے کہ آیت میں نذیر سے مراد عقل نہیں ہے کیونکہ عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے، جبکہ لمبی عمر ملنے جس میں انسان غور و فکر کر سکتا ہے اور عقل آنے کے درمیان کوئی مغائرت نہیں ہے۔ کیونکہ عقل مند ہونا اسی لمبی عمر کی وجہ سے ہے اور جو بے عقل ہوا سے تو گویا نصیحت کی عمر ملی ہی نہیں(2)۔

عکرمہ، سفیان بن عیینہ اور وکیع فرماتے ہیں نذیر سے مراد بڑھاپے کے سفید بال ہیں۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر نے یہ قول عکرمہ سے نقل کیا ہے۔ ابن مردویہ اور بیہقی نے اپنی سنن میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ سفید بال موت کے قاصد ہیں۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ جب ایک بال سفید ہوتا ہے تو وہ دوسروں کو کہتا ہے تم بھی تیار ہو جاؤ موت کا وقت قریب آ گیا ہے(3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں نذیر سے مراد رشتہ داروں اور دوستوں کی موت ہے۔

سے حکم ہوگا بدبختو اپنے کفر اور نافرمانی کے عذاب کا مزہ چکھو۔ اس وقت ان ظالموں سے کوئی بھی عذاب کو دور کرنے والا مددگار نہ ہوگا۔

إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٣٨﴾

"بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین میں ہر چھپی ہوئی چیز کو یقیناً وہ جانتا ہے دلوں کے رازوں کو 1"

1 یعنی اس پر کسی انسان کا حال مخفی نہیں ہے کیونکہ وہ تو دل کے نہاں خانہ میں اٹھنے والی آرزوؤں اور رازوں کو بھی جانتا ہے۔ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ پہلے جملہ کی علت ہے یعنی جو دلوں کے مضمرات کو جانتا ہے جو انتہائی مخفی ہیں وہ دوسری چیزوں کو بدرجہ اولیٰ جانتا ہے۔

كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿٣٩﴾

''وہی ہے جس نے تمہیں (گزشتہ قوموں کا) جانشین بنایا زمین میں۔ پس جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال بھی اس پر ہوگا اور نہیں اضافہ کرے گا کفار کے لئے ان کا کفر اللہ کی جناب میں بجز ناراضگی کے اور نہ اضافہ کرے گا کفار کے لئے ان کا کفر بجز گھاٹے (اور خسران) کے[1]''

[1] جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ کا پہلا مفہوم تو بیان کیا گیا ہے کہ تم ایک دوسرے کے خلیفے ہو۔ اس معنی کے اعتبار سے خطاب تمام افراد انسانی کو ہوگا۔ بعض مفسرین نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس نے تمہیں تمام امتوں سے بعد میں بھیجا ہے اور ان کی عبرت ناک داستانیں تمہیں دکھائی اور سنائی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں خلیفہ بمعنی المستخلف ہے، یعنی اس نے تمہیں ایک دوسرے کا خلیفہ بنایا ہے اور تمہیں کائنات میں تصرف کا اختیار بخشا ہے اور زمین کے اندر اور اوپر جو کچھ خزانے اور معدنیات موجود ہیں سب پر تمہیں تسلط اور غلبہ عطا کیا ہے۔ خلائف خلیفہ کی جمع ہے اور الخلفاء خلیف کی جمع ہے۔
وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ کا تکرار اس بات کی دلیل ہے کہ کفر خسارہ اور ناراضگی میں سے ہر کے لئے مستقل ہے۔ پس یہ چیز کفر کی قباحت اور اس سے اجتناب کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ ۚ بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿٤٠﴾

''آپ فرمائیے کیا تم نے دیکھے ہیں اپنے شریک جنہیں تم پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا۔ مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے یا ان کی کوئی شراکت ہو آسمانوں (کی تخلیق) میں[1] یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہو اور وہ اس کے روشن دلائل پر عمل پیرا ہوں (کچھ بھی نہیں)[2] بلکہ یہ ظالم محض ایک دوسرے کے ساتھ جھوٹے (دلفریب) وعدے کرتے رہتے ہیں[3]''

[1] مِنْ دُونِ اللَّهِ سے مراد بت ہیں۔ ان کو شرکاء اس لئے کہا ہے کہ کفار مکہ انہیں اللہ کا شریک سمجھتے تھے یا اس لئے کہ وہ اپنے مال میں انہیں شریک کرتے تھے۔ اروني، ارایتم کی تاکید یا بدل اشتمال ہے کیونکہ ارایتم کا معنی اخبروني ہے۔ مَاذَا خَلَقُوا، رایتم کا مفعول ثانی ہے اور شرکاء کم پر محمول ہے۔ من الارض سے مراد زمین کا کوئی جز ہے اور شرک بمعنی شرکت ہے۔ یعنی مجھے ان شرکاء کے متعلق بتاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین کے کسی گوشہ میں کوئی تخلیق کی ہے یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی آسمان کی تخلیق میں ان کی کوئی شرکت ہے، جس کی وجہ سے یہ الوہیت ذاتیہ میں شرکت کے مستحق ہو گئے ہیں۔ ام منقطعہ بمعنی بل ہے۔ اور ہمزہ کسی زمین کے گوشہ کی تخلیق سے اضراب ہے اور آسمانوں کی تخلیق میں شرکت سے استفہام ہے۔
[2] (اگر یہ زمین و آسمان کی تخلیق میں حصہ دار نہیں جس کو تم خود تسلیم کر چکے ہو) تو پھر بتاؤ کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں کوئی کتاب ایسی دی ... فا جواب شرط محذوف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ان

(یعنی جمع) پڑھا ہے۔منہ کی ضمیر کا مرجع کتاب ہے۔بل سابق تردید سے اضراب اور باقی تمام کا اثبات ہے۔

۳۔ ان ظالموں کے پاس بے جان مورتیوں کے شریک ہونے پر کوئی علمی دستاویز نہیں ہے کہ اس سے استدلال کر سکیں۔ بلکہ ان کے باپ دادا اپنی اپنی نسل کو بلا سند اور بلا دلیل گمراہ کرنے کے لئے جھوٹے وعدے دیتے رہے کہ یہ بت اللہ کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یقولون ھؤلاء شفعاء نا عند اللہ۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ روکے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو تا کہ وہ اپنی جگہ سے سرک نہ جائیں اور اگر وہ سرکنے لگیں تو کوئی نہیں روک سکتا انہیں اللہ تعالیٰ کے بعد۱ بیشک وہ بڑا حلیم (اور) بخشنے والا ہے ۲''

۱۔ اَنْ تَزُوْلَا یا تو مفعول لہ ہے یا مفعول بہ ہے۔ (ممکن جس طرح اپنے حدوث میں محدث کا محتاج ہوتا ہے) اسی طرح اس کی بقاء کے لئے مبقی اور محافظ کا ہونا بھی ضروری اور لازمی ہے۔لئن پر لام قسم کے لئے ہے۔من بعدہ کی ضمیر کا مرجع اسم جلالت ہے، یعنی اللہ کے سوا یا الزوال ہے' اور اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ الخ کا جملہ جواب قسم ہے اور جواب شرط کے قائم مقام ہے اور جواب شرط پر دلالت کر رہا ہے۔مِنْ اَحَدٍ میں من زائدہ ہے اور مِّنْۢ بَعْدِهٖ میں من ابتداء کے لئے ہے۔

۲۔ وہ حلیم ہے کہ اس نے کفار کو مہلت عطا فرمائی اور فوراً عذاب نہیں دیا۔وہ غفور ہے کہ مومنوں کی غلطیوں اور خطاؤں کو بخش دیتا ہے۔ اگر اس کا حلم اور غفران نہ ہوتا تو وہ آسمانوں اور زمین کو گرنے سے نہ روکتا تو ان کے گناہوں کی وجہ سے یہ آسمان ان پر گر پڑتے اور زمین ان کے ساتھ دھنس جاتی۔

ابن ابی حاتم نے ابن ابی ہلال سے روایت کیا ہے کہ قریش کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم میں نبی مبعوث فرماتا تو کوئی امت ہم سے زیادہ اپنے خالق کی اطاعت گزار نہ ہوتی اور کوئی امت ہم سے زیادہ اپنے نبی کے ارشاد کو سننے والی نہ ہوتی اور اپنی کتاب پر عمل پیرا ہونے میں ہم سے زیادہ متشدد نہ ہوتی۔اس وقت اللہ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1)۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ﴿۴۲﴾

''اور (کفار مکہ) اللہ تعالیٰ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ زیادہ ہدایت قبول کریں گے پہلی امتوں سے ۱۔ پس جب آ گیا ان کے پاس ڈرانے والا تو ان کی (حق سے) نفرت اور بڑھ گئی ۲''

۱۔ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ، اَقْسَمُوْا کے مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ ایمان بمعنی اقسام ہے' یعنی وہ بڑی بلیغ اور مؤکد قسمیں اٹھاتے تھے یا فعل محذوف کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے۔تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اقسموا باللہ جھدوا جھد ایمانھم۔یا اَقْسَمُوْا کے فاعل سے حال ہے۔یعنی جاھدین فی ایمانھم۔اس کی مثال یہ ہے مررت بہ وحدہ۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں بعثت نبوی ﷺ سے پہلے جب قریش کو علم ہوا کہ اہل کتاب نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا ...

ہے تو قریش یہود و نصاریٰ پر لعن طعن کرتے کہ وہ لوگ کتنے بدبخت تھے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کو جھٹلایا اور خود قسمیں اٹھا کر کہتے تھے کہ ہمارے پاس اگر کوئی رسول تشریف لایا تو ہم سابقہ تمام ایماندار قوموں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے (1)۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ قریش نے یہ لمبے چوڑے دعوے اس وقت کیے تھے جب انہوں نے یہود و نصاریٰ کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے کہ وہ کسی دین پر نہیں ہیں، یہود کہتے نصاریٰ کسی دین پر نہیں۔ نصاریٰ کہتے' یہود کا کوئی دین و مذہب نہیں ہے۔ لیکونن لفظاً جواب قسم ہے اور معنی جواب شرط ہے۔

۲۔ جب جناب محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ کی آمد سے ان کی حق سے نفرت اور بڑھ گئی (نہ کوئی اخلاقی قدر کا پاس رہا اور نہ کسی عہد و پیاں کی یاد رہی) زادھم کی نسبت نذیر کی طرف یا اس کے آنے کی طرف مجازی ہے (یعنی حکم کو سبب کی طرف منسوب کیا گیا ہے' کیونکہ نفس نذیر یا اس کی آمد نے حق سے ان کی نفرت میں اضافہ نہیں کیا تھا بلکہ حق سے ان کی نفرت اس نذیر کے سبب یا اس کی آمد کے سبب بڑھی تھی)

اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ﴿٤٣﴾

'' وہ زیادہ سرکشی کرنے لگے زمین میں ۱؎ اور گھناؤنی سازشیں کرنے لگے اور نہیں گھیرتی گھناؤنی سازش بجز سازشیوں کے ۲؎ پس کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو پہلے (نافرمانوں) کے ساتھ کیا گیا تھا (اگر یہ بات ہے) تو آپ نہیں پائیں گے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی اور آپ نہیں پائیں گے اللہ کی سنت میں کوئی تغیر ۳؎ ''

۱؎ اسْتِكْبَارًا یا تو نفوراً سے بدل ہے۔ یا نفوراً کا مفعول لہ ہے یا زادھم کے مفعول اول سے حال ہے۔ مَكْرَ السَّيِّئِ سے مراد برا عمل ہے۔ کلبی فرماتے ہیں اس سے مراد ان کا شرک پر جمع ہونا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے متعلق سازشیں کرنا ہے ...... یا آپ کو قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ اصل میں وان مکروا المکر السئی تھا۔ صفت کی وجہ سے موصوف کو حذف کر دیا اور پھر ان مع الفعل کو مصدر سے بدلا گیا تو مَكْرَ السَّيِّئِ ہو گیا۔ یہ مصدر اپنی صفت کی طرف مضاف ہے (جیسا کہ صلوۃ الاولی میں ہے) حمزہ نے السیئی کے ہمزہ کو اجتماع حرکات کے ثقل کی وجہ سے وصل کی حالت میں تخفیفاً ساکن کر کے پڑھا ہے جیسا کہ ابو عمرو نے بار نکم کے ہمزہ کو ساکن کر کے پڑھا ہے اور ہمزہ جب وقف کرتے ہیں تو ہمزہ ساکنہ کو یاء سے بدل دیتے ہیں۔ اعمش کی قراءت بھی یہی ہے، جبکہ باقی قراء نے ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وقف کی حالت میں ہمزہ کو روم اور اسکان کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔

۲؎ جو اسلام اور داعی اسلام کی مخالفت میں حیلہ سازی کرتا ہے اس کی مکاریوں اور سازشوں کا وبال ان پر پڑتا ہے۔ بدر کے روز کفار کو ان کی اپنی سازشوں نے مصیبت میں گرفتار کیا اور وہ قتل کر دیئے گئے۔ ابن عباس فرماتے ہیں شرک کا برا انجام اسی شخص کو گھیرتا ہے جو شرک کرتا ہے۔ یعنی شرک کا وبال مشرکوں پر ہی پڑتا ہے (2)۔

رہی ہے جب انہوں نے کفر پر اصرار کیا تو انہیں نیست و نابود کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مکہ میں کفار کا نام و نشان مٹ گیا اور صرف مومنین باقی رہ گئے۔ اللہ کے عذاب کو مکذبین سے دوسرے لوگوں کی طرف پھیرنے والا کوئی طاقت ور تمہیں نہیں ملے گا بلکہ اس کے عذاب کا کوڑا جھٹلانے والوں پر ہی برسے گا۔

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا ﴿۴۴﴾

”کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ دیکھ لیتے کہ کتنا (دردناک) انجام ہوا ان (سرکشوں) کا جو ان سے پہلے گزر چکے حالانکہ وہ قوت (و طاقت) میں ان سے (کئی گنا) زیادہ تھے اور (سنو!) اللہ تعالیٰ ایسا (کمزور) نہیں ہے کہ اسے آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز نیچا دکھا سکے [1] وہ ہر بات جاننے والا بڑی قدرت والا ہے [2]۔“

[1] اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا میں استفہام انکاری ہے۔ اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے الم یشاھدوا آثار الماضیین و لھم یسروا۔ فینظروا یسروا پر معطوف ہے اور لم کی وجہ سے مجزوم ہے۔ یا نفی کے بعد ان مقدرہ کے ساتھ منصوب ہے۔ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد شام، یمن اور عراق کی گزشتہ قومیں ہیں۔ یعنی ان شہروں میں وہ گزشتہ نافرمان قوموں کے عبرت آمیز نشان دیکھ چکے ہیں۔ کانوا، قد کی تقدیر کے ساتھ حال ہے۔ اشد منھم میں ھم ضمیر کا مرجع اہل مکہ ہیں۔ یعنی پہلی قومیں قوت و سطوت میں ان سے کئی گنا زیادہ تھیں لیکن جب ان کی سرکشی حد سے بڑھی تو عذاب الٰہی کا بگولہ آیا اور انہیں تہس نہس کر دیا، انہیں کوئی طاقت اس عذاب الٰہی سے بچا نہ سکی۔ تو اے مکہ کے مشرکو! تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم ان کے نشانات سے عبرت حاصل کیوں نہیں کرتے۔ شئ سے پہلے من زائدہ ہے اور شئ یعجز کے فاعل کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ فی السموات فی الارض ظرف مستقر ہے اور شئ کی صفت ہے یا یعجزہ کے متعلق ہے اور ظرف لغو ہے۔

[2] وہ تمام چیزوں کے حقائق کو بھی جانتا ہے۔ جو چیز جس کی مستحق ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے۔

وَ لَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ یُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِیْرًا ﴿۴۵﴾

”اگر اللہ تعالیٰ (فوراً) پکڑ لیا کرتا لوگوں کو ان کے کرتوتوں کے باعث تو نہ (زندہ) چھوڑتا زمین کی پشت پر کسی جاندار کو لیکن (اس کی سنت یہ ہے) وہ ڈھیل دیتا رہتا ہے انہیں ایک مقررہ میعاد تک [1]۔ پس جب ان کی میعاد آ جائے گی تو بیشک اللہ کے سب بندے اسکی نگاہ میں ہیں [2]۔“

[1] جیسا کہ سابقہ آیات میں گزر چکا ہے کہ کفار مکہ کا کفر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان پر عذاب کی بجلی گرا کر ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے اور انہیں خاک میں ملا دیا جائے جیسا کہ گزشتہ قوموں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔ حالانکہ وہ ان سے بہت زیادہ

زمین پر چلنے والی روح باقی نہ رہتی لیکن وہ کریم ذات لوگوں کے مؤاخذہ کو ایک خاص مدت تک مؤخر فرماتی ہے۔ اَجَلٍ مُّسَمًّى سے مراد موت کے بعد کا وقت ہے یا روز قیامت ہے۔

؎ جب وقت مقرر پہنچ جائے گا تو سب بندے اس کی نگاہ میں ہیں، سب کو اپنے اپنے اعمال کے مطابق سزا و جزاء دے گا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں عباد سے مراد اہل طاعت اور اہل معصیت سب مراد ہیں۔

الحمد للہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی سید المرسلین

اے علیم و بصیر! میری کوتاہیوں اور سیاہ کاریوں پر قلم عفو پھیر دے اور روز قیامت اپنے محبوب کریم ﷺ کے لواء حمد کے نیچے جگہ عطا فرمانا اور قیامت کی ہولناکیوں اور پریشانیوں سے محفوظ رکھنا۔ تو کریم ہے تو جواد ہے تو رحمٰن ہے۔

محمد اقبال شاہ گیلانی

23-12-2000

بمطابق 26 رمضان المبارک 1421 ہجری بروز ہفتہ بعد نماز صبح 7:15

سورۂ یٰسٓ

آیاتہا ۸۳ ｜ سُوْرَۃُ یٰسٓ مَکِّیَّۃٌ ۳۶ ｜ رکوعاتہا ۵

سورۂ یاسین مکی ہے، اس میں تراسی آیات اور پانچ رکوع ہیں

آغاز ترجمہ سورۂ یٰسین 22-12-2000 بمطابق 26 رمضان المبارک صبح 7:15

سورہ یٰسین کا ایک نام معمہ ہے۔ حضرت ابن مردویہ' الخطیب اور بیہقی نے (۱) ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ سورۂ یٰسین کو معمہ کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں عطا کرتی ہے۔ اس کا ایک نام دافعہ بھی ہے کیونکہ یہ اپنے پڑھنے والے سے ہر برائی دور کرتی ہے۔ اس کو قاضیہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ قضائے حاجات کا باعث بنتی ہے۔ اس کی 83 آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

یٰسٓ ۝۱ ''اے سید (عرب وعجم)''

ابونعیم نے الدلائل میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بلند آواز سے قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔ کفار قریش کو اس سے بڑا دکھ ہوا۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ آپ کو پکڑ لیں لیکن قدرت نے ان کے ہاتھ ان کی گردنوں میں باندھ دیئے اور آنکھوں سے اندھے ہو گئے۔ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے اے محمد خدا کا واسطہ' رشتہ داری اور قرابت کا واسطہ ہمارے لئے دعا فرمائیں تاکہ ہماری یہ تکلیف دور ہو جائے۔ قریش کے ہر خاندان میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ اور تعلق تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مشکل حل فرما دی۔ اس وقت یہ آیات یٰسین لا یومنون تک نازل ہوئیں۔ لیکن اس واضح معجزہ کو دیکھ کر بھی کوئی ایک بھی ایمان نہ لایا(1) حمزہ اور ابوبکر نے یٰسین کو یاء کے فتحہ کے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اخلاص کے ساتھ پڑھا ہے۔ ورش' ابوبکر' ابن عامر اور کسائی نون کو واو میں ادغام کرتے ہیں اور غنہ کو باقی رکھتے ہیں۔ اسی طرح نٓ والقلم میں پڑھتے ہیں لیکن بصریوں میں عام قراء و ورش کے مسلک پر دہاں بیان کے ساتھ پڑھتے ہیں،

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 485 (العلمیۃ)

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک روایت اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تورات میں سورۂ یٰسین کا نام معمہ ہے۔ یہ اپنے پڑھنے والے کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں عطا کرتی ہے۔ دنیا و آخرت کی مصیبتیں اس سے دور کرتی ہے اور آخرت کی ہر تکلیف کو دفع کرتی ہے۔ اس کو دافعہ اور قاضیہ بھی کہا جاتا ہے، یہ اپنے قاری سے ہر برائی کو دور کرتی ہے اور اس کی حاجات کو پورا کرتی ہے۔ جو شخص اس کی تلاوت کرتا ہے اسے بیس حج کا ثواب ملتا ہے اور جو اس کو سنتا ہے اس کو سو دینار اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ثواب ملتا ہے اور جو اس کو لکھتا ہے پھر اس کو پیتا ہے تو اس کے پیٹ میں ہزار دوا، ہزار

جب کہ باقی قراء دونوں سورتوں میں نون کے اظہار کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

یٰسین معنی اور اعراب میں دوسرے مقطعات کی طرح ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لغۃ طی میں اس کا معنی یا انسان ہے اور اس سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اس بناپر ہوگا کہ اس کی اصل انیسین ہے پھر کثرت ندا کی وجہ سے اس کا ایک حصہ یعنی سین حذف کیا گیا ہے جیسا کہ ایمن کو تخفیفاً من اللہ (ایم اللہ ام اللہ) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ابن عباس سے مروی ہے۔ حسن، سعید بن جبیر اور علماء کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ ابو العالیہ کہتے ہیں اس کا معنی یا رجل ہے۔ ابوبکر الوراق فرماتے ہیں اس کا معنی یا سید البشر ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ قسم ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲

"قسم ہے قرآن حکیم کی [1]۔"

[1] یہ قرآن بدیع معانی اور نظم و عبارت کے اعتبار سے محکم اور مضبوط ہے۔ واؤ قسمیہ ہے اگر یٰسین کو قسم تسلیم کیا جائے تو واؤ عاطفہ ہوگی۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳

"بیشک آپ رسولوں میں سے ہیں [1]۔"

[1] یہ جملہ جوب قسم ہے، اس جملہ پر اگر یہ کہا جائے کہ کسی بات کی خبر دینے کی دو اغراض ہوتی ہیں۔ 1۔ مخاطب کو حکم سے آگاہ کرنا۔ 2۔ یہ بتانا کہ متکلم کو بھی بات کا علم ہے۔ یہاں کوئی معنی بھی متصور نہیں ہو سکتا پھر یہاں خبر دینے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں کفار کو آگاہ کرنا مقصود ہے اور ان کی اس بات کا رد کرنے کے لئے ہے جس پر وہ ہر وقت مصر تھے کہ "لست مرسلاً" کہ آپ رسول نہیں ہیں۔

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۴

"(یقیناً) آپ راہ راست پر ہیں [1]۔"

[1] یہ مرسلین کے متعلق ہے اور اس صراط مستقیم سے مراد توحید اور امور اسلام پر استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ ہے معنی یہ ہوگا بیشک آپ ان رسولوں میں سے ہیں جو صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ پر بھیجے گئے تھے۔ یا علی صراط مستقیم ظرف مستقر ہے اور ان کی دوسری خبر ہے یا حال ہے اس ضمیر سے جو من المرسلین میں ہے۔ اور اس کا فائدہ مدح ہے اور جو شریعت آپ لے کر آئے ہیں اس کے مستقیم ہونے پر دلالت کرنا ہے۔ اگرچہ لمن المرسلین سے اسی بات پر التزاماً دلالت ہو رہی ہے۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝۵

"نازل فرمایا ہے (قرآن حکیم کو) عزیز (اور) رحیم نے [1]۔"

[1] حفص، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے اعنی کے اضمار کے ساتھ منصوب پڑھا ہے، یا مصدر کے فعل کے اضمار کے ساتھ منصوب پڑھا

قراء نے تنزیل کو مرفوع پڑھا ہے' اس بناء پر کہ یہ مبتدا محذوف القرآن کی خبر ہے۔ یہ جملہ صراط کا بیان ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ⑥

''تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو (طویل عرصہ سے) نہیں ڈرایا گیا اس لئے وہ غافل ہیں ۱؎۔''

۱؎ لِتُنْذِرَ' یا تو تنزیل کے متعلق ہے یا لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کے معنی کے متعلق ہے۔ ما انذر میں ما نافیہ ہے۔ اور یہ جملہ قوم کی صفت ہے۔ یعنی تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو ایک عرصہ سے نہیں ڈرایا گیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد مکہ میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا تھا۔ پس وہ دوسرے لوگوں کی نسبت رسالت کے زیادہ ضرورت مند تھے۔ چونکہ اتنے عرصہ سے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اس لئے وہ غافل ہو چکے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما انذرَ میں ما موصولہ یا موصوفہ ہے۔ معنی یہ ہوگا تاکہ آپ انہیں اس چیز کے ساتھ ڈرائیں جس کے ساتھ ان کے آباء و اجداد کو ڈرایا گیا تھا۔ اس تقدیر پر ما انذرَ' تنذر کا مفعول ہوگا۔ یا ما انذر میں ما مصدریہ ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو جس طرح اس کے آباء کو ڈرایا گیا۔ ان تمام صورتوں میں فَهُمْ غٰفِلُوْنَ' اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کے متعلق ہوگا، یعنی ہم نے ان کی طرف سے آپ کو اس لئے مبعوث فرمایا تاکہ آپ انہیں ڈرائیں کیونکہ وہ غافل ہو چکے ہیں۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑦

''بیشک (ان کے پیہم کفر و عناد کے باعث) یہ بات لازم ہو چکی ہے ان میں سے اکثر پر کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۱؎۔''

۱؎ قول سے مراد یہ ارشاد ہے۔ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ⑲۔

(ترجمہ) کہ میں ضرور بھروں گا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے۔ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ میں هم ضمیر کا مرجع اکثر ہے۔ ابن جریر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ ابوجہل نے قسم اٹھائی ہے کہ اگر میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو ایسا کروں گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی دو آیات نازل فرمائیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ⑧

''ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کی گردنوں میں طوق ۱؎ پس وہ ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اس لئے ان کے سر اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں ۱؎۔''

۱؎ ابوجہل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مارنے کے لئے آیا تو قدرت نے اسے اندھا کر دیا۔ لوگ اسے بتاتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کھڑے ہیں (اپنی قسم پوری کر اور انہیں مار) لیکن وہ کہتا وہ کہاں ہے کہاں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نظر ہی نہ آتے (۱)۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت کریمہ ابوجہل اور اس کے مخزومی ساتھی کے متعلق نازل ہوئی۔ ایک دفعہ ابوجہل (لعنۃ اللہ علیہ) نے قسم اٹھائی کہ اگر اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو اسے چور چور کر دے گا۔ ایک مرتبہ اس نے آپ ﷺ کو حالت نماز میں [illegible]

مخزومی اٹھا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی پتھر سے قتل کر کے آؤں گا۔ وہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی نماز ادا فرما رہے تھے۔ اس نے پتھر مارنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی سلب کر لی۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز تو سنتا تھا۔ لیکن اسے دکھائی کچھ نہ دیتا تھا۔ وہ بھی اپنا منہ لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آیا لیکن اندھا ہونے کی وجہ سے ان کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اسے آواز دی کر تو نے کیا کیا۔ اس نے کہا مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظر ہی نہیں آئے، مجھے ان کی آواز سنائی دیتی تھی لیکن نظر نہیں آتے تھے، میرے اور ان کے درمیان ایک بڑا بیل حائل ہو گیا جو دم ہلا رہا تھا۔ اگر میں تھوڑا سا قریب جاتا تو وہ مجھے کھا جاتا' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ الخ (1)۔

۲۔ اغلال یعنی ان کے طوق ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ سر جھکا نہیں سکتے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اغلال ہاتھوں سے کنایہ ہے اگرچہ ان کا ذکر پہلے نہیں ہے کیونکہ الغل کا معنی ہاتھ کا گردن سے جمع کر دینا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے ہاتھوں میں زنجیریں اور گلوں میں طوق ڈال کر جکڑ دیا ہے (2)۔ فھم پر فاسببیہ ہے۔ کیونکہ اغلال' اقمام کا سبب ہے۔ یعنی وہ اپنے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں، کسی چیز کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بیہقی نے دلائل میں سدی الصغیر عن کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا بنی مخزوم کے کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش تیار کی۔ ان میں ابوجہل اور ولید بن مغیرہ بھی تھے۔ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور وہ بدبخت آپ کی قرأت سن رہے تھے۔ انہوں نے اپنا مشورہ کے مطابق ولید بن مغیرہ کو بھیجا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دے۔ وہ چل پڑا حتیٰ کہ جہاں آپ نماز پڑھ رہے تھے وہاں پہنچ گیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی آواز تو سن رہا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دکھائی نہ دیتے۔ واپس آ کر اس نے انہیں حقیقت حال بتائی۔ وہ سب آپ کی طرف آئے۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں آپ نماز ادا فرما رہے تھے تو انہیں آواز سنائی دیتی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم دکھائی نہیں آتے تھے۔ وہ آواز کی طرف جاتے تو آواز تھوڑی دور پیچھے سے سنائی دیتی، وہ پیچھے آواز کی طرف آتے تو آواز دوسری طرف پیچھے سے سنائی دیتی۔ اس طرح وہ نامراد ہو کر واپس پلٹے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کا کوئی راستہ نہ پا سکے۔ آئندہ آیت سے یہی مراد ہے (3)۔

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

"اور ہم نے بنا دی ہے ان کے سامنے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے پس وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے ۱۔"

۱۔ سداً کو حمزہ، کسائی اور حفص نے سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں دو لغتیں ہیں۔ فاعشینا ھم کا معنی یہ ہے۔ کہ ہم نے انہیں اندھا کر دیا، یہ تغشیہ سے ہے جس کا معنی ڈھانپ دینا ہے۔ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ پر فاسببیہ ہے۔ علماء معانی فرماتے ہیں یہ ارشاد بطور تمثیل ہے۔ وہاں نہ کوئی طوق تھا نہ دیوار تھی۔ بلکہ معنی یہ ہے کہ ہم نے

کی مثل ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہیں۔ جو ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اور وہ منہ اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کی مثل ہیں جن کے مقصود و مراد اور ان کے درمیان دیوار حائل ہے۔ اسی وجہ سے نہ وہ حق کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں اور نہ اپنی گردنیں حق کی طرف پھیر سکتے ہیں اور نہ حق کے لئے اپنے سروں کو جھکا سکتے ہیں۔ اگر بالفرض وہ سر کو جھکا بھی لیں تو ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار ہے جس کی وجہ سے انہیں ہدایت کی شاہراہ نظر نہیں آتی۔ یا یہ معنی کہ ہم نے اپنے نبی کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے اس وجہ سے ہم نے انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت سے باز رکھا۔ ہو سکتا ہے کہ جعلنا بمعنی نجعل ہو اور ماضی کا صیغہ بیان فرمایا کیونکہ اس کا وقوع یقینی ہے، یعنی ہم انہیں گردنوں میں طوق ڈال کر جہنم میں پھینکیں گے اور اس کے سامنے ایک دیوار کھڑی کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے آگ کے تابوت بنا دے گا۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑩

''اور یکساں ہے ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے [1]۔''

[1] اس آیت کی تفسیر پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ⑪

''آپ تو صرف اسی کو ڈرا سکتے ہیں جو اتباع کرتا ہے قرآن کا اور ڈرتا ہے (خداوند) رحمان سے بن دیکھے [1]۔ پس مژدہ سنائیے ایسے شخص کو مغفرت کا اور بہترین اجر کا [2]۔''

[1] یعنی اے پیارے نبی! آپ کے ڈرانے کا فائدہ صرف اس پر مرتب ہو سکتا ہے جو قرآن میں غور و فکر کرتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ نیز وہ اپنے رحمٰن رب کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ یا یہ معنی کہ آپ کا ڈرانا اس کے لئے نفع بخش ہوگا جو قرآن کی اتباع کی صلاحیت رکھتا ہو اور خشیت الٰہی کی استعداد کا حامل ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء قہار اور منتقم کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ الرحمٰن فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت کی صفت کو ملاحظہ کرتے ہوئے خشیت و خوف کا ہونا کمال خشیت ہے اور عین ایمان ہے کیونکہ ایمان خوف و امید کے درمیان ہوتا ہے۔ بالغیب خشی کے فاعل سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ عذاب سے ڈرتا ہے حالانکہ اس نے اس عذاب کا ابھی تک معائنہ نہیں کیا۔ یا یہ معنی کہ وہ خلوت میں بھی اپنے رب کے عذاب سے ڈرتا رہتا ہے۔

[2] یعنی بشری تقاضوں کے باعث جو ان سے کوتاہیاں اور گناہ ہوئے ہیں ان کی مغفرت و بخشش کا مژدہ جانفزا سنا دو نیز جنت میں انہیں اعلیٰ اور عمدہ رزق و ٹھکانہ ملنے کی نوید بھی سنا دو۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۗ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ⑫

''بیشک ہم ہی زندہ کرتے ہیں مردوں کو اور لکھ لیتے ہیں (ان اعمال کو) جو وہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے ان آثار کو جو وہ

اعمال بھی ہیں جیسے برائی اور بے حیائی کی اشاعت کرنا، ظلم کی بنیاد رکھنا، کفر کی تائید کرنا، کسی بدعت کا آغاز کرنا وغیرہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اسلام میں کسی اچھے کام کا آغاز کیا جس پر بعد میں آنے والے لوگ عمل پیرا ہوئے تو اس شخص کو اپنے عمل کا بھی اجر ملے گا اور جتنے لوگ اس نیک کام پر عمل پیرا ہوئے ان سب کا اجر بھی اسے ملے گا۔ دوسرے جو اس کی اقتداء میں عمل کرنے والے ہیں ان کے اجر میں بھی کچھ کمی نہ کی جائے گی۔ جس نے اسلام میں کسی برے طریقہ کا آغاز کیا تو جو لوگ اس پر عمل کریں گے سب کے گناہوں کا بوجھ اس پر پڑے گا لیکن بر اعمل کرنے والوں کے گناہ اور بوجھ میں بھی کمی نہ ہوگی (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے حدیث جریر سے روایت کیا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آثارھم سے مراد مساجد کی طرف چل کر جانے والے قدموں کے نشان ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے زیادہ نماز کا ثواب اس شخص کو ہوگا جو دور سے چل کر آیا ہوگا پھر اس کا جو اس سے تھوڑے کم اور دوسرے سے زیادہ قدم چل کر آیا ہوگا۔ اور جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے منتظر رہتا ہے اس کا اجر اس سے زیادہ ہوگا جو نماز اکیلے پڑھ کر سو جاتا ہے (بخاری و مسلم) (2) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں مسجد نبوی کے اردگرد زمین کے کچھ پلاٹ خالی پڑے تھے۔ بنی سلمہ نے پروگرام بنایا کہ مسجد کے قریب منتقل ہو جائیں۔ جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پروگرام اور ارادہ کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم مسجد کے قریب آنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ انہوں نے عرض کی جی ہاں یا رسول اللہ! ہمارا ارادہ کچھ ایسا ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بنی سلمہ اپنے گھروں میں رہو تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں (یعنی مسجد کی طرف جتنے قدم چل کر آتے ہو وہ سب لکھے جاتے ہیں ان کا تمہیں اجر وثواب ملے گا) (3) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بغوی نے بھی اس کو اسی طرح روایت کیا ہے۔ ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن کہا ہے اور حاکم نے ابوسعید الخدری سے نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔

۲۔ كُلَّ شَيْءٍ مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر احصینا بیان کر رہا ہے اِمَامٍ مُّبِيْنٍ سے مراد لوح محفوظ ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اور بیان فرمائیے ان کے (سمجھانے کے) لئے مثال اس گاؤں کے باشندوں کی جب آئے وہاں (ہمارے) رسول۔''

ا۔ اے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کفار مکہ کے لئے مثال بیان فرمائیے۔ عرب کہتے ہیں هذه الاشياء على ضرب واحد یہ تمام اشیاء ایک جیسی ہیں۔ یہاں اضرب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے کیونکہ اس کے ضمن میں جعل کا فعل موجود ہے گویا یوں ارشاد ہے جعل لهم مثلا اصحاب القرية۔ مثلاً مفعول اول ہے اور اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ مفعول ثانی ہے۔ الفریابی ابن عباس سے، ابن ابی حاتم نے حضرت بریدہ سے، عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ قریہ سے مراد انطاکیہ ہے، یعنی اہل انطاکیہ کا حال اہل مکہ کے سامنے بیان فرمائیے۔ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ، اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ سے بدل اشتمال ہے۔ المرسلون سے مراد عیسیٰ علیہ السلام

حواریوں نے اس شخص پر سلام کیا تو اس نے پوچھا تم دونوں کون ہو؟ حواری نے کہا اللہ کا رسول تمہیں بتوں کی عبادت چھوڑ کر رحمان کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ بوڑھے نے پوچھا تمہارے پاس کوئی نشانی ہے۔ انہوں نے کہا ہاں ہمارے پاس بڑی واضح نشانی ہے ہم اللہ کے اذن سے مریض کو شفایاب کرتے ہیں، مادر زاد اندھے کو بینا کرتے ہیں اور کوڑھی کے مریض کو درست کر دیتے ہیں۔ بوڑھے نے کہا میرا ایک بیٹا کئی سال سے مریض ہے۔ قاصدوں نے کہا ہمیں ساتھ لے چل ہم اس کی حالت دیکھتے ہیں۔ بوڑھا انہیں گھر لے آیا انہوں نے اس کے بیٹے پر ہاتھ پھیرا تو وہ اسی وقت اللہ کے اذن سے صحت یاب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی، اس کے علاوہ کئی مریضوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں شفا بخشی۔ اس شہر کا ایک بادشاہ تھا، وہب نے اس کا نام انطفس لکھا ہے۔ وہ روم کے بادشاہوں سے تھا اور بتوں کا پجاری تھا۔ جب اس کو یہ خبریں پہنچیں تو بادشاہ نے ان دونوں قاصدوں کو بلایا اور پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہم عیسیٰ علیہ السلام کے قاصد ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا تم کیسے آئے ہو؟ انہوں نے کہا ہم تجھے یہ دعوت دینے آئے ہیں کہ ان بتوں کی عبادت چھوڑ دو جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور اس ذات کی عبادت کرو جو سنتی بھی ہے اور دیکھتی بھی ہے۔ بادشاہ نے پوچھا تمہارا ہمارے خدا کے علاوہ کوئی اور خدا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں ہمارا خدا وہ ہے جس نے تجھے اور تیرے خداؤں کو پیدا کیا۔ بادشاہ نے کہا تم دونوں چلے جاؤ میں تمہارے معاملہ میں غور و فکر کرتا ہوں۔ پس لوگ ان قاصدوں کے پیچھے لگ گئے پھر انہیں پکڑ کر سر بازار مارا پیٹا۔

وہب لکھتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے ان دو آدمیوں کو انطاکیہ بھیجا۔ وہ انطاکیہ پہنچے لیکن بادشاہ تک نہ پہنچ سکے۔ وہ طویل مدت ٹھہرے رہے۔ ایک دن بادشاہ اپنے محل سے باہر نکلا تو انہوں نے تکبیر کہی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا۔ بادشاہ کو ان پر غصہ آ گیا، اس نے دونوں کو قید کرنے کا حکم دیا نیز ہر ایک کو سو سو کوڑے لگانے کا بھی فیصلہ سنایا۔ جب ان قاصدوں کو جھٹلایا گیا تو انہیں مارا پیٹا گیا تو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کے سردار شمعون الصفا کو ان کے پیچھے بھیجا تاکہ ان کی معاونت کریں۔ شمعون غیر معروف طریقہ پر شہر میں داخل ہوا اور بادشاہ کے حاشیہ نشینوں سے تعلقات استوار کرنے شروع کر دیئے حتیٰ کہ وہ اس سے مانوس ہو گئے۔ بادشاہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور بڑا احسن سلوک کا مظاہرہ کیا اور عزت و احترام کیا۔ ایک دن شمعون نے بادشاہ سے کہا اے بادشاہ سلامت! میں نے سنا کہ آپ نے دو آدمیوں کو قید کر رکھا ہے اور جب انہوں نے تیرے دین کے علاوہ کسی دین کی تجھے دعوت دی تو تو نے انہیں مارا بھی ہے لیکن کیا تو نے ان سے کوئی بات بھی کی تھی اور تو نے ان کی کوئی بات سنی بھی تھی۔ بادشاہ نے کہا مجھے انتہائی غصہ تھا اس لئے میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شمعون نے کہا بادشاہ سلامت پسند فرمائیں تو انہیں بلا بھیجیں تاکہ ہم ان کے حالات اور دین پر آگاہی حاصل کریں۔ بادشاہ نے ان دونوں کو بلایا تو شمعون نے ان سے پوچھا تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا اللہ اس کا حکم فرماتا ہے۔ شمعون نے کہا تمہارے پاس اپنے حق ہونے اور قاصد ہونے کی نشانی کیا ہے جس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں ہے شمعون نے انہیں کہا آپ اللہ کی صفات بیان کرو۔ انہوں نے کہا وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ انہوں نے کہا جو تم چاہو ہم دکھا سکتے ہیں۔ بادشاہ نے ایک لڑکا بلایا جس کی آنکھیں بالکل ختم ہو چکی تھیں بلکہ آنکھوں کی جگہ بھی پیشانی کی طرح برابر تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی شفا کی دعا مانگتے رہے حتیٰ کہ آنکھ کی جگہ کھل گئی۔ ان دونوں نے مٹی کے دو ڈھیلے لے کر اس کی آنکھوں

گا۔ بادشاہ سے کہا جناب! ہم سے کچھ مخفی نہیں کہ ہمارا خدا جس کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ نفع نقصان پر قادر نہیں ہے، نہ وہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے۔ شمعون کی یہ عادت تھی کہ بادشاہ جب بتوں کے پاس جاتا تو شمعون کثرت سے نماز پڑھتا اور خوب آہ وزاری کرتا حتی کہ لوگ سمجھتے کہ وہ ہمارے دین پر ہے۔ بادشاہ نے ان پیغام رسانوں کو کہا اگر تمہارا خدا مردہ کے زندہ کرنے پر قادر ہے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ انہوں نے کہا ہمارا خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ بادشاہ نے کہا یہاں ایک میت ہے جو سات دنوں سے دفن ہے، وہ ایک کسان کا بیٹا تھا۔ میں نے اسے دفن نہیں کر دیا تھا تا کہ اس کا باپ جو غائب تھا وہ واپس آ جائے۔ لوگ وہ میت اٹھا کر لائے تو اس کی بو بدل چکی تھی۔ ان دونوں نے بلند آواز سے دعا مانگنی شروع کی اور شمعون آہستہ آہستہ اپنے پروردگار کو پکار رہا تھا۔ پس وہ میت کھڑا ہو گیا اور کہا کہ میں سات دن سے شرک کی حالت میں مرا تھا مجھے آگ کی سات وادیوں میں داخل کیا گیا۔ میں تمہیں ڈراتا ہوں اس عقیدہ کے برے انجام سے جس پر تم قائم ہو۔ پس تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ۔ پھر اس نے کہا آسمان کے دروازے کھل گئے میں نے ایک جوان دیکھا جو بڑا خوش شکل تھا، وہ ان تین افراد کی سفارش کر رہا تھا۔ بادشاہ نے کہا وہ تین کون ہیں۔ اس نے کہا شمعون اور یہ دو شخص۔ بادشاہ کو بہت تعجب ہوا جب شمعون نے دیکھا کہ اس کی بات بادشاہ پر موثر ہو گئی ہے تو اس نے بادشاہ کو حقیقت حال سے باخبر کیا۔ پھر بادشاہ بھی ایمان لایا اور کچھ لوگ بھی ایمان لے آئے اور کچھ لوگ منکر ہی رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بادشاہ کی بیٹی فوت ہو چکی تھی۔ اور دفن بھی ہو چکی تھی شمعون نے بادشاہ کو کہا ان دو آدمیوں سے مطالبہ کر کہ تیری بیٹی کو زندہ کر دیں۔ بادشاہ نے بیٹی کے زندہ کرنے کا مطالبہ کیا تو وہ دونوں کھڑے ہو گئے اور نماز پڑھنے لگے اور دعا کرنی شروع کر دی۔ شمعون بھی ان کے ساتھ آہستہ آہستہ دعا مانگ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو زندہ کر دیا۔ قبر پھٹ گئی اور وہ باہر نکل آئی۔ اس عورت نے کہا یہ دونوں سچے ہیں لیکن مجھے تو خیال نہیں آتا کہ تم ایمان لے آؤ گے۔ پھر اس لڑکی نے ان دو شخصوں سے کہا کہ مجھے اپنی جگہ واپس لوٹا دیں۔ انہوں نے اس کے سر پر مٹی ڈالی اور وہ اپنی قبر کی طرف لوٹ گئی جیسا کہ پہلے تھی۔

ابن اسحاق نے کعب اور وہب سے روایت کیا ہے کہ بادشاہ نے انکار کیا تھا اور بادشاہ اور اس کی قوم نے ان قاصدوں کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ جب حبیب نجار کو یہ خبر پہنچی جو شہر کے کنارے پر رہتا تھا۔ دوڑتا ہوا آیا اور انہیں نصیحت کی اور انہیں ان قاصدوں کی اطاعت کی طرف بلایا۔ اللہ تعالیٰ آئندہ ارشاد میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں(1)۔

إِذْ أَرْسَلْنَآ إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوٓا إِنَّآ إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ ﴿۱۴﴾

"جب (پہلے) ہم نے بھیجے ان کی طرف دو رسول تو انہوں نے ان کو جھٹلایا پس ہم نے تقویت دی (انہیں) ایک تیسرے رسول سے [1] تو ان تینوں نے (انہیں) کہا کہ ہمیں تمہاری طرف بھیجا گیا ہے [2]۔"

[1] إِذْ أَرْسَلْنَآ، سابقہ اذ سے بدل ہے۔ پہلے دو قاصدوں کا نام وہب نے یحییٰ اور یونس لکھا ہے(2) فعززنا کو ابو بکر نے تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان دونوں قرأتوں کا معنی ایک ہے۔ ثالث سے مراد شمعون ہے۔ ابن المنذر نے

اسی مخصوص غرض کو ہی ذکر کیا جاتا ہے اور زائد چیزوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اہل قریہ کی طرف اپنے دو حواریوں کو بھیجا تھا(1)۔ کعب فرماتے ہیں وہ قاصد صادق اور مصدوق تھے اور تیسرا شلوم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھیجنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے، فرمایا ہم نے بھیجے حالانکہ انہیں عیسیٰ علیہ السلام نے بھیجا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھیجا تھا(2)۔

۲۔ قالوا کا فاعل تینوں مبلغ ہیں، یعنی ان رسولوں نے قسم اٹھا کر اہل انطاکیہ کو کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾

''بستی والوں نے کہا نہیں ہو تم مگر انسان ہماری مانند اور نہیں اتاری رحمٰن نے کوئی چیز نہیں ہو تم مگر جھوٹ بول رہے ہو ؎۱۔''

؎۱ انطاکیہ والوں نے کہا تمہارے اندر کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں رسالت کے لئے خاص فرمایا ہو۔ رحمٰن نے تو کوئی وحی نازل نہیں فرمائی ہے، تم دعوائے رسالت میں جھوٹ بول رہے ہو۔

قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّاۤ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

''رسولوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم یقیناً تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں ؎۱۔''

؎۱ رسولوں نے اللہ کے علم سے استشہاد کیا جو قسم کے قائم مقام ہے۔ اسی وجہ سے جو کہتا ہے کہ اللہ جانتا ہے میں نے ایسا کام کیا ہے۔ حالانکہ وہ اس بات میں جھوٹا تھا تو یہ یمین غموس ہوگی یعنی جھوٹی قسم ہوگی۔ چونکہ لوگوں نے ان کی رسالت کا انکار کیا تھا اس لئے لام تاکید اور قسم کے ساتھ مؤکد جواب دیا۔

وَمَا عَلَیْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۷﴾

''اور نہیں ہم پر کوئی ذمہ داری بجز اس کے (کہ پیغام حق) کھول کر پہنچا دیں ؎۱۔''

؎۱ ہمارا فرض تو صرف اتنا تھا کہ ایسی نشانیوں کے ساتھ پیغام پہنچا دیں جو ہمارے پیغام کی صحت کی واضح دلیل ہوں۔ مثلاً مادر زاد اندھوں کو زندہ کرنا، کوڑھی کے مریض کو شفا دینا اور مردوں کا زندہ کرنا۔ یعنی تم جو ہمارے پیغام کا انکار کر رہے ہو اس سے ہمیں تو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ ہمارے ذمہ جو تبلیغ کا فریضہ تھا وہ ہم نے بحسن و بخوبی ادا کر دیا ہے۔ اب اس انکار اور رد کا وبال تم پر ہی لوٹے گا۔ جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کا سلسلہ روک لیا۔

قَالُوْۤا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ لَیَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸﴾

''وہ کہنے لگے ہم تو تمہیں اپنے لئے فال بد سمجھتے ہیں اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کر دیں گے اور پہنچے گا تمہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب ؎۱۔''

؎۱ کہنے لگے عرصہ دراز سے اگر ہم پر بارش نہیں ہو رہی تو اس کی وجہ تمہاری نحوست ہے۔ یہ بات انہوں نے اس لئے کہی تھی کہ ان بزرگوں نے جو انہیں دعوت دی تھی [illegible]

لوگوں کی یہی عادت ہوتی ہے کہ ہر اس چیز کی خواہش کرتے ہیں جس کی طرف ان کی طبائع مائل ہوتی ہیں اور اس کو منحوس سمجھتے ہیں جس کو ناپسند کرتے ہیں۔

قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

"رسولوں نے فرمایا تمہاری بدفالی تمہیں نصیب ہو (حیرت ہے) اگر تمہیں نصیحت کی جاتی ہے (تو تم دھمکیاں دینے لگتے ہو) ۱؎ بلکہ تم لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہو ۲؎۔"

۱؎ ان رسولوں نے کہا تمہاری بدحالی اور نحوست کا سبب تو تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارا کفر ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں خیر و شر کا حصہ تمہارے ساتھ ہے (۱) وہ تم سے جدا نہ ہوگا۔ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ شرط ہے اور اس کا جواب شرط محذوف ہے اور ہمزہ استفہام انکار کے لئے ہے۔ یعنی اگر تمہیں نصیحت کی جاتی ہے تو تم ہمارے ساتھ بدفالی پکڑتے ہو اور ہمیں رجم کی دھمکیاں دیتے ہو۔ یہ تمہیں مناسب تو نہیں لگتا بلکہ چاہئے تو یہ تھا کہ تم نصیحت قبول کرتے اور احسان سمجھتے۔ ابو جعفر نے دوسرے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ذکر تم کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے (2) تقدیر کلام اس طرح ہوگی اتطیر تم و تواعدتم لان ذکر تم۔ یعنی کیا تم بدفالی پکڑتے ہو اور دھمکیاں دیتے ہو کیونکہ تمہیں وضاحت کی گئی ہے۔

۲؎ تم قوم ہی ایسی ہو، تم عصیان میں حد سے بڑھ گئے ہو اور اللہ کے برگزیدہ رسولوں سے بدفالی پکڑتے ہو حالانکہ ان سے تو برکت حاصل کرنا چاہئے تھا۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾

"دریں اثناء آیا شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا۔ اس نے کہا اے میری قوم پیروی کرو رسولوں کی ۱؎۔"

۱؎ یہ آنے والا شخص حبیب نجار بڑھئی تھا۔ عبدالرزاق، ابن ابی حاتم نے قتادہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ سدی فرماتے ہیں وہ دھوبی تھا۔ وہب فرماتے ہیں حبیب ریشم کا کام کرتا تھا اور وہ بیمار تھا اور اس کو جذام کا مرض تھا اور اس کا گھر شہر کے دروازوں میں سے آخری دروازہ کے قریب تھا۔ وہ مومن اور صدقہ دینے والا شخص تھا۔ دن کو مزدوری کرتا اور شام کو اپنی کمائی دو حصوں میں تقسیم کرتا، نصف اپنے اہل و عیال کو کھلاتا اور نصف صدقہ کر دیتا۔ جب اسے یہ خبر پہنچی کہ اس کی بدبخت قوم نے آئے ہوئے رسولوں کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ بیچارا دوڑتا ہوا آیا اور کہا اے میری قوم رسولوں کی اتباع کرو (3)۔

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

"پیروی کرو ان (پاکبازوں) کی جو تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے اور وہ سیدھی راہ پر ہیں ۱؎۔"

۱؎ یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے یا بدل ہے۔ ایک زائد فائدہ پر مشتمل ہے، یعنی یہ اللہ کے بندے اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور مشقتوں پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے اور یہ لوگ دنیا و آخرت میں ہدایت یافتہ ہیں۔

وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾

لوٹ کر جانا ہے ۲ ۔''

۱؎ ما استفهامیه مبتدا ہے۔ اور ظرف اس کی خبر ہے ولا اعبد 'ی ضمیر متکلم سے حال ہے پھر یہ جملہ یاقوم اتبعوا المرسلین پر معطوف ہے۔ اس میں غائب سے متکلم کی طرف التفات ہے، اس کلام میں ایک لطیف انداز تبلیغ ہے۔ اپنے نفس اور اپنے ضمیر کو خالص نصیحت کی جارہی ہے اور ضمناً قوم کو بھی نصیحت کی جارہی ہے کہ ناصح جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرتا ہے تو اس کلام سے مراد قوم کو جھڑکنا اور تنبیہ کرنا ہے اور اس بات پر کہ اپنے خالق کی عبادت ترک کر کے غیروں کے سامنے اپنی جبین نیاز جھکاتے ہیں۔

۲؎ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ کا جملہ تہدید اور زجر و توبیخ میں مبالغہ کرنے کے لئے ہے کہ تم اس خالق کی عبادت کرنے اور اسے معبود تسلیم کرنے سے روگردانی کر رہے ہو، جب کہ ایک دن تم سب کی اس معبود حقیقی کی بارگاہ میں پیشی ہونی ہے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾

''کیا (میرے لئے جائز ہے کہ) میں بنا لوں اسے چھوڑ کر کوئی اور خدا؟ (ہرگز نہیں) اگر رحمٰن مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش مجھے ذرا فائدہ نہ پہنچا سکے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے ۱؎ ۔''

۱؎ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حبیب ایک غار میں اللہ کی عبادت کرتا تھا (۱) جب اسے رسولوں کی خبر پہنچی تو وہ اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ ۔ اس کی یہ نصیحت سن کر وہ بولے تو ہمارے دین کا مخالف ہے اور ان رسولوں کے مذہب کا پیروکار بن گیا ہے۔ حبیب نجار نے کہا وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ حمزہ اور یعقوب نے مالی کو یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس شخص نے ''فطرنی'' میں تخلیق کی اضافت اپنی طرف کی ہے، جب کہ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ میں رجوع کی نسبت قوم کی طرف کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تخلیق (پیدا کرنا) نعمت کا اثر ہے اس لئے اس پر اس کا اظہار لازم تھا اور رجوع میں زجر و توبیخ ہے۔ اس لئے اس کی نسبت قوم کی طرف کرنا مناسب تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب اس نے یہ کہا اتبعوا المرسلین (رسولوں کی اتباع کرو) تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کیا تو ان لوگوں کا پیروکار ہے؟ تو اس نے جواباً کہا وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جو میرا خالق ہے۔ اور تم سب نے قیامت کے روز حاضر ہونا ہے۔ وہ تمہیں تمہارے کرتوتوں کی سزا دے گا (2) اتخذ میں استفہام انکاری ہے۔ من دونہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے علاوہ جھوٹے من گھڑت خدا ہیں۔ ولا ینقذون کو ورش نے وصل کی صورت میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دے تو یہ بت اور مورتیاں مجھے اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتیں۔ نقصان کو دور کرنے میں اور عذاب سے بچانے میں ان کی شفاعت کی نفی کرتے ہیں، نفع میں ان کی شفاعت کی نفی میں مبالغہ ہے۔ یعنی جو نقصان اور عذاب سے بچاؤ کی سفارش نہیں کر سکتے وہ نفع پہنچانے کی سفارش کیسے

کر سکتے ہیں؟ کیونکہ رحمت کے حصول کے لئے سفارش کی قبولیت تو بہت بلند مرتبہ ہے جب دفع ضرر کے لئے ان کی سفارش قبول نہیں ہے تو حصول مراتب اور حصول رحمت کیلئے کیسے قبول ہوگی۔ جملہ شرطیہ اٰلِهَةً کی صفت ہے۔

اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۴﴾

''(اگر میں شرک کروں) تو میں بھی اس وقت کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔''

اِنِّیْٓ کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر میں اس خدا کو چھوڑ کر جس نے مجھے پیدا کیا ان مورتیوں کو خدا تسلیم کروں جو نہ نفع کا باعث ہیں اور نہ نقصان پہنچانے پر قادر ہیں تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا۔ یہ گمراہی اتنی واضح ہوگی کہ معمولی سمجھ رکھنے والا بھی کہے گا کہ یہ گمراہی ہے۔ یہ جملہ بتوں کو خدا بنانے کے انکار کی علت بیان کر رہا ہے۔

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

''میں ایمان لے آیا ہوں تمہارے رب پر پس (کان کھول کر) میرا اعلان سن لو۔''

اِنِّیْٓ کو نافع اور ابن کثیر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اے میری قوم یا اے بادشاہ میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا ہوں جس نے تمہیں پیدا فرمایا پس تم میرے دعویٰ ایمان کو بانگ دہل سن لو۔ یہ آیت سابقہ نصیحت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب قوم سے کہا گیا اتبعوا المرسلین تو گویا انہوں نے کہا کیا تو ان پر ایمان لایا ہے؟ اس نے کہا اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہو۔ میں یہ اعلان بھرے مجمع میں کر رہا ہوں تم سب سن لو۔ اگر یہ چیز بہتر نہ ہوتی تو میں اپنی ذات کے لئے اسے قطعاً پسند نہ کرتا۔ رب کی اضافت مخاطبین کی طرف کی ہے، امنت بوبی نہیں کہا کیونکہ یہ اسلوب ان کو ایمان کی طرف زیادہ دعوت دینے والا ہے۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اس کے اس اعلان پر قوم اس پر ٹوٹ پڑی اور اسے قتل کر ڈالا۔ ابن مسعود فرماتے ہیں لوگوں نے اسے اپنے پاؤں کے ساتھ روندا حتیٰ کہ اس کی انتڑیاں اور معدہ اس کی دبر کے راستے باہر نکل آیا۔ سدی نے کہا ہے کہ قوم اسے پتھروں سے مار رہی تھی اور وہ یہ کہہ رہا تھا اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ (اے اللہ میری قوم کو راہ راست عطا فرما) آخر کار انہوں نے اس ناصح اور مخلص شخص کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دیا۔ حسن فرماتے ہیں انہوں نے اس کے حلق کو چیر کر شہر کی دیوار سے لٹکا دیا۔ اس شخص کی قبر انطاکیہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جنت میں داخل فرما دیا تھا۔ وہ وہاں زندہ ہے اور اسے رزق پہنچایا جاتا ہے(1) یعنی وہ شہداء کی زندگی گذار رہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نجار کا یہ خطاب رسولوں کو تھا۔ جب حبیب نے دیکھا کہ لوگ مجھے قتل کرنے والے ہیں تو اس نے اپنے ایمان پر رسولوں کو گواہ بنایا۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی کہ اس نے رسولوں کو کہا میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا تو اللہ تعالیٰ نے بندہ نوازی کرتے ہوئے اور اپنے بندے کی عزت افزائی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا (آ جا میری جنت کی بہاریں تیری منتظر ہیں اور تیرے قدوم میمنت لزوم کے لئے اس کی زمین مشتاق ہے)

''حکم ہوا (جا) جنت میں داخل ہو جا وہ بولا کاش! میری قوم بھی جان لیتی ۱۔''

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ مژدہ جانفزا اس وقت سنایا، جب کہ ابھی اس نے جام شہادت نوش نہیں کیا تھا، یعنی ارشاد فرمایا تو اپنی اس قبر میں داخل ہو جا جو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنادی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیل لہ نہیں فرمایا کیونکہ کلام سے مقصود مقول (جو بات کہی گئی ہے) ہے نہ کہ مقول لہ (جس کو بات کہی جائے) کیونکہ وہ تو پہلے ہی معلوم ہے اور سلسلہ کلام اسی کے متعلق ہو رہا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور مقدر سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے۔ کہ جب اس نے اپنے دین پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت اس کی کیفیت کیا تھی؟ جب حبیب جنت کی معطر و معنبر وادیوں میں پہنچ گیا تو کہنے لگا کاش میری قوم بھی اس حقیقت کو جان لیتی۔

بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ ﴿۲۷﴾

''کہ بخش دیا ہے مجھے میرے رب نے اور شامل کر دیا ہے مجھے باعزت لوگوں میں ۱۔''

۱۔ ما موصولہ یا مصدر یہ ہے اور باء یعلمون کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کاش میری قوم اس چیز کو جان لیتی جس کی وجہ سے میرے رب نے مجھے معاف فرما دیا ہے۔ یا یہ معنی کہ کاش میری قوم میری مغفرت کو جان لیتی یاما استفهامیہ ہے اور باء غَفَرَ کے متعلق ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کس وجہ سے میرے رب نے مجھے معاف کر دیا۔ اس کی مراد ایمان تھا۔ اور کفار کی اذیتوں پر صبر کرنا تھا (یعنی اس نے کہا میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ سچے دل سے ایمان لانے اور کفار کی صبر آزما تکالیف کو برداشت کرنے کی وجہ سے میرے رب نے میری بشری کمزوریوں کو معاف فرما دیا ہے اور مجھے ان لوگوں میں داخل کر دیا ہے جنہیں ابدی اور سرمدی عزت سے نوازا گیا ہے) نیک اور صالح اپنے غصہ اور جذبات پر کتنا ضبط رکھتے ہیں کہ قوم جان لینے پر پختہ ارادہ کر چکی ہے اور یہ درویش ان کے لئے یہ خواہش کر رہا ہے کہ کاش میری قوم ایمان و طاعت کی شیرینی اور مٹھاس کو جان لے۔ اللہ کے نیک بندوں کی یہی صفت ہوتی ہے، وہ دشمنوں پر رحم کرتے ہیں اور جاہلوں سے الجھتے نہیں، حسن اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اللہ کے اس بندے کی اس تمنا کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں کو ایمان اور طاعت کے حصول پر برانگیختہ کر لے۔ یا یہ وجہ تھی کہ قوم کو علم ہو جائے کہ وہ اس کو قتل کر کے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں کیونکہ وہ حق کا علمبردار ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں جب حبیب کو قتل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر غضب فرمایا اور فوری انتقام لے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا کہ خوفناک کڑک کے ذریعے سب کو ہلاک کر دے۔ تو کفار سب کے سب اس بجلی کی کڑک سے موت کے منہ میں چلے گئے (1)۔

وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِیْنَ ﴿۲۸﴾

''اور نہ اتارا ہم نے اس کی قوم پر اس (کی شہادت) کے بعد کوئی لشکر آسمان سے ۱۔ اور نہ ہمیں اس کی ضرورت تھی ۲۔''

۱۔ قَوْمِهٖ سے مراد حبیب کی قوم ہے۔ مِنْۢ بَعْدِهٖ میں من زائدہ ہے۔ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ میں پہلا من زائدہ ہے نفی کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ اور دوسرا من ابتداء کے لئے ہے۔ یعنی ہم نے ان کو ہلاک کرنے کے لئے آسمان سے لشکر نہیں اتارا جیسا کہ ہم نے بدر اور خندق کے روز لشکر اتارے تھے۔ بلکہ فرشتے کی ایک چیخ نے ان کا کام تمام کر دیا۔ اس جملہ میں ان کی ہلاکت کی حقارت کا بیان

۲؎ ما نافیہ ہے یعنی ہمیں ضرورت ہی نہیں کہ ہم قوم کو ہلاک کرنے کے لئے فرشتوں کے لشکر کو نازل کریں کیونکہ یہ معاملہ ہمارے لئے بڑا آسان ہے اگر ہم نے آپ کی نصرت اور تائید کے لئے فرشتے نازل کئے ہیں تو اس سے مقصود آپ کو کامیابی کی بشارت دینا اور آپ کو عزت و شرف عطا کرنا تھا نیز آپ کے قلب اطہر کو سکون اور اطمینان بخشنا تھا۔ ارشاد ہے مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ اور نہیں بنایا فرشتوں کے اترنے کو اللہ نے مگر خوش خبری تمہارے لئے اور تا کہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس سے اور (حقیقت تو یہ ہے) کہ نہیں ہے فتح و نصرت مگر اللہ کی طرف سے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما موصولہ ہے اور جند پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ جس طرح ہم نے پہلی نافرمان قوموں پر کبھی پتھر، کبھی آندھی اور کبھی تیز بارشوں کا عذاب نازل کیا، ہم نے حبیب کی قوم پر ایسی کوئی چیز نازل نہیں کی بلکہ ایک کڑک نے چشم زدن میں ان کا نام و نشان مٹا دیا۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾

”نہ تھی مگر ایک گرج پس وہ بجھے ہوئے کوئلے بن گئے ۱؎۔“

۱؎ صَيْحَةً کو جمہور قراء نے کان کی خبر کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے کان کو تامہ بنایا ہے اور صیحۃ کو مرفوع پڑھا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ اکثر مفسرین کا یہ قول ہے کہ جبریل نے شہر کے دروازے کے دونوں کواڑ پکڑ کر زوردار چیخ ماری تو وہ بجھے ہوئے کوئلے کی طرح ہو گئے(1) کفار کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ زندگی حرارت غریزیہ (فطری) سے قائم ہوتی ہے۔ جب فطری حرارت ختم ہو جاتی ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ ماانزلنا کے جملہ کا عطف وجاء من اقصا المدینہ رجل یسعیٰ پر ہے۔ وما کنا منزلین کا جملہ معترضہ ہے۔ ان کانت الا صیحۃ واحدۃ کا جملہ علت بیان کر رہا ہے۔ اذا پر فاء سببیہ ہے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾

”صد افسوس ان بندوں پر نہیں آیا ان کے پاس کوئی رسول ۱؎ مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کرنے لگ گئے ۲؎۔“

۱؎ عَلَى الْعِبَادِ، حسرۃ کی صفت ہے۔ اور حسرۃ کو منادیٰ بنانے سے مقصود مخاطبین کو تنبیہ کرنا ہے کہ ان لوگوں پر حسرت و افسوس کرنا واجب ہے۔ حسرۃ پر تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ یعنی حسرت کی بڑائی بیان کر رہی ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے اے حسرت تو آ جا یہ ایسی حالت ہے جس میں تیرا حاضر ہونا حق ہے اور وہ حالت یہ ہے جس پر مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ دلالت کر رہا ہے۔ یعنی اللہ کے نبیوں سے مذاق کرنا ایسی حالت ہے جو افسوس اور حسرت کے اظہار کا تقاضا کرتی ہے۔

۲؎ استثناء مفرغ ہے اور یاتیھم کی ضمیر منصوب سے حال ہے یا رسول سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے استثناء شرط و جزاء کے معنی میں ہے، یعنی کلما یاتیھم رسول یستھزء ون۔ یہ جملہ حسرت کی علت بیان کر رہا ہے کیونکہ جو لوگ اپنے مخلصوں اور نصیحت گذاروں سے مزاح کرتے ہیں حالانکہ ان سے نسبت اور وابستگی دنیا و آخرت کی خیر کا موجب ہے۔ تو ایسے لوگ واقعی حسرت کے مستحق ہیں اور اس لائق ہیں کہ حسرت کرنے والے ان پر حسرت کا اظہار کریں۔ ایسے بدبختوں کی حالت زار پر فرشتے اور جن و انس میں سے مومنین حسرت کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حسرت ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو لیکن ان کے جرم کی بڑائی کے اظہار کے لئے بطور

حسرۃ پر نصب فعل مقدر کی وجہ سے ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی یاایھا المخاطبون تحسروا حسرۃً۔ علی العباد' حسرۃً انتہائی غم اور ندامت کو کہتے ہیں۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اس کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بے ایمان لوگوں کے لئے فرمائے گا کہ بندوں پر حسرت' ندامت اور غم ہو' دوسرا قول یہ ہے کہ ہلاک ہونے والوں کا قول ہے۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں جب انہوں نے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو کہا یا حسرۃ علی العباد، العباد پر الف لام عہدی ہے۔ اور اس سے مراد انطاکیہ کے لوگ ہیں یا ہر وہ شخص ہے جو بھی رسولوں پر ایمان نہ لایا اور ان کا مذاق اڑایا۔ یہ اہل مکہ کو وعید سنائی جارہی ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾

''کیا انہیں علم نہیں کہ کتنی امتوں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا[1] (اور) وہ (آج تک) ان کی طرف لوٹ کر نہ آئے[2]۔''

[1] اَلَمْ يَرَوْا کا معنی الم یعلموا ہے۔ اور یہ کم اهلکنا سے متعلق ہے۔ کیونکہ کم میں اس کا ماقبل فعل عامل نہیں ہوتا اگر چہ وہ کم خبریہ ہی ہو کیونکہ کم استفہامیہ اصل ہے اور وہ صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ کَمْ اَهْلَكْنَا کی ضمیر اہل مکہ کے لئے ہے۔

[2] یہ جملہ معنی کے اعتبار سے کم سے بدل اشتمال ہے۔ یعنی کیا انہیں معلوم نہیں کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ وہ ان کی طرف لوٹ کر آنے والے نہیں۔ جب اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ مردے کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے تو اس وہم اور شبہ کو زائل کرنے کے لئے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا۔

وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اور ان سب کو ہمارے سامنے حاضر کر دیا جائے گا[1]۔''

[1] لما کو عاصم اور حمزہ نے اس سورت میں' سورۂ زخرف اور سورۃ الطارق میں تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے ابن ذکوان کی روایت میں سورۂ زخرف کے علاوہ ہر جگہ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے الطارق میں تشدید کی موافقت کی ہے، جب کہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ جنہوں نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک ان نافیہ ہے اور لما بمعنی اِلّا ہے۔ اور جنہوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک ان مخففه من مثقله ہے۔ اور لام فارقہ ہے اور ما تاکید کے لئے زائدہ ہے۔ جَمِيْعٌ بروزن فعیل بمعنی مفعول ہے۔ اور لدينا جميع کی ظرف ہے یا محضرون کی ظرف ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اور ایک نشانی ان کے لئے یہ مردہ زمین ہے ہم نے اسے زندہ کر دیا[1] اور ہم نے نکالا اس سے غلہ پس وہ اس سے کھاتے ہیں[2]۔''

[1] نافع نے المیتة کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَحْيَيْنٰهَا الارض کی خبر ہے۔ آیة موصوف لھم صفت ہے۔ پھر یہ موصوف صفت مل کر مبتدا ہے۔ الارض المیتة پھر مبتدا ہے، اَحْيَيْنٰهَا اس کی خبر ہے۔ پھر یہ جملہ اس میں پہلے مبتدا انه لھم کی خبر ہے۔ یا اَحْيَيْنٰهَا

مصنف اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ الارض سے کوئی معین زمین مراد نہیں ہے۔ اس لئے یہ نکرہ کے حکم میں ہے (یعنی اس پر الف لام عہد ذہنی ہے جس کا مدخول نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے اس کے ساتھ نکرہ اسم جیسے معاملات کئے جاتے ہیں) اس کی مثال یہ ہے ولقد امر علی اللئیم یسبنی (اس مثال میں یسبنی اللئیم کی صفت واقع ہو رہا ہے کیونکہ اللئیم پر الف لام عہد ذہنی ہے۔ باجود مدخول معرفہ نہیں ہوتا اس لئے یسبنی جملہ اس کی صفت ہے) آیت کی یا یہ ترکیب ہے کہ الارض مبتدا ہے اور اٰیۃ خبر ہے یا الارض خبر ہے اور آیۃ مبتدا ہے۔ یہ جملہ وان کل لما پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَحْیَیْنٰهَا جملہ مستانفہ ہو۔ اور زمین کے نشانی ہونے کو بیان کررہا ہو (یعنی کوئی سوال کرتا ہے کہ زمین کیسے نشانی ہے تو اس کے جواب میں فرمایا اَحْیَیْنٰهَا)

۳؎ حباً سے مراد جنس حَبّ (دانہ) ہے مثلاً گندم، جو وغیرہ کے دانے۔ منه کی ضمیر کا مرجع حبٌّ ہے، یا کلون کے صلہ (منہ) کو مقدم فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ سب سے بڑی چیز جس کو کھایا جاتا ہے اور جس کے ذریعے زندگی بسر ہوتی ہے وہ اناج اور غلہ ہے۔

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾

"اور ہم نے اگائے اس میں باغات کھجور اور انگوروں کے اور جاری کر دیئے اس میں چشمے ۱؎۔"

۱؎ کھجور اور انگور کے مختلف اقسام کے پھل ہوتے ہیں اس لئے ان کو جمع ذکر فرمایا لیکن حبٌ (دانہ) کو مفرد ذکر فرمایا کیونکہ جنس خود مختلف اقسام پر دلالت کرتی ہے، جب کہ نوع ایسی نہیں ہوتی۔ نوع ایک حقیقت کے افراد پر دلالت کرتی ہے۔ نخیل (کھجور کا درخت) کا ذکر فرمایا، تمر (کھجور کا پھل) ذکر نہیں فرمایا۔ چاہئے یہ تھا کہ تمر ہوتا تا کہ پھلوں کے ساتھ اس کی مطابقت ہو جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھجور کا درخت مزید منافع اور صنعت الٰہیہ کے آثار پر دلالت کرنے ساتھ خاص ہے اس لئے کھجور کے درخت کا ذکر فرمایا۔ فجرنا فیھا میں ھا ضمیر کا مرجع الارض ہے۔ من العیون میں من بیانیہ ہے۔ شیاءً من العیون کے معنی میں ہے۔ موصوف کو حذف کیا گیا ہے اور صفت کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ اخفش کے نزدیک من زائدہ ہے (لیکن یہ مرجوح قول ہے)

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

"تا کہ کھائیں وہ اس کے پھلوں سے ۱؎ اور نہیں بنایا ہے اس کو ان کے ہاتھوں نے ۲؎ کیا وہ (ان نعمتوں پر) شکر ادا نہیں کرتے ۱؎۔"

۱؎ لِيَاْكُلُوْا، فجرنا کے متعلق ہے۔ مِنْ ثَمَرِهٖ کی ضمیر کا مرجع (مذکور کے اعتبار سے) جنات ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ثَمَرِهٖ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہ بطریق التفات ہے (یعنی پہلے متکلم کے صیغے استعمال کئے گئے پھر غائب کی ضمیر ذکر فرمادی) معنی یہ ہوگا کہ تا کہ وہ کھائیں جو اللہ تعالیٰ نے پھلوں میں سے پیدا فرمائے۔ حمزہ اور کسائی نے ثُمُرِهٖ کو ثاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک لغت یا ثمار کی جمع ہے۔

۲؎ حمزہ کسائی اور ابوبکر نے عملت، یعنی بغیر ضمیر کے پڑھا ہے۔ ما موصولہ ہے اور اس کا عطف ثمرہ پر ہے۔ معنی یہ ہوگا تا کہ وہ کھائیں جو وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں۔ یعنی جو وہ پھلوں سے مختلف انداز کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں مثلاً عرق، شیرہ وغیرہ۔

نسبت زیادہ بہتر ہے۔

سے ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اینکرون انعام اللہ فلا یشکرون ۔یعنی کیا وہ اللہ تعالیٰ کے انعام کا انکار کرتے ہیں۔اور شکر ادا نہیں کرتے شکر کے ترک پر انکار' شکر کے حکم کی دلیل ہے، یعنی شکر کرنا چاہئے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

"ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود ان کے نفسوں کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جنہیں وہ (ابھی) نہیں جانتے لے۔"

لے الْاَزْوَاجَ سے مراد مختلف انواع واصناف ہیں۔ماتنبت الارض' نباتات اور درخت وغیرہ میں سے جو زمین اگاتی ہے۔مِنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی مذکر' مونث وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بحر و بر میں پیدا فرمایا ہے اور ابھی تک جن پر کوئی شخص مطلع نہیں ہے۔

وَ اٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

"اور دوسری نشانی ان کے لئے رات ہے ہم اتار لیتے ہیں اس سے دن کو تو یکلخت وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں لے۔"

لے یعنی ہماری قدرت کاملہ کی ایک نشانی رات ہے جس سے ہم دن کو اتار لیتے ہیں۔یعنی اصل تاریکی ہے اور سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ اس تاریکی پر دن کا اجالا چڑھ جاتا ہے پھر جب سورج غروب ہوتا ہے۔دن کو رات سے اتار دیتے ہیں اور تاریکی ظاہر ہو جاتی ہے۔انسلخ یہاں سلخ الجلد سے مستعار ہے۔جس کا معنی بکری کی کھال اتارنا ہے۔ترکیب میں یہ آیت سابقہ آیت کی طرح ہے۔فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ کا عطف نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ ہے۔یعنی جب رات آتی ہے تو فوراً تاریکی میں داخل ہو جاتے ہیں۔خلاصہ یہ کہ دن جاتا ہے اور رات آتی ہے۔

وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾

"(یہ) آفتاب ہے جو چلتا رہتا ہے اپنے ٹھکانے کی طرف لے یہ اندازہ مقرر کیا ہوا ہے اس (خدا کا) جو عزیز (اور) علیم ہے لے۔"

لے مستقر مصدر میمی یا اسم مکان ہے۔یعنی سورج کے چلنے پر ایک مخصوص نہج پر اس کا استقرار مرتب ہوتا ہے (اس طرح کہ ہر برج میں ایک مہینہ اس کا استقرار ہوتا ہے) اور گرمیوں میں اپنے ارتفاع کی انتہا کو پہنچتا ہے اور سردیوں میں اپنے انخفاض کی نہایت کو پہنچتا ہے۔یعنی سورج چلتا ہے کہ اس کا ارتفاع و انخفاض ایک حد متعین میں ہو۔اس صورت میں مستقر سے پہلے لام عاقبت کے لئے ہوگا) اسم مکان کی صورت میں معنی یہ ہوگا یہ اپنے استقرار کی جگہ کی طرف چلتا ہے۔اس کو مسافر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے' کیونکہ مسافر جب

گرمیوں میں آسمان کے اندر اس کی بلندی کی نہایت ہے اور سردیوں میں اس کے نزول کی انتہا ہے۔ یا مستقر سے مراد ہر روز کا مشرق و مغرب میں مقدر منتہیٰ ہے۔ کیونکہ سورج کے سال میں تین سو پینسٹھ مشرق و مغرب ہیں۔ ہر روز نئے مطلع سے طلوع ہوتا ہے اور نئے مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ آنے والے سال تک پہلے جس مطلع سے طلوع ہوتا ہے پھر کبھی وہاں سے طلوع نہیں ہوتا۔ یا مستقر سے مراد دنیا کی تباہی کے وقت اس کے چلنے کا اختتام ہے۔ یہ سب تاویلات اس بات پر مبنی ہیں کہ ظاہراً کسی وقت سورج کو قرار نہیں ہے اور عبداللہ کی قرأت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ سورج کو قرار نہیں ہے۔ عبداللہ بن مسعود کی قرأت کو علامہ بغوی نے عمر بن دینار عن بن عباس کے سلسلہ سے نقل فرمایا ہے کہ آپ **والشمس لا مستقر لھا** پڑھتے تھے(1)۔ لیکن صحیح حدیث میں ہے کہ سورج کا مستقر عرش کے نیچے ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت فرمایا ہے(2)۔

علامہ بغوی نے حضرت ابوذر کے حوالہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے ابوذر جب سورج غروب ہوتا ہے تو تجھے معلوم ہے یہ کہاں جاتا ہے۔ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، فرمایا یہ جاتا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے پھر اجازت طلب کرتا ہے' تو اسے مشرق سے طلوع ہونے کی اجازت مل جاتی ہے۔ عنقریب یہ سجدہ کرے گا لیکن اس کا سجدہ قبول نہ ہوگا' یہ اجازت طلب کرے گا اور اس کو اجازت نہیں ہوگی۔ حکم ہوگا جہاں سے آیا ہے وہاں لوٹ جا پس سورج مغرب سے طلوع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا کا یہی مطلب ہے(3)۔ فرمایا اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے (بخاری و مسلم) حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد اور طلوع ہونے سے پہلے عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے پھر اسے مشرق سے طلوع ہونے کا اذن ملتا ہے تو طلوع ہو جاتا ہے۔ عنقریب اسے مشرق سے طلوع ہونے کا اذن نہیں ملے گا تو وہ اس وقت مغرب سے طلوع ہو جائے گا اور یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ سورج کے غروب ہونے کے وقت سے طلوع ہونے تک رات کی مقدار مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے حتیٰ کہ قطب شمالی کے بلغار کے پیچھے جب راس سرطان کے پاس ہوتا ہے رات کا وقت بالکل مختصر ہوتا ہے، اسی وجہ سے وہاں عشاء کی نماز کا وقت پایا ہی نہیں جاتا بلکہ سورج کے غروب ہونے کے بعد ایک طرف شفق غروب ہوتا ہے تو دوسری جانب صبح طلوع ہو جاتی ہے تو ایسی صورت حال میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سورج عرش کے نیچے سجدہ کرنے کے لئے جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں سورج کے غروب ہونے سے لے کر طلوع ہونے تک سورج کا سجدہ کرنا مراد نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت رات کی تاریکی تمام ممالک پر چھائی ہوئی ہو اور یہ اس وقت ہوتی ہے جب سورج اپنے نصف سفر پر ہوتا ہے۔ اس وقت فرشتے سورج کو عرش کے نیچے لے جاتے ہوں اور وہ وہاں سجدہ کرتا ہو پھر اس کو طلوع ہونے کا اذن مل جاتا ہو۔ مختلف ممالک میں رات کی مقدار کا مختلف ہونا رات کے مبدأ اور منتہیٰ کے اختلاف سے متعلق ہے اور یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے یا سجدہ سے مراد صرف اطاعت وانقیاد ہے۔ کیونکہ سیاق حدیث اس کی تائید نہیں کرتا۔

۲۔ اس انداز میں سورج کا چلنا جس میں بے شمار ایسی حکمتیں مضمر ہیں جن کا ادراک عقل انسانی سے وراء ہے۔ اس انداز کا چلانا اس ذات کی طرف سے ہے جو ہر مقدور پر قادر ہے۔ ہر معلوم کا اپنے علم سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔

''اور (ذرا) چاند کو دیکھو ہم نے مقرر کر دی ہیں اس کے لئے منزلیں آخر کار ہو جاتا ہے کھجور کی بوسیدہ شاخ کی مانند۔[1]''

[1] القمر کو ابن کثیر، نافع اور ابو عمرو نے الشمس پر معطوف ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے، یعنی تقدیر عبارت اس طرح ہو گی ایة لهم الشمس و ایة لهم القمر اور القمر کے بعد والا جملہ ترکیب میں اسی طرح ہے جس طرح الشمس کے بعد والا جملہ ہے۔ باقی قراء نے القمر کو فعل مضمر کی بناء پر منصوب پڑھا ہے جس کی تفسیر بعد والا فعل کر رہا ہے۔ یعنی القمر سے پہلے قدرنا محذوف ہے۔ چاند کی اٹھائیس منازل ہیں، ہر رات ایک منزل میں اترتا ہے، نہ ادھر ادھر سرکتا ہے اور نہ اپنے مقررہ وقت پر پہنچنے میں تاخیر کرتا ہے۔ پھر جب آخری منازل میں ہوتا ہے تو انتہائی باریک قوس نما ہو جاتا ہے حتی کہ بوسیدہ ٹیڑھی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے اور مہینے کی آخری راتوں میں سورج کی شعاعوں کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ القدیم سے مراد پرانی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد ایسی ٹہنی ہے جس پر سال یا سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہو۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰

''نہ سورج کی یہ مجال کہ (پیچھے سے) چاند کو آ پکڑے اور نہ رات کی یہ طاقت ہے کہ دن سے آگے نکل جائے[1] اور سب (سیارے اپنے اپنے) فلک میں تیر رہے ہیں[2]۔''

[1] امام بیضاوی فرماتے ہیں چلنے کی تیزی میں سورج چاند کو نہیں پہنچ سکتا (1)۔ امام بیضاوی کا یہ قول فلاسفہ کے قول پر مبنی ہے کیونکہ انکا نظریہ یہ ہے کہ چاند سورج سے انتہائی تیز رفتار ہے۔ چاند کا دورانیہ ایک مہینہ میں مکمل ہوتا ہے، جب کہ سورج کا دورانیہ سال میں مکمل ہوتا ہے۔ میرے نزدیک معاملہ الٹ ہے جیسا کہ آئندہ بیان کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ بہتر یہ ہے کہ ادراک کو تیز رفتاری کے ساتھ مقید نہ کیا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ سورج چاند کو اس کی مخصوص رفتار میں نہیں پہنچے گا حتی کہ دونوں کا چلنا ایک جیسا ہو جائے۔ کیونکہ چلنے میں ان کا متحد ہونا نباتات و حیوانات کی نشوونما اور زندگی میں خلل کا باعث بنے گا۔ یا یہ کہا جائے کہ سورج منافع اور آثار میں چاند کو نہیں پہنچ سکتا یا یہ کہا جائے کہ سورج چاند کو اس کے مکان میں نہیں پا سکتا (یعنی سورج اس کی منازل میں اتر آئے اور جہاں چاند چلے سورج بھی وہاں چلے ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر ایک کا فلک مقرر ہے۔ چاند آسمان دنیا میں ہے اور سورج چوتھے آسمان پر ہے) یا یہ کہا جائے کہ سورج کے لئے ممکن نہیں کہ چاند کی سلطنت اور اس کے نور کی شعاعوں میں جمع ہو جائے اور اس کے نور کو ختم کر دے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الشمس سے مراد دن ہو اور چاند سے مراد رات ہو۔ یعنی دن کے لئے صحیح نہیں کہ رات سے سبقت لے جائے۔ اور یہ رات کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دن سے سبقت لے جائے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے وقت پر آگے پیچھے آتا ہے۔ کوئی اپنے وقت سے پہلے نہیں آتا۔ علامہ بغوی کے کلام سے یہی مستفاد ہے۔

[2] کلّ پر تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے یعنی کل واحد منها۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کی تقدیر کلهم ہے اور ضمیر کا مرجع سورج اور چاند ہیں۔ کیونکہ احوال کا اختلاف ذات میں متعدد ہونے کا موجب ہے اگرچہ بالاعتبار ہی ہو۔ یا ضمیر کا مرجع ستارے ہیں

تیرتی ہے اور ستاروں کے آسمان دنیا میں ہونے کی دلیل یہ ارشاد ہے۔ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ۔

یہ آیت کریمہ صراحتہً دلالت کرتی ہے کہ سورج' چاند اور ستارے سب فرشتوں کے ذریعے یا بلا ارادہ چل رہے ہیں، کیلوں کی طرح ایک جگہ آسمان میں مرتکز نہیں ہیں۔ ایسا نہیں جیسا کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ سب سیارے آسمان میں ایک جگہ جڑے ہوئے ہیں اور آسمان کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ فلاسفرا اپنے نظریہ پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ تیرنا فلک کے پھٹنے اور جڑنے کو مستلزم ہے اور ان کے نزدیک آسمانوں کا پھٹنا اور جڑنا محال ہے۔ فلاسفر سیاروں کی حرکات کے تعدد سے آسمانوں کے تعدد پر استدلال کرتے ہیں' یعنی کواکب کی حرکات کے برابر افلاک ہیں۔ وہ کہتے ہیں آسمان سات ہیں اور ایک دوسرے کے اوپر اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے پیاز کے چھلکے جڑے ہوتے ہیں اور نویں آسمان کو تمام کی حد قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ایک منطقہ اور دو قطبوں پر حرکت کر رہا ہے' اس حیثیت سے اس کا دائرہ ایک دن اور ایک رات میں مکمل ہوتا ہے۔ باقی آسمان اس کی حرکت سے چلتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی طبعی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف دوسرے منطقہ اور دو دوسرے قطبوں پر ہے۔ اس طرح فلک ثوابت کے دو قطبوں اور فلک الافلاک (نواں آسمان) کے دو قطبوں کے درمیان تقاطع حاصل ہوتا ہے۔ سورج فلک الثوابت کے منطقہ کو لازم ہوتا ہے اور فلک الثوابت کا منطقہ بارہ حصوں میں تقسیم ہوتا ہے جن میں سے ہر حصہ کو برج کہا جاتا ہے، اس فلک کو فلک البروج بھی کہتے ہیں۔ یہ انہوں نے اس لئے کہا ہے کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ کواکب اپنی چال کا دائرہ ایک دن اور ایک رات میں مکمل کرتے ہیں اور جب انہوں نے دیکھا کہ سات سیاروں کے علاوہ تمام سیارے ایک دوسرے سے نسبت میں مختلف نہیں ہیں، ان کی رفتار ایک دن اور ایک رات سے تھوڑی کم ہوتی ہے اور وہ کمی انتہائی قلیل ہوتی ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ تمام کے ساتھ سیارے ایک آسمان یعنی آٹھویں آسمان میں جڑے ہوئے ہیں اور اسی آسمان کا نام فلک البروج بھی ہے اور ان کا چلنا نہ چلنے کی مانند ہے اسی لئے اس کو ثوابت کہتے ہیں اور ان ستاروں کے فلک کو فلک الثوابت کہتے ہیں پھر جب انہوں نے دیکھا کہ سات ستارے جن کی چال ایک دن اور رات سے کم ہوتی ہے کیونکہ چاند تیس یا انتیس دنوں میں دائرہ مکمل کرتا ہے اور سورج تین سو پینسٹھ دن یا تین سو چونسٹھ دن میں اپنا دائرہ مکمل کرتا ہے اور اسی طرح دوسرے سیارے ہیں اور سات سیارے تمام کے تمام مغرب سے مشرق کی طرف چلتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی چال کو ایک دن اور ایک رات سے ناقص دیکھا جاتا ہے۔ جب انہوں نے ان کی چال کو دائرہ سے کم یا زیادہ دیکھا تو ان کی چال کے تیز ہونے کا قول کیا اور کہا کہ چاند فلک تیز ہے کیونکہ چاند ایک مہینہ میں دائرہ کو قطع کرتا ہے اور سورج تین سو پینسٹھ دن میں طے کرتا ہے، اسی طرح وہ تمام ستاروں کے متعلق کہتے ہیں۔ اور پھر جب انہوں نے دیکھا کہ پانچ سیارے عطارد' زہرہ' مشتری' مریخ اور زحل ان کی چال کبھی دائرہ سے زیادہ ہوتی ہے، کبھی کم ہوتی ہے اور کبھی دائرہ کے برابر ہوتی ہے تو ان کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں اور ان کے لئے سیر کی تدویرات ثابت کرتے ہیں اوپر والی تدویر کی سیر نیچے والی سیر کے مخالف ہے۔ ان سب چیزوں کو علم ہیئت میں بیان کیا گیا ہے۔

جب نصوص قطعیہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آسمان کی تعداد سات ہے، اس سے زائد نہیں ہے (اسی وجہ سے اس تعداد کے منکر کو کافر کہا جاتا ہے) نیز نصوص قطعیہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ افلاک میں خرق والتیام بھی جائز ہے، اس کے منکر کو بھی کافر

درمیان فاصلہ ہے۔ جو ان کا فاصلہ تسلیم نہ کرے وہ فاسق ہے۔ امام احمد اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے ایک طویل مرفوع حدیث نقل فرمائی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین و آسمان اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت بیان فرمائی ہے(1)۔ ترمذی اور ابوداؤد نے عباس بن عبدالمطلب سے ایک طویل مرفوع حدیث نقل کی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین و آسمان اور ہر دو آسمانوں کے درمیان مسافت اکہتر، بہتر، تہتر سال بیان فرمائی(2) (شاید یہ اختلاف چلنے والوں کی چال کے اعتبار سے ہو، کئی سست اور کئی تیز چلتے ہیں) ان احادیث کی بناء پر علم ہیئت کے بطلان کا قول ثابت ہو جاتا ہے۔ جو علم ہیئت پر اعتقاد اور یقین رکھے اس پر کتاب وسنت کے انکار کی وجہ سے کفر کا اندیشہ ہے۔ جب آسمانوں میں خرق والتیام کا جواز ظاہر ہو گیا تو کوئی حرج نہیں کہ یہ کہا جائے کہ تمام سیارے آسمان دنیا میں ہیں جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ۔

اور سب سیارے اپنے فلک میں تیر رہے ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر کی سیر تقریباً دائرہ تامہ ہے اور یہ مقدار ایک ہے اور سات ستاروں کی سیر مختلف مقادیر پر ہے جیسا کہ ملاحظہ کیا گیا ہے اور یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ پانچ ستاروں کی چال کبھی تیز اور کبھی ناقص ہوتی ہے جیسا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے پانچ ستاروں کو الخنس، الجواری الکنس کہا گیا ہے، حقیقت حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾

''اور ایک نشانی ان کے لئے یہ بھی ہے کہ ہم نے سوار کیا ان کی اولاد کو ایک کشتی میں جو بھری ہوئی تھی [1]۔''

[1] اہل مدینہ، اہل شام اور یعقوب نے ذریاتھم (یعنی جمع) اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ المشحون وہ جو بھری ہوئی ہو۔ ذریۃ سے مراد ان کی اولاد ہے جو تجارت میں ان کی اتباع کرتے تھے۔ یا بچے اور ان کی عورتیں مراد ہیں جو ان کے ساتھ رہتے تھے۔ عورتوں پر بھی ذریت کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ ذریت کی پرورش کرتی ہیں اور حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقتولہ عورت کو دیکھا تو فرمایا یہ تو جنگ اور قتال کے اہل ہی نہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد کی طرف پیغام بھیجا کہ عورتوں اور مزدوروں کو قتل نہ کرو۔ اس حدیث میں ذریت سے مراد عورت ہے اور یہ ارشاد آپ ﷺ نے مقتولہ عورت کو دیکھ کر فرمایا تھا۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذریت کا استعمال عورت کے لئے کیا ہے فرمایا حُجُّوْا بِالذُّرِّيَّةِ لَا تَاْكُلُوْا اَرْزَاقَهَا وَ تَذَرُوْا اَرْبَاقَهَا فِيْ اَعْنَاقِهَا۔ یعنی عورتوں کے ساتھ حج کرو۔ کذا فی نھایہ۔ اور الفلک سے مراد چھوٹی بڑی کشتیاں ہیں۔ ذریت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ ان کا کشتیوں میں بیٹھنا مشکل ہوتا ہے اور کشتیوں میں ان کا جما رہنا عجیب ہوتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں فلک سے مراد سفینہ نوح ہے(3) اور ذریۃ سے مراد آباء ہیں اور ذریت کا اطلاق آباء پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس کا اطلاق اولاد پر ہوتا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں فلک سے سفینہ نوح مراد لینے کی صورت میں(4) آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے آباء کو سوار کیا اور موجود لوگوں اور ان کی اولاد کو ان آباء کی پشتوں میں اٹھایا اور خصوصیت کے ساتھ ذریت کا ذکر احسان جتلانے میں زیادہ بلیغ ہے اور ایجاز و اختصار کے ساتھ ساتھ تعجب انگیزی میں اس کا زیادہ دخل ہے۔

وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾

''اور ہم نے پیدا کیں ان کے لئے اس کشتی کی مانند اور چیزیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں ۱؎۔''

۱؎ مثلہ کی ضمیر کا مرجع مطلق کشتی ہے یا کشتی نوح ہے۔ یعنی کشتیوں کی مانند یا نوح کی کشتی کے مثل ہم نے ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں مثلاً اونٹ وغیرہ۔ کشتی پانی کے لئے ہوتی ہے اور اونٹ صحرا کے جہاز ہوتے ہیں یا یہ معنی کہ نوح کی کشتی کی مثل دوسری چھوٹی بڑی کشتیاں پیدا کی ہیں۔

وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ وَ لَا هُمْ یُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں پس کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو اور نہ وہ ڈوبنے سے بچائے جاسکیں ۱؎۔''

۱؎ اگرچہ ہم نے ان کے لئے کشتیاں پیدا فرمائی ہیں۔ لیکن اگر ہم انہیں ڈبونا چاہیں گے تو کوئی ان کو غرقاب ہونے سے بچا نہ سکے گا۔ فلا صریخ محذوف شرط کی جزاء ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ان نغرقھم فلاصریخ یا یہ معنی کہ ہم ڈبوئیں گے تو آواز بھی نہ نکال سکیں گے۔ لَا یُنْقَذُوْنَ کا عطف لَا صَرِیْخَ لَهُمْ پر ہے۔ یعنی غرق ہونے سے بچائے نہ جاسکیں گے ابن عباس فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکے گا۔

اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ ﴿۴۴﴾

''بجز اس کے کہ ہم ان پر رحمت فرمائیں اور انہیں کچھ وقت تک لطف اندوز ہونے دیں ۱؎۔''

۱؎ استثناء مفرغ ہے اور علیت کی بناء پر منصوب ہے۔ حین سے مراد وہ مدت ہے جو ان کی عمروں کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ڈرو (اس عذاب سے) جو تمہارے سامنے ہے اور جو تمہارے پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۱؎۔''

۱؎ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں ما حین ایدیکم سے مراد آخرت ہے۔ یعنی آخرت کے لئے عمل کرو اور مَا خَلْفَكُمْ سے مراد دنیا ہے۔ پس اس سے محتاط رہو اور اس سے دھوکا نہ کھاؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ سے مراد وہ حادثات ہیں جو گذشتہ قوموں کو پیش آئے اور ماخلفکم سے مراد عذاب آخرت ہے۔ حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آسمان اور زمین کے عذاب مراد ہیں جیسے ارشاد ہے۔ اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰى مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ[1]۔

بعض علماء فرماتے ہیں عذاب دنیا اور عذاب آخرت مراد ہے۔ بعض اس کا برعکس فرماتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں پہلے اور پچھلے گناہ مراد ہیں۔ اذا کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے واذا قیل لھم اتقوا اعرضوا، یعنی جب انہیں تقویٰ کا حکم دیا جاتا ہے یا عذاب الٰہی سے ڈرنے کی نصیحت کی جاتی ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں۔ جواب محذوف کا قرینہ آئندہ آیت ہے۔

وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿۴۶﴾

''اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانیوں سے مگر وہ اس سے روگردانی کرنے لگتے ہیں ۱؎۔''

وماتاتیھم من آیۃ سے مل کرماتاتیھم من رسولٍ پر معطوف ہے۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ ۙ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطۡعَمَہٗۤ ٭ۖ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۷﴾

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ خرچ کرو اس مال سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے تو کافر کہتے ہیں اہل ایمان کو کیا ہم انہیں کھانا کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا[1] (اے ناصحو!) تم تو بالکل بہک گئے ہو[2]۔''

[1] وَاِذَا قِیۡلَ کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے۔ یعنی مومنین کفار مکہ کو مساکین پر خرچ کرنے کو کہتے تو وہ یہ جواب دیتے کہ اللہ تعالیٰ نے قدرت کے باوجود انہیں مال نہیں دیا تو ہم بھی مشیت الٰہی کی موافقت کرتے ہیں، ہم بھی ان کو عطا نہیں کرتے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب قریش کے مشرکوں سے مومنین فقراء کو کھانا کھلانے کی اپیل کی گئی تو انہوں نے یہ کہا تھا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت الحسن سے اور عبد بن حمید اور ابن المنذر نے اسماعیل بن خالد سے یہی قول روایت کیا ہے۔ کفار کا یہ قول باطل اور مردود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بطور امتحان بعض لوگوں کو رزق کی فراوانی عطا فرمائی اور بعض کو تنگدستی اور معاشی بدحالی سے دوچار کیا۔ فقیر کو اللہ تعالیٰ کا مال و دولت نہ عطا کرنا بخل کی وجہ سے نہیں اور غنی کو غرباء اور خستہ حال لوگوں پر خرچ کرنے کا حکم دینا مالی احتیاج کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ مخلوق کی آزمائش ہے اور اس میں اس کی کئی حکمتیں کارفرما ہیں۔ اس کے افعال کی ہر حکمت کو عقل انسانی ادراک نہیں کر سکتی۔

[2] کفار نے کہا تم ہمیں مشیت الٰہی کی مخالفت کا حکم دیتے ہو تو تم کھلی گمراہی میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفار کو جواب ہو۔ یا مومنین نے کفار کو جو جواب دیا اس کی حکایت ہو۔

وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۸﴾

''اور کافر کہتے ہیں یہ وعدہ کب آئے گا[1] اگر تم سچے ہو (تو اس کا مقررہ وقت بتا دو)[2]۔''

[1] اَلۡوَعۡدُ سے مراد قیامت اور دوبارہ اٹھنا ہے۔ اس جملہ کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے اور استفہام استبطاء (یعنی تاخیر کا سبب پوچھا جا رہا ہے) کے لئے ہے۔

[2] اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ قیامت ضرور آئے گی تو ہمیں اس کے آنے کا وقت بتاؤ۔ اِنۡ شرطیہ ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ فانبئونا عن وقت اتیانہ یہ ان کا سوال اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین سے ہوتا تھا۔

مَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً تَاۡخُذُہُمۡ وَ ہُمۡ یَخِصِّمُوۡنَ ﴿۴۹﴾

''یہ (ناہنجار) نہیں انتظار کر رہے مگر ایک گرج کا جو (اچانک) انہیں دبوچ لے گی جب وہ بحث مباحثہ کر رہے ہوں گے[1]۔''

[1] مَا یَنۡظُرُوۡنَ، یقولون کے فاعل سے حال ہے۔ الا صیحتہ واحدہ، استثناء مفرغ ہے۔ اور مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس صیحہ سے مراد نفخہ اولی ہے (1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ کفار تو نفخ [illegible]

تاتیھم الساعة بغتة وھم لا یشعرون (ترجمہ) آ جائے ان پر قیامت اچانک اور انہیں اس کی آمد کا شعور تک نہ ہو۔ جب وہ ان باتوں سے بے خبر ہونگے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا تو گویا گناہوں کے چھوڑنے کے لئے اس دل ہلا دینے والی کڑک کا انتظار کر رہے ہیں۔ تاخذھم صیحۃ واحدہ کی صفت ہے۔ اور ھم ضمیر کا مرجع لوگ ہیں جو سابق کلام سے مفہوم ہیں۔ اسی طرح وھم یخصمون کی ضمیر کا مرجع بھی لوگ ہیں اور وھم یخصمون، تاخذھم کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یعنی قیامت اس طرح اچانک آ جائے گی کہ وہ منڈیوں میں خرید و فروخت اور بازاروں میں معاملات زندگی میں بحث مباحثہ کر رہے ہوں گے، انہیں ان کی آمد کا تصور بھی نہ ہو گا کہ اچانک آ جائے گی۔ یخصمون اصل میں یختصمون تھا۔ تاء کو ساکن کر کے ص میں ادغام کیا گیا۔ اور پھر عاصم، ابن ذکوان، کسائی کی قرأت پر التقائے ساکنین کی وجہ سے خاء کو کسرہ کر دیا گیا۔ ابن کثیر، ورش، ہشام اور یعقوب نے تاء کی حرکت نقل کر کے خاء کو دینے کی وجہ سے بفتحۃ خاء اور ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون اور ابو عمرو نے خاء کے فتحہ کے اختلاس اور صاد کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون نے اسی طرح بھی پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے خاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا ابو جعفر اور قالون نے التقائے ساکنین جائز قرار دیا ہے، جب کہ دوسرا حرف مدغم ہو۔

امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ دو آدمی کپڑے کی خرید و فروخت کے لئے اس کو پھیلائے ہوئے ہوں گے۔ ابھی سودا نہ ہوا ہوگا اور اس کپڑے کو لپیٹا نہ ہوگا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ ایک آدمی اپنی اونٹنی کا دودھ دوھ کر لائے گا، اس کو استعمال کرنے سے پہلے قیامت برپا ہو جائے گی۔ ایک شخص اپنے منہ میں لقمہ ڈالنے کے لئے اٹھائے گا، اس کے کھانے سے پیشتر قیامت واقع ہو جائے گی۔ فریابی نے حضرت ابو ہریرہ سے اسی آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہوں گے اور کپڑوں کی پیمائش کر رہے ہوں گے، اپنی اونٹنیوں کا دودھ دوھ رہے ہوں گے اور اپنی حوائج میں مصروف ہوں گے کہ قیامت برپا ہو جائے گی (1)۔

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَّلَآ إِلَىٰٓ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ﴿٥٠﴾

''پس نہ وہ (اس وقت) کوئی وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر آ سکیں گے [1]۔''

[1] فَلَا يَسْتَطِيعُونَ کا عطف تاخذھم پر ہے۔ اور رابطہ ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی فلا یستطیعون بعدھا۔ فاء سببیہ ہے۔ عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں زبیر بن عوام سے روایت کیا ہے فرمایا قیامت برپا ہو جائے گی، جب کہ ایک شخص کپڑے کی پیمائش کر رہا ہوگا، ایک شخص اونٹنی کا دودھ دوھ رہا ہوگا پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی لا یستطیعون توصیة ولا الی اھلھم یرجعون۔ یعنی لوگ کسی کام کی وصیت بھی نہ کر سکیں گے اور اپنے گھر والوں کا حال دیکھنے کے لئے گھر والوں کے پاس پہنچ ہی نہ سکیں گے بلکہ جونہی چیخ کی آواز سنیں گے مر جائیں گے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ ﴿٥١﴾

لے نُفِخَ ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا حالانکہ صور مستقبل میں پھونکا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا وقوع یقینی اور متحقق ہے۔ اس لئے ماضی کا صیغہ استعمال کرنا جائز ہے۔ اور اس کا عطف فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ کے مضمون پر ہے، یعنی پہلے وہ مر جائیں گے پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور ان دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کی مسافت ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اور بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے۔ لوگوں نے حضرت ابو ہریرہ سے پوچھا اے ابو ہریرہ چالیس سے چالیس دن مراد ہیں؟ فرمایا میں یہ نہیں کہتا پھر لوگوں نے کہا کیا چالیس مہینے مراد ہیں؟ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا پھر لوگوں نے کہا چالیس سے چالیس سال مراد ہیں؟ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا (1)۔ ابن ابی داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث روایت کی ہے جس میں ہے کہ دو نفخوں کے درمیان فاصلہ چالیس سال کا ہے (2)۔ اجداث، جمع ہے جدث کی جس کا معنی قبر ہے۔ ینسلون کا معنی یخرجون ہے۔ نَسل کا اصل معنی کسی چیز سے جدا ہونا ہے، اسی سے نسل الوبر من البعیر (اونٹ سے اون جدا ہوگی) ہے۔ اولاد کو نسل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ باپ سے جدا ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی جلدی چلنا ہے۔ قاموس میں بھی ینسل کا معنی تیز چلنا لکھا ہے۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ؕ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾

"(اس وقت) کہیں گے ہائے ہم برباد ہو گئے کس نے ہمیں اٹھا کھڑا کیا ہے ہماری خواب گاہوں سے لے (آواز آئے گی) یہ وہی ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ فرمایا تھا اور سچ کہا تھا (اس کے) رسولوں نے ۲ ۔"

لے یہاں بھی یقین اور تحقق کی وجہ سے ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا ہے۔ کفار جب قبروں سے اٹھیں گے تو ہلاکت و بربادی کو پکاریں گے اے بربادی آ جا اب تیرا آنے کا وقت ہے۔ یا یہاں منادی محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے یاایها المخاطب ویلنا اے مخاطب ہم برباد ہو گئے۔ ویل مصدر ہے جس کا لفظاً کوئی فعل نہیں ہے اور یہ مقدر فعل کی وجہ سے منصوب ہے۔ قاموس میں ویل کا معنی حلول الشر (شر کا نازل ہونا) لکھا ہے۔ بعض محققین فرماتے ہیں لغت میں اس معنی کے لئے ویل وضع نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔ امام احمد، ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، بیہقی، ابن ابی الدنیا، ھناد اور امام حاکم نے ابو سعید سے روایت کیا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ویل جہنم میں ایک وادی ہے جس میں کافر اس کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے چالیس سال گرتا جائے گا۔ اس حدیث کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔

سعید بن منصور، ابن المنذر اور بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ ویل جہنم کی ایک وادی ہے جس میں دوزخیوں کی پیپ بہتی ہے اور یہ جھٹلانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ ابن جریر نے عثمان بن عفان کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ویل دوزخ میں ایک پہاڑ ہے۔ البزار نے ضعیف سند کے ساتھ سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ میں ایک پتھر ہے جسے ویل کہا جاتا ہے۔ اس پر عرفاء چڑھیں گے اور اتریں گے۔

۲ مرقدنا پر حفص نے لطیف سکتہ کیا ہے اور دوسرے قراء کے نزدیک یہاں وقف بہتر ہے۔ ابن عباس اور قتادہ فرماتے ہیں کفار یہ اس لئے کہیں گے کیونکہ دونوں نفخوں کے درمیان اللہ تعالیٰ ان سے عذاب اٹھا لیں گے [illegible]

وقت اٹھ کر قیامت کا منظر دیکھیں گے تو ہلاکت کو پکاریں گے۔ حضرت ابن عباس کا یہ قول معتزلہ کے عقیدہ کو باطل کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آیت عذاب قبر کی نفی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ آیت تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ سونے والوں کی طرح تھے اور علماء معانی فرماتے ہیں کفار جب جہنم کے مختلف عذاب دیکھیں گے تو ان کے مقابلہ میں قبر کا عذاب انہیں نیند کی طرح محسوس ہوگا۔ اس وقت وہ کہیں گے ہمیں کسی نے ہماری خوابگاہوں سے بیدار کر دیا

هذا مبتدا ہے اور ما وعد الرحمن خبر ہے۔ ما مصدر یہ بمعنی مفعول ہے یا موصولہ ہے اور رابطہ ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی هذا ما وعد به الرحمن صدق فيه المرسلون۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ صدق المرسلون جملہ مستانفہ ہو اور یہ سابقہ جملہ پر معطوف ہو۔ یہ انکار اقرار ہے، جب کہ اس وقت اقرار وتسلیم کا کوئی فائدہ نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جملہ ملائکہ کا قول ہے جو کفار کے سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ کفار کے جواب میں مومنین کا قول ہے۔ لیکن جواب کے انداز میں ذکر نہیں کیا گیا (چاہئے تو یہ تھا کہ اس طرح ہوتا بعثكم الرحمن) اس کی وجہ ان کو انکا کفر یاد دلانا ہے اور انہیں اس کفر کے اختیار پر جھڑکنا اور زجر کرنا ہے اور اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ بعثكم الرحمن وعدكم بالبعث وارسل اليكم الرسل فصد قوكم یعنی تمہیں رحمٰن نے اٹھایا ہے جس نے تم سے دوبارہ اٹھنے کا وعدہ کیا تھا اور جس نے وہ رسول بھیجے تھے جنہوں نے تمہیں سچی باتیں بتائی تھیں۔ معاملہ اس طرح نہیں ہے جس طرح تمہارا خیال ہے کہ اس نے سونے والے کو اٹھا دیا پس تمہیں اٹھانے والے کے متعلق نہیں پوچھنا چاہئے بلکہ تمہیں بعث کے متعلق پوچھنا چاہئے جو بعث اکبر ہے، بڑا ہولناک منظر ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ هذه مرقدنا کی صفت ہو اور ما وعد الرحمٰن مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ یا ما وعد مبتدا اور خبر محذوف ہو، یعنی اس طرح ہو ما وعد الرحمن حق (جو رحمٰن نے وعدہ فرمایا وہ حق ہے) اس تاویل کی صورت میں مرقدنا پر سکتہ یا وقف مناسب نہ ہوگا)

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٥٣﴾

"نہیں ہوگی مگر ایک زوردار کڑک پھر وہ فوراً سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے [1]۔"

[1] آخری نفخہ کے وقت فوراً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے۔ ان کے قبروں سے اٹھانے اور میدان حشر میں جمع کرنے پر وقت اور اسباب درکار نہ ہوں گے۔ ایک زوردار کڑک آئے گی اور سب بارگاہ الوہیت میں جمع ہو جائیں گے۔ هم ضمیر کی جمع جَمِيعٌ لَّدَيْنَا پہلی خبر ہے اور مُحْضَرُونَ دوسری خبر ہے۔ اس جملہ میں بعث اور حشر کی ہولنا کی کو بیان کیا جا رہا ہے نیز یہ بتایا جا رہا ہے کہ بعث اور حشر ان اسباب پر منحصر نہ ہوگا جن اسباب کا وہ مختلف امور میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٤﴾

"پس آج نہیں ظلم کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور نہ ہی بدلہ دیا جائے گا تمہیں مگر ان اعمال کا جو تم کیا کرتے تھے [1]۔"

[1] معاملہ کی تصویر کشی اور نفوس میں راسخ کرنے کے لئے اس بات کو بیان کیا گیا ہے جو انہیں قیامت کے روز کہی جائے گی۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ ﴿٥٥﴾

ہیں جیسے السُحت اور السُحُت۔

شغل کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے، ابن عباس فرماتے ہیں باکرہ (کنواری) عورت سے صحبت مراد ہے۔ وکیع بن الجراح فرماتے ہیں سماع مراد ہے۔ کلبی کہتے ہیں شغل سے مراد یہ ہے کہ وہ دوزخیوں سے بالکل غافل ہوں گے اور جس مصیبت میں دوزخی مبتلا ہوں گے اس کا انہیں کوئی خیال تک نہ ہوگا اور نہ وہ دوزخیوں کو یاد کریں گے۔ الحسن فرماتے ہیں وہ جنت کی نعمتوں میں اس طرح مگن ہوں گے کہ دوزخیوں کے عذاب سے وہ بالکل بے خبر ہوں گے۔ ابن کیسان کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زیارت کرنے والے اور اللہ کی مہمان نوازی میں مصروف ہوں گے (1)۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ جس چیز کو پسند کریں گے اس میں مشغول ہوں گے۔ بلند مرتبہ صوفیاء اکرام جن کا مقصود صرف اور صرف اللہ ہوتا ہے وہ اپنے اپنے مدارج کے تجلیات میں مستغرق و منہمک ہوں گے اور دوسرے لوگ اپنے اپنے ذوق اور رغبت کے مطابق سماع، خوشبو، کھانا، پینا اور جماع میں مشغول ہوں گے۔ ابونعیم نے ہمارے شیخ طریقت ابویزید بسطامی کا قول نقل فرمایا ہے کہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص بندے ہیں اگر انہیں دیدار جمال الٰہی سے روک دیا جائے گا تو وہ جنت میں اس طرح آہ وفغاں کرنا شروع کر دیں گے جس طرح جہنمی آگ سے نکلنے کے لئے چیخ وپکار کریں گے۔ شغل کی تنکیر اور اس کے ابہام میں اس مقام سرور اور تلذذ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ کے نیک بندے فائز ہوں گے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ شغل اتنا رفیع اور بلند ہے کہ عقل انسانی اس کا ادراک اور تصور بھی نہیں کر سکتی اور اس کی حقیقت الفاظ کے دائرہ سے وراء ہے۔ **فاکھون** إنَّ کی دوسری خبر ہے۔ ابوجعفر نے ہر جگہ الف کے بغیر **فکھون** پڑھا ہے۔ اور حفص نے سورۃ المطففین میں ابوجعفر کی موافقت کی ہے، بغیر الف کے ہو تو اس میں مبالغہ ہوگا۔ باقی قراء نے الف کے ساتھ **فاکھون** پڑھا ہے۔ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے الحاذر اور الحذر ہے۔ اور یہ **الفکاھۃ** سے مشتق ہے اس کا معنی لطف اندوز ہونا ہے، یعنی جنتی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ مجاہد اور ضحاک نے **فاکھون** کا ترجمہ معجبون کیا ہے۔ یعنی جہاں وہ ہوں گے بڑے خوش وخرم ہوں گے۔ ابن عباس نے بھی اس کا معنی فرحون کیا ہے یعنی وہ خوش ہوں گے (2)۔

هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾

''وہ اور ان کی بیویاں سایہ میں (مرصع) تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے [1]۔''

[1] حمزہ اور کسائی نے ظلال کو بغیر الف کے ظُلَلٍ پڑھا ہے۔ یہ ظلہ کی جمع ہے۔ باقی قراء نے الف اور ظاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ ظِلّ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں دھوپ نہ پڑتی ہو جیسے قبہ، چھتری وغیرہ۔ ارائک جمع ہے اریکۃ کی، اس مسند کو کہتے ہیں جو پردے میں ہو۔ بغوی نے ثعلب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اریکہ اس مسند کو کہتے ہیں جو پردے کے اندر ہو (3)۔ بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اریکہ نہ تو صرف مسند کو کہتے ہیں اور نہ صرف پردے کو کہتے ہیں بلکہ دونوں کے مجموعے کو اریکہ کہتے ہیں۔ بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ وہ مسند موتیوں اور یاقوت کی ہوں گی عَلَى الْاَرَآئِكِ جار مجرور مُتَّكِـُٔوْنَ کے متعلق ہے۔ ہم مبتدا ہے اور فی **ظلٰل** خبر ہے۔ عَلَى الْاَرَآئِكِ جملہ مستانفہ ہے یا مبتدا کی دوسری خبر ہے یا متکئون ھم کی خبر ہے فی **ظلٰل** اور عَلَى الْاَرَآئِكِ خبر کے متعلق ہیں [illegible]

ہے۔ازواجھم احکام میں مشارکت کی وجہ سے ھم ضمیر پر معطوف ہے یافی ظلٰل معطوف اور معطوف علیہ سے حال ہے۔

لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ ﴿۵۷﴾

''ان کے لئے وہاں (طرح طرح کے لذیذ) پھل ہوں گے اور انہیں ملے گا جو وہ طلب کریں گے ۱؎۔''

۱؎ يَدَّعُوْنَ دعا سے باب افتعال ہے۔یعنی جو وہ اپنے لئے طلب کریں گے یا یہ عربوں کے قول اِدَّع عَلَی ما شئت سے مشتق ہے جس کا معنی ہے جو چاہے تو مجھ سے تمنا کر، یعنی ان کو وہ ملے گا جس کی وہ تمنا کریں گے یا یہ معنی کہ دنیا میں جو کچھ جنت اور اس کے درجات طلب کریں گے وہ ان کو ملیں گے۔ ماموصولہ یا موصوفہ ہے اور یہ ترکیبی لحاظ سے مبتدا ہے اور اس کی خبر لھم ہے۔

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾

''تم سلامت رہو! (انہیں) یہ کہا جائے گا اپنے رحیم رب کی طرف سے ۱؎۔''

۱؎ سَلٰمٌ، ما سے بدل ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مایدعون کی خبر یا مبتدا محذوف ھُوَ کی خبر ہو یا یہ مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو۔ قولاً مصدر مؤکد ہے فعل محذوف کا اور من رب، قولاً کی صفت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا یا اس کی طرف سے کہا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر ملائکہ کے واسطہ سے یا بغیر واسطہ کے سلام فرمائے گا اور یہ ان کی تعظیم کے لئے ہوگا اور یہی ان کا مطلوب دل ہوگا اور ان کی خواہش ہوگی یا قولاً پر نصب اختصاص کی بناء پر ہے، یعنی بطور مدح اس کو نصب دی گئی ہو۔ ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا، دارقطنی اور الاجری نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب جنتی جنت کی نعمتوں میں مشغول ہوں گے اچانک اوپر سے نور چمکے گا۔ جب وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کا رب ان پر جھانک رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے جنتیو! السلام علیکم! سلام قولاً من رب رحیم سے یہی مراد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اس کی طرف دیکھیں گے جب تک وہ دیکھتے رہیں گے جنت کی کسی نعمت کی طرف متوجہ نہ ہوں گے حتیٰ کہ جلوہ حقیقی پردہ فرمالے گا۔ لیکن اس کا نور اور اس کی برکت ان کے مکانوں پر جلوہ فگن رہے گا (1) علامہ سیوطی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا جھانکنا اور مطلع ہونا مکان اور حلول سے منزہ ہے (یعنی جھانکنا اس کی اپنی شان کے لائق ہوگا) علامہ بغوی فرماتے ہیں فرشتے جنتیوں پر ان کے رب کی طرف سے سلام پہنچائیں گے۔ مقاتل فرماتے ہیں ملائکہ جنت کے ہر دروازے سے سَلَامٌ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْجَنَّةِ مِنْ رَّبِّكُمُ الرَّحِيْمِ يُعْطِيْهِمُ السَّلَامَةَ اِسْلَمُوْا السَّلَامَةَ اِلَّا بِدِيَةِ (اے اہل جنت تم پر تمہارے رب رحیم کی طرف سے سلام ہو۔ وہ تمہیں سلامتی عطا فرمائے اور ابدی سلامتی عنایت فرمائے)۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور (حکم ہوگا) اے مجرمو! (میرے دوستوں سے) آج الگ ہوجاؤ ۱؎۔''

۱؎ مقاتل، سدی اور زجاج فرماتے ہیں مجرم اور نافرمان بندوں کو حکم ہوگا کہ میرے نیکوکار بندوں سے جدا ہوجاؤ، یعنی مومنین کو عزت و احترام کے ساتھ جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور مجرموں کو دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا۔ اس آیت کا عطف سابقہ آیت کے

کر دیا جائے گا پھر وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، نہ وہ کسی کو دیکھ سکے گا اور نہ اسے کوئی دوسرا دیکھے گا(۱)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں دوزخ میں جب اس شخص کو ڈالا جائے گا جس نے ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے تو ان کے لئے لوہے کے تابوت بنائے جائیں گے جن میں کیل بھی لوہے کے ہوں گے پھر ان تابوتوں کو دوسرے لوہے کے تابوتوں میں بند کیا جائے گا پھر انہیں جہنم کے نچلے طبقہ میں پھینکا جائے گا۔ ان میں کوئی یہ نہیں سوچے گا کہ میرے علاوہ بھی کسی کو عذاب ہو رہا ہے۔ ابونعیم اور بیہقی نے سوید بن غفلہ سے اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾

”کیا میں نے تمہیں یہ تاکیدی حکم نہیں دیا تھا اے اولاد آدم کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

لے یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے یعنی میں نے اپنے رسولوں کے ذریعے تمہیں تاکیدی حکم دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں شیطان کی فرمانبرداری نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے یہ آیت کریمہ کفار کو مومنین سے جدا کرنے کی علت بیان کر رہی ہے ان مفسرہ ہے آخر میں اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ فرما کر اس کی اطاعت نہ کرنے کی علت بھی بیان کر دی ہے۔

وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾

”اور میری عبادت کرنا یہ سیدھا راستہ ہے لے۔“

لے اَنِ اعْبُدُوْنِيْ کا عطف لا تعبدوا پر ہے۔ ھذا کا مشار الیہ شیطان کی عبادت سے روکنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے، یہ جملہ مستانفہ ہے جو عہد کی مذکورہ دونوں شقوں (شیطان کی عبادت نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا) کے مقتضیٰ کے بیان کے لئے ہے یا دوسری شق (اللہ کی عبادت کرنا) کے مقتضیٰ کے بیان کے لئے ہے اور صراط پر تنوین یعنی نکرہ ذکر کرنا مبالغہ اور تعظیم کے لئے ہے یا تنکیر بعضیت کے لئے ہے کیونکہ توحید، صراط مستقیم کا بعض ہے۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾

”(بایں ہمہ) گمراہ کر دیا شیطان نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو لے کیا تم عقل (وخرد) نہیں رکھتے تھے لے۔“

لے اَضَلَّ کا فاعل شیطان ہے۔ جِبِلًّا کو اہل مدینہ اور عاصم نے جیم اور باء کے کسرہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یعقوب نے جیم اور باء کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور ابو عمرو نے جیم کے ضمہ اور باء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے جیم اور با کے ضمہ اور بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔ یہ تمام لغات ہیں اور تمام کا معنی مخلوق اور جماعت ہے۔ یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ یہاں سے پھر شیطان کی انسان کے ساتھ دشمنی اور اس کی عداوت کے ظہور اور اس کے بھٹکانے کے واضح ہونے کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جس کے پاس تھوڑی سی بھی عقل موجود ہے اور جو ادنیٰ سی فراست رکھتا ہے اس کے لئے شیطان کی کارستانی اور دشمنی واضح ہے۔ کیونکہ وہ ازلی بدبخت انسان کو بے حیائی اور برائی پر برانگیختہ کرتا ہے، خالق رازق نفع و نقصان کے مالک کی عبادت کو چھوڑ کر بے جان، بے نفع اور غیر مضر مورتیوں کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ترک

۲؎ یہ استفہام توبیخ کے لئے ہے، یعنی اس کی اتنی واضح دشمنی کے باوجود تم اس کی عداوت کو نہیں سمجھتے و لقد اضلّ کا جملہ توبیخ کے لئے معترضہ ہے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

''یہ ہے وہ جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا آج اس کی آگ تاپو اس کفر کے باعث جو تم کیا کرتے تھے ۱؎۔''

۱؎ جب دوزخی آگ کے قریب پہنچیں گے تو انہیں یہ کہا جائے گا۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

''آج ہم مہر لگا دیں گے کفار کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں (ان بدکاریوں پر) جو وہ کمایا کرتے تھے ۱؎۔''

۱؎ اس جملہ میں خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے۔

امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ مسکرانے لگے پھر پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کس وجہ سے مسکرایا؟ عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا (قیامت کے روز) بندہ اپنے رب سے کہے گا اے میرے رب کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں نہیں۔ بندہ کہے گا میں اپنی ذات کے علاوہ اپنے خلاف کسی کی گواہی نہ مانوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ شَهِیْدًا وَبِالْکِرَامِ الْکَاتِبِیْنَ شُهُوْدًا آج تیرے خلاف تیرا نفس اور کراماً کاتبین فرشتے گواہی دینے کے لئے کافی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا۔ پھر اس کے جسم کے اعضاء سے ارشاد ہو گا کہ تم بولو! پس انسان کے اپنے اعضاء اس کے کرتوتوں کے متعلق بول پڑیں گے پھر بندے کو بولنے کی اجازت ہو گی تو وہ اپنے اعضاء سے مخاطب ہو کر کہے گا تمہارا ستیاناس ہو جائے تم ملیا میٹ ہو جاؤ، میں تمہاری طرف سے جھگڑ رہا تھا(1) (اور تم میرے خلاف گواہی دے رہے ہو)

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے روز اپنے رب کا دیدار کریں گے فرمایا کیا دوپہر کے وقت جب کہ کوئی بادل نہ ہو تمہیں سورج کے دیکھنے میں کوئی دقت ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کی نہیں۔ فرمایا چودھویں کی رات جب کہ بادل نہ ہو تو تمہیں چاند کو دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کی نہیں۔ فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم اپنے رب کا دیدار کرنے میں تکلیف محسوس نہ کرو گے مگر جتنی کہ سورج اور چاند کو دیکھنے میں محسوس کرتے ہو پھر بندہ پیش ہو گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے فلاں کیا میں نے تجھے عزت کا تاج نہیں عطا فرمایا تھا؟ کیا میں نے تجھے سردار نہیں بنایا تھا؟ کیا میں نے تجھے بیوی نہیں عطا کی تھی؟ کیا میں نے تیرے لئے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کر دیئے تھے؟ میں نے تجھے قوم کا رئیس بنایا تھا، تجھے مال غنیمت کا چوتھائی ملتا تھا۔ بندہ عرض کرے گا مولا کیوں نہیں یہ سب تیری عنایات تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تیرا گمان تھا کہ تو مجھ سے ملے گا، بندہ عرض کرے گا، میرا تو یہ گمان نہیں تھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا جس طرح تو نے

جواب ہوگا۔ پھر تیسرے سے ملاقات ہوگی اس سے بھی اسی طرح کا ارشاد ہوگا۔ تو وہ عرض کرے گا۔ میں تجھ پر ایمان لایا۔ تیری کتاب پر، تیرے رسول پر ایمان لایا، میں نے نماز پڑھی، روزہ رکھا، صدقہ کیا اور حسب استطاعت اپنی تعریف وتوصیف کرے گا۔ ارشاد ہوگا ہم تیرے خلاف کوئی گواہ پیش کریں؟ وہ دل میں سوچے گا کہ میرے خلاف کون گواہی دے گا' اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور اس کی ران کو ارشاد ہوگا' بول! پس اس کی ران' اس کا گوشت اور اس کی ہڈی اس کے اعمال بد کے متعلق سب کچھ بتا دیں گے۔ فرمایا یہ منافق ہوگا اور اپنے حق میں عذر پیش کرے گا اور اسی (بدبخت) پر اللہ کا غضب ہوگا(1)۔

امام احمد اور طبرانی نے عقبہ بن عامر سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ جس روز مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی سب سے پہلے انسان کی جو ہڈی بولے گی وہ اس کی بائیں ران کی ہڈی ہوگی(2)۔

امام احمد' نسائی' حاکم اور بیہقی نے معاویہ بن حیدہ کی حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے روز تم اس حال میں آؤ گے کہ تمہارے مونہوں پر غلاف چڑھا ہوگا اور سب سے پہلے انسان کا جو عضو بات کرے گا وہ اس کی ران اور ہتھیلی ہوگی۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز مومن کو حساب کیلئے بلایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر علیحدگی میں اس کے اعمال پیش فرمائے گا۔ مومن ان سب کا اعتراف کرے گا اور عرض کرے گا اے میرے پروردگار میں نے واقعی یہ کوتاہی بھی کی، میں نے یہ بھی گناہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے وہ سب جرائم معاف فرما دے گا، اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔ فرمایا سطح زمین پر کوئی مخلوق اس کے گناہوں کو نہیں دیکھ سکے گی۔ لیکن اس کی نیکیاں ظاہر ہوں گی۔ تمام لوگ ان نیکیوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اور کافر اور منافق کو حساب کے لئے بلایا جائے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ اس کے اعمال پیش فرمائے گا وہ ان اعمال بد کا انکار کرے گا اور کہے گا اے میرے پروردگار تیری عزت کی قسم اس فرشتہ نے میرے نامہ اعمال میں وہ اعمال بھی لکھ دیئے ہیں جو میں نے نہیں کئے۔ ارشاد ہوگا تو نے فلاں برائی' فلاں جگہ فلاں دن کی تھی۔ وہ کہے گا اے میرے پروردگار تیری عزت کی قسم میں نے یہ برائی نہیں کی۔ جب وہ اس طرح جھوٹ بکے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا(3)۔ ابوموسیٰ فرماتے ہیں میرا خیال ہے کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) سب سے پہلے جو عضو بات کرے گا وہ دائیں ران ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ تلاوت فرمائی۔

ابویعلی اور حاکم نے ابوسعید خدری کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمایا ہے کہ قیامت کے روز کافر کو اس کے اعمال بد پر شرم دلائی جائے گی تو وہ انکار کرے گا اور جھگڑے گا۔ پس اسے کہا جائے گا کہ یہ تیرے پڑوسی تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ وہ کہے گا یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں پھر ارشاد ہوگا کہ تیرے خلاف تیرے گھر والے اور تیرا خاندان گواہی دیتا ہے۔ وہ کہے گا یہ بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ پھر ارشاد ہوگا (تم سچے ہو) تو حلف اٹھاؤ وہ (بدبخت) قسم بھی اٹھا دیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کو خاموش کر دے گا اور ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی پھر اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ میں ڈال دے گا(4)۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿٦٦﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو ہم ان کی آنکھوں کا نشان تک محو کر دیتے پھر وہ راستہ کی طرف دوڑ کر آتے بھی تو ان (اندھوں) کو راستہ کیسے نظر آتا۔''

۱؎ یعنی اگر ہم چاہیں تو ان کی یہ ظاہری آنکھیں یوں مٹا دیں کہ نہ آنکھ کا گڑھا ہو نہ پلکیں۔ طمس کا یہی معنی ہے کہ کسی چیز کا بالکل اثر اور نشان ہی مٹا دینا۔ استبقوا کا عطف طمسنا پر ہے۔ یعنی جس راستہ پر ہر وقت ان کی آمد و رفت رہتی ہے اس راستہ کی طرف دوڑ کر آئیں لیکن وہ اندھا ہونے کی وجہ سے اسے کیسے دیکھ سکیں گے۔ الصراط پر نصب یا تو اس اعتبار سے ہے کہ حرف جر حذف کیا گیا ہے یا استباق کے ضمن میں اِبْتَدَاءَ کا معنی پایا جاتا ہے یا مسبوق الیہ کو مجازاً مسبوق بنایا گیا ہے یا ظرف کی بناء پر منصوب ہے۔ فانی پر فاء سببیت کے لئے اور استفہام انکاری ہے، یعنی آنکھوں کے مٹ جانے کے سبب وہ نہیں دیکھ سکیں گے علامہ بغوی لکھتے ہیں یہ قول حسن اور سعدی کا ہے۔ ابن عباس' قتادہ' مقاتل اور عطاء فرماتے ہیں اس آیت کا یہ معنی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کی گمراہی کی آنکھیں پھوڑ دیں اور انہیں گمراہی اور ضلالت سے اندھا کر دیں اور ان کی آنکھیں گمراہی سے ہدایت کی طرف پھیر دیں جس سے یہ اپنی شاہراہ ہدایت دیکھ لیں (۱)۔ یعنی ہم نے جب یہ چاہا ہی نہیں تو یہ اپنی ہدایت کا راستہ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو ہم انہیں مسخ کر کے رکھ دیتے ان کی جگہوں پر پھر وہ نہ آگے جا سکتے اور نہ پیچھے پلٹ سکتے ۱؎۔"

۱؎ ابوبکر نے مَكَانَتِهِمْ کو مکاناتھم یعنی جمع کا صیغہ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے، یعنی اگر ہم چاہتے تو انہیں اپنی جگہوں پر ہی بندر اور خنازیر بنا دیتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر ہم چاہتے تو انہیں پتھر بنا دیتے جو اپنی جگہ پر پڑے رہتے اور ان میں کوئی روح اور جان نہ ہوتی۔ مضیا کا معنی ذھابًا (جانا) ہے۔ رجوع کی جگہ و لا یرجعون فعل ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ فواصل کی رعایت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ وہ تکذیب سے تصدیق کی طرف نہ لوٹ سکتے۔ حضرت حسن کی تاویل کے مطابق اس آیت اور سابقہ آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے کفر اور عہد شکنی کے باعث اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ یہ سلوک کیا جانا چاہئے لیکن دنیا میں ہماری رحمت سب کو شامل ہے اس لئے ہم ایسا نہیں کرتے' نیز ان کے متعلق ہماری حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں ڈھیل دی جائے۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾

"اور جس کو ہم طویل عمر دیتے ہیں تو کمزور کر دیتے ہیں اس کی طبعی قوتوں کو ۱؎ پھر کیا یہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ۲؎۔"

۱؎ نُنَكِّسْهُ کو عاصم اور حمزہ نے پہلی نون کے ضمہ دوسری کے فتحہ، کاف کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے پہلی نون کے فتحہ، دوسری کے سکون، کاف کے ضمہ اور تخفیف کے ساتھ مجرد سے پڑھا ہے۔ تنکیس زیادہ بلیغ ہے اور النکس زیادہ مشہور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں یعنی پہلے بچپن میں بے چارگی کی کیفیت میں ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ قوت و طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور عنوان شباب پر پہنچتا ہے تو پھر قوتوں میں ضعف اور کمزوری شروع ہو جاتی ہے حتی کہ مر جاتا ہے۔

۲؎ اس کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ کے مضمون پر ہے اور استفہام انکاری ہے، یعنی ان کو سوچنا چاہئے تھا کہ جو بچپن سے جوانی اور پھر

اس میں تدریج (آہستہ آہستہ کسی کام کو پائے تکمیل تک پہنچانا) کا عمل ہے۔ نافع اور ابن ذکوان نے تعقلون (تاء) کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس سے پہلے خطاب کا ذکر ہے جیسے الم اعھد الیکم جب کہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ یعقلون غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کی وجہ ولو نشاء لمسخناھم کا ارشاد ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں الکلبی نے فرمایا کفار مکہ نے کہا (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) شاعر ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں یہ شعر ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾

''اور نہیں سکھایا ہم نے اپنے نبی کو شعر اور نہ یہ ان کے شایان شان ہے لے نہیں ہے یہ مگر نصیحت اور قرآن جو بالکل واضح ہے ۲؎۔''

لے اس کا عطف انک لمن المرسلین پر ہے۔ اس میں خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے، یعنی ہم نے قرآن کی تعلیم کے ساتھ اسے شعر نہیں سکھایا کیونکہ یہ قرآن اشعار کی طرح نہ ہم قافیہ ہے اور نہ موزون ہے، نہ اس میں اشعار کے باطل معانی کی طرح کوئی معنی اور مفہوم ہے، نہ اس میں بلاوجہ رغبت دلانے والے تخیلات کا تذکرہ ہے اور نہ نفرت آمیز خیالات کا ذکر ہے اور نہ خیالی اور جھوٹے تصورات کی آمیزش ہے اور میرے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ شایان شان نہیں کہ وہ اپنے وقت کی قیمتی دولت کو اشعار کہنے اور وزن و قافیہ کی رعایت میں ضائع کرتا رہے۔ اور امام بخاری اور مسلم نے براء بن عازب کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قول نقل کیا ہے انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب (میں نبی ہوں اور اس میں جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا (پوتا) ہوں(2)۔

اسی طرح حضرت جندب بن ابی سفیان کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ هَلْ اَنْتَ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِيْتُ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَالَقِيْتَ (تو انگلی ہے جو زخمی ہوئی ہے اور جو کچھ تمہیں تکلیف پہنچتی ہے اللہ کے راستہ میں پہنچی ہے)

تو یہ دونوں اشعار بغیر کسی تکلیف اور تصنع کے صادر ہوئے تھے اور ان سے آپ کا قصداً اشعار کہنا نہیں تھا اور جس شخص سے بلا ارادہ مقفی، مسجع اور موزوں کلام صادر ہو جائے اسے شاعر نہیں کہا جاتا۔ اس قسم کا کلام اکثر نثر کی عبارات میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے خلیل رجز یہ اشعار کو اشعار شمار ہی نہیں کرتا اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کذب اور عبدالمطلب دونوں کی باء کو حرکت دی تھی اور دمیت کی تاء کو بغیر اشباع کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور لقیت کی تاء کو ساکن کر کے پڑھا (اگر یہ ثابت ہو تو پھر شعر کی صورت ہی نہ رہے گی) علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعر کا ایک مصرعہ بھی شاعری کے انداز میں نہیں پڑھ سکتے تھے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مصرعہ پڑھنے لگتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر روانی کے ساتھ جاری نہ ہوتا(3)۔

علامہ بغوی نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مصرعہ پڑھا۔

كَفٰى بِالْاَ سْلَامِ وَالشَّيْبِ لِلْمَرْءِ نَاهِياً (اسلام اور بالوں کی سفیدی انسان کو گناہوں سے روکنے کے لئے کافی ہے) شاعر نے تو اس طرح کہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پڑھا تو پھر بھی پہلے کی طرح پڑھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا! اشھد انک رسول اللّٰہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ۔

مقدام بن شریح اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور مثال شعر پڑھا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن رواحہ کے اشعار پڑھتے تھے۔ فرماتی ہیں کبھی کبھی آپ یہ مصرعہ پڑھتے تھے۔

یَاتِیْکَ الْاَخْبَارُ مَنْ لَمْ تُزَوِّدِیْ (زمانہ تیرے پاس ایسی نصیحت آموز واقعات لائے گا جو پہلے تیرے پاس نہیں ہیں(1)۔

معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور مثال اشعار پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر انتہائی ناپسند تھے۔ فرماتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی شعر نہیں پڑھا مگر کبھی کبھی قبیلہ بنی قیس بن طرف کے شاعر کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

سَتُبْدِیْ لَکَ الْاَیَّامُ مَا کُنْتَ جَاھِلًا وَیَاْتِیْکَ بِالْاَخْبَارِ مَنْ لَمْ تُزَوِّدِیْ

زمانہ تیرے لئے وہ سب کچھ کھول دے گا جس سے تو نا آشنا ہے اور جو تیرے پاس نہیں وہ بھی تیرے پاس لے آئے گا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے مصرعہ کو اس طرح پڑھتے ہیں ویاتیک من لم تزود بالاخبار۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ شعر کا مصرعہ اس طرح نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ میں شاعر ہوں اور نہ میرے لئے شعر کہنا مناسب ہے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان میں لہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ یعنی قرآن کے لئے شعر ہونا مناسب نہیں۔

ع یہ قرآن تو سراپا نصیحت اور ارشاد الٰہی ہے۔ فرائض، احکام، حدود اور ماضی مستقبل کے حالات واقعات بیان کرنے والے ہیں، جب کہ شاعر کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔

لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ۝

''تاکہ وہ بروقت خبردار کرے اسے جو زندہ ہے اور تاکہ حجت تمام کردے کفار پر [1]۔''

[1] نافع، ابن عامر اور یعقوب نے تاء خطاب کے ساتھ لِتُنْذِرَ پڑھا ہے اور سورۂ احقاف میں بھی مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے احقاف میں ان کی موافقت کی ہے اور باقی قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ سابقہ کلام کے متعلق ہے، یعنی ہم نے قرآن نازل کیا اور محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تاکہ قرآن یا رسول بروقت متنبہ کرے مومن کو جس کا دل ابھی زندہ ہے اور حقائق اشیاء کو سمجھتا ہے اور حیات ابدیہ ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ ابدیت کی تخصیص اس لئے فرمائی کیونکہ مومن شخص ہی اس قرآن سے نفع حاصل کرتا ہے نہ کہ کافر کیونکہ [illegible] سے بھی محروم ہوتا ہے، پتھر دل کی نوجوانات کو اچھا سمجھتا ہے اور شیطان کی اتباع کو

ہوگا۔ کافرین کا ذکر حیّا کے مقابلہ میں کیا تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کافر حقیقت میں مردہ ہیں۔ القول سے مراد کلمہ عذاب ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝

''کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے پیدا فرمائے ان کے لئے اس مخلوق سے جو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی مویشی پھر (اب) یہ ان کے مالک ہیں [1]۔''

[1] ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے اور واو عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اینکرون البعث او اینکرون خلق اللّٰه ولم یروا یعنی کیا یہ بعثت کا انکار کرتے ہیں یا اللہ کی تخلیق کا انکار کرتے ہیں اور انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے پیدا کی ہیں وہ اشیاء جو ہماری دست کاری کا کرشمہ ہیں۔ عمل کی نسبت ایدینا کی طرف فرمائی اختصاص اور تفرد میں مبالغہ کرتے کے لئے استعارۃً یہ اسلوب اختیار فرمایا۔ یعنی سب مخلوق کو عدم سے وجود میں لانے والے ہم ہیں۔ انعاماً (مویشی) کا ذکر خصوصی طور پر کیا کیونکہ ان میں فطرت کے انوکھے انداز ہیں اور ان میں منافع کی کثرت ہے۔ آخر میں فرمایا ہم نے انہیں مالک بنایا تو وہ مالک ہیں یا یہ معنی کہ ہم نے ان کے لئے مسخر فرمایا تو وہ ان میں تصرف کر سکتے ہیں۔

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۝

''اور ہم نے تابعدار بنا دیا انہیں ان کا پس ان میں سے بعض پر وہ سواری کرتے ہیں اور بعض کا (گوشت) کھاتے ہیں [1]۔''

[1] ذللنا کا معنی سخرنا ہے۔

وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ [1] اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝

''اور ان کے لئے ان مویشیوں میں اور بھی کئی منفعتیں ہیں اور پینے کی چیزیں ہیں کیا وہ شکر ادا نہیں کرتے [1]۔''

[1] دوسرے منافع سے مراد ان کی کھالوں اور اون کا استعمال ہے۔ ان کو زمین میں ہل چلانے کے لئے استعمال کرنا وغیرہ ہے۔ مشارب جمع ہے مشربة کی۔ یہ اسم ظرف ہے۔ یا مصدر ہے، اس سے مراد جانوروں کا دودھ پینا ہے۔ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ میں ہمزہ انکار کے لئے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اینکرون فلا یشکرون یعنی کیا وہ انکار کرتے ہیں اور شکر نہیں کرتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں اور ناشکری کرتے ہیں جیسا کہ آنے والا ارشاد دلالت کر رہا ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

''اور ان (ظالموں) نے بنا لئے ہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور خدا کہ شاید وہ ان کی مدد کریں [1]۔''

[1] یعنی ان بدبختوں نے باوجود اس کے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور پیہم نعمتوں کو دیکھ لیا اور یہ خوب جان چکے ہیں کہ وہ نفع وضرر کا مالک ہے کائنات کی ہر چیز کا منفرد خالق ہے لیکن کافروں کے بتوں کو عبادت میں اس کا شریک بنا لیا ہے۔ اس جملہ کا عطف خلقنا لهم پر ہے۔ یعنی انعامات کی بارش [illegible]

انس کا معاملہ ایک عجیب وغریب صورت میں ہے پیدا میں کرتا ہوں اور عبادت غیر کی کی جاتی ہے۔ رزق میں دیتا ہوں اور شکر دوسروں کا کیا جاتا ہے۔ لعلهم ینصرون' اتخذوا کے فاعل سے حال ہے، یعنی وہ اس امید پر انہیں خدا بناتے ہیں کہ وہ ان کی مشکل حالات میں امداد کریں گے حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

''یہ جھوٹے خدا انہیں مدد کر سکتے ان کی اور یہ کفار ان معبودوں کے لئے تیار شدہ لشکر ہیں لے۔''

لے هم ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں اور لهم کا مرجع ان کے معبودان باطلہ ہیں، یعنی ان خداؤں کی حفاظت اور ان کو شکست و ریخت سے بچانے کے لئے لشکر تیار کر رکھے ہیں حالانکہ یہ بے جان مورتیاں نہ ان کو کوئی خیر پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان سے کسی شر کو دور کر سکتی ہیں۔ بعض علماء نے یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ قیامت کے روز ہر باطل معبود کو لایا جائے گا اور پھر ان کے ساتھ ان کے پرستار بھی ہوں گے گویا وہ آگ میں ڈالے جانے کے لئے ایک لشکر ہے، یہ جملہ لا یستطیعون کے فاعل سے حال ہے۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

''پس نہ رنجیدہ کرے آپ کو (اے حبیب!) ان کا قول ہم خوب جانتے ہیں جس بات کو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں لے۔''

لے فاء سببیت کے لئے ہے۔ یعنی جب آپ نے کافروں کے متعلق عذاب کی وعید سن لی تو یہ کافر جو اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں الحاد کرتے ہیں اور جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں آپ اس پر کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ ہم ان کی عداوت اور عقائد باطلہ کو جانتے ہیں جو یہ اپنے نہاں خانہ دل میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو یہ اعمال بد کرتے ہیں اور اقوال شنیعہ بولتے ہیں ہم ان کو بھی جانتے ہیں۔ اور ہم ان سب کرتوتوں اور بکواسات پر ان کو سزا دیں گے، آپ کی تسلی کے لئے یہی کافی ہے۔ اِنَّا نَعْلَمُ کا جملہ علیحدہ جملہ کی حیثیت سے نہی کی علت ہے۔

حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسی حدیث کو صحیح بھی کہا ہے فرماتے ہیں عاص بن وائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا اور کہنے لگا یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اس حالت کے بعد اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا۔ وہ تجھے مارے گا اور پھر تجھے زندہ کرے گا پھر تجھے جہنم میں داخل کرے گا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾

''کیا انسان (اس حقیقت کو) نہیں جانتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے لے پس اب وہ (ہمارا) کھلا دشمن بن بیٹھا ہے ۲ے۔''

لے الانسان سے مراد عاص بن وائل ہے۔ ابن ابی حاتم نے متعدد طرق سے مجاہد، عکرمہ اور ابن زبیر سے اور سدی' بیہقی (شعیب

آیا اور اپنے ہاتھ سے اسے مسل کر کہنے لگا کیا اس کے اتنا بوسیدہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ کرے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ تجھے دوبارہ اٹھائے گا اور پھر تجھے دوزخ میں داخل فرمائے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1)۔ ہمزہ انکار کے لئے ہے اور واو محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی اینکر الانسان قدرتنا علی الا عادۃ ولم یر۔ یعنی کیا انسان دوبارہ زندہ کرنے کی ہماری قدرت کا انکار کرتا ہے اور اس نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اسے ایک نطفہ سے پیدا کیا ہے۔

ا فاذا پر فا عطف کے لئے ہے۔ اور اذا مفاجاتیہ ہے، یعنی ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر ہمارا کھلا دشمن بن بیٹھا اور ہمارے ساتھ باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے لگا۔ اس کو اب تحقیق حق سے غرض نہیں کیونکہ وہ تو ظاہر باہر ہے یہ جانتا ہے اور اور اپنی ابتدائی تخلیق کا معترف بھی ہے پھر یہ اس بات کا انکار کرتا ہے جو اس کی پہلی تخلیق سے زیادہ آسان ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپ کے متعلق جو کچھ یہ بک بک کر رہے ہیں یہ تو انکے نزدیک آسان ہے یہ تو ایسے گستاخ ہو چکے ہیں کہ حشر اور قیامت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ اس جملہ میں ان کی انتہائی مذمت اور قباحت بیان ہو رہی ہے کہ چاہئے تو یہ تھا کہ انسان نعمتوں اور بخششوں کے مقابلہ میں سجدہ شکر ادا کرتا لیکن یہ ناشکری کرتا ہے حالانکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے پانی کی ایک ناپاک بوند سے پیدا فرمایا اور پھر عزت وسروری کے اس مقام پر پہنچایا کہ شرافت اور کرامت کو اس پہ فخر ہے۔ بعض علماء نے فاذا ھو خصیمٌ مبین کا یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ حقیر پانی ہونے کے بعد آسان عقل وشعور اور قادر الکلام ہو گیا، اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر قدرت رکھنے والا ہو گیا۔ بعض فرماتے ہیں عزت وشرف پانے کے بعد اپنی ذلیل اور گھٹیا اصل پر ہو گیا، اپنے رب سے جھگڑنے لگا اور مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت کا منکر ہو گیا۔ اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ الخ کا جملہ اولم یروا انا خلقنا لھم الخ کا بدل ہے۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ۝۷۸

''اور بیان کرنے لگا ہے ہمارے لئے (عجیب وغریب) مثالیں اور اس نے فراموش کر دیا ہے اپنی پیدائش کو (گستاخ) کہتا ہے اجی! کون زندہ کرسکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں ا۔''

ا انسان ہمارے لئے عجیب وغریب مثالیں بیان کرتا ہے اور مردوں کو زندہ کرنے کی ہماری قدرت کی نفی کرتا ہے اور اپنے خالق کو ایک عاجز بندے سے تشبیہ دیتا ہے اور اپنی پیدائش اور تخلیق کو فراموش کر دیا ہے کہ اسے ایک منی کی بوند سے پیدا کیا گیا ہے۔ حالانکہ منی سے تخلیق کرنا ہڈی سے پیدا کرنے کی نسبت زیادہ عجیب وغریب ہے۔

وھی رمیم کا جملہ العظام سے حال ہے۔ اور یہ جملہ مثل کے بیان کے لئے علیحدہ مستقل کلام ہے۔ رمیم پرانی اور بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں۔ یہ فعیل کا وزن بمعنی فاعل ہے اور یہ رم الشی سے مشتق ہے پھر غلبہ کی وجہ سے اسم بن گیا، اس وجہ سے اس کا مونث کا صیغہ استعمال نہیں ہوتا یا یہ فعیل بمعنی مفعول ہے اور رممتہ سے مشتق ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت میں دلیل ہے کہ ہڈی میں زندگی ہوتی ہے اور اس میں موت بھی مؤثر ہوتی ہے(2)۔ امام بیضاوی کی مراد یہ ہے کہ مردار کی ہڈی نجس (پلید) ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے ... التحقیق ...

مذہب ذکر کیا ہے لیکن صاحب رحمۃ الامہ نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد کا صحیح مذہب یہ ہے کہ دانت، پر اور ہڈی پاک ہے۔ جو علماء مردار کی ہڈی کی نجاست کا قول کرتے ہیں انہوں نے اس آیت کریمہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لَا یُنْتَفَعُ مِنَ الْمَیْتَةِ بِشَیْءٍ (مردار کی کسی چیز سے نفع نہ اٹھایا جائے گا) سے حجت پکڑی ہے۔ ابو بکر الشامی نے اپنی سند کے ساتھ عن ابی الزبیر کے سلسلہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ صاحب المغنی اور صاحب تنقیح التحقیق نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند حسن ہے اور ابن وہب نے اپنی سند میں زمعہ بن صالح عن ابی الزبیر عن جابر کی سند سے روایت کی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں لَا تَنْفَعُوْا مِنَ الْمَیْتِ بِشَیْءٍ وَّلَا تَنْفَعُوْا بِالْمَیْتِ۔ صاحب التنقیح فرماتے ہیں زمعہ کے بارے میں کلام ہے اور حدیث میں علت ہے جسے ابن معور وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں مردار کے بالوں اور ہڈی میں زندگی نہیں ہوتی، یعنی ان میں زندگی نہیں ہوتی تو ان پر موت بھی طاری نہیں ہوتی' پس مردار سے انتفاع کی نہی والی حدیث ان دونوں (ہڈی اور بال) کو شامل نہیں ہے۔ لیکن صاحب ہدایہ کے قول پر یہ آیت کریمہ حجت ہے کیونکہ یہ آیت کریمہ ہڈی میں حیات کے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ دلیل دی جائے کہ کسی چیز کی پلیدی کا باعث بہنے والا خون ہے اور ہڈی اور بالوں میں بہنے والا خون نہیں ہوتا اگر چہ ان میں زندگی ہوتی ہے۔ اس لئے بال اور ہڈیاں ناپاک نہیں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن جانوروں میں بہنے والا خون نہیں ہوتا۔ ان کے پانی میں گرنے سے پانی پلید نہیں ہوتا حضرت سلمان سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر کھانے اور پینے والی چیز میں اگر کوئی ایسا جانور مر جائے جس کا خون نہ ہو تو اس چیز کا کھانا اور پینا حلال ہے اور اس سے وضو کرنا بھی جائز ہے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے(1)۔ دار قطنی فرماتے ہیں اس حدیث کو بقیہ کے علاوہ کسی دوسرے راوی نے سعید بن سعید الزبیدی سے روایت نہیں کیا ہے اور سعید ضعیف راوی ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں سعید مجہول ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کے برتن میں مکھی گر جائے تو اس کو غوطہ دے کر باہر پھینک دو کیونکہ اس کے ایک پر میں شفا ہے اور دوسرے میں داء (بیماری) ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ ہماری دلیل حضرت ابن عباس کی حدیث بھی ہے کہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مردار بکری کے پاس سے گذرے تو فرمایا تم لوگ اس کی جلد سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ یہ مردہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مردار کا صرف کھانا حرام ہے(3) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ دار قطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردار جانور میں سے صرف اس کا گوشت حرام کیا ہے۔ لیکن اس کی کھال' اس کے بال اور اس کی اون میں کوئی حرج نہیں ہے(4)۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبد الجبار بن مسلم ہے' دار قطنی فرماتے ہیں وہ ضعیف ہے لیکن ابن حبان نے اسے ثقہ لوگوں میں شمار کیا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں یہ حدیث حسن کے مرتبہ سے کم نہیں ہے۔ حیرت ہے علامہ ابن جوزی پر کہ انہوں نے اسی حدیث سے مردار کی اون اور اس کے بالوں کی طہارت پر حجت پکڑی ہے لیکن ہڈی کی طہارت پر اس حدیث کو حجت نہیں بنایا۔ ہڈی کی نجاست پر اس نے لَا تَنْتَفِعُوْا مِنَ الْمَیْتَةِ بِشَیْءٍ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے اور صوف اور بالوں کی نجاست پر اس حدیث سے حجت نہیں پکڑی۔ حق یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لاتنتفعوا من المیتة

ہے لیکن بال اور ہڈیاں اور اون جن میں خون کا اختلاط نہیں ہوتا' ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور دباغت کے بعد اور رطوبت کے ازالہ کے بعد جلد (کھال) کے استعمال میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے متعلق اور بھی احادیث ہیں۔ دارقطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ خبردار مردار کی ہر چیز حلال ہے لیکن جو چیزیں کھائی جاتی ہیں وہ حلال نہیں ہیں اور کھال' بال' اون اور ہڈیاں یہ سب چیزیں حلال ہیں کیونکہ ان میں ذبح کر کے پاکیزگی حاصل نہیں کی جاتی (1) (بلکہ وہ پہلے ہی پاک ہوتی ہیں اور ان میں موت مؤثر نہیں ہوتی) اس حدیث کی سند میں ابوبکر الہذلی ہے۔ دارقطنی فرماتے ہیں یہ متروک ہے۔ غندر فرماتے ہیں یہ کذاب ہے۔ یحییٰ فرماتے ہیں یہ روایت حدیث میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

دارقطنی نے ام سلمہ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مردار کی کھال کی دباغت کرلی جائے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس کی اون، بالوں اور سینگوں کو جب پانی سے دھویا جائے تو ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے (2) دارقطنی فرماتے ہیں یہ حدیث صرف یوسف بن السفر نے روایت کی ہے۔ اور وہ متروک ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ ابوزرعہ اور نسائی فرماتے ہیں وہ متروک ہے۔ رحیم کہتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں وہ قابل حجت نہیں ہے۔

ابن الجوزی نے ابویعلی عن حمید الشامی عن سلیمان عن ثوبان کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہ کے لئے ہاتھی کے دانتوں سے بنے ہوئے دو کنگن اور تانت سے بنا ہوا ایک ہار خریدا۔ ابن الجوزی کہتے ہیں یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس کی سند میں حمید اور سلیمان دونوں مجہول راوی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں میں حمید کو نہیں پہچانتا۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں میں سلیمان کو نہیں جانتا اور عاج سے مراد بھی ذبل ہے (یعنی کچھوے کی کھال) ابن قتیبہ کہتے ہیں یہاں عاج سے وہ عاج مراد نہیں جو عوام میں معروف ہے جو ہڈی اور دانت سے تراش کر بناتے ہیں کیونکہ یہ تو مردار ہے اور اس کے متعلق نہی وارد ہے۔ پھر اس سے حضرت فاطمہ کے لئے کیسے کنگن بنائے گئے تھے' عاج سے مراد کچھوے کی کھال ہے۔ اصمعی نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اصمعی کا یہ کہنا کہ "عاج سے مراد وہ نہیں جسے عوام جانتے ہیں" یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاید لغت میں بھی اس کا یہ معنی نہیں ہے لیکن حقیقت اس طرح نہیں ہے۔ المحکم میں ہے عاج' ہاتھی کے دانت کو کہتے ہیں، دانت کے علاوہ کو عاج نہیں کہا جاتا۔ جوہری کہتے ہیں عاج ہاتھی کی ہڈی کو کہتے ہیں اس کا واحد عاجہ ہے۔ اصمعی نے یہ تاویل اس لئے کی ہے کیونکہ اس کے اعتقاد میں ہاتھی کی ہڈی ناپاک ہے۔ قاموس کی عبارت سے بھی اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ عاج کا لفظ کچھوے کی کھال اور ہاتھی کی ہڈی سے مشترک ہے۔ جزری کی نہایہ سے بھی یہی مفہوم ملتا ہے۔ الذبل سمندری یا خشکی کے کچھوے کی کھال کو کہتے ہیں یا سمندری جانور کی پیٹھ کی ہڈیوں کو کہتے ہیں جس سے کنگن بنائے جاتے ہیں۔ بیہقی نے عن بقیہ عن عمرو بن خالد عن قتادہ عن انس کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھی کے دانتوں سے بنی ہوئی کنگھی استعمال فرماتے تھے۔ بیہقی فرماتے ہیں بقیہ کی اپنے مجہول شیوخ سے روایت ضعیف ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ایسی بہت سی احادیث اگرچہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں اور متن کے اعتبار سے حسن ہیں اور بعض حسن سے کم مرتبہ نہیں اور اس حدیث کی شاہد صحیحین کی پہلی حدیث بھی ہے تو کیسے قابل حجت نہ ہوں گی۔ واللہ علم۔

''آپ فرمائیے (اے گستاخ سن!) زندہ فرمائے گا انہیں وہی جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کو خوب جانتا ہے۔[1]''

[1] یعنی اس کی قدرت پہلے کی طرح باقی ہے کیونکہ اس کی قدرت میں تغیر اور تبدیلی ممتنع ہے اور مادہ بھی اسی حالت میں باقی ہے اس کی بالذات قابلیت موجود ہے۔ (تو وہی ذات جس نے ابتدا میں تخلیق فرمایا دوبارہ بھی وہی اٹھائے گا اور زندہ کرے گا) یہ جملہ مستانفہ ہے اور وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ کا جملہ یحیٰی کے فاعل سے حال ہے، یعنی وہ اپنی مخلوقات کی تفاصیل اور ان کی تخلیق کی کیفیت جانتا ہے، وہ اشخاص کے بکھرے ہوئے ذرات کا خوب علم رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کس جگہ ہیں اور کس راستہ پر ہیں، وہ ان ذرات کو ایک دوسرے سے جدا کرنے پھر ان کو آپس میں جوڑنے اور ملانے کا بھی علم رکھتا ہے جو ان افراد میں اعراض اور قوتیں تھیں ان کے اعادہ کو بھی جانتا ہے یا ان کی پہلی قوتوں اور اعراض کی مثل پیدا کرنے کو بھی جانتا ہے۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ﴿٨٠﴾

''جس نے (اپنی حکمت سے) رکھ دی تمہارے لئے سبز درختوں میں آگ[1] پھر تم اس سے اور آگ سلگاتے ہو[2]۔''

[1] الَّذِي، اسم موصول الذی انشاھا سے بدل ہے یا مبتدا محذوف هُوَ کی خبر ہے یا مدح کے طور پر بتقدیر اعنی منصوب ہے ابن عباس فرماتے ہیں دو درخت پیدا ہوتے ہیں ایک کو المرخ اور دوسرے کو العفار کہتے ہیں۔ جو شخص ان کی تر و تازہ ٹہنیاں مسواک کی مثل کاٹے جن سے پانی بہہ رہا ہو اور پھر مرخ کو عفار پر رگڑے تو ان سے آگ نکلتی ہے۔ عرب کہتے ہیں ہر درخت میں آگ ہے اور مرخ و عفار اس صفت میں ممتاز ہیں۔ علماء فرماتے ہیں سوائے عناب کے ہر درخت میں آگ ہے۔

[2] اذاً مفاجاتیہ ہے۔ یعنی آگ سلگانے کے وقت تمہیں ذرا بھر شک نہیں ہوتا کہ سبز درخت کی ٹہنیوں سے آگ نکل رہی ہے پس جو ہستی سبز درخت سے آگ نکالنے پر قادر ہے حالانکہ سبز درخت میں پانی ہوتا ہے جو آگ کی طبعاً ضد ہے وہ ہستی یقیناً بوسیدہ ہڈی کو پہلے کی طرح تر و تازہ کرنے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے۔

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم ۚ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿٨١﴾

''کیا وہ (قادر مطلق) جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو قدرت نہیں رکھتا کہ پیدا کر سکے ان جیسی (چھوٹی سی) مخلوق بیشک! (وہ ایسا کر سکتا ہے) اور وہی پیدا فرمانے والا سب کچھ جاننے والا ہے[1]۔''

[1] استفہام انکاری ہے اور واو محذوف پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اخلق السموات والارض کما تعرفون بہ و لیس الذی خلقهما مع کبر جرمها وعظم شانها بقادرٍ الخ یعنی میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے جیسا کہ تم اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہو۔ تو وہ ذات جو اتنے وسیع و عریض آسمان و زمین کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ان جیسی حقیر [illegible] مثل پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ وہ تو وہ ہے

اِنَّمَآ اَمْرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝۸۲

''اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔[1]''

[1] یکون کو ابن عامر اور کسائی نے یقول پر عطف کی بناپر منصوب پڑھا ہے۔امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ ایک تمثیل ہے کہ قدرت الہیہ اپنے مراد میں اس طرح مؤثر ہوتی ہے جیسے اطاعت گذار اپنے مطاع کی بغیر کسی توقف وانکار کے اطاعت کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا امر کسی آلہ اور عمل کا محتاج نہیں بلکہ اس کا ارشاد کُنْ ہوتا ہے اور چیز وجود میں آ جاتی ہے اس شبہ کو ہی ختم فرما دیا کہ شاید اللہ تعالیٰ کو بھی مخلوق کی طرح مادہ اور عمل کی ضرورت پڑتی ہوگی(1)۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۸۳

''پس وہ (ہر عیب سے) پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔[1]''

[1] سبحان فعل محذوف کا مصدر ہے اور فاء سببیت کے لئے ہے۔یعنی جب تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطفہ سے پیدا فرمایا ہے وہ ہڈیوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے جب کسی چیز کو تخلیق فرمانے کا ارادہ فرمایا ہے تو وہ فرماتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے تو پھر تم اس بے عیب ذات کی پاکیزگی بیان کرو جس کے دست قدرت میں ہر چیز کی قدرت ہے ملکوت سے مراد الملک بمعنی قدرت ہے۔مبالغہ کے لئے واو اور تاء کا اضافہ کیا گیا ہے۔کفار جو اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں بیان کرتے تھے یہ آیت ان تمام بے تکی اور لایعنی باتوں سے اس کی پاکیزگی اور تنزیہ بیان کر رہی ہے جو کچھ انہوں نے بک بک کی تھی اس پر تعجب کا اظہار ہو رہا ہے۔وہ ذات تو ہر چیز پر قادر ہے اس کے لئے اعادہ کونسی مشکل بات ہے۔والیه ترجعون میں قیامت کا اقرار کرنے والوں کے لئے وعدہ ہے اور منکرین قیامت کے لئے وعید ہے والیه ترجعون کا عطف بیدہ پر ہے۔معقل بن یسار سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے مردوں پر سورۂ یٰسین پڑھو۔اس حدیث کو امام احمد ابوداؤد ابن ماجہ ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ایک روایت میں اس طرح ہے کہ (سورہ) یٰسین قرآن کا دل ہے۔جو شخص رضا الٰہی اور آخرت کی بھلائی کے لئے تلاوت کرتا ہے اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔اس کو اپنے مردوں پر پڑھو(2) جزری نے یہی حدیث الحصن الحصین میں اسی طرح روایت کی ہے۔

حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰسین ہے۔جو شخص سورۂ یٰسین پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں دس مرتبہ پورے قرآن کی تلاوت کا ثواب لکھ دیتے ہیں(3)۔اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو ہر رات کو سورۂ یٰسین پڑھے گا اس کی بخشش ہو جائے گی۔اس حدیث کو بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رات کو سورۂ یٰسین تلاوت کرے گا وہ صبح کرے تو مغفور (بخش دیا گیا) ہوگا اس حدیث کو ابونعیم نے الحلیہ میں ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ایک مرتبہ سورۂ یٰسین پڑھی گویا اس نے دو مرتبہ پورا قرآن پڑھا۔

اس حدیث کو بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ایک مرتبہ سورۂ یٰسین پڑھی گویا اس نے دس مرتبہ قرآن پڑھا۔ اس حدیث کو بھی بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت فرمایا ہے' حضرت معقل بن یسار سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رضاالٰہی کے لئے سورۂ یٰسین پڑھی اس کے پہلے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے، تم اس کو اپنے مردوں پر پڑھو۔ اس حدیث کو بھی بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ طبرانی نے حضرت انس کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ جو ہمیشہ رات کو سورۂ یٰسین پڑھے گا وہ مرے گا تو شہید ہو کر مرے گا۔ دارمی اور طبرانی نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث روایت کی ہے کہ جو رضاالٰہی کے لئے سورۂ یٰسین تلاوت کرے گا اس کی بخشش کر دی جائے گی۔ دیلمی اور ابوالشیخ ابن حبان نے فضائل میں حضرت ابوذر کی حدیث روایت کی ہے جس مرنے والے پر سورۂ یٰسین پڑھی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرماتا ہے۔ محاملی نے امالی میں عبداللہ بن زبیر کی حدیث روایت فرمائی ہے کہ جو شخص اپنی کسی حاجت کے لئے سورۂ یٰسین پڑھے گا اس کی وہ حاجت پوری کر دی جائے گی۔ اس حدیث کی شاہد مرسل حدیث دارمی نے ذکر کی ہے۔ المستدرک میں ابو جعفر محمد بن علی سے مروی ہے، فرماتے ہیں جس کا دل سخت ہوا سے ایک پیالہ میں زعفران سے سورۂ یٰسین لکھ کر پینی چاہئے۔ ابن ضریس نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک پاگل شخص کے اوپر سورۂ یٰسین پڑھی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے بھی روایت کی ہے کہ جس نے سورۂ یٰسین صبح کے وقت تلاوت کی وہ شام تک خوش رہے گا اور جو شام کے وقت سورۂ یٰسین تلاوت کرے گا وہ صبح تک شادر ہے گا۔ جن لوگوں نے اس کا تجربہ کیا ہے انہوں نے بھی ایسا ہی بتایا ہے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی سید المرسلین

تفسیر مظہری سورۂ یٰسین کا ترجمہ وتفسیر 2 جنوری 2001ء بروز منگل بعد از نماز عشاء بوقت 9-45 (بمطابق چھ شوال 1421) مکمل ہوا۔ مالک الملک کی بارگاہ میں التجاء ہے کہ وہ سورۂ یٰسین کے ترجمہ اور تفسیر لکھنے کے طفیل میری کوتاہیوں پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے اور ہر نیک خواہش کو پورا فرمائے آمین۔

بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ و آلہ و صحبہ وسلم

والصافات

آیاتھا ۱۸۲ ﴿ سُورَۃُ الصّٰفّٰتِ مَکِّیَّۃٌ ۳۷ ﴿ رکوعاتھا ۵

سورۃ الصافات مکی ہے، اس میں ایک سو بیاسی آیات اور پانچ رکوع ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾

''قسم ہے (مقام نیاز میں) پرے باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی ۱؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے ان فرشتوں کی جو نمازیوں کی صفوں کی طرح مقام عبودیت میں صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس طرح صفیں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صفیں بنائے ہوئے ہیں۔ ہم نے عرض کی یارسول اللہ! فرشتے اپنے رب کے حضور کس طرح صف بستہ ہیں؟ فرمایا وہ صفوں کو مکمل کرتے ہیں اور صف کو ملا کر رکھتے ہیں (1)۔ اسی طرح ابن عباس، حسن اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان فرشتوں کی قسم اٹھائی جارہی ہے جو ہوا میں پر پھیلائے حکم الٰہی کے منتظر کھڑے ہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ پرندوں کی قسم اٹھائی جارہی ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے وَالطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ۔

فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا ۙ﴿۲﴾

''پھر خوب جھڑکنے والوں کی ۱؎''

۱؎ زاجرات سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بادل کو جھڑکتے ہیں اور اسے ہانکتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے وہ فرشتے مراد ہیں جو بھلائی کے الہام کے ذریعے لوگوں کو گناہوں سے روکتے ہیں یا وہ شیطانوں کو روکتے ہیں جو انسانوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے زواجر القرآن فرشتے مراد ہیں جو قرآن کی ہر قیامت سے حفاظت کرتے ہیں (2)۔

فَالتّٰلِیٰتِ ذِکۡرًا ۙ﴿۳﴾

''پھر قرآن کی تلاوت کرنے والوں کی ۱؎''

۱؎ اس سے مراد بھی وہ فرشتے ہیں جو ذکر الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ فرشتے مراد ہیں جو کتب سماویہ سے آیات کو انبیاء پر پڑھنے والے ہیں۔ ذکراً مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے یا التالیات کے معنی سے مصدر کی بناء پر منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ یا مذکورہ بالا تینوں قسمیں علماء کی اٹھائی جارہی ہیں جو نماز میں صفیں باندھے کھڑے ہوتے ہیں، اپنے پند و نصائح اور دلائل و براہین کے ذریعے کفر اور

اللہ کے راستہ میں صفیں باندھے کھڑے ہوتے ہیں، گھوڑوں اور دشمن کو جھڑکنے، روکنے اور ہانکنے والے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے ہوتے ہیں، ذکر الٰہی سے دشمن کی مبارزت بھی انہیں غافل نہیں کرتی اور ان کا عطف' ذوات یا صفات کے اختلاف کی بناء پر ہے۔ فا ترتیب وجودی کیلئے ہے کیونکہ صف بستہ ہونا کمال ہے اور زجر' برائی سے روکنے کی وجہ سے تکمیل ہے یا خیر کی طرف لے جانے کی وجہ سے تکمیل ہے اور تلاوت فیضان ہے یا فا ترتیب رتبہ کے لئے ہے جیسا کہ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں ہے۔ حمزہ نے تاء ات کو قریبی لفظ میں قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ادغام کیا ہے کیونکہ تاء زبان کی طرف اور اصول ثنایا سے ادا ہوتی ہے۔ ابو عمرو نے اپنی اصل پر ادغام کیا ہے (ابو عمرو دو قریب المخرج حروف کو ادغام کرتے ہیں، جب کہ حمزہ کے نزدیک اصلاً قریب المخرج حروف کا ادغام نہیں ہے)

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴

''کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے[1]''

[1] یہ جملہ کفار مکہ کا رد ہے جو یہ کہتے تھے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ (ترجمہ) کیا بنا دیا ہے اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا، بے شک یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝۵

''جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا جو کچھ ان کے درمیان ہے اور مالک ہے مشرقوں کا[1]''

[1] یہ سابقہ آیت میں اِنَّ کی دوسری خبر ہے یا مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے۔ اور مشارق سے مراد تمام ستاروں کے طلوع ہونے کی جگہیں اور اوقات ہیں یا مشارق سے مراد سورج کے طلوع ہونے کے مقامات اور اوقات ہیں کیونکہ سال میں ہر روز وہ نئے مطلع سے طلوع ہوتا ہے، اس طرح اس کی تین سو پینسٹھ مشرقیں بنیں گی۔ جس طرح سورج کے مشارق مختلف ہیں تو مغارب بھی اسی طرح مختلف ہوں گے۔ اسی وجہ سے ایک کے ذکر پر اکتفاء فرمایا۔ دوسری وجہ صرف مشرق کے ذکر کی یہ ہو سکتی ہے کہ طلوع ہونے میں قدرت الٰہی کا ظہور زیادہ نمایاں ہے اور یہ اظہار نعمت میں زیادہ بلیغ ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ ۝۶

''بلاشبہ ہم نے آراستہ کیا ہے آسمان دنیا کو ستاروں کے سنگھار سے۔[1]''

[1] دنیا کا معنی قریب ترین ہے۔ اس آیت میں غیوبت سے تکلم کی طرف التفات ہے۔ جمہور قراء نے بزینۃ الکواکب کو اضافت کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اضافت بیانیہ ہے، یعنی ہم نے آسمان دنیا کو سنگھار دیا۔ اور وہ سنگھار ستارے ہیں یا یہ مصدر کی مفعول کی طرف اضافت ہے، یعنی ہم نے ستاروں کو مزین کیا کیونکہ جس طرح زینۃ اللیقۃ کی طرح بطور اسم آتا ہے۔ اسی طرح نسبۃ کی طرح مصدر آتا ہے یا زینۃ مصدر فاعل کی طرف مضاف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ستارے اپنی تزیین کے ساتھ اور اپنی مختلف اشکال کے ساتھ آسمان کو مزین کرتے ہیں۔

... اور کواکب کو جر اس سے بدل کی حیثیت سے دی ہے، یعنی زینت سے

ہے(۱) یہ قرأت جمہور کی قرأت میں اضافت کے بیانیہ ہونے کی تائید کرتی ہے۔ابوبکر نے زینۃ کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور کواکب کو مفعولیت کی بناء پر نصب دی ہے۔ یہ قرأت مصدر کی مفعول کی طرف اضافت کی تائید کرتی ہے۔ یا کواکب، اعنی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے یا زینۃ کے محل سے بدل کی بناء پر منصوب ہے۔

وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۞

''اور (اسے) محفوظ کر دیا ہے ہر سرکش شیطان (کی رسائی) سے ؎''

؎ حِفْظًا مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی حفظنا ھا حفظاً یا معنی کے اعتبار سے زینۃ پر عطف کی بناء پر منصوب ہے گویا یوں ارشاد فرمایا کہ ہم نے ستاروں کو آسمان کے لئے زینت اور شیطانوں سے حفاظت کے لئے تخلیق فرمایا۔ مارد سرکش کو کہتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ تمام ستارے آسمان دنیا میں ہیں۔ امام بیضاوی کا یہ قول کہ ثوابت آٹھویں کرہ میں مرکوز ہیں اور باقی سیارے سوائے چاند کے چھ کروں میں ہیں۔ آسمان دنیا اور ان کروں کے درمیان واسطہ ہے (جب کہ یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ سب ستارے پہلے آسمان پر ہیں) تو پھر اس آیت اور علماء ہیئت کے قول میں تطبیق کیسے ہوگی) امام بیضاوی فرماتے ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ علماء ہیئت کی بات مستحق ہی نہیں ہے اگر تسلیم کر بھی لی جائے تو پھر بھی علماء کی بات اور اس آیت میں تضاد نہیں ہے کیونکہ زمین پر رہنے والے لوگ جب آسمان دنیا کی طرف دیکھتے ہیں تو انہیں آسمان کی نیلی چھت پر تمام جواہر مختلف شکلوں میں جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ پس لوگوں کی نسبت سے یہی آسمان مزین ہے(۱) علامہ ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں امام بیضاوی کی یہ تمام بحث فلاسفہ کی نظر کے جواز پر مبنی ہے۔ جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فلاسفہ کا یہ نظریہ کتاب وسنت اور اجماع کے خلاف ہے اور باطل ہے کیونکہ آسمانوں کا سات ہونا کتاب اللہ سے منصوص ہے۔ پس آٹھویں کرہ (آسمان) کا قول کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ آٹھویں کرہ کا کوئی اور نام رکھنا کچھ مفید نہیں جیسا کہ خمر کا کوئی دوسرا نام رکھا جائے تو وہ حلال نہیں ہوتا۔ آسمان دنیا پر تمام ستاروں کے ہونے کی دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ الدنیا کا لفظ آیت السماء کی صفت ہے اور صفت کا تقاضا یہ ہے کہ زینت آسمان دنیا کے ساتھ خاص ہے اگر یہ حصر نہ ہو تو آسمان کو دنیا کی صفت سے مقید کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ کا قول بھی اس بات کی تردید کرتا ہے کہ آسمان دنیا کے علاوہ کسی دوسرے آسمان میں بھی سیارے ہیں کیونکہ شیطانوں پر شہاب ثاقب آسمان دنیا سے ہی برستے ہیں شیطانوں کے لئے آسمان دنیا سے اوپر جانے کی کوئی راہ ہی نہیں ہے اور یہ کہنا کہ شہاب آٹھویں آسمان سے نکل کر ساتویں آسمان کو چیرتے ہوئے چوری چھپے باتیں سننے والے شیطان کو لگتا ہے۔ عقل اس قول کو تسلیم نہیں کرتی اور نہ نقل اس کی تائید اور تصدیق کرتی ہے۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۞

''نہیں سن سکتے کان لگا کر عالم بالا کی باتوں کو اور پتھراؤ کیا جاتا ہے ان پر ہر طرف سے ؎''

؎ حفص، حمزہ اور کسائی نے سین اور میم کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کی اصل یتسمعون ہے، تاء کو سین میں ادغام کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سننا چاہتے ہیں، اس میں سماع کی نفی میں مبالغہ ہے۔ باقی قراء نے سین کے سکون اور میم کی تخفیف سے پڑھا ہے۔ مستقل کلام ہے...

مارد کی صفت بنانا جائز نہیں۔ کیونکہ پھر یہ مفہوم ہو جائے گا کہ جو شیطان نہیں سنتے ان سے حفاظت کے لئے ستاروں کو پیدا فرمایا ہے۔ اسی طرح اس جملہ کو لام کے حذف کی بناء پر حفظاً کی علت بنانا بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ جنتک ان تکرمنی میں ہے۔ یعنی اصل میں لئلا یسمعون تھا۔ پہلے لام حذف کیا پھر ان کو بھی حذف کیا گیا اور اس کے عمل کو بھی ختم کیا گیا کیونکہ ان دونوں حذفوں کا اجتماع ناپسندیدہ ہے۔ الی الملاء الاعلیٰ جار مجرور لا یسمعون کے متعلق ہے۔ اسماع کی نفی میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے اس میں اصغاء کا معنی متضمن فرمایا ہے نیز جس چیز سے انہیں روکا گیا ہے اس کی ہولنا کی بیان کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ملاء اعلیٰ سے مراد فرشتے ہیں۔ یا وہ بلند مرتبہ فرشتے ہیں جن کے سپرد عالم بالا کے تمام امور اور معاملات ہیں۔ یقذفون کا عطف لا یسمعون پر ہے۔ یعنی جب وہ شیطان عالم بالا میں ٹھہرنے یا وہاں کی باتوں کو سننے کا قصد کرتے ہیں تو ان پر آسمان دنیا کی افقوں سے شہاب ثاقب برستے ہیں۔

دُحُوۡرًا وَّلَهُمۡ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ﴿۹﴾

”ان کو بھگانے کے لئے اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے [1]“

[1] دُحُوۡرًا مصدر ہے۔ اور یقذفون کے مصدر مؤکد کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ قذف اور دحور قریب المعنی ہیں یا مدحورین کے معنی میں حال کی بناء پر منصوب ہے یا حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب ہے اور دحور سے مراد وہ شی ہے جس کے ساتھ کسی کو بھگایا جائے۔ عَذَابٌ وَّاصِبٌ سے مراد آخرت کا دائمی عذاب ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں دنیا میں ان کے لئے دائمی عذاب یہ ہے کہ وہ نفخہ اولی تک آگ میں جلتے رہیں گے۔

اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾

”مگر جو شیطان کچھ جھپٹ لینا چاہتا ہے تو تعاقب کرتا ہے اس کا تیز شعلہ [1]“

[1] لا یسمعون کے فاعل سے استثناء ہے۔ اور مَنۡ اس سے بدل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں استثناء منقطع ہے۔ الخطفہ کا معنی سرعت سے کسی چیز کا اچک لینا ہے۔ یعنی جو ملائکہ کی کلام سے چوری چھپے کچھ لینا چاہتا ہے چونکہ کلام کا ذکر سماع کی نفی میں ضمناً ہو چکا ہے اسی وجہ سے الخطفہ پر الف لام عہد خارجی ذکر فرمایا۔ اتبع بمعنی تبع ہے۔ شہاب سے مراد وہ شعلہ ہے جو ٹوٹا ہوا ستارہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ شعلہ ستارہ سے نکلتا ہے جو چوری چھپے سننے والے شیطانوں پر مارا جاتا ہے۔

حقیقت اس طرح نہیں ہے جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ شہاب ایک بخار ہے جو طبقات ھواء میں سے طبقہ علیا کی طرف سے بلند ہوتا ہے جو کرہ نار کے ساتھ ملاصق ہے تو وہ بخار مشتعل (روشن) ہو جاتا ہے یہ قول ظن و تخمین پر مبنی ہے اور یہ باطل ہے وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡـًٔا﴿۲۸﴾ (ترجمہ) اور ظن حق کے مقابلہ میں کسی کام نہیں آ سکتا۔

یہ فلاسفہ کے اس نظریہ کی طرح ہے جو وہ بارش کے متعلق تجویز کرتے ہیں کہ زمین سے بخارات اٹھتے ہیں پھر وہ ہوا کے کرہ زمہریر میں پہنچ کر منجمد ہو جاتے ہیں اور بادل بن جاتے ہیں پھر جب انہیں سورج کی حرارت پہنچتی ہے تو پگھل کر بارش کے قطرات کی صورت میں

بارشیں برستی رہتی ہیں، جب کہ اس موسم میں بخارات کا چڑھنا نہیں پایا جاتا۔ اگر بات اس طرح ہوتی تو کبھی بادل سارے کا سارا پگھل جاتا اور پھر کبھی دکھائی نہ دیتا۔ اسی طرح بخارات تو ہر وقت بلند ہوتے رہتے ہیں لیکن شہاب کسی وقت دکھائی دیتے ہیں۔ اگر بخارات سے شہاب بنتے تو ہمیشہ دکھائی دینے چاہئیں۔ فلاسفہ کے یہ تمام اقوال اور نظریات کتاب وسنت کے مخالف ہیں اور باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (ترجمہ) اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی۔ ایک اور مقام پر فرمایا وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ (ترجمہ) اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ الْکَوَاکِبِ ۝ (الی قولہ) شہاب ثاقب۔

امام بخاری نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تاروں کو تین وجود کے لئے پیدا فرمایا ہے (1) آسمان کی تزیین کے لئے (2) شیطانوں کو مارنے کے لئے (3) راہنمائی حاصل کرنے کے لئے بطور علامت بنانے کے لئے۔ جس نے ان کے علاوہ کوئی اور تاویل بیان کی ہے اس نے خطا اور غلطی کی ہے اور اس نے بغیر علم کے گفتگو کی ہے (1)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ کسی کام کا آسمان میں فیصلہ فرماتا ہے تو ملائکہ اس کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں یوں لگتا ہے گویا کسی چٹان پر زنجیر لگ رہی ہے پھر جب ملائکہ کے دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو پوچھتے ہیں کیا کہا تمہارے رب نے۔ دوسرے کہتے ہیں اس کا فرمان حق ہے وہی بلند و بالا اور عظمت والا ہے فرشتوں کی اس گفتگو کو چوری چھپے سننے والے (جن) سن لیتے ہیں پھر ان سے اسی طرح دوسرے چوری چھپے سننے والے (جن) سنتے ہیں۔ یہ جن ایک دوسرے کے اوپر نیچے قطار میں ہیں (2) (سفیان نے اپنا ہاتھ ترچھا کر کے انگلیوں کو کشادہ کر کے اشارہ فرمایا کہ شیطان اس طرح اوپر نیچے ہیں جیسے انگلیاں اوپر نیچے ہیں) اور پر والے سن کے نیچے والوں کو بتاتے ہیں پھر وہ اپنے سے نیچے والوں کو بتاتے ہیں حتیٰ کہ یہ بات جادوگر یا کاہن کی زبان پر پہنچ جاتی ہے۔ اکثر شیطانوں کی بات کو آگے پہنچانے سے پہلے شہاب ثاقب پہنچ جاتا ہے اور اس کا کام تمام کر دیتا ہے۔ بعض اوقات شیطان شہاب کے پہنچنے سے پہلے بات نیچے والوں کو پہنچا دیتا ہے پھر وہ سننے والا اس بات کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر بیان کرتا ہے پھر لوگ کہتے ہیں فلاں کاہن اور جادوگر نے ہمیں فلاں دن ایسا ایسا کہا نہیں تھا؟ پس اس ایک بات کی وجہ سے جو اس نے آسمان کی طرف سے سنی تھی اس کی تصدیق کی جاتی ہے یعنی اسے سچا سمجھا جاتا ہے (3)۔

مسلم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ہمارا پروردگار جس کا نام بڑا بابرکت ہے جب کوئی حکم فرماتا ہے تو حاملین عرش اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں پھر ان کے قریب آسمان دنیا والے تسبیح بیان کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ تسبیح آسمان دنیا کے فرشتے کرتے ہیں پھر حاملین عرش کے قریب والے فرشتے حاملین عرش سے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کا حکم سناتے ہیں پھر ہر آسمان والے اپنے اوپر والے آسمان کے فرشتوں سے پوچھتے ہیں حتیٰ کہ یہ سلسلہ آسمان دنیا کے فرشتوں تک پہنچتا ہے۔ پس جن چوری چھپے اس بات کو سن لیتے ہیں پھر وہ اپنے دوستوں (کاہنوں) کو پہنچاتے ہیں۔ پس وہ جو کچھ سن کر لائے ہیں وہ تو حق ہے لیکن وہ اس میں جھوٹ کی ملاوٹ کرتے ہیں اور بات میں اضافہ کرتے ہیں۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا

ہے کہ ملائکہ عنان میں اترتے ہیں۔ عنان سے مراد بادل ہے اور اس بات کا ذکر کرتے ہیں جو آسمان میں ہو چکی ہوتی ہے۔ شیطان وہ بات چوری چھپے سنتے ہیں اور کاہنوں کو پہنچاتے ہیں۔ وہ اس بات کے ساتھ اپنی طرف سے سو جھوٹ ملاتے ہیں(1)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اس میں اختلاف ہے کہ جس شیطان کو شہاب لگتا ہے وہ اذیت اٹھا کر واپس آ جاتا ہے یا جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ لیکن اوپر جانے والے شیطان کو کبھی شہاب لگ جاتا ہے لیکن کبھی (وہ فرشتوں کی جگہ بھاگ جاتا ہے جس کی وجہ سے) شہاب اسے نہیں لگتا جیسا کہ کشتی پر سوار کی طرف موجیں بلند ہوتی ہیں کبھی اسے غرق کر دیتی ہیں اور کبھی موجیں کشتی سے ٹکرا کر واپس آ جاتی ہیں۔ اسی لئے لوگ کشتیوں میں سفر کرنے سے بالکل اجتناب نہیں کرتے۔ اسی طرح جن بعض اوقات شہاب کی چوٹ سے بچ نکلتے ہیں۔ اس لئے ایسی حرکتوں سے باز نہیں آتے(2)۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ⑪

"پس آپ ان سے پوچھئے آیا وہ زیادہ مضبوط ہیں خلقت کے اعتبار سے یا (دوسری چیزیں) جنہیں ہم نے پیدا فرمایا[1]
بے شک ہم نے پیدا کیا ہے انہیں لیسدار کیچڑ سے[2]"

[1] استفتھم میں ضمیر منصوب کا مرجع مشرکین مکہ ہیں اور من خلقنا سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے مثلاً آسمان، زمین اور ان کے درمیان موجود مخلوق، مشارق، مغارب، ستارے اور شہاب ثاقب۔ عقلاء کو غلبہ دیتے ہوئے مَنْ ذکر فرمایا۔ یہاں استفہام تقریری ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ام مَن خلقنا سے مراد گذشتہ قومیں ہیں مثلاً قوم عاد، ثمود، یعنی ان کے علاوہ جو ہم نے گذشتہ قومیں پیدا کیں جنہیں ہم نے ان کے کرتوتوں کے باعث ہلاک کر دیا۔ وہ ازروئے خلقت مضبوط تھے یا تم مضبوط اور طاقتور ہو۔ ہم نے انہیں جب حشمت و ثروت، رعب و دبدبہ کے باوجود تہس نہس کر دیا (تو تم کس باغ کی مولی ہو) تم کیوں ہمارے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہو۔ پہلی تاویل اانتم اشد خلقاً ام السماء کے قول کے مطابق ہے۔ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ کا ارشاد بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ام من خلقنا سے مراد کوئی مخصوص قوم اور چیز نہیں بلکہ عام مخلوق ہے۔

[2] طِيْنٍ لَّازِبٍ ہاتھ سے چمٹ جانے والی مٹی۔ مجاہد اور ضحاک نے لازب کا معنی بدبودار کیا ہے(3) انسانوں کی تخلیق اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں یہی چیز تفریق کرنے والی ہے کیونکہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق بغیر کسی سابق مادہ کے ہوئی ہے، جب کہ حضرت انسان کی تخلیق سے پہلے اس کا مادہ مٹی اور پانی موجود تھا، اس سے اس کا جسم تیار کیا گیا۔ اس جملہ میں ایک سوال موجود ہے جو عم یتساءلون کے بعد عن النباء العظیم کے ذکر کے طریقہ پر ہے۔ اس کلام سے مقصود منکرین قیامت کا رد ہے کیونکہ انسان کی تخلیق کا لیسدار مٹی سے ہونا اس کے ضعف پر بہت بڑی گواہی ہے کیونکہ جس کی تخلیق مٹی سے ہو اس میں اتنی صلابت اور قوت نہیں ہو سکتی پس جو ذات آسمانوں اور دوسری بڑی تخلیقات پر قادر ہے وہ یقیناً اس چیز پر بھی قادر ہوگی جو آسمانوں اور دوسری بڑی اشیاء کے مقابلہ میں حقیر اور بے وقعت ہے۔ اس آیت سے کفار کے قول ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (کیا جب ہم (مر کر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے (دوبارہ) پیدا کیا جائیگا) کا رد فرمایا ہے کہ پہلے جب ان کی تخلیق لیسدار مٹی سے ہوئی ہے تو پھر یہ دوبارہ مٹی [illegible] انسان کے مرنے کے بعد

مٹی اور پانی دونوں باقی بھی ہوں گے اور ان میں آپس میں ملنے کی قابلیت بھی ہوگی اور جو اس سے انسان کو تخلیق فرمانے والا ہے اس کی قدرت میں کوئی تغیر و تبدیلی بھی جائز نہیں تو پھر دوبارہ زندہ کرنا کیسے محال اور یہ (عقل کے دشمن) کیسے قیامت کا انکار کرتے ہیں۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾

''آپ تو اظہار تعجب کرتے ہیں (قدرت کے کرشمے دیکھ کر) اور وہ تمسخر اڑاتے ہیں ۱؎''

۱؎ بل اضراب کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف منتقل ہونے کے لئے ابتدائیہ ہے۔ عجب اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو انہونی چیز دیکھنے کے وقت لاحق ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو عجبت کے فعل کے ساتھ اور تعجب کے صیغہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے عَجِبَ رَبُّكَ مِنْ قَوْمٍ يُسَاقُوْنَ اِلَى الْجَنَّةِ فِي السَّلَاسِلِ (۱) اسی طرح سبحانہ ما اعظم شانہ کا ارشاد ہے۔ اسی طرح عجب کا اطلاق اس شی پر بھی ہوتا ہے جس کی مثال معہود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ (ترجمہ) کیا (یہ بات) لوگوں کے لئے باعث تعجب ہے کہ ہم نے وحی بھیجی ایک مرد (کامل) پر جو ان میں سے ہے۔ اکثر عجب کا لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب انسان کسی چیز کو انتہائی حسین اور خوبصورت دیکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے اعجبنی کذا اس مفہوم میں یہ ارشاد الٰہی بھی ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ (ترجمہ) اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے عَجِبَ رَبُّكُمْ مِنْ شَابٍّ لَيْسَتْ لَهٗ صَبْوَةٌ۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے عَجِبَ رَبُّكُمْ مِنَ الكُمِّ وَقُنُوْطِكُمْ۔

کبھی انتہائی بری چیز دیکھنے کے وقت بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً عرب کہتے ہیں عَجِبْتُ مِنْ بُخْلِكَ وَ شُرْهِكَ مجھے تیرا بخل اور لالچ انتہائی برا لگا۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

شَيْئَانِ عَجِيْبَانِ هُمَا اَبْرَدُ مِنْ يَخٍ شَيْخٌ يَتَصَبّٰى وَصَبِيٌّ يَتَشَيَّخُ

دو چیزیں بہت بری لگتی ہیں دونوں برف سے زیادہ ٹھنڈی ہیں بوڑھے کا بچہ بننا اور بچے کا بوڑھا بننا۔

تعجب کا صیغہ اس وقت بھی استعمال کیا جاتا ہے جب انسان کسی چیز کو بہت زیادہ دیکھتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے ما اکرمہ، وما اطفاہ وما اشد استخراجہ وما اجہلہ وما اشد بیاضہ، یعنی وہ کتنا کریم ہے وہ کتنا تیز رفتار ہے۔ اس کا نکالنا کتنا سخت ہے وہ کتنا جاہل ہے، اس کی سفیدی کتنی زیادہ ہے، بعض علماء فرماتے ہیں عجب ایسی حالت ہے جو انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے، جب کہ وہ کسی شی کے سبب سے ناواقف ہو، اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر عجب کا اطلاق درست نہیں کیونکہ اس کا علم تو ہر چیز کو محیط ہے (وہ سب کو جانتا ہے) بعض علماء فرماتے ہیں عجب وہ حالت ہے جو انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب وہ کسی چیز کو بہت بڑا اور عظیم سمجھتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان دونوں تفسیروں کا مآل بھی وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کیونکہ انسان اسی چیز کو عظیم سمجھتا ہے جس کی مثل پہلے نہ دیکھی ہو اور انسان غیر معہود چیز کے سبب سے ناآشنا ہوتا ہے۔ پس حمزہ اور کسائی کی قرأت میں ظاہر سے پھیرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عجبت متکلم کا صیغہ ہو تو امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عجب علی سبیل فرض اور تخییل ہوگا یا علی الاستعظام

جس کا سبب انسان کو معلوم نہ ہو اس کو دیکھ کر جو انسان کو کیفیت لاحق ہوتی ہے اسے عجب کہتے ہیں۔ پس انسان اس چیز کو بڑا سمجھتا ہے جو حد قیاس سے خارج ہوتی ہے) بعض علماء فرماتے ہیں اس سے پہلے قول مقدر ہے، یعنی قل یا محمد عجبتُ (اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرمایئے میں تعجب کرتا ہوں) علامہ بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عجب کا مطلب اس کا انکار کرنا اور کسی چیز کی بڑائی بیان کرنا ہوتا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکار اور مذمت کے لئے ہوتا ہے جیسے اس آیت کریمہ میں ہے۔ کبھی استحسان کے معنی میں ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے عَجِبَ رَبُّكُمْ مِنْ شَابٍّ لَيْسَتْ لَهُ صَبْوَةٌ۔

حضرت جنیدؒ (بغدادیؒ) سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی چیز سے تعجب نہیں فرماتا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت فرماتا ہے فرمایا وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ یعنی واقعی اس طرح ہے جیسا آپ کہتے ہیں۔ جمہور قراء نے عجبت مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں حالانکہ یہ آپ کے امین اور صادق ہونے کے معترف بھی ہیں اور معجزات آپ کی صداقت کے گواہ بھی ہیں، قرآن کے معجزہ ہونے کے بھی اقراری ہیں یا یہ معنی کہ آپ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی دوبارہ اٹھانے کی قدرت کا انکار کرتے ہیں حالانکہ اس کی قدرت ہر چیز میں نمایاں ہے کیونکہ آپ کے لئے یہ امر معہود نہیں تھا اس لئے آپ تعجب کرتے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر تعجب کرتے کہ قرآن نازل ہو چکا ہے اور اس کے بعد بھی انسان گمراہ ہو رہے ہیں۔ اس تعجب کی وجہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال یہ تھا کہ جو قرآن سنے گا وہ اس پر ایمان لے آئے گا۔ مشرکین نے جب قرآن کی آیات سنیں تو وہ مذاق اڑانے لگے اور اس پر ایمان نہ لائے۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا اے محبوب آپ تعجب کرتے ہیں اور یہ گستاخ مذاق اڑا رہے ہیں۔ یسخرون ھم مبتدا مقدر کے ساتھ عجبت کے فاعل سے حال ہے، یعنی وہ آپ کے تعجب کرنے کا مذاق کرتے ہیں اور آپ دوبارہ اٹھنے کو ثابت کرتے ہیں اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ ﴿۱۳﴾

''اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت قبول نہیں کرتے [1]''

[1] جب ان کے سامنے حشر کی صحت پر دلالت کرنے والے دلائل بیان کئے جاتے ہیں تو اپنی کندذھنی اور قلت تدبر کے باعث ان دلائل سے نفع حاصل نہیں کرتے۔

وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ ﴿۱۴﴾

''اور جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق کرنے لگتے ہیں [1]''

[1] یعنی جب رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق کرنے میں انتہا کر دیتے ہیں یا یہ معنی کہ وہ ایک دوسرے کو بلاتے ہیں کہ اس معجزہ کا تمسخر اڑائیں۔ ابن عباس اور مقاتل فرماتے ہیں ایۃ (معجزہ) سے مراد انشقاق القمر (چاند کا

۱؎ یعنی جو وہ معجزہ دیکھتے اسے کھلا جادو کہہ کر رد کر دیتے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾

''کیا جب ہم مر جائیں گے اور (مر کر) مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے (تو) کیا ہم زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے ۱؎ ''

۱؎ متنا کو نافع، حمزہ اور کسائی نے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَئنالمبعوثون اصل میں اَنُبْعَثُ اِذَمِتْنَا تھا۔ پھر کلام میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے جملہ فعلیہ کو اس میں سے بدل دیا گیا اور ظرف کو مقدم کیا گیا اور ہمزہ کو مکرر لایا گیا نیز اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ دوبارہ اٹھنا ویسے بھی عجیب ہے لیکن مٹی اور ہڈیاں ہو جانے کے بعد زندہ ہونا تو مزید عجیب تر اور محال ہے۔ یہ قرأت ابن عامر کی قرأت سے زیادہ بلیغ ہے جس میں پہلے حمزہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ نافع، کسائی اور یعقوب کی قرأت سے بھی زیادہ بلیغ ہے جس میں دوسرے ہمزہ کو ساقط کر دیا گیا ہے۔

اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾

''اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی ۱؎ ''

۱؎ اس کا عطف اِنَّ کے اسم کے محل پر ہے۔ یا مبعوثون کی ضمیر پر ہے۔ کیونکہ اَوَ اٰبَآؤُنَا ہمزہ کی وجہ سے مبعوثون سے جدا ہے۔ (اگر درمیان میں ہمزہ نہ ہوتا تو ضمیر مرفوع متصل پر بغیر تاکید کے عطف کرنا جائز نہ ہوتا) اور استفہام اس بات کے انکار کے لئے ہے کہ ان کو اور ان کے اگلے باپ دادا کو اکٹھا دوبارہ اٹھایا جائے گا، اتنا زمانہ گذرنے کے بعد تو مزید عجیب اور محال ہے۔ نافع اور ابن عامر نے (او) کی واو کو تردید کے معنی پر ساکن کر کے پڑھا ہے۔ اس قرأت پر عطف جائز نہیں ہے۔

قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

''فرمائیے! ہاں (ضرور) اس حال میں کہ تم ذلیل وخوار ہو گے ۱؎ ''

۱؎ یعنی تمہیں اور تمہارے آباء واجداد کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ کسائی نے نعَمْ کو نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی اس میں ایک لغت ہے۔ وانتم داخرون، مقدر فعل کے فاعل سے حال ہے، دخور کا معنی انتہائی ذلیل وخوار ہونا ہے۔

فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ یَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾

''پس قیامت تو فقط ایک جھڑکی ہو گی پس وہ (اٹھ کر ادھر ادھر) دیکھنے لگیں گے ۱؎ ''

۱؎ فَاِنَّمَا الخ یہ مقدر شرط کا جواب ہے، یعنی جب قیامت قائم ہو گی تو یہ ایک جھڑکی ہو گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ھی ضمیر مبہم ہے۔ اور اس کی وضاحت اس کی خبر زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ کر رہی ہے۔ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ سے مراد نفخہ ثانیہ ہے۔ زجر کا معنی دھتکارنا اور سخت آواز سے کسی کو منع کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں زجر الراعی غنمه، یعنی چرواہے نے بکریوں کو واپس آنے کے لئے آواز دی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابتدائی تخلیق کے وقت کُن کا امر فرمایا تھا اسی طرح دوبارہ زندہ کرنے کے لئے بھی کن کا ارشاد ہو گا اور سب اگلے پچھلے اٹھ

وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿٢٠﴾

''اور کہیں گے ہم برباد ہو گئے! یہ تو یوم جزاء ہے [1]''

[1] لفظ ''یا'' تنبیہ کیلئے ہے۔ ویل مصدر ہے جس کا لفظاً کوئی فعل نہیں ہے۔ قالوا کا عطف ینظرون پر ہے اور قالوا یقولون کے معنی میں ہے۔ یَوْمُ الدِّیْنِ سے مراد یوم جزاء ہے، یعنی اس میں ہمارے اعمال کی سزا دی جائے گی۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢١﴾

''(ہاں ہاں) یہی فیصلہ کا دن ہے جس (کی آمد) کو تم جھٹلایا کرتے تھے [1]''

[1] یعنی یہ وہ دن ہے جس میں نیکوکار اور مجرم کے درمیان فرق کیا جائے گا یا یہ فیصلہ کا دن ہے اس میں اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ملائکہ کا جواب ہے۔ منکرین قیامت کی کلام یَوْمُ الدِّیْنِ پر مکمل ہو چکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کلام بھی منکرین کا ہے جو وہ ایک دوسرے سے کریں گے۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿٢٢﴾

''(اے فرشتو) جمع کرو جنہوں نے ظلم کیا تھا اور ان کے ساتھیوں کو اور جن کی یہ عبادت کیا کرتے تھے [1]''

[1] ظَلَمُوْا سے مراد اشرکوا ہے، یعنی جنہوں نے شرک کیا کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے، یعنی فرشتوں کو حکم ہو گا کہ مشرکوں اور ان کے ہم مشربوں اور ان کے پیروکاروں اور ان کے معبودان باطلہ سب کو میدان حشر میں حساب و جزاء کے لئے جمع کرو۔ علامہ بیہقی نے نعمان بن بشیر کے طریق سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے حضرت عمر بن الخطاب کو یہ فرماتے سنا ہے اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ سودخور سودخوروں کے ساتھ جمع کئے جائیں گے' بدکار بدکاروں کے ساتھ ہوں گے' اور شراب خور شرابیوں کے گروہ میں ہوں گے۔ جنت میں بھی ہم مشرب لوگ اکٹھے ہوں گے اور دوزخ میں بھی ایک جیسے کرتوتوں کے حامل لوگ جمع ہوں گے (1)۔ بیہقی نے ابن عباس سے ازواجھم کا معنی اشباھم نقل کیا ہے۔ جس کا مطلب ان کے مشابہ لوگ ہیں۔ قتادہ اور کلبی فرماتے ہیں ازابهم سے مراد یہ ہے کہ جو ان کی مثل عمل کرتے تھے پس شرابی' شرابیوں کے' سودخور' سودخوروں کے ساتھ ہوں گے۔ ضحاک فرماتے ہیں اس سے مراد شیطان دوست ہیں' ہر کافر اپنے شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہوگا۔ الحسن فرماتے ہیں ازواجھم سے مراد ان کی شرک کرنے والی بیویاں ہیں (2)۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿٢٣﴾

''اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پس سیدھا لے چلو انہیں جہنم کی راہ کی طرف۔ [1]''

[1] یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن بتوں کی عبادت کرتے تھے مقاتل نے مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد شیطان لیا ہے۔ اور بطور دلیل یہ ارشاد پیش کیا ہے اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اور فرماتے ہیں (3)۔ لفظ مخصوص ہے عام نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

تھی۔ (مثلاً عبادت تو عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یہودی عزیر علیہ السلام کی کرتے تھے لیکن ان کے لئے یہ حکم نہیں ہے بلکہ من دون اللہ سے مراد شیطان ہے) ابن عباس فرماتے ہیں فَاهْدُوْهُمْ کا مطلب یہ ہے کہ ان خبیثوں کی دوزخ کی طرف راہنمائی کرو! ابن کیسان فرماتے ہیں انہیں دوزخ کی طرف لے جاؤ۔ عرب سائق (پیچھے سے ہانکنے والا) کو بھی ہادی کہتے ہیں (1)۔

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اور (اب ذرا) روک لو انہیں ان سے باز پرس کی جائے گی لہ''

لہ مفسرین فرماتے ہیں جب مشرکوں کو دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا تو پل صراط کے پاس انہیں روک لیا جائے گا، ارشاد ہوگا انہیں روک لو ان سے باز پرس کی جائے گی۔ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ کا جملہ قفوا کی علت ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں مشرکوں سے ان کے افعال و اقوال سب کے متعلق باز پرس ہوگی۔ ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ ان سے لا الٰہ الا اللّٰہ کے متعلق سوال ہوگا (2)۔ مسلم نے ابو برزہ اسلمی سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کے پاؤں پل صراط سے جدا نہ ہوں گے حتی کہ چار چیزوں کے متعلق اس سے باز پرس کر لی جائے گی۔ 1۔ عمر کے متعلق سوال ہوگا کہ کن مشاغل میں بسر کی۔ 2۔ جسم کے متعلق سوال ہوگا کہ کس کام میں اسے کمزور کیا۔ 3۔ علم کے متعلق سوال ہوگا کہ اس پر کتنا عمل کیا۔ 4۔ مال کے متعلق سوال ہوگا کہ کہاں سے مال کمایا اور پھر کس مقصد میں اسے خرچ کیا (3)۔

ترمذی، اور ابن مردویہ نے اسی کی مثل حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کی ہے۔ طبرانی نے حضرت معاذ بن جبل، ابو درداء اور ابن عباس سے روایت کی ہے۔ ابن المبارک نے الزھد میں ابوالدرداء سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھے سب سے زیادہ خوف اس بات کا ہے جب حساب ہوگا تو مجھ سے پوچھا جائے گا جو تیرے پاس علم تھا اس پر کتنا عمل کیا (4) امام احمد نے الزھد میں ابوالدرداء سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے روز جو سوال ہوگا وہ یہ ہوگا کہ جو تجھے علم تھا اس پر عمل کتنا کیا۔

ابن ابی حاتم نے ابقع بن عبداللہ الکلاعی سے روایت کیا ہے کہ جہنم کے سات پل ہیں، ان پر پل صراط ہے، پہلے پل کے پاس لوگوں کو روکا جائے گا ارشاد ہوگا ان کو روک لو، ان سے باز پرس کی جائے گی پس پہلے نماز کے متعلق محاسبہ ہوگا اور نماز کے متعلق پوچھا جائے گا، پس جو ہلاک ہوگا وہ ہلاک ہو جائے گا اور جو نجات پائے گا۔ وہ نجات پا جائے گا جب دوسرے پل کے قریب پہنچیں گے تو امانت کے متعلق محاسبہ ہوگا کہ کیسے اسے ادا کیا اور کیسے اس میں خیانت کی پس جو ہلاک ہوگا وہ ہلاک ہوگا اور جو نجات پائے گا وہ نجات پائے گا۔ جب تیسرے پل پر پہنچیں گے تو رشتہ درای کے متعلق سوال ہوگا کہ رشتہ داری کو کیسے قائم رکھا اور کیسے اسے توڑا، پس ہلاک ہو گا جو ہلاک ہوگا اور نجات پائے گا۔ جو نجات پائے گا اس دن رحم (رشتہ قرابت) ہوا میں معلق ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرے گا اے اللہ جس نے مجھے ملائے رکھا (آج) تو بھی اسے ملا اور جس نے (دنیا میں) مجھے توڑا (آج) تو بھی اسے توڑ دے)

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾

''تمہیں کیا ہو گیا تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے لہ''

لہ اُن کو یہ ارشاد توبیخ کرنے کے لئے ہوگا کہ دنیا میں تو تم سب مجرم ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے آج مدد کیوں نہیں کرتے اس حکم سے مقصود ان کا استہزاء اور ان کا عجز ظاہر کرنا ہوگا۔

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿٢٦﴾

''بلکہ آج تو وہ سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں لہ''

لہ ابن عباس فرماتے ہیں مُسْتَسْلِمُوْنَ کا معنی خاضعون (سر جھکائے ہوئے) ہے۔ حسن فرماتے ہیں منقادون (فرمانبرداری کرنے والے) ہے عرب کہتے ہیں استسلم شیءٌ جب کوئی اطاعت کرے اور سر جھکا دے (1)۔

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٧﴾

''اور متوجہ ہوں گے ایک دوسرے کی طرف (اور) سوال جواب کریں گے لہ''

لہ گمراہ سردار اور گمراہ پیروکار' یا کفار اور ان کے شیطان دوست ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال جواب کریں گے یَتَسَآءَلُوْنَ اقبل کے فاعل اور مفعول سے حال ہے۔ یعنی ایک دوسرے کو جھڑکنے کے لئے سوال کریں گے۔ اسی وجہ سے یَتَسَآءَلُوْنَ کی تفسیر ملامت کرنے اور جھگڑنے سے بھی کی گئی ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ ﴿٢٨﴾

''(پیروکار سرداروں سے) کہیں گے کہ تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس بڑے کرّ وفرّ سے (اور ہمیں کفر پر مجبور کرتے تھے) لہ''

لہ الیمین سے مراد قوی ترین دلائل ہیں یا دین ہے' یا خیر و بھلائی ہے۔ اسی طرح ضحاک اور مجاہد فرماتے ہیں یہ یمین الانسان سے مستعار ہے' یعنی انسان کی دائیں طرف جو دونوں طرفوں میں سے قوی' اشرف اور انفع طرف ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے دائیں طرف کو یمین کہا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الیمین سے مراد قسم ہے' یعنی تم قسمیں اٹھا کر کہتے تھے کہ ہم جو دین تم پر پیش کرتے اور جس کی دعوت ہم دیتے ہیں وہی حق ہے۔ بعض علماء نے اس کا معنی قوت اور قہر کیا ہے' یعنی تم ہمیں گمراہی پر مجبور کرتے تھے۔ یہ جملہ اور بعد والا جملہ باہم سوال و جواب کا بیان ہے۔

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿٢٩﴾

''وہ جواب دیں گے بلکہ تم ایمان ہی کب لائے تھے (کہ ہم نے تم کو گمراہ کر دیا) لہ''

لہ رؤسا یا شیاطین کہیں گے ہم نے تمہیں گمراہ نہیں کیا بلکہ تم نے اپنے اختیار سے کفر اور گمراہی کو اختیار کیا تھا۔

وَ مَا كَانَ لَنَا عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِیْنَ ﴿٣٠﴾

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ إِنَّا لَذَآئِقُونَ ﴿۳۱﴾

''پس لازم ہو گیا ہم سب پر اپنے رب کا حکم اب (خوامخواہ) ہم عذاب کو چکھنے والے ہیں ۱؎ ''

۱؎ اس کلام کا عطف محذوف کلام پر ہے جو سابق کلام سے مفہوم ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی کُنْتُمْ قَوْماً طَاغِیْنَ کَمَا کُنَّا طَاغِیْنَ فَحَقَّ عَلَیْنَا جَمِیْعاً۔ یعنی تم بھی اپنے رب کے نافرمان تھے جیسے ہم نافرمان اور سرکش تھے پس ہم سب پر ہمارے رب کا حکم واجب و لازم ہو چکا ہے۔ قول ربنا سے مراد یہ ارشاد ہے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (ترجمہ) کہ میں ضرور بھروں گا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے۔

فَأَغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ ﴿۳۲﴾

''پس ہم نے تم کو بھی گمراہ کیا' ہم خود بھی گمراہ تھے ۱؎ ''

۱؎ یعنی دونوں گمراہوں کا گمراہ ہونا اور عذاب میں مبتلا ہونا ایسا امر ہے جس کا فیصلہ ازل سے ہو چکا ہے۔ ہم نے تو صرف یہی کیا کہ تمہیں بھی اس گمراہی کی طرف بلایا جس میں ہم خود گرفتار تھے' ہماری تو یہی خواہش تھی کہ تم بھی ہماری طرح گمراہ ہو جاؤ۔

فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿۳۳﴾

''پس وہ (سب) اس روز عذاب میں حصہ دار ہوں گے ۱؎ ''

۱؎ فاء سببیت کیلئے ہے۔ یعنی جب رؤسا' متبعین کفار اور ان کے ساتھی سب جب گمراہ تھے تو آج سب عذاب میں حصہ دار ہوں گے۔

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿۳۴﴾

''ہم اسی طرح سلوک کرتے ہیں مجرموں کے ساتھ ۱؎ ''

۱؎ کَذٰلِکَ مصدریت کی بناء پر محل نصب میں ہے' یعنی نفعل فعل کے مصدر کی صفت ہے اور ک مثل کے معنیٰ میں ہے۔ مجرمین سے مراد ہر مشرک۔ مجرم سے مراد مشرک ہونے کی تائید آنے والا ارشاد بھی کرتا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوٓا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۳۵﴾

''کفار کا یہ حال ہے کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا تو یہ تکبر کرنے لگتے ہیں۔''

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوٓا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ﴿۳۶﴾

''اور کہتے ہیں کیا ہم چھوڑ دیں گے اپنے خداؤں کو ایک شاعر اور دیوانے کے کہنے سے ۱؎ ''

۱؎ شاعر اور مجنون سے ان کی مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی' اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ہرزہ سرائی کا رد کرتے ہوئے یہ فرمایا۔

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۷﴾

''(دیوانے تو یہ خود ہیں) وہ تو دین حق لے کر آئے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں سارے رسولوں کی ۱؎ ''

دعویٰ ان کے دعویٰ کے موافق ہے۔

اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿۳۸﴾

''(اے مجرمو) تم ضرور چکھو گے دردناک عذاب کو[1]۔''

[1] اس کلام میں غیبوبت سے خطاب کی طرف التفات ہے، یعنی اے مجرموں تم نے شرک کیا اور رسولوں کی تکذیب کی اس لئے تمہیں دردناک عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور نہیں بدلہ دیا جائے گا تمہیں مگر اسی کا جو تم کیا کرتے تھے[1]۔''

[1] یعنی دنیا میں جو تم شرکیہ اعمال کرتے تھے اسی کا ہی تمہیں بدلہ ملے گا۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

''البتہ اللہ کے مخلص بندے (اس عذاب سے محفوظ رہیں گے)[1]۔''

[1] یہ استثناء منقطع ہے لیکن اگر تُجْزَوْنَ میں ضمیر کا مرجع تمام مکلفین ہوں تو استثناء مماثلت کے اعتبار سے ہوگی کیونکہ مخلصین کا ثواب سات سو گنا تک بلکہ جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا بڑھا دے گا۔ استثناء منقطع بھی اسی اعتبار سے ہوگی (یعنی اگر استثناء منقطع ہو تو گویا مفہوم یہ ہوگا کہ اے کافرو! تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء تمہارے اعمال کی مقدار کے مطابق دی جائے گی لیکن موحدین اور مخلصین کے لئے ایسا نہیں ہوگا کیونکہ ان کی جزاء اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے کئی گنا بڑھا دی جائے گی پس مشرکین سے مخلص کی استثناء اس اعتبار سے ہوگی کہ مشرکین کی جزاء ان کے عمل کے مطابق ہوگی اور موحدین کی جزاء کئی گنا زیادہ ہوگی)

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۴۳﴾ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۴﴾

''وہی ہیں انہیں وہ رزق دیا جائے گا جس کی کیفیت معلوم ہے[1]۔ لذیذ پھل اور ان کا بڑا احترام و اکرام کیا جائے گا[2]۔ (اور وہ) نعمت کے باغوں میں ہوں گے[3]۔ (زرنگار) پلنگوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے[4]۔''

[1] رزق معلوم سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسا رزق ہے جس کی خصوصیات مثلاً ہمیشہ باقی رہنا اور لذیذ ہونا معلوم ہیں۔ اسی لئے رزق معلوم کی تفسیر فواکہ سے کی گئی ہے فاکھۃ کی جمع فواکہ ہے۔ یہ رزق کا بدل یا بیان ہے۔ اور فاکھۃ سے مراد ہر وہ چیز ہے۔ جس سے تلذذ حاصل کیا جائے بطور خوراک استعمال نہ ہو اور قوت اسے کہتے ہیں جو بطور غذا استعمال ہو لذت مقصود نہ ہو۔ رزق کا لفظ تلذذ اور خوراک دونوں کو شامل ہے۔ اہل جنت کی تخلیق ہی ایسی ہوگی کہ ان کے اجسام ضائع اور ختم نہ ہوں گے اس لئے انکا رزق خالص پھل ہوں گے (اہل جنت [illegible] نہیں ہوگا [illegible] کے اجسام باقی رہیں)

۳؎ ظرف مستقر کے متعلق ہے، یعنی ان کے لئے رزق ہے جو جنت میں معلوم ہے اور جنت میں سوائے نعمتوں کے اور کچھ نہیں ہے یا یہ مکرمون کے متعلق ہے یا مکرمون کی ضمیر سے حال ہے یا اولئک کی دوسری خبر ہے۔

۴؎ علی سرر، حال ہے یا خبر ہے۔ اس کے خبر ہونے کی صورت میں اس میں جو ضمیر مستکن ہے وہ ذوالحال ہوگی اور متقابلین اس سے حال ہوگا۔ یا مکرمون کی ضمیر سے حال ہوگا۔ یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے علی سرر، متقابلین کے متعلق ہو۔ اس صورت میں متقابلین مکرمون کی ضمیر سے حال ہوگا۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍۭ ﴿۴۵﴾

''پھرائے جائیں گے ان پر چھلکتے جام (شراب طہور کے) چشموں سے پُر کر کے ۱؎ ''

۱؎ کاس اس جام کو کہتے ہیں جس میں شراب ہو اور کبھی اس کا اطلاق نفس شراب پر بھی ہوتا ہے جیسے اعشیٰ شاعر کا قول ہے وَكَأْسٍ شَرِبْتُ عَلٰى لَذَّةٍ یعنی بہت سی شرابیں میں نے لذت کیلئے استعمال کیں۔ اخفش کہتا ہے قرآن میں کاس سے مراد شراب ہی ہے(1)۔ یہ جملہ حال ہے یا خبر ہے۔ من معین یا تو عانه یعینه سے اسم مفعول ہے۔ جس کا معنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ سطح زمین پر وہ شراب جاری ہوگی اور آنکھوں کے لئے ظاہر ہوگی یا یہ عین الماء سے ماخوذ ہے جو پانی کا منبع اور مخرج ہوتا ہے اور الماء المعین سے مراد وہ پانی ہوگا جو چشمہ سے نکلتا ہے اور جاری ہوتا ہے۔ جنت کی شراب کی معین سے صفت بیان کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ بھی پانی کی طرح نہروں میں حقیقۃً جاری ہوگا یا اس لئے کہ جنتیوں کو جو پینے کے لئے شراب ملے گی وہ کمال لذت کی وجہ سے مختلف قسموں کی شرابوں سے جو لذت مطلوب ہوتی ہے اس کی جامع ہوگی۔

بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۴۶﴾

''(دودھ سے زیادہ) سفید بڑے لذیذ پینے والوں کے لئے ۱؎ ''

۱؎ دنیا کی شراب پینے کے وقت انتہا بدشکل دکھائی دیتی ہے لیکن جنت کی شراب انتہائی سفید ہوگی اور لذت سے بھرپور ہوگی۔ بیضاء اور لذۃ دونوں کاس کی صفتیں ہیں۔ حسن فرماتے ہیں جنت کی شراب دودھ سے کہیں زیادہ سفید ہے(2) اور مبالغہ کے لئے لذۃ کو بطور صفت استعمال فرمایا یا لذۃ تانیث ہے لذی کی جس کا معنی لذیذ ہے جیسے طبٌ اور اس کا وزن فَعْلٌ ہے۔

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾

''نہ اس میں مضر صحت کوئی چیز ہے اور نہ وہ اس (کے پینے) سے مدہوش ہوں گے ۱؎ ''

۱؎ غول، غاله، یغوله سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کو خراب کر دینا ہے۔ لاغول کا مطلب یہ ہے کہ وہ شراب ایسی ہے کہ اس میں فساد نام کی کوئی چیز نہیں ہے جیسا کہ دنیا کی شراب میں مفاسد اور مضرات ہیں مثلاً دنیا کی شراب پینے سے عقل ضائع ہو جاتی ہے، پیٹ میں درد ہوتا ہے، سر چکرانے لگتا ہے، قے آتی ہے، پیشاب آتا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے ینزفون کو باب افعال سے زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے حفص نے سورۂ واقعہ میں ان کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے دونوں جگہ زاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یاء کے

اور انزف الشارب اس وقت بولا جاتا ہے جب عقل یا شراب ختم ہو جائے۔ نزف کا اصل معنی ختم ہونا ہے نزف لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ انزفت الشی نزفته سے زیادہ بلیغ ہے۔ نزف کو نفی کے ساتھ علیحدہ ذکر فرمایا اور پھر عام پر اس کو عطف فرمایا کیونکہ شراب کا بڑا نقصان اور خسارہ یہ ہوتا ہے کہ عقل ضائع ہو جائے اور شرابی کے لئے سب سے تکلیف دہ امر وہ ہوتا ہے جب اس کی شراب ختم ہو جائے یعنی جنت میں نہ شراب ختم ہوگی اور نہ اس سے ہوش و حواس مختل ہوں گے۔

وَعِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ عِيۡنٌ ﴿۴۸﴾

''ان کے پاس ہوں گی نیچی نگاہوں والی آہو چشم (عورتیں) ۱؎''

۱؎ یعنی ان جنت کے مکینوں کے پاس ایسی عورتیں ہوں گی جو اپنے خاوندوں پر اپنی نگاہوں کو ٹکائے ہوں گی، کسی غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا انہیں گوارا نہ ہوگا کیونکہ ان کے خاوند ہی ان کے نزدیک حسین ترین ہوں گے۔ عین مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی هن عینٌ عرب کہتے ہیں۔ رجلٌ اعین، موٹی موٹی حسین آنکھوں والا مرد۔ امرۃ عیناء موٹی موٹی حسین آنکھوں والی عورت رجالٌ ونساءٌ عین۔ یعنی جمع کے لئے عین استعمال ہوتا ہے۔

كَاَنَّهُنَّ بَيۡضٌ مَّكۡنُوۡنٌ ﴿۴۹﴾

''گویا وہ (شتر مرغ کے) انڈوں کے مانند، گرد و غبار سے محفوظ ۱؎''

۱؎ ابن جریر نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عین یعنی موٹی موٹی آنکھوں والیاں ان کی پلکیں گدھ کے پروں کی طرح ان کی آنکھوں پر ہوں گی (۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے كَاَنَّهُنَّ بَيۡضٌ مَّكۡنُوۡنٌ کے متعلق فرمایا ان کی جلد اتنی ملائم و نرم ہوگی جیسے انڈے کے اندر سفیدی کے اوپر باریک پردہ ہوتا ہے (2) بیض جمع ہے بیضة کی (مکنون مذکر لفظ ذکر فرمایا حالانکہ یہ جمع کی صفت ہے) موصوف کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے صفت کو مذکر ذکر فرمادیا۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں جنتی حوروں کو شتر مرغ کے انڈوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ شتر مرغ ان کو غبار اور ہوا سے اپنے پروں کے ساتھ چھپائے رکھتا ہے اور اس کے انڈوں میں سفیدی زردی میں ایک لطیف انداز میں ملی ہوئی ہوتی ہے (3) یہ زردی مائل سفیدی عورتوں کا خوبصورت ترین رنگ سمجھا جاتا ہے۔ عرب اسی وجہ سے عورتوں کو شتر مرغ کے انڈوں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔

فَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۵۰﴾

''پس وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے (اور) سوال جواب کریں گے ۱؎''

۱؎ یعنی جنتی آپس میں گفتگو کریں گے اور دنیا کا گذشتہ حال پوچھیں گے۔ یہ جملہ یطاف علیهم پر معطوف ہے، یعنی وہ شراب طہور کے جام نوش فرمائیں گے اور شراب پر گفتگو کریں گے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

وَمَا بَقِيَتۡ مِنَ اللَّذَّاتِ اِلَّا اَحَادِيۡثُ الۡكِرَامِ عَلَى الۡمُدَامِ

[illegible]

قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ﴿۵۱﴾

''کہے گا ان میں سے ایک کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا لے''

لے یہ اہل جنت کی گفتگو کا بیان ہے کہ ایک کہے گا دنیا میں میرا ایک لنگوٹیا یار ہوتا تھا جو قیامت اور دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتا تھا۔ مجاہد فرماتے ہیں اس قرین سے مراد شیطان ہے۔ دوسرے مفسرین فرماتے ہیں انسانوں میں سے ایک دوست کا ذکر ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں یہاں قرین سے مراد بھائی ہے۔ باقی مفسرین فرماتے ہیں یہ دونوں آپس میں شریک تھے، ایک کافر تھا جس کا نام مطروس تھا اور دوسرا مومن تھا جس کا نام یہودا تھا یا یہ ان آدمیوں کا ذکر ہے جن کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں ذکر فرمایا ہے وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ (1)۔

یَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ﴿۵۳﴾

''وہ (مجھے) کہا کرتا تھا کہ کیا تو (قیامت پر) ایمان لانے والوں سے ہے۔ کیا جب ہم مریں گے اور (مرکر) مٹی اور (بوسیدہ) ہڈیاں ہو جائیں گے کیا اس وقت ہمیں جزاء دی جائے گی لے''

لے اَىِٕنَّكَ میں استفہام توبیخ کے لئے ہے۔ اء ذامتنا میں استفہام انتہائی بعید جاننے اور انکار کے لئے ہے۔

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾

''ارشاد ہوگا کیا تم اسے دیکھنا چاہتے ہو؟ لے''

لے یعنی کیا تم دوزخیوں کو دیکھنا چاہتے ہو میں تمہیں وہ دوست دکھا دوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت میں قَالَ کا فاعل اللہ تعالیٰ یا کوئی فرشتہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ یا کوئی فرشتہ کہے گا کہ کیا تم دوزخیوں پر مطلع ہونا چاہتے ہو۔ تو میں تمہیں وہ دوست دکھاؤں تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ تمہارا مقام و مرتبہ ان سے کتنا بلند و بالا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جنت میں ایک روشندان ہوگا جس سے جنتی دوزخیوں کو دیکھیں گے (2)۔

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۵۵﴾

''پس جب اس نے جھانکا تو دیکھا اپنے یار کو جہنم کے وسط میں لے''

لے اطلع کا فاعل مومن ہے، یعنی دوزخیوں پر جھانکے گا تو اپنے دوست کو دوزخ میں دیکھے گا۔ کسی شے کے درمیان کو سواء اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہاں سے اس شے کی تمام جوانب برابر ہوتی ہیں۔ ہناد نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مومن نے جب دیکھا تو اپنے دوستوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ میں نے قوم کی کھوپڑیاں ابلتی دیکھی ہیں۔

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ﴿۵۶﴾

''جنتی بول اٹھے گا بخدا تو تو مجھے ہلاک کرنا ہی چاہتا تھا لے''

لے یعقوب نے دونوں حالتوں میں لَتُرْدِیْنِ کو یاء متکلم کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش نے صرف وصل کی حالت میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا، باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِنْ مخففه من مثقله ہے۔ اور

وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿٥٧﴾

”اور اگر میرے رب کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی (آج) پکڑ کر لائے جانے والوں میں سے ہوتا[1]“

[1] یعنی جنتی کہے گا اگر میرا رب مجھ پر ہدایت اور عصمت کی نعمت نہ فرماتا تو میں بھی تیرے ساتھ اس بھڑکتی آگ میں ہوتا۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿٥٨﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿٥٩﴾

”(جنتی کہیں گے) کیا اب تو ہمیں مرنا نہیں ہوگا بجز اپنی پہلی موت کے[1] اور نہ ہمیں (اب) عذاب دیا جائے گا[2]“

[1] یعنی اب ہمیں موت نہیں آئے گی' موتتنا الاولی اسم فاعل (یعنی بمیتین) کی وجہ سے مصدریت کی بناء پر منصوب ہے اور یہ مستثنیٰ مفرغ ہے یا یہ معنی کہ ہم اب کبھی نہیں مریں گے مگر جو دنیا میں موت پا چکے، اس صورت میں مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ فاء تقدیر کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَنَحْنُ مُخَلَّدُوْنَ مُنَعَّمُوْنَ فَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ یعنی کیا اب ہم ہمیشہ رہیں گے اور نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے اور ہم مریں گے نہیں، استفہام تقریری ہے۔ یعنی مخاطب کو اس چیز کے اقرار پر ابھارا جا رہا ہے جس کا وہ دنیا میں ا ء نا لمدینون کہہ کر انکار کیا کرتا تھا۔

[2] یہ مومن کی کلام کا تتمہ ہے جو وہ اپنے دوزخی دوست کو زجر و توبیخ کرنے کے لئے کر رہا تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے اظہار کے لئے اپنے جنتی ساتھیوں سے کہہ رہا ہو کہ اب ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ ایک طرف یہ اپنے دوستوں سے کلام ہے اور دوسری طرف دوزخی دوست کو توبیخ بھی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب موت کو ذبح کر دیا جائے گا تو اہل جنت فرشتوں سے اظہار مسرت کے طور پر فرشتوں سے کہیں گے کیا اب ہمیں مرنا نہیں ہوگا' فرشتے کہیں گے نہیں' تو اہل جنت یہ کہیں گے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٠﴾

”بیشک یہی وہ عظیم الشان کامیابی ہے[1]“

[1] ھٰذَا کا مشار الیہ جنت میں ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ اہل جنت کی کلام بھی ہوسکتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کلام ہو۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿٦١﴾

”ایسی ہی عظیم الشان کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے[1]“

[1] یعنی اس منزل کے لئے یا ان نعمتوں کے لئے کوشش اور عمل صالح کرنے چاہئیں نہ کہ دنیاوی مال و متاع کے لئے شب و روز تھکان برداشت کرنی چاہئے۔ جس میں ذہنی اور قلبی پریشانی بھی ہے اور بہت جلد فناء ہونے والا بھی ہے۔

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾

”بھلا یہ دعوت بہتر ہے یا زقوم کا درخت[1]“

[1] یعنی اہل جنت کے لئے جن نعمتوں اور سرفرازیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بہتر ہیں یا زقوم کا درخت جس کے ساتھ دوزخیوں کی تواضع کی

ہے اور اس لفظ کے ذکر میں دلیل ہے کہ اہل جنت کے لئے جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ انہیں ابتداءً پیش کی جائیں گی جس طرح آنے والے مہمان کو ابتداءً بطور ضیافت کچھ چیزیں پیش کی جاتی ہیں لیکن ان کے علاوہ جو جنتیوں کو نعمتیں ملیں گی ان تک ابھی عقل انسانی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح زقوم دوزخیوں کی خوراک ہوگی۔

ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' ابن ابی حاتم' ابن حبان' حاکم اور بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر زقوم سے بہنے والے پانی کا ایک قطرہ دنیا کے سمندروں میں ڈالا جائے تو اہل زمین پر زندگی تنگ ہو جائے (اب فیصلہ کرلو) جو اس کو کھائے گا اس کی بدحالی کا کیا عالم ہوگا(1)۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں اور ابونعیم نے ابی عمران الخولانی سے شجرۃ الزقوم کے بارے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ انسان زقوم کے درخت سے جتنا (کھانے کے لئے) چھیلے گا اتنی مقدار وہ درخت آدمی کا جسم چھیل لے گا(2)۔

إِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٣﴾

"ہم نے بنادیا ہے اسے آزمائش ظالموں کے لئے [1]"

[1] فتنہ سے مراد آخرت میں عذاب اور آزمائش ہے یا دنیا میں ابتلاء ہے۔ الظّٰلمین سے مراد کفار ہیں۔ کافر کہتے ہیں کہ دوزخ میں درخت کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ آگ تو درختوں کو جلا دیتی ہے۔ ابن الزبعری کو سرداران قریش نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں زقوم سے ڈراتا ہے' حالانکہ بربر قوم کی زبان میں زقوم مکھن اور کھجور کو کہتے ہیں پھر زبعری کو ابوجہل اپنے گھر لے گیا اور اپنی لونڈی سے کہا یاجاریہ زقمینا اے لونڈی ہمیں زقوم کھلا تو وہ مکھن اور کھجور لے آئی۔ ابوجہل نے کہا یہ مکھن اور کھجور کھاؤ۔ یہ ہے وہ جس کی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں دھمکیاں دیتا ہے(3)۔

ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ابوجہل نے کہا تمہارا دوست (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے کہ دوزخ میں ایک درخت ہے حالانکہ آگ درختوں کو جلا دیتی ہے۔ قسم بخدا ہم تو زقوم سے مراد صرف کھجور اور مکھن ہی مانتے ہیں۔ جب انہوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ آگ میں درخت کیسے ہوسکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا(4)۔

إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْۤ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٦٥﴾

"یہ ایک درخت ہے جو اگتا ہے جہنم کی تہہ میں اس کے شگوفے گویا شیطانوں کے سر ہیں [1]"

[1] اصل الجحیم سے مراد جہنم کی گہرائی ہے۔ حسن اور سدی کا یہی قول ہے اور اس درخت کی شاخیں جہنم کے درکات تک بلند ہیں(5) پھل کو طلع کہا جاتا ہے اس کے طلوع و خروج کی وجہ سے۔ ابن عباس فرماتے ہیں شیاطین سے مراد شیاطین ہی ہیں اور کسی چیز کی قباحت اور بدصورتی بیان کرنے کے لئے شیطانوں کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ لوگ جب کسی شی کی انتہائی بدصورتی بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کانہ شیطان اگرچہ شیطان کو کسی نے دیکھا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں ان کی بدصورتی کا تصور موجود ہے(6) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ شیاطین سے مراد بدشکل ہیبت ناک سانپ ہیں جن کی کلغیاں ہوتی ہیں ان کی عجیب شکل کی

وجہ سے انہیں شیاطین کہا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ایک بد شکل کڑوا اور بدبودار درخت ہے جو دیہی علاقوں میں پیدا ہوتا ہے اس کو عرب رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ کہتے ہیں۔

فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾

''پس انہیں ضرور کھانا ہوگا اس سے اور بھریں گے اس سے اپنے پیٹ ۱؎''

۱؎ منہا کی ضمیر کا مرجع شجرۃ (درخت) ہے یا طلع ہے۔ فاء سببیت کے لئے ہے۔ یہ اس درخت کے فتنہ ہونے کی علت بیان ہو رہی ہے۔ بھوک کے غلبہ کی وجہ سے ضرور کھائیں گے یا انہیں اس کے کھانے پر مجبور کیا جائے گا۔ ملاء کا معنی برتن کو اس طرح بھرنا ہے کہ اس میں مزید گنجائش نہ ہو۔

ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾

''پھر انہیں زقوم کھانے کے بعد کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا ۱؎''

۱؎ یعنی پیٹ بھر کر زقوم کھانے اور سخت پیاس لگنے کے بعد انہیں کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا۔ ثم کا لفظ انتہائی ناگواری کی حالت میں ان کے پینے کو بیان کرنے کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ شوبا کا معنی خلط ملط کرنا اور ملانا ہے۔ من حمیم شوبا کے متعلق ہے۔ حمیم انتہائی گرم پانی کو کہتے ہیں، یعنی وہ کھولتا ہوا پانی پئیں گے تو وہ ان کے پیٹوں میں زقوم سے مل جائے گا۔

ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾

''پھر انہیں لوٹا دیا جائے گا جحیم کی طرف ۱؎''

۱؎ علامہ بغوی لکھتے ہیں وہ بد بخت پیاسے اونٹ کی طرح کھولتے ہوئے پانی کی طرف لپکیں گے۔ یہ حمیم یعنی کھولتے ہوئے پانی کا تالاب جحیم سے جدا ہوگا۔ وہ پانی پینے کے بعد پھر انہیں جحیم کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اس توجیہ کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ (ترجمہ) وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان جو از حد گرم ہوگا (۱) ابن مسعود نے اس آیت کو اِنَّ مَقِيْلَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ پڑھا ہے۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾

''انہوں نے پایا تھا اپنے باپ دادا کو گمراہ۔ پس وہ (بے سوچے سمجھے) ان کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں ۱؎۔''

۱؎ یعنی وہ اس سزا کے اس لئے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے گمراہ آباء و اجداد کی اندھی تقلید کی تھی۔ اپنی عقل اور اپنی ذہنی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا تھا۔ یہ جملہ مذکورہ بالا سزا کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾

''اور بہک گئے تھے ان سے قبل بہت سے پہلے لوگ ۱؎''

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا فِیْهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ﴿۷۲﴾

''اور ہم نے بھیجے تھے ان میں ڈرانے والے لے''

لے یعنی ہم نے انبیاء کرام کو بھیجا تھا جو انہیں گمراہی کے برے انجام سے ڈراتے تھے۔

فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۷۳﴾

''پس (اے مخاطب!) ذرا دیکھ کیسا انجام ہوا جنہیں ڈرایا گیا تھا لے''

لے استفہام تعجب اور استعظام کے لئے ہے۔ جملہ استفہامیہ مفرد کی تاویل میں ہو کر اُنظر کا مفعول ہے۔ اس سے مقصود استفہام نہیں مگر یقینی خبر دینا مقصود ہے کہ منکر اور نافرمان قوم کا انجام دنیا و آخرت میں عذاب ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۷۴﴾

''(مگر وہ نہ سنبھلے) سوائے ان کے جو اللہ کے مخلص بندے تھے لے''

لے سابقہ جملہ کے مضمون سے یہ استثناء ہے، یعنی وہ نہ سمجھے مگر اللہ کے مخلص بندے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور تنذیر سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ انہوں نے خالص دین کو اللہ کے لئے اپنایا اور وہ عذاب سے نجات پا گئے۔ المخلصین کو لام کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے دین کو خالص فرمایا۔ یہ خطاب (اُنظُر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد قوم ہے کیونکہ انہوں نے بھی پہلی قوموں کے واقعات سن رکھے تھے اور ان کی اجڑی بستیوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے تھے۔

وَ لَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ ﴿۷۵﴾

''اور (فریاد کرتے ہوئے) پکارا ہمیں نوح نے پس ہم بہترین فریاد رس ہیں لے''

لے یہاں سے اجمال کے بعد تفصیل کے ساتھ گذشتہ قوموں کے واقعات کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔ اس کا عطف ولقد ارسلنا پر ہے۔ اور یہ عام کے بعد خاص کے ذکر کرنے کے قبیل سے ہے، یعنی اے محبوب ان مشرکین مکہ سے پہلے قوم نوح بھی گمراہی کی دلدل میں گری تھی پھر ان میں ہم نے نوح علیہ السلام کو بطور نذیر (ڈرانے والا) بھیجا تھا۔ اس نے انہیں پوری دلسوزی اور شفقت بھرے انداز میں اسلام کی طرف دعوت دی تھی لیکن وہ ایمان نہ لائے تھے حتیٰ کہ نوح علیہ السلام ان کے اسلام قبول کرنے سے ناامید ہو گئے تھے۔ پھر نوح علیہ السلام کی طرف یہ وحی بھیجی گئی کہ تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا بجز ان کے جو ایمان لا چکے ہیں تو نوح علیہ السلام نے ہم سے دعا کی کہ اس بدبخت قوم کو ہلاک کر دے۔ ہم نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور ہم بہت بہتر اپنے بندوں کی فریادوں کو قبول کرنے والے ہیں۔ اس جملہ میں کلام محذوف کر دی گئی ہے کیونکہ مابعد کلام محذوف کلام پر دلالت کر رہی ہے۔

وَ نَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿۷۶﴾

''اور ہم نے نجات دے دی انہیں اور ان کے گھرانے کو ایسی مصیبت سے جو بڑی زبردست تھی لے''

لے اس کلام کا عطف فاجبنا مقدر پر ہے اور الکرب العظیم [illegible]

''اور ہم نے بنا دیا فقط ان کی نسل کو باقی رہنے والا ۱ ''

۱ یعنی نوح علیہ السلام کی قوم میں سے کسی کی اولاد باقی نہیں رہی تھی صرف نوح علیہ السلام کی اولاد باقی بچی تھی۔

ترمذی وغیرہ نے سمرہ کے حوالہ سے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبٰقِيْنَ کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ (نوح علیہ السلام کے تین بیٹے) حام سام اور یافث باقی رہے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سام ابو العرب (عربوں کے باپ) ہیں۔ حام ابو الحبش (حبشیوں کے باپ) ہیں اور یافث ابو الروم (رومیوں کے باپ) ہیں(1) ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب نوح علیہ السلام کشتی سے اترے تو جتنے آپ کے ساتھ مرد اور عورتیں تھیں سب مر گئے، صرف آپ کی اولاد اور آپ کی ازواج باقی رہ گئیں تھیں(2)۔ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان میں روئے زمین پر رہنے والے تمام لوگ غرق ہو گئے تھے۔ صرف آپ کے پیروکار بچے تھے جو آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے پھر جب کشتی سے اترے تھے تو سوائے آپ کی اولاد کے اور کوئی دوسرا نہیں بچا تھا اور قیامت تک نسل در نسل تمام لوگ آپ کی نسل سے ہوں گے۔ حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے سام، حام اور یافث۔ سام عربوں، رومیوں اور فارسیوں کا جد اعلیٰ ہے۔ حام سوڈانیوں کا جد اعلیٰ ہے اور یافث ترکوں خوز اور یاجوج ماجوج اور ھند کے مشرقی علاقوں کے لوگوں کا جد اعلیٰ ہے(3)۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک نوح علیہ السلام تمام لوگوں کی طرف مبعوث نہیں کیے گئے تھے کیونکہ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہونا ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔ حضرت نوح صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ جب آپ کی قوم ایمان نہ لائی تو آپ نے ان کی ہلاکت کے لئے دعا فرمائی پھر ان پر طوفان آیا اور سارے منکر غرق ہو گئے۔ آیت میں لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا میں الارض سے مراد مخصوص خطہ زمین ہے۔ جس کی طرف آپ کو مبعوث کیا گیا تھا اور آیت میں حصر اضافی ہے، یعنی ہم نے آپ کی قوم سے سوائے آپ کی اولاد کے کوئی باقی نہیں چھوڑا۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۞ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۞

''اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں۔ نوح پر سلام ہو تمام جہانوں میں ۱ ''

۱ آخرین سے مراد آنے والی قومیں اور امتیں ہیں یعنی آنے والی قومیں آپ پر سلام پیش کرتی رہیں گی اور وہ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ کہتی رہیں گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ہے اور تَرَكْنَا کا مفعول محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی تَرَكْنَا عَلَيْهِ الثَّنَاءَ وَالذِّكْرَ الْجَمِيْلَ۔ یعنی آپ کی تعریف اور ثنا خوانی کو تمام جہانوں میں چھوڑا۔ فِي الْعٰلَمِيْنَ ''علیہ'' ظرف مستقر کے متعلق ہے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۞

''ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنین کو ۱ ''

۱ یعنی ہم محسنین کو اسی طرح بہترین جزا دیتے ہیں معنی یہ کہ جو جزا ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی شہرت اور نیک نامی کو باقی رکھ کر دی

اور اپنی طرف سے سلام بھیجا اسی طرح کی جزاء ہم ہر محسن کو دیتے ہیں۔

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۱﴾

''بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے [1]''

[1] یعنی ہم نے نوح کو یہ سرفرازی اور عزت ان کے ایمان اور احسان کی وجہ بخشی ہے۔ اس آیت میں امت محمدیہ (علی صاحبها الصلوٰة والتسلیم) کے صالحین اور نیکوکار لوگوں کے لئے بشارت ہے۔

ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ ﴿۸۲﴾

''پھر ہم نے غرق کر دیا دوسرے لوگوں کو [1]''

[1] یعنی جو نیکی اور احسان کرنے والے نہیں تھے ان کو ہم نے غرق کر دیا۔ اس کا عطف نجینا پر ہے۔

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ﴿۸۳﴾

''اور ان کی جماعت میں سے ابراہیم (علیہ السلام) بھی تھے [1]''

[1] اس کا عطف انه' من عبادنا المومنین پر ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام ان لوگوں میں سے تھے جو ایمان اور اصول دین میں یا تمام فروع میں یا اکثر فروع میں نوح علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان دو ہزار چھ سو چالیس سال کی مدت ہے۔ ان کے درمیان حضرت ہود اور صالح علیہما السلام بھی تشریف لائے تھے۔

إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿۸۴﴾

''جب وہ حاضر ہوئے اپنے رب کے دربار میں قلب سلیم کے ساتھ [1]''

[1] ظرف یا تو شیعته میں جو مشایعة کا معنی ہے اس کے متعلق ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آنے کے وقت حضرت نوح کی اتباع و پیروی کی یا ظرف محذوف فعل اذکر کے متعلق ہے۔ قلب سلیم سے مراد وہ دل ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر دوسری ذات سے محبت کرنے اور تعلق رکھنے سے محفوظ اور سلامت ہو اور آپ کے قلب سلیم کی شہادت آپ کا اپنے لخت جگر کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں ذبح کرنا ہے۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ﴿۸۵﴾

''جب انہوں نے کہا اپنے باپ اور اپنی قوم کو کہ تم کس کی پوجا کرتے ہو [1]''

[1] یہ ظرف یا تو سابقہ اذ سے بدل ہے یا جاء یا سلیم کی ظرف ہے اور اس آیت میں استفہام پتھروں کی مورتیوں کی عبادت کرنے پر توبیخ کے لئے ہے (یعنی کچھ سوچنا چاہئے کہ تم کس کی عبادت کر رہے ہو)

أَئِفْكًا آلِهَةً دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ ﴿۸۶﴾

کی خاطر اس کو مقدم کیا گیا ہے۔ اسی طرح مفعول بہ کو بھی اہمیت کے پیش نظر پہلے ذکر کیا گیا ہے، یعنی ان کا سارا عقیدہ جھوٹ اور باطل پر مبنی ہے (اس میں حقیقت نام کی کوئی چیز نہیں) یہ ترکیب بھی ہوسکتی ہے کہ افکاً مفعول بہ ہواور الھۃً اس کا بدل ہو، یعنی جوان کو خدا بناتا ہے اس کے جھوٹ میں مبالغہ بیان کرنے کے لئے الھۃ کو ہی جھوٹ کہہ دیا۔ یہ ترکیب بھی ممکن ہے کہ افکاً آفکین کے معنی میں حال ہو۔

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾

''پس تمہارا کیا خیال ہے سارے جہانوں کے پروردگار کے بارے میں ۔ل''

ل یعنی وہ ذات جو واقعی تمام جہانوں کو آہستہ آہستہ مرتبہ کمال تک پہنچانے والی ہے تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے کہ تم نے اس کی عبادت ترک کردی ہے یا تم نے غیروں کو اس کا شریک بنالیا ہے۔ کیا تم اس کے عذاب سے بے خوف ہوگئے ہو، یعنی کوئی قطعی دلیل تو درکنار کوئی ظنی دلیل بھی تمہارے پاس ایسی نہیں جو تمہیں اس ذات کی عبادت سے روکے یا شرک کے جواز کا سہارا بنے یا اس کے عذاب سے بے خوف اور مامون ہونے کا تقاضا کرتی ہو۔ ان تینوں تقادیر پر الزام حاصل ہوتا ہے اور کلام ختم ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا باطل ہے اور سفید جھوٹ ہے۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿٨٨﴾

''سو آپ نے ایک بار دیکھا ستاروں کی طرف ۔ل''

ل نظر کا عطف قال پر ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کے مقامات کو دیکھا اور ان کے ملنے کو دیکھا یا علم نجوم یا ستاروں کی کتاب کو دیکھا۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ علم نجوم اور اس کا سیکھنا سکھانا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا لیکن ہماری شریعت میں اس کا سیکھنا اور سکھانا منسوخ ہوگیا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے جادو سے کوئی شعبہ لیا اس نے زائد کرلیا جو زائد کرلیا (1)۔ اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ رزین نے اس حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے نجومی کاہن سے زائد ہے اور کاہن جادوگر ہے اور جادوگر کافر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں افراد کفر میں برابر ہیں اور یہ توجیہ کرنی بھی جائز ہے کہ ستاروں کے علم میں غور وخوض اس وقت حرام ہوتا ہے جب حادثات زمانہ کو ستاروں کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی یہ کہا جائے کہ فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی وغیرہ) لیکن جب تمام حادثات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ کو تسلیم کیا جائے اور ستاروں کے ادھر ادھر ہونے کو علامات سمجھا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت مطہرہ ہے کہ ان ستاروں کے اتصال پر بعض اشیاء کی تخلیق فرماتا ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ دواء پینے کے بعد شفا عطا فرمادیتا ہے۔ زہر استعمال کرنے کے بعد موت دے دیتا ہے اور جب کوئی کسی کام کا عزم مصمم کرتا ہے تو اس کام کو پیدا فرمادیتا ہے۔ اگر یہ نظریہ ہو تو پھر علم نجوم میں غور وفکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستارون کے علم کے حصول سے اس لئے منع فرمایا ہوتا کہ لوگ حوادث زمانہ کو ستاروں کی طرف منسوب نہ کریں۔ زید بن خالد الجہنی سے مروی ہے، فرماتے ہیں رات کے وقت بارش کے بعد صلح حدیبیہ کے مقام پر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی نماز سے فراغت کے بعد لوگوں کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کیا

ہے صبح کے وقت میرے بندوں میں سے کچھ مجھ پر ایمان لانے والے ہوتے ہیں اور کچھ میرا انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ ہم پر بارش اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے ہوئی وہ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور ستاروں کا انکار کرنے والے ہیں اور جو کہتے ہیں ہم پر بارش فلاں ستارے کی وجہ سے ہوئی وہ میرا انکار کرنے والے اور ستاروں پر ایمان رکھنے والے ہیں (بخاری ومسلم)(1)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ آسمان سے برکت (بارش) نازل نہیں فرماتے مگر صبح کے وقت کچھ لوگ اس بارش کی وجہ سے کافر ہوتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو لوگ کہتے ہیں فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی۔ اس حدیث کو مسلم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت امام محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب المنقذ من الضلال میں لکھا ہے کہ علم طب اور علم نجوم اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی پر اتارے پھر یہ دونوں علم کفار کے ہتھے چڑھ گئے۔ نجوم بھی علم طب کی طرح ظنی فائدہ دیتا ہے اور اس کی دلیل نجومیوں کا فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی خبر دینا اور ان کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت واقتدار کے خاتمہ کا بتانا ہے۔

امام بخاری نے صحیح میں اپنی سند کے ساتھ زہری سے روایت کیا ہے کہ ابن الناطور شام کے نصرانیوں کا پادری تھا۔ اس نے بتایا کہ ہرقل ایک دن صبح کے وقت ایلیا آیا تو پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس سے کسی ہمراز نے وجہ پوچھی جناب کی حالت کچھ غیری نظر آ رہی ؟ (ابن الناطور کہتا ہے کہ ہرقل کاہن تھا اور ستاروں سے امور کا اندازہ لگاتا تھا) ہرقل نے بتایا کہ آج رات جب میں نے ستاروں کی کیفیت پر غور وفکر کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ختنہ کرنے کا بادشاہ پیدا ہو چکا ہے۔ مجھے بتاؤ اس امت میں ختنہ کون لوگ کرتے ہیں؟ اس نے اپنے حواریوں کو بتایا کہ صرف یہود ختنہ کرتے ہیں۔ ان سے تو آپ پریشان نہ ہوں اور تم اپنے ملک کے شہروں میں یہ حکم نامہ روانہ کر دو کہ ہر یہودی کو قتل کر دو۔ یہ باہمی مشورہ ہو رہا تھا کہ غسان کے گورنر کی طرف سے ایک شخص ہرقل کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خبر لے آیا' جب ہرقل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پہنچی تو اس نے اپنے کارداروں کو حکم دیا کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کیا وہ مختون پیدا ہوئے ہیں یا نہیں۔ وہ تحقیق کر کے واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ آپ مختون پیدا ہوئے ہیں پھر اس نے عربوں کے متعلق پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ ختنہ کرتے ہیں ہرقل نے کہا اس امت کا بادشاہ پیدا ہو چکا ہے پھر ہرقل نے اپنے ایک دوست کو مزید تحقیق کے لئے خط لکھا جو اس کی طرح علم نجوم کا ماہر تھا۔ خود ہرقل حمص چلا گیا۔ کچھ وقت کے بعد دوست کا خط ہرقل کو پہنچا، اس میں ہرقل کی رائے کی موافقت تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا چکے ہیں اور وہ نبی ہیں(2)۔ شیخ ابن حجر فرماتے ہیں زہری کی یہ روایت ابن الناطور سے متصل ہے معلق نہیں ہے۔ ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں بیان کیا ہے کہ زہری نے بتایا کہ میں نے عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں ابن الناطور سے دمشق میں ملاقات کی تھی اور میرا خیال ہے کہ زہری نے ان سے یہ حدیث ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد لی ہے۔ یہ حدیث اور اس قسم کی دوسری احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ علم نجوم سے بھی کچھ نہ کچھ علم کا فائدہ ملتا ہے لیکن اس علم میں مشغولیت عقائد کے فساد کا موجب بنتی ہے اور وہ یہ کہ لوگ حادثات زمانہ کو ستاروں کی طرف منسوب کرنے لگتے ہیں۔ دوسرا اس کی مشغولیت میں وقت کے قیمتی سرمایہ کا نقصان ہے کیونکہ اس علم میں کوئی دینی منفعت نہیں ہے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم میں مشغول ہونے سے منع فرمایا ہے۔ دین عیسوی میں علم نجوم میں اشتغال جائز تھا ورنہ علماء نصاری اس میں سر نہ کھپاتے۔ جو علماء فرماتے ہیں کہ علم نجوم باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ستاروں کی طرف دیکھنے کا یہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ

ان کے انداز میں یہ معاملہ اختیار فرمایا تا کہ وہ میری بات کا رد اور انکار نہ کر سکیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بتوں کے خلاف ایک سازش کرنے کا ارادہ فرمایا تھا تا کہ ان پر دلیل اور حجت قائم ہو جائے کہ یہ پتھر مورتیاں عبادت کے لائق نہیں ہیں، دوسرے دن آپ کی قوم کا اجتماع اور عید تھی اور ان کا معمول یہ تھا کہ وہ بتوں کے پاس جاتے اور ان کے لئے دسترخوان بچھاتے اور ان کے سامنے عید منانے سے پہلے رنگا رنگ کھانے رکھ جاتے اور اس عمل کو وہ تبرک سمجھتے تھے پھر جب عید کا پروگرام مکمل کر کے واپس آتے تو وہ کھانے خود کھا جاتے۔ عید کے اس موقع پر انہوں نے حضرت ابراہیم کو کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کل عید کے پروگرام میں شامل ہوں تو حضرت ابراہیم نے ستاروں کی طرف دیکھا(1)۔

فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ﴿٨٩﴾

”پھر کہا میری طبیعت ناساز ہے لے“

لے ابن عباس فرماتے ہیں آپ نے فرمایا میں مطعون ہوں (یعنی مجھے طاعون کا مرض ہے) اور وہ لوگ طاعون کے مرض سے بہت دور بھاگتے تھے۔ حسن نے سقیم کا معنی مریض کیا ہے۔ مقاتل نے اس کا معنی درد کا ہے(2) صحیحین میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین مواقع پر تعریض اور توریہ فرمایا۔ دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق فرمایا انی سقیم میں مریض ہوں، بل فعلہ کبیرھم(3) اور تیسرا موقع وہ ہے جب آپ نے اپنی بیوی سارہ کو اپنی بہن کہا تھا۔ یہ حدیث تفصیل سے سورۂ انبیاء میں گزر چکی ہے۔ حدیث کے الفاظ میں ہے کذبات جس کا معنی جھوٹ ہے لیکن یہاں جھوٹ مراد نہیں بلکہ توریہ اور تعریض مراد ہے (توریہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک کلام کے دو مفہوم ہوتے ہیں مخاطب ایک مفہوم سمجھ رہا ہوتا ہے، جب کہ متکلم کی مراد دوسرا مفہوم ہوتا ہے)

ضحاک نے انی سقیم کا معنی ساقم (یعنی میں بیمار ہوں گا) لکھا ہے(4) بعض علماء اس کی یہ تاویل فرماتے ہیں کہ جس شخص کی گردن میں موت کا طوق ہمیشہ موجود ہو وہ بیمار ہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک شخص اچانک مر گیا تھا تو لوگوں نے کہا وہ تو صحیح سلامت تھا اور مر گیا ایک اعرابی وہاں موجود تھا اس نے کہا جس کی گردن میں موت کا طوق ہو، کیا وہ صحیح سلامت ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے کفر کی وجہ سے میری طبیعت ناساز ہے۔ بل فعلہ کبیرھم کی تاویلات ہم نے سورۂ انبیاء میں ذکر کر دی ہیں۔

فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ﴿٩٠﴾

”چنانچہ وہ لوگ انہیں پیچھے چھوڑ کر (میلہ دیکھنے) چلے گئے لے“

لے جب وہ میلہ اور عید منانے چلے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بت خانہ میں داخل ہوئے اور ان کے بتوں کی خوب درگت بنائی جیسا کہ آئندہ آیات سے واضح ہوتا ہے۔

فَرَاغَ إِلَىٰ آلِهَتِهِمْ فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ﴿٩١﴾

”پھر ... (مٹھائیاں) نہیں کھاؤ گے لے“

لہ راغ یہ روغہ الثعلب سے مشتق ہے جس کا معنی لومڑی کا چالاکی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس کا اصل معنی کسی تدبیر اور حیلہ کے ساتھ میل کرنا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں راغ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی کا آنا جانا پوشیدہ اور مخفی ہو (۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے استہزاءً فرمایا یہ کھانا جو تمہارے سامنے دھرا ہے اسے تم نہیں کھاؤ گے۔

مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۝۹۲

''تمہیں کیا ہو گیا کہ تم بولتے بھی نہیں لہ''

لہ یعنی میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ یہ جملہ حال ہے اور اس کا عامل مالکم میں فعل کا معنی ہے۔

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ۝۹۳

''پھر پوری قوت سے ضرب لگائی ان پر داہنے ہاتھ سے لہ''

لہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام چپکے سے ان کے بتوں کے پاس گئے۔ راغ کا صلہ علی استعمال فرمایا تاکہ استعلاء اور غلبہ پر دلالت کرے، یعنی ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں پر غالب آ گئے یا اس چیز کے اظہار کے لئے ہے کہ مفعول ناپسندیدہ تھا۔ ضرباً مصدریت کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ راغ بمعنی ضرب ہے یا فعل محذوف ضرب کی وجہ سے منصوب ہے۔ الیمین سے مراد دایاں ہاتھ ہے کیونکہ وہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الیمن سے مراد قسم ہے جس کا ذکر پہلے تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ کے الفاظ میں ہو چکا ہے۔

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ۝۹۴

''(رنگ رلیاں منانے کے بعد) آئے آپ کی طرف دوڑتے ہوئے لہ''

لہ جب ابراہیم علیہ السلام کی قوم اپنا جشن منانے کے بعد واپس آئی تو دیکھا کہ بت ٹوٹے پڑے ہیں آپس میں بحث کرنے لگے کہ مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ہمارے ان خداؤں کا یہ قابل دید حشر کس نے کیا ہے بڑا ظالم ہے؟ جس نے ہمارے بتوں کی ایسی تذلیل کی ہے۔ سب نے یہی گمان کیا کہ سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۝ کہ ایک نوجوان ابراہیم کے متعلق سنتے ہیں کہ وہی ان کا ویری اور دشمن ہے۔ اسی نے یہ سب کچھ کیا ہوگا، تیزی سے دوڑتے ہوئے آپ کے پاس پہنچے۔ اعمش اور حمزہ نے یزفون کو یاء کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یزفون یاء کے ضمہ کے ساتھ۔ معنی ایک دوسرے کو جلدی دوڑنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝۹۵

''آپ نے فرمایا کیا تم پوجتے ہو انہیں جنہیں تم خود تراشتے ہو لہ''

لہ قَالَ کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم ان بتوں کو پوجتے ہو جنہیں تم خود پتھروں سے تراشتے اور گھڑتے ہو۔ تمہیں ان بے جان مورتیوں کے سامنے سر جھکاتے اور آداب

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

”حالانکہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو ۔[1]“

[1] یہ جملہ تعبدون کے فاعل سے حال ہے۔ حال کے ساتھ تقیید انکار کے بعد دوبارہ انکار کے اظہار کے لئے ہے۔ ظاہر کلام کا تقاضا یہ ہے کہ ما مصدر یہ ہے، یعنی حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا اور تمہارے اعمال کو بھی پیدا فرمایا پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنے خالق کی عبادت ترک کر کے ان مورتیوں کی عبادت کرتے ہو جن کو تمہاری تراش خراش کی احتیاج ہے۔ یہ آیت کریمہ ہمارے نظریہ کی بین دلیل ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں یہ ما موصولہ ہے اور وہ اس کا معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ نے تمہیں پیدا فرمایا اور جو تم بت گھڑتے ہو ان کو بھی اس نے پیدا فرمایا اور بتوں کو پیدا کرنے کی نسبت اپنی طرف اس لئے فرمائی کیونکہ ان کے جواہر کی تخلیق اللہ کی طرف ہے اگرچہ مخصوص شکل ان مشرکوں کے ہاتھوں کی تیار کردہ ہے۔ اسی وجہ سے شکل کی نسبت ان کی طرف کی۔ لیکن اس طرح شکل بنانے پر قدرت بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے اور ان کا مواد اور اسباب بھی جن پر ان بتوں کی تخلیق موقوف ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے یا ما مصدر یہ ہے اور عمل بمعنی معمول ہے تا کہ ما تنحتون کے ساتھ مطابقت کر جائے۔ ہمارے نزدیک پہلی توجیہ ہی بہتر ہے کیونکہ دوسری دو تاویلیں حذف اور مجاز کی مقتضی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان کا معمول (کام) صرف شکل بنانا ہے، اصنام کا جوہر تیار کرنا نہیں ہے اور آخری دو تاویلوں کی صورت میں بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ شکل بھی اللہ کی مخلوق ہے بندہ صرف کاسب ہے (اہلسنت (اشاعرہ) کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور بندہ کاسب ہے، جب کہ معتزلہ کا نظریہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے)

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾

”انہوں نے (فیصلہ کن انداز میں) کہا بناؤ اس کے لئے وسیع آتشکدہ پھر پھینک دو اسے اس بھڑکتی آگ میں ۔[1]“

[1] جب مشرک دلائل کے ساتھ بات کرنے اور آپ کی حقائق آمیز باتوں کا جواب دینے سے عاجز آ گئے تو کہنے لگے اسے بھڑکتی آگ میں پھینک دو۔ جحیم کا معنی بھڑکتی آگ ہے اور جحیم پر الف لام اضافت کا بدل ہے (یعنی جحیم ذالک البنیان) یہ جملہ چند محذوف جملوں پر معطوف ہے جو ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ تقدیر کلام اس طرح ہو گی فَامْلَئُوْهُ حَطَبًا وَاضْرِبُوْهُ بِالنَّارِ فَاِذَا الْتَهَبَ اَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ، یعنی پہلے اس چار دیواری کو لکڑیوں سے بھرو پھر اس میں آگ جلاؤ۔ جب آگ خوب بھڑک جائے تو پھر ابراہیم کو اس میں ڈال دو۔ مقاتل فرماتے ہیں انہوں نے پتھروں سے ایک چار دیواری بنائی تھی جس کی بلندی تیس ہاتھ اور چوڑائی بیس ہاتھ تھی۔ پہلے انہوں نے اسے لکڑیوں سے بھرا اور پھر اس میں آگ لگا دی(1)۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾

”انہوں نے تو چاہا کہ آپ کے ساتھ مکر کریں لیکن ہم نے انہیں ذلیل کر دیا۔[1]“

[1] بہ کی ضمیر کا مرجع ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ کیدا کا معنی شر اور سازش ہے۔ انہوں نے آپ کو جلانے کا منصوبہ اس لئے تیار کیا تا کہ

ہاتھ اور پاؤں باندھ کر آگ میں پھینک دیا لیکن ہم نے ان کے اس مکر و دجل کو باطل کر دیا اور ابراہیم کو اپنی شان علو پر ایک واضح دلیل بنا دیا۔ آگ کو ابراہیم پر ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا۔ آگ نے آپ کا بال بھی نہ جلایا لیکن قدرت کا کرشمہ کہ جس رسی سے آپ کو جکڑ کر باندھ دیا گیا تھا وہ جل گئی۔ یہ واقعہ جابر و ظالم نمرود کے زمانہ میں بابل کی زمین پر ہوا تھا۔

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۹۹﴾

''اور آپ نے کہا میں جا رہا ہوں اپنے رب کی طرف وہ میری راہنمائی فرمائے گا[1]''

[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ سے صحیح وسلامت باہر تشریف لائے اور مشرک اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تو آپ نے فرمایا میں تمہارے دارالکفر کو چھوڑ کر جا رہا ہوں اور میں ایسی جگہ جا رہا ہوں یہاں میں سکون اور دلجمعی کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کروں گا۔ اس آیت کا عطف فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِیْنَ کے مفہوم پر ہے۔ یعنی جب آپ آگ سے سلامتی کے ساتھ باہر تشریف لائے تو فرمایا میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ میری ایسی جگہ راہنمائی فرمائے گا جہاں میرے دین کی صلاح ہوگی یا یہ معنی کہ میں وہاں کا قصد کروں گا جہاں کا میرا رب مجھے حکم فرمائے گا تو آپ شام تشریف لے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے خوف سے بابل کی زمین سے حضرت سارہ کو لے کر نکل پڑے اور حضرت سارہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں سے جمیل و شکیل تھیں اور آپ مصر کی حدود سے گزر رہے، جب کہ مصر کا فرعون اس وقت صادف بن صادف تھا۔ ابن الملقن نے شرح بخاری میں اس کا نام سنان بن علوان ذکر کیا ہے جو الضحاک کا بھائی تھا۔ بعض علماء نے اس کا نام عمرو بن امرء القیس ذکر کیا ہے۔ اس وقت کے فرعون (مصر کے بادشاہ کا لقب فرعون ہوتا تھا) نے حضرت ابراہیم سے سارہ کو چھین لیا اور انہیں اپنے محل میں لے گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے لئے دیواروں اور پردوں کو انڈے کے پردے کی طرح باریک بنا دیا تا کہ آپ حضرت سارہ کو دیکھتے رہیں اور آپ کا دل مطمئن رہے۔ آپ انتہائی غیرت مند شخص تھے۔ جب فرعون نے حضرت سارہ کا ارادہ کیا تو محل میں زلزلہ آ گیا۔ فرعون کو معلوم نہ ہوا کہ یہ زلزلہ حضرت سارہ کی وجہ سے ہے وہ دوسرے محل میں منتقل ہو گیا تو وہ بھی لرزنے لگا۔ وہ تیسرے محل میں چلا گیا تو وہ بھی اسی طرح لرزنے لگا۔ حضرت سارہ نے کہا یہ سب کچھ ابراہیم کی وجہ سے لرز رہا ہے۔ فرعون نے حضرت ابراہیم کو اپنی زوجہ واپس کر دی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب فرعون نے حضرت سارہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ اس نے حضرت سارہ سے فریاد کی اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت سارہ نے اس کی درستگی کے لئے دعا فرمائی۔ اس کا ہاتھ پہلے کی طرح بالکل ٹھیک ہو گیا۔ فرعون نے دوبارہ آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر وہ مفلوج ہو گیا۔ اس نے دوبارہ آپ سے دعا کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ پھر ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی تو وہ ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔ اس بے حیا نے تیسری مرتبہ پھر ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہاتھ پھر شل ہو گیا۔ اب اس نے قسم اٹھائی کہ اب اگر ہاتھ ٹھیک ہو گیا تو پھر ہرگز ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی اور ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔

امام احمد نے اپنی مسند میں اور امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ کی معیت میں ایک جابر بادشاہ کے پاس سے گزر رہے، جب کہ اس بادشاہ کو پہلے خبر دی گئی تھی کہ [illegible]

تشریف لائے تو فرمایا اے سارہ سطح زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مومن نہیں ہے۔ اس ظالم بادشاہ نے تیرے متعلق مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا وہ میری بہن ہے تو میری تکذیب نہ کرنا۔ بادشاہ نے حضرت سارہ کو بلایا۔ جب آپ بادشاہ کے دربار میں پہنچیں تو اس نے بدنیتی سے آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ پکڑا گیا۔ بادشاہ نے حضرت سارہ سے دعا کی درخواست کی اور کہا میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی تو اس کا ہاتھ درست ہو گیا۔ اس نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا تو پہلے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ گرفت میں آ گیا اس نے دوبارہ دعا کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ میں تجھے اب کچھ گزند نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی اس کا ہاتھ درست ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنے درباری کو بلایا اور کہا تو میرے پاس کسی انسان کو نہیں کسی جن کو لایا ہے۔ بادشاہ نے حضرت سارہ کو خدمت کے لئے ایک لونڈی ہاجرہ پیش کی۔ جب حضرت سارہ ہاجرہ کو لے کر حضرت ابراہیم کے پاس پہنچیں تو آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابراہیم نے ہاتھ سے اشارہ سے فرمایا کیا ہوا؟ حضرت سارہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فاجر کے مکر اور سازش کو اس کے سینے میں لوٹا دیا اور اس نے مجھے خدمت کے لئے ہاجرہ لونڈی دی ہے(1)۔

المواھب اللدنیه میں ایک روایت ہے کہ جب صادف بادشاہ نے حضرت سارہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ بندھ گیا تھا پھر اس نے ابراہیم علیہ السلام سے فریاد کی تھی۔ حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تو اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اس بادشاہ نے حضرت ابراہیم کو ہاجرہ پیش کی تھی جو حضرت اسماعیل کی والدہ تھیں اور کہا مجھے سارہ پر گرفت کا کوئی اختیار نہیں۔

ہاجرہ امانتدار خازن اور ہم مجلس تھیں اور بادشاہ نے جب وہ ھبہ کی تھی تو حضرت ابراہیم یا حضرت سارہ کو مخاطب کر کے کہا ھا اجرک یہ تمہارا اجر ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو ہاجرہ کہا جاتا ہے پھر حضرت ابراہیم نے سارہ کو خوش کرنے کے لئے یہ خادمہ انہیں عطا فرما دی حضرت سارہ کے بطن سے حضرت ابراہیم کی حضرت اسماعیل کی ولادت سے پہلے کوئی اولاد نہ تھی اور حضرت سارہ اپنے آپ کو عقیم (بانجھ) سمجھتی تھیں۔ حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم سے کہا ہاجرہ ایک مرغوب عورت ہے میں تجھے ھبہ کرتی ہوں شاید اس کے بطن سے تیری اولاد ہو جائے پس حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل کی ولادت ہوئی تھی۔ میں کہتا ہوں حضرت اسماعیل کی ولادت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بعد ہوئی تھی۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠٠﴾

”(دعا مانگی) میرے رب! عطا فرما دے مجھے ایک نیک بچہ لے“

لے مقاتل فرماتے ہیں جب ابراہیم علیہ السلام ارض مقدس (شام) پہنچے تو اللہ تعالیٰ سے نیک بچہ کی دعا مانگی(2)۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿١٠١﴾

”پس ہم نے مژدہ سنایا انہیں ایک حلیم فرزند کا لے“

لے حلیم سے مراد دانش مند اور عقل مند ہے۔ قاموس میں حلیم کا یہی معنی لکھا ہے(3) اور اس سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور یہی صحیح قول ہے۔ ابن عمر کا بھی یہی قول ہے۔ سعید بن مسیب، شعبی، حسن بصری، مجاہد الربیع بن انس محمد بن کعب القرظی اور کلبی کا بھی

یہی قول ہے۔ عن عطاء بن ابی ریاح و یوسف بن مالک عن ابن عباس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا جن کا فدیہ دیا گیا تھا وہ اسماعیل تھے۔ واقدی اور ابن عساکر نے عن بن سعید عن ابیہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ سارہ حضرت ابراہیم کے عقد میں تھیں اور طویل عرصہ گذر گیا لیکن اولاد نہ ہوئی جب حضرت سارہ نے دیکھا کہ میرے بطن سے اولاد نہیں ہوتی تو انہوں نے اپنی قبطیہ باندی ہاجرہ حضرت ابراہیم کو ہبہ کر دی۔ اسی سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے پس حضرت سارہ اسی وجہ سے ان سے غیرت کرنے لگیں۔ یہ واقعہ تفصیلاً ہم نے سورۂ ابراہیم میں ذکر کر دیا ہے پھر ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کو لے کر مکہ میں آئے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ ابھی حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل کو دودھ پلاتی تھیں۔ حضرت ابراہیم نے ان دونوں کو کعبہ کے پاس چھوڑ دیا (بخاری میں اسی طرح ہے) ہم نے بخاری کی یہ حدیث بھی سورۂ ابراہیم میں ذکر کی ہے۔ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں وہ بچہ جس کے ذبح کرنے کا حکم حضرت ابراہیم کو دیا گیا تھا وہ حضرت اسحٰق تھے لیکن یہ قول جھوٹ اور باطل ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں محمد بن کعب القرظی نے فرمایا کہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص سے جو علماء یہود میں سے تھا (بعد میں اسلام قبول کیا تھا) کہ حضرت ابراہیم کو کس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا؟ انہوں نے فرمایا اسماعیل پھر اس شخص نے کہا اے امیر المومنین یہود یہ جانتے تھے لیکن اے معشر قریش! تم پر یہود حسد کرتے تھے کہ تمہارا باپ وہ ہو جس کو ذبح کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور وہ کہتے تھے جس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اسحاق بن ابراہیم ہے اور حضرت اسماعیل کے ذبح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ بدلے میں ذبح ہونے والے مینڈھے کے سینگ کعبہ میں لٹکے ہوئے تھے اور حضرت اسماعیل کی اولاد کے قبضہ میں تھے اور وہ کعبہ کے جلنے تک لٹکے رہے۔ جب حضرت عبداللہ بن زبیر اور حجاج کے زمانہ میں کعبہ کو آگ لگی تھی تو وہ سینگ جل گئے تھے (1) سعید بن منصور اور بیہقی نے اپنی سنن میں عن امراۃ من بنی سلیم عن عثمان بن طلحہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے اس مینڈھے کے دونوں سینگ کعبہ میں لٹکے ہوئے تھے (2) علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت شعبی فرماتے ہیں میں نے وہ دونوں سینگ کعبہ کے ساتھ لٹکے ہوئے دیکھے تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اسلام کا ابتدائی دور تھا اور مینڈھے کا سر سینگوں سمیت لٹکا ہوا تھا اور کعبہ کا پرنالہ خشک تھا۔ اصمعی کہتے ہیں میں نے ابو عمرو بن العلاء سے پوچھا ذبیح اسماعیل تھے یا اسحاق؟ ابو عمرو نے فرمایا اصمعی! تیری عقل کہاں چلی گئی مکہ میں اسحاق کب تھے؟ مکہ میں تو صرف اسماعیل تھے۔ انہوں نے ہی اپنے باپ کے ساتھ مل کر کعبہ کی تعمیر کی تھی (3) علامہ بغوی فرماتے ہیں دونوں قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں (4)۔ میں کہتا ہوں علامہ بغوی کا یہ قول اشارہ ہے کہ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایک قول ثابت نہیں ہے کیونکہ ایک قول کو صحیح تسلیم کرنے سے دوسرے قول کا اعتبار اٹھ جائے گا۔ علامہ بغوی نے جو قول ذکر کیا ہے وہ صحابہ کرام میں سے حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباس کا قول ہے اور تابعین اور تبع تابعین میں سے کعب الاحبارؒ، سعید بن جبیرؒ، قتادہؒ، مسروقؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ، مقاتلؒ، زہری اور سدی کا قول ہے۔ عکرمہ اور سعید بن جبیر کی روایت میں ابن عباس کا بھی ایک قول یہی ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق ہیں سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کو شام میں حضرت اسحاق کو ذبح کرنے کا خواب دکھایا گیا۔ حضرت ابراہیم حضرت اسحاق کو لے کر چلے تو ایک ماہ کی مسافت صبح دوپہر تک طے کر لی حتیٰ کہ آپ منیٰ میں قربانی کرنے کی جگہ پہنچ گئے پھر جب اللہ تعالیٰ نے مینڈھے کو ذبح کرنے کا حکم دیا تو آپ نے اسے ذبح کر دیا پھر آپ اسحاق علیہ السلام کو لے کر شام کی طرف واپس چلے۔

دو پہر سے شام تک ایک مہینہ کی مسافت طے کر لی اللہ تعالیٰ نے وادیوں اور پہاڑوں کو آپ کے لئے لپیٹ دیا(1) شاید جن لوگوں نے حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کا قول کیا ہے انہوں نے یہود کی روایات پر اعتماد کیا ہے۔

حضرت اسماعیل کے ذبیح ہونے کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد پیدا ہونے والے حضرت اسماعیل تھے اور اللہ تعالیٰ نے فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ کا عطف وقال انی ذاھبٌ الی ربی سیھدین پر فاء کے ذریعے فرمایا ہے جو بلا تاخیر کسی کام کے یکے بعد دیگرے واقع ہونے پر دلالت کرتی ہے، جب کہ حضرت اسحاق علیہ السلام تاخیر کے ساتھ بہت عرصہ بعد پیدا ہوئے تھے اور جس کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ شخصیت تھے جن کی بشارت دی گئی تھی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت اس کے بعد اس بچہ کی بشارت پر معطوف ہے تو عطف کے تقاضا کے مطابق یقیناً دوسری بشارت پہلی بشارت سے مختلف ہوگی۔ یہ نہ کہا جائے کہ جو بشارت اس معطوف کے بعد ہے وہ اسحاق علیہ السلام کی نبوت کی بشارت ہے، ولادت کی بشارت نہیں ہے جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق کی بشارت دو مرتبہ دی گئی۔ ایک مرتبہ ولادت کی اور دوسری مرتبہ ان کی نبوت کی۔ یہ کہنا اس لئے صحیح نہیں کیونکہ یہ آیت کریمہ کے ظاہر کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۝ یعنی ہم نے انہیں نفس اسحٰق کی بشارت دی، جب کہ ان کے نبی ہونے اور ان کے صالح ہونے کا بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے اسحاق کی نبوت اور ان کی صلاح کی بشارت دی اور کلام کو بلا ضرورت ظاہر سے پھیرنا جائز نہیں ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ جب اسحاق علیہ السلام کی بشارت سنائی گئی تو ساتھ ہی یعقوب علیہ السلام کی بھی بشارت سنائی گئی جو حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ۝ (یعنی ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی اور اسحٰق کے پیچھے یعقوب کی) تو یہ متصور ہو ہی نہیں سکتا کہ یعقوب علیہ السلام کی ولادت سے پہلے حضرت اسحاق کے قریب البلوغ ہونے کی عمر میں ان کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ۝

”اور جب وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے [1] آپ نے فرمایا اے میرے پیارے فرزند! میں نے دیکھا ہے خواب میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں [2] اب بتا تیری کیا رائے ہے [3] عرض کیا میرے پدر بزرگوار! کر ڈالئے جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں سے پائیں گے [4]“

[1] اس کا عطف ایک محذوف جملہ پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَوُلِدَ لَهُ الْغُلَامُ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ یعنی آپ کے ہاں بچہ پیدا ہوا پھر جب وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ کام کر سکے۔ اور آپ کی معاونت کر سکے۔ کلبی کہتے ہیں السعی سے مراد اللہ کی رضا کے

کیا ہے کہ وہ جب جوان ہو گیا اور ابراہیم علیہ السلام کی کوشش کی طرح کوشش کرنے لگا(1) بعض علماء فرماتے ہیں اس وقت حضرت اسماعیل کی عمر تیرہ سال تھی۔ بعض فرماتے ہیں سترہ سال تھی۔ ظرف یعنی معہ محذوف کے متعلق ہے جس پر السعی دلالت کر رہا ہے۔ السعی کے متعلق نہیں ہے کیونکہ السعی مصدر ہے اور مصدر کا صلہ اس سے مقدم نہیں ہوتا اور یہ بلغ کے متعلق بھی نہیں کیونکہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی بلوغت اکٹھی نہیں ہے گویا یوں ارشاد ہے کہ فلما بلغ السعی جب وہ دوڑ دھوپ کی عمر کو پہنچ گیا فقیل مع من؟ تو سوال ہوا کس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کو پہنچا؟ فقیل : معہ۔ تو فرمایا اپنے باپ کے ساتھ۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ معہ ظرف مستقر ہے اور السعی سے حال ہے۔ یابُنَیَّ کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

لہ حضرت ابراہیم نے خواب میں واقعی بیٹے کو ذبح کرتے دیکھا تھا یا یہ بھی احتمال ہے کہ کوئی ایسا خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر بیٹے کا ذبح کرنا تھا۔ محمد بن اسحاق لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل سے ملاقات کا ارادہ کرتے تو براق پر سوار ہوتے۔ شام سے صبح کے وقت چلتے اور قیلولہ مکہ میں کرتے پھر شام کے وقت مکہ سے چلتے اور رات ملک شام میں بسر فرماتے حتی کہ حضرت اسماعیل آپ کے ساتھ چلنے کی عمر کو پہنچ گئے۔ حضرت ابراہیم کی یہ خواہش تھی کہ اسماعیل اپنے رب کی عبادت اور حرمات الہیہ کی تعظیم بجالائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خواب میں حکم دیا کہ وہ اپنے لخت جگر اور نور نظر کو ذبح کریں۔ یہ خواب آپ نے آٹھویں رات کو دیکھا تھا گویا کوئی کہنے والا کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو آپ صبح سے شام تک متفکر رہے کہ یہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطان کی کوئی فریب کاری ہے۔ اسی وجہ سے آٹھویں کے دن کو یوم الترویہ (غور و فکر کا دن) کہا جاتا ہے۔ جب اگلی رات ہوئی تو آپ نے پھر وہی خواب دیکھا جب صبح ہوئی تو آپ جان گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی وجہ سے نویں ذی الحجہ کے دن کو یوم عرفہ (پہچان کا دن) کہا جاتا ہے(2)۔ علامہ بیہقی نے کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے شعب الایمان میں اس طرح نقل کیا ہے ابن اسحاق وغیرہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو آپ نے اپنے شہزادے سے فرمایا رسی اور چھری پکڑو۔ اس وادی سے ہم لکڑی کاٹ لائیں۔ جب شعب ثبیر میں پہنچے تو حضرت ابراہیم نے اپنے صاحبزادے کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ مقاتل فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے متواتر تین راتیں یہ خواب دیکھا۔ پھر جب آپ کو یقین ہو گیا تو آپ نے اپنے بیٹے کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ سدی فرماتے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی رب ھب لی من الصالحین تو آپ کو نیک صالح بچہ کی خوشخبری سنائی گئی۔ آپ نے خوشخبری سننے کے بعد کہا اللہ تعالیٰ نے بچہ دیا تو وہ اللہ کے لئے ذبح کیا جائے گا۔ جب بچہ پیدا ہوا اور اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا اپنی نذر پوری کرو اور بیٹے کو ذبح کرنے کا جو حکم دیا گیا اس کا یہی نذر سبب تھی(3) لیکن یہ قول آزمائش کے منافی ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل کو کہا چلو ہم اللہ کے لئے قربانی دے آئیں۔ انہوں نے چھری اور رسی لے لی اور اپنے باپ کے ساتھ چل پڑے۔ جب پہاڑوں کے درمیان پہنچے تو اسماعیل نے کہا ابا حضور! تمہاری قربانی کا جانور کہاں ہے؟ تو اس وقت آپ نے بتایا کہ بیٹا مجھے خواب میں دکھایا گیا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں(4) نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی علماء نے انی کو دونوں جگہ یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ؔ تری کو حمزہ اور کسائی نے تاء کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور یہ رای سے مشتق ہے، رؤیت سے مشتق نہیں ہے، یعنی تیری کیا رائے ہے؟ آپ نے اپنے بیٹے سے اس لئے رائے طلب کی تا کہ امر الٰہی پر آپ کے صبر اور طاعت الٰہی پر آپ کی عزیمت معلوم ہو جائے۔ باقی قراء نے تاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو راء کے فتحہ میں امالہ کرتے ہیں۔

۳ؔ حضرت اسماعیل نے خندہ پیشانی اور خوشی سے عرض کیا ابا جان آپ کو جو حکم دیا گیا ہے آپ وہ کریں۔ ماتؤمر اصل میں ماتومربہ تھا۔ یا تو جار مجرور (بہ) کو اکٹھا حذف کیا گیا ہے۔ پہلے حرف جر کو حذف کیا گیا اور فعل کو ضمیر کے ساتھ ملا دیا گیا (ماتومرہ) ہو گیا پھر ضمیر عائد کو بھی حذف کر دیا گیا یا امر بمعنی مامور ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے افعل امرک ای مامورک مامور کو تعبیر کرنے کے لئے ہے۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کے خواب وحی الٰہی ہوتے ہیں اور واجب الاطاعت ہوتے ہیں۔ عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ انبیاء کرام کے خواب وحی ہوتے ہیں (1) بخاری نے اپنی صحیح میں ابو سعید الخدری سے اور مسلم نے ابن عمر اور ابو ہریرہ سے امام احمد اور ابن ماجہ نے ابی رزین سے اور طبرانی نے ابن مسعود سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہیں (2) اس میں ذرا شک نہیں کہ انبیاء کرام کے تمام خواب سچے ہوتے ہیں، فساد کا احتمال نہیں رکھتے لیکن دوسرے لوگوں کے خواب سچے بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی ہوتے ہیں۔ ستجدنی کو نافع نے یاء کے فتحہ کے ساتھ باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾

”پس جب دونوں نے سر اطاعت خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۱ؔ“

۱ؔ یعنی باپ بیٹا حکم الٰہی کے سامنے جھک گئے اور ارشاد الٰہی کی اطاعت کی۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ابراہیم نے اپنے بیٹے کو مطیع بنا دیا اور اسماعیل نے اپنے نفس کو مطیع کر دیا (3) ابن عباس فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو زمین پر لٹا دیا، جب کہ پیشانی دونوں پہلوؤں کے درمیان تھی (4) اور یہ واقعہ منیٰ میں صخرہ کے پاس ہوا تھا۔ اس قول کو عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ بغوی نے عن عطاء بن السائب عن رجل من قریش عن ابیہ کے سلسلہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے حضرت اسماعیل کی ذبح کا معاملہ اسی جگہ ہوا تھا جو آج بھی قربانی کرنے کی جگہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں مفسرین نے یہ روایت بھی لکھی ہے کہ حضرت اسماعیل نے حضرت ابراہیم سے عرض کی اے میرے والد محترم میرے اعضاء کو سختی سے باندھ دیں حتیٰ کہ ذبح کے وقت میں حرکت نہ کروں اور اپنے کپڑوں کو اچھی طرح لپیٹ لو تا کہ میرے خون کا کوئی چھینٹا ان پر نہ لگ جائے اور میرے اجر میں کمی نہ ہو جائے اور میرے خون کو دیکھ کر میری والدہ پریشان نہ ہو جائے۔ مزید عرض کیا ابو! اپنی چھری اچھی طرح تیز کر لیں اور میرے حلق پر اسے تیزی سے چلانا تا کہ مجھ پر آسانی رہے کیونکہ موت کا معاملہ بڑا سخت ہوتا ہے اور جب آپ [illegible] سلام عرض کرنا اور اگر آپ میری قمیص ان کے پاس لے جانا چاہیں تو بھی لے جائیں

کیونکہ ہوسکتا ہے اس سے ان کو کچھ تسلی اور اطمینان ہو جائے۔حضرت ابراہیم نے اپنے لخت جگر کے میٹھے میٹھے کلمات سن کر اور آداب فرزندی دیکھ کر ارشاد فرمایا بیٹا' حکم الٰہی کی اطاعت میں تو کتنا بہتر معاون ہے۔جس طرح اسماعیل نے کہا تھا حضرت ابراہیم نے اسی طرح کیا۔پھر حضرت ابراہیم نے اپنے لخت جگر کو بوسہ دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔اس وقت حضرت ابراہیم کی آنکھوں میں رحمت و شفقت کے آنسو اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔آپ نے رضاالٰہی میں اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دی لیکن چھری سے اسماعیل کے گلے پر کوئی خراش بھی نہ پڑی۔روایت ہے کہ حضرت ابراہیم نے کئی مرتبہ گلے پر چھری چلائی لیکن چھری نے گلے کو نہ کاٹا۔آپ نے چھری کو پتھر پر دو تین مرتبہ تیز کیا لیکن چھری کام نہیں کرتی تھی(1)۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کئی مرتبہ پوری قوت سے چھری کو چلایا لیکن چھری نے کچھ اثر نہ کیا۔اللہ تعالیٰ نے اسماعیل کے گلے پر تانبا چڑھا دیا تھا۔علماء نے یہ روایت بھی لکھی ہے کہ حضرت اسماعیل نے عرض کی ابا حضور! آپ مجھے پیشانی کے بل پہلو پر لٹا دیں کیونکہ آپ میرے چہرے کو دیکھیں گے تو آپ کو مجھ پر رحم آ جائے گا۔کہیں ایسا نہ ہو کہ امر الٰہی کی اطاعت میں رقت وشفقت کا جذبہ حائل نہ ہو جائے۔اس طرح میں چھری کو دیکھ کر جزع فزع بھی نہیں کروں گا۔حضرت ابراہیم نے اپنے نور نظر کے مشورہ پر عمل کیا پھر آپ نے ان کی گدی پر چھری رکھی تو چھری الٹی ہوگئی۔

عبد بن حمید' ابن المنذر' ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اور عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے بھی روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے صاحبزادے کو منہ کے بل لٹایا تھا(2)۔

ابو ہریرہ نے حضرت کعب الاحبار سے اور ابن اسحاق نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو شیطان نے دل میں کہا اگر آج میں آل ابراہیم کو نہ بھٹکا سکا تو پھر کبھی ان میں سے کسی کو نہیں بھٹکا سکوں گا۔شیطان لعین انسانی شکل میں بچہ کی ماں کے پاس پہنچا اور کہا اے محترمہ! تجھے پتہ ہے تیرے لخت جگر کو ابراہیم کہاں لے گیا ہے؟ والدہ نے کہا وہ دونوں باپ بیٹا قریب کی وادی میں لکڑیاں کاٹنے گئے ہیں۔شیطان نے کہا قسم بخدا ایسا نہیں، ابراہیم تو اسے ذبح کرنے کے لئے لے گیا ہے۔ماں نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا وہ تو اپنے بیٹے پر انتہائی شفیق ہے اور وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔شیطان نے کہا نہیں۔ایسا نہیں ابراہیم کا خیال ہے کہ مجھے اللہ نے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔وہ اسی ارادہ اور خیال کو پورا کرنے کے لئے لے گیا ہے۔والدہ نے کہا اگر واقعی اس کے رب نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا ہے تو پھر اچھا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی اطاعت کریں۔شیطان کا داؤ جب وہاں نہ لگا تو وہاں سے نامراد ہو کر دوڑتا ہوا بیٹے (اسماعیل) کے پاس پہنچا۔آپ اپنے باپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔شیطان کہنے لگا اے عزیز تمہیں پتہ ہے تیرا باپ تجھے کس وادی میں لے جا رہا ہے؟ بیٹے نے کہا ہم اس وادی میں اپنے گھر والوں کے لئے لکڑیاں کاٹنے کے لئے جا رہے ہیں۔شیطان نے کہا نہیں اللہ کی قسم ایسا نہیں۔وہ تمہیں ذبح کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔بیٹے نے پوچھا کیوں؟ شیطان نے کہا ابراہیم کا خیال ہے۔کہ اسے اس کے رب نے بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا ہے بیٹے نے کہا اگر ان کے پروردگار نے انہیں حکم دیا ہے تو پھر انہیں ضرور ایسا کرنا چاہئے۔جب بیٹے نے بھی شیطان کے دام ہمرنگ زمیں کو تار تار کر دیا تو شیطان ابراہیم کی طرف متوجہ ہوا۔کہنے لگا بزرگو! کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا اس وادی میں ایک کام کی غرض [illegible]

ہوں۔ شیطان نے کہا نہیں میرا خیال تو یہ ہے کہ شیطان نے تجھے خواب میں بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا ہے اور تم اسی خیال کو پورا کرنے جا رہے ہو۔ حضرت ابراہیم اپنی فراست سے پہچان گئے کہ یہ شیطان لعین ہے۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا اے اللہ کے دشمن دور ہو جا مجھ سے۔ قسم بخدا میں اپنے رب کے حکم کو بسر و چشم قبول کروں گا اور اس پر دل و جان سے عمل پیرا ہوں گا۔ ابلیس غصے کی آگ میں جلتا ہوا واپس پلٹا اور ابراہیم اور آل ابراہیم کے متعلق جو امیدیں اور آرزوئیں لے کر گیا تھا وہ سب کی سب اس کے دل میں ہی رہ گئیں اور اپنا منہ لے کر رہ گیا۔ تائید الٰہی سے وہ سب شیطان کی فسوں کاریوں اور وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رہے (1)۔

ابوالطفیل نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ملا تو شیطان مشعر (مزدلفہ) کے پاس آپ کے سامنے آیا لیکن ابراہیم علیہ السلام اس سے آگے نکل گئے پھر جب آپ جمرہ عقبہ کے پاس پہنچے تو پھر شیطان سامنے آیا آپ نے اس کو سات کنکریاں ماریں۔ آپ اپنی منزل کی طرف چلتے گئے۔ جب آپ جمرہ وسطیٰ کے پاس پہنچے تو وہ لعین پھر پہنچ گیا آپ نے یہاں بھی اسے سات کنکریاں ماریں پھر آپ روانہ ہو گئے حتیٰ کہ آپ جمرہ کبریٰ کے پاس پہنچے تو وہ لعین پھر پہنچ گیا آپ نے یہاں بھی اسے سات کنکریاں ماریں اور اپنے مقصد کی طرف گامزن رہے حتیٰ کہ منیٰ میں قربانی کی جگہ پہنچ کر حکم الٰہی کی تعمیل میں اپنے لخت جگر نور نظر کو زمین پر لٹا دیا۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

''اور ہم نے آواز دی اے ابراہیم (بس ہاتھ روک لو!) لے''

لے امام بغوی فرماتے ہیں واو زائدہ ہے اور نادیناہ کا جواب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں لما کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی کہ جو ہو چکا سو ہو چکا ان دونوں کی مسرت اور خوشی ایسی تھی کہ نہ کوئی حال کو بیان کر سکتا ہے اور نہ کوئی کلام اس کا احاطہ کر سکتی ہے اور ان کا انعامات الٰہیہ پر شکر بھی قابل دید تھا کہ اس پروردگار عالم نے مصیبت کو دور کر دیا اور اطاعت و فرمانبرداری کی ایسی توفیق بخشی کہ ایسی کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائی اور پھر عظیم ثواب کے عطا کرنے کے بعد تمام جہاں پر فضیلت بھی عطا فرمائی (2) میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واو لما کے محذوف جواب پر عطف کے لئے ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ مَنَعْنَاهُ عَنْهُ الذَّبْحَ وَنَادَيْنَاهُ، یعنی جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو ہم نے اسے ذبح کرنے سے روک دیا اور ہم نے آواز دی اے ابراہیم! اَنْ نادینا کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾

''بیشک تو نے سچ کر دکھایا خواب کو لے ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنوں کو لے''

لے اے ابراہیم! آپ نے اپنی قدرت کے مطابق اطاعت حکم کو خوب نبھا دیا اور تکلیف و ابتلاء سے مقصود بندے کا اپنی قدرت کے مطابق عمل کر دکھانا ہے، اس کے علاوہ تکلیف و ابتلاء سے کچھ مطلوب نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ خون بہاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور جو کچھ خواب میں دیکھا تھا وہ عالم بیداری میں بھی

تاویل کے مطابق حضرت ابراہیم پر ذبح کرنا واجب نہیں تھا ان پر صرف اسباب ذبح کا مہیا کرنا تھا تو پھر و فدیناہ کا کیا معنی ہوگا کیونکہ فدیہ تو وجوب کے بعد ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری تقدیر پر اگر ذبح کے اسباب مہیا کرنا اصلاً واجب تھا تو ذبح دلالۃً واجب ہوگیا کیونکہ عادۃً اسباب کے مہیا کرنے کے بعد چیز کا پایا جانا لازم ہوتا ہے اس لئے فدیہ کا اس پر اطلاق صحیح ہے (یعنی گلے پر چھری چلائی جائے تو عادۃً ذبح کا پایا جانا لازم ہوتا ہے تو جب آپ نے خواب میں چھری چلانا دیکھا تھا تو ذبح کرنا بھی التزاماً ثابت تھا) یہ آیت کریمہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ کسی حکم پر عمل سے پہلے بھی اس حکم کا نسخ ہوسکتا ہے۔

۲؎ یہ جملہ ان کی احسان مندی کی وجہ سے تکلیف کے دور ہونے کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی نیکوکاروں اور اطاعت شعاروں کو ان کی فرمانبرداری کی ہم اسی طرح جزاء دیتے ہیں جیسی ہم نے ابراہیم کو عطا فرمائی تھی۔ ہم نے بچے کو ذبح کرنے کا حکم بھی اٹھا دیا اور اجر عظیم بھی عطا فرمایا اور تمام جہانوں پر فضیلت و برتری بھی عطا فرما دی۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿١٠٦﴾

''بیشک یہ بڑی کھلی آزمائش تھی ۱؎''

۱؎ یعنی بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ایک ایسی آزمائش تھی جس سے مخلص اور غیر مخلص بالکل نکھر کر سامنے آجاتے ہیں یا یہ مطلب کہ یہ ایسی مشقت اور صعوبت تھی کہ اس سے بڑی اور کوئی مشکل نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بلاء سے مراد نعمت ہے، یعنی بیٹے کی جگہ دنبہ کا فدیہ بہت بڑی نعمت ہے۔

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿١٠٧﴾

''اور ہم نے بچالیا اسے فدیہ میں ۱؎ ایک عظیم ذبیحہ دے کر ۲؎''

۱؎ اس کا عطف نادینا پر ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ آواز سنی تو آسمان کی طرف دیکھا' حضرت جبرئیل ایک سیاہ سینگوں والے دنبے کے ساتھ نظر آئے۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا یہ تمہارے بیٹے کا فدیہ ہے، اسے چھوڑ دیجئے اور اسے ذبح فرمایئے۔ حضرت جبرئیل نے تکبیر بلند کی اور مینڈھے نے بھی تکبیر بلند کی۔ حضرت ابراہیم نے تکبیر کہی اور آپ کے بیٹے نے بھی تکبیر کہی۔ حضرت ابراہیم نے مینڈھے کو پکڑا اور منیٰ میں مذبح کے اندر لے گئے پھر وہاں اسے ذبح کر دیا' فدیہ دینے والے حقیقت میں ابراہیم تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے فدیہ کے طور پر ذبیحہ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ تھا اور اس کا حکم کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ تھا۔ یہ فدیہ میں مجازی نسبت میں مجاز کے طور پر ہے۔

۲؎ عظیم سے مراد عظیم الجثة ہے۔ یعنی موٹا تازہ بھاری بھر کم یا عظیم القدر، یعنی ثواب میں بہت عظیم تھا۔ حسین بن الفضل فرماتے ہیں وہ مینڈھا عظیم القدر اس لئے تھا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا حق تھا کہ وہ عظیم ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کو عظیم اس لئے فرمایا کیونکہ وہ مقبول تھا(۱)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اکثر مفسرین کا یہ قول ہے کہ وہ مینڈھا جنت میں

ہے کہ جو مینڈھا حضرت ابراہیم نے ذبح کیا تھا یہ وہ تھا جسے حضرت آدم کے بیٹے ہابیل نے قربانی دیا تھا(1) اسی آیت کریمہ سے علماء احناف نے دلیل پکڑی ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر مانے اس پر ایک بکری ذبح کرنا لازم ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے(2)۔ ہم نے یہ مسئلہ پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ حج میں وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ کے تحت ذکر کر دیا ہے اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسی نذر ماننے والے پر کوئی چیز لازم نہ ہو کیونکہ اس نے گناہ کی نذر مانی ہے۔ امام ابو یوسف کا بھی یہی قول ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے استحساناً بکری کا لازم ہونا فرمایا ہے۔ کیونکہ جب شرعاً حقیقت مہجورہ ہو تو مجاز متعین ہو جاتا ہے پس جب کسی نے بچے کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو ہم نے اس کا بدل اس پر لازم کیا، یعنی اس پر بکری ذبح کرنا لازم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ بھی یہی تھا جیسا کہ ہم نے سورۂ حج میں ذکر کیا ہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿١٠٨﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿١٠٩﴾

''اور ہم نے چھوڑا ان کا ذکر خیر آنے والوں میں سلام ہو ابراہیم پر[1]''

[1] علیه کی ضمیر کا مرجع ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اس جملہ کا عطف جاء ربه بقلب سلیم پر ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فدیناه پر عطف ہو۔ آخرین سے مراد آنے والے لوگ اور امتیں ہیں۔ ترکنا کے مفعول کو سیاق کلام کی دلالت کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ، ترکنا کا مفعول ہو۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٠﴾ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١١﴾

''اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا[1]''

[1] یہ جملہ سلام کی علت بیان کر رہا ہے۔ اس قصہ میں چونکہ ''اِنَّا'' کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس لئے یہاں ذکر نہیں فرمایا۔

وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿١١٢﴾

''اور ہم نے بشارت دی آپ کو اسحٰق کی (کہ) وہ نبی ہوگا (زمرہ) صالحین میں سے[1]''

[1] یعنی نبوت اور اصلاح میں سے ہر ایک کو مقضی (جس کا فیصلہ کیا گیا ہو) اور مقدر بنانے کے اعتبار سے نبیًا اور مِّنَ الصَّالِحِينَ اسحٰق سے حال ہوں گے۔ اور مبشر بہ (اسحٰق) کا بشارت کے وقت موجود نہ ہونا بھی قدح کا باعث نہیں ہے کیونکہ ذوالحال کا موجود ہونا شرط نہیں ہے بلکہ ذوالحال کے ساتھ فعل کے تعلق کے وقت حال کے مضمون سے ذوالحال کا متصف ہونا شرط ہے پس یہاں مضاف مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے جو حال اور ذوالحال کا عامل بنے۔ مثلاً یہ کہا جائے بشرناه بوجود اسحاق اور یہ قول فادخلوها خالدین کی مثل نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں داخل ہونے والوں کا خلود دخول کے وقت مقدر تھا۔ جب کہ اسحاق کے پائے جانے کے وقت ان کی نبوت وصلاح مقدر نہیں تھی۔ نبوت کے بعد صلاح کا ذکر حضرت اسحاق علیہ السلام کی ثناء اور آپ کی عظمت شان کے اظہار کے لئے ہے (تاکہ صراحۃً آپ کی تعریف وتوصیف پر دلالت ہو جائے اگرچہ نبوت کے ذکر میں التزاماً آپ کی صلاح کا بھی ذکر ہو چکا تھا) اور نبوت کے بعد صلاح کا ذکر اشارہ ہے کہ نبوت کی غایت صلاح ہے کیونکہ نبوت کے ضمن میں بالفعل علی الاطلاق

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ۭ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿١١٣﴾

''اورہم نے برکتیں نازل کیں اس پر اور اسحاق پر اور ان کی نسل میں کوئی نیک ہوگا اور کوئی اپنی جان پر کھلا ظلم کرنے والا ہوگا ۱؎''

۱؎ یعنی دین و دنیا کی خیرات و برکات کا ہم نے ابراہیم پر فیضان فرمایا۔ بعض علماء نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ہم نے ان کی اولاد میں برکت نازل کی اور اسحٰق پر بھی برکتیں نازل کیں۔ حضرت پر خاص برکت یہ تھی کہ آپ کی نسل سے ہزار نبی تشریف لائے۔ ان میں پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے اور آخری عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ ان دونوں یعنی ابراہیم اور اسحٰق کی اولاد میں نیک سیرت ہوں گے یا ایمان و طاعت کے ساتھ اپنے نفس سے بھلائی کرنے والے ہوں گے۔ ''مبین'' یعنی ان کا ظلم ظاہر ہوگا۔ اس آیت میں تنبیہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی میں نسب کا کوئی اثر نہیں ہے اور اولاد میں ظلم و معاصی کا پایا جانا بزرگوں کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں ہے

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١١٤﴾

''ہم نے احسان فرمایا موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) پر ۱؎''

۱؎ نبوت اور دوسرے دینی اور دینوی انعامات سے سرفراز فرمایا۔ اس آیت کا عطف ولقد نادانا نوحٌ پر ہے۔ اور ان کے درمیان جملے معترضہ ہیں۔

وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿١١٥﴾

''اورہم نے بچالیا ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑے غم و اندوہ سے ۱؎''

۱؎ قوم سے مراد بنی اسرائیل ہے۔ اَلْكَرْبِ الْعَظِيْمِ سے مراد فرعون کی اذیت ہے اور بعض مفسرین نے اس لئے غرق ہونے سے نجات مراد لی ہے۔

وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٦﴾

''اورہم نے ان کی مدد فرمائی پس ہوگئے وہی غلبہ پانے والے ۱؎''

۱؎ نَصَرْنٰهُمْ میں ھم ضمیر سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم ہے، یعنی وہ فرعون اور اس کی قوم پر غالب آگئے۔

وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿١١٧﴾

''اورہم نے بخشی ان دونوں کو ایسی کتاب جو نہایت واضح ہے ۱؎''

۱؎ کتاب سے مراد تورات ہے۔ اَلْمُسْتَبِيْنَ یعنی جو احکام الٰہی اور شرائع کے بیان میں مکمل تھی۔

وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١١٨﴾

''اورہم نے ہدایت دی انہیں سیدھے راستہ کی ۱؎''

نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣١﴾ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾

''اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو بیشک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں [1]۔''

[1] ان آیات کا مفہوم پیچھے گذر چکا ہے۔

وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٢٣﴾

''اور بیشک الیاس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے ہیں [1]''

[1] الیاس کو ابن ذکوان نے بروایت النقاش عن الاخفش ہمزہ کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے تحقق کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس آیت کا عطف ولقد مننا پر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں الیاس سے مراد ادریس پیغمبر ہیں اور عبداللہ بن مسعود کے مصحف میں اِنّ ادریس لمن المرسلین تھا۔ عکرمہ کا بھی یہی قول ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں الیاس بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ حضرت الیسع علیہ السلام کے چچا زاد بھائی تھے۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں حضرت الیاس کا سلسلہ نسب اس طرح ہے الیاس بن بشر بن فنحاص بن عیزار بن ہارون بن عمران علیہ السلام نیز محمد بن اسحاق اور دوسرے مؤرخین علماء نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس سے پہلے نبی کی روح قبض کی تو بنی اسرائیل بدعتوں میں مبتلا ہو گئے، شرک کا غبار ہر طرف پھیل گیا اور لوگوں نے بڑے بڑے بت نصب کر دیئے جن کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے گمراہی کے اس گھپ اندھیرے میں توحید و ہدایت کا چراغ روشن کرنے کے لئے حضرت الیاس کو نبی بنا کر بھیجا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو نبی بھی مبعوث ہوتا وہ ان احکام کی تجدید کے لئے آتا جو وہ تورات میں سے بھلا چکے تھے۔ بنو اسرائیل شام کے علاقہ میں بکھرے ہوئے تھے اس انتشار کا سبب یہ تھا کہ یوشع بن نون نے جب شام کو فتح کیا تو اس نے یہاں بنی اسرائیل کو سکونت دی اور یہ علاقہ ان میں تقسیم کر دیا۔ بنی اسرائیل کا ایک قبیلہ بعلبک اور اس کے گرد و نواح میں قیام پذیر تھا۔ ان میں سے حضرت الیاس تھے اور ان کی طرف آپ کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس وقت بعلبک کا بادشاہ اُجب نامی شخص تھا۔ وہ بادشاہ خود بھی بت پرست تھا اور وہ لوگوں کو بھی بتوں کی عبادت پر مجبور کیا کرتا تھا۔ بادشاہ جس بت کی عبادت کرتا تھا اس کا نام بعل تھا جس کا طول بیس ہاتھ تھا اور اس کے چار منہ تھے۔ حضرت الیاس لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلاتے لیکن وہ اپنے بادشاہ کا حکم مانتے اور آپ کی کوئی بات نہ سنتے اور بادشاہ اس بت کی تصدیق کرتا اور اسی کو تسلیم کرتا تھا۔ حضرت الیاس بادشاہ کی بھی راہنمائی کرتے اور اس کے اعمال بد کو بھی سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُجب بادشاہ کی ایک بیوی تھی جس کا نام ازبیل تھا۔ بادشاہ جب کسی جنگی مہم یا کسی دوسری غرض سے ملک سے باہر جاتا تو اسے اپنا نائب بنا کر جاتا تھا اور وہ بے حجاب باہر نکلتی اور لوگوں کے مسائل کے فیصلے کرتی تھی وہ بہت سے انبیاء کرام کی قاتل تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو بھی اس بدبخت عورت نے قتل کیا تھا۔ اس عورت کا ایک کاتب تھا جو مومن اور دانشمند تھا، اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا، اس خوش نصیب شخص نے اس ظالم

بچے اور بچیاں ستر کی تعداد میں تھے اور اس اُجب بادشاہ کا ایک پڑوسی تھا جو ایک نیک سیرت انسان تھا، اس کا نام مزد کی تھا اور اس کا ایک باغ تھا جس پر اس کی معیشت کا دارومدار تھا۔ ہر وقت وہ اس کی آبادکاری اور کانٹ چھانٹ میں مصروف رہتا تھا اور وہ باغ بادشاہ کے محل کے سامنے تھا۔ وہ میاں بیوی اس میں سیر وتفریح کے لئے آتے تھے، اس میں وہ کھاتے پیتے اور غسل کرتے تھے۔ بادشاہ اپنے پڑوسی مزد کی سے حسن سلوک سے پیش آتا تھا اور وہ بھی بادشاہ سے اچھا برتاؤ کرتا تھا لیکن بادشاہ کی بیوی ازبیل اس کے باغ کی وجہ سے اس سے حسد کرتی تھی اور ہمیشہ کسی ایسے حیلے کی تلاش میں رہتی تھی جس کے ذریعہ سے وہ باغ اس سے غصب کر لے کیونکہ وہ سنتی تھی کہ لوگ اس باغ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور اس کی خوبصورتی پر اظہار تعجب کرتے ہیں۔ ازبیل اس شخص کو قتل کرنے کا حیلہ کرتی تھی لیکن بادشاہ اسے منع کرتا تھا۔ ازبیل کو اب اس کو قتل کرنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا سوئے اتفاق کہ بادشاہ کہیں سفر پر دور چلا گیا اور کافی عرصہ اپنے ملک سے باہر رہا۔ ازبیل نے موقع کو غنیمت سمجھا اور چند آدمی مزد کی کے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار کئے کہ اس نے بادشاہ اُجب کو گالیاں دی ہیں۔ گواہ گواہی دینے کے لئے تیار ہوگئے اور اس زمانہ میں قانون یہ تھا کہ جو بادشاہ کو گالیاں دے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ مزد کی کے خلاف جھوٹی گواہی ہوگئی تو ازبیل نے مزد کی کو بلایا اور کہا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تو نے بادشاہ کو گالیاں دی ہیں۔ مزد کی نے انکار کیا۔ اس نے گواہوں کو بلا لیا اور جھوٹی گواہی اس کے خلاف پیش کر دی۔ ازبیل نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا اور اس کے باغ پر خود قبضہ کر لیا' اس نیک آدمی کو قتل کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے۔

جب بادشاہ واپس آیا تو اس کو ساری صورت حال بیوی نے بتائی۔ بادشاہ نے کہا تو نے اچھا نہیں کیا۔ اب ہم کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ بڑے عرصہ سے وہ ہمارا پڑوسی رہا اور ہم نے اس کے پڑوس کو خوب نبھایا اور ہم نے اس سے ہر تکلیف کو روکے رکھا کیونکہ ہم پر اس کے پڑوس کا حق تھا اور تو نے اس کے جوار کو برے انداز میں ختم کیا ہے۔ بیوی نے کہا میں تو تیری وجہ سے اس پر غضبناک ہوئی تھی اور تیرے قانون کے مطابق میں نے فیصلہ کیا تھا۔ بادشاہ نے بیوی سے کہا تیرے لئے ممکن نہ تھا کہ تو اس کے پڑوس کی حفاظت کرتی بیوی نے کہا جو ہو گیا سو ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے الیاس کو اُجب بادشاہ اور اس کی قوم کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ انہیں بتاؤ کہ اللہ تم لوگوں پر ناراض ہے کیونکہ تم نے اس کے دوست کو قتل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے کہ اگر انہوں نے اپنے اس کرتوت کی توبہ نہ کی اور باغ اس کے ورثاء کو نہ دیا تو انہیں یعنی اُجب اور اس کی بیوی کو باغ میں ہلاک کر دے گا پھر ان کے جسم باغ میں مرداروں کی طرح پڑے رہیں گے حتیٰ کہ ہڈیوں سے گوشت اتر جائے گا اور وہ اپنے جسموں سے بہت تھوڑا عرصہ متمتع ہوں گے۔ حضرت الیاس بادشاہ کے پاس آئے اور جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اور اس کی بیوی کے متعلق باغ واپس کرنے کا ارشاد فرمایا تھا وہ من وعن سنا دیا۔ بادشاہ نے جب یہ پیغام سنا تو غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور کہنے لگا الیاس جو کچھ کہہ رہے ہو سب باطل ہے۔ فلاں فلاں افراد جو بتوں کی عبادت کرتے بالکل ہماری مثل تھے، وہ کھاتے پیتے رہے اور نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور جس چیز کو تم باطل سمجھتے ہو اس کے ہوتے ہوئے ان کے کسی دنیوی معاملہ میں کوئی نقصان اور خسارہ نہ ہوا۔ ان پر ہمیں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ بادشاہ نے حضرت الیاس کو سزا دینے اور قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ جب حضرت الیاس نے سمجھا کہ وہ مجھے تکلیف پہنچانے کے درپے ہے تو آپ اس کو چھوڑ کر چلے گئے اور

رہے، زمین کی بوٹیوں کے پتے اور درختوں کے پھل کھاتے رہے۔ بادشاہ کے حواری حضرت الیاس کی تلاش میں رہے اور انہوں نے کچھ جاسوس چھوڑے لیکن اللہ تعالیٰ نے الیاس کو ان ظالموں سے بچائے رکھا۔ پھر جب سات سال مکمل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو اپنے اظہار اور اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے اُجب کے بیٹے کو مریض کر دیا۔ اُجب کو وہ بیٹا بہت پیارا تھا اور اس کی مشابہت رکھتا تھا اس کا بیٹا سخت مریض ہو گیا حتی کہ بادشاہ اس کی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنے بت بعل سے دعا مانگی۔ اس وقت کے لوگ بعل کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا تھے وہ اس بت کا بہت احترام کرتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے چار سو خادم اس کے لئے مقرر کر رکھے تھے۔ ان مجاوروں اور خادموں کو انبیاء کہتے تھے شیطان بت کے اندر داخل ہو جاتا اور باتیں کرتا تھا۔ یہ چار سو مجاور پورے انہماک سے شیطان کی باتیں سنتے اور شریعت کے متعلق ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا۔ شیطان سے سنی ہوئی باتیں مجاور لوگوں کے سامنے بیان کرتے اور لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ انہیں انبیاء کہتے تھے۔ جب لڑکے کا مرض شدت اختیار کر گیا تو بادشاہ نے ان مجاوروں سے درخواست کی کہ بعل کے سامنے سفارش کریں اور اس سے اس کے بیٹے کے لئے شفا طلب کریں۔ مجاروں نے دعائیں مانگیں لیکن اس بت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ شیطان کو بعل کے اندر داخل ہونے سے روک لیا حالانکہ مجاورین گڑ گڑا کر پورے خشوع خضوع سے دعا مانگتے رہے۔ جب عرصہ دراز گذر گیا اور بت کے سامنے کچھ شنوائی نہ ہوئی تو مجاوروں نے اجب سے کہا شام کے فلاں علاقہ میں چند اور خدا ہیں ان کی طرف ان مجاوروں کو بھیجو شاید وہ تیرے خدا بعل سے سفارش کریں کیونکہ تیرا خدا بعل تجھ سے ناراض ہے اگر وہ تجھ سے ناراض نہ ہوتا تو تیری گذارش ضرور قبول کرتا۔ بادشاہ نے کہا مجھ سے ناراض کیوں ہے؟ میں تو اس کی اطاعت کرتا ہوں۔ مجاروں نے بتایا اس کی ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ تو نے الیاس کو قتل نہیں کیا اور تو نے اس کے معاملہ میں کوتاہی کی حتیٰ کہ وہ سلامتی کے ساتھ نکل گیا۔ حالانکہ وہ تیرے خدا کا منکر ہے۔ اُجب نے کہا میں الیاس کو اب کیسے قتل کر سکتا ہوں' میرا بیٹا بیمار ہے میں اس کو تلاش نہیں کر سکتا، نہ مجھے اس کے ٹھکانے اور جگہ کا علم ہے کہ میں اس کا قصد کروں۔ اگر میرے بیٹے کو عافیت ہو گئی تو میں اس کو تلاش کر کے قتل کروں گا اور اپنے خدا کو راضی کروں گا پھر اس نے اپنے وہ چار سو انبیاء (مجاروں) دوسرے شام کے خداؤں کی طرف بھیجے تا کہ وہ بادشاہ کے بت کے پاس سفارش کریں کہ اس کے بیٹے کو شفا ہو جائے۔ جب وہ چار سو کا جتھہ جا رہا تھا اس پہاڑ کے سامنے پہنچے جس میں حضرت الیاس پوشیدہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو وحی فرمائی کہ پہاڑ سے اترو' ان کے سامنے جاؤ اور ان سے بات چیت کرو اور فرمایا ڈرو نہیں میں تجھ سے ان کے شر کو پھیر دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ حضرت الیاس پہاڑ سے نیچے تشریف لائے۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہیں روک لیا۔ جب وہ ٹھہرے تو فرمایا اللہ نے مجھے تمہاری طرف اور تمہارے پچھلے ساتھیوں کی طرف بھیجا ہے۔ اے میری قوم اپنے رب کا پیغام غور سے سنو تا کہ تم اپنے بادشاہ کے پاس بھی یہ پیغام پہنچا دو اور اس کی طرف لوٹ جاؤ اور کہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے اُجب کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں اللہ ہوں اور میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں ہی بنی اسرائیل کا خدا ہوں جس نے انہیں پیدا
[illegible] کم علم نے تجھے اس بات پر ابھارا ہے کہ تو میرا شریک ٹھہرائے اور میرے علاوہ دوسروں

نہیں ہے۔ حضرت الیاس نے انہیں یہ فرمایا اور وہ واپس پلٹ گئے، جب کہ ان کے دل رعب سے بھرے ہوئے تھے۔ جب وہ بادشاہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ الیاس ہمارے سامنے پہاڑ سے اترے تھے۔ وہ ایک بلند قامت دبلے پتلے جسم والے تھے، سر کے بال گر چکے تھے، جلد سکڑی ہوئی تھی اور انہوں نے بالوں کا بنا ہوا جبہ پہنا ہوا تھا اور کانٹوں سے اس کا گریبان سی رکھا تھا۔ اس نے ہمیں روک لیا۔ جب وہ ہمارے پاس پہنچا تو ہمارے دل ہیبت اور خوف سے بھر گئے اور ہماری زبانیں گنگ ہوگئیں۔ ہم اتنی کثیر تعداد میں تھے لیکن نہ تو اس سے بات کر سکے اور نہ اسے پکڑ کر لا سکے۔ حتیٰ کہ ہم اپنا منہ لے کر تیرے پاس لوٹ آئے پھر انہوں نے الیاس کا پیغام بادشاہ کو سنایا۔ اُجب نے کہا جب تک الیاس زندہ ہے زندگی سے نفع بے سود ہے اور اس پر قبضہ پھر کسی مکر وفریب سے کیا جا سکتا ہے۔ پس اس نے ایک سازش کے تحت پچاس مرد اپنی قوم سے چنے جو بڑے طاقتور اور جنگ جو تھے۔ انہیں اس نے الیاس کی گرفتاری اور قتل کے لئے مقرر کیا۔ اس نے انہیں تاکید کی کہ انتہائی حیلہ اور منصوبہ بندی کر کے جانا اور اسے دھوکے سے قتل کرنا اور یہ ظاہر کرنا کہ ہم اور ہمارے پیچھے جتنے لوگ ہیں سب ایمان لا چکے ہیں تاکہ الیاس مانوس ہو جائے اور دھوکا میں آ جائے پھر اسے پکڑ کر بادشاہ کے پاس لایا جائے۔ وہ پچاس افراد بادشاہ کی نصیحت و مشورہ قبول کرتے ہوئے چل پڑے حتیٰ کہ جس پہاڑ میں حضرت الیاس رہتے تھے اس پر چڑھ گئے پھر اس کے اوپر جدا جدا ہو کر بلند آواز سے حضرت الیاس کو پکارنے لگے اور کہنے لگے اے اللہ کے نبی ہماری طرف تشریف لا۔ ہم پر اپنی زیارت کا احسان فرمایئے، ہم سب تم پر ایمان رکھتے ہیں اور تیری تصدیق کرتے ہیں۔ ہمارا بادشاہ اُجب اور تمام لوگ تجھ پر ایمان لا چکے ہیں۔ آپ اپنے متعلق بے خوف ہو جایئے۔ تمام بنی اسرائیل آپ پر سلام بھیجتے ہیں اور دل و جان سے اقرار کر رہے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان لائے ہیں اور تیری دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ آپ ہمارے پاس تشریف لایئے اور ہم میں اپنے احکام نافذ فرمایئے۔ آپ جو حکم دیں ہم تعمیل کریں گے اور جس کام سے آپ منع کریں گے اس سے رک جائیں گے۔ اب تمہیں ہمارے ایمان قبول کرنے کے بعد چھپ کر رہنے کی اجازت نہیں۔ آپ ہماری طرف تشریف لایئے۔ یہ سب باتیں مکر وفریب جھوٹ اور دھوکا تھا۔ جب حضرت الیاس نے ان کی یہ باتیں سنیں تو ان کے ایمان کی کچھ امید ذہن میں آئی اور سوچا کہ اگر اب ظاہر نہ ہوا تو شاید اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں الہام فرمایا کہ ٹھہر جاؤ اور ان کے لئے دعا کرو تو حضرت الیاس نے یہ دعا کی اے اللہ اگر یہ اپنی باتوں میں سچے ہیں تو مجھے ظاہر ہونے کی اجازت دے دے اور اگر یہ سب جھوٹے ہیں تو میری طرف سے تو ان کا کام تمام کر دے اور ان پر آگ کے گولے برسا جو انہیں جلا کر راکھ کر دیں۔ ابھی تک الیاس کی کلام مکمل نہ ہوئی تھی کہ ان پر آگ برسنے لگی جس کے ساتھ وہ سب جل گئے۔ جب یہ خبر اُجب کو پہنچی تو پھر بھی وہ اپنے برے ارادہ سے باز نہ آیا۔ اس نے دوبارہ سازش کرنے کا پروگرام بنایا اور پہلی تعداد کے برابر ایک گروہ تیار کیا جو پہلے لوگوں سے زیادہ طاقتور اور حیلہ ساز تھا' بادشاہ کے حکم سے وہ پہاڑوں کے اوپر چڑھ گئے اور پکارنے لگے' اے اللہ کے نبی! ہم اللہ کے غضب اور اس کی پکڑ سے تیرے وسیلہ کی پناہ لیتے ہیں۔ ہم پہلے لوگوں کی طرح نہیں ہیں، وہ منافق تھے اور ہمارے مشورہ کے بغیر تیرے خلاف سازش کرنے آئے تھے۔ اگر ہمیں ان کا پتہ چل جاتا تو ہم انہیں تہہ تیغ کر دیتے اور تیری حفاظت کرتے پس تیرے رب نے ان کا کام تمام کر دیا اور انہیں ہلاکت کے گڑھے میں پھینک دیا۔ اس پروردگار عالم نے ہماری طرف سے

جب بادشاہ نے دوسرے گروہ کی ہلاکت کی خبر سنی تو وہ انتہائی غضبناک ہوا اور اس نے خود الیاس کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ کیا لیکن بیٹے کی مرض اس کے اس ارادہ میں آڑے آ گئی۔ اس کے لئے خود جانا ممکن نہ ہوا تو اس نے الیاس کی طرف عورت کے مومن کاتب کو بھیجنے کا ارادہ کیا اس امید سے کہ الیاس اس سے مانوس ہوگا اور پہاڑوں سے نیچے اتر آئے گا۔ اس نے کاتب کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ اب وہ الیاس کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور بادشاہ نے کاتب کے سامنے یہ ارادہ اس لئے ظاہر کیا کیونکہ بادشاہ کو اس کے ایمان لانے کا علم تھا اور بادشاہ اس کے ایمان پر مطلع ہونے کے باوجود اس کی تعریف کیا کرتا تھا کیونکہ وہ انتہائی کفایت شعار، امانتدار اور دانشمند آدمی تھا۔ جب اس کاتب کو بادشاہ نے حضرت الیاس کی طرف بھیجا تو اس کے ساتھ آدمیوں کا ایک جتھہ بھیجا۔ بادشاہ نے کاتب کے علاوہ باقی تمام لوگوں کے سامنے اپنے بغض اور کینہ کا اظہار کیا۔ انہیں کہا کہ الیاس کو اعتماد میں لینا اور پھر اگر وہ تمہارے ساتھ نہ آنا چاہے تو باندھ کر لے آنا اور اگر کاتب کے ساتھ آ جائے تو تم اسے خوف زدہ نہ کرنا۔ بادشاہ نے کاتب کے سامنے اپنی توبہ کا بھی ذکر کیا اور مزید کہا کہ اب مجھ پر حقیقت منکشف ہوگئی ہے کہ جتنی مجھے مصیبت پہنچی ہے مثلاً میرے ساتھیوں کا جل جانا اور میرے بچے کا شدید مرض میں مبتلا ہونا یہ سب الیاس کی بددعا کی وجہ سے ہے۔ اب مجھے خدشہ ہے کہ ہمارے باقی ماندہ لوگوں کے لئے بھی وہ بددعا نہ کر دیں اور ہم سب ہلاک نہ ہو جائیں۔ تم اس کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ ہم سب نے توبہ کر لی ہے اور ہماری توبہ درست نہیں ہو سکتی اور ہم رضا الٰہی کو حاصل نہیں کر سکتے اور بتوں کو مکمل طور پر نہیں چھوڑ سکتے جب تک کہ الیاس ہمارے درمیان موجود نہ ہوں اور وہ ہمیں احکام کا حکم نہ دیں اور محرمات سے منع نہ کریں اور جب تک کہ الیاس ہمیں خود آ کر رب کی رضا کے افعال نہ بتائیں۔ بادشاہ نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ تم بت کی عبادت سے الگ ہو جاؤ۔ لوگوں نے بھی کاتب کو کہا کہ تم الیاس کو بتانا کہ ہم جن بتوں کی عبادت کرتے تھے ان کی عبادت ہم نے ترک کر دی ہے۔ الیاس خود آ کر انہیں جلائیں اور انہیں ہلاک کریں۔ یہ سب بادشاہ کی طرف سے دجل اور فریب تھا۔

کاتب اور مقررہ افراد الیاس کی تلاش میں چل پڑے حتی کہ اس پہاڑ پر چڑھ گئے جس میں حضرت الیاس رہتے تھے پھر اس مومن کاتب نے آپ کو آواز دی حضرت الیاس اس کی آواز کو پہچان گئے۔ آپ کے دل میں اس کی ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو وحی فرمائی کہ تم اپنے نیک بھائی کے لئے ظاہر ہو جاؤ اور ان سے ملاقات کرو نیز اس کی بیعت کی تجدید کرو آپ ظاہر ہوئے، اس مومن پر سلام کیا اور مصافحہ فرمایا۔ آپ نے پوچھا کیا خبر ہے؟ اس کاتب مومن نے بتایا کہ اس ظالم جابر نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے پھر اس نے وہ سب کچھ بیان کیا جو قوم نے کہا تھا۔ مزید اس مومن نے کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ تشریف نہ لے گئے تو مجھے خدشہ ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ آپ مجھے جو حکم فرمائیں میں تعمیل ارشاد کروں گا۔ اگر آپ چاہیں تو میں انہیں چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو جاؤں اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی طرف سے ان کے ساتھ جہاد کروں اگر آپ چاہیں تو مجھے کوئی پیغام دیں میں انہیں پہنچا آؤں اگر آپ چاہیں تو اپنے پروردگار سے دعا فرمائیں کہ وہ ہمیں اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی راستہ عطا فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کی طرف وحی فرمائی یہ جو کچھ قوم کی طرف سے پیغام لے آئے ہیں یہ سب دھوکا اور فریب ہے، یہ اس کذب بیانی کے ساتھ آپ پر

مصروف رہے گا۔ پھر میں اس کو بری حالت میں موت دے دوں گا۔ جب لڑکا فوت ہو جائے تو آپ واپس آ جانا۔ حضرت الیاس اس مومن کاتب کے ساتھ چل پڑے۔ حتیٰ کہ اُجب کے پاس پہنچ گئے۔ ادھر وہ پہنچے ادھر اللہ تعالیٰ نے لڑکے کو شدید تکلیف میں مبتلا کر دیا حتیٰ کہ موت اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کو لڑکے کی مصیبت کی وجہ سے الیاس سے غافل کر دیا۔ وہ اس کی پریشانی میں گرفتار تھے تو حضرت الیاس صحیح سلامت واپس آ گئے۔ جب اُجب کا بیٹا مر گیا اور وہ اس کے معاملات سے فارغ ہو گئے، غم اور پریشانی کم ہو گئی تو وہ الیاس کے معاملہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ بادشاہ نے کاتب سے حضرت الیاس کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا مجھے تو ان کی کوئی خبر نہیں، مجھے تو تیرے بیٹے کی موت اور غم نے ہر چیز سے غافل کر دیا تھا' میرا تو خیال یہ تھا کہ آپ نے اس پر اعتماد کر لیا ہوگا۔ بادشاہ نے کاتب کی بات سے اعراض کیا اور اس کو چھوڑ دیا کیونکہ اسے بھی اس کے بیٹے کی موت پر پریشانی لاحق تھی۔ جب حضرت الیاس کو پہاڑوں پر رہتے ہوئے عرصہ دراز ہو گیا اور انہیں لوگوں کے ساتھ رہنے کا اشتیاق پیدا ہوا تو آپ پہاڑ سے نیچے اترے اور چل پڑے حتیٰ کہ آپ بنی اسرائیل کی ایک عورت کے پاس پہنچ گئے اور یہ عورت یونس بن متی مچھلی والے کی والدہ تھی' حضرت الیاس اس کے پاس چھ مہینے چھپے رہے اس زمانہ میں یونس بن متی معصوم بچے تھے اور دودھ پیتے تھے۔ حضرت یونس کی والدہ خود حضرت الیاس کی خدمت کرتی تھی اور اپنے مال سے ان کی معاونت کرتی تھیں۔ چونکہ حضرت الیاس پہاڑوں کی کھلی فضا میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے اس لئے آپ مکانوں کی تنگی سے اکتا گئے۔ آپ نے پہاڑوں میں رہنا پسند کیا۔ آپ شہر کی فضا سے نکل کر اپنی جگہ پہاڑ میں چلے گئے۔ حضرت یونس کی والدہ' حضرت الیاس کی جدائی اور فراق کی وجہ سے پریشان ہو گئی اور ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے وحشت میں گھر گئی پھر کچھ عرصہ بعد اس کا بچہ یونس فوت ہو گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب اس نے اس کا دودھ چھڑایا، اس کی مصیبت ان کے لئے بہت عظیم تھی۔

یونس کی والدہ حضرت الیاس کی تلاش میں نکل پڑی' پہاڑوں پر چڑھتی اور ان میں چکر لگاتی رہی حتیٰ کہ اس نے الیاس کو تلاش کر لیا۔ اس نے حضرت الیاس کو کہا تیرے جانے کے بعد میں اپنے بیٹے کی موت کی وجہ سے انتہائی پریشان ہوئی اور اس کی مصیبت مجھ پر ناقابل برداشت ہو گئی کیونکہ اس ایک بچہ کے سوا میری اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ آپ مجھ پر رحم فرمایئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میرے بیٹے کو زندہ کر دے۔ میں نے اپنے بیٹے کو دفن نہیں کیا ہے بلکہ اسے کپڑے میں لپیٹ آئی ہوں اور میں اس کو ایک خفیہ جگہ رکھ آئی ہوں۔ حضرت الیاس نے فرمایا مجھے ایسے امور کا حکم نہیں دیا گیا، میں اللہ تعالیٰ کا عبد مامور ہوں، وہی کرتا ہوں جس کا وہ مجھے حکم فرماتا ہے۔ عورت نے انتہائی آہ و زاری کی اور گڑگڑائی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کے دل کو عورت کی طرف مائل فرما دیا۔ حضرت الیاس نے فرمایا تیرا بیٹا کب مرا تھا؟ اس نے کہا اسے سات دن ہو گئے ہیں۔ حضرت الیاس اس عورت کے ساتھ چل پڑے اور سات دن چلتے رہے جب بچے کے پاس پہنچے تو اسے مرے ہوئے چودہ دن گذر چکے تھے۔ آپ نے پہلے وضو فرمایا اور نماز ادا کی اور پھر دعا فرمائی اللہ تعالیٰ نے یونس بن متی کو زندہ فرما دیا۔ جب وہ زندہ ہو کر بیٹھ گیا تو حضرت الیاس جلدی سے اسے وہیں چھوڑ کر اپنی جگہ لوٹ آئے۔ جب حضرت الیاس کی قوم کی نافرمانی کا عرصہ طویل ہو گیا تو آپ بہت پریشان ہو گئے۔ اسی پریشانی کی کیفیت میں سات سال گزر گئے۔ سات سال بعد اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اور فرمایا اے الیاس پریشانی اور غم کیوں ہے؟ کیا تو میری وحی کا امین نہیں ہے۔ زمین میں تو میری حجت نہیں ہے اور میری مخلوق میں تو میرا برگزیدہ نہیں ہے...

ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے الیاس آج وہ دن نہیں کہ میں زمین اور اہل زمین کو تجھ سے محروم کروں۔ یقیناً زمین کا قیام اور اس کی صلاح تیرے اور تیرے جیسے دوسرے بزرگوں کی وجہ سے ہے اگرچہ تعداد میں تم تھوڑے ہو لیکن تم مجھ سے کوئی اور سوال کرو میں عطا کروں گا۔ حضرت الیاس نے عرض کی اگر تو مجھے موت نہیں دیتا تو مجھے بنی اسرائیل سے بدلہ لینے کی قوت عطا فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو کیا چاہتا ہے کہ میں تجھے عطا کروں۔ حضرت الیاس نے عرض کی تو مجھے سات سال کے لئے آسمان کے خزانوں پر قدرت عطا فرما دے پس ان پر میری دعا کے بغیر بادل نہ آئے اور نہ میری سفارش کے بغیر بارش کا قطرہ برسے۔ کیونکہ اس طریقہ سے وہ مطیع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے الیاس میں اپنی مخلوق پر بہت رحم فرماتا ہوں اگرچہ وہ ظلم بھی کرتے رہیں۔ حضرت الیاس نے عرض کی پھر چھ سال کے لئے بارش کا سلسلہ میرے حکم کے تابع کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس سے زیادہ میں اپنی مخلوق پر رحم فرماتا ہوں۔ آپ نے عرض کی پھر پانچ سال بارش کا کنٹرول مجھے دے دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بھی میری رحمت سے بہت بعید ہے، میں تجھے تین سال تک ان سے انتقام لینے کی قدرت عطا فرماتا ہوں۔ تین سال تک بارش کا سلسلہ تیرے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ حضرت الیاس نے عرض کی میں کیسے زندہ رہوں گا؟ فرمایا میں تیرے لئے پرندوں کا ایک لشکر مسخر کر دوں گا جو سرسبز وادیوں سے کھانے پینے کا سامان لائے گا۔ حضرت الیاس نے عرض کی اب میں خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس نافرمان قوم سے بارش روک لی حتی کہ مال مویشی کیڑے پتنگے درخت سب ہلاک ہو گئے، لوگ انتہائی پریشان اور مشقت میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت الیاس اسی طرح اپنی قوم سے پوشیدہ رہے۔ آپ جہاں ہوتے آپ کا رزق وہاں پہنچا دیا جاتا۔ آپ کی قوم کو اس بات کا احساس ہو گیا انہیں جس گھر میں روٹی کی خوشبو محسوس ہوتی وہ کہتے اس مکان میں حضرت الیاس داخل ہوئے ہیں۔ وہ آپ کو تلاش کرتے (لیکن آپ نہ ملتے) تو لوگ گھر والوں کو اذیتیں دیتے۔ ابن عباس فرماتے ہیں بنی اسرائیل تین سال قحط میں مبتلا رہے ایک دفعہ حضرت الیاس ایک بوڑھی کے پاس سے گذرے، آپ نے بوڑھی سے پوچھا کہ تیرے پاس کوئی کھانا ہے۔ بوڑھی نے کہا کچھ تھوڑا سا آٹا اور تھوڑا سا زیتون ہے۔ آپ نے وہ دونوں چیزیں منگوائیں اور ان پر برکت کی دعا کی اور اپنے ہاتھ سے کھانے کو مس کیا حتی کہ آپ کی دعا اور ہاتھ کی برکت سے بوری آٹے سے بھر گئی اور اور مٹکا زیتون سے بھر گیا۔ جب لوگوں نے اس بوڑھی کے پاس یہ سامان دیکھا تو پوچھا یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے بتایا میرے پاس سے ایک ایسے ایسے حلیہ کا آدمی گذرا ہے اس نے آپ کی ہیئت وصفات بیان کیں۔ لوگ پہچان گئے اور کہنے لگے وہ الیاس تھا۔ وہ آپ کو تلاش کرنے لگے لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا لیکن آپ ان سے بھاگ گئے پھر آپ نے بنی اسرائیل کی ایک عورت کے گھر پناہ لی جس کا ایک بیٹا تھا۔ اس کا نام الیسع بن اخطوب تھا۔ وہ لڑکا سخت تکلیف میں مبتلا تھا اس عورت نے آپ کو اپنے ہاں پناہ دی اور آپ کو چھپائے رکھا۔ حضرت الیاس نے اس کے بیٹے کے لئے دعا فرمائی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ الیسع نے الیاس کی پیروی شروع کر دی اور آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی اور آپ کے ساتھ ساتھ رہنے لگا جہاں آپ تشریف لے جاتے وہ بھی وہاں پہنچ جاتا۔ اس وقت حضرت الیاس بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور الیسع جوان تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کی طرف وحی فرمائی کہ تو نے بہت سی مخلوق کو ہلاک کر دیا ہے، بارش کے روکنے کی وجہ سے جانور ... حضرت الیاس نے عرض کی اے میرے پروردگار تو مجھے

الیاس بنی اسرائیل کے پاس آئے اور فرمایا تم بھوک سے مر چکے ہو اور مشقت میں مبتلا ہو چکے ہو، تمہاری سیاہ کاریوں کی وجہ سے چوپائے، پرندے، کیڑے، مکوڑے اور درخت سب ہلاک ہو چکے ہیں اور تم غلط راستے پر ہو۔ اگر تم غلط روی کو جاننا چاہتے ہو تو اپنے بتوں کو میرے مقابلہ میں لے آؤ اگر وہ تمہاری بارش کے متعلق درخواست قبول کرتے ہیں تو پھر جو تم کہتے ہو وہ سچ ہے اور اگر وہ تمہاری اس درخواست کو قبول نہیں کرتے تو تم جان لو کہ تم غلط عقیدہ پر ہو اور تم اس عقیدہ کو ترک کر دو پھر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا وہ تمہیں اس مصیبت سے نجات دے گا۔ لوگوں نے کہا یہ تو نے انصاف کی بات کی ہے۔ وہ اپنے بتوں کو نکال کر لے آئے اور ان سے دعائیں مانگیں لیکن بارش نہ ہوئی اور مصیبت سے نجات نہ ملی پھر انہوں نے حضرت الیاس سے کہا ہم ہلاک ہو چکے ہیں تم ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ آپ نے دعا کی اور حضرت الیسع بھی اس دعا میں شریک تھے فوراً بادل سمندر کے درمیان سے ڈھال کی طرح نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی طرف آ گیا پھر وہ پورے افق پر پھیل گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی اور بادل ان پر اتنا برسا کہ مردہ زمینیں زندہ ہو گئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف دور فرما دی تو انہوں نے عہد شکنی کا مظاہرہ کیا اور اپنے کفر سے باز نہ آئے اور اپنے پرانے غلط اور باطل عقیدہ پر قائم رہے۔

جب حضرت الیاس نے ان کی یہ ناشکری اور نافرمانی دیکھی تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اس نافرمان قوم سے نجات اور راحت دے دے۔ علماء فرماتے ہیں آپ کو کہا گیا کہ تم فلاں دن کا انتظار کرو جب وہ دن آئے تو فلاں مقام کی طرف نکل جانا اور جو سواری تیرے پاس آئے اس پر سوار ہو جانا اور خوف نہ کرنا۔ حضرت الیاس نکلے تو حضرت الیسع بھی آپ کے ساتھ نکل پڑے حتیٰ کہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ آگ کا ایک گھوڑا آیا، بعض علماء فرماتے ہیں اس گھوڑے کا رنگ آگ کے رنگ کی طرح تھا وہ گھوڑا آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ حضرت الیاس چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو گئے۔ گھوڑا آپ کو لے کر چل پڑا۔ پیچھے سے حضرت الیسع نے آواز دی اے الیاس میرے لئے کیا حکم ہے؟ حضرت الیاس نے ان کی طرف اوپر سے اپنی چادر پھینک دی۔ یہ علامت تھی کہ آپ بنی اسرائیل پر میرے نائب اور خلیفہ ہیں۔ یہ آپ کا آخری عہد اور ملاقات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قوم سے اٹھا لیا اور آپ سے کھانے، پینے کی خواہش ختم کر دی اور پَر عطا فرما دیے پس آپ انسان بھی ہیں فرشتہ بھی ہیں، آسمانی بھی ہیں اور زمینی بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُجب بادشاہ اور اس کی قوم پر ایک دشمن مسلط کر دیا وہ ان پر وہاں سے حملہ کرتا جہاں سے انہیں علم ہی نہ ہوتا حتیٰ کہ وہ ان پر غالب آ گیا۔ اس نے اُجب بادشاہ اور اس کی بیوی ازبیل کو مزدکی کے باغ میں قتل کر دیا۔ پھر ان کے جسم مرداروں کی طرح اس باغ میں پڑے رہے حتیٰ کہ ان کے گوشت سڑ گئے اور ہڈیاں پرانی اور بوسیدہ ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیسع کو تاج نبوت عطا فرمایا اور انہیں رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف مبعوث فرمایا اور ان کی طرف وحی فرمائی۔ بنو اسرائیل حضرت الیسع پر ایمان لائے اور آپ کی تعظیم اور احترام کرتے رہے اور آپ کے وصال تک ان میں آپ کا حکم نافذ رہا۔

اسریٰ بن یحییٰ عن عبد العزیز کے سلسلہ سے مروی ہے کہ حضرت الیاس اور خضر علیہما السلام رمضان شریف کے روزے بیت المقدس میں رکھتے ہیں اور ہر سال حج کرتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت الیاس بیابانوں پر مقرر ہیں۔ اور حضرت خضر سمندر پر مقرر ہیں علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کے تحت اسی طرح لکھا ہے (1)۔

إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِۦٓ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٢٤﴾

"(یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں لے"

لے یعنی حضرت الیاس نے فرمایا کیا تم اللہ کے عذاب سے ڈرتے نہیں۔

أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ﴿١٢٥﴾

"کیا تم عبادت کرتے ہو بعل کی اور چھوڑتے ہو احسن الخالقین کو لے"

لے تَدْعُوْنَ بمعنی تعبدون ہے۔ بعل بنی اسرائیل کا ایک بت تھا۔ جس کی وہ عبادت کرتے تھے اسی وجہ سے ان کے شہر کا نام بعلبک تھا۔ مجاہد، عکرمہ اور قتادہ فرماتے ہیں اہل یمن کی لغت میں بعل رب کو کہتے ہیں یہ کلام سابقہ کلام کا بیان یا بدل ہے (ا)۔

اللَّهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٢٦﴾

"(یعنی) اللہ کو جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے لے"

لے اللہ کو حمزہ، کسائی، یعقوب اور حفص نے احسن الخالقین سے بدل کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے استیناف کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔

فَكَذَّبُوهُ فَإِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ﴿١٢٧﴾

"پھر انہوں نے آپ کو جھٹلایا پس یقیناً انہیں (پکڑ کر) حاضر کیا جائے گا لے"

لے حاضر کرنے سے مراد عذاب میں حاضر کرنا قرینہ کی وجہ سے عذاب کا ذکر نہیں فرمایا یا اس لئے عذاب کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ مطلق احضار عرف شر کے ساتھ خاص ہے۔

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿١٢٨﴾

"بجز اللہ کے بندوں کے جو مخلص ہیں لے"

لے یہ استثناء فکذبوہ کے فاعل سے ہے المحضرین سے استثناء نہیں کیونکہ اس ترکیب سے معنی میں فساد پیدا ہوگا بعض علماء فرماتے ہیں یہ استثناء منقطع ہے یا المحضرین سے مستثنیٰ متصل ہے بشرطیکہ المحضرین اس مفہوم میں ہو کہ بعض کے وصف کے ساتھ تمام کا وصف بیان کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اسی اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿﴾ (اے قافلہ والو! بلاشبہ تم چور ہو) (اس جملہ میں سارے قافلہ کو چور کہا گیا ہے حالانکہ سب چور نہ تھے پیالہ تو کسی ایک کی خورجی میں تھا)

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿١٢٩﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ ﴿١٣٠﴾

"اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں سلام ہو الیاس پر لے"

لے الْ یَاسِیْنَ سے مراد الیاس ہی ہیں۔ یعنی الیاس میں ایک لغت ال یاسین ہے جیسے سیناء اور سینین اسماعیل اور سمعین

اس تاویل پر یہ اس طرح ہوگا جیسے اشعریین (اشعری اور اس کے پیروکار) اعجمین (عجمی لوگ) لیکن اس تاویل پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب کسی علم کی جمع بنائی جائے تو اس پر الف لام تعریف کا داخل کرنا واجب ہوتا ہے۔ نافع اور عامر نے ال یاسین کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اور لام کو کسرہ کے ساتھ یاسین سے جدا پڑھا ہے کیونکہ یہ المصحف میں علیحدہ علیحدہ لکھے ہوئے تھے (یعنی ال مضاف اور یاسین مضاف الیہ علیحدہ علیحدہ دو کلمے ہیں) اس قرأت پر یاسین الیاس کا باپ ہوگا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یاسین الیاس کا ہی اسم ہو اور الیاسین سے مراد الیاس اور ان کے پیروکار ہوں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یاسین سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن یا دوسری کتب سماوی ہیں لیکن یہ قول نظم قرآن کے مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ دوسرے انبیاء کے واقعات کا سلسلہ چل رہا ہے (یعنی ماقبل اور مابعد کلام سے یہ مفہوم کوئی علاقہ اور مناسبت نہیں رکھتا)

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣١﴾ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾

''ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے ہیں لے''

لے انه کی ضمیر کا مرجع الیاس ہیں۔ ابن مسعود کی قرأت میں سلام علی ادریسین ہے، یعنی ادریس اور آپ کے پیروکاروں پر سلام ہو کیونکہ ابن مسعود نے بھی اِنَّ اِدرِیسَ لَمِنَ المُرسَلِین پڑھا ہے۔

وَإِنَّ لُوطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣٣﴾ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ﴿١٣٤﴾ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ﴿١٣٥﴾

''اور بیشک لوط بھی پیغمبروں میں ہیں (یاد کرو) جب بچالیا ہم نے انہیں اور ان کے سارے اہل خانہ کو بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی لے''

لے یعنی جب لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل ہوا تو ہم نے ان کی بیوی کے سوا سب گھر والوں کو اس عذاب سے بچالیا اور ان کی بیوی عذاب میں باقی رہنے والوں میں رہی۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ﴿١٣٦﴾

''پھر ہم نے برباد کردیا دوسرے لوگوں کو لے''

لے دَمَّرْنَا کا معنی اهلكنا ہے، یعنی ہم نے ہلاک کردیا۔

وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِينَ ﴿١٣٧﴾ وَبِاللَّيْلِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٣٨﴾

''اور تم گذرتے رہتے ہو ان (کے اجڑے دیاروں) پر صبح کے وقت اور رات کے وقت لے کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے ۲''

لے کم ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں، یعنی اے مشرکین مکہ جب تم شام کی طرف سفر کرتے ہو تو سدوم کی بستی تمہارے راستہ میں آتی ہے۔ تم ان کے تباہ شدہ مکانوں کے کھنڈرات سے صبح وشام گذرتے ہو۔ یا یہ معنی کہ دن اور رات کے وقت (ان) کی بستیوں ...

مسافر قیام گاہ کا ارادہ رکھتا ہو وہ شام کے وقت اس بستی سے گذرتا ہو۔ یہ اس صورت میں ہے اگر سفر دن کے وقت ہو اور اگر سفر رات کے وقت کا ہو تو معاملہ الٹ ہوگا۔

ل أفَلَا تَعْقِلُونَ یعنی کیا تم صاحب عقل نہیں کہ تم ان بستیوں سے عبرت حاصل کرو۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣٩﴾ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿١٤٠﴾

''اور بے شک یونس بھی (ہمارے) رسولوں میں سے ہیں جب وہ بھاگ کر گئے تھے بھری ہوئی کشتی کی طرف (سوار ہونے کے لئے) ل''

ل آبق کا معنی اصل میں آقا سے غلام کا بھاگ جانا ہے لیکن حضرت یونس علیہ السلام اپنے رب کی اجازت کے بغیر بھاگ گئے تھے اس لئے یہاں بھی اس کا اطلاق درست ہے۔

عبدالرزاق اور احمد نے الزھد میں' عبد بن حمید' اور ابن المنذر نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت یونس علیہ السلام نے قوم کو عذاب کی وعید سنائی اور پھر عذاب میں تاخیر ہوگئی تو آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلے قوم کو چھوڑ کر چلے گئے اور ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ آپ سوار ہوئے تو کشتی رک گئی۔ ملاح کہنے لگے اس میں کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ انہوں نے قرعہ اندازی کی تو قرعہ یونس کے نام کا نکلا تو حضرت یونس علیہ السلام نے کہا میں ہی بھاگا ہوا غلام ہوں، آپ نے پانی میں چھلانگ لگادی۔ علامہ بغوی نے ابن عباس اور وہب کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے تین مرتبہ قرعہ اندازی کی تھی اور ہر بار آپ کا نام نکلا تھا(۱)۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ جب آپ سمندر کے کنارے پہنچے تو آپ کے ساتھ آپ کی بیوی بھی تھی اور آپ کے دو بیٹے بھی تھے۔ کشتی آئی تو آپ نے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سوار ہونے کا ارادہ کیا لیکن جب آپ نے بیوی کو سوار ہونے کے لئے آگے بڑھایا تو کشتی اور اس کے درمیان ایک موج حائل ہوگئی (جو اسے بہا کر لے گئی) پھر ایک موج آئی جوان کے بڑے بیٹے کو نگل گئی پھر ایک بھیڑیا آیا جو آپ کے چھوٹے بیٹے کو اٹھا کر لے گیا۔ آپ تنہا رہ گئے پھر ایک دوسری کشتی آئی آپ اس پر سوار ہوئے اور آپ لوگوں سے جدا ایک کونہ میں بیٹھ گئے۔ جب کشتی سمندر میں پہنچی تو رک گئی۔ لوگوں نے قرعہ اندازی کی(2) ہم نے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۂ یونس میں ذکر کردیا ہے۔

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ﴿١٤١﴾

''پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوئے اور دھکیلے ہوؤں میں سے ہوگئے ل''

ل ساهم' المساهمه سے مشتق ہے جس کا معنی قرعہ اندازی کے لئے تیر ڈالنا ہے کان بمعنی صار ہے یعنی آپ قرعہ کی وجہ سے مغلوبین میں سے ہوگئے۔ دحض کا اصل معنی کامیابی کے مقام سے پھسلنا ہے لیکن یہاں مغلوب ہونا ہے۔

فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿١٤٢﴾

''پھر نگل لیا انہیں حوت نے درآں حالانکہ وہ اپنے آپ کو ملامت کررہے تھے ل''

(اَلْاٰمَ) کا ہمزہ اس ہمزہ کی طرح ہو جو اصبح اور امسیٰ میں ہوتا ہے) یا یہ معنی کہ آپ ایسا کام کرنے والے تھے جس پر ملامت کی جاتی ہے یا یہ معنی کہ آپ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ یہ جملہ (وَهُوَ مُلِيْمٌ) التقمه کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

''پس اگر وہ اللہ کی پاکی بیان کرنے والوں سے نہ ہوتے ۱؎ تو پڑے رہتے مچھلی کے پیٹ میں قیامت کے دن تک ۲؎''

۱؎ ابن عباس فرماتے ہیں اَلْمُسَبِّحِيْنَ کا معنی المصلین ہے۔ یعنی اگر وہ نماز پڑھنے والوں میں سے نہ ہوتے۔ حضرت وہب نے اس کا معنی العابدین کیا ہے، یعنی اگر وہ عبادت کرنے والوں میں سے نہ ہوتے۔ الحسن فرماتے ہیں مچھلی کے پیٹ میں آپ نے نماز نہیں پڑھی تھی لیکن اس سے پہلے کوئی نیک عمل کیا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی سابقہ عبادت کی قدر دانی فرمائی (1) میں کہتا ہوں یہ ممکن ہے کہ آپ نے مچھلی کے پیٹ میں اشارہ سے نماز پڑھی ہو کیونکہ وہاں آپ زندہ تھے اور باہوش تھے اور بہتر یہ قول ہے کہ آپ مچھلی کے پیٹ میں لا الہ الا انت سبحانک کے کلمات کے ساتھ تسبیح نہ فرماتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے جیسا کہ قرآن کی واضح نص موجود ہے۔

۲؎ یعنی مچھلی کے پیٹ میں مر جاتے اور وہی مچھلی ان کے لئے قبر ہوتی اور مچھلی کے اجزاء کے ساتھ ملے رہتے جیسے اللہ تعالیٰ کو علم تھا اور قیامت تک اسی کیفیت میں رہتے۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

''پھر ہم نے ڈال دیا انہیں کھلے میدان میں اس حال میں کہ وہ بیمار تھے ۱؎''

۱؎ یعنی ہم نے مچھلی کو ان کے نگل جانے کا حکم دیا۔ العراء ایسا مکان جو درختوں اور جھاڑیوں سے خالی ہو۔ وَهُوَ سَقِيْمٌ یعنی ایسے چوزے کی مانند تھے جس کے اوپر بال نہ ہوں۔ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ آپ کا گوشت بوسیدہ ہو گیا تھا اور ہڈیاں نرم ہو گئی تھیں اور آپ کے اعضاء میں کوئی قوت و طاقت نہ تھی۔ علماء کا اختلاف ہے کہ آپ کتنی مدت مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ مقاتل نے تین دن کی مدت لکھی ہے (2) اسی طرح ابن المنذر، عبد بن حمید، ابن ابی حاتم نے قتادہ سے نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں عطاء نے سات دن بیان فرمائے ہیں (3) اسی طرح ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی نے ضحاک کا قول بیس دن نقل فرمایا ہے۔ سدی، کلبی اور مقاتل بن سلیمان نے چالیس دن لکھے ہیں (4) ابن عباس سے حاکم نے اور ابن ابی شیبہ امام احمد (فی الزہد) عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابو مالک سے، عبدالرزاق، ابن مردویہ نے ابن جریج سے عبد بن حمید اور ابن المنذر نے عکرمہ سے اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔ عبد بن حمید نے زوائد الزہد میں دن کا کچھ حصہ بیان کیا ہے۔ ابن ابی حاتم، حاکم اور بغوی نے الشعبی سے نقل کیا ہے کہ مچھلی نے چاشت کے وقت آپ کو نگلا اور شام کے وقت اگل دیا تھا (5)۔

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾

''اور (ان کی حفاظت کے لئے) ہم نے اگا دی ان پر کدو کی بیل ۱؎''

1۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں حسن اور مقاتل فرماتے ہیں ایسی بوٹی جس کا تنا نہ ہو اور زمین پر پھیلتی اور کھلتی ہو اور سردیوں میں باقی نہ رہتی ہو جیسے کدو، ککڑی اور تربوز کی بیل، اس کو یقطین کہتے ہیں (1) علامہ بغوی فرماتے ہیں خلاف عادت اس بیل کا تنا بھی تھا۔ یقطین، قطن بالمکان سے مشتق ہے جس کا معنی کسی جگہ ٹھہرنا ہے اور اس کا وزن یفعیل ہے۔ میں کہتا ہوں وہ کدو کی بیل تھی جس نے آپ کو اپنے پتوں کے ذریعے مکھیوں کے کاٹنے سے محفوظ کر لیا تھا۔ ان پتوں کی وجہ سے وہ آپ کے جسم پر نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ تمام مفسرین کا قول ہے۔ اسی طرح عبد بن حمید اور ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ مقاتل بن حبان فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام ایک درخت (بیل) کے سایہ میں رہتے تھے اور ایک پہاڑی بکری آپ کے پاس آتی تھی جس کا صبح و شام آپ دودھ پیتے تھے حتی کہ آپ کا گوشت مضبوط ہو گیا۔ بال اگ آئے اور اعضاء میں قوت آ گئی پھر آپ سو گئے۔ جب بیدار ہوئے تو درخت (بیل) خشک ہو چکا تھا پھر جب آپ کو دھوپ لگی تو آپ بہت پریشان ہوئے اور رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا اور فرمایا تم ایک درخت کے سوکھ جانے پر غمگین ہو اور اپنی امت کے ایک لاکھ افراد پر غم نہیں کرتے جو اسلام قبول کر چکے ہیں اور تائب ہو چکے ہیں (2)۔

مسئلہ: انبیاء کرام کی لغزشوں کو ذکر کرنا جائز نہیں کیونکہ ان کی لغزش رجوع الی اللہ اور ان کے مراتب کی بلندی کا باعث ہوتی ہے۔ جس نے کسی نبی کی گستاخی کی وہ کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ " (ترجمہ) (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کے لئے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں (بخاری و مسلم) (3)

بخاری کی روایت میں ہے کہ جس نے یہ کہا کہ میں یونس بن متی سے افضل ہوں اس نے جھوٹ بولا (4)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک مسلمان اور یہودی کے درمیان تلخ کلامی ہوئی، مسلمان نے کہا قسم ہے اس کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے یہودی نے کہا قسم ہے اس کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے۔ یہودی نے جب یہ کہا تو مسلمان نے ہاتھ اٹھایا اور یہودی کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔ یہودی بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور جو کچھ اس کے اور مسلمان کے درمیان معاملہ تھا وہ عرض کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو بلایا اور واقعہ کی تفصیل پوچھی۔ مسلمان نے واقعہ عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو۔ کیا قیامت کے روز لوگ بے ہوش ہوں گے تو میں بھی ان کے ساتھ بے ہوش ہوں گا اور میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام عرش کی ایک طرف کو پکڑے ہوئے ہوں گے اور معلوم نہیں وہ بھی ان لوگوں سے ہوں گے جو بے ہوش تھے اور پھر مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے یا ان لوگوں میں سے تھے جن کی اللہ تعالیٰ نے بے ہوش ہونے والوں سے استثناء فرمائی ہے (5) ایک روایت میں ہے فرمایا مجھے معلوم نہیں طور کے دن کی بے ہوشی اس دن کی بے ہوشی کے عوض کر دی گئی ہے یا وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے ہیں اور میں نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن متی سے افضل ہے۔ ابو سعید کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انبیاء کے درمیان فضیلت (کا موازنہ) نہ کرو۔ بخاری و مسلم (6) حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں ہے فرمایا اللہ کے نبیوں کے درمیان فضیلت (کا موازنہ) نہ کرو (7)۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انبیاء کے درمیان فضیلت نہ کرنے کا ارشاد فرمایا ہے اس کا مفہوم کیا ہے، جب کہ آیت قرآنی اور اجماع سے انبیاء کرام کی فضیلت ثابت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ (یہ رسول کی جماعت ہے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ (میں اولاد آدم کا قیامت کے دن سردار ہوں گا سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی)(1) اس حدیث کو امام مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَ مَا مِنْ نَبِيٍّ يَّوْمَئِذٍ آدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ اِلَّا تَحْتَ لِوَاءِ يْ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ وَّلَا فَخْرَ(2) (میں قیامت کے روز اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور یہ میں بطور فخر نہیں کہہ رہا بلکہ اظہار حقیقت کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اس دن ہر نبی یعنی آدم اور ان کے علاوہ سب انبیاء میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور سب سے پہلے میری قبر کھلے گی اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا اور سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری سفارش قبول ہوگی اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میں تمام رسولوں کا قائد ہوں گا اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا اور میں خاتم النبیین ہوں اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا۔ سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور میری شفاعت قبول ہوگی اور میں یہ فخر یہ نہیں کہہ رہا۔ اس حدیث کو دارمی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے(3)۔

(سوال کا حاصل یہ ہے کہ جب فضیلت دینے اور فضیلت نہ دینے دونوں قسم کی روایات موجود ہیں تو تطبیق کیسے ہوگی)

مصنف فرماتے ہیں میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ ظن و تخمین کے ساتھ انبیاء کے درمیان فضیلت کا موازنہ نہ کرو، جب تک کہ وحی الٰہی کے ذریعے کسی کی فضیلت ظاہر نہ ہو جائے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کی دوسروں پر فضیلت بیان ہو تو اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ نفس نبوت میں انبیاء کے درمیان فضیلت بیان نہ کرو، یعنی بعض پر تو تم ایمان لاؤ، ان کی تعظیم و توقیر بھی کرو اور بعض پر ایمان نہ لاؤ۔ اللہ اعلم

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

"اور ہم نے بھیجا تھا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف [1]"

[1] علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام کو اس مصیبت میں مبتلا ہونے سے پہلے موصل کے علاقہ نینوا میں مبعوث کیا گیا تھا(4) عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اسی طرح نقل کیا ہے اور حسن سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد دوبارہ ہم نے اسے ان لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف پہلے بھیجا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں دوبارہ جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے وہ پہلی قوم سے مختلف تھی۔ مقاتل اور کلبی فرماتے ہیں اَوْ بمعنی بل ہے(5) ابن عباس فرماتے ہیں اَوْ بمعنی واو ہے۔ جیسا کہ عذراً اور نذراً میں اَوْ بمعنی واو ہے۔ زجاج کہتا ہے اَوْ یہاں اپنی اصل پر

ہے۔یعنی تمہارے اندازے اور گمان پر یالاکھ سے زائد تھے جیسے کوئی شخص کسی افراد کے جتھہ کو دیکھتا ہے اور کہتا یہ ہزار یا اس سے زائد ہیں پس یہاں شک مخلوق کے اعتبار سے ہے(1) (اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی تعداد میں کوئی شک نہیں) یہ زائد تعداد کتنی تھی؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔حضرت ابن عباس اور مقاتل فرماتے ہیں وہ بیس ہزار تھے(2) ترمذی نے ابی بن کعب سے یہی روایت کیا ہے کہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ زائد بیس ہزار تھے(3) حسن فرماتے ہیں تین ہزار سے کچھ زائد تھے۔سعید بن جبیر فرماتے ہیں وہ ستر ہزار تھے(4)۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿١٤٨﴾

''پس وہ ایمان لائے اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں کچھ وقت تک ۔ لے''

لے یعنی جن لوگوں کی طرف حضرت یونس علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا وہ عذاب کو دیکھنے کے بعد یونس علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔حین سے مراد متعین مدت ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس اور حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ کو سلام کے ساتھ ختم نہیں فرمایا جیسا کہ باقی انبیاء کرام کے واقعات کو سلام کے ساتھ ختم فرمایا(مثلاً فرمایا سلام علی ابراهیم سلامٌ علی موسٰی و هارون' سلام علی الیاسین) شاید اس کی وجہ اصحاب شرائع اور اولوالعزم رسولوں اور ان کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے سابقہ اسلوب اختیار نہیں فرمایا یا سورت کے آخر میں چونکہ سب رسولوں پر سلام فرمایا ہے اس لئے اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے ان کے لئے علیحدہ سلام کا ذکر نہیں فرمایا۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿١٤٩﴾

''ذرا پوچھئے ان (نادانوں) سے کیا آپ کے رب کے لئے تو بیٹیاں ہیں اور ان کے لئے بیٹے لے''

لے اس کلام کا عطف فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا پر ہے۔سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا تھا کہ ان منکرین قیامت سے وجہ انکار دریافت کریں کہ کیا ان کی تخلیق مشکل ہے یا ان کے علاوہ زمین و آسمان اور ملائکہ کی تخلیق مشکل ہے۔یا جو ان سے پہلے قومیں گذر چکی ہیں ان کی تخلیق مشکل تھی پھر جب وہ زبان سے یا حال سے اقرار کر دیں کہ پہلے لوگوں کی تخلیق مشکل تھی تو پھر انہیں اس ذات سے ڈرانا جس نے ان طاقتور اور توانا لوگوں سے ان کی نافرمانی کا انتقام لیا اور ان کو ان کے کفر کی وجہ سے تہس نہس کر دیا۔جب وہ ذات ان سے طاقتور لوگوں پر قادر ہے اور ہر مخلوق پر وہ قادر ہے اور وہ قیامت کے قائم کرنے پر بھی قادر ہے اور تم جیسے حقیر و ناتواں لوگوں کو عذاب کی بھٹی میں دھکیلنے پر بھی قادر ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے مناسب واقعات ذکر فرمائے۔اب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب سے فرما رہے ہیں کہ انہوں نے جو من گھڑت تقسیم بنا رکھی ہے اس کی ان سے وجہ دریافت کریں یہ کہتے ہیں اللہ کے لئے بیٹیاں ہیں اور ان کے لئے بیٹے ہیں۔مشرکوں میں سے بعض کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں ان کے اس شرک پر کئی اور گمراہیاں بھی پائی جاتی تھیں مثلاً وہ اللہ کے لئے جسم ثابت کرتے تھے اور اللہ کے لئے بیٹیاں جائز قرار دیتے تھے کیونکہ ولادت) اجسام کا خاصہ ہے جو تغیر و تبدل کو قبول کرتے ہیں (یعنی جب اللہ کے لئے بیٹیاں مانتے ہیں تو گویا خدا کا

جسم مانتے ہیں کیونکہ ولادت (پیدا کرنا اور پیدا ہونا) اجسام کا خاصہ ہے) دوسری گمراہی یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اپنے آپ کو فضیلت دیتے تھے کیونکہ اللہ کے لئے کمزور ترین صنف اور اپنے لئے بہتر اور قوی صنف کا عقیدہ رکھتے تھے۔ تیسری گمراہی یہ کہ فرشتوں کی توہین کرتے تھے کیونکہ انہیں انوثت کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کے ابطال اور انکار کو قرآن حکیم میں کئی مرتبہ ذکر فرمایا ہے اور ان کی اس بات کو اتنا قبیح فرمایا ہے کہ اس کی نحوست سے آسمان پھٹنا چاہتے ہیں، زمین پھٹتی ہے اور پہاڑ گرتے ہیں۔ یہاں انکار صرف آخری دو باتوں پر ہے کیونکہ ان میں سے ایک گروہ ان دو بدعقیدگیوں میں ملوث تھا جہینہ اور بنی سلمہ بن عبد الدار قبائل یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ دوسری ان دونوں باتوں (اللہ کے لئے بیٹیاں ہونا اور ملائکہ کا مونث ہونا) کے فساد کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں عقیدوں کا فساد ایسا ہے کہ عام لوگ اپنی طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے بھی جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے خود ان سے سوال کرنے کے متعلق فرمایا (یعنی تمہارے گھر اگر بچی پیدا ہو جائے تو لوگوں سے منہ چھپائے پھرتے ہو، جب کہ اس خالق کے لئے تم اولاد ثابت کرتے ہو اور وہ بھی لڑکیاں جو صنف انسانی میں کمزور اور عاجز صنف ہے تمہاری اس بے انصاف ذہنیت اور پرحماقت سوچ پر تف ہے۔ تم خود ہی بتاؤ اس تقسیم کی دلیل کیا ہے؟)

أَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ إِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

"آیا جب ہم نے فرشتوں کو مونث بنایا تو کیا وہ موجود تھے [1]"

[1] اس ارشاد میں ان سے استہزاء ہے اور یہ تصور ہے کہ وہ لوگ انتہائی جاہل تھے کہ وہ ایسی بے تکی باتیں کرتے تھے اور ایسے من گھڑت فیصلے کرتے تھے گویا وہ فرشتوں کی تخلیق کے وقت موجود تھے۔

أَلَآ إِنَّهُمْ مِّنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

"غور سے سنو! وہ جھوٹی تہمت لگاتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بچے جنے [1] اور وہ بلاشبہ جھوٹ بکتے ہیں [2]"

[1] افک ایسے جھوٹ کو کہتے ہیں جس کا بطلان ظاہر ہو اور دلیل جس کے سراسر منافی ہو

[2] إِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ یعنی یہ تمام عقلمندوں کے نزدیک یقیناً جھوٹے ہیں۔

أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

"کیا اس نے پسند کی ہیں (اپنے لئے) بیٹیاں بیٹوں کو چھوڑ کر [1]"

[1] أَصْطَفَى کو ابو جعفر نے ہمزہ مکسورہ وصلی کے ساتھ پڑھا ہے اور درمیان کلام میں وہ اس کو ساقط کرتے ہیں اور نافع سے بھی یہی روایت ہے اور اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ہمزہ استفہام لفظاً حذف ہے یا قالوا کی تقدیر کے ساتھ یہ خبر ہے۔ یعنی یہ جھوٹ بکتے ہیں جب یہ کہتے ہیں کہ اس نے بیٹیوں کو پسند فرمایا ہے۔ عام قراء نے ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے جو ہمزہ وصل پر داخل ہے اور یہ استفہام انکار کے لئے ہے یا یُقَالُ لَهُمْ أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ کی تقدیر پر استبعاد کے لئے ہے (یعنی ان سے پوچھا جائے گا کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں پر بیٹیوں کو ترجیح دی ہے)

ل یہ تم کیسے فیصلے کر رہے ہو کہ اللہ کے لئے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے ہیں۔ الاصطفاء کا معنی ہے اچھی چیز چننا، جب کہ لڑکیاں گھٹیا صنف ہے۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

''کیا تم غور و فکر نہیں کیا کرتے لے''

ل فلا محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے الا تتفکرون فلا تتذکرون، یعنی جو کچھ تم کہہ رہے ہو اللہ تعالی اس سے پاک ہے۔ تذکرون اصل میں تتذکرون تھا۔ ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾

''کیا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے لے''

ل یعنی تمہارے پاس کوئی ایسی واضح دلیل ہے جو ملائکہ کے بیٹیاں ہونے کے متعلق اللہ تعالی کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہو، یعنی اسباب علم تین ہیں (1) عقل (2) حس (3) خبر صادق۔ اور خبر علم کا فائدہ نہیں دیتی جب تک اس کا مدار حس پر نہ ہو یا وہ اللہ تعالی کی اطلاع پر مبنی نہ ہو۔ دلالت عقل کا انکار تو آپ نے اس ارشاد میں فرمایا اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿﴾ چونکہ اللہ تعالی کی اولاد نہ ہونے پر دلیل قائم ہے اور اس کے علاوہ ملائکہ کے مونث ہونے کا ادراک عقل سے ممکن ہی نہیں اور کسی عقل مند کے لئے یہ کہنا جائز ہی نہیں کہ خالق کے لئے تو گھٹیا چیز ثابت کرے اور مخلوق کے لئے اعلی واشرف کو تسلیم کرے۔

حس کی دلالت کا انکار آپ نے اس ارشاد میں فرمایا اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿﴾ یعنی ان کی بات کے مفید للعلم ہونے کے لئے دوسری چیز حس ہے کہ انہوں نے فرشتوں کی پیدائش کو آنکھوں سے دیکھا ہو کہ انہیں مونث پیدا کیا گیا ہے لیکن یہ اس وقت تو موجود ہی نہ تھے۔ تیسرا سبب علم کا خبر صادق ہے۔ اس کی نفی اس ارشاد سے فرمادی اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿﴾ یعنی تمہاری بات کی صداقت کے لئے کوئی حجت ہے جو علیم و خبیر ذات کی طرف سے نازل ہوئی ہو کیونکہ جس بات کی تائید اللہ تعالی کی کوئی نازل کردہ حجت سے ہو وہ تمام باتوں سے زیادہ علم کا فائدہ دیتی ہے، تمہارے پاس وہ بھی نہیں ہے لیکن جب ممکن تھا کہ وہ کہہ دیں کہ ہمیں اللہ تعالی نے یہ دلیل اور حجت عطا کی ہے جیسا کہ وہ اپنی طرف کہہ دیتے ہیں مثلاً دوسری آیت میں ہے اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (ترجمہ) اور جب کرتے ہیں کوئی بے حیائی کا کام (تو) کہتے ہیں پایا ہم نے ایسا ہی کرتے ہوئے اپنے باپ دادا کو اور اللہ نے بھی ہمیں حکم دیا اس کا۔

فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

''تو اپنی وہ دستاویز پیش کرو اگر تم سچے ہو لے''

ل یعنی تم وہ کتاب پیش کرو جو اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور جس میں یہ لکھا ہو کہ فرشتے اللہ تعالی کی بیٹیاں ہیں اگر تم اپنے

جائے گا ۱؎ ''

۱؎ یہ جملہ قد کی تقدیر کے ساتھ استفتھم کی منصوب ضمیر سے حال ہے۔ جویبر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ قریش کے قبائل سلیم جہنیہ اور خزاعہ کے متعلق نازل ہوئی تھی (1) مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں الجنۃ سے مراد فرشتے ہیں۔ ان کو جنت اس لئے کہا کیونکہ یہ عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں (2) (جن کا معنی پوشیدہ ہونا ہے) میں کہتا ہوں فرشتوں کو جنہ کے نام سے تعبیر کیا تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہونے کے مرتبہ کے حامل نہیں ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں ملائکہ کا ایک گروہ ہے جسے جن کہا جاتا ہے اور ان میں سے ابلیس ہے۔ عرب کے مذکورہ قبائل ان فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ کلبی فرماتے ہیں وہ کہتے اللہ تعالیٰ نے ایک جنی سے نکاح کر لیا ہے اور اس سے فرشتے پیدا ہوئے۔ نعوذ باللّٰہ من ذالک۔ بعض قریش نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ حضرت ابو بکر الصدیق نے فرمایا پھر ان کی مائیں کون ہیں؟ کہنے لگے جنوں کی سردار عورتیں (3) اسی طرح البیہقی نے شعب الایمان میں مجاہد سے نقل کیا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ کا جملہ معترضہ ہے۔ انھم میں ضمیر کا مرجع یا تو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہنے والے لوگ ہیں یا مطلقاً انسان مراد ہیں یا جن مراد ہیں اور فرشتوں کو بھی شامل ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٥٩﴾

'' پاک ہے اللہ تعالیٰ ان (لغویات) سے جو یہ بیان کرتے ہیں ۱؎ ''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ بیٹے اور نسب سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک اور جملہ معترضہ ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿١٦٠﴾

'' مگر اللہ کے چنے ہوئے بندے (ایسی ہرزہ سرائی نہیں کرتے) ۱؎ ''

۱؎ اگر انھم کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنے والے لوگ ہیں تو یہ اس سے مستثنیٰ منقطع ہے۔

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿١٦١﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿١٦٢﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿١٦٣﴾

'' پس تم اور جن (جھوٹے خداؤں) کی پوجا کرتے ہو تم (سب مل کر) اللہ کے خلاف (کسی کو) نہیں بہکا سکتے مگر اسے جو تاپنے والا ہے بھڑکتی آگ کو ۱؎ ''

۱؎ ما سے مراد بت ہیں۔ علیہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ فاتنین، گمراہ کرنے والے ہیں، یعنی تم اور تمہارے یہ باطل معبود خواہ کتنی ہی تگ و دو کریں کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے لیکن ان بدبختوں کو تم گمراہ کرو گے جن کا جہنمی ہونا علم الٰہی میں پہلے ہی متعین ہے۔

وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿١٦٤﴾

'' اور فرشتے کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کے لئے مقام متعین ہے ۱؎ ''

۱؎ یہ جملہ بتقدیر قول ولقد علمت الجنۃ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قَالَتْ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آسمان چرچرایا اور چرچرانا اس کا حق ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے آسمان میں چار انگلیوں کے برابر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے پیشانی رکھے ہوئے نہ ہو۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے(1) یا مقام معلوم سے مراد مراتب قرب میں متعین مقام ہے جس سے کوئی فرشتہ تجاوز نہیں کرتا سدی فرماتے ہیں قرب اور مشاہدہ میں مقام متعین ہے۔ ابوبکر الوراق فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرشتہ کیلئے متعین مقام ہے جس پر رہ کر وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے جیسے خوف، رجاء، محبت اور رضا وغیرہ(2) میں کہتا ہوں فرشتوں کا مقام متعین ہے لیکن حضرت انسان قرب کی منازل متواتر طے کرتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(3) ملائکہ اپنے مقامات سے تجاوز نہیں کرتے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین سے فرمایا اے جبرئیل تو نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے۔ جبرئیل نے یہ جملہ سن کر جھرجھری لی اور عرض کی یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان نور کے ستر حجابات ہیں اگر ان میں سے کسی ایک کے بھی قریب جاؤں تو میں جل جاؤں۔ مصابیح میں زرارہ بن اوفی سے یہ حدیث اسی طرح روایت ہے(4) اسی حدیث کو ابونعیم نے حلیہ میں حضرت انس سے روایت کیا ہے لیکن اس میں جبرئیل کے جھرجھری لینے کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسرافیل کو جس دن سے پیدا فرمایا ہے وہ پاؤں ملا کر کھڑا ہے، اپنی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ستر نور ہیں اگر وہ ان نوروں میں سے کسی کے قریب جائے تو جل جائے(5) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح بھی کہا ہے یہ آیت کریمہ ملائکہ کی عبادت کرنے والوں کی تردید کر رہی ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ (ترجمہ) بے شک کافر ہو گئے وہ جنہوں نے (یہ) کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی تو ہے حالانکہ کہا تھا خود مسیح نے اے بنی اسرائیل عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے یقیناً جو بھی شریک بنائے گا اللہ کے ساتھ تو حرام کر دی ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت اور اس کا ٹھکانا آگ ہے۔

وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّاۗفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾

"اور ہم پرے باندھے (مقام نیاز میں) کھڑے ہیں [1]"

[1] ابن ابی حاتم نے یزید بن مالک سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں لوگ متفرق اور منتشر ہو کر نماز پڑھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّاۗفُّوْنَ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو صفیں باندھنے کا حکم دیا(6) ابن المنذر نے ابن جریج سے اسی طرح روایت نقل کی ہے کلبی فرماتے ہیں ملائکہ آسمان میں عبادت کے لئے اس طرح صفیں باندھتے ہیں جس طرح لوگ زمین میں (نماز کے لئے) صفیں باندھتے ہیں(7) امام مسلم نے جابر بن سمرہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس طرح صفیں نہیں باندھتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے حضور صفیں باندھتے ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ فرشتے

اپنے رب کے حضور کس طرح صفیں باندھتے ہیں؟ فرمایا وہ پہلی صفوں کو مکمل کرتے ہیں اور صف میں زیادہ فاصلہ نہیں رکھتے ہیں (1)
آیت کا مطلب یہ ہے کہ طاعت کی ادائیگی میں قدم ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔

وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

"اور بیشک ہم اس کی پاکی بیان کرنے والے ہیں [1]"

[1] یعنی اس کی پاکی بیان کرتے ہیں ہر اس چیز سے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ مثلاً بیٹا بنانا وغیرہ۔ پہلے اِنَّ حرف تاکید ذکر فرمایا پھر لام تاکید ذکر فرمایا پھر درمیان میں فصل ذکر فرمایا یہ تمام چیزیں تاکید اور اختصاص پر دلالت کرتی ہیں اور اس تاکید بالائے تاکید سے مقصود ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور یہ کفار کی نسبت سے حصر اضافی ہے، یعنی ہم کفار کی طرح تسبیح اور عبادت میں شرک کرنے والے اور ہم کفار کی طرح تسبیح و تہلیل کو ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔

وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾

"اور وہ (بعثت نبوی سے پہلے) کہا کرتے تھے اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت ہوتی پہلے لوگوں کی طرف سے تو ہم اللہ کے مخلص بندے بن جاتے [1]"

[1] یعنی مشرکین مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے کہ اگر پہلے لوگوں پر جو کتب نازل ہوئیں ان میں سے کوئی کتاب ان کی طرف سے ہمیں پہنچتی تو ہم خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اس کے احکام کی مخالفت نہ کرتے اور ان کانوا میں اِن مخفف من مثقلہ ہے۔ اور لام فارقہ ہے، یعنی ان نافیہ اور مخففہ میں فرق کرنے کے لئے ہے اور ان دونوں کے ذکر میں اشارہ ہے کہ وہ یہ بات تاکید کے ساتھ کرتے تھے۔ اس لئے ان کے پہلے اور آخری امر کو تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا۔

فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

"پس (جب نصیحت آئی) تو اسے ماننے سے انکار کر دیا وہ عنقریب (اپنا انجام) جان لیں گے [1]"

[1] بہٖ کی ضمیر کا مرجع ذکر ہے اور سوف پر فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ کفر وعید کا سبب ہے، یعنی جب اشرف ترین کتاب ان کے پاس پہنچی تو اس کا انکار کر دیا پس عنقریب اپنے کفر کا انجام جان لیں گے اور اس کفر کی وجہ سے انتقام کا کوڑا ان پر برسے گا تو **ان** کو کفر کی برائی پر آگاہی ہو جائے گی۔

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

"اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے کہ ان کی ضرور مدد کی جائے گی اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہوا کرتا ہے [1]"

لے اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ کلمتنا کا بیان ہے۔اسی وجہ سے درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں فرمایا، یعنی ہمارا وعدہ ہے کہ ہمارے لشکر ہی کامیاب وکامران ہوں گے (یہ ہمارا قانون عام ہے) میں کہتا ہوں اگر کبھی مسلمانوں کے لشکروں کو ہزیمت اور شکست کا سامنا ہوتا ہے تو یہ انسان کے گناہوں کی نحوست کا نتیجہ ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے) ایک اور مقام پر فرمایا اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (ترجمہ) جب کہ گھمنڈ میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے پس نہ فائدہ دیا تمہیں (اس کثرت نے) بھی اور تنگ ہوگئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے پھر تم مڑے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾

”پس آپ رخ (انور) پھیر لیجئے ان سے تھوڑی دیر لے“

لے ابن عباس فرماتے ہیں حین سے مراد موت ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد وہ دن ہے جس دن دنیا میں ان پر عذاب آئے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد بدر کا دن ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں سدی نے فرمایا جس دن اللہ تعالیٰ جنگ کرنے کا حکم دے گا (ا) مقاتل کے قول نسخها آية القتال (قتال کی آیت نے اس آیت کو منسوخ کردیا) کا بھی یہی مطلب ہے۔

وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾

”اور ملاحظہ فرماتے رہیئے ان کے (حالات) کو وہ (خود بھی) اپنا انجام دیکھ لیں گے لے“

لے یعنی آپ ان کو مقتول، مغلوب اور عذاب میں مبتلا دیکھئے۔ آیت کے اسلوب میں اشارہ ہے کہ یہ کام عنقریب ہونے والا ہے گویا وہ آپ کے سامنے ہے اور جو دنیا میں ہم نے آپ کے لئے تائید ونصرت یا آخرت میں ثواب اور دنیا وآخرت میں ان کفار پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے وہ یقیناً یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ آیت میں سوف دوری کو بیان کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ وعید کے لئے ہے۔

ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ کا ارشاد ہوا تو مشرکین مکہ کہنے لگے وہ عذاب کب آئے گا؟ جویبر نے ابن عباس سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾

”کیا وہ ہمارے عذاب (کے اترنے) کے لئے جلدی مچا رہے ہیں لے“

لے استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے اور فا محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ أَيَجْهَلُوْنَ شَأْنَنَا فَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ یعنی کیا یہ ہماری شان علو سے ناواقف ہیں اور ہمارے عذاب کو اترنے کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔

''پس جب وہ اترے گا ان کے آنگن میں تو وہ صبح بڑی خوفناک ہوگی جنہیں ڈرایا جاتا تھا۔''

لے نَزَلَ کا فاعل عذاب ہے، یعنی جب عذاب ان کے صحن میں آئے گا۔ فراء کہتے ہیں عرب قوم کی جگہ ساحہ کے لفظ پر اکتفا کرتے ہیں(1) یا یہ معنی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کے ساتھ کفار کے آنگن میں اتریں گے صباح کا لفظ عذاب کے نزول کے وقت کے لئے استعارۃً استعمال ہوا ہے۔ یہ صباح الجیش المبیت (صبح کے قریب حملہ کرنے والا لشکر) سے مستعار ہے عموماً حملہ اور غارت گری صبح سویرے کی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے حملہ کو صباح کہتے ہیں اگرچہ وہ حملہ کسی دوسرے وقت بھی ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خیبر پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تو آپ اس قلعہ کے پاس رات کے وقت پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب کسی قوم کے پاس رات کے وقت پہنچتے تو اسی وقت حملہ نہ کرتے بلکہ صبح کا انتظار فرماتے حضرت انس فرماتے ہیں جب صبح ہوئی تو یہودی اپنے پھاوڑے اور ٹوکرے لئے باہر نکلے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ کہنے لگے قسم بخدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کے ساتھ لشکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اکبر خیبر تباہ ہو گیا جب ہم صحن میں اترتے ہیں تو ان کی صبح بڑی خوفناک ہے جنہیں ڈرایا گیا تھا۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے روایت کیا ہے(2) صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لے کر کسی قوم پر حملہ کرنے کے لئے جاتے تو صبح تک حملہ نہ فرماتے اور انتظار فرماتے اگر (اس بستی) سے اذان کی آواز سنتے تو حملہ نہ فرماتے اگر اذان کی آواز نہ سنتے تو صبح کے وقت ان پر حملہ کر دیتے۔ ہم خیبر کی طرف نکلے تو ہم خیبر کے پاس رات کے وقت پہنچے۔ جب صبح ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کی آواز نہ سنی تو آپ سوار ہوئے اور میں ابوطلحہ کے پیچھے سوار ہوا اور میرا پاؤں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کو مس کر رہا تھا۔ راوی فرماتے ہیں یہودی ہماری طرف اپنے ٹوکروں اور پھاوڑوں کے ساتھ نکلے۔ جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو کہنے لگے محمد! قسم بخدا محمد اور لشکر آیا ہے اور وہ قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو فرمایا اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ خَرِبَتْ خَيْبَرُ اِنَّا اِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ(3)۔

وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اور رخ انور پھیر لیجئے ان سے تھوڑی دیر کے لئے اور (قدرت الٰہی کا تماشا) دیکھتے رہیئے وہ بھی اپنا انجام دیکھ لیں گے لے۔''

لے یہ ارشادات تاکید کے لئے دوبارہ ذکر فرمائے۔ پہلی آیت میں ابصرھم فرمایا تھا، یعنی مفعول کے ساتھ مقید فرمایا تھا تو دلالت کے مقام کی وجہ سے فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ بھی مقید ہوگا۔ لیکن اس آیت میں مفعول کے ساتھ مقید نہیں فرمایا بلکہ مطلق ذکر فرمایا اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ آپ گوناں گوں ایسی خوشیاں اور مسرتیں دیکھیں گے جن کا احاطہ زبان ذکر کے لئے ممکن نہیں اور یہ کافر ایسی تکالیف دیکھیں گے جن کا تذکرہ ناممکن ہے یا پہلا ارشاد دنیا کے عذاب کے لئے ہے اور دوسرا آخرت کے عذاب کے لئے ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

۱؎ عزت کا معنی غلبہ اور قوت ہے اور رب کی عزت کی طرف اضافت کا مقصود یہ ہے کہ وہی عزت کا مالک ہے۔ یہ عزت اس کے ساتھ خاص ہے کیونکہ لا عزة الا له عزت فقط اس کے لئے ہے یا اس عزت سے مرادوہ عزت نہیں جو ازلی اور ذاتی ہوتی ہے اور صفات الٰہیہ میں سے ہے بلکہ اس عزت سے مرادوہ عزت ہے جس کی طرف رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین منسوب ہیں (اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ عزت حادثہ (جو پہلے نہ ہو بعد میں پیدا ہو) بھی اسی کی مملوک ہے اور اس کے ساتھ خاص ہے جہاں چاہتا ہے وہاں رکھتا ہے) اس آیت میں اشارہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ اس کی ذات کے لئے واجب ہیں اور اس کی ذات ان کی مقتضی ہے۔ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ اور ثبوتیہ کو داخل فرمایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں توحید کا شعور بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر اس بات سے منزہ ہے جو شرک کہتے ہیں جن کا ذکر سورت میں ہو چکا ہے۔

وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾

''اور سلامتی ہو سب رسولوں پر ۱؎''

۱؎ یعنی سلام ہو ان رسولوں پر جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفات بیان کیں۔ اس جملہ میں تمام رسولوں کے لئے سلامتی کا ذکر ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

''اور سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے ۱؎''

۱؎ یعنی سب تعریفات کا وہی مستحق ہے کیونکہ رسولوں کو مبعوث فرما کر اور کتابوں کو نازل فرما کر اس نے مومنین کو اپنی ذات اور صفات کی معرفت عطا فرمائی، انبیاء کرام کو اپنی تائید کا مژدہ سنایا۔ داعیان اسلام کے دشمنوں کی تباہی اور بربادی کی خبر بیان فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں جسے یہ پسند ہو کہ قیامت کے روز اجر کا پورا پیمانہ بھرے تو اس کی مجلس کا آخری کلام یہ ہونا چاہئے۔ سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَ سَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (1) اس حدیث کو علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں اور عبد بن رنجویہ نے الترغیب میں روایت کیا ہے۔

سورۂ ص

اٰیاتھا ۸۸ سُوْرَۃُ صٓ مَکِّیَّۃٌ ۳۸ رکوعاتھا ۵

سورۂ ص مکی ہے، اس میں اٹھاسی آیات اور پانچ رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ﴿۱﴾

''ص قسم ہے قرآن ۱؎ سراپا نصیحت کی (دعوت محمدی حق ہے) ۲؎''

۱؎ امام احمد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ایک دفعہ ابو طالب بیمار تھے، قریش آپ کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لائے۔ قریش نے ابو طالب سے حضور کی شکایت کی۔ ابو طالب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اے میرے بھیجتے تم اپنی قوم سے کیا چاہتے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سے صرف ایک بات کا تقاضا کرتا ہوں اگر یہ میری بات تسلیم کرلیں تو عرب ان کے فرمانبردار ہو جائیں اور عجم ان کو خراج ادا کریں فرمایا صرف ایک بات چاہتا ہوں۔ ابو طالب نے پوچھا کون سی بات؟ فرمایا یہ کہہ دیں لا الہ الا اللہ۔ کفار کہنے لگے کیا اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنالیا ہے یہ تو بڑی عجیب بات ہے(۱) اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں ص قسم ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ سورت کا نام ہے جیسا کہ پہلے ہم نے تمام حروف تہجی کے متعلق تفصیلاً ذکر کر دیا ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں ص اللہ تعالیٰ کے اسماء الصمد اور صادق الوعد کی مفتاح (چابی) ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی ہے صدق اللہ اللہ نے سچ فرمایا۔ ابن عباس سے اس کا معنی صدق محمد صلی اللہ علیہ وسلم مروی ہے۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا(2) بعض علماء فرماتے ہیں یہ المصاداۃ مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔ اسی وجہ سے اسے نادِ کے وزن پر کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اس کا معنی ہے پیش کرنا کیونکہ آپ نے پہلی آواز سے مطابقت کی۔ مطلب یہ ہوگا کہ اے محبوب اپنے عمل کو قرآن کے مطابق کرو۔ صحیح یہ ہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے۔ ہم نے اس کی تحقیق سورۂ بقرہ کی ابتداء میں ذکر کردی ہے۔

۲؎ ابن عباس نے ذِی الذِّکۡرِ کا معنی ذی البیان کیا ہے(3) یعنی قرآن عقائد، شرائع اور مواعید میں سے جس چیز کی حضرت انسان کو ضرورت تھی سب کو بیان کرنے والا ہے یا اس کا معنی ہے کہ قرآن سراپا نصیحت ہے۔ ضحاک نے اس کا معنی ذی الشرف (شرف والا ہے) کیا ہے(4) جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہے وَ اِنَّہٗ لَذِکۡرٌ لَّکَ وَ لِقَوۡمِکَ اور بے شک یہ بڑا شرف ہے آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے۔ اگر ص اسم ہو جو بطور چیلنج ذکر کیا گیا ہو یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی کلام کے لئے امر ہو یا صیغہ امر ہو تو واو قسم کے

لئے ہوگی۔ اگر صٓ قسم ہوگی تو واو عطف کے لئے ہوگی۔ اخفش کہتے ہیں اس قسم کا جواب قسم اِنْ کُلٌّ اِلَّا کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ہے۔ اور یہ قول انتہائی بعید ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس کا جواب محذوف ہے جس پر صٓ کی چیلنج کے معنی پر دلالت ہے امر کا صیغہ دلالت کر رہا ہے، یعنی یہ قرآن معجزہ ہے یا اس پر عمل واجب ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں، حقیقت وہ نہیں جو کفار بکتے ہیں۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝

’’لیکن یہ کفار تکبر اور مخالفت میں (اندھے ہو گئے) ہیں [1]‘‘

[1] یعنی کفار حق سے تکبر اور زمانہ جاہلیت کی حمیت و عصبیت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور دشمنی میں حق کی روشنی دیکھنے سے اندھے ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کو تسلیم نہیں کرتے یا یہ معنی کہ عقل اور نقل جس عقیدہ کے مقتضی ہیں یہ کفار اس کی مخالفت میں اندھے ہو گئے ہیں۔ عِزَّةٍ اور شِقَاقٍ پر تنوین ان کی مخالفت اور ان کے تکبر کی شدت پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ یہ کلام محذوف جواب قسم سے اضراب ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ جواب قسم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ بَلْ عَجِبُوْٓا بل یہاں ابتدائیہ ہے۔ قتیبی فرماتے ہیں ’’بل‘‘ کلام سے تدارک اور دوسری نفی کے لئے ہے۔ آیت کا مجاز اس طرح ہے اِنَّ اللّٰهَ اَقْسَمَ بِصٓ وَالْقُرْآنِ ذِی الذِّكْرِ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ مَكَّةَ فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے صٓ اور قرآن سراپا نصیحت کی قسم اٹھائی ہے کہ کفار مکہ تکبر اور دشمنی میں اندھے ہو چکے ہیں۔

كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۝

’’بہت سی امتوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے پس وہ فریاد کرنے لگے اور نہیں تھا یہ وقت بچ نکلنے کا [1]‘‘

[1] یہ آیت کریمہ محض غرور و عناد کی بنیاد پر کفر کرنے پر وعید ہے اور انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ان جیسے کئی نافرمان لوگوں کو ہم نے اپنے عذاب کی چکی میں پیس کر رکھ دیا۔ جب ہمارا عذاب پہنچا تو وہ توبہ و استغفار کی آوازیں لگانے لگے لیکن ہم نے کہا اب بھاگنے اور فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ لات حین مَنَاصٍ اصل میں لات الحین حین مَنَاصٍ ہے۔ کم اهلكنا کا جملہ معترضہ ہے اور پہلے کفار کی حالت بیان کی، اب ان کے انجام کا ذکر فرمایا جا رہا ہے، یعنی ہم انہیں بھی ہلاک کر دیں گے جیسے ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو (نافرمانی کی وجہ سے) ہلاک کیا تھا۔ لات میں لا مشابہ بلیس ہے۔ اور تاکید کے لئے تانیث کی تاء اس پر زائد کی گئی ہے۔ جس طرح رُبَّ اور ثَمَّ پر زائد کی جاتی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے اس کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے اور وقت کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے، اس کا ایک معمول حذف ہوتا ہے یا اسم یا خبر محذوف ہوتی ہے۔ یہاں اسم محذوف ہے، یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے۔ اخفش کہتا ہے یہ لا نافیہ للجنس ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ فعل کی نفی کے لئے ہے اور اس کے بعد والے اسم پر نصب فعل کے اضمار کی وجہ سے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لا اری حين مناص حاصلاً لهم۔ زجاج کے نزدیک وقف لات کی تاء پر ہے۔ اور کسائی کے نزدیک ھاء کے ساتھ وقف ہے۔ یعنی لاہ۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ حین میں ت زائد کی گئی ہے، لا پر وقف ہے۔ اور پھر تحین سے آغاز ہے۔ یہ ابو

(وہ اس وقت مہربانی کرتے ہیں جب کوئی مہربانی کرنے والا نہیں ہوتا اور وہ اس وقت کھلاتے ہیں جب کوئی کھلانے والا نہیں ہوتا)

مناص' ناصه ینوصه سے مصدر میمی ہے۔ قاموس میں النوص کا معنی التاخر اور المناص کا معنی ملجاه (پناہ گاہ) لکھا ہے(1)۔ ابن عباس فرماتے ہیں کفار مکہ جب لڑتے اور جنگ میں بھاگنے پر مجبور ہو جاتے تو ایک دوسرے کو کہتے مناص یعنی بھاگ جاؤ اور اپنا بچاؤ کرو۔ جب اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ پر بدر کی جنگ میں عذاب نازل فرمایا تو کہنے لگے مناص' بھاگ کر جان بچاؤ تو اس وقت یہ کہا گیا لات حین مناص اب بھاگ جانے کا وقت نہیں ہے(2) یہ جملہ نادوا کے فاعل سے حال ہے، یعنی انہوں نے آہ و زاری کی لیکن اس وقت آہ و فغاں کا وقت گذر چکا تھا اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا اور کوئی پناہ گاہ موجود نہ تھی۔ کفار مکہ کو پہلے لوگوں کی بے بسی کا ذکر سنایا گیا لیکن ان کو کوئی درس عبرت نہ ملا۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۚۖ

''اور وہ (اس پر) حیران تھے کہ آیا ہے ان کے پاس ایک ڈرانے والا ان میں سے' اور کفار کہنے لگے کہ یہ شخص ساحر ہے کذاب ہے [1]''

[1] عَجِبُوْٓا کا عطف ظرف مستقر (یعنی فی عزة و شقاق) پر ہے۔ یا یہ قد کی تقدیر کے ساتھ ظرف میں جو ضمیر مشتر ہے اس سے حال ہے۔ کفار کا پہلے ذکر ہو چکا تھا پھر اسم ضمیر کا ذکر کافی تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر اظہار غضب کے لئے اور ان کی مذمت کرنے کے لئے اسم ظاہر الکافرون ذکر فرمایا نیز اس چیز کا ظہور مقصود تھا کہ محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کذاب اور ساحر کی جو انہوں نے نسبت کی ہے اس کی وجہ محض ان کا کفر ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو جادو کی کرشمہ سازی کہتے اور آپ کی پرحکمت باتوں کو جھوٹ کہتے۔ العیاذ باللہ۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝

''کیا بنا دیا ہے اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بیشک یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے [1]''

[1] یہ کلام قالوا کے حذف پر محمول ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے دعوت توحید دی تو انہوں نے بڑے تعجب سے کہا کیا انہوں نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنا لیا ہے؟ یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو الوہیت ایک جماعت اور پورے گروہ کے لئے تھی وہ ایک کے لئے کیسے ہو گئی؟ یہ بڑی عجیب بات ہے، آج تک جو کام ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو کرتے دیکھا ہے اور ان سے سیکھا ہے یہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ذات کا علم اور قدرت بہت سے امور اور اشیاء کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر بن خطاب نے جب اسلام قبول کیا تو قریش پر یہ انتہائی ناگوار ہوا لیکن مسلمان آپ کے اسلام سے خوب شاداں و فرحاں ہوئے۔ ولید بن مغیرہ نے قریش کے سردار لوگوں کو اکٹھا کیا تقریباً پچیس سرداران قریش جمع ہوئے جن میں سے ولید عمر میں سب سے بڑھا تھا۔ ولید نے مشورہ دیا کہ ہم ابوطالب کے پاس جائیں (اور انہیں کہیں کہ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں کہ ہمارے خداؤں کو برا بھلا نہ کہے) ابوطالب کے پاس پہنچے تو کہنے لگے آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ کو معلوم ہے ان بیوقوفوں نے ہمارے آباؤ اجداد کے عقائد و اعمال پر کیسے تنقید شروع کر رکھی ہے۔ ہم جناب کے پاس حاضر

تجھ سے گذارش کرتے ہیں کہ آپ ان پر زیادتی نہ کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ کہنے لگے آپ ہمارے خداؤں کا تذکرہ چھوڑ دیں اور ہم آپ کو اور آپ کے خدا کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے ایک بات کی ضمانت دے دو جس کے تسلیم کرنے پر تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم بھی تمہاری فرمانبرداری قبول کر لیں گے۔ ابو جہل نے کہا تیرے باپ کی قسم ہم تیری ایک نہیں بلکہ دس باتیں ماننے کے لئے تیار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہو لا اله الا الله. پس آپ کی یہ بات سنتے ہی تتر بتر ہو گئے اور کہنے لگے کیا اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنا لیا ہے، ایک خدا ساری مخلوق کی دعائیں کیسے سنے گا(1)۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں التعجیب اس عجیب بات کو کہتے ہیں جس کی کوئی مثال ہو اور عجاب اس کو کہتے ہیں جس کی کوئی مثال نہ ہو۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۟ۖ (٦)

”اور تیزی سے چل دیئے قوم کے سردار (رسول کے پاس سے) اور (قوم سے کہا) یہاں سے نکلو اور جمے رہو اپنے بتوں پر[1] بیشک اس میں اس کا کوئی (ذاتی) مدعا ہے[2]“

[1] انطلق کا جملہ قالوا اجعل لالهة الخ پر معطوف ہے۔ یعنی حضرت ابو طالب کی مجلس سے صنادید کفار اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے اپنے معبودوں کی عبادت پر ثابت قدم رہو۔ ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ امشوا سے پہلے اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ انطلاق میں قول کا معنی موجود ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں انطلاق سے مراد الا ندفاع بالقول ہے۔ یعنی باتوں سے دفاع کرنا۔ امشوا یہ مشیت المرة سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے کہ اس نے کثرت سے بچے جنے۔ اسی سے الماشیہ ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ اسی بات پر جمع ہوئے ہیں۔

[2] یہ جو توحید کا پرچار کر رہے ہیں ان کا اس میں کوئی ذاتی نفع ہے۔ یہ جملہ امشوا کی علت بیان کر رہا ہے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ جب حضرت عمر نے اسلام قبول کیا تو ان کی وجہ سے مسلمانوں کو تقویت مل گئی۔ کفار یہ منظر دیکھ کر کہنے لگے ان هذا لشي يراد کہ انکا اس میں کوئی ذاتی مقصود و مدعا ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ جو ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں میں صبح و شام اضافہ ہو رہا ہے یہ بڑی عجیب بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے متعلق کچھ ارادہ رکھتے ہیں(2) جس کو ہم سے روکنے والا کوئی نہیں۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اہل زمین کے متعلق کوئی ارادہ فرمایا ہے بعض علماء نے لکھا ہے یہ معنی ہے کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے اوپر سرداری دینے کا ارادہ فرمایا ہے یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو توحید کا پیغام دیتے ہیں یا انکا ارادہ عرب و عجم پر اپنی حکومت کا قیام ہے یہ ایسی چیز ہے جس کا ارادہ ہر شخص کرتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارا دین ایک ایسی چیز ہے جو مطلوب ہے تا کہ تم سے حاصل کیا جائے۔

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۟ۖ (٧)

”ہم نے تو ایسی بات آخری ملت (نصرانیت) میں بھی نہیں سنی یہ بالکل من گھڑت مذہب ہے[1]“

تیسرا خدا مانتے تھے۔ مجاہد کہتے ہیں اس سے کفار کی مراد قریش کی ملت اور ان کا وہ دین جس پر وہ قائم تھے (۱) یعنی ہم نے اپنے آباء کو جس عقیدہ پر پایا اس میں ہم نے یہ توحید کا تصور نہیں سنا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ حال کے محل میں ظرف مستقر ہو، یعنی ہم نے اہل کتاب سے اور کاہنوں سے یہ توحید کا عقیدہ نہیں سنا۔ انہوں نے تو ہمیں نہیں بتایا کہ آخری ملت (اسلامیہ) میں ایسا نظریہ ہوگا یہ تو من گھڑت جھوٹ ہے۔

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ؕ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِیْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ؕ﴿۸﴾

"کیا نازل کیا گیا ہے اس پر الذکر (قرآن) ہمارے درمیان میں سے لے بلکہ یہ کفار شک میں مبتلا ہیں میرے ذکر کے متعلق بلکہ انہوں نے ابھی نہیں چکھا میرے عذاب کا مزا ۲۔"

لے الذکر سے مراد قرآن ہے اور استفہام بمعنی انکار ہے پس استفہام بمعنی نفی ہے اور یہ ان ھذا الا اختلاق کے مضمون کی تاکید کے لئے ہے، یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو ہم سے عمر میں بڑا ہے نہ مال و جاہ کے اعتبار سے زیادہ ہے تو پھر ان پر قرآن کیسے نازل ہوا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ان کی تکذیب کی وجہ صرف اور صرف حسد تھا۔ نیز ان کی نگاہوں میں عظمت کا تصور صرف دنیوی مال و متاع کی کثرت تھی۔

۲ بل کے ساتھ اضراب انکار اور شک کے اثبات کے لئے ہے کیونکہ ان کے پاس نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر اور کذاب کہنے کی کوئی حجت اور دلیل نہیں تھی۔ اس وجہ سے تقلید کا سہارا لینے لگے اور دلیل سے اعراض کرنے لگے، قرآن کا انکار کرنے کے بجائے قرآن لانے والے کا انکار کیا۔ ابھی تک انہوں نے ہمارے عذاب کا مزا نہیں چکھا اگر چکھا ہوتا تو کبھی انکار کی جرأت نہ کرتے۔ یقیناً یہ عذاب کا مزا چکھیں گے اور اس وقت ان کا شک زائل ہو جائے گا لیکن اس وقت کا اعتراف نفع مند نہ ہوگا۔ دوسرا بل شک سے اضراب کے لئے اور قرآن کی حقیقت کی نفی کا جو ان کا اعتقاد اور یقین تھا اس کے اثبات کے لئے ہے۔ پہلے شک کا اثبات فرمایا، ان کے پاس حجت نہ ہونے کے اعتبار سے پھر یقین کا اثبات فرمایا ان کی ہٹ دھرمی اور جہل مرکب کے اعتبار سے بعض علماء فرماتے ہیں بل دونوں مقامات پر ابتدائیہ ہے، اضراب کے لئے ہے۔ پہلا جملہ کفار کے کلام کا جواب ہے اور دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۚ﴿۹﴾

"کیا ان کے قبضہ میں ہیں خزانے آپ کے رب کی رحمت کے جو عزت والا ہے بے حساب عطا کرنے والا ہے لے۔"

لے یعنی کیا نبوت کی چابیاں ان کے پاس ہیں کہ جسے چاہیں دے دیں۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں، نبوت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے کیونکہ وہ غالب ہے، اس پر کوئی چیز غالب نہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ ام منقطعہ بمعنی بل ہے اور ہمزہ بعض علماء کے نزدیک ایک دعویٰ سے دوسرے دعویٰ کی طرف اضراب کے لئے ہے یا ہمزہ اس دعویٰ کے انکار کے لئے ہے۔

اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ فَلْيَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ ﴿۱۰﴾

(آسمانوں پر) اس کی راہوں سے 2؎"

1؎ پہلے کفار کا رد فرماتے ہوئے فرمایا ان کے پاس رحمت کے خزائن نہیں ہیں پھر فرمایا ان کا اس عالم جسمانی میں کوئی دخل نہیں جو رحمت رب کے خزائن کا ایک چھوٹا سا جزء ہے تو پھر انہیں مقام نبوت جیسے بلند و بالا امر میں تصرف کرنے کا کیسے حق ہوگا۔

2؎ یہ شرط محذوف کا جواب ہے، یعنی اگر انہیں آسمانوں اور زمین میں کچھ اقتدار اور سلطنت ہے تو سیڑھی لگا کر عرش پر چڑھ جائیں اور اس پر بیٹھ کر اس کائنات کی تدبیر کریں اور جن کو اچھا سمجھتے ہیں ان پر وحی نازل کریں، ان سے استہزاء کے لئے فرمایا آسمان پر چڑھو۔ یہ امر زجر و توبیخ اور ان کے عجز کے اظہار کے لئے ہے۔ قتادہ اور مجاہد فرماتے ہیں اسباب سے مراد آسمان کے دروازے ہیں اور وہ راستے ہیں جو ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف جاتے ہیں۔ الغرض ہر وہ چیز جو کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ ہو خواہ وہ دروازہ ہو یا راستہ ہو وہ اس کا سبب ہے (1)۔

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ﴿۱۱﴾

"(درحقیقت) کفار کے لشکروں میں سے یہ ایک چھوٹا سا لشکر ہے جسے وہاں (بدر میں) شکست دے دی جائے گی 1؎"

1؎ ما قلت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اور جند مبتدا محذوف کی خبر ہے اور مَهْزُوْمٌ، جند کی صفت ہے، یعنی کفار مکہ کا یہ چھوٹا سا لشکر جسے عنقریب بدر کے میدان میں شکست سے دوچار کیا جائے گا، یہ بھی ان کفار کے لشکروں میں سے ایک ہے جنہوں نے گذشتہ زمانے میں میرے رسولوں کے خلاف محاذ بنائے تھے لیکن ان کی ساری نخوتوں اور خرمستیوں کے ساتھ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا تھا تو پھر یہ (کس باغ کی مولی ہیں) انہیں امور الٰہیہ میں کس نے تصرف اور تدبیر کا اختیار دیا ہے یا یہ معنی کہ اے پیارے حبیب! جو کچھ یہ ہرزہ سرائی کر رہے ہیں اس سے آپ پریشان نہ ہوں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی بتا دیا کہ مشرکین کا لشکر شکست اٹھائے گا (2) فرمایا سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾۔ عنقریب پسپا ہوگی یہ جماعت اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ اس نوید کا اظہار بدر کی جنگ میں ہوا۔ ھنالک کا اشارہ بدر اور ان کی قتل گاہوں کی طرف ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ اس جگہ کی طرف اشارہ ہے جہاں کفار موجود ہوں اور اس قسم کے محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہیں اور پیارے حبیب کی تکذیب کریں۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴿۱۲﴾

"جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح، عاد اور میخوں والے فرعون نے 1؎"

1؎ ابن عباس اور محمد بن کعب فرماتے ہیں ذُو الْاَوْتَادِ سے مراد مضبوط عمارتوں والا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی مضبوط اور طاقتور حکومت والا ہے۔ قتیبی کہتے ہیں عربوں کا قول ہے هُمْ فِي الْعِزِّ الثَّابِتِ الْاَوْتَادِ اور اس سے ان کی مراد دائمی طاقتور شخص ہوتا ہے (3) ضحاک نے بھی اس کا معنی قوت والا اور سخت پکڑ والا کیا ہے۔ عطیہ فرماتے ہیں بہت زیادہ لشکروں والا، یعنی وہ لشکر اس

روایت میں اوتاد کا معنی بیان ہوا ہے(1) کلبی اور مقاتل کہتے ہیں اوتاد جمع ہے وتد کی۔ فرعون نے کیلوں کی طرح ستون بنا رکھے تھے، لوگوں کو ان پر عذاب دیتا تھا۔ جب کسی پر ناراض ہوتا ہوتا تو اسے ان چار ستون کے درمیان چت لٹا دیتا اور اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے ان ستونوں کے ساتھ باندھ دیتا پھر اس زمین و آسمان کے درمیان معلق لٹکا ہوا چھوڑ دیتا حتی کہ وہ آدمی تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ مجاہد اور مقاتل بن حبان کہتے ہیں تو وہ زمین پر کسی کو چت لٹا دیتا پھر اس کے ہاتھ اور پاؤں زمین پر کیلوں کے ساتھ باندھ دیتا۔ سدی لکھتے ہیں وہ ایک شخص کو لٹا دیتا اور رسیوں کے ساتھ کیلوں سے باندھ دیتا اور اس شخص پر بچھو اور سانپ چھوڑ دیتا۔ قتادہ کہتے ہیں فرعون کو ذُوالْاَوْتَادِ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ پارٹیاں تھیں اور کھیل کے میدان تھے۔ وہ کھلاڑی اس کے سامنے ان میدانوں میں کرتب اور کھیل کے مظاہرے کرتے تھے(2)۔

وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الْاَحْزَابُ ⑬

''اور ثمود قوم لوط اور اصحاب ایکہ نے یہی وہ گروہ ہیں (جن کا ذکر پہلے گذر چکا) لے''

لے اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے۔ الْاَحْزَابُ پر الف لام عہدی ہے، یعنی یہی وہ گروہ ہیں جن کا ذکر جند ما هنالک الخ کے ارشاد میں گذر چکا ہے۔ انہوں نے رسولوں کے خلاف گروہ تیار کئے تھے۔ مشرکین مکہ کا گروہ بھی انہی نابکار قوموں میں سے ایک ہے۔

اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ⑭

''ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو (ان پر) لازم ہو گیا میرا عذاب لے''

لے یہ کلام اس تکذیب کا بیان ہے جو پہلے ان کی طرف مبہم طور پر منسوب کی گئی ہے اور یہ کلام تاکید کی مختلف انواع پر مشتمل ہے (مثلاً تکذیب تکرار، ابہام کے ایضاح، جملہ استثنائیہ جس میں ان کی تکذیب کا اثبات ہے جو تخصیص و تاکید کے انداز میں ہے) اس کلام کو تاکید بالائے تاکید اس لئے فرمایا تاکہ ان کے سخت عذاب کے مستحق ہونے پر مہر لگ جائے۔ اسی وجہ سے اس جملہ پر فَحَقَّ عِقَابِ کو مرتب فرمایا ہے، یعنی ان پر میرا عذاب واجب ہو گیا اور ان پر میرا وہی عذاب نازل ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ عقاب کو یعقوب نے وصل اور وقف دونوں حالتوں میں یاء کے ساتھ، یعنی عقابی پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے حذف کے ساتھ کسرہ پر اکتفاء کرتے ہوئے پڑھا ہے۔

کل کذب الرسل کے جملہ پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ گذشتہ قوموں نے اپنے اپنے رسول کی تکذیب کی تھی، کسی دوسرے رسول کی انہوں نے تکذیب نہیں کی تھی تو پھر اس طرح کیوں فرمایا کہ ان سب نے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ مصنف فرماتے ہیں یا یہ جمع کے مقابلہ میں جمع کے اصول پر ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے رسول کی تکذیب کی (جیسے عرب کہتے ہیں القوم رکبوا دوابهم اس کا مطلب نہیں کہ قوم کا ہر فرد ہر سواری پر سوار ہوا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی سواری پر سوار ہوا) یا اس لئے کہ رسولوں میں سے ایک کی تکذیب سب رسولوں کی تکذیب ہے کیونکہ تمام رسولوں کی دعوت اور پیغام ایک تھا (لا اله الا الله)

''اور نہیں انتظار کررہے ہیں یہ (کفار مکہ) مگر ایک کڑک کی جس کے بعد کوئی مہلت نہیں ہوگی ۱؎''

۱؎ مَا یَنْظُرُ کا معنی ما ینتظر ہے۔اس کا عطف وقال الکافرون پر ہے یا یہ حال ہے اور ھؤ لاء سے مراد کفار قریش ہیں۔صیحۃ واحدۃ سے مراد نفحہ صور ہے، یعنی یہ ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ عذاب الیم دیکھ لیں گے لیکن اس وقت کا ایمان نفع بخش نہ ہوگا۔مالھا من فواق، صیحۃ کی دوسری صفت ہے۔حمزہ اور کسائی نے فواق کو فاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی علماء نے فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں فتحہ کے ساتھ قریش کی لغت ہے اور ضمہ کے ساتھ تمیم کی لغت ہے۔ابن عباس اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی لوٹنا ہے۔مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی مہلت ہے۔ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی پھرنا ہے۔فراء اور ابوعبیدہ فرماتے ہیں فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی راحت اور افاقہ ہے جیسے جواب بمعنی اجابۃ ہوتا ہے۔فراء اور ابوعبیدہ کا خیال ہے کہ یہ افاقۃ المریض سے مشتق ہے جب مریض غلبہ مرض سے صحت یابی کی طرف آئے اور ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی دو مرتبہ دودھ دو ہنے کے درمیان کا وقت ہے (۱) یعنی ایک مرتبہ اونٹنی کا دودھ دوھ لیا جائے پھر اسے کچھ وقت کے لئے چھوڑ دیا جائے حتی کہ اس کی کھیری میں دوبارہ دودھ جمع ہو جائے تو اس درمیانی وقفہ کو فواق کہتے ہیں، یعنی کفار کے لئے اتنی بھی مہلت نہ ہوگی جتنی دو مرتبہ دودھ دو ہنے کے درمیان ہوتی ہے۔بعض علماء فرماتے فوق (بالفتح) اور فواق (بالضم) دونوں استعارۃً رجوع کے معنی میں ہیں کیونکہ درمیانی وقفہ میں دودھ دوبارہ کھیری میں لوٹ آتا ہے اور مریض صحت کی طرف رجوع کرتا ہے، یعنی صور پھونکے جانے کے بعد دنیا کی طرف ان کو لوٹنا نہیں ہوگا یا یہ معنی کہ جب صور پھونکنے کا وقت آئے گا تو اسے ملتوی اور پھیرا نہیں جائے گا یا یہ معنی کہ انہیں دو مرتبہ دودھ دھونے کے درمیانی وقفہ کی مدت بھی مہلت نہیں ملے گی یا یہ معنی کہ نہ انہیں عذاب سے افاقہ ملے گا اور نہ انہیں آرام و راحت نصیب ہوگی۔کلبی کہتے ہیں جب فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ کا ارشاد نازل ہوا تو کفار بطور استہزاء کہنے لگے اے ہمارے رب یوم حساب سے پہلے جلدی ہمیں اپنے عذاب کا حصہ دے دے۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾

''وہ (مذاقاً) کہتے ہیں اے ہمارے رب جلدی دے دے ہمارے حصہ (کا عذاب) یوم حساب سے پہلے ۱؎''

۱؎ القط اس صحیفہ کو کہتے ہیں۔جس میں ہر چیز کا شمار ہو چکا ہو۔سعید بن جبیر نے ابن عباس سے اسی طرح کا مفہوم روایت کیا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنا نامہ اعمال دنیا میں ہی دے دے۔سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ کفار کی مراد یہ تھی کہ اے ہمارے رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس جنت کا تذکرہ کرتا ہے اس میں سے ہمارا نصیب ہمیں دنیا میں ہی عطا کر دے۔حسن، قتادہ، مجاہد اور سدی فرماتے ہیں کفار کی مراد یہ تھی ہمیں ہمارے عذاب اور سزا کا حصہ دنیا میں دے دے۔عطاء فرماتے ہیں نضر بن الحارث نے یہی کہا تھا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے۔مجاہد فرماتے ہیں قطنا سے مراد حسابنا (ہمارا حساب) ہے (2)۔

اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾

طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا۱؎''

۱؎ اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ کا جملہ مستانفه ہے۔ اور واذکر عبدنا اس پر معطوف ہے۔ فرمایا میرے بندے داؤد کو یاد کرو کیونکہ پہلے انبیاء کرام کے حالات واقعات کا ذکر ناپسندیدہ باتوں پر صبر کرنے اور نفس کو طاعت پر رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ذا الاید کا معنی انتہائی طاقت در اور طاعت پر مضبوطی سے قائم رہنے والا ہے۔ اَوَّابٌ کا معنی ہے کائنات سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف بہت رجوع کرنے والا یا یہ معنی کہ معصیت کو چھوڑ کر اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی اطاعت گذار ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حبش کی لغت میں اس کا معنی تسبیح کرنے والا ہے(1) انه اواب کا جملہ "الاید" کی علت بیان کر رہا ہے اور یہ جملہ دلیل ہے کہ ذاالاید سے مراد وہ ہے جو دین میں مضبوط ہے۔ شیخین نے صحیحین میں، امام احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ترین روزہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین نماز داؤد علیہ السلام کی نماز ہے آپ آدھی رات سوتے پھر رات کا تیسرا حصہ قیام فرماتے اور رات کا آخری چھٹا حصہ پھر سوتے(2)۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۝۱۸

''ہم نے فرمانبردار بنادیا تھا پہاڑوں کو وہ ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے عشاء اور اشراق کے وقت ۱؎''

۱؎ یہاں سے فصل الخطاب تک ان انعامات اور نوازشات کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر کئے تھے۔ یہ داؤد سے بدل اشتمال ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں داؤد علیہ السلام کی کرامت کو یاد کرو۔ چاہیے یہ تھا کہ يُسَبِّحْنَ کی جگہ مسبحات ہوتا لیکن اسلوب میں یہ تبدیلی ماضی کی حالت کی حکایت اور سامع کی نظر میں اس حالت کو حاضر کرنے کے لئے ہے تاکہ سامع پہاڑوں کی تسبیح کے حدوث اور تجدد کا مشاہدہ کرے اور قدرت ربانیہ پر تعجب کرے۔

کلبی کہتے ہیں عشی اور اشراق سے مراد صبح وشام ہے اور اشراق اس وقت کو کہتے ہیں جب سورج انتہائی روشن ہو۔ ابن عباس نے اشراق سے مراد چاشت کی نماز لی ہے(3) علامہ بغوی نے اپنی سند سے اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس کا قول نقل فرمایا ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں اس آیت پر ایمان رکھتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے حتیٰ کہ حضرت ام ہانی بنت ابی طالب نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے اُمّ ہانی یہ چاشت یہ اشراق کی نماز ہے(4) اس اثر کو طبرانی نے الاوسط میں اور ابن مردویہ نے نقل کیا ہے۔ ابن جریر اور حاکم نے عبداللہ بن الحارث کے حوالہ سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے چاشت کی نماز کا علم اس آیت سے ہوا۔ اس قول کو سعید بن منصور نے بھی روایت کیا ہے۔

وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝۱۹

''اور پرندوں کو وہ بھی تسبیح کے وقت جمع ہو جاتے اور سب ان کے لئے فرمانبردار تھے ۱؎''

۱؎ الطیر کا عطف الجبال پر ہے محشورة کا معنی مجتمعه ہے كُلٌّ سے مراد پہاڑ اور پرندے ہیں۔ پہلی آیت میں بھی فرمایا کہ

پہاڑ ان کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ یہاں پھر فرمایا کُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ۔ اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ (یسبحن معه) صرف تسبیح میں موافقت کرنے پر دلالت کرتا ہے جب کہ یہاں جملہ اسمیہ ہے تسبیح کے دوام پر دلالت کرتا ہے یا اس آیت کا مفہوم ہے کہ داؤد علیہ السلام، پہاڑ اور پرندے سب اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اس صورت میں "له" کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہوگا۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾

''اور ہم نے مستحکم کر دیا ان کی حکومت کو اور ہم نے بخشی انہیں دانائی اور فیصلہ کن بات کرنے کا ملکہ ۱؎''

۱؎ ہیبت، نصرت اور لشکروں کی کثرت کے ذریعہ سے ہم نے ان کے اقتدار کو مستحکم کیا، بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا حضرت داؤد علیہ السلام زمینی بادشاہوں میں سب سے زیادہ اقتدار کے مالک تھے۔ آپ کی عبادت گاہ کے ہر رات چھتیس ہزار افراد نگہبان اور محافظ ہوتے تھے(1) بغوی نے عکرمہ کے حوالہ سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس ایک سردار کے خلاف مقدمہ پیش کیا کہ اس نے میری گائیں غصب کر لی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعیٰ علیہ سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا پھر آپ نے مدعی (دعویٰ کرنے والے) سے گواہی طلب کی تو اس کے پاس گواہی نہ تھی۔ حضرت داؤد نے ان دونوں کو فرمایا تم اب جاؤ میں تمہارے معاملہ میں سوچ بچار کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو خواب میں ارشاد فرمایا کہ مدعیٰ علیہ (جس پر دعویٰ کیا گیا ہے) کو قتل کر دو، حضرت داؤد علیہ السلام نے سوچا کہ یہ خواب ہے، میں عجلت سے کام نہیں لوں گا حتی کہ کوئی واضح حکم مل جائے۔ دوسرے دن بھی خواب میں ایسا ہی اشارہ پایا لیکن آپ نے اس پر بھی عمل نہ کیا پھر تیسرے دن بھی اسی طرح خواب دیکھا کہ یا اسے قتل کر دو یا اس کو سخت سزا دو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعیٰ علیہ کو بلایا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے قتل کرنے کا حکم بھیجا ہے۔ مدعیٰ علیہ نے کہا (کیا) تم مجھے بغیر گواہی کے قتل کر دو گے؟ آپ نے فرمایا ہاں قسم بخدا میں تیرے اوپر اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ کروں گا۔ جب مدعیٰ علیہ نے دیکھا کہ آپ اسے قتل کرنے والے ہیں تو اس شخص نے کہا جناب آپ جلدی نہ فرمائیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ قسم بخدا مجھے اس گناہ کی وجہ سے نہیں پکڑا گیا بلکہ میں نے اس کے باپ کو دھوکے سے قتل کیا تھا اس کی وجہ سے مجھے پکڑا گیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے قتل کرنے کا حکم فرما دیا۔ اس واقعہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کی ہیبت بنی اسرائیل کے دلوں پر چھا گئی اور داؤد علیہ السلام کا اقتدار مضبوط ہو گیا(2) عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اسی طرح کا واقعہ روایت کیا ہے۔ حکمت سے مراد نبوت کمال علم اور پختہ عمل ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا فصل الخطاب سے مراد یہ قاعدہ ہے کہ ''گواہی مدعی پر ہوگی اور قسم منکر پر ہوگی'' (اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ) کیونکہ اس طرح فیصلہ کرنے سے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ بغوی نے یہ لکھا ہے کہ ابی بن کعب سے بھی یہ مروی ہے کہ فصل خطاب سے مراد گواہ اور قسمیں ہیں۔ مجاہد، عطاء بن رباح کا بھی یہی قول ہے فرماتے ہیں ابن مسعود، حسن، کلبی اور مقاتل فرماتے ہیں فصل الخطاب سے مراد فیصلہ کرنے کی بصیرت ہے(3) فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد بیان الکلام ہے، یعنی ... پر ظاہر ہو جائے اور اس میں فصل، وصل، عطف، استئناف، اضمار، اظہار، حذف اور تکرار

محسوس کرے جیسا کہ ام معبد کی حدیث کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بالکل واضح ہوتا تھا۔ نہ اتنا تھوڑا اور مختصر ہوتا تھا کہ سمجھنے میں مخل ہو اور نہ اتنا زیادہ ہوتا کہ سننے والا اکتا جاتا۔ اس حدیث کو ہم نے سورۂ توبہ میں فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ الخ کی تفسیر میں ہجرت کے واقعہ میں ذکر کیا ہے۔ شعبی سے مروی ہے کہ فصل الخطاب سے مراد حمد وثناء کے بعد اَمّا بعد کا قول ہے(1) امام بیضاوی فرماتے ہیں اما بعد کو فصل الخطاب اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے حمد وثناء مقصود سے جدا ہو جاتی ہے(2)۔

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾

"اور کیا آئی ہے آپ کے پاس اطلاع فریقانِ مقدمہ کی جب انہوں نے دیوار پھاندی عبادت گاہ کی [1]"

[1] یہ استفہام تعجب کے لئے اور مخاطب کو واقعہ کے سننے کے لئے چوکنا کرنے کے لئے ہے۔ یہ جملہ اذکر پر معطوف ہے۔ الخصم اصل میں مصدر ہے اسی وجہ سے اس کا اطلاق تثنیہ اور جمع پر بھی ہوتا ہے۔ یہاں خصم سے مراد دو جھگڑنے والے ہیں اور تسوروا میں جمع کا صیغہ مجازاً ذکر کیا گیا ہے جیسے مجازاً اس ارشاد صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا میں تثنیہ کے لئے (قلوب) جمع ذکر کیا گیا ہے۔ تیسوّر السور سے مشتق ہے جیسے تَسَنَّمَ سنام سے مشتق کیا گیا ہے۔ تسور کا معنی دیوار پر چڑھنا ہے۔ المحراب سے مراد قلعہ ہے، اس کو محراب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی دیواروں پر چڑھ کر جنگ کی جاتی ہے یا محراب سے مراد مسجد ہے کیونکہ مسجد میں انسان شیطان سے جنگ کرتا ہے اس لئے اسے محراب کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دیوار پھلانگ کر آنے والے زیادہ ہوں جیسا کہ جمع کا صیغہ اور ضمیریں دلالت کر رہی ہیں۔ اذیاتو تحاکم محذوف کے متعلق ہے یا نبأ کے متعلق ہے اس بناء پر کہ اس واقعہ سے مراد داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا واقعہ ہو۔ اتیٰ کی طرف نباء کی نسبت مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہے، یعنی هل اتاك قصة نبا الخصم یا ظرف الخصم کے متعلق ہے کیونکہ اس میں فعل کا معنی پایا جاتا ہے۔ ظرف اتیٰ کے متعلق نہیں ہے کیونکہ یہاں فعل اور ظرف کا زمانہ ایک نہیں ہے۔ کیونکہ اس خبر کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا اس وقت نہیں تھا یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان تھا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ اس امتحان کا سبب کیا تھا، بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک خواہش کی کہ مجھے بھی اپنے آباء واجداد حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا مقام مل جائے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سوال کیا کہ اسے بھی امتحان میں مبتلا کیا جائے جس طرح ان کے بزرگوں کو امتحان میں مبتلا کیا گیا اور انہیں ایسی فضیلت عطا فرمائے جیسی ان بزرگوں کو عطا فرمائی(3)۔ سدی، کلبی اور مقاتل نے اپنے شیوخ سے روایت کیا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے وقت کو تقسیم کر رکھا تھا آپ ایک دن لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے، ایک دن اپنے رب کی عبادت کے لئے خلوت نشینی فرماتے اور ایک دن اپنی ازواج اور دوسرے مشاغل میں صرف فرماتے(4)۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر نے حسن سے روایت کیا ہے کہ آپ نے چار حصوں میں اپنے وقت کو تقسیم کیا ہوا تھا(5) ایک دن وعظ فرماتے تھے۔ فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی کتاب میں حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے فضائل پڑھے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی اے میرے رب ساری خیر اور بھلائی تو میرے آباء واجداد لے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ میں نے انہیں ایسی آزمائشوں میں مبتلا کیا تھا جس میں تمہیں مبتلا نہیں کیا اور انہوں نے ان مصائب پر صبر کا مظاہرہ کیا تھا۔ حضرت ابراہیم کو نمرود جیسے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 593 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 137 (العلمیہ)

ظالم بادشاہ سے واسطہ پڑا، بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔حضرت اسحاق کو ذبح ہونے اور بینائی کے سلب ہونے میں مبتلا کیا۔حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف کی جدائی کے غم میں مبتلا کیا۔حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کی میرے رب مجھے بھی تو ان جیسی تکالیف میں مبتلا کر، میں بھی صبر کروں گا۔اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اے داؤد تجھے فلاں مہینے فلاں دن آزمائش میں ڈالا جائے گا، محتاط رہنا، جب وہ دن آیا جس کا اللہ نے وعدہ فرمایا تھا تو حضرت داؤد علیہ السلام اپنی عبادت گاہ میں تشریف لے گئے، نماز اور تورات کی تلاوت میں مصروف ہو گئے، آپ اسی ذکر وفکر میں مشغول تھے کہ شیطان ایک سونے کے کبوتر کی شکل میں سامنے آگیا، اس کا ہر پر بڑا خوبصورت تھا۔بعض نے لکھا ہے کہ اس کے پر موتیوں اور زبرجد کے تھے۔وہ آپ کے سامنے بیٹھ گیا، وہ آپ کو بڑا حسین لگا، آپ نے پکڑنے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تا کہ بنی اسرائیل کو وہ کبوتر دکھا کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرائیں۔جب آپ نے اسے پکڑنے کا ارادہ فرمایا تو وہ اڑ کر قریب ہی بیٹھ گیا۔آپ نے پھر اسے پکڑنا چاہا تو تھوڑا دور ہو گیا۔آپ نے اس کا پیچھا کیا تو وہ اڑ کر روشندان میں جا بیٹھا پھر آپ اس کو پکڑنے کے لئے پیچھے گئے وہ روشندان سے بھی اڑ گیا۔حضرت داؤد علیہ السلام اسے روشندان سے دیکھنے لگے کہ یہ کہاں جا کر بیٹھتا ہے تا کہ کسی کو پیچھے بھیج کر شکار کرائیں۔اس نظارہ کے دوران اچانک آپ کی نظر ایک عورت پر پڑ گئی جو ایک تالاب کے کنارے غسل کر رہی تھی۔یہ کلبی کا قول ہے اور سدی فرماتے ہیں آپ نے اس عورت کو ایک چھت پر غسل کرتے ہوئے دیکھا۔وہ ایک خوبصورت ترین عورت تھی۔حضرت داؤد کو وہ عورت پسند آئی عورت نے بھی دیکھ لیا اسے کوئی سایہ محسوس ہوا تو اس نے اپنے لمبے لمبے بال کھول کر بدن کو ڈھانپ لیا اتنی لمبی زلفیں دیکھ کر آپ مزید متعجب ہوئے۔حضرت داؤد نے اس عورت کے متعلق پوچھا۔بتایا یہ شائع کی بیٹی تشائع ہے، اور یا بن حنانا کی بیوی ہے اور اس کا خاوند ایوب بن صوریا کے ساتھ بلقاء کے غزوہ میں شریک ہے۔ایوب بن صوریا حضرت داؤد علیہ السلام کا بھانجا تھا۔بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خواہش تھی اور یا اس عورت کا خاوند شہید ہو جائے اور آپ اس عورت سے نکاح کر لیں۔آپ کا گناہ صرف اسی قدر تھا کہ آپ نے یہ خواہش کی تھی۔بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے بھانجے ایوب کو لکھا کہ اور یا کو فلاں جگہ لڑنے کے لئے بھیجو اور انہیں تابوت سے آگے رکھو۔اس وقت جس شخص کو تابوت سے آگے رکھا جاتا اس کے لئے پیچھے لوٹنا جائز نہ ہوتا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے فتح عطا فرمائے یا وہ خود شہید ہو جائے۔اس نے اسے آگے کیا فتح نصیب ہوئی ہے پھر داؤد علیہ السلام نے ایوب کو لکھا کہ اسے فلاں دشمن کے مقابلہ میں بھیجو جو بڑا جنگجو ہے (قدرت نے اسے پھر بھی فتح عطا فرمائی) پھر آپ نے لکھا کہ اسے فلاں جنگجو کے مقابلہ میں بھیجو وہ تیسری مرتبہ شہید ہو گیا۔جب عورت کی عدت گذر گئی تو داؤد علیہ السلام نے اس عورت سے نکاح کر لیا یہی عورت حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ تھی(1)۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ داؤد علیہ السلام کا گناہ یہ تھا کہ آپ نے ایک شخص سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے (تا کہ آپ اس سے نکاح کر لیں) مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ امر اس وقت مباح تھا لیکن اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد کا یہ عمل پسند نہ آیا کیونکہ یہ کام دنیا میں رغبت اور ازواج کی کثرت کی طرف شوق رکھنے کی دلیل تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے علاوہ پہلے بھی اتنی عورتیں عطا فرمادی تھیں کہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی(2) علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت حسن سے مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام

ایسا شخص ہے جس کا دن اس طرح گذرے کہ اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دل میں سوچا کہ میں اس کام کی طاقت رکھتا ہوں بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ محفل میں عورتوں کے فتنہ کا ذکر ہوا (کہ کیا کوئی اس سے محفوظ رہ سکتا ہے) آپ نے دل میں سوچا کہ اگر مجھے عورتوں کے فتنہ میں مبتلا کیا جائے گا تو میں محفوظ رہوں گا۔ جب آپ کی عبادت کا دن ہوتا تو آپ اپنی عبادت گاہ میں داخل ہو جاتے اور دروازہ بند کر لیتے اور حکم فرماتے کہ کوئی اندر داخل نہ ہو۔ آپ ایک دن اسی کیفیت میں کمرہ کے اندر تورات پر جھک کر اس کی تلاوت کر رہے تھے کہ سونے کا ایک کبوتر آپ کے پاس آ بیٹھا جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا ہے۔ علامہ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس عورت کے خاوند کو اپنے لشکر کی طرف بھیجا اور اسے لکھا کہ فلاں جگہ تم چلنا وہ جب وہاں چلا تو شہید ہو گیا۔ آپ کو اس کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ جب داؤد علیہ السلام نے اس عورت سے نکاح کر لیا تو تھوڑے عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کے دن انسانی شکل میں دو فرشتے بھیجے۔ جب انہوں نے آپ کی عبادت گاہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو چوکیداروں نے ان کو روک لیا وہ انسانی شکل میں فرشتے دیوار پھاند کر آپ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ کو محسوس نہ ہوا کیونکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے لیکن آپ کو اس وقت معلوم ہوا جب وہ آپ کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ فرشتے جبرئیل اور میکائیل تھے (1)۔

إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُودَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ ﴿٢٢﴾

''اور جب اچانک داخل ہوئے داؤد پر پس آپ کچھ گھبرا گئے ان سے۔ انہوں نے کہا ڈریئے نہیں ہم تو مقدمہ کے دو فریق ہیں۔ زیادتی کی ہے ہم میں سے ایک نے دوسرے پر آپ ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ فرمائیے اور بے انصافی نہ کیجئے اور دکھایئے ہمیں سیدھا راستہ 1۔''

1۔ إِذْ دَخَلُوا، اذ تسوروا سے بدل ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی گھبراہٹ کی وجہ یہ تھی کہ وہ دو آدمی اس دن آپ کے پاس پہنچے؟ جب کہ کسی کو چوکیدار اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ دوسرا یہ لوگ اوپر سے آئے اس وجہ سے آپ کو اندیشہ لاحق ہوا۔ آنے والوں نے کہا ہمارا آپس میں جھگڑا ہے، یہ کلام علی سبیل الفرض ہے اور اس سے مقصود تعریض اور اشارہ کرنا ہے گویا انہوں نے کہا ہمارا آپس میں جھگڑا ہے، ہم میں سے بعض نے بعض پر بغاوت کی ہے اور ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمائیں شط الرحل شططاً واشط اشطاطاً اس کا معنی ہے حکم اور فیصلہ میں ظلم کرنا اور یہاں معنی ہوگا حد سے تجاوز کرنا یہ شط الدار واشطت سے مشتق ہے۔ جس کا معنی دور ہونا ہے سواء مصدر بمعنی فاعل ہے اور یہ حقیقت میں الصراط کی صفت ہے لیکن صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا گیا ہے جیسا کہ اخلاق ثیاب میں صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا گیا ہے، یعنی ہمیں آپ عدل کا راستہ دکھائیں۔

إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ﴿٢٣﴾

''(صورت نزاع یہ ہے کہ) یہ میرا بھائی ہے اور اس کی ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے اب یہ

لہ اَخِیْ سے مراد دینی اور ہم مسلک بھائی ہے۔ نعجۃ سے مراد عورت ہے کنایۃً عورت کو نعجہ کہا جاتا ہے۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں کلام تنبیہ اور تفہیم کے لئے ہے کیونکہ وہاں کوئی دنبیاں نہ تھیں۔ یہ جملہ ظرفیہ ان کی دوسری خبر ہے''ولی'' کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ وَلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ کا جملہ ظرفیہ حال کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ اور اس میں عامل سابق ظرف ہے قال کا عطف له تسع و تسعون نعجة پر ہے۔ ابن عباس نے اکفلنیھا کا معنی اعطنیھا (یعنی یہ مجھے دے دو) کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تو اس عورت کو طلاق دے دے تا کہ میں اس سے نکاح کرلوں (1) حقیقت یہ ہے کہ اس کو تو میرے ساتھ ملا دے اور اس کو اس طرح کر دے تا کہ میں اس کی کفالت کروں جس طرح میں دوسری عورتوں کی کفالت کرتا ہوں۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے اجعلھا کفلی و نصیبی (اسے میرا کفل اور نصیب بنا دے)

عزّنی کا عطف قال پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ مجھ پر جھگڑے میں غالب آ جاتا ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کلام کرتا ہے تو مجھ سے یہ زیادہ فصیح ہے اور اگر جنگ کرتا ہے تو مجھ سے زیادہ پکڑ کرنے والا ہے کیونکہ میرے ہاتھوں میں کمزوری ہے اگر چہ حق پر میں ہوتا ہوں (2) بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ عورت کو پیغام نکاح دینے میں وہ مجھ پر غالب آ جاتا ہے۔ میں بھی ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجتا ہوں اور میرے پیغام کے اوپر اپنا پیغام بھیجتا ہے پس وہ مجھ پر غالب آ جاتا ہے حتی کہ وہ اس سے نکاح کر لیتا ہے۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِیْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ﴿۲۴﴾

''آپ نے فرمایا بیشک اس نے ظلم کیا ہے تم پر یہ مطالبہ کر کے کہ تیری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملا دے اور اکثر حصہ دار زیادتی کرتے ہیں ایک دوسرے پر سوائے ان حصہ داروں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں اور فوراً خیال آ گیا داؤد کو کہ ہم نے اسے آزمایا ہے سو وہ معافی مانگنے لگ گئے اپنے رب سے اور گر پڑے رکوع میں لہ''

لہ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا اگر معاملہ واقعی اس طرح ہے جیسا تم بیان کر رہے ہو تو اس نے تم پر یقیناً ظلم کیا ہے ظَلَمَكَ کا جملہ محذوف قسم کا جواب ہے اور اس اسلوب سے مقصود اس کے ملانے کے فعل پر انکار اس کے لالچ کی مذمت کرنا مقصود ہے سوال مصدر ہے جو اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے اور دوسرے مفعول کی طرف اس کا الی کے صلہ کے ساتھ متعدی ہونا اضافت کے معنی کی تضمین کے لئے ہے۔ خلطاء سے مراد شرکاء ہیں اور یہ خلیط کی جمع ہے وَاِنَّ كَثِیْرًا کا عطف لَقَدْ ظَلَمَكَ پر ہے۔ قَلِیْلٌ مَّا میں ما ابہام اور ان کی قلت سے تعجب کے لئے ہے۔ جب داؤد علیہ السلام نے فیصلہ سنایا تو ان آنے والوں میں سے ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا اور وہ دونوں پھر آسمان کی طرف چڑھ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو فوراً یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس فیصلہ کے ذریعے امتحان میں مبتلا کیا ہے کہ اس فیصلہ سے چوکنا ہوتا ہوں یا نہیں۔ سدی نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ جب ان آنے

والوں میں سے ایک نے اپنا دعویٰ پیش کیا تو داؤد علیہ السلام نے دوسرے سے پوچھا (کہ کیا معاملہ واقعی اسی طرح ہے) اس نے کہا

میری ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے بھائی کی ایک دنبی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس سے ایک دنبی لے کر اپنی سو دنبیاں پوری کر لوں اور یہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا اگر تو نے ایسا کیا تو میں تجھے ناک اور پیشانی پر ماروں گا۔ اس نے اسے کہا اے داؤد آپ اسی سزا کے حقدار ہیں کیونکہ اوریا کی صرف ایک بیوی تھی اور آپ کی ننانوے بیویاں تھیں۔ تم اسے قتل ہونے کے لئے تابوت سے آگے بھیجتے رہے حتی کہ وہ قتل ہو گیا اور پھر آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دیکھا تو وہ غائب ہو گئے اور آپ کو کوئی شخص نظر نہ آیا آپ سمجھ گئے کہ یہ کیا معاملہ تھا۔ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں وہ فرماتے ہیں داؤد علیہ السلام کا صرف اتنا قصور تھا کہ آپ نے خواہش کی تھی کہ اوریا کی بیوی ان کے لئے حلال ہو جائے اتفاقاً اوریا جنگی لشکر میں شامل تھا وہ وہاں شہید ہو گیا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کی شہادت کی خبر پہنچی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے ایسا افسوس کا اظہار نہ کیا جیسا کہ کسی دوسری لشکریوں کی ہلاکت پر کرتے تھے پھر آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اتنی بات پر آپ کو عتاب فرمایا کیونکہ انبیاء کرام کے قصور اگرچہ انتہائی چھوٹے بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی شان بہت بلند ہوتی ہے۔

بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا قصور صرف اتنا تھا کہ اوریا نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور وہ اس سے نکاح کرنے کا پورا ارادہ کر چکا تھا لیکن جب وہ جنگ پر چلا گیا تو داؤد علیہ السلام نے اسی عورت کی طرف پیغام نکاح بھیج دیا۔ اس عورت نے داؤد علیہ السلام کی عظمت و جلالت کی وجہ سے ان سے نکاح کر لیا۔ اوریا کو اس پر بہت رنج ہوا۔ اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو عتاب فرمایا کیونکہ آپ نے یہ ایک عورت بھی اس کے منگیتر کے لئے نہ چھوڑی حالانکہ آپ کے پاس پہلے ننانوے عورتیں تھیں (1) علامہ بغوی نے حضرت انس بن مالک کی حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے جب اس عورت کی طرف دیکھا تو آپ نے ارادہ کر لیا اور پھر لشکر کے جرنل کو پیغام بھیجا کہ جب دشمن سے مقابلہ ہو تو فلاں شخص کو تابوت کے آگے رکھنا کیونکہ اس دور میں تابوت کے ذریعے فتح طلب کی جاتی تھی جو تابوت کے آگے ہوتا تو وہ واپس نہ آتا حتی کہ شہید ہو جائے یا مخالف کا لشکر شکست سے دوچار ہو جائے۔ اس عورت کا خاوند قتل ہو گیا پھر دو فرشتے نازل ہوئے جنہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ معاملہ کو سمجھ گئے اور سجدہ میں گر گئے اور آپ چالیس روز تک سجدہ میں پڑے رہے حتی کہ آپ کے سر پر آنسوؤں کی وجہ سے گھاس اگ آئی اور زمین پیشانی کو کھا گئی اور سجدہ میں آپ یہ کہتے رہے اے رب کریم! داؤد سے ایسی لغزش ہوئی ہے جو مشرق و مغرب سے زیادہ ہے۔ اے میرے پروردگار اگر تو نے رحم نہ فرمایا تو داؤد (علیہ السلام) کا گناہ معاف نہ ہوگا اور تو اس کے گناہ کو آنے والے لوگوں میں کہانی بنا دے گا چالیس دنوں کے بعد حضرت جبرئیل آئے اور کہا اے داؤد اللہ تعالیٰ نے تیری خواہش کو معاف فرما دیا ہے جس کا تو ارادہ کر چکا تھا۔ داؤد علیہ السلام نے کہا میرا رب اس بات پر قادر ہے کہ میرا ارادہ اور خواہش معاف فرما دے جو میں نے کی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ عادل ہے، اس کا کسی کی طرف جھکاؤ نہیں ہے۔ اس وقت کیا حالت ہوگی جب قیامت کے روز فلاں شخص آئے گا اور عرض کرے گا اے میرے پروردگار میرا خون جو داؤد کے ذمہ ہے (اس کا بدلہ دیا جائے) جبرئیل نے کہا میں نے یہ تو اللہ تعالیٰ سے نہیں پوچھا اگر آپ چاہتے ہیں تو میں ایسا کر دوں گا۔ آپ ۔۔۔

آؤ (کہ اس خون کا کیا بنے گا) جبرئیل اوپر چڑھ گئے اور داؤد علیہ السلام سجدہ میں گر گئے جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا آپ سجدہ میں رہے پھر جبرئیل امین تشریف لائے تو کہا اے داؤد میں نے اس کام کے متعلق اللہ تعالیٰ سے پوچھا ہے جس کے لئے آپ نے مجھے بھیجا تھا اور اس نے مجھے یہ فرمایا ہے کہ داؤد کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو قیامت کے روز جمع فرمائے گا اور پھر اس سے فرمائے گا داؤد پر جو تیرا خون ہے وہ انہیں معاف کردے۔ وہ شخص عرض کرے گا اے میرے پروردگار تجھے اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے شخص تو اس معافی اور بخشش کے بدلے جنت میں جو چاہتا ہے لے لے(1)۔ حضرت ابن عباس، کعب الاحبار اور وہب بن منبہ سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس جب فرشتے آئے اور حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے خلاف خود ہی فیصلہ دے دیا تو وہ دونوں فرشتے اپنی ہیئت میں ہو گئے اور اوپر چڑھ گئے اور یہ کہہ رہے تھے اس شخص نے اپنے خلاف فیصلہ سنا دیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حقیقت حال کا پتہ چل گیا اور پھر آپ چالیس دن سجدہ میں پڑے رہے، نہ کھانا کھایا، نہ پانی پیا۔ صرف قضائے حاجت اور فرضی نماز کے وقت سر اٹھاتے تھے۔ اس چالیس دن کے عرصہ میں آپ روتے ہی رہے حتی کہ آپ کے سر کے اردگرد گھاس اگ آئی اور آپ اپنے رب سے یہ التجا کرتے رہے۔ اور توبہ کا سوال کرتے رہے آپ کی سجدہ میں دعا کے یہ الفاظ تھے پاک ہے ہر عیب اور نقص سے جو بادشاہ عظیم ہے جو جیسے چاہتا ہے اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے پاک ہے نور کا تخلیق کرنے والا پاک ہے جو دلوں کے درمیان حائل ہوتا ہے پاک ہے وہ ذات جو نور کی خالق ہے اے میرے معبود تو نے مجھے اور میرے دشمن ابلیس کو خالی چھوڑ دیا جب اس کا فتنہ مجھ پر اترا تو میں قائم نہ رہ سکا۔ پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود تو نے مجھے پیدا کیا تو تیرے علم میں تھا کہ میں ایسا کرنے والا ہوں پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود ہلاکت ہوگی۔ داؤد کے لئے جب اس سے پردہ اٹھے گا اور کہا جائے گا یہ داؤد خطاکار ہے پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود قیامت کے روز میں کس آنکھ سے تیری زیارت کروں گا ظالم پوشیدہ اور خفیہ نظروں سے دیکھیں گے پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود میں کن قدموں سے تیرے آگے چلوں گا اور کیسے تیرے سامنے کھڑا ہوں گا؟ جب خطاکاروں کے قدم پھسل جائیں گے۔ پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود غلام ہمیشہ اپنے آقا سے ہی مغفرت طلب کرتا ہے۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں وہ شخص ہوں جو سورج کی گرمی بھی برداشت نہیں کر سکتا تو پھر تیری دوزخ کی گرمی کیسے برداشت کروں گا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں وہ شخص ہوں جو بجلی کی کڑک کی آواز برداشت نہیں کر سکتا پھر میں دوزخ کی آواز کیسے سن سکوں گا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود ہلاکت ہو داؤد کے لئے اس عظیم گناہ کی وجہ سے جو اس سے سرزد ہوا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود تو میرے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے۔ میرا عذر قبول فرما۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود اپنی رحمت کے طفیل میرے گناہ معاف فرما دے اور اپنی رحمت سے مجھے میری خواہشات کے باعث دور نہ کردے۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے نور سے ان گناہوں کی جنہوں نے مجھے ہلاک کر دیا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں اپنے گناہوں سے بھاگ کر تیری طرف آیا ہوں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے تو مجھے مایوس ہونے والوں سے نہ کر اور قیامت کے دن مجھے رسوا نہ کرنا۔ پاک ہے نور کا خالق(2)۔

مجاہد فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن سجدہ میں پڑے رہے اور سر نہ اٹھایا حتی کہ آپ کے آنسوؤں کی نمی سے گھاس

کر رونا شروع کر دیا۔ آپ کے اندر کی گرمی سے لکڑی بھڑک اٹھی اور جل گئی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ اور مغفرت نازل فرمائی۔ وہب فرماتے ہیں داؤد علیہ السلام کو ندا کی گئی کہ میں نے تجھے معاف کر دیا ہے۔ حضرت داؤد نے عرض کی اے میرے پروردگار یہ کیسے ہوگا تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم اوریا کی قبر کے پاس جاؤ اور اسے آواز دو میں اسے تیری آواز سنا دوں گا تو اس کا حق تم سے اتر جائے گا۔ آپ چل پڑے۔ جب کہ آپ بوریا کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ آپ اوریا کی قبر کے قریب جا کر بیٹھ گئے اور پھر اسے پکارا۔ اوریا نے کہا کون ہے جس نے میرے مزا میں خلل ڈالا اور مجھے بیدار کر دیا۔ آپ نے فرمایا میں داؤد ہوں۔ اوریا نے کہا اے اللہ کے نبی کیسے تشریف لائے ہو؟ آپ نے فرمایا میں تجھ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ جو کچھ میری وجہ سے تیرے ساتھ ہوا ہے وہ مجھے معاف کر دے۔ اوریا نے پوچھا تیری وجہ سے میرے ساتھ کیا ہوا؟ حضرت داؤد نے فرمایا میں نے تجھے قتل ہونے کے لئے پیش کیا تھا۔ اوریا نے کہا آپ نے تو مجھے جنت کے لئے پیش کیا تھا۔ آپ پر میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی اے داؤد! کیا تجھے معلوم نہیں میں عادل حاکم ہوں، میں ظلم کے ساتھ فیصلہ نہیں کرتا۔ تو نے اوریا کو یہ کیوں نہیں بتایا کہ تو نے اس کی بیوی کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ حضرت داؤد پھر واپس لوٹ آئے اور قبر کے پاس آ کر اوریا کو ندا دی۔ اوریا نے کہا کون ہے؟ جس نے میری لذت کو قطع کر دیا۔ آپ نے فرمایا میں داؤد ہوں۔ اس نے پوچھا اے اللہ کے نبی میں نے تجھے معاف نہیں کر دیا تھا؟ آپ نے فرمایا ہاں تو نے مجھے معاف کر دیا تھا لیکن میں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے تیرے ساتھ تیری بیوی سے نکاح کرنے کے لئے کیا تھا۔ بعد میں میں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ اوریا خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا' آپ نے بار بار اسے پکارا لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ آپ اس کی قبر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مٹی کے چلو بھر کر اپنے سر پر ڈالنے لگے اور پھر یہ کہنے لگے داؤد کے لئے ہلاکت ہے، داؤد کے لئے ہلاکت ہے' داؤد کے لئے بڑی ہلاکت ہے۔ پاک ہے نور کا خالق اور ہلاکت ہوگی داؤد کے لئے جب عدل کا میزان رکھا جائے پاک ہے نور کا خالق ہلاکت ہے داؤد کے لئے پھر بڑی ہلاکت داؤد کے لئے جب اس کی ٹھوڑی سے پکڑ کر مظلوم کے حوالے کیا جائے گا' پاک ہے نور کا خالق ہلاکت ہے داؤد کے لئے پھر بڑی ہلاکت ہوگی داؤد کے لئے جب اسے منہ کے بل مجرموں کے ساتھ دوزخ کی طرف گھسیٹ کر لے جایا جائے گا پاک ہے نور کا خالق پھر آسمان سے ندا آئی اے داؤد میں نے تیرا گناہ معاف کر دیا اور تیرے رونے پر میں نے رحم کیا اور تیری دعا کو قبول کیا اور تیری لغزش کو دور کر دیا۔ حضرت داؤد نے عرض کی کیسے اے میرے پروردگار! جب کہ صاحب حق نے تو مجھے معاف نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے داؤد میں اسے قیامت کے روز ایسا ثواب عطا کروں گا جو آنکھوں نے نہ دیکھا ہوگا اور کانوں نے نہ سنا ہوگا پھر میں اسے کہوں گا میں اپنے بندے داؤد سے راضی ہو گیا وہ بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار مجھے یہ ثواب کیسے ملا؟ میرا عمل تو اس کا اہل نہیں تھا۔ میں کہوں گا یہ میرے بندے داؤد کا عوض ہے پھر میں اس سے کہوں گا کہ تجھے معاف کر دے پس وہ شخص میری وجہ سے تجھے معاف کر دے گا۔ حضرت داؤد نے عرض کی اے میرے پروردگار اب میں جان گیا تو نے مجھے معاف فرما دیا ہے(1) اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ کا یہی مطلب ہے اور راکعاً بمعنی ساجداً ہے جس طرح سجود کو رکوع کہا جاتا ہے کیونکہ رکوع سجود کا مبدء ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ رکوع کے بعد آپ نے سجدہ کیا گویا آپ نے استغفار کی دو رکعتوں کے لئے تکبیر تحریمہ کہی اور اسی نماز میں سجدہ کیا۔

کے سجدہ تلاوت کے قائم مقام ہو جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایاخر راکعاً تو رکوع کا اطلاق سجود پر فرمایا ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقصود تعظیم ہے خاص سجدہ نہیں ہے۔اور تعظیم کا معنی رکوع وسجود دونوں میں ایک ہے اور تعظیم الٰہی کی ضرورت یا توان لوگوں کی اقتداء میں ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی یا ان کی مخالفت میں ہے جنہوں نے تعظیم الٰہی سے انکار کیا اور یہی معنی ظاہر ہے۔اسی وجہ سے اس کو قیاس کہا جاتا ہے۔آئمہ ثلاثہ یعنی امام مالک امام احمد اور امام شافعی فرماتے ہیں سجدہ کی جگہ رکوع جائز نہیں ہے اور یہ استحسان (قیاس خفی) ہے اور وجہ استحسان یہ ہے کہ واجب مخصوص جہت پر تعظیم ہے اور وہ سجود ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص فوراً آیت سجدہ پر رکوع نہ کرے حتیٰ کہ زیادہ قرأت پڑھ جائے اور پھر سجدہ کی نیت سے رکوع کرے تو بالا جماع جائز نہیں ہے اور اس آیت میں رکوع کے ساتھ سجدہ کی تعبیر بھی غیر مسلم ہے اگر تسلیم کیا بھی جائے تو یہ محض مجاز ہوگا اور یہ ایک کو دوسرے کے قائم مقام رکھنے کا تقاضا نہیں کرتا۔

امام ابوحنیفہؒ یہاں قیاس کو استحسان پر ترجیح دیتے ہیں اور قیاس استحسان سے قوی ہے اور قیاس کی تائید عبداللہ بن مسعود اور ابن عمر کی روایت سے بھی ہوتی ہے یہ دونوں حضرات نماز میں رکوع کو سجدہ کے قائم مقام سمجھتے تھے اور کسی دوسرے صحابی کا ان سے اختلاف بھی مروی نہیں ہے نیز قیاس خفی کو اس کے خفا اور قیاس جلی کو اس کے ظہور کی وجہ سے ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ ترجیح کسی متصل معنی کی وجہ سے دی جاتی ہے اور قیاس جلی کو قیاس خفی کی معارضیت کی صورت میں بہت کم ترجیح دی جاتی ہے۔اسی وجہ سے علماء نے دس سے کچھ زائد مواقع پر قیاس جلی کی قیاس خفی پر ترجیح کا ذکر کیا ہے۔اصول فقہ سے یہ مواقع پہنچانے جاسکتے ہیں لیکن قیاس خفی کو قیاس جلی پر اتنی زیادہ ترجیح دی گئی ہے کہ مواقع کا شمار ممکن نہیں۔

مسئلہ: اگر آیت سجدہ کی تلاوت کے فوراً بعد رکوع کر لیا اور سجدہ تلاوت کی نیت نہ کی پھر نماز کا سجدہ کیا تو نماز کے فرضی سجدہ کی ادائیگی سے سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا خواہ نمازی نے سجدہ تلاوت کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔اسی طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے اگر آیت سجدہ کے بعد ایک آیت یا دو آیات تلاوت کرے اور پھر رکوع کر لے تو نماز کے سجدہ میں سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا۔لیکن جمہور علماء اس کے خلاف ہیں اور آیت سجدہ کے بعد تین آیات پڑھنے کے بعد نماز کے سجدہ میں سجدہ تلاوت کی ادائیگی کے متعلق علماء کا اختلاف ہے اور تین سے زائد آیات پڑھنے کے بعد سجدہ تلاوت کے قائم مقام نہ رکوع ہوگا اور نہ سجدہ ہوگا خواہ سجدہ تلاوت کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔مسئلہ۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نمازی جب تک نماز میں ہے اس پر سجدہ تلاوت کی قضا واجب ہے۔جمہور احناف کا بھی یہی مسلک ہے۔محمد بن سلمہ کا خیال ہے کہ نماز کے سجدہ کا سجدہ تلاوت کے قائم مقام ہونا قیاس ہے۔اور استحساناً یہ جائز نہیں ہے کیونکہ نماز کے سجدہ کا سجدہ خود فرض ہے کسی دوسرے کے قائم مقام نہیں ہوتا جیسے رمضان شریف کا روزہ کسی دوسرے دن کے قضاء روزہ اور اس دن کے ادا روزہ دونوں کے قائم مقام نہیں ہوتا پس یہاں قیاس استحسان پر مقدم ہے۔رہا رکوع کا سجدہ تلاوت کے قائم مقام ہونا تو قیاس اس کے خلاف ہے لیکن یہ استحساناً جائز ہے اور استحسان قیاس خفی ہے پس اس صورت میں استحسان کو قیاس پر ترجیح دی گئی ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ کے نزدیک سورہ ص کی اس آیت کو تلاوت کرنے والے پر سجدہ واجب ہے اور امام مالک کے نزدیک اس آیت کی

ہے اور نماز میں اس کوادا کرنا جائز نہیں ہے۔ ابن جوزی نے ابن عباس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ یہ واجب سجدوں میں سے نہیں ہے ابن عباس فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ ص کا سجدہ کرتے دیکھا لیکن یہ واجب سجدوں میں سے نہیں ہے(1)۔ اس حدیث کو ابن الجوزی نے ترمذی کے طریق سے بیان کیا ہے اور امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباس سے اس طرح روایت کیا ہے فرماتے ہیں سورۂ ص واجب سجدوں میں سے نہیں ہے اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا(2) ایک روایت میں ہے کہ مجاہد فرماتے ہیں میں نے ابن عباس سے پوچھا کیا میں سورۂ ص میں سجدہ کروں تو ابن عباس نے ومن ذریته داؤد وسلیمان سے لے کر فبھداھم اقتدہ تک تلاوت فرمائی۔ اور پھر ارشاد فرمایا تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کی اقتدا کریں(3)۔ تو حضرت ابن عباس کا یہ جواب وجوب کا تقاضہ کرتا ہے اور یہ حدیث ہمارے حق میں حجت ہے اور ہمارے مسلک کے مخالف نہیں ہے اور ابن عباس کا یہ قول کہ لَیْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُوْدِ (واجب سجدوں میں سے نہیں) موقوف ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے) پہلے قول کے معارض ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مرفوع ہے۔ ابن الجوزی نے ابو سعید الخدری کی حدیث سے بھی دلیل پکڑی ہے، فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ہمیں خطاب فرمایا اور سورۂ ص تلاوت فرمائی جب آیت سجدہ سے گذرے تو آپ نیچے اترے اور سجدہ فرمایا اور ہم نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا۔ پھر دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص کی آیت سجدہ پڑھی تو ہم سجدہ کرنے کے لئے بکھر گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طرح سجدہ کی تیاری کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا یہ ایک نبی کی توبہ کا سجدہ ہے لیکن میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تم سجدہ کرنے کے لئے تیار ہو پھر آپ منبر سے نیچے تشریف لائے، آپ نے سجدہ کیا اور ہم نے بھی سجدہ کیا(4) اس حدیث کو ابن الجوزی نے دارقطنی کے طریق سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث بھی ہمارے خلاف حجت نہیں بن سکتی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ مطلقاً سجدہ تلاوت کے عدم وجوب پر دلالت ہے جیسا کہ جمہور کا قول ہے۔ میرے نزدیک فتویٰ کے لئے یہی قول مختار ہے۔ احناف میں سے امام طحاوی کا بھی یہی قول ہے لیکن امام صاحب کا قول سجدہ کے وجوب کا ہے اور ہماری دلیل حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ کیا(5)۔ اس حدیث کو ابن الجوزی نے دارقطنی کے طریق سے روایت کیا ہے ابو سعید کی حدیث میں ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ کیا۔ اس حدیث کو طحاوی، ابو داؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے سورۂ ص میں سجدہ کیا(6)۔

سائب بن یزید سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے حضرت عمر کے پیچھے صبح کی نماز پڑھی تو آپ نے سورۂ ص تلاوت فرمائی اور اس میں سجدہ تلاوت کیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک شخص نے کہا اے امیر المومنین کیا یہ سجدہ، واجب سجدوں میں سے ہے؟ حضرت عمر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سجدہ کرتے تھے(7) ابو مریم سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت عمر شام پہنچے تو داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ میں آئے اور نماز ادا فرمائی اور اس میں سورۂ ص تلاوت کی۔ جب آیت سجدہ پر پہنچے تو سجدہ کیا(8)۔ ابن عباس کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ تلاوت ادا فرمایا اور فرمایا حضرت داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور

1۔ جامع ترمذی، حدیث: 577 (دار الحدیث) 2۔ صحیح بخاری، حدیث: 3240 [illegible]

پر سجدہ ادا کیا اور ہم اس آیت کا سجدہ بطور شکر ادا کرتے ہیں (1) اس حدیث کو نسائی نے حجاج بن محمد عن عمر بن ذر سے موصولاً روایت کیا ہے۔ اس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور امام شافعی نے الام میں ابن عیینہ عن ایوب عن عکرمہ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے نقل کی ہے، عبداللہ بن بزیع عن عمر بن ذر عن ابیہ عن سعید بن جبیر عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے بھی روایت کی ہے اور ابن بزیع کی وجہ سے اس کو معلول کہا۔ فرماتے ہیں ابن عدی فرماتے ہیں کہ ابن بزیع قابل حجت نہیں ہیں۔ ابن اسکن نے اس کی تصحیح کی ہے۔ اسی طرح ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن ہمام نے فرمایا اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے داؤد علیہ السلام کے حق میں جو سجدہ کی کیفیت تھی اسے بھی بیان فرمادیا اور جو حیثیت ہمارے حق میں ہے اسے بھی بیان فرمادیا اور شکر کا سبب ہونا وجوب کے منافی نہیں ہے کیونکہ فرائض اور واجبات کا وجوب بھی تو اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کے شکر کی بناء پر ہے۔

مسند امام ابوحنیفہ میں ابوحنیفہ عن سماک بن حرب عن عیاض الاشعری عن ابی موسیٰ کی سند سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ کیا۔

امام احمد نے بکر بن عبداللہ مزنی کے واسطہ سے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے خواب دیکھا کہ سورۂ ص لکھ رہا ہوں۔ جب میں آیت سجدہ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دوات، قلم اور جو کچھ میرے سامنے پڑا ہے وہ سب سجدہ کرتے ہوئے الٹ گیا ہے۔ حضرت ابوسعید فرماتے ہیں میں نے اپنا یہ خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ نے سجدہ نہ فرمایا (2)۔

ابن ہمام فرماتے ہیں سورۂ ص میں سجدہ کا حکم بھی دوسرے سجدوں کی طرح مواظبت اور دوام اختیار کر گیا اور ابھی تک اس پر عمل ہو رہا ہے اگرچہ اس پر پہلے عزیمت نہ تھی لیکن ابوسعید کی پہلی روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس واقعہ سے پہلے کی ہوگی۔

فصل: ابن عباس فرماتے ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ آج رات میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ایک درخت کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوں، میں نے سجدہ کیا تو اس درخت نے میرے سجدہ کے ساتھ سجدہ کیا۔ میں نے اس درخت کو یہ کہتے ہوئے سنا اَللّٰھُمَّ اكْتُبْ لِیْ بِھَا عِنْدَکَ اَجْرًا وَّضَعْ عَنِّیْ بِھَا وِزْرًا وَّاجْعَلْھَا لِیْ عِنْدَکَ ذُخْرًا وَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَھَا مِنْ عَبْدِکَ دَاوٗدَ (اے اللہ میرے لئے اس سجدہ کے عوض اجر لکھ دے اور اس کے عوض میرے گناہ ساقط کر دے اور اس کو میرے لئے اپنی بارگاہ میں ذخیرہ فرمالے اور مجھ سے اس کو اس طرح قبول فرما جس طرح تو نے داؤد علیہ السلام کی طرف سے قبول فرمایا تھا) ابن عباس فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت سجدہ پڑھی اور پھر سجدہ فرمایا اور پھر اس شخص نے درخت کے جو الفاظ بتائے تھے ان کے ساتھ دعا پڑھی (3) اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو غریب کہا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کی ہے۔ اسی طرح ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے لیکن اس میں تَقَبَّلْھَا مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عَبْدِکَ دَاوٗدَ کے الفاظ نہیں ہیں۔

فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

"[illegible] بخش [illegible] کی تقصیر اور بیشک ان کے لئے ہمارے ہاں بڑا قرب ہے اور خوبصورت انجام ہے۔"[1]

احاطۂ تحریر سے وراء ہے اور جو کمال اور قدر و منزلت کمال ندامت اور انتہائی توبہ و استغفار کی وجہ سے نصیب ہوا اگر ان سے یہ تقصیر نہ ہوئی تو انہیں حاصل نہ ہوتا۔ بعض علماء نے زلفی کا معنی دنیا میں خیر اور قدر کی زیادتی کیا ہے۔ حسن مآب کا معنی حسن مرجع اور آخرت میں بہتر انجام ہے۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام کے متعلق یہ جو روایت کیا گیا ہے آپ نے اوریا کو بار بار جنگ میں بھیجا تا کہ وہ قتل ہو جائے اور پھر اس کی بیوی سے نکاح کر لیں۔ یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے۔ شان نبوت اس قسم کے الزامات سے بہت بلند ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ تو صرف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ نے خواہش کی ایک ایسی چیز کی جو آپ کے پاس نہیں تھی، جب کہ آپ کے پاس اس جیسی ننانوے چیزیں موجود تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے اس فیصلہ کے ذریعے آپ کو اس خواہش پر تنبیہ فرما دی کہ یہ آپ کی شایان شان نہیں ہے تو اب آپ نے فوراً توبہ و استغفار کیا اور اس خواہش سے رجوع کر لیا۔ صاحب مدارک فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کے لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو تا کہ میں اس سے نکاح کر لوں اور یہ اس دور میں ایک عام رواج اور معمول تھا اور ہمدردی کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا جس طرح کہ انصار نے مہاجرین سے اس قسم کا حسن سلوک پیش کیا تھا۔ اتفاقاً حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اوریا کی بیوی پر پڑی تو وہ انہیں اچھی لگی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا سے رواج کے مطابق اسے طلاق دینے کی فرمائش کی تو وہ حیا کی وجہ سے آپ کی بات کو رد نہ کر سکا۔ اس نے اسے طلاق دے دی اور پھر داؤد علیہ السلام نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔

میں کہتا ہوں داؤد علیہ السلام نے وہ عمل نہ کیا جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ جب حضرت زینب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند آئیں تو آپ نے ان کے خاوند حضرت زید سے فرمایا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو) تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینب کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو عتاب فرمایا پھر داؤد علیہ السلام نے استغفار کیا اور رجوع فرمایا۔ قرآن کے الفاظ بھی اس روایت کے مؤید ہیں کیونکہ مدعی نے یہی کہا تھا کہ یہ کہتا ہے اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ۝ مدعی نے تو یہ نہیں کہا کہ یہ میرے قتل کا ارادہ کرتا ہے اور داؤد علیہ السلام نے فیصلہ کرتے ہوئے بھی صرف اتنا کہا تھا کہ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ (بیشک اس نے ظلم کیا ہے تم پر یہ مطالبہ کر کے کہ تیری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملا دے)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں وہب بن منبہ نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی تو آپ تیس سال اپنی خطا پر روتے رہے اور دن رات آپ کے آنسو بہتے رہتے تھے اور جب آپ سے خطا سرزد ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک ستر سال تھی۔ اس خطا کے بعد آپ نے اپنے وقت کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک دن بنی اسرائیل کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ایک دن اہل و عیال میں گذارتے اور ایک دن جنگلوں اور پہاڑوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرتے اور ایک دن اپنے گھر میں خلوت میں چلے جاتے۔ آپ کے گھر میں چار ہزار عبادت کی جگہیں تھیں۔ اس میں راہب لوگ جمع ہوتے تھے۔ آپ ان کے ساتھ اپنے اوپر روتے اور لوگ بھی آپ کے ساتھ روتے پھر جب باہر جانے کا دن ہوتا تو آپ جنگلوں میں نکل جاتے اور بلند آواز سے ایک خاص لے میں روتے۔

سمندر پر آتے یہاں بھی بلند آواز سے ایک مخصوص انداز میں روتے۔ آپ روتے تو سمندر کی مچھلیاں سمندری جانور، پرندے اور درندے سب آپ کے ساتھ روتے پھر جب شام ہوجاتی تو واپس تشریف لاتے اور جب اپنے نفس کی خطا پر رونے کا دن ہوتا تو ایک ندا کرنے والا ندا دیتا کہ آج داؤد علیہ السلام کے رونے کا دن ہے پس ان کے معاونین حاضر ہوجائیں۔ آپ اپنے اس عبادت خانہ میں داخل ہوجاتے جس میں بہت سی عبادت کی جگہیں بنی ہوئی تھیں پھر آپ بوریا کے تین فرش بچھاتے جن کے اندر کھجور کے پتے بھرے ہوتے تھے۔ آپ ان کے اوپر بیٹھتے وہاں آپ کے پاس چار ہزار راہب آتے جن کے سروں پر ٹوپیاں ہوتی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہوتی تھیں وہ ان عبادت کی مخصوص جگہوں میں بیٹھ جاتے تھے پھر داؤد علیہ السلام بلند آواز سے روتے اور اپنے نفس پر نوحہ کرتے۔ درویش اور صوفیاء جو آپ کی مجلس میں ہوتے وہ بھی آپ کے ساتھ بلند آواز سے روتے تھے اور وہ متواتر روتے رہتے تھے حتیٰ کہ فرش ان کے آنسوؤں میں ڈوب جاتا تھا اور داؤد علیہ السلام مرغ کے بچے کی طرح اس میں گر پڑتے اور بسمل کی طرح پھڑکتے رہتے پھر آپ کے بیٹے حضرت سلیمان آتے اور آپ کو اٹھا لیتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام ان آنسوؤں کے پانی سے چلو بھر کر اپنے منہ پر ملتے تھے اور دعا کرتے اے میرے پالنہار مجھے معاف کردے۔ اگر داؤد علیہ السلام کے رونے کا تمام دنیا کے لوگوں کے رونے کا موازنہ کیا جائے تو برابر ہوگا۔ وہب فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا سر کبھی اوپر نہ اٹھایا حتیٰ کہ فرشتے نے یہ مژدہ سنایا۔ آپ کے معاملہ کی ابتداء لغزش ہے اور اس کا آخر مغفرت ہے، سر اٹھایئے اس وقت آپ نے سر اوپر اٹھایا پھر بھی بعد کی پوری زندگی کبھی پانی نہ پیا مگر اس میں آپ کے آنسو ملے ہوتے تھے کبھی کوئی کھانا تناول نہیں فرمایا مگر اس میں آپ کے آنسوؤں کی آمیزش ہوتی (1)۔

اوزاعی نے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی آنکھیں مشکیزوں کی طرح تھیں جن سے ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا تھا اور آپ کے چہرے پر آنسوؤں کی وجہ سے اس طرح گڑھے پڑ گئے تھے جس طرح زمین میں پانی کے چلنے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں (2) وہب کہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تو عرض کی یا رب تو نے مجھے بخش دیا لیکن میں کیسے اپنی خطا نہیں بھولوں گا پس میں اپنے لئے اور تمام خطا کاروں کے لئے قیامت تک معافی مانگتا رہوں گا۔ وہب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کی خطا کو آپ کے دائیں ہاتھ میں کندہ فرمادیا تھا جب بھی آپ کھانے یا پینے کے لئے ہاتھ اٹھاتے تو اسے دیکھ کر رونے لگ جاتے۔ جب لوگوں کو خطاب فرماتے تو اپنے لئے معافی مانگنے سے پہلے دوسرے خطا کاروں کے لئے معافی مانگتے۔ قتادہ نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام میں خطا کے بعد ہمیشہ خطا کاروں کے پاس بیٹھتے تھے۔ آپ ان لوگوں کو بلاتے اور کہتے خطا کار داؤد کے پاس آؤ آپ پانی بھی پیتے تو اپنے آنسو ملا کر پیتے اور جو کی خشک روٹی پر آنسو بہاتے رہتے حتیٰ کہ وہ تر ہوجاتی پھر اس پر نمک اور راکھ چھڑک کر تناول فرماتے تھے اور کہتے یہ خطا کاروں کا کھانا ہے۔ وہب فرماتے ہیں خطا سے پہلے داؤد علیہ السلام نصف رات قیام کرتے اور ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے۔ جب یہ خطا سرزد ہوئی تو ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور ساری رات قیام فرماتے تھے (3)۔ ثابت فرماتے ہیں جب داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عقاب (سزا) کو یاد کرتے تو آپ کے اعضاء اتر جاتے تھے پھر ان کو کسی بندھن کے ساتھ باندھا جاتا تھا اور جب اللہ کی رحمت کو یاد کرتے تو اعضاء اپنی جگہ درست

آپ کی تلاوت نہیں سنتے تھے اور یہ بھی روایت ہے کہ ان وحشیوں اور پرندوں نے کہا اے داؤد! آپ کی خطا نے آپ کی آواز کی مٹھاس کو ختم کر دیا ہے (1)۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾

"اے داؤد ہم نے مقرر کیا ہے آپ کو (اپنا) نائب زمین میں پس آپ فیصلہ کیا کرو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ اور نہ پیروی کیا کرو ہوائے نفس کی وہ بہکا دے گی تمہیں راہ خدا سے بیشک جو لوگ بھٹک جاتے ہیں راہ خدا سے ان کے لئے سخت عذاب ہے اس لئے کہ انہوں نے بھلا دیا تھا یوم حساب کو۔ل"

ل يٰدَاوٗدُ سے پہلے قلنا محذوف ہے اور یہ فغفرنا له پر معطوف ہے، یعنی اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا یا یہ معنی کہ ہم نے آپ کو پہلے انبیاء کرام کا نائب اور خلیفہ (1) بنایا۔ فاحکم پر فاء سببیہ ہے۔ بالحق سے مراد اللہ کے حکم سے ہے۔

وَلَا تَتَّبِعِ کا عطف فاحکم پر ہے۔ فَيُضِلَّكَ نہی کے جواب میں ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ سبیل اللہ سے مراد وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حق کے ثبوت پر قائم فرمائے ہیں۔ اس ارشاد میں دلیل ہے کہ جو خواہشات نفس کا پیروکار ہوتا ہے اس کی رائے صائب نہیں ہوتی اور وہ اپنے اجتہاد میں ٹھوکر کھا جاتا ہے جیسا کہ وہ بہتر فرقے ہیں جو اسلام کے مدعی ہیں اور راہ خدا سے بھٹکنے والوں کے لئے سخت عذاب اس لئے ہے کیونکہ وہ یوم حساب کو بھول گئے ہیں۔ اس دن کی یاد راہ حق کو لازم پکڑنے اور خواہشات نفس کی مخالفت کا تقاضا کرتی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ الخ کا جملہ جملہ مستانفہ ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 601 (الفکر)

(1) حضرت عمر بن خطاب نے حضرت طلحہ، زبیر، کعب اور سلمان رضی اللہ عنہم سے پوچھا خلیفہ اور بادشاہ میں کیا فرق ہے؟ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے کہا ہم نہیں جانتے۔ حضرت سلمان نے کہا خلیفہ وہ ہے جو رعیت سے عدل کرتا ہے، ان میں مال تقسیم کرتا ہے اور اپنی رعایا پر اس طرح مہربان ہوتا ہے جس طرح کوئی شخص اپنے اہل و عیال پر مہربان ہوتا ہے اور اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے کرتا ہے حضرت کعب نے فرمایا میرا تو خیال تھا کہ میرے سوا کوئی دوسرا یہ فرق نہ جانتا ہوگا۔ حضرت سلمان سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے پوچھا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ ہوں۔ حضرت سلمان نے فرمایا اگر تم مسلمان کی زمین ایک درہم یا اس سے کم وبیش لے کر غیر مستحق کو دیتے ہو تو تم بادشاہ ہو خلیفہ نہیں ہو۔ حضرت عمر نے اس جملہ سے عبرت حاصل کی۔ سلمان بن عوجاء سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت عمر نے فرمایا مجھے معلوم نہیں میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ ہوں۔ ایک شخص نے کہا اے امیر المومنین ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا خلیفہ وہ ہوتا ہے جو لیتا ہے تو حق و انصاف سے لیتا ہے اور اسے خرچ بھی صحیح جگہ پر کرتا ہے اور آپ اللہ کے فضل و احسان سے ایسا ہی کرتے ہیں اور بادشاہ وہ ہوتا ہے جو لوگوں پر ظلم و ستم کرتا ہے، اس سے لیتا ہے اس کو دیتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر خاموش ہو گئے۔ حضرت معاویہ جب منبر پر بیٹھتے تو یہ

''اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمان اور زمین کو جو کچھ ان کے درمیان ہے بے فائدہ ۱؎ یہ تو کفار کا گمان ہے ۲؎ پس بربادی ہے کفار کے لیے آگ کے عذاب سے۔ ۳؎''

۱؎ بَاطِلًا سے مراد ایسا کام ہے جس میں کوئی حکمت نہ ہو یا بَاطِلًا ذوی باطل کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے زمین و آسمان کی تخلیق بے مقصد اور بغیر حکمت کے نہیں فرمائی۔ یا یہ معنی کہ ہم نے زمین و آسمان کی تخلیق بے مقصد اور عبث نہیں کی یا یہ مفہوم ہے کہ ہم نے زمین و آسمان کی تخلیق اس باطل کے لئے نہیں کی جو خواہشات کی پیروی کرتا ہے بلکہ ہم نے اس کی تخلیق اس حق کے لئے کی ہے جو صانع کے وجود کا استدلال ہے۔ اس کے اوامر کی پیروی اور منہیات سے اجتناب کر کے اس کی نعمتوں کا شکر کرنا ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

۲؎ یہ کفار کا گمان ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق عبث اور حکمت سے خالی ہے کیونکہ وہ دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے ہیں اور اطاعت گذار کے ثواب اور گنہگار کے عذاب کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا یہ انکار اس بات کا متقضی ہے کہ نظام عالم کی رنگینیاں عبث اور بے مقصد ہیں۔

۳؎ ویلٌ پر تنوین تعظیم کے لئے ہے اور فاء سببیت کے لئے ہے۔ کفار کی مذمت اور برائی بیان کرنے کے لئے ضمیر کی جگہ پھر اسم ظاہر الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کو دوبارہ ذکر فرمایا النار سے پہلے من سببیہ ہے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾

''کیا ہم بنا دیں گے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان لوگوں کی مانند جو فساد برپا کرتے ہیں زمین میں یا ہم بنا دیں گے پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح ۱؎''

۱؎ ام منقطع بمعنی بل ہے اور ہمزہ دونوں فریقوں، یعنی نیکوکاروں اور فسادیوں کے درمیان برابری کے انکار کے لئے ہے جو برابری زمین و آسمان کی تخلیق کے بے فائدہ ہونے کے لوازم میں سے ہے۔ یہ اسلوب استفہام اس لئے اپنایا تا کہ اس برابری کے تصور کی نفی ہو جائے۔ کفار جو گمان کرتے تھے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق بے مقصد ہے ان کی اس لایعنی باتوں سے اعراض کے لئے ام بمعنی بل ذکر فرمایا۔ دوسرا ام بھی منقطعہ بمعنی بل ہے۔ پہلے مومنین اور کفار کے درمیان برابری پر انکار کیا پھر مومنین میں سے متقین اور مجرمین کے درمیان برابری پر انکار فرمایا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دوسرا انکار پہلے انکار کے تکرار کے لئے ہو کہ آخری دو وصف بھی حکیم ذات کے نزدیک برابری کا تقاضا نہیں کرتے تو پھر پہلے دو گروہوں کے درمیان برابر کا سلوک کیسے ہوگا؟ یہ آیت کریمہ ایک عقلی دلیل ہے جو حشر کے وقوع کے وجوب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ دنیا میں تو ان دونوں فریقوں کے درمیان عمومی طور پر کوئی فضیلت نہیں ہے بلکہ دنیا میں تو معاملہ الٹ ہے کہ مومنین کی بنسبت کافر زیادہ عمدہ عیش و آسائش میں ہیں۔ پس ضروری ہے کہ کوئی دوسرا موقع محل ایسا ہونا چاہیے جہاں متقین کو اپنے اچھے اعمال کا نیک صلہ ملے اور کفار اور بدکار لوگوں کو اپنے کفر اور بداعمالیوں کی سزا ملے۔

مقاتل فرماتے ہیں کفار قریش کہا کرتے تھے کہ ہمیں آخرت میں اسی طرح خیرات و برکات میسر ہوں گی جیسے تمہیں میسر ہوں گی۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔

"یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف بڑی بابرکت تاکہ وہ تدبر کریں اسکی آیتوں میں ۱؎ اور تاکہ نصیحت پکڑیں عقلمند ۲؎"

۱؎ کِتٰبٌ سے مراد قرآن کریم ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ ھذا القرآن کی خبر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ھٰذَا الْقُرْآنُ کِتَابٌ مِّنَ اللّٰہِ، یعنی یہ قرآن اللہ کی طرف سے ایک کتاب ہے۔ مبارک یعنی بڑی بابرکت اور نفع بخش ہے اور اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ اے محبوب تم اور تمہاری امت کے علماء اس میں غور وفکر کرو تاکہ اس کے ظاہری مفہوم اور صحیح تاویلات کو پہچان لو اور معانی مستنبطہ کی معرفت حاصل کرلو یا یہ معنی کہ ہر وہ شخص جسے عقل کی دولت ونعمت سے نوازا گیا ہے وہ اس میں غور وفکر کرے تاکہ وہ جان لے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے، کسی بشر کا ایسی کلام پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں تدبر آیات سے مراد آیات کی اتباع کرنا ہے۔

۲؎ دوسرا مقصد اس کتاب کے نزول کا یہ ہے کہ عقول سلیمہ رکھنے والے اس سے نصیحت حاصل کریں یا یہ معنی کہ صاحب عقل لوگوں کے ذہنوں میں معرفت الٰہی کو حاصل کرنے کی جو قوت اور استعداد ودیعت کی گئی ہے اس کے ذریعے وہ معرفت حاصل کریں، جس معرفت پر دلائل بھی قائم کئے گئے ہیں کیونکہ کتب الٰہیہ اس چیز کو بیان کرتی ہیں جو صرف شریعت سے معلوم ہوتی ہے نیز کتب سماویہ اس چیز کی طرف راہنمائی کرتی ہیں عقل خود جس کے حصول پر قادر نہیں ہوتی شاید تدبر پہلے معلوم کے لئے ہو اور تذکر دوسرے معلوم کے لئے ہو۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝۳۰

"اور ہم نے عطا فرمایا داؤد کو سلیمان (جیسا فرزند) بڑی خوبیوں والا بندہ بہت رجوع کرنے والا ۱؎"

۱؎ وَهَبْنَا کا عطف ففغرنا پر ہے اور ان کے درمیان جملے معترضے ہیں۔ العبد سے مراد سلیمان علیہ السلام ہیں۔ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ کا جملہ آپ کی تعریف کی علت اور وجہ بیان کر رہا ہے۔ آپ اللہ کی بارگاہ میں بہت زیادہ توجہ کرنے والے تھے یا تسبیح کی صورت میں بہت زیادہ اس کی طرف رجوع کرنے والے تھے اس لئے آپ کی صفت اَوَّابٌ ذکر فرمائی۔

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝۳۱

"جب پیش کئے گئے آپ پر سہ پہر کو تین پاؤں پر کھڑے ہونے والے تیز رفتار گھوڑے ۱؎"

۱؎ اذ ظرف ہے اَوَّابٌ کی یا نعم کی اور ضمیر کا مرجع حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔ عشی سے مراد ظہر کے بعد کا وقت ہے۔ صافن اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو تین قدموں پر کھڑا ہوتا ہے اور چوتھے قدم کے سم کا کنارہ زمین پر ٹیکتا ہے۔ یہ عمل گھوڑے کی خوبیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جیاد جمع ہے جواد یا جود کی اور اس سے مراد تیز رفتار گھوڑا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جیادٌ جید کی جمع ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد سبقت لے جانے والے گھوڑے ہیں (۱) بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے صفون اور جودۃ دونوں صفات کو بیان فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان میں ٹھہرنے اور چلنے کے دونوں اچھے اوصاف جمع تھے، یعنی جب وہ کھڑے ہوتے ہیں تو اپنی جگہوں پر بڑے سکون سے کھڑے ہوتے ہیں اور جب دوڑتے ہیں۔ تو برق رفتاری سے دوڑتے ہیں کلبی کہتے ہیں حضرت سلیمان نے

حضرت داؤد کی میراث سے ہزار گھوڑے ملے تھے (1) لیکن اس قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نَحْنُ مَعْشَرُ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ مَاتَرَكْنَا صَدَقَةٌ (ہم انبیاء کا گروہ کوئی میراث نہیں چھوڑتے جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے) رد کرتی ہے۔عبد بن حمید، فریابی، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے ابراہیم التیمی سے روایت کیا ہے کہ بیس ہزار پروں والے گھوڑے تھے جن کی حضرت سلیمان نے کونچیں کاٹ ڈالی تھیں (2) عبد بن حمید اور ابن المنذر نے عوف عن الحسن کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جن گھوڑوں کی حضرت سلیمان نے کونچیں کاٹی تھیں وہ پروں والے گھوڑے تھے اور آپ کے لئے وہ سمندر سے نکالے گئے تھے۔آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کسی کے پاس ایسے گھوڑے نہ تھے (3)۔علامہ بغوی نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ وہ بیس ہزار پروں والے گھوڑے تھے (4) علماء نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے نماز ظہر ادا فرمائی اور پھر اپنی کرسی پر تشریف فرما ہو گئے اور وہ گھوڑے آپ پر پیش کئے جانے لگے۔آپ پر نو سو گھوڑے پیش کئے گئے تو آپ کو نماز عصر یاد آئی لیکن اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور نماز کا وقت گذر چکا تھا لیکن آپ کے رعب و ہیبت کی وجہ سے کسی نے آپ کو نماز کے متعلق آگاہ نہ کیا۔نماز کے فوت ہونے کا آپ کو بہت دکھ ہوا۔

فَقَالَ اِنِّیْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ ۚ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾

"تو آپ نے کہا مجھے ان گھوڑوں کی محبت پسند آئی ہے اپنے رب کی یاد کے لئے (پھر انہیں چلانے کا حکم دیا) یہاں تک کہ چھپ گئے پردہ کے پیچھے [1]"

[1] قال کا عطف محذوف جملوں پر ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہوگی اِذْعُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّافِنَاتُ الْجِيَادُ فَاشْتَغَلَ بِهَا حَتّٰى فَاتَهُ الْعَصْرُ فَقَالَ الخ الخير سے مراد مال کثیر ہے اور اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جن کے ساتھ آپ مشغول ہوئے تھے یا الخیر کا اطلاق الخیل (گھوڑوں) پر کیا ہے کیونکہ عرب لام اور راء کے درمیان تبادلہ کرتے رہتے ہیں مثلاً کہتے ہیں خَتَلْتُ الرَّجُلَ وَخَتَرْتُهُ جس کا معنی دھوکا دینا ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں خیل کو خیر اس لئے فرمایا کیونکہ گھوڑوں کی پیشانیوں میں خیر رکھی گئی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک کے لئے خیر باندھی گئی ہے اجر اور غنیمت (5) اس حدیث کو بخاری مسلم نے متعدد صحابہ سے روایت کیا ہے۔اصل میں احببت بمعنی اثرت، علی کے صلہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے لیکن جب اسے انبت کے قائم مقام رکھا گیا تو عن کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا۔بعض علماء فرماتے ہیں احببت بمعنی تقاعدت ہے اور حب الخیر علت کی بناء پر منصوب ہے اور معنی یہ ہوگا تقاعدت لحب الخیر یعنی میں گھوڑوں کی محبت کی وجہ سے بیٹھا رہا۔
توارت کا فاعل ضمیر الشمس کی طرف راجع ہے اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں ہے لیکن العشی کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔علامہ بغوی فرماتے ہیں حجاب ایک پہاڑ ہے جو کوہ قاف سے ایک ماہ کی مسافت پر ہے اور سورج اس کے پیچھے غروب ہوتا ہے (6)۔

رُدُّوْهَا عَلَیَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

"(حکم دیا) واپس لاؤ انہیں میرے پاس تو ہاتھ پھیرنے لگے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر [1]"

کو میرے پاس واپس لاؤ تو گھوڑے پیش کیے گئے۔ طفق بمعنی اخذ ہے اور اس کا عطف قال ردوھا پر ہے۔ مسحاً یمسح کا مصدر ہے۔ یعنی یمسح السیف مسحاً یعنی تلوار کے ساتھ ان کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹنے لگے اور یہ عربوں کے قول مسح علاوتہ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے اس کی گردن کاٹ دی۔ ابن عباسؓ حسن، قتادہ، مقاتل اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ ابن المنذر نے ابن جریج کے حوالہ سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا حضرت سلیمان نے تلوار کے ساتھ ان کی پنڈلیاں کاٹ دیں(1) طبرانی نے الاوسط میں، اسماعیل نے اپنی معجم میں اور ابن مردویہ نے حسن سند کے ساتھ ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سلیمان نے تلوار کے ساتھ گھوڑوں کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹ دیں(2) اور آپ کا یہ فعل اللہ کے حکم سے ذکر الٰہی سے غفلت پر توبہ کے طور پر تھا اور رضا الٰہی کے قرب کے حصول کے لئے تھا۔ حسن فرماتے ہیں جب آپ نے گھوڑوں کو مار دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نعم البدل عطا فرما دیا اور وہ ہوا تھی جو آپ کے حکم سے چلتی تھی(3) بعض مفسرین فرماتے ہیں آپ نے گھوڑوں کو ذبح کیا اور پھر ان کا گوشت صدقہ کر دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں گھوڑوں کا گوشت حلال تھا جس طرح ہماری شریعت میں بھی جمہور علماء کے نزدیک گھوڑوں کا گوشت حلال ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت مکروہ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ آپ نے ان گھوڑوں کو اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے مخصوص فرما دیا اور ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر داغ لگا دیئے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حکایت ہے آپ نے رُدُّوۡهَا عَلَیَّ کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے فرشتوں کو حکم دیا کہ سورج کو واپس لاؤ۔ فرشتے سورج کو واپس لائے حتیٰ کہ آپ نے عصر کی نماز اپنے وقت پر ادا فرمائی۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کے پاس راہ خدا میں جہاد کے لئے گھوڑے پیش ہوتے رہے حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا(4)۔

زہری اور ابن کیسان فرماتے ہیں آپ گھوڑوں سے محبت اور ان سے شفقت و پیار کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں سے اپنے ہاتھ کے ساتھ غبار جھاڑ رہے تھے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ قول ضعیف ہے اور مشہور پہلا قول ہے(5) میں کہتا ہوں اس قول کا رد حضرت سلیمان علیہ السلام کے قول اِنِّیۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ حَتّٰی تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ سے بھی ہو جاتا ہے۔

وَلَقَدۡ فَتَنَّا سُلَیۡمٰنَ وَاَلۡقَیۡنَا عَلٰی کُرۡسِیِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾

"اور ہم نے فتنہ میں ڈالا سلیمان (علیہ السلام) کو اور ڈال دیا ان کے تخت پر ایک بے جان جسم پھر وہ (ہماری طرف) متوجہ ہوئے [1]"

[1] یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے اور وھبنا پر اس کا عطف ہے۔ فتنا کا معنی اختبرنا اور ابتلینا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سلیمان نے کہا میں آج رات ننانوے عورتوں سے صحبت کروں گا (ایک روایت میں سو عورتوں کا ذکر ہے) اور ہر ایک سے شہسوار پیدا ہوگا جو راہ خدا میں جہاد کرے گا' فرشتے نے کہا ان شاء اللہ کہو آپ نے یہ نہ کہا اور بھول گئے۔ آپ نے عورتوں سے صحبت کی لیکن ایک عورت کے سوا کوئی بھی حاملہ نہ ہوئی اور اس سے بھی

ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اگر حضرت سلیمان ان شاء اللہ کہتے تو سب راہ خدا کے مجاہد اور شہسوار ہوتے (بخاری مسلم)(1) بعض علماء نے لکھا ہے کہ دایہ نے وہ ادھورا بچہ آپ کی کرسی پر ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا کا یہی مفہوم ہے۔ ثم اناب کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے آئندہ ان شاء اللہ چھوڑنے سے رجوع کر لیا۔ طاؤس نے ثم اناب کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔ یہ تاویل تمام اقوال سے بہتر ہے کیونکہ اس کو صحیحین کی حدیث کی تقویت و تائید حاصل ہے اور اس تاویل میں انبیاء کرام کی تقدیس کا پہلو بھی ہے کیونکہ جسد اس جسم کو کہتے ہیں جس میں روح نہ ہو تو اس تاویل پر جسد کا مفہوم صادق آتا ہے۔ طبرانی نے الاوسط میں اور ابن مردویہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیٹا پیدا ہوا تو جنوں نے کہا اگر یہ بچہ زندہ رہا تو ہم اس جبری مشقت اور فرمانبرداری سے کبھی فارغ نہ ہوں گے پس ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اسے قتل کر دیں یا اسے دیوانہ بنا دیں۔ حضرت سلیمان کو جب جنوں کی اس سازش کا علم ہوا تو آپ نے شیطانوں کے خوف سے اسے بادل میں چھپا دیا پھر آپ کو اس کا کچھ علم نہ تھا حتی کہ وہ مردہ حالت میں آپ کی کرسی پر گر پڑا۔ یہ سب کچھ اس لغزش پر تنبیہ تھی کہ آپ نے اپنے رب پر بھروسہ کیوں نہیں کیا۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت سلیمان نے سنا کہ سمندر کے جزیرہ میں ایک شہر ہے جس کا نام میدون ہے اور اس کا ایک عظیم الشان بادشاہ ہے چونکہ وہ سمندر کے جزیرہ میں رہتا ہے کوئی شخص اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو ایسی سلطنت اور بادشاہی عطا فرمائی تھی کہ بحر و بر کی کوئی چیز ان کے سامنے رکاوٹ نہ تھی۔ آپ ہوا پر سوار ہوئے اور ہوا پانی کے اوپر سے آپ کو اٹھا کر لے گئی حتی کہ آپ جن و انس کے لشکر سمیت اس جزیرہ میں اترے اور اس بادشاہ کو قتل کر دیا اور جو کچھ مال و متاع تھا سب پر قبضہ کر لیا۔ اس مال غنیمت میں آپ کو اس بادشاہ کی جرادہ نامی لڑکی بھی ملی تھی جو بڑی حسین و جمیل تھی۔ حضرت سلیمان نے اس کا اپنے لئے انتخاب فرمایا اور اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس عورت نے بادل نخواستہ اسلام قبول کر لیا۔ حضرت سلیمان اس سے انتہائی محبت فرماتے تھے ایسی محبت آپ دوسری عورتوں سے نہیں کرتے تھے۔ اس عورت کا آپ کے نزدیک بڑا مقام و مرتبہ تھا لیکن وہ ہمیشہ مغموم رہتی تھی اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو ٹپکتے رہتے تھے۔ حضرت سلیمان پر اس کی یہ کیفیت بہت گراں تھی۔ آپ نے پوچھا کیا وجہ ہے تو ہر وقت غمگین رہتی ہے اور تیرے آنسو رکتے ہی نہیں ہیں۔ اس لڑکی نے کہا مجھے اپنے باپ کی یاد رلاتی ہے کبھی مجھے اس کا ملک یاد آتا ہے کبھی اس پر ٹوٹنے والی مصیبت یاد آتی ہے اس لئے میں ہر وقت روتی رہتی ہوں۔ حضرت سلیمان نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجھے اس سے بہتر ملک عطا فرمایا ہے، اس سے بڑی سلطنت عطا کی ہے، اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اور یہ نعمت سب نعمتوں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ کہنے لگی بات بالکل اسی طرح ہے لیکن میں جب اپنے باپ کو یاد کرتی ہوں تو میری یہی کیفیت ہو جاتی ہے جو تیرے سامنے ہے اگر آپ جنوں کو حکم فرمائیں اور وہ میرے گھر میں میرے والد کی ایک مورتی بنا دیں اور صبح و شام اس کو دیکھا کروں تو شاید میرا یہ غم ہلکا ہو جائے اور مجھے کچھ تسلی ہو جائے۔ حضرت سلیمان علیہ اسلام نے جنوں کو حکم [illegible] مورتی بنادو حتی کہ وہ اس کے باپ کی بعینہٖ تشبیہ ہو، کچھ فرق محسوس نہ ہو۔ جنوں نے

عورت نے اس مورتی کو ویسا لباس پہنا دیا جو اس کا باپ زندگی میں پہنا کرتا تھا پھر جب حضرت سلیمان گھر سے نکل جاتے تو صبح شام وہ اپنی خادماؤں کے جلوس میں اس مورتی کے پاس جاتی اور اسے سجدہ کرتی۔ خادمائیں بھی سجدہ کرتیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چالیس دنوں تک اس واقعہ کا علم نہ ہوا۔ جب آصف بن برخیا کو اس کی خبر پہنچی جو ایک سچا انسان تھا اور اس کے لئے حضرت سلیمان کے دروازے پر کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی جس وقت حضرت سلیمان کے گھر آنا چاہتا آ سکتا تھا خواہ حضرت سلیمان گھر میں ہوں یا نہ ہوں وہ آیا اور اس نے عرض کی اے اللہ کے نبی میری عمر بڑی ہو گئی ہے، میری ہڈیاں نرم پڑ گئی ہیں اور میری عمر ختم ہونے والی ہے میرے جانے کا وقت قریب ہے۔ میں اب چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے ایک جگہ کھڑے ہو کر گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ کروں اور اپنے علم کے مطابق ان کی تعریف کروں اور لوگوں کو ان کی وہ باتیں بتاؤں جن سے وہ غافل ہیں۔ حضرت سلیمان نے فرمایا ایسا کرو اجازت ہے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں کو جمع کیا اور آصف بن برخیا بحیثیت خطیب کھڑے ہو گئے انہوں نے گذشتہ انبیاء کرام کا تذکرہ کیا اور ہر نبی میں جو جو خوبیاں تھیں اور اللہ نے جو فضیلت عطا فرمائی تھی سب کو بیان کیا حتی کہ سلیمان علیہ السلام کے تذکرہ تک پہنچے اس نے کہا اے سلیمان تم بچپن میں بڑے حلیم الطبع تھے، انتہائی نیکوکار اور متقی تھے، انتہائی انصاف کے ساتھ فیصلے فرماتے تھے اور ہر ناپسندیدہ کام سے پرہیز کرتے تھے۔ آپ کے بچپن اور چھوٹی عمر کا تذکرہ کر کے خاموش ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس بات پر بہت غصہ آیا حتی کہ آپ غصہ سے بھر گئے۔ جب سلیمان علیہ السلام گھر گئے تو آصف کو بلا کر فرمایا آصف! تو نے گذشتہ انبیاء کرام کا تذکرہ کیا، تو نے ان کے ہر زمانہ کی تعریف اور ان کے ہر حال کو بیان کیا لیکن میرا ذکر تو نے صرف بچپن کے زمانہ کے ساتھ کیا اور پھر تو خاموش ہو گیا میری بعد کی زندگی کا تو نے ذکر نہیں کیا بعد میں میری زندگی میں کیا، واقع ہوا ہے؟ آصف نے کہا ایک عورت کی خواہش پر چالیس دنوں سے تمہارے گھر میں غیر اللہ کی عبادت ہو رہی ہے۔ حضرت سلیمان نے پوچھا میرے گھر میں۔ آصف نے کہا ہاں جناب کے گھر میں۔ حضرت سلیمان نے کہا انا للّٰہ و انا الیہ راجعون یقیناً اب میں سمجھ گیا ہوں آپ نے جو کہا وہ کسی ایسی خبر کی وجہ سے کہا تھا جو تجھے پہنچ چکی تھی۔ حضرت سلیمان اپنے گھر کی طرف پلٹے اور وہ بت توڑ دیا اور اس عورت کو اور ان کی لونڈیوں کو سزا دی پھر پاک کپڑے لانے کا حکم دیا۔ آپ کے پاس ایسے کپڑے لائے گئے جن کے سوت کو نابالغہ عورتوں نے کاتا تھا، نابالغہ عورتوں نے ہی بنا تھا اور ان کو دھوتی بھی نابالغہ عورتیں تھی، ان کو کسی بالغہ عورت نے چھوا نہیں تھا پھر آپ وہ کپڑے پہن کر صحرا میں اکیلے نکل گئے اور وہاں آپ نے راکھ کا فرش بچھانے کا حکم دیا پھر آپ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنے لگے، اسی راکھ پر بیٹھ گئے اور کپڑوں کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرنے کے لئے راکھ پر لوٹنے لگے اور ان کے گھر میں جو کچھ غیر اللہ کی عبادت ہوتی تھی اس پر رونے لگے اور مغفرت طلب کرنے لگے۔ آپ اسی آہ و بکا کی کیفیت میں شام تک رہے اور پھر واپس گھر تشریف لائے۔

آپ کی ایک ام ولد لونڈی تھی جس کا نام امینہ تھا۔ جب آپ قضائے حاجت یا کسی بیوی سے صحبت کے لئے جاتے تو اپنی انگوٹھی اسی لونڈی کے پاس رکھ جاتے۔ آپ کے غسل کرنے سے پہلے تک وہ انگوٹھی اس لونڈی کے پاس رہتی۔ آپ اس انگوٹھی کو ہمیشہ طہارت کی حالت میں چھوتے تھے اور آپ کی حکومت اسی انگوٹھی کی وجہ سے تھی ایک دن اس انگوٹھی کو امینہ کے پاس رکھ کر بیت الخلا میں چلے گئے۔

گیا۔ سب پرندے جن اور انسان اس کے حکم کے پابند ہو گئے۔ حضرت سلیمان امینہ کے پاس آئے تو آپ کی حالت بدلی ہوئی تھی آپ نے فرمایا امینہ! میری انگوٹھی دو۔ اس نے کہا تو کون ہے؟ آپ نے فرمایا میں سلیمان بن داؤد ہوں۔ امینہ نے کہا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سلیمان تو مجھ سے اپنی انگوٹھی لے کر اپنے تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ حضرت سلیمان جان گئے کہ اس خطاء کی وجہ سے گرفت ہو گئی ہے۔ آپ بنی اسرائیل کے گھروں کے دروازوں پر جاتے اور کہتے میں سلیمان بن داؤد ہوں لیکن وہ آپ پر مٹی پھینکتے اور برا بھلا کہتے اور کہتے دیکھو یہ مجنوں ہے۔ کیا کہہ رہا ہے؟ کہتا ہے میں سلیمان بن داؤد ہوں۔ جب سلیمان علیہ السلام نے معاشرہ کا یہ نارو ابرتاؤ دیکھا تو آپ سمندر کی طرف نکل گئے۔ آپ مچھیروں کی مچھلیاں بازار میں لے آتے اور وہ آپ کو ہر روز دو مچھلیاں دیتے۔ جب شام ہوتی تو آپ ایک مچھلی روٹیوں کے بدلے فروخت کر دیتے اور دوسری خود بھون لیتے۔ یہ سلسلہ چالیس دن تک جاری رہا۔ کیونکہ چالیس دن آپ کے گھر میں بت کی پوجا ہوتی رہی تھی۔ آصف بن برخیا اور علماء بنی اسرائیل نے ان چالیس دن میں اس اللہ کے دشمن شیطان کے احکام کو عجیب دیکھا۔ ایک دن آصف نے کہا اے بنی اسرائیل کیا تم ابن داؤد کے احکام مختلف دیکھتے ہو جیسے میں مختلف دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں ہم بھی ان کے احکام پہلے کی نسبت مختلف دیکھ رہے ہیں۔ آصف بن برخیا نے فرمایا میں ان کی بیویوں سے جا کر پوچھتا ہوں کیا ان کو بھی یہ تبدیلی محسوس ہو رہی ہے جیسا کہ ان کے عام امور میں ہم تبدیلی محسوس کر رہے ہیں۔ بیویوں کے پاس آصف بن برخیا گئے اور ابن داؤد کے احکام میں تبدیلی کے متعلق پوچھا سب نے کہا ہم بہت زیادہ تبدیلی محسوس کر رہی ہیں۔ اب وہ حیض والی عورتوں کو بھی نہیں چھوڑتا اور غسل جنابت بھی نہیں کرتا۔ آصف بن برخیا نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تو کھلی آزمائش ہے۔ پھر آصف بنی اسرائیل کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ خاص امور میں تبدیلی تو عام امور سے بھی زیادہ ہے۔ جب چالیس دن گزر گئے تو جن اپنی جگہ سے اڑا اور سمندر کے پاس سے گزرا اور وہ انگوٹھی سمندر میں پھینک دی۔ اس انگوٹھی کو ایک مچھلی نے نگل لیا۔ پھر اس مچھلی کو کسی شکاری نے پکڑا۔ اتفاق سے حضرت سلیمان اس دن اس شکاری کی مزدوری کرتے رہے' شام کے وقت اس نے آپ کو دو مچھلیاں دیں جن میں ایک وہ مچھلی تھی جس نے انگوٹھی نگلی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک مچھلی روٹیوں کے عوض فروخت کر دی اور جس کے پیٹ میں انگوٹھی تھی اسے کاٹا تا کہ اس کو بھون لیں۔ آپ کو اس کے پیٹ سے انگوٹھی مل گئی' آپ نے وہ پہن لی اور اللہ کے حضور سجدہ میں گر گئے' اس طرح پھر جن اور پرندے آپ کے ساتھ ہو گئے اور انسان بھی آپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ سمجھ گئے کہ جو کچھ ان کے گھر میں بت کی پوجا ہوئی تھی اسی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ آپ دوبارہ تخت شاہی پر متمکن ہو گئے اور اپنے گناہ کی توبہ کی پھر آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ صخر نامی جن کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ جنوں نے اسے تلاش کیا اور پکڑ کر آپ کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک چٹان کو کاٹا اور پھر صخر کو اس میں داخل کیا پھر اس کے اوپر دوسری چٹان رکھ دی پھر لوہے اور تانبے کے ساتھ اسے مضبوطی سے باندھ دیا اور حکم دیا کہ اسی حالت میں اسے سمندر میں پھینک دو۔ یہ واقعہ وہب نے بیان کیا ہے(1)۔

سدی کہتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کا سبب یہ ہے کہ آپ کی سو بیویاں تھیں ان میں سے ایک کا نام جرادہ تھا۔ آپ سب عورتوں پر اسے ترجیح دیتے تھے اور اس پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے تھے' جب آپ قضاء حاجت کے لئے جاتے تو اسی کے

جب فیصلہ تمہارے پاس آئے تو فیصلہ میرے بھائی کے حق میں کر دینا۔ حضرت سلیمان نے کہا ٹھیک ہے ایسا کروں گا لیکن آپ نے ایسا کیا نہیں تھا' پس آپ اسی جواب کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا کئے گئے تھے۔ آپ انگوٹھی جرادہ کو دے کر بیت الخلاء میں گئے تو پیچھے سے شیطان آپ کی شکل میں آیا اور اس سے انگوٹھی لے گیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر جا کر بیٹھ گیا۔ آپ جب فارغ ہوئے اور اپنی بیوی سے انگوٹھی پوچھی تو اس نے کہا کیا تم وہ لے نہیں گئے ہو؟ حضرت سلیمان نے فرمایا نہیں۔ آپ اپنی جگہ چھوڑ گئے اور چالیس دن تک شیطان لوگوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ لوگ اس کے احکام کو عجیب دیکھتے (لیکن بولتا کوئی نہیں تھا) ایک دن بنی اسرائیل کے قراء اور علماء جمع ہوئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں کے پاس گئے اور کہا کہ ہم اس شخص کے احکام میں تبدیلی دیکھ رہے ہیں۔ اگر واقعی یہ سلیمان ہے تو پھر اس کی عقل ضائع ہوگئی ہے یہ سن کر عورتیں رونے لگیں۔ لوگ واپس آئے اور اسے ترچھی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور پھر تورات کھول کر پڑھنے لگے۔ وہ جن ان کے سامنے سے اڑا اور محل کی بالکونی میں جا بیٹھا۔ ابھی تک انگوٹھی اس کے پاس تھی۔ پھر وہ اڑا اور سمندر پر پہنچ گیا وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ سے سمندر میں گر گئی اور ایک مچھلی نے نگل لی۔ حضرت سلیمان ایک شکاری کے پاس آئے، جبکہ آپ کو شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ آپ نے شکاری سے کھانا طلب کیا اور اسے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا میں سلیمان ہوں۔ کسی شکاری نے آپ کے سر پر ڈنڈا مارا اور آپ کا سر زخمی کر دیا۔ آپ سمندر کے کنارے اپنے خون کو دھونے لگے' دوسرے شکاریوں نے آپ کو مارنے والے شکاری کو ملامت کی اور آپ کو دو مچھلیاں بھی دے دیں جو انہوں نے پہلے پکڑ رکھی تھیں' آپ نے ان دونوں کا پیٹ چاک کیا اور پھر ان کو دھونا شروع کیا۔ ایک مچھلی کے پیٹ سے آپ کو اپنی انگوٹھی مل گئی۔ آپ نے وہ پہن لی' اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی حکومت اور شان وشوکت واپس فرما دی۔ پرندے آپ کے اوپر گھومنے لگے' لوگوں نے بھی آپ کو پہچان لیا کہ آپ سلیمان علیہ السلام ہیں اور جو کچھ وہ آپ سے اب تک سلوک روا رکھتے رہے اس پر معذرت کرنے لگے آپ نے فرمایا میں تم سے تمہارے عذر پر کوئی بات نہیں کرتا اور نہ تمہیں اپنے کئے پر ملامت کرتا ہوں' یہ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا پھر آپ اپنے تخت حکومت پر تشریف لائے اور امور مملکت سنبھال لئے۔ آپ نے حکم دیا کہ انگوٹھی لینے والے شیطان (جن) کو پکڑ کر لایا جائے۔ آپ نے اسے ایک لوہے کے صندوق میں بند کر دیا اور اوپر سے اسے سیل کر دیا اور اپنی مہر لگا دی پھر آپ نے حکم دیا کہ اسے اسی حالت میں سمندر میں پھینک دو وہ اب بھی اسی طرح زندہ ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گا(1)۔

سعید بن مسیب سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام تین دن لوگوں سے چھپے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے سلیمان تم تین دن چھپے رہے اور میرے بندوں کے معاملات پر توجہ نہیں دی۔ پس اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمائش میں ڈال دیا۔ پھر انہوں نے بھی انگوٹھی اور شیطان کے انگوٹھی لینے کا واقعہ بیان کیا ہے جیسا کہ پیچھے ہم نے ذکر کیا ہے(2)۔ حسن فرماتے ہیں یہ شان الٰہی سے بعید ہے کہ وہ حضرت سلیمان (پیغمبر) کی عورتوں پر ایک شیطان کو مسلط کر دے(3)۔ (بغوی کا کلام یہاں ختم ہوا)

عبد بن حمید نے ابن عباس سے اور ابن جریر نے سدی سے' نسائی اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے یہ واقعہ وہب بن منبہ کی طرح روایت کیا ہے لیکن بعض طرق میں ہے کہ صخر جن جب سلیمان علیہ السلام کے تخت پر بیٹھا تو حضرت سلیمان اور آپ کی ازواج

شایان شان نہیں کہ اس نے حضرت سلیمان کی ازواج پر شیطان کو مسلط کر دیا ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں انگوٹھی شیطان اور حضرت سلیمان کے گھر میں بت کا ہونا سب یہود کی خرافات ہیں (اللہ ان پر لعنت کرے) علامہ بغوی لکھتے ہیں بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت سلیمان کی آزمائش شروع ہوئی تو آپ کی انگوٹھی ہاتھ سے گر گئی جس میں آپ کی حکومت کا دارومدار تھا۔ حضرت سلیمان نے دوبارہ اس کو پہنا تو پھر وہ گر گئی' حضرت سلیمان کو اس کے بار بار گرنے سے یقین ہو گیا کہ آزمائش شروع ہو گئی ہے۔ آصف بن برخیا آئے تو اس نے حضرت سلیمان کو کہا آپ اپنے گناہ کی وجہ سے آزمائش میں ڈالے گئے ہیں' انگوٹھی چودہ دن تک آپ کے ہاتھ میں نہ ٹھہری پھر آپ اپنی سرائے میں چلے گئے' آصف نے وہ انگوٹھی اٹھائی اور اپنے ہاتھ میں پہنی تو وہ نہ گری' جسد سے یہی مراد ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وَاَلْقَيْنَا عَلٰی كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا میں ذکر فرمایا ہے۔ پس آصف بن برخیا آپ کی سیرت کے مطابق چودہ دن تک آپ کی حکومت چلاتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو اس کی حکومت واپس فرما دی۔ آپ اپنی کرسی پر تشریف فرما ہوئے اور انگوٹھی پہنی تو وہ نہ گری (1)۔

میں کہتا ہوں وہب کی روایت کے بطلان پر دلیل یہ بات ہے کہ اس روایت میں ہے کہ سمندر کے جزیرہ صیدون میں ایک عظیم الشان بادشاہ رہتا تھا اس پر آپ نے حملہ کیا تھا، جبکہ سمندر میں ہونے کی وجہ سے وہاں تک کوئی شخص پہنچ نہیں سکتا تھا۔ حضرت سلیمان اس شہر کی طرف نکلے، جبکہ ہوا آپ کو اٹھائے ہوئے تھی' تو آپ ہوا کے ذریعے پانی کے اوپر سے گزر کر اپنے لشکر سمیت اس شہر میں جا اترے۔ جب قرآن صراحتہً کہہ رہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کی تسخیر اس آزمائش اور رجوع کے بعد ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فسخرنا له الريح یعنی فتنہ اور انابت کے بعد ہم نے اس کے لئے ہوا کو مسخر کیا۔ اسی طرح آپ کی یہ دعا رب هب لی ملكا الخ بھی آزمائش کے بعد کی ہے۔

میں کہتا ہوں اس قصہ کو اگر صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو حضرت سلیمان سے معصیت کا صدور پھر بھی لازم نہیں آتا کیونکہ مورتیوں کا بنانا اس زمانہ میں جائز تھا اور آپ کو ان کے سجدہ کرنے کا علم نہیں تھا' اس لئے ان کا یہ عمل آپ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

''عرض کی میرے رب! مجھے معاف فرما دے اور عطا فرما مجھے ایسی حکومت جو کسی کو میسر نہ ہو۔ میرے بعد [1]۔ بیشک تو ہی بے انداز عطا کرنے والا ہے۔ [2]''

[1] انبیاء کرام اور صالحین کی سنت وعادت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے بادشاہی کا سوال کرنے سے پہلے استغفار کیا۔ نافع اور ابو عمرو نے من بعدی کی یاء کو فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

اس آیت کے سیاق سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش وابتلاء دنیا و آخرت میں ان کو بلند درجات عطا کرنے کے لئے تھی جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش ان کو بلند مراتب عطا کرنے کے لئے تھی۔ حضرت سلیمان علیہ

نے اس کو بخش دیا) جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا تھا۔

مقاتل' ابن کیسان فرماتے ہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کسی کے لئے ایسی شاہی نہ ہو(1)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میرے سوا میرے دور میں کسی کو ایسی بادشاہی نہ ملے۔ جیسے یہ ارشاد ہے فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں آپ کی طلب کی مراد یہ تھی کہ مجھے ایسی حکومت عطا فرما کہ آخری عمر میں پھر مجھ سے چھین نہ لے اور کسی غیر کو نہ عطا فرما دے(2) جیسا کہ پہلے تو نے مجھ سے چھین لی ہے' بعض علماء فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سوال اس لئے کیا تھا تا کہ یہ بادشاہی ان کی نبوت کے لئے نشانی بن جائے اور ان کے لئے معجزہ ہو جائے۔ مقاتل فرماتے ہیں سلیمان علیہ السلام پہلے ہی بادشاہ تھے لیکن اس سوال سے وہ ہواؤں' پرندوں اور جنوں کی تسخیر چاہتے تھے۔ اس کی دلیل بعد والی آیات ہیں(3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گزشتہ رات ایک بہت بڑے جن نے تھوکا تا کہ میری نماز کو توڑ دے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت عطا فرما دی' میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں تا کہ تم سب اس کو دیکھ لو (لیکن) مجھے اپنے بھائی (سلیمان علیہ السلام) کی دعا یاد آ گئی کہ رَبِّ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ اس لئے میں نے اسے دھتکارتے ہوئے واپس لوٹا دیا۔ (متفق علیہ)(4)

میں کہتا ہوں ہو سکتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی مراد یہ ہو کہ اسے ایسی حکومت نہ دینا جو میرا ہم مرتبہ ہو اور آپ کا یہ کہنا لوگوں پر اظہار شفقت کے لئے تھا' یعنی میری طرح جس شخص کا دنیا سے رشتہ منقطع ہو اور دل محبت الٰہی اور معرفت الٰہی سے سرشار ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی چیز کے نقصان دینے کا تصور اس کے دل میں نہ ہو اور کوئی چیز اسے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والی نہ ہو تو اس کے لئے دنیا مزید نیکیاں حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے لیکن جو اس مرتبہ علیا پر فائز نہ ہو تو دنیا اس کے لئے یاد الٰہی سے غفلت کا سبب بنتی ہے اور اس کے لئے دنیا زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ حدیث تو تمہاری تاویل سے موافقت نہیں رکھتی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام سے بلند مرتبہ تھے لیکن اس کے باوجود آپ کو ان کی مثل حکومت و شاہی عطا نہیں کی گئی' اسی وجہ سے آپ نے جن کو ستون کے ساتھ باندھا بھی نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام سے بلند مرتبہ تھے لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طرح حکومت عطا نہیں کی گئی تھی کیونکہ سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ میرے بعد کسی کو ایسی حکومت نہ ملے۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ملک (بادشاہ نبی) اور نبی عبد بننے میں اختیار عطا فرمایا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی عبد بننا پسند فرمایا تھا کیونکہ فقر آپ کے نزدیک افضل تھا اور حدیث شریف صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن کو ستون سے باندھنے کی قدرت عطا فرمائی تھی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کا خیال کرتے ہوئے اپنے اختیار سے اسے چھوڑ دیا تھا ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو جن و انس پر نافذ تھا۔

تَاْتِيْ بِدَعْوَتِهِ الْاَ شُجَارُ سَاجِدَةً ۝ تَمْشِيْ اِلَيْهِ عَلٰى سَاقٍ بِلَا قَدَمٍ

(حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب درختوں کو اشارہ فرماتے ہیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے قدموں کے بغیر اپنے تنے کے سہارے خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فقراء کی زندگی اور ان کا لباس مرغوب تھا۔ اسی طرح تمام خلفاء راشدین کو بھی خلافت اور فقر دونوں عظمتیں حاصل تھیں اور دونوں کے فضائل میسر تھے۔ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى خُلَفَاءِ هٖ وَآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

ے اے اللہ تعالیٰ تیری ذات وہاب (بہت زیادہ عطا کرنے والا) ہے جسے چاہتا ہے جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے جسے تو عطا کرے کوئی اسے محروم کرنے والا نہیں اور جسے تو عطا نہ فرمائے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾

''پس ہم نے ہوا کو آپ کا فرمانبردار بنا دیا۔ چلتی تھی آپ کے حسب حکم آرام سے جدھر آپ چاہتے لے''

لے ابوجعفر نے الریح کو جمع کا صیغہ یعنی الریاح پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے جنس کے ارادہ سے مفرد پڑھا ہے۔ یہ جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فَاسْتَجَبْنَا دُعَاءَهٗ فَسَخَّرْنَا لَهٗ۔ یعنی ہم نے اس کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور ان کے لئے ہوا کو فرمانبردار بنا دیا۔ تجری بامرہ' الریح کی صفت ہے جس طرح ولقد امر علی اللئیم یسبنی میں یسبنی اللئیم کی صفت ہے یا تجری الریح سے حال ہے۔ رخاء کا معنی نرم ہے، یعنی اس میں لڑکھڑاہٹ نہ ہوتی تھی۔ یا یہ معنی کہ ہوا آپ کے ارادہ کے مخالف نہیں چلتی تھی' حیث اصاب' تجری کی ظرف ہے۔ یعنی جہاں کا آپ ارادہ فرماتے ادھر چلتی تھی۔ عرب کہتے ہیں اَصَابَ الصَّوَابَ فَاَخْطَاَ الْجَوَابَ۔

وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾

''اور سب دیو بھی ماتحت کر دیئے کوئی معمار اور کوئی غوطہ خور لے''

لے یعنی ہم نے جنوں کو بھی آپ کے لئے مسخر کر دیا، کوئی قلعے اور محلات تعمیر کرتے تھے اور کوئی آپ کے لئے سمندر کی تہہ سے موتی نکال کر لاتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے سمندر سے موتی نکلوائے تھے۔ کل، الشیاطین سے بدل ہے۔

وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾

''اور ان کے علاوہ (جو سرکش تھے) باندھ دیئے گئے زنجیروں میں لے''

لے اٰخَرِيْنَ کا عطف کل پر ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہوا تھا ایک گروہ مشقت طلب کام کرتا تھا جیسے مکان تعمیر کرنا اور سمندر کی تہہ میں غوطہ زنی کر کے موتی نکالنا اور دوسرا گروہ سرکش شیطانوں کا تھا جن کو آپ نے زنجیروں میں علیحدہ علیحدہ جکڑ رکھا تھا تاکہ شر انگیزی نہ کر سکیں۔

میں کہتا ہوں شاید ابلیس پر آپ کو تسلط نہ تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے وعدہ فرمایا تھا فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾۔

گی ۱؎ ۔''

۱؎ یعنی ہم نے سلیمان کو کہا اے سلیمان ہم نے تجھے وسیع شاہی اور تسلط عطا فرمایا جو کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمایا اور یہ ہماری بخشش اور عطا ہے تو جس کو چاہے عطا کر دے اور جس سے چاہے روک لے، آپ سے اس معاملہ میں کوئی باز پرس نہ ہوگی کیونکہ ان میں تصرف کرنے کا اختیار تیرے سپرد کیا گیا ہے۔

حضرت حسن فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جس کسی پر بھی انعام فرمایا تو وہ اس کے لئے بوجھ بن گیا لیکن سلیمان علیہ السلام کے لئے ایسا نہیں تھا اگر وہ کسی کو عطا کریں تو ان کے لئے اجر ہے اور اگر کسی سے اپنی نوازشات روک لیں تو ان پر کسی قسم کا مواخذہ نہیں (1)۔ اس مفہوم کے اعتبار سے بِغَیْرِ حِسَابٍ، فامنن کی ضمیر سے حال ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عطا سے حال ہو یا اس کے متعلق ہو اور درمیان میں کلام اعتراض ہو۔ یعنی ہم نے آپ کو اتنا کثیر عطا فرمایا جس کا شمار اور گنتی ممکن نہیں۔ مقاتل کہتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ جنوں کی تسخیر ہماری عطا ہے جنوں میں سے جس کو چاہو چھوڑ دو اور جس کو چاہو باندھ دو آپ پر ان کے چھوڑنے اور باندھنے کا کوئی مواخذہ نہ ہوگا (2)۔

وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾

''اور بیشک انہیں ہمارے ہاں بڑا قرب حاصل ہے اور خوبصورت انجام ۱؎ ۔''

۱؎ یعنی دنیا میں ملک عظیم پر اتنا وسیع تسلط عطا فرمایا لیکن آخرت میں بھی ان کا ہماری بارگاہ میں بڑا قرب و مرتبہ ہوگا۔ حسن مآب سے مراد جنت ہے۔

وَ اذْكُرْ عَبْدَنَاۤ اَیُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ﴿۴۱﴾

''اور یاد فرمایئے ہمارے بندے ایوب کو جب انہوں نے پکارا اپنے رب کو (الٰہی) پہنچائی ہے مجھے شیطان نے بہت تکلیف اور دکھ ۱؎ ۔''

۱؎ اَیُّوْبَ، عَبْدَنَاۤ سے عطف بیان ہے اور اس جملہ کا عطف واذکر عبدنا داؤد پر ہے۔ اذ نادیٰ من عبدنا سے بدل اشتمال ہے۔ حمزہ نے مَسَّنِیَ کو یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَنِّیْ اپنے اسم خبر سے مل کر حضرت ایوب علیہ السلام کی کلام کی حکایت ہے۔ نصب کو ابوجعفر نے نون اور صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یعقوب نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے نون کے ضمہ اور صاد کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، تمام کا معنی مشقت اور تکلیف ہے۔ عذاب سے مراد دکھ ہے۔ مقاتل اور قتادہ فرماتے ہیں نصب جسمانی تکالیف اور عذاب مالی پریشانی ہے (3) ہم نے سورۂ انبیاء میں حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیف اور مدت آزمائش کا تذکرہ کر دیا ہے۔ پھر جب آپ کی مدت آزمائش مکمل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا۔

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿۴۲﴾

''(حکم ہوا) اپنا پاؤں (زمین پر) مارو یہ نہانے کے لئے ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کے لئے ۱؎ ۔''

۱؎ یہ جملہ قلنا کی تقدیر کے ساتھ مستانفہ ہے۔ هذا مغتسل الخ کا جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے

فَرَكَضَ فَخَرَجَتْ عَیْنٌ فَقُلْنَا لَهٗ هٰذَا مُغْتَسَلٌ ...

یہ نہانے کے لئے ٹھنڈا پانی ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے جب اس پانی سے غسل فرمایا تو تمام ظاہری بیماریاں ختم ہوگئیں اور جب اس چشمہ کا پانی پیا تو باطنی ہر تکلیف دور ہوگئی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ نے دو مرتبہ زمین پر پاؤں مارا تو دو چشمے جاری ہوئے۔ ایک گرم تھا اور دوسرا ٹھنڈا۔ ایک سے آپ نے غسل فرمایا اور دوسرے سے نوش فرمایا۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے دایاں پاؤں مارا تو ایک چشمہ جاری ہوگیا پھر دایاں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے زمین پر مارا تو دوسرا چشمہ جاری ہوگیا۔ ایک سے آپ نے نوش فرمایا اور دوسرے سے غسل فرمایا(1)۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾

''اور ہم نے عطا فرمایا انہیں ان کا اہل وعیال اور ان کی مانند ان کے ساتھ بطور رحمت اپنی جناب سے اور بطور نصیحت اہل عقل کے لئے 1''

1 اس کلام کا عطف سابق کلام کے مفہوم پر ہے، یعنی ہم نے انہیں شفا بخشی اور یہ سب کچھ عنایت فرمایا۔

وَخُذْ بِیَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

''اور (حکم ملا) پکڑ لو اپنے ہاتھ سے تنکوں کا ایک مٹھا اور اس سے مارو اور قسم نہ توڑو 1 بیشک ہم نے پایا انہیں صبر کرنے والا بڑا خوبیوں والا بندہ ہر وقت ہماری طرف متوجہ 2''

1 خذ کا عطف ارکض پر ہے۔ اس ترکیب کے اعتبار سے وَوَهَبْنَا لَهٗۤ الخ جملہ معترضہ ہوگا یا خذ قلنا کی تقدیر پر وهبنا پر معطوف ہے۔ ضغثاً مٹھی بھر درخت کی ٹہنیاں یا گھاس کے تنکے۔ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی اس ترکیب کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام نے گھاس کا ایک مٹھا لے کر جس میں سو تیلیاں تھیں (اپنی بیماری کی حالت میں اٹھائی گئی قسم پوری کرنے کے لئے) اپنی بیوی کو مارا۔

2 یہ جملہ وهبنا کی علت بیان کر رہا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو جو جسمانی تکلیف پہنچی اور مال واہل کا جو نقصان ہوا کسی چیز پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زبان شکایت نہ کھولی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں ہم نے انہیں صابر پایا۔ عافیت کی تمنا اور شفا کی طلب کو جزع فزع نہیں کہا جاتا جیسا کہ ہم نے سورۂ انبیاء میں ذکر کیا ہے۔ ہمارے شیخ شہید (حضرت مرزا جان جاناں شہید) نے یہاں بڑی لطیف کلام فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام نے کئی سال تک اپنی مصیبت پر صبر کئے رکھا (جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے) پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف کو دور کرنے کا ارادہ فرمایا تو ان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ اے ایوب اللہ تعالیٰ تجھ سے آزمائش دور کرنے کے لئے تضرع وزاری اور اپنی بارگاہ میں عجز وانکسار کے اظہار کا ارادہ فرماتے ہیں تو ایوب علیہ السلام نے رضائے الٰہی کو چاہتے ہوئے تضرع وزاری کو اختیار فرمایا حالانکہ آپ کی طبیعت صبر کی متقضی تھی۔ پس اس طرح آپ مقام صبر سے مقام رضا کی طرف ترقی کر گئے پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے صبر کی قدر دانی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا اور ان کے مقام رضا کی طرف ترقی کرنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ کہ ایوب خوبیوں والا بندہ ہے اور اپنے ضمیر اور نفس کے ساتھ مکمل

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝

''اور یاد فرماؤ ہمارے (مقبول) بندوں ابراہیم اسحٰق اور یعقوب کو بڑی قوتوں والے اور روشن دل تھے ۔ ل''

ل تینوں اسماء عِبٰدَنَآ سے عطف بیان ہیں ۔ ابن کثیر نے جمع کی جگہ جنس کو رکھنے کی بناء پر عبدنا پڑھا ہے یا مفرد معنی کے اعتبار سے عبدنا پڑھا ہے اور صرف ابراہیم اس کا عطف بیان ہے اسحاق اور یعقوب معطوف ہیں ۔ ان پاکباز لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ بجا لانے کی قوت عطا فرمائی تھی نیز انہیں دین کی بصیرت اور معرفت الٰہی بھی عطا کی گئی تھی ۔ ابن عباس قتادہ اور مجاہد نے اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ کا یہی مفہوم بیان کیا ہے اطاعت الٰہی میں اعمال صالحہ کرنے کو ایدی سے تعبیر فرمایا کیونکہ اکثر اعمال صالحہ ہاتھوں کی مدد سے کئے جاتے ہیں ۔ معارف کو ابصار سے تعبیر فرمایا کیونکہ ابصار حصول معرفت کا قوی ترین مبدء ہے ۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ جاہل لوگ اپاہج اور اندھوں کی مانند ہوتے ہیں ۔

اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝

''ہم نے مختص کیا تھا انہیں ایک خاص چیز سے اور وہ دار آخرت کی یاد تھی ۔ ل''

ل یعنی ہم نے انہیں ایک مخصوص خصلت عطا کی تھی جو صرف ان میں پائی جاتی تھی اور وہ خصلت آخرت کی یاد تھی، یعنی ان کی زندگیوں کا ہر لمحہ یاد آخرت میں بسر ہوتا تھا ۔ وہ آخرت کو سنوارنے کی فکر میں لگے رہتے تھے ۔ ذکر الدار یا تو مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع ہے یا اعنی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے یا خالصة سے بدل کی حیثیت سے مجرور ہے، یعنی ہمیشہ آخرت کے گھر کی یاد میں رہتے ہیں اور لوگوں کو بھی آخرت کی یاد دلاتے ہیں جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی عادت طیبہ ہوتی ہے اور ان کی ہر لمحہ یہ یاد طاعت میں اخلاص کے سبب ہوتی ہے کیونکہ جو اعمال بجالاتے ہیں یا جو ترک کرتے ہیں ان سب میں انہیں رضا الٰہی مطلوب ہوتی ہے ان کا مطمع نظر فقط رب تعالیٰ کی ملاقات ہوتی ہے اور یہ صرف آخرت میں ہی پائی جائے گی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہو تقدیر عبارت اس طرح ہو ذکری صاحب الدار یعنی وہ دار کے مالک کی یاد میں رہتے ہیں اور دار کا مالک اللہ تعالیٰ ہے آخرت پر دار کا اطلاق کر کے یہ شعور دیا کہ حقیقت میں دار (گھر) تو آخرت ہی ہے ۔ دنیا تو فقط گزرگاہ ہے جس میں کسی کو قرار نہیں اور جس میں قرار نہ ہو اسے دار (گھر) نہیں کہا جاتا ۔

نافع اور ہشام نے خالصه کو ذِکْرَی کی طرف بیان کے لئے مضاف کر کے پڑھا ہے یا خالصه مصدر بمعنی خلوص ہے اور اپنے فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے ۔ مالک بن دینار فرماتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت اور دنیا کی یاد نکال دی ہے اور آخرت کی محبت اور آخرت کی یاد کے لئے ہم نے ان کو مختص کر دیا ہے ۔ مقاتل فرماتے ہیں وہ آخرت کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے تھے ۔ سدی فرماتے ہیں وہ آخرت کے خوف کے ساتھ مختص تھے (1) ۔ ابن زید فرماتے ہیں خالصه کو مضاف کر کے پڑھنے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں خاص فرمالیا ہے ان نعمتوں کے لئے جو آخرت کی نعمتوں میں سے افضل ترین ہیں ۔ انا اخلصاهم کا جملہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر سابق کلام کی علت ہے ۔

''اور یہ (حضرات) ہمارے نزدیک چنے ہوئے بہت بہترین لوگ ہیں۔ لہ''

لہ اخیار جمع ہے خیر کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خیّر کی جمع ہے جیسے میّت اور میت کی جمع اموات آتی ہے۔

وَاذْكُرْ إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ﴿٤٨﴾

''اور یاد فرمایئے اسماعیل، یسع اور ذی الکفل کو یہ سب بہترین لوگوں میں سے ہیں۔ لہ''

لہ یسع، اخطوب کے بیٹے تھے جنہیں بنی اسرائیل پر خلیفہ بنایا گیا تھا اور پھر نبی بنائے گئے تھے۔ حمزہ اور کسائی نے لام مشدد کے ساتھ اور یاء کے سکون کے ساتھ لَیْسَع سے منقول کرتے ہوئے وَاللَّیْسَعَ پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے لام ساکن اور یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ذالکفل، الیسع کے چچا کا بیٹا تھا یا بشر بن ایوب کا بیٹا تھا۔ ان کے نبی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ آپ کا یہ لقب ہونے کی وجہ بعض علماء نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کی طرف بنی اسرائیل کے سونبی تشریف لے گئے تھے اور اس نے ان سب کو پناہ دی تھی اور ان کی کفالت کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس نے ایک ایسے نیک شخص کی کفالت کی تھی جو ہر روز سو نمازیں پڑھتا تھا۔ کل من الاخیار، اذکر کے مفعول سے حال ہے۔

هَٰذَا ذِكْرٌ ۚ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ﴿٤٩﴾

''یہ نصیحت ہے اور بیشک پرہیزگاروں کے لئے بہت عمدہ ٹھکانہ ہے لہ''

لہ ھذاء کا اشارہ گزشتہ انبیاء کے واقعات کی طرف ہے، یعنی یہ ان کے لئے باعث شرف تھے یا یہ معنی کہ جو قرآن آپ پر تلاوت کیا جا رہا ہے یہ ان کی پاکیزہ حیات کا ذکر جمیل ہے۔ آگے ان انعامات کا تذکرہ فرمایا جو انبیاء کرام اور ان کے متبعین کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ مآب کا معنی مرجع ہے۔ یعنی متقین کے لئے بہترین لوٹنے کی جگہ ہے۔

جَنَّاتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ ﴿٥٠﴾

''سدابہار باغات کھلے ہوں گے ان کے لئے سب دروازے۔ لہ''

لہ جَنّٰتِ عَدْنٍ، حسن مآب سے عطف بیان ہے یا اس سے بدل ہے اور عدن اعلام غالبہ میں سے ہے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے جَنّٰتِ عَدْنِ ٭ الَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ۔ (سدابہار چمن جن کا وعدہ (خداوند) رحمٰن نے اپنے بندوں سے کیا ہے) مفتحة، حال کی بناء پر منصوب ہے اور اس میں عامل متقین میں فعل کا معنی ہے، لھم الابواب اس بناء پر مرفوع ہے کہ اس کی طرف مفتحة کو منسوب کیا گیا ہے اور ذوالحال کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ یا الابواب پر الف لام مضاف الیہ کے عوض ہے تقدیر اس طرح ہوگی مُفَتَّحَةً لَّهُمْ اَبْوَابُهَا یا جنات کی طرف لوٹنے والی ضمیر مستتر سے بدل اشتمال ہے۔

مُتَّكِئِينَ فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَشَرَابٍ ﴿٥١﴾

''تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ان میں طلب فرماتے ہوں گے وہاں طرح طرح کے پھل اور مشروبات لہ''

لہ فاکہۃ کی صفت کثیرہ ذکر فرمائی پھر اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے شراب کی صفت کثیر کو حذف کیا گیا ہے۔ متکئین اور یدعون

فرمایا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جنتیوں کا کھانا محض تلذذ کے لئے ہوگا کیونکہ بطور غذا کھانا اس لئے استعمال کیا جاتا ہے تا کہ جسم میں جو طاقت کی کمی واقع ہوتی ہے اسے پورا کیا جائے، جبکہ جنت میں تو کوئی کمزوری اور تحلیل ہوگی ہی نہیں۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾

''اور ان کے پاس نیچی نگاہوں والی (عمر، جمال و کمال میں) ہم مثل (حوریں) ہوں گی [1]''

[1] یعنی ان کے پاس ایسی حوریں ہوں گی جو اپنے خاوندوں کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گی۔ فرمایا اَتْرَابٌ یعنی ہم عمر ہوں گی ان کی عمر تینتیس 33 سال ہوگی۔ اَتْرَابٌ جمع ہے ترب کی۔ مجاہد فرماتے ہیں اَتْرَابٌ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ باہم محبت و پیار کرنے والیاں ہوں گی، ان کی سوتنوں کی طرح آپس میں رقابت نہ ہوگی (۱) اور ایک دوسرے سے غیرت نہ کھائیں گی۔ یہ جملہ ظرفیہ حال ہے یا هم ضمیر کی خبر ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾

'' یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ روز حساب (تمہیں ملے گا) [1]''

[1] ابن کثیر نے یہاں اور سورۂ ق میں غائب کا صیغہ یوعدون پڑھا ہے اور ضمیر متقین کے لئے ہے۔ ابوعمرو نے یہاں ابن کثیر کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے مومنین کے لئے خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یوم پر لام علت کے لئے ہے کیونکہ حساب جزاء کے ملنے کی علت ہے یا اس کا معنی فی یوم الحساب ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿٥٤﴾

''بیشک یہ ہمارا (دیا ہوا) رزق ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ [1]''

[1] ماله من نفاد کا جملہ رزقنا سے حال ہے۔ هذا کی دوسری خبر ہے۔

هٰذَا ؕ وَ اِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿٥٥﴾

''یہ (تو پرہیزگاروں کے لئے) اور بلاشبہ سرکشوں کے لئے برا ٹھکانہ ہوگا [1]''

[1] هٰذَا یا تو الامر کی خبر ہے یا مبتدا ہے کما ذکر اس کی خبر ہے، یہ خذ کا مفعول ہے۔ طاغین سے مراد کافر ہیں۔ مآب کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے۔

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾

''(یعنی) جہنم وہ داخل ہوں گے اس میں تو یہ کتنا تکلیف دہ بچھونا ہے۔ [1]''

[1] جَهَنَّمَ، شر مآب سے بدل یا عطف بیان ہے۔ یصلونها، جہنم سے حال ہے۔ بئس کا مخصوص بالذم جہنم یا مهادهم محذوف ہے۔

هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّ غَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾

لے ھٰذَا کا مشار الیہ العذاب ہے اور یہ مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر فلیذوقوا کر رہا ہے یاھذا مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی یہ ان کی مہمان نوازی ہے، چاہیے کہ وہ اسے چکھیں یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی العذاب ھذا۔ یاھذا مبتدا ہے اور حمیم اس کی خبر ہے۔ فراء نے یہی ترکیب کی ہے۔ اس آخری ترکیب کی صورت میں فلیذوقوہ کا جملہ معترضہ ہوگا اور سابقہ تاویلات کی صورت میں حمیم' مبتدا محذوف ھو کی خبر ہوگا۔ حمیم' انتہائی گرم پانی کو کہتے ہیں۔ غساق کا عطف حمیم پر ہے۔ حمزہ' کسائی اور حفص نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے' بروزن فعال جیسے خباز اور طباخ۔ جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ عذاب کی طرح فعال کے وزن پر پڑھا ہے۔

غساق کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ انتہائی ٹھنڈک ہے جو دوزخیوں کو اس طرح جلائے گی جیسے آگ ان کو جلائے گی (1)۔

مجاہد اور مقاتل فرماتے ہیں اس سے مراد وہ چیز ہے جو انتہائی ٹھنڈی ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں لغت ترک میں اس کا معنی بدبودار چیز ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ چیز جو بہے، یعنی دوزخیوں کی کھالوں اور گوشت سے بہنے والی پیپ اور زانیوں کی شرمگاہوں سے نکلنے والا بدبودار مادہ (2)۔ یہ غسقت سے مشتق ہے جس کا معنی بہنا ہے اور غساق کا معنی انصاب (بہنا) ہے۔

بیہقی نے عطیہ سے روایت کیا ہے کہ غساق سے مراد بہنے والی پیپ ہے (3)۔ اسی طرح ابراہیم اور ابورزین کا قول نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم' ابن ابی الدنیا اور الضیاء نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے کہ غساق جہنم میں ایک چشمہ ہے جس کی طرف سانپ' بچھو وغیرہ ہر زہریلے جانور کا زہر بہہ کر جاتا ہے (4) پھر ایک شخص کو لایا جائے گا اور اسے غوطہ دیا جائے گا وہ نکلے گا تو اس کی جلد ہڈیوں سے گر چکی ہوگی اور اس کی جلد اور گوشت اس کے ٹخنوں سے معلق ہوگا اور وہ اس طرح اپنے گوشت کو گھسیٹ رہا ہوگا جیسے انسان اپنے کپڑے کو زمین پر گھسیٹ کر چلتا ہے۔

وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾

''اور اس کے علاوہ اس کی مانند طرح طرح کا عذاب ہے لے''

لے ابوعمرو اور ابوجعفر نے ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ اخری کی جمع ہے جیسے کبریٰ اور کبر۔ ابوعبیدہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کیونکہ اس کی صفت ازواج بھی جمع ہے۔ باقی قراء نے ہمزہ کے فتحہ اور اس کے بعد الف کے ساتھ مفرد پڑھا ہے، یعنی عذاب اخر یا مذوق اخر۔ مِنْ شَكْلِهٖۤ آخر کی صفت ہے، یعنی حمیم اور غساق کی مثل۔ مفرد ضمیر ما ذکر کے لئے ہے یا شراب کے لئے ہے جو حمیم اور غساق کو شامل ہے۔ ضمیر مفرد عذاب کے لئے ہے۔ ازواج کا معنی ہے قسم قسم کا۔ یہ آخر کی خبر ہے یا اس کی صفت ہے یا مذکورہ تینوں اسماء کی صفت ہے یا جار مجرور کے ساتھ مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے جو ھم ہے۔

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾

''۔۔ (لو) دوسری فوج گھسا جاتی ہے تمہارے ساتھ کوئی خوش آمدید نہیں انہیں یہ ضرور آگ تاپنے والے ہیں لے''

ابن عباس فرماتے ہیں یہ کلام دوزخ کے دروغے دوزخیوں کے قائدین سے کریں گے۔ لیڈر اور قائدین جب آگ میں داخل ہوں گے اور پھر ان کے پیروکار داخل ہوں گے تو دوزخ کے داروغے قائدین سے مخاطب ہو کر یہ کہیں گے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کلام قائدین اور لیڈر آپس میں کریں گے، یعنی یہ پیروکاروں کی فوج بھی آگ میں تمہارے ساتھ گھسنا چاہتی ہے۔ اقتحام کا معنی کسی شی میں اپنے آپ کو دھکیل دینا ہے۔ کلبی کہتے ہیں دوزخیوں کو پہلے گرز مارے جائیں گے حتیٰ کہ وہ گرزوں کے خوف سے خود بخود دوزخ میں چھلانگیں لگائیں گے (2)۔ میں کہتا ہوں اس کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین لوگوں کو آگ میں گرنے سے روک رہے ہیں اور آگ کا موجب بننے والے اعمال سے منع کر رہے ہیں لیکن لوگ برائیوں میں ملوث ہو کر دوزخ میں گھسنا چاہتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری مثال اس شخص کی ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب اس کا اردگرد روشن ہو گیا تو پتنگے اور کیڑے اس آگ میں گرنا شروع ہو گئے۔ میں انہیں اس آگ سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ اس پر غالب آجاتے ہیں اور وہ اس آگ میں گھس جاتے ہیں۔ فرمایا یہ میری اور تمہاری مثال ہے، میں تمہیں آگ سے بچانے کے لئے پیچھے سے روکتا ہوں (اور کہتا ہوں) آگ سے بچو آگ سے بچو لیکن تم مجھ پر غالب آجاتے ہو اور اس آگ میں گھس جاتے ہو (بخاری و مسلم) (3)

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ کا جملہ قول کی تقدیر کے ساتھ جملہ مستانفہ ہے، یعنی بعض سرکش دوسروں کے متعلق کہیں گے کہ یہ جماعت بھی تمہارے ساتھ گھسنا چاہتی ہے یا لیڈروں اور رؤسا کو کہا جائے گا کہ تمہارے متبعین آگ میں تمہارے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لیڈر کہیں گے لا مرحبا بهم۔ ان متبعین کو خوش آمدید نہ ہو۔ یہ متبوعین کی اپنے متبعین کے لئے بددعا ہے اور یہ جملہ قول کی تقدیر کے ساتھ ماقبل کلام کے ساتھ متصل ہے۔

اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ کا جملہ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی وہ بھی اپنے اعمال کی وجہ سے ہماری طرح اس آگ میں داخل ہونے والے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ فوج کی صفت ہے یا حال ہے، یعنی انہیں کہا جائے گا انہیں خوش آمدید نہ ہو۔ عرب آنے والے کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں مرحبا، یعنی تو وسیع اور کھلے مکان میں آیا جس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ الرحب کا معنی وسعت ہے۔ اس لفظ (مرحبا) سے آنے والے کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اور جس کے لئے بددعا کرنی ہو اسے عرب کہتے ہیں لا مرحبا۔ یعنی اس کی حقارت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔ آیت میں بهم کا کلمہ ان کے بیان کے لئے ہے جن کے لئے بددعا کی گئی ہے۔

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۫ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝۶۰

''وہ کہیں گے (ظالمو!) تمہیں کوئی خوش آمدید نہ ہو تم نے ہی آگے کیا اس عذاب کو ہمارے لئے سو بہت برا ٹھکانہ ہے ۔''

یہ علیحدہ کلام ہے، یعنی اتباع کرنے والے اپنی قائدین سے کہیں گے کہ تم جو کچھ ہمیں کہہ رہے ہو یا ہمارے متعلق کہا گیا ہے تم اس کے زیادہ مستحق ہو کیونکہ خود بھی گمراہ تھے اور ہمیں بھی تم نے گمراہ کیا۔ یہ عذاب تم نے ہمارے لئے آگے کیا کیونکہ تم ہی ہمیں کفر کی طرف دعوت دینے والے تھے۔ ہمارے اور تمہارے لئے یہ جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔

قَالُوۡا رَبَّنَا مَنۡ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدۡهُ عَذَابًا ضِعۡفًا فِى النَّارِ ﴿۶۱﴾

”کہیں گے اے ہمارے رب! جس (بدبخت) نے آگے کیا ہے ہمارے لئے یہ عذاب پس بڑھادے اس کا عذاب دوگنا آگ میں۔ ۱؎“

۱؎ یہ مستانفہ جملہ ہے، یعنی اتباع کرنے والے یہ کہیں گے، یعنی جو بدبخت ہماری اسی سزا اور عذاب کا باعث بنا اس کو دوہرا عذاب دے۔

وَقَالُوۡا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمۡ مِّنَ الۡاَشۡرَارِ ﴿۶۲﴾

”اور کہیں گے کیا وجہ ہے کہ ہمیں نظر نہیں آ رہے (یہاں) وہ لوگ جنہیں ہم شمار کرتے تھے برے لوگوں میں ۱؎۔“

۱؎ لا نری کا جملہ لنا کی ضمیر متکلم سے حال ہے اور اس کا عامل فعل کا معنی ہے۔ اشرار جمع ہے شریر کی۔ شر، خیر کی ضد ہے اور خیر وہ چیز ہوتی ہے جس میں ہر شخص رغبت رکھتا ہے اور شر وہ ہوتا ہے جسے ہر شخص ناپسند کرتا ہے، یعنی کافر کہیں گے کیا وجہ ہے کہ دنیا میں جنہیں ہم ناپسند کرتے تھے اور جنہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہے۔ ان کی مراد خبیب، بلال، صہیب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے مومن فقراء ہوں گے جن سے دنیا میں یہ دولت کے نشے میں مست لوگ مذاق کرتے تھے اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اَتَّخَذۡنٰهُمۡ سِخۡرِيًّا اَمۡ زَاغَتۡ عَنۡهُمُ الۡاَبۡصَارُ ﴿۶۳﴾

”ہم جن کا تمسخر اڑایا کرتے تھے ۱؎ یا پھر گئی ہیں ان کی طرف سے ہماری آنکھیں ۲؎“

۱؎ اہل بصرہ، حمزہ اور کسائی نے ہمزہ وصلی کے ساتھ اَتَّخَذۡنٰهُمۡ پڑھا ہے اس حیثیت سے کہ یہ رجالا کی دوسری صفت ہے یا قد کی تقدیر کے ساتھ حال ہے یا کنا کی دوسری خبر ہے۔ اہل حجاز، ابن عامر اور عاصم نے استفہام کی بناء پر ھمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ ان سے مذاق کرنے میں اپنے اوپر انکار کر رہے ہیں۔ نافع، حمزہ اور کسائی نے سخریا کو سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ سورۃ المومنین میں گزر چکا ہے اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ فراء کہتے ہیں یہ استفہام تعجب اور توبیخ کے معنی میں ہے (۱) اور مالنا لا نری کے قول سے مفہوم مقدر جملہ میں ھمزہ کے لئے ام معادلہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی مَا لَنَا لَا نَرٰى هٰؤُلَاءِ الَّذِيۡنَ اتَّخَذۡنَا هُمۡ سِخۡرِيًّا اَلَيۡسُوۡا هٰهُنَا اَمۡ زَاغَتۡ عَنۡهُمۡ اَبۡصَارُنَا فَلَمۡ نَرَهُمۡ وَهُمۡ هٰهُنَا۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو نہیں دیکھ رہے جن سے ہم مذاق کرتے تھے۔ کیا وہ یہاں نہیں ہیں یا ہماری آنکھیں ان سے پھر گئی ہیں پس ہمیں وہ نظر نہیں آ رہے جبکہ وہ یہاں موجود ہیں یا دوسری قرأت کے مطابق اتخذناھم کا ہمزہ اَیُّ الۡاَمۡرِ مَا فَعَلۡنَا بِهِمۡ مِنَ الۡاِسۡتِسۡخَارِ مِنۡهُمۡ اَمۡ تَحۡقِيۡرِهِمۡ کے معنی میں ہوگا، یعنی اپنے نفسوں پر مذاق اڑانے اور ان کی تحقیر کرنے کا انکار کر رہے ہیں کیونکہ آنکھ کا بھٹکنا اسی مفہوم سے کنایہ ہے۔ یا ام منقطعہ ہے اور مراد ان کو ذلیل سمجھنے اور ان سے مذاح کرنے پر دلالت کرتا ہے، یعنی ہماری نگاہوں کا ٹیڑھا پن تھا اور ہماری نظروں کا قصور تھا کہ ہم ان کی ظاہری بوسیدہ حالت کو تکتے رہے [illegible] تھے وہ ہمیں نظر نہ آئے) ابن کیسان کہتے ہیں

کے جوہر باطن کو دیکھنے سے قاصر رہیں(1)۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾

''یقیناً یہ سچ ہے دوزخی آپس میں جھگڑیں گے لے''۔

لے یعنی دوزخیوں کے متعلق جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ یقیناً ہوگا، ان کا آپس میں یہ مکالمہ ضرور ہوگا۔ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ، حق سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے' دوزخیوں کا آپس میں جو سوال و جواب ہوگا اس کو جھگڑنے والوں کے درمیان جاری ہونے والی کلام سے تشبیہ دی گئی ہے اس لئے اس کو تَخَاصُمُ فرمایا اس لئے کہ قائدین اپنے متبعین سے کہیں گے لا مرحبا هم اور متبعین قائدین سے کہیں گے بل انتم لا مرحبا بكم تو یہ جھگڑا ہے اس لئے ان کی ساری گفتگو کو جھگڑے سے تعبیر فرمایا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾

''(اے حبیب!) آپ فرمایئے میں تو فقط ڈرانے والا ہوں اور نہیں ہے کوئی خدا مگر اللہ جو ایک ہے سب پر غالب ہے لے''

لے قل اپنے مقولہ سے مل کر جملہ مستانفہ ہے اور انما قصر قلب کے لئے ہے اور یہ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿﴾ کے ساتھ متصل ہے، یعنی میں ساحر و کذاب نہیں ہوں بلکہ میں تو عذاب الٰہی سے بروقت متنبہ کرنے والا ہوں ما من اله الا الله کا عطف انما پر ہے اور یہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا کے ساتھ متصل ہے۔ الواحد یعنی اللہ ایک ہے وہ اپنی ذات اور صفات میں شرکت کو قبول نہیں فرماتا، وہ ہر چیز پر غالب ہے۔ یہ کلام کفار کے لئے وعید ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾

''مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے عزت والا بہت بخشنے والا لے''

لے عزیز کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ کسی کو سزا دے تو اسے کوئی مغلوب کرنے والا نہیں۔ الْغَفَّارُ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے چھوٹے بڑے سب گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ ان اوصاف کے ذکر میں توحید کا ثبوت' موحدین کے لئے وعدہ اور مشرکین کے لئے وعید ہے۔ نیز پہلے تو قھر کی صفت ذکر کی گئی تھی اس سے جو شبہ اور وہم پیدا ہوتا تھا ان صفات سے اس شبہ کا ازالہ ہو گیا۔ (کہ یعنی وہ صرف صفت قھر سے متصف نہیں بلکہ اپنے اطاعت گزار بندوں کے لئے غفار بھی ہے)

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿٦٧﴾

''فرمایئے یہ بڑی اہم اور عظیم خبر ہے۔ لے''

لے ابن عباس' مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس آیت میں ھو کا مرجع قرآن ہے(2) بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مرجع قیامت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿﴾ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ﴿﴾ میں قیامت کو نباء عظیم فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے تمہیں بتایا کہ میں تمہیں اس ذات کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں جو اس صفت سے متصف ہے، وہ معبود برحق الوہیت میں یکتا

اَنۡتُمۡ عَنۡهُ مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۶۸﴾

''تم اس سے منہ موڑے ہوئے ہو۔ ۱؎''

۱؎ یہ جملہ نباء کی دوسری صفت ہے۔ یعنی تم اپنی انتہائی غفلت کی وجہ سے اس سے منہ موڑے ہوئے ہو حالانکہ عقلمند کے لئے ایسی بات سے اعراض درست نہیں ہوتا، جبکہ اس کی حقیقت پر بڑے واضح دلائل قائم ہو چکے ہیں۔

توحید کا تذکرہ تو پہلے گزر چکا ہے اور نبوت پر آئندہ ارشادات دلالت کر رہے ہیں۔

مَا كَانَ لِيَ مِنۡ عِلۡمٍۢ بِالۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰٓى اِذۡ يَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۶۹﴾

''مجھے کوئی علم نہ تھا عالم بالا کے بارے میں جب وہ جھگڑ رہے تھے ۱؎''

۱؎ لی کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ملاء اعلی سے مراد فرشتے ہیں کیونکہ ملائکہ کی باتوں کے متعلق خبر دینا جو پہلی کتب میں وارد باتوں کے موافق ہوں اور پھر اس شخص کا خبر دینا جس نے نہ ملائکہ کی باتیں سنی ہوں اور نہ کتابوں کا مطالعہ کیا ہو تو یقیناً ایسی باتیں اسے صرف اور صرف وحی سے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں فرشتوں کے جھگڑے سے مراد آدم علیہ السلام کے شان کے متعلق جھگڑا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنِّيۡ جَاعِلٌ فِي الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ (میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب کہنے لگے کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خونریزیاں کرے گا)

حدیث شریف میں حضرت عبدالرحمٰن بن عائش الحضرمی سے مروی ہے، فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے رب کو انتہائی حسین صورت میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرشتے کس بات میں جھگڑ رہے ہیں، میں نے عرض کی اے میرے پروردگار تو بہتر جانتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی میں نے اس کی ٹھنڈک کو اپنے سینے میں پایا تو جو کچھ آسمان اور زمین میں تھا میں جان گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَكَذٰلِكَ نُرِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلِيَكُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِيۡنَ ﴿۷۵﴾ (اور اسی طرح ہم نے دکھا دی ابراہیم کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں) پھر اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آسمان کے فرشتے کس بات میں جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے عرض کی کفارات میں بحث کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا کفارات کیا ہیں؟ میں نے عرض کی جماعت کی طرف پیدل چل کر جانا' نمازوں کے بعد مساجد میں دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھنا اور تکلیف کی جگہوں میں مکمل وضو کرنا' فرمایا جو ایسا کرے گا خیر کے ساتھ زندہ رہے گا اور خیر کے ساتھ مرے گا اور اس کے گناہ اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے اس دن جس میں ماں نے اسے جنا تھا اور درجات میں سے ہے' کھانا کھلانا' سلام کا پھیرنا اور رات کو اس وقت قیام کرنا، جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس طرح دعا مانگو اَللّٰهُمَّ اِنِّيۡ

[illegible] وَاِذَا اَرَدْتَّ فِتْنَةً

تو مجھے بغیر آزمائش میں ڈالے اپنی بارگاہ میں بلالے)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے یہ سب باتیں حق اور سچ ہیں(1)۔

اس حدیث کو بغوی نے شرح السنۃ اور اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو دارمی نے من الموقنین تک روایت کیا ہے۔ ترمذی نے عبدالرحمٰن بن عائش سے بغوی کی طرح یہی حدیث روایت کی ہے۔ امام ترمذی نے ابن عباس اور معاذ بن جبل سے بھی اس کے ہم معنی عبارت کی کچھ تبدیلی کے ساتھ روایت کی ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فرشتوں کی کفارات میں بحث وتمحیص سے مراد وہ تمام اعمال ہوں جو لکھنے میں فرشتے ایک دوسرے سے جلدی کرتے ہیں اور ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے رحمان کی بارگاہ میں میں انہیں پیش کروں جیسا کہ رفاعہ بن رافع کی حدیث میں ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے سر اٹھایا تو کہا سمع اللہ لمن حمده، پیچھے سے ایک شخص نے کہا ربنا ولک الحمد حمدا کثیراً طیباً مبارکاً فیه. جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو فرمایا میرے پیچھے ابھی یہ کلمات کس نے پڑھے ہیں؟ اس شخص نے کہا حضور میں نے پڑھے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیس 30 سے کچھ زائد فرشتے ان کلمات کو لکھنے میں جلدی کررہے تھے کہ کون پہلے انہیں لکھتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ اذ علم کی ظرف ہے یا محذوف کے متعلق ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی مِنْ عِلْمٍ بِكَلَامِ الْمَلَاءِ الْأَعْلٰى۔

اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَیَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾

"نہیں وحی کی جاتی میری طرف مگر یہ کہ میں فقط کھلا ڈرانے والا ہوں۔ لے"

لے انما اپنے جملہ سے مل کر یا تو محل رفع میں ہے کیونکہ یوحی کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یا محل نصب میں ہے اور یہ اعراب علیت کی بناء پر ہے اور اس صورت میں یوحی فعل سے مفہوم مصدر کی طرف منسوب ہوگا، یعنی مَا اُوْحِيَ اِلَیَّ اِلَّا الْاِنْذَارُ الْمُبِيْنُ اَوْ مَا اُوْحِيَ اِلَیَّ وَ حْيٌ اِلَّا لِاَجْلِ الْاِنْذَارِ (میری طرف وحی نہیں کی جاتی مگر واضح ڈرانا یا میری طرف وحی نہیں کی جاتی مگر ڈرانے کے لئے) اور رسول بنا کر بھیجنے کا مقصود بھی یہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں النبأ العظیم سے مراد آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ ہے اور بغیر نے اس واقعہ کی خبر دینا ہے۔ الملاء الاعلیٰ سے مراد ملائکہ آدم علیہ السلام اور ابلیس ہیں جو اس واقعہ سے متعلق ہیں کیونکہ وہی آسمان میں تھے اور ان کے درمیان گفتگو تھی۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿۷۱﴾

"(اے حبیب!) یاد فرمایئے جب کہا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے۔ لے"

لے اِذْ قَالَ، اذ یختصمون سے بدل ہے اور اس کا بیان ہے کیونکہ یہ واقعہ جس پر اذ داخل ہوا ہے۔ ملائکہ اور ابلیس کی اس گفتگو پر مشتمل ہے جو انہوں نے آدم علیہ السلام کی تخلیق، ان کے خلافت کے استحقاق اور ان کو سجدہ کرنے کے متعلق کی تھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ

مشرکین کو تکبر اور ہٹ دھرمی کی سزا سے ڈرانا ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کبر و بڑائی کا مظاہرہ نہ کرو ورنہ تمہیں بھی اسی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا جس میں ابلیس کو مبتلا کیا گیا تھا، جب اس نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے تکبر کیا تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان سے گفتگو کرنا کسی فرشتے کے واسطہ سے ہو یا ملاء اعلیٰ سے مراد عام ہو جو اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو شامل ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اذ' اذکر کی وجہ سے منصوب ہو۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾

''پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے [1]''

[1] سَوَّيْتُهٗ کا معنی اتممت خلقه ہے، یعنی جب میں اس کی تخلیق مکمل کر دوں۔ آدم علیہ السلام کو شرف عطا کرنے یا روح کو شرف بخشنے کے لئے روح کو اپنی طرف مضاف فرمایا۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾

''پھر سجدہ کیا سب کے سب فرشتوں نے۔ [1]''

[1] سجد کا عطف قال ربک پر ہے۔

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾

''سوائے ابلیس کے اس نے گھمنڈ کیا اور ہو گیا کافروں میں سے۔ [1]''

[1] اِسْتَكْبَرَ' استثناء کی علت بیان کر رہا ہے اور کان بمعنی صار ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تکبر کرنے کی وجہ سے یا اس کی اطاعت سے تکبر کرنے کی وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا یا علم الٰہی میں تھا کہ وہ کافروں میں سے ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾

''ارشاد ہوا اے ابلیس! کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے [1] کیا تو نے تکبر کیا یا تو اپنے آپ کو اس سے عالی مرتبہ خیال کرتا ہے [2]''

[1] بِيَدَيَّ کا کلمہ متشابہات میں سے ہے' سلف صالحین اس کی کوئی تاویل نہیں کرتے تھے' وہ فقط اس پر ایمان رکھتے تھے اور اس کا مراد و مفہوم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے تھے، جبکہ متاخرین علماء اس کی تاویل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آدم (علیہ السلام) کو ماں' باپ کے واسطہ کے بغیر پیدا فرمایا اور ید کا تثنیہ ذکر فرمایا تا کہ اس کی تخلیق میں مزید قدرت کا اظہار ہو جائے اور پھر آدم علیہ السلام کے بغیر واسطہ کے اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہونے پر اس کے انکار کو مرتب فرمایا تا کہ یہ شعور ملے کہ اس قادر مطلق کی تخلیق ہونا اس

غلاموں کے لئے بعض کو خادم بنادے خصوصاً جس کو کوئی خصوصیت حاصل ہے اس کے لئے دوسروں کو خدمت بجالانے کا حکم دے دے تو یہ کوئی قبیح امر نہیں ہے۔

۲ ہمزہ استفہام توبیخ اور انکار کے لئے ہے جو ہمزہ وصلی پر داخل ہوا ہے۔ یعنی کیا تو نے بغیر استحقاق کے تکبر کیا ہے یا تو ان میں سے ہے جو تفوق اور برتری کے حقدار ہیں۔ پہلی شق پر توبیخ ہے اور دوسری پر انکار ہے (یعنی اگر محض تکبر کی بناء پر سجدہ کرنے سے انکار کیا ہے تو تو نے بہت برا کیا ہے اور اگر تو نے یہ سمجھا کہ یہ حکم کم درجہ فرشتوں کو ہے یہ بھی تیری کم فہمی ہے)

قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ ؕ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّکَ رَجِیۡمٌ ﴿ۚۖ۷۷﴾

"وہ (گستاخ) بولا میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا ہے مجھے آگ سے اور پیدا کیا ہے اسے کیچڑ سے۔ حکم ملا (اے بے حیا) نکل جا جنت سے بیشک تو پھٹکارا گیا۔ ۱"

۱ مِنۡهَا کی ضمیر کا مرجع جنت ہے۔ بعض کے نزدیک آسمان ہیں۔ حسن اور ابوالعالیہ فرماتے ہیں اس کی وہ خلقت مراد ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا تھا۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں یہ تاویل صحیح ہے کیونکہ ابلیس نے اپنی خلقت کی وجہ سے تکبر کیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی خلقت میں تبدیلی فرمادی' وہ کالا سیاہ اور انتہائی بدصورت ہو گیا، جبکہ پہلے بڑا حسین تھا(1)۔ فَاِنَّکَ رَجِیۡمٌ نکل جانے کے حکم کی علت ہے، یعنی تو بھلائی کے ساتھ نہ ہو گا۔

وَّ اِنَّ عَلَیۡکَ لَعۡنَتِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۷۸﴾

"اور بیشک تجھ پر میری لعنت برسے گی قیامت تک ۱"

۱ لَعۡنَتِیۡۤ کو نافع نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ جب قیامت آئے گی تو لعنت ختم ہو جائے گی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس پر صرف لعنت قیامت تک ہے لیکن پھر لعنت کے ساتھ عذاب بھی مل جائے گا۔

قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۷۹﴾

"ابلیس بولا (اگر یہی اٹل فیصلہ ہے) تو میرے رب مجھے مہلت دیجئے روز حشر تک۔ ۱"

۱ فَاَنۡظِرۡ پر فاء سببیت کے لئے ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کی دشمنی کی وجہ سے اسے دھتکارا گیا تھا اس لئے اس نے مہلت طلب کی تا کہ بنی آدم کو راہ راست سے بھٹکا تا رہے۔

قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿ۙ۸۰﴾

"جواب ملا بیشک تو مہلت دیئے جانے والوں میں سے ہے۔ ۱"

۱ انک پر فاء سببیت کے لئے ہے کیونکہ اس کا سوال اس جواب کا سبب تھا۔ جملہ اسمیہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو مہلت دینے

إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٨١﴾

"(یہ مہلت) مقررہ وقت کے دن تک ہے۔[1]"

[1] وقت مقررہ سے مراد نفخہ اولیٰ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سورۂ حجر میں گزر چکی ہے۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾

"کہنے لگا تیری عزت کی قسم! میں ضرور گمراہ کردوں گا ان سب کو۔[1]"

[1] یہاں بھی فاء سببیت کے لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اس کو مہلت دینا اس کے لوگوں کے گمراہ کرنے کے عزم کے سبب تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت نہ ہوتی تو وہ کبھی لوگوں کے گمراہ کرنے پر قادر نہ ہوتا۔ لعین نے اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم اٹھائی تا کہ یہ اس کی مراد پر تسلط اور غلبہ کا وسیلہ بن جائے۔

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾

"سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے تو نے چن لیا ہے۔[1]"

[1] یعنی جن بندوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کرنے اور گمراہی سے بچانے کے لئے منتخب فرمالیا ہے یا یہ معنی کہ جنہوں نے اپنے دلوں کو اللہ کے لئے خاص کر دیا ہے۔ یہ دونوں مفہوم قرأتوں کے اختلاف کی بناء پر ہیں۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور ابن عامر نے الْمُخْلِصِينَ کو لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ﴿٨٤﴾

"فرمایا تو میں حق ہوں[1] اور میں سچ ہی کہتا ہوں[2]"

[1] فَالْحَقُّ کو عاصم، حمزہ اور یعقوب نے مبتدا محذوف کی خبر کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے یعنی انا الحق یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور الحق اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الحق یمینی او قسمی۔ باقی قراء نے حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب پڑھا ہے، یعنی حرف قسم حذف کیا گیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو فاحق الحق۔

[2] الحق قول، جملہ معترضہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قسم کے تکرار کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم اٹھائی۔

لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٥﴾

"میں ضرور بھردوں گا جہنم کو تجھ سے اور تیرے سب فرمانبرداروں سے۔[1]"

[1] یہ جملہ جواب قسم ہے اور منک سے مراد من جنسک ہے تا کہ تمام شیطانوں کو شامل ہو جائے۔ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ سے مراد بنی آدم ہیں۔ یعنی تم میں سے اور ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ من تبعک سے مراد کفار ہیں۔ اگر سابقہ جملہ کی تقدیر انا الحق یا احق الحق ہو تو یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہوگا۔ اجمعین دونوں ضمیروں کی تاکید ہے۔

1. علیہ کی ضمیر کا مرجع انداز یا قرآن ہے یعنی میں تم سے انجام بد سے ڈرانے اور قرآن سنانے پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتا اور نہ تو میں قرآن اپنی طرف سے گھڑنے والا ہوں یا یہ معنی کہ تم میرے حال سے واقف ہو۔ میں اپنے لئے کسی ایسی بات کا دعویٰ نہیں کرتا جو میرے پاس نہ ہو۔ یعنی میں بغیر حقیقت کے نبوت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ الخ کا جملہ سابقہ جملوں کے مضامین کو ثابت کرنے والا ہے۔

امام بخاری نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہمیں تکلف کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ علامہ بغوی نے مسروق سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا اے لوگو! جسے کسی بات کا علم ہو وہ اسے کہہ دینی چاہئے اور جو نہ جانتا ہو، اسے جواب میں اللہ اعلم کہنا چاہیے کیونکہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے متعلق اللہ اعلم کہنا بھی علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ارشاد فرمایا اے محبوب تم کہہ دو میں تم سے کسی اجر کا سوال نہیں کرتا اور نہ میں جھوٹے مدعین میں سے ہوں(1)۔ میں کہتا ہوں ما انا من المتکلفین ما اسئلکم الخ کے مضمون کی تاکید ہے کیونکہ جو کسی سے اجر کا سوال نہیں کرتا اسے بات میں تکلف کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾

''نہیں ہے یہ (قرآن) مگر نصیحت سب جہانوں کے لئے۔ 1''

1. ھُوَ کا مرجع قرآن ہے، عالمین سے مراد جن وانس ہیں۔ یعنی یہ قرآن جو تمام جہانوں کے لئے موعظت ہے میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور میں اس کی تبلیغ کرتا ہوں۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾

''اور (اے کفار) تم ضرور جان لو گے اس کی خبر کچھ عرصہ بعد۔ 1''

1. یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ یعنی قرآن میں جو وعدہ اور وعید ہے اس کو جان لو گے یا اس کی صداقت کا تم اعتراف کر لو گے۔ ابن عباس اور قتادہ فرماتے ہیں بعد حین سے مراد بعد الموت ہے، یعنی مرنے کے بعد تم اس کی حقیقتوں کو جان لو گے۔ عکرمہ فرماتے ہیں بعد حین سے مراد قیامت کا دن ہے۔ حسن فرماتے ہیں اے ابن آدم مرنے کے بعد تیرے پاس یقینی خبر آ جائے گی(2)۔

☆

سورۂ ص کی تفسیر المظہر ی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے 1207 ہجری کو مکمل ہوئی اور اس کے بعد ان شاء اللہ سورۃ الزمر کی تفسیر ہو گی۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر عنایت سے سورۂ ص کی تفسیر مظہری کا ترجمہ 6 فروری 2001ء بروز بدھ بعد نماز عشاء 10:45 اختتام کو پہنچا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ اَوْلِيَاءِ اُمَّتِهٖ وَ

اے مالک الملک ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں منظور و مقبول فرما اور ہمارے عیوب پر پردہ فرما دے اور ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دور فرما دے، ہمارے گناہوں پر قلم عفو پھیر دے۔ تو غنی ہے، مغنی ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، غفار ہے، ستار ہے۔ اے ہمارے پروردگار میرے والدین پر اپنی خصوصی رحمت فرما ان کا سایہ عاطفت تادیر میرے سر پر قائم فرما۔ یا حی یا قیوم میری اولاد کو نیک سیرت بنا' انہیں دین اور قرآن کی نعمت عطا فرما۔ اے کریم ان کی دنیا بھی بہتر فرما اور آخرت بھی بہتر فرما۔ اے کریم دارالعلوم محمدیہ غوثیہ اور اس کی برانچوں میں پڑھانے والے اساتذہ' پڑھنے والے طلباء اور ان کے معاونین پر ہمیشہ کرم و احسان فرمائے رکھ۔ اے کریم میرے مرشد کریم کے آستانہ عالیہ کو اپنے ذکر اور اپنے دین کی خدمت سے آباد رکھنا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

سورة الزمر

آیاتہا ۷۵ سُوْرَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ ۳۹ رکوعاتہا ۸

سورۃ الزمر مکی ہے، اس میں پچھتر آیات اور آٹھ رکوع ہیں

قول باری تعالیٰ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا الآیہ کے سوا سورہ زمر مکی ہے، اس کی 75 آیات ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی 72 آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝

''اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ کی طرف سے جو عزیز (اور) حکیم ہے [1] ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ پس آپ عبادت کریں اللہ کی خالص کرتے ہوئے اس کے لئے اطاعت کو [2]۔''

[1] تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو کہ ھذا ہے۔ یا پھر یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ہے۔ عزیز کا معنی ہے کہ وہ اپنی ملکیت اور بادشاہی میں غالب ہے اور حکیم کا معنی ہے کہ وہ اپنی صنعت و کاریگری میں حکیم اور دانا ہے۔ پہلی ترکیب کے مطابق مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ تَنْزِيْلُ کے متعلق ہے۔ یا دوسری خبر ہے یا حال ہے اور اس میں عامل معنی اشارہ یا تنزیل ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر اور واضح ہے کہ پہلی ترکیب کے مطابق کتاب سے مراد سورت ہے اور دوسری کے مطابق قرآن کریم ہے۔

[2] بِالْحَقِّ سے مراد متلبسا بالحق۔ یعنی ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے یہ کتاب درآنحالیکہ یہ حق کے ساتھ مقترن اور ملی ہوئی ہے۔ یا اس کا معنی ہے۔ بِسَبَبِ اِثْبَاتِ الْحَقِّ وَ اِظْهَارِهٖ وَ تَفْصِيْلِهٖ۔ یعنی ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے یہ کتاب حق کو ثابت کرنے، اسے ظاہر کرنے اور اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے۔ اس میں اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ کے ساتھ تنزیل کا تکرار لازم نہیں آتا کیونکہ تنزیل تو بطور عنوان ہے اور انزال جو کچھ کتاب میں ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ہے۔

مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت شرک اور ریاکاری سے پاک ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ خبر کی تقدیم اس معنی اختصاص کی تاکید کے لئے ہے جس کا فائدہ لام دے رہا ہے گویا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اسے صراحۃً مؤکد ذکر کیا گیا ہو۔ یا پھر اسے (عبادت کے خالص معنی کو) دلائل کی کثرت اور براہین کے ظاہر و باہر ہونے کے سبب علوم مقرر و محقق کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور کوئی حرف تاکید ذکر نہیں کیا۔

إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۗ إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿٣﴾

”خبردار! صرف اللہ کے لئے ہے دین خالص ۱؎ اور جنہوں نے بنا لئے اس کے سوا اور والی (اور کہتے ہیں) ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان جن باتوں میں یہ اختلاف کیا کرتے ہیں۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ۲؎ اس کو جو جھوٹا (اور) بڑا ناشکرا ہو ۳؎۔“

۱؎ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ جملہ معترضہ ہے اور یہ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ امر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص اور لازم ہے کہ طاعت و عبادت خالصۃً اسی کے لئے ہو کیونکہ وہی صفات الوہیت میں منفرد ہے اور اسرار و رموز پر اطلاع پانے اور دل میں چھپی باتوں پر آگاہ ہونے میں یکتا ہے۔

۲؎ اور وہ کفار جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور والی بنا لئے ہیں اور کہتے ہیں ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر محض اس لئے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا مقرب بنا دیں۔ ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی قرأت اسی طرح ہے۔ گویا نعبدهم سے پہلے قالوا فعل مقدر ہے جو کہ ترکیب کلام میں اتخذوا اصلہ سے بدل ہے یا پھر قالوا سے قبل قد مقدر ہے اور جملہ اتخذوا کے فاعل سے حال ہے۔

زلفی مصدر ہے جو قربیٰ کے معنی میں ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ زلفیٰ اسم ہے جسے مصدر کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا ليقربونآ الى الله تقريباً(1) (یعنی زلفیٰ ترکیب کلام میں مفعول مطلق ہے) یا حال ہے۔ الذین اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے اور اس کی خبر ان الله يحكم بينهم ہے۔ یعنی جن دینی امور کے بارے میں یہ اختلاف کیا کرتے ہیں قیامت کے دن ان کے بارے اللہ تعالیٰ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اس طرح کہ وہ حق کی راہ اختیار کرنے والوں کو جنت میں داخل فرمائے گا اور باطل پرستوں کو جہنم کے حوالے کرے گا۔ بینهم کی ضمیر کا مرجع کفار اور ان کے مقابل اہل ایمان تمام لوگ ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسم موصول مبتدا کی خبر قالوا کا نعبدهم کا جملہ ہو۔ ان الله يحكم بينهم اور جملہ مستانفہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موصول سے مراد معبودان باطلہ ہوں اور (ضمیر عائد) اور لوٹنے والی ضمیر کلام سے محذوف ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن ملائکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بتوں کو انہوں نے والی (کارساز) بنا رکھا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ اور جملہ مَا نَعْبُدُهُمْ قَالُوْا مقدر کے ساتھ حال واقع ہوگا یا صلہ سے بدل ہوگا۔ اس صورت میں وہ خبر نہیں ہو سکتا۔

جویبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا یہ آیت تین قبیلوں عامرؓ کنانہ اور بنی سلمہ کے بارے نازل ہوئی کیونکہ وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور یہ نظریہ رکھتے تھے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور ساتھ یہ کہتے ہیں مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ (کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اسلئے کرتے ہیں تا کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا مقرب بنا دیں)(2)

کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔ (لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى)(1)

۳؎ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ سے مراد وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بت ہماری سفارش کریں گے۔

کفار سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والے لوگ ہیں۔ اس طرح کہ وہ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو ہدایت دینے کا نہ ارادہ فرمایا ہے نہ فرمائے گا۔ کیونکہ اگر وہ چاہتا تو انہیں بالیقین ہدایت دے دیتا نتیجتًا نہ وہ جھٹلاتے اور نہ کفر کرتے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝

"اگر اللہ چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے تو چن لیتا اپنی مخلوق سے جس کو چاہتا۔ وہ پاک ہے۔ وہی اللہ ہے جو ایک ہے سب سے زبردست ۱؎ اس نے پیدا فرمایا ہے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔ وہ لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر ۲؎ اور اس نے مسخر کر دیا ہے سورج اور چاند کو۔ ہر ایک رواں ہے مقرر میعاد تک۔ غور سے سنو! وہی عزت والا (اور) بہت بخشنے والا ہے ۳؎۔"

۱؎ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے جیسے ان کا گمان ہے تو اپنی مخلوق سے جس کو چاہتا چن لیتا۔ آیت طیبہ میں "ما" موصولہ ہے اور جملے میں اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر منصوب محذوف ہے اور پھر موصول اپنے صلہ کے ساتھ ملکر لا صطفی فعل کا مفعول ہے۔ اور مما یخلق اس سے حال ہے اور اس میں بھی ضمیر عائد منصوب محذوف ہے۔ یعنی ترتیب عبارت اس طرح بنتی ہے لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اِتِّخَاذَ الْوَلَدِ لَا صْطَفٰى مَا يَشَآءُ ہ مِمَّا خَلَقَ۔ کیونکہ جو بھی موجود ہے وہ اس کی مخلوق ہے اور دلائل سے یہ امر ثابت ہے کہ دو کا واجب الوجود ہونا ممتنع ہے اور جو واجب الوجود نہیں اس کی طرف واجب ہونے کی نسبت کرنا بھی ممتنع ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مخلوق خالق کی مثل نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کے بیٹے کے قائم مقام ہو۔ لہٰذا یہ کلام اس قول کی قوت میں ہے لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّا يَتَصَوَّرُ ذَالِكَ۔ (اگر اللہ تعالیٰ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا) کلام سے جزاء کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی دلیل کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مما یخلق میں ما موصولہ کی طرف لوٹنے والی ضمیر مرفوع ہو اور معنی یہ ہو لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَاصْطَفٰى وَلَدًا بِقَدَرٍ عَلٰى خَلْقِ الْاَشْيَاءِ (اگر اللہ تعالیٰ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو وہ کسی کو بیٹا چن لیتا جو چیزوں کی تخلیق پر قادر ہوتا) اور یہ امر محال ہے کیونکہ اس سے الٰھوں کا متعدد ہونا لازم آتا ہے اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی کو بیٹا بنانے کا ارادہ کرنا ممتنع ہے۔ پھر اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے مضبوط اور پختہ کیا کہ سُبْحٰنَهٗ وہ

وجوب کے تابع ہوتی ہے (یعنی اللہ کے لئے واجب الوجود ہونا لازم اور ضروری ہے) اور وجوب ذات وصفات میں یکتا اور منفرد ہونے کو مستزم ہے اور مماثلت ومشارکت کی نفی کرتا ہے (یعنی نہ کوئی اس کی مثل ہوسکتا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی شریک ہوسکتا ہے) تو پھر اس کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ بیٹا تو والد کا ہم جنس ہوتا ہے اس لئے کہ وہ اس کے بعض اجزاء سے بنتا ہے اور اس کی قہاریت کا مطلق ہونا' سب سے زبردست اور قوت والا ہونا بھی اس بات کی نفی کرتا ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو اور اس کا کوئی بیٹا ہو۔ کیونکہ اولاد کی حاجت اسے ہوتی ہے جو زوال پذیر ہو'فناء ہونے والا ہو اور اللہ تعالیٰ تو زوال پذیر ہونے اور فناء ہونے سے پاک اور مبرہ ومنزہ ہے۔

پھر مابعد قول اس پر بطور استدلال ذکر فرمایا۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ الآیۃ

؂ کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، ان میں سے کوئی بیکار اور ناکارہ نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے پیدا فرمایا تا کہ وہ صانع' بنانے والے کی قدرت پر دلیل ہو جائیں۔ وہی رات اور دن میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے سے ڈھانپ لیتا ہے۔ گویا کہ وہ انہیں ایسے ایک دوسرے پر لپیٹ دیتا ہے جیسا کہ لباس اپنے پہننے والے کے ساتھ لپٹ جاتا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سبب غیب کر دیتا ہے۔ جیسا کہ لفافہ کے سبب اس کے اندر موجود چیز غیب ہوتی ہے۔ یا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر مسلسل' لگاتار اور تہہ در تہہ اس طرح رکھ دیتا ہے جیسے عمامہ کے بل تہہ در تہہ اور مسلسل ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ رات اور دن میں سے ہر ایک کو دوسرے کے پیچھے لاتا ہے۔ حسن اور کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رات کو کم کرتا ہے اور دن کو بڑھا دیتا ہے اور پھر دن کو کم کرتا ہے اور رات میں اضافہ کر دیتا ہے (۱)۔

؃ اور اس نے مسخر کر دیا ہے سورج اور چاند کو کہ ان میں سے ہر ایک مقررہ میعاد، یعنی قیامت کے دن تک فلک میں روانی ہے۔ غور سے سنو! وہی غالب ہے اور ہر شئی پر قدرت رکھتا ہے اور بہت بخشنے والا ہے اس طرح کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا اور نہ وہ اس دنیا میں اپنی رحمت ومنفعت سے کسی کو محروم کرتا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝

''اس نے پیدا کیا ہے تمہیں فرد واحد سے پھر بنایا اسی سے اس کا جوڑا ؎ اور پیدا کئے تمہارے لئے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے ؂ وہ پیدا فرماتا ہے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں (تدریجاً) ایک حالت سے دوسری حالت تین اندھیروں میں۔ یہ (قدرت والا) اللہ تمہارا رب ہے' اسی کی حکومت ہے۔ نہیں کوئی معبود بجز اس کے۔ پھر تم کدھر منہ پھیر کر جا رہے ہو ؃۔''

؎ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جنہیں بغیر ماں باپ کے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا) یہ رب کریم کی توحید پر دوسری دلیل ہے کہ اس نے نفس واحدہ سے ہی اس عالم سفلی کو وجود بخشا۔ کلام میں لفظ ثم محذوف کلام پر عطف کے لئے ذکر کیا گیا ہے اور وہ محذوف کلام نفس کی صفت ہے اور وہ ہے خلقها۔

جعل منها زوجها فشفعها بها: ایک نفس کو اکیلا بنایا گیا پھر اس سے جوڑا بنادیا پس اس کے سبب وہ دو ہو گئے (اور پھر ان دو سے تم تمام کو پیدا فرمایا) یا پھر اس کا عطف خلقکم پر ہے۔ اس صورت میں لفظ ثم دو آیتوں کے درمیان تفاوت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں عادت جاریہ کا ذکر ہے، جبکہ دوسری آیت میں اس طرح نہیں بلکہ تخلیق کی دوسری قسم کا اظہار ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ کا معنی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے میثاق لیا تو تمام اولاد آدم کو ان کی پشت سے باہر نکالا پھر انہی سے ان کی زوجہ حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا۔

۲۔ وَاَنْزَلَ لَكُمْ کا معنی ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے فیصلہ فرمایا اور تمہارے لئے بنادیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وہ فیصلے جو لوح محفوظ میں لکھے ہوتے ہیں ان کے نفاذ کو نزول من السمآء سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے یا معنی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے ایسے اسباب کے ساتھ (جانور) پیدا کئے جو اسباب آسمان سے نازل ہوتے ہیں مثلاً ستاروں کی شعائیں اور بارش وغیرہ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے آٹھ جوڑے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت میں پیدا کئے پھر وہاں سے ان کے ساتھ تمہارے فائدہ کے لئے انہیں بھی اتار دیا۔ ثمٰنية ازواج سے مراد آٹھ جوڑے، یعنی آٹھ جانور مذکر و مؤنث) اور وہ اونٹ گائے بھیڑ اور بکری جوڑا جوڑا ہیں۔ ترکیب کلام میں ثمٰنية ازواج، الانعام سے حال ہے۔

۳۔ يَخْلُقُكُمْ الخ یہ سابقہ کلام کی وضاحت کے لئے ہے، جملہ مبینہ ہے۔ یعنی وہ انسانوں اور جانوروں کو اپنی ماؤں کے شکموں میں تدریجاً پیدا فرماتا ہے۔ لیکن ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر ترجیح دیتے ہوئے خطاب صرف انہیں ہی کیا گیا ہے۔ خلقا من م بعد خلق کا معنی ہے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف، یعنی پہلے نطفہ پھر جما ہوا خون پھر گوشت کا لوتھڑا پھر ہڈیاں پھر ان پر گوشت چڑھایا جاتا ہے اور بعد ازاں اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ کا معنی ہے تین تاریکیوں میں۔ یعنی پیٹ کی تاریکی، رحم کی ظلمت اور جھلی کا اندھیرا۔ یا پھر صلب (پشت) رحم اور پیٹ کا اندھیرا مراد ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ۔ یعنی جو یہ تمام افعال کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہی اللہ ہے تمہارا رب ہے۔ ترکیب کلام میں ذالکم مبتدا ہے لفظ اللہ خبر اول ہے۔ ربکم خبر ثانی ہے لَهُ الْمُلْكُ (اسی کی حکومت ہے) تیسری خبر ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (اس کے سوا کوئی معبود نہیں) یہ چوتھی خبر ہے۔ یعنی اس کے بغیر کوئی بھی عبادت کے مستحق اور لائق نہیں کیونکہ پیدا کرنے میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (پھر تم کدھر منہ پھیر کر جا رہے ہو) اس میں فاء سببیہ ہے اور استفہام حقیقت سے دوری اور تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔ یعنی تم اتنے واضح اور کامل استدلال و بیان کے باوجود راہ حق سے کدھر منہ پھیر کر جا رہے ہو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا پاٹ میں مصروف ہو۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۗ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۗ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۗ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ

اگر تم شکر ادا کرو تو وہ پسند کرتا ہے تمہارے لئے ۱؎ اور نہیں اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹنا ہے۔ پس وہ آگاہ کرے گا تمہیں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے تھے۔ بیشک وہ خوب جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کو بھی۔''

۱؎ اگر تم ناشکری کرتے سو تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں، یعنی اسے تمہارے ایمان لانے کی کوئی حاجت نہیں (وہ تو تم سے اور تمہارے ایمان سے مستغنی ہے) اِنْ تَكْفُرُوْا شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور دلیل جزاء یعنی فان اللّٰه غنی عنكم کو جزاء کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اِنْ تَكْفُرُوْا يَعُوْدُ وَبَالُ كُفْرِكُمْ اِلَيْكُمْ لَا اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ۔ یعنی اگر تم کفر اختیار کرتے ہو ناشکری کرتے ہو تو اس کفر کا وبال تمہیں پر پڑے گا نہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب لوٹے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تم سے اور تمہارے ایمان سے مستغنی ہے، اسے کوئی ضرورت اور حاجت نہیں تم اس کے محتاج اور ضرورت مند ہو کہ تمہیں ہی کفر اور ناشکری کے سبب ضرر اور نقصان پہنچے گا اور ایمان کے سبب تمہارا ہی فائدہ اور نفع ہوگا۔

۲؎ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ کا جملہ شرطیہ پر عطف ہے۔ یعنی کفر اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی مبغوض اور ناپسندیدہ ہے اگرچہ وہ اسی کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا۔ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کے سینے کو انتہائی تنگ کر دیتا ہے۔ یہی علماء سلف کا قول ہے اور اسی پر اہل السنۃ والجماعۃ کا اجماع ہے۔ معتزلہ کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ (وہ کفر اور معصیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کی طرف نہیں کرتے)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا(۱) اور ان سے مراد وہی لوگ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے (شیطان کو) فرمایا تھا اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۔ بیشک میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہوسکتا۔ اس قول کا مبنی اور بنیاد اس پر ہے کہ یہاں رضا مجازی طور پر ارادہ رکھنے کے معنی میں ہو۔ ورنہ حق تو یہ ہے کہ نہ تو رضا ارادہ کو مستلزم ہے (کہ رضا کے لئے ارادہ کا پایا جانا ضروری ہو) اور نہ رضا ارادہ کا مرادف ہے اور ہم معنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تو خیر اور شر تمام کو شامل ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے وہ نہیں ہوتا۔ اور مراد کا اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف ہونا محال ہے (یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو کچھ ہو جائے یا وہ چاہے تو کچھ نہ ہو ایسا ہونا محال ہے) اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۔

۳؎ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ اور اگر تم شکر ادا کرو تو وہ تمہارے لئے پسند کرتا ہے۔ یعنی اگر تم اپنے رب کے ساتھ ایمان لے آؤ اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کر لو تو وہ تمہیں اس پر اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ یہی حاصل معنی ہے کیونکہ رضا ثواب دینے کو مستلزم ہے (یعنی رضا یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کے سبب اجر و ثواب دیا جائے) یرضہ' اصل میں یرضاہُ تھا۔ جواب شرط ہونے کی وجہ سے حالت جزمی میں الف ساقط ہو گیا۔

نافع، عاصم، حمزہ اور ہشام نے ہاء ضمیر کی حرکت کو اپنی حالت پر برقرار رکھتے ہوئے اختلاس (بغیر سر کئے حرکت کو پڑھنا) کے

طرح کہ حرکت کی بجائے حرف علت کی آواز پیدا ہو جائے) کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ ھاء ضمیر الف کے حذف ہونے کے سبب حرف متحرک کے ساتھ متصل ہے۔ یزیدی سے ابوحمدان وغیرہ کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ ابوعمرو سے ایک روایت ھاء کو ساکن کرنے کی بھی ہے اور یعقوب نے اسی طرح قرأت کی ہے۔

ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے کفر اور ناشکری کا وبال تم سے دوسروں کی طرف تجاوز نہیں کرے گا (بلکہ اس کا سارا نقصان تمہیں کو پہنچے گا) حضور نبی کریم ﷺ کو تمہارے کفر پر رہنے کے سبب کوئی نقصان اور ضرر نہیں ہوگا۔ پس آپ ﷺ کا تمہیں ایمان لانے کی دعوت دینا فقط تمہارے نفع اور بہتری کے لئے ہے۔ (ورنہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا) پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹنا ہے۔ پس وہ تمہیں تمہارے ان کاموں کی جزاء سے آگاہ کرے گا جو تم کیا کرتے تھے بیشک وہ سینوں کے رازوں کو خوب جاننے والا ہے پس وہ تمہاری نیتوں کے مطابق تمہارے اعمال پر جزاء عطا فرمائے گا۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِیَ مَا كَانَ یَدْعُوْۤا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِیْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۝۸

''اور جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف (اس وقت) پکارتا ہے اپنے رب کو دل سے رجوع کرتے ہوئے اس کی طرف پھر جب عطا کرتا ہے اسے نعمت اپنی (جناب سے) [1] تو بھول جاتا ہے اس تکلیف کو جس کے لئے فریاد کرتا رہا تھا اس سے پہلے اور بناتا ہے اللہ کے ہم مثل تاکہ بہکا دے اس کی راہ سے [2]۔ (اے مصطفیٰ! آپ اسے) فرمائیے لطف اٹھا لے اپنے کفر سے تھوڑے دن۔ بیشک تو دوزخیوں میں سے ہے [3]۔''

[1] جب کسی کافر انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے اس وقت وہ اپنے رب کو اس کی طرف دل سے رجوع کرتے ہوئے اور اس سے مدد کی فریاد کرتے ہوئے پکارتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے نعمت عطا کر دیتا ہے یا اسے صاحب جاہ و حشم اور غلاموں اور خادموں والا بنا دیتا ہے۔ خول کا معنی ہے خدمتگار اور متبعین۔ رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کے بارے ارشاد فرمایا وہ تمہارے بھائی اور خدمتگار ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے قبضہ میں دے دیا ہے۔ یا خول کا معنی ہے حفاظت کرنا، دیکھ بھال کرنا۔ جیسا کہ حدیث طیبہ میں ہے کان علیه السلام یتخولنا ای یتعهد نا بالموعظة کہ رسول اللہ ﷺ وعظ و نصیحت کے ساتھ ہماری حفاظت اور دیکھ بھال فرمایا کرتے تھے۔ اسی معنی میں عربوں کا یہ قول بھی ہے فلان خائل مال۔ فلاں آدمی مال کی حفاظت کرنے والا ہے اور اس کا انتظام درست رکھتا ہے۔ نہایہ اور قاموس میں اسی طرح ہے۔

نِعْمَةً مِّنْهُ ترکیب کلام میں یا تو خول کا مفعول ثانی ہے جبکہ خول کا معنی اعطی ہو۔ یا پھر یہ مفعول لہ ہے۔

[2] (تو بھول جاتا ہے اس تکلیف کو جس کے لئے فریاد کرتا رہا تھا نعمت سے پہلے) یعنی وہ ضرر اور تکلیف جسے دور کرنے اور زائل

وَالْاُنْثٰی ۝ میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنالیتا ہے تاکہ دین اسلام کی راہ سے بہکا دے۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور رویس نے لیضل کو یاء کے فتحہ کے ساتھ لیضل پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو ضمہ کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ جب ضلال اور اضلال اس ترتیب پر مذکور ہوں تو انہیں علۃ غائیہ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کا لازمی نتیجہ خود گمراہ ہونا اور دوسروں کو گمراہ کرنا ہی ہوتا ہے گویا یہی علۃ غائیہ اور مقصود ہو جاتا ہے) جیسا کہ اس ارشاد میں بھی (لا) تعلیل علۃ غائیہ کے بیان کیلئے مذکور ہے فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ (آل فرعون نے (موسیٰ علیہ السلام) کو اٹھالیا نتیجۃً وہ ان کے لئے دشمن اور باعث غم بن گئے)۔

۳؎ اے محمد ﷺ! آپ اس کافر کو کہہ دیں تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اٹھا لے۔ اس قلیل مدت سے مراد مرنے کے وقت تک دنیوی زندگی کے دن ہیں۔ یہ امر تہدید اور جھڑک کے لئے ہے۔ اس میں کفار کو آخرت میں (نعمتوں سے) لطف اندوز ہونے سے مایوس اور ناامید کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی آخرت میں ان کے لئے کوئی ایسی نعمت نہیں ہوگی جو ان کے لئے راحت بخش اور سکون آور ہوگی) یہی وجہ ہے کہ اس کی علت استیناف کے طریقے پر اپنے اس قول کے ساتھ بیان فرمائی اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ۔ (وجہ یہ ہے) کہ بیشک تو دوزخیوں میں سے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت عیینہ بن ربیعہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ مقاتل نے کہا ہے یہ آیت ابوحذیفہ بن مغیرہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

''بھلا جو شخص عبادت میں بسر کرتا ہے رات کی گھڑیاں کبھی سجدہ کرتے ہوئے کبھی کھڑے ہوئے (بایں ہمہ) ڈرتا ہے آخرت سے اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی رحمت کی ۱؎۔ آپ پوچھئے کیا برابر ہو سکتے ہیں علم والے اور جاہل۔ البتہ صرف عقل مند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں ۲؎۔''

۱؎ بھلا جو شخص عبادات کے وظائف ادا کرتے ہوئے رات کی گھڑیاں ادا کرتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ قنوت سے مراد قرآن کریم کی تلاوت اور (عبادت کی غرض سے) طویل قیام کرنا ہے۔

ابن کثیر، نافع اور حمزہ نے مَن کی میم کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے رات گزارتا ہے وہ اس کی مثل ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے کئی شریک اور مقابل بنا رکھے ہیں؟ باقیوں نے میم کو تشدد پڑھا ہے۔ اس صورت میں اَمْ منقطعہ ہوگا، اور معنی اس طرح ہوگا اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ كَمَنْ جَعَلَ لَهٗ اَنْدَادًا۔ (کیا طاقت و عبادت میں ہمہ تن مشغول رہنے والا اس کی مثل ہو سکتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی شریک بنا رکھے ہیں) یا پھر اَم متصلہ ہوگا اور کچھ عبارت محذوف ہوگی تقدیر کلام اس طرح ہوگی اَمَّنْ جَعَلَ اللّٰهَ اَنْدَادًا وَّلَمْ يَشْكُرْ نِعْمَتَهٗ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ هُوَ قَانِتٌ۔ کیا وہ آدمی جس نے اللہ تعالیٰ

ساجدا و قائما یہ دونوں قانتٌ کی ضمیر سے حال ہیں۔ معنی یہ ہوگا درآنحالیکہ وہ حالت نماز میں کبھی سجدہ کر رہا ہوتا ہے اور کبھی سراپا ادب بن کر ہاتھ باندھے) کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو انتہائی حقیر اور کمزور خیال کرتے ہوئے آخرت کے عذاب سے ڈرتا رہتا ہے اور فقط اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے۔ اپنے اعمال پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرتا، یعنی وہ خوف ورجاء (امید) دونوں کو جمع کئے ہوتا ہے۔ نہ تو اتنا زیادہ خوف رکھتا ہے کہ بالکل ہی مایوس اور ناامید ہو جائے کیونکہ اس کے بارے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ ۔ کہ فقط قوم کفار ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید ہوئی ہے اور نہ ہی رجاء (امید) میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ بالکل ہی پرامن اور مطمئن ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بارے ارشاد خداوندی ہے فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ ۔ (اللہ تعالیٰ کی تدبیر (گرفت) سے فقط خسارہ اٹھانے والے لوگ ہی مطمئن اور پرامن ہوتے ہیں)

ترکیب کلام میں دونوں جملے (یحذر الاٰخرۃ اور یرجوا رحمۃ ربہ) حال کے محل میں واقع ہیں یا پھر علت بیان کرنے کے لئے محل استیناف میں ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ضحاک کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی۔

ابن ابی سعید نے کلبی سے ابوصالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی (1)۔

جویبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابن مسعودؓ عمار بن یاسر اور سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی (2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ضحاک نے کہا ہے یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بارے نازل ہوئی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی (3)۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے بھی آپ سے نقل کیا ہے۔

کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابن مسعودؓ عمار اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہم کے بارے نازل ہوئی (4)۔ مذکورہ تمام اقوال میں وجہ اجتماع وتطبیق یہ ہے کہ یہ آیت ان تمام افراد کے بارے میں نازل ہوئی۔

لے آپ پوچھئے کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام صفات جلال و جمال سے متصف ہے پھر اس کے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ اس کی طاعت وعبادت کے اعمال کرتے ہیں اور معاصی و گناہوں سے بچتے ہیں اور وہ لوگ جو یہ نہیں جانتے (ایسے نظریات اور اعمال سے وہ ناواقف اور جاہل ہیں) اس آیت طیبہ میں استفہام انکاری ہے، یعنی بالیقین یہ لوگ آپس میں مساوی اور برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ جملہ پہلے جملے کی علت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مضمون کی تائید بھی کرتا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے کی تائید کرتا ہے مگر تشبیہ کے طریقے پر۔ یعنی جس طرح عالم اور جاہل آپس میں برابر

اور ہم رتبہ نہیں ہو سکتے اسی طرح اطاعت شعار اور گنہگار مطیع و فرمانبردار اور معصیت اور گناہ کا ارتکاب کرنے والا بھی آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔ (گویا پہلے جملے کی اس جملے میں تشبیہ بیان کی گئی ہے)

بعض نے یہ کہا ہے کہ پہلے جملے میں دونوں فریقوں کے مابین قوت عملیہ کے اعتبار سے مساوات کی نفی کی گئی ہے اور اس کے بعد اس جملے میں دونوں کے درمیان قوت علمیہ کے اعتبار سے مساوات کی نفی کر دی گئی ہے تاکہ دونوں کے مابین کامل فرق ظاہر ہو جائے اور ایک فریق کی دوسرے پر فضیلت اور فوقیت بالکل واضح ہو جائے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے کہا گیا ہے اور وَالَّذِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ ابوحذیفہ مخزومی کے لئے۔ انما یتذکر سے مراد یہ ہے کہ اس قسم کے بیانات اور امثلہ سے صرف عقلمند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔

قُلْ یٰعِبَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ⑩

"آپ فرمایئے اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو ڈرتے رہا کرو اپنے رب سے۔ (اور یاد رکھو) ان کے لئے جنہوں نے نیک اعمال کئے اس دنیا میں نیک صلہ ہے[1] اور اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے[2] (مصائب و آلام میں) صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا[3]۔"

[1] اَحْسَنُوْا یعنی جو لوگ ایمان لائے اور خوب اچھی طرح عمل کئے یعنی اعمال کو خوب خشوع و خضوع اور عاجزی و انکساری کے ساتھ ادا کیا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا **الاحسان ان تعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔** احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تجھے یہ کیفیت حاصل نہ ہو (یعنی اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا) تو پھر یہ یقین جانئے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے (پس یہی کسی طاعت و عبادت کی خوبی اور حسن ہے)

اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا، اَحْسَنُوْا کے متعلق ہے (یعنی جنہوں نے اس دنیا میں نیک عمل کئے ان کے لئے آخرت میں اچھا صلہ ہے۔ اور وہ جنت ہے۔ (حسنة سے مراد یہی ہے) ترکیب کلام میں حسنة مبتدا ہے اور لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا خبر ہے۔ اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ کی علت بیان کر رہا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ فِی الدُّنْیَا ظرف مستقر حسنة سے حال ہے اور پھر وہ ظرف مستقر کا فاعل ہے اور اس سے میری مراد قول باری تعالیٰ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا ہے۔

سدی نے کہا ہے کہ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ سے مراد صحت اور عافیت ہے(1) لیکن یہ قول صحیح اور قوی نہیں ہے کیونکہ صحت و عافیت تو جس طرح مومن کو عطا ہوتی ہے اسی طرح کافر کو بھی ملتی ہے بلکہ کبھی معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ (یعنی کافر صحت و عافیت کے ساتھ ہوتا ہے اور مومن اس نعمت سے محروم ہوتا ہے)

سامنا ہو۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا مکہ مکرمہ سے کوچ کر جاؤ، یعنی ہجرت کر جاؤ(1)۔

مجاہد نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے میری زمین وسیع ہے پس تم ہجرت کر جاؤ اور (مکہ مکرمہ سے) جدائی اور علیحدگی اختیار کر لو(2)۔

حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ جس آدمی کو گناہ کرنے اور معصیت کا ارتکاب کرنے کا حکم دیا جائے اسے چاہئے کہ وہاں سے بھاگ جائے چلا جائے(3)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو قول باری تعالیٰ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ پر معطوف ہے یا پھر اتَّقُوْا رَبَّكُمْ پر کیونکہ یہ بمعنی ھاجروا ہے۔ (یعنی اپنے رب سے ڈرو اور ہجرت کر جاؤ)

؎ اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (مصائب و آلام میں) صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا) بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفار کی جانب سے اذیتوں اور تکلیفوں کے باوجود اپنے دین پر ڈٹے رہے اور اسے کبھی نہ چھوڑا۔ یا وہ لوگ ہیں جنہوں نے (دین کی خاطر) وطن اور عزیز و اقارب کی جدائی اور مفارقت پر صبر اختیار کیا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی۔ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور اپنے دین کو نہیں چھوڑا تھا۔ جب ان پر (مکہ مکرمہ میں) مصائب و آلام بڑھ گئے' تکالیف شدید ہو گئیں تو یہ انتہائی صبر اور حوصلے کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہے اور مکہ مکرمہ کو خیر باد کہہ کر حبشہ کی طرف ہجرت فرما ہو گئے۔ چونکہ آیت کریمہ میں لفظ عام ہے اس لئے یہ انہیں بھی شامل ہے اور ہر اس آدمی کو بھی جو مصائب و آلام برداشت کرنے' طاعت و عبادت کی مشقت اٹھانے اور نفس کو معصیت و گناہ سے روکنے پر صبر کرتا ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر اطاعت شعار اور نیک عمل کرنے والے کو ناپ تول کر اجر و ثواب عطا کیا جائے گا سوائے صبر کرنے والوں کے' کیونکہ ان پر تو (بغیر ناپ تول کے) لپ بھر بھر کر ثواب پھینکا جائے گا(4)۔

اصبہانی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ترازو نصب کئے جائیں گے اور نماز پڑھنے والوں کو بلایا جائے گا انہیں بھی وزن کر کے پورا پورا اجر دیا جائیگا پھر حج کی سعادت حاصل کرنے والوں کو لایا جائے گا انہیں بھی ترازو پر وزن کر کے اجر دیا جائے گا اور پھر مصائب و آلام اور دین کی خاطر دکھ، درد اور طرح طرح کی آزمائشوں پر صبر اختیار کرنے والوں کو بلایا جائیگا تو ان کے لئے کوئی میزان نہیں لگایا جائے گا اور نہ ہی ان کے اعمال کے رجسٹر کھولے جائیں گے بلکہ ان پر تو بغیر حساب و شمار کے اجر و ثواب کی برسات کر دی جائے گی یہاں تک کہ دنیا میں صحت و عافیت کے ساتھ رہنے والے وہاں مقام حساب میں یہ تمنا اور آرزو کرنے لگیں گے کاش دنیا میں ان کے جسموں کو بھی قینچیوں کے ساتھ کاٹا جاتا۔ ان میں یہ طلب اور خواہش اس اجر و ثواب کو دیکھ کر پیدا ہوگی جو تکالیف اور طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنے والوں کو عطا ہوگا(5)۔ اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ میں اسی چیز کا بیان ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

طبرانی اور ابو یعلیٰ نے ناقابل اعتراض سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن شہید کو لایا جائے گا اور حساب کیلئے اسے کھڑا کیا جائے گا پھر صدقہ و زکوٰۃ دینے والے کو لایا جائے گا اور اسے حساب کیلئے کھڑا کیا جائے گا (یعنی ان لوگوں کو

اجر وثواب عطا فرمانے کیلئے ترازو لگائے جائیں گے اوران کے اعمال کا پورا پورا اجر دیا جائیگا) اور پھر مصائب وآلام پر صبر اختیار کرنے والوں کو لایا جائے گا اوران کے لئے میزان نصب نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے اعمال کے رجسٹر کھولے جائیں گے بلکہ ان پر تو اجر کی بارش کر دی جائے گی حتیٰ کہ عافیت وصحت کے ساتھ رہنے والے بھی وہاں مقام حساب میں یہ تمنا اور آرزو کرنے لگیں گے کاش ان کے جسم بھی قینچیوں کے ساتھ کاٹے جاتے۔ ان میں یہ خواہش مصائب برداشت کرنے والوں کے اجر وثواب کو دیکھ کر پیدا ہوگی (1)۔

ترمذی اور ابن ابی الدنیا نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کے دن (دین کی خاطر) مصائب برداشت کرنے والوں اور اذیتوں پر صبر اختیار کرنے والوں کو اجر وثواب سے نوازا جائیگا تو دنیا میں عافیت کے ساتھ رہنے والے بھی یہ خواہش کرنے لگیں گے کہ اگر ان کے جسموں کو بھی قینچیوں کے ساتھ کاٹا جاتا (2) (تو آج انہیں بھی ان صبر کرنے والوں کا سا اجر وثواب ملتا)

میں کہتا ہوں شاید اہل البلاء سے مراد اہل عشق ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شہید کو اہل بلاء میں سے شمار نہیں کیا گیا حالانکہ دنیا کی مصیبتوں اور آزمائشوں میں سے شدید ترین آزمائش قتل ہے اور شہید نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے پر صبر اختیار کیا ہے۔ (اور اس تکلیف کو برداشت کیا ہے۔)

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۱۱﴾ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳﴾

"فرمائیے! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں خالص کرتے ہوئے اس کیلئے اطاعت کو [1] اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں [2] آپ فرمائیے! میں ڈرتا ہوں اگر میں حکم عدولی کروں اپنے رب کی اس بڑے دن کے عذاب سے [3]۔"

[1] نافع نے انی میں یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے سکون کے ساتھ۔

مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ کا معنی ہے کہ میں فقط اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کروں (کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو)

[2] مجھے اخلاص کا حکم دیا گیا ہے تاکہ میں دنیا میں اور آخرت میں تمام سے آگے بڑھ جاؤں کیونکہ سبقت کا انحصار اخلاص پر ہی ہے یا پھر اس لئے اخلاص کا حکم دیا گیا تاکہ میں قریش اور ان جیسا دین رکھنے والوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہو جاؤں۔

دونوں آیتوں کے درمیان حرف عطف مغائرت کے لئے ہے چونکہ دوسرا امرت علت کے ساتھ مقید ہے اس لئے وہ پہلے کا مغائر ہے۔ کیونکہ پہلا امر تو ایسی عبادت کا ہے جو اخلاص کے ساتھ مقترن ہو (یعنی پہلی آیت میں اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم ہے) چونکہ عبادت کا حکم دیا گیا ہے اس لئے وہ ذاتی طور پر اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اس میں اخلاص پایا جائے اور عبادت اس لئے بھی اخلاص کا تقاضا کرتی ہے تاکہ سبقت دینی حاصل ہو جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ لان اکون میں لام زائدہ ہو جیسا کہ **اردت لان افعل** (میں نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا) میں ہے تو اس صورت میں امر سبب سے اول خود اسلام قبول کرنے کیلئے ہوگا تاکہ اسلام کی دعوت دینے کے

کرتا ہے کہ آپ ﷺ سب سے پہلے مسلم ہوں کیونکہ کسی غیر کو دعوت دینا اپنی ذات کو اس دعوت کے ساتھ متصف کرنے کی فرع ہے۔ اس اسلوب بیان میں دوسروں کو اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہے، یعنی میں تمہیں ایسی چیز کی طرف ہی دعوت دے رہا ہوں جو تمہارے لئے انتہائی نفع بخش اور بہتر ہے۔ کیونکہ اگر وہ مفید اور بہتر نہ ہوتی تو میں ذاتی طور پر اسے کبھی اختیار نہ کرتا حالانکہ سب سے پہلے میں نے اپنے لئے اسے اختیار کیا ہے۔

۳؎ نافع' ابوعمرو اور ابن کثیر نے انی کو یائے کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے سکون کے ساتھ۔

آپ فرما دیجئے کہ اگر اخلاص ترک کر کے اور جس شرک و برے اعمال میں تم مبتلا ہو ان کی طرف مائل ہو کر میں اپنے رب کی حکم عدولی اور نافرمانی کروں تو میں اس بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس آیت میں بھی سابقہ آیت کی طرح گناہوں (کے انجام) سے ڈرانا اور اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب آپ ﷺ کو اپنے آباء و اجداد کا دین اپنانے کی دعوت دی گئی (1)۔

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ﴿۱۴﴾ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۵﴾

''فرمائیے! اللہ کی ہی میں عبادت کرتا ہوں خالص کرتے ہوئے اس کے لئے اپنے دین کو۔ پس تم عبادت کرو جس کی چاہو اس کے سوا ۱؎ (نیز) فرما دیجئے اصل نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جو گھاٹے میں ڈالیں گے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن ۲؎ سنو! یہی کھلا گھاٹا ہے ۳؎۔''

۱؎ پہلے یہ خبر دینے کا حکم ارشاد فرمایا کہ آپ کو عبادت کرنے اور اس میں اخلاص پیدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس آیت میں یہ خبر دینے کا حکم دیا گیا ہے کہ میری عبادت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ایک تو یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ وہ اس کی مخالفت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خوفزدہ رہیں اور ساتھ ہی کفار کی تمام آرزوؤں اور امیدوں کو منقطع کرنے کے لئے یہ حکم دیا گیا ہے۔ (کیونکہ وہ یہ امید رکھتے تھے کہ شاید رسول اللہ ﷺ ان کی رائے اور تجویز قبول فرما کر اپنے آباء و اجداد کے دین پر چل پڑیں گے لیکن یہ حکم فرما کر انہیں مطلع کر دیا گیا کہ ایسا ممکن ہی نہیں بلکہ میری عبادت خالص اللہ کے لئے ہے۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ انہیں خوفزدہ کرنے اور رسوا کرنے کے لئے انہیں فرمایا تم اللہ کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو۔ ترکیب کلام میں یہ جواب شرط ہے اور اس کی شرط محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اِنْ لَّمْ تُوَافِقُوْنِیْ فِی الْعِبَادَةِ خَالِصًا فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ۔ اگر تم عبادت کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرنے میں میری موافقت نہیں کرتے تو پھر تم جس کی چاہو عبادت کرتے رہو۔ پس اس کے سبب جو عذاب تم پر آئے گا اور جو خسارہ تم اٹھاؤ گے عنقریب تمہیں اس کا علم ہو جائے گا' تم اس کا مشاہدہ کر لو گے۔

۲؎ آپ فرما دیجئے اصل نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جو اپنے آپ کو اور گھر والوں کو گمراہی کے سبب خسارے میں ڈالیں گے،

ترکیب کلام میں یوم القیامۃ خسروا کی ظرف ہے۔ یہ خسر التاجر سے ماخوذ ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی تاجر اپنی تجارت میں دھوکہ کھا جائے اور نقصان اٹھائے۔ تو چونکہ ان لوگوں نے بھی خود گمراہ ہونے اور اپنے گھر والوں کو گمراہ کرنے کے سبب جنت میں اپنے حصوں کو جہنم میں موجود اپنے حصوں کے ساتھ بدل ڈالا ہے (یعنی انہوں نے جنت میں اپنے حصے اہل ایمان کے حوالے کر دیئے اور ان کے بدلے اہل ایمان کیلئے جہنم میں مقرر شدہ حصے ان سے لے لئے اس لئے ان کے لئے خسارے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے) خسر فعل اصلاً لازم ہے لیکن یہاں متعدی استعمال ہوا ہے۔ (کیونکہ اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ اس کا مفعول ہے)

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خسران الاھل کے بارے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے جنت میں ایک گھر اور اس کے لئے اہل بنا رکھے ہیں۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے اعمال کئے تو وہ اس گھر اور اپنے اہل کو پالے گا اور جس نے گناہ اور معصیت کا ارتکاب کیا تو اس کا گھر اور اہل اس کی بجائے دوسرے اطاعت شعار اور فرمانبردار آدمی کے حوالے کر دیئے جائیں گے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ اس تفسیر کی بناء پر خسر اھلہ کا معنی ہے فوت اھلہ یعنی اس نے اپنے اہل کو ضائع کر دیا، گم کر دیا۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ خسران الاھل کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اس کے گھر والے اہل جہنم میں سے ہیں تو وہ اس کے گمراہ کرنے کے سبب دوزخ میں پہنچے ہیں اور اگر وہ اہل جنت میں سے ہیں تو یہ خود گمراہ ہو کر جہنم میں جا پہنچا۔ جس سے واپسی ممکن نہیں۔ لہٰذا اس طرح یہ ان سے دور ہو گیا۔

سنو! قیامت کے دن کا خسارہ ہی اتنا واضح اور کھلا خسارہ ہے کہ خسارے کی تمام اقسام میں سے کوئی بھی اس جیسی نہیں۔ کیونکہ دنیا کا خسارہ آسان ہے اور تبدیل ہو سکتا ہے (جبکہ قیامت کے خسارے میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں) اس آیت میں کئی مبالغات کے ذریعے ان کے خسارے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس کی ابتداء لفظ الا سے کی گئی ہے، پھر درمیان میں ضمیر فصل ھو ذکر کی گئی ہے اور لفظ خسران کو معرفہ ذکر کیا گیا اور پھر اس کی صفت المبین ذکر کی گئی ہے اور پھر مابعد آیت میں خسران کی وضاحت فرمائی۔

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝۱۶ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝۱۷ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۱۸

''(ان (بدبختوں) کے لئے اوپر سے بھی آگ کے شعلے ہوں گے اور نیچے سے بھی آگ کے شعلے۔ اس (عذاب الیم) سے ڈراتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو، اے میرے بندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو۔ اور جو لوگ بچتے ہیں شیطان سے کہ اس کی عبادت کریں اور (دل سے) جھکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف ان کے لئے مژدہ ہے۔ پس آپ مژدہ سنا دیں میرے ان بندوں کو۔ جو غور سے سنتے ہیں بات کو پھر پیروی کرتے ہیں اچھی بات کی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے

تک آگ کے فرش اور بستر ہوں گے۔ نیچے والے فرش کو بھی ظلل (سائبان) کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی اپنے نیچے والوں کے لئے سائبان ہی ہوں گے۔ یہی وہ عذاب ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس میں واقع کرنے سے بچائیں (یعنی ایسے کاموں سے اجتناب کریں جن کے سبب وہ اس عذاب الیم میں مبتلا ہو سکتے ہیں) اے میرے بندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو اور ایسے کام نہ کرو جو میری ناراضگی اور عذاب کا موجب ہوتے ہیں۔

۔ (اور جو لوگ شیطان سے بچتے ہیں) طاغوت کا معنی ہے سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والا۔ انتہائی زیادہ سرکش۔ یہ فعلوت کے وزن پر ہے، مصدر میں مبالغہ کے اظہار کے لئے لام کلمے کو عین پر مقدم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رحموت ہے۔ پھر صفت میں اظہار مبالغہ کے لئے اسی کے ساتھ وصف بیان کر دیا گیا۔ (تو چونکہ سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والا شیطان ہے اس لئے طاغوت کا لفظ شیطان کے لئے مختص ہو گیا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے طاغوت سے مراد بت لئے ہیں۔ کیونکہ قول باری تعالیٰ ان یعبدوھا میں ھا ضمیر مؤنث کا مرجع لفظ طاغوت ہے اور یہ ضمیر طاغوت سے بدل اشتمال ہے اور یہی اس کی دلیل ہے کہ طاغوت سے مراد بت ہیں۔

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شئی کو چھوڑ کر دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتے ہیں ان کے لئے اجر و ثواب کی بشارت ہے۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کی زبان سے اور موت آنے کے وقت ملائکہ کی زبان سے ان کے لئے خوشخبری اور مژدہ ہے۔ یعنی وہ لوگ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں بشارت دی جائے انہیں مژدہ سنایا جائے۔ اسی وجہ سے اس کے بعد فرمایا فبشر عباد۔ اے محمد ﷺ! آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیں۔

ابو شعیب نے حالت وصل میں عبادِ کو یائے مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حالت وقف میں یاء ساکن کے ساتھ اور ابو حمدون وغیرہ نے یزیدی کی روایت سے حالت وصل میں یائے مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے اور حالت وقف میں یاء کو حذف کر دیا ہے۔ ابو عمرو کے قول کا قیاس بھی یہی ہے کہ وہ حالت وقف میں صرف علامت کی اتباع کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ قراء نے حالت وصل اور حالت وقف دونوں میں یاء کو حذف کر دیا ہے۔

جویبر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب آیت طیبہ لھا سبعۃ ابواب الآیۃ نازل ہوئی تو انصار میں سے ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے سات غلام ہیں میں نے (سات دروازوں میں سے) ہر ایک سے (داخل ہونے کے لئے) اپنے تمام غلاموں کو آزاد کر دیا (1) تو اس وقت آیت کریمہ فبشر عبادی نازل ہوئی۔

۔ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ سے مراد یہ ہے کہ وہ قرآن کریم اور دوسرا کلام سنتے ہیں۔ پھر اتباع اور پیروی قرآن کریم کی کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا کلام بھی سنتے ہیں اور کفار کا کلام بھی۔ لیکن پیروی رسول اللہ ﷺ کے کلام کی کرتے ہیں (پہلے معنی کے مطابق احسن سے مراد قرآن کریم اور دوسرے کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔ اور قول سے مراد مطلق کلام ہو گا چاہے وہ کوئی ہو اور کسی کا ہو۔)

سیاق کلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہاں فبشرھم مذکور ہوتا۔ لیکن ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھتے ہوئے فرمایا فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الخ تو یہ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ ان کے شیطانوں سے بچنے کا مبداء اور بنیاد یہ ہے کہ وہ مختلف اقوال کا تنقیدی تجزیہ کر

بھی امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایمان لے آئے تو حضرت عثمان ذوالنورین' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف' حضرت طلحہ بن عبید اللہ' حضرت زبیر بن عوام' حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم ان کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے ایمان لانے کے بارے میں دریافت کیا۔ پس آپ نے انہیں اپنے ایمان لانے کی خبر دی تو وہ بھی ایمان لے آئے۔ چنانچہ ان تمام کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

مذکورہ تفسیر کے مطابق احسن (اسم تفضیل) بمعنی حسن (صفت مشبہ) ہے کیونکہ کفار کے کلام میں کوئی حسن اور خوبی موجود نہیں (کہ اس کے مقابلہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو احسن کہا جائے۔)

ابن زید نے کہا ہے کہ یہ دونوں آیتیں ان تین افراد کے بارے نازل ہوئیں جو زمانہ جاہلیت میں لا الہ الا اللّٰہ کہا کرتے تھے اور وہ ہیں زید بن عمرو بن نفیل یا سعید بن زید' ابوذر غفاری اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اس صورت میں احسن سے مراد لا الہ الا اللّٰہ کہنا ہے(1)۔

سدی نے کہا ہے کہ جن احکام کا انہیں حکم دیا جاتا ہے ان میں سے حسین ترکی وہ پیروی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ظالم سے بدلہ لینے اور اسے معاف کر دینے کا ذکر کیا ہے لیکن ان دونوں امروں میں سے معاف کر دینا احسن امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عزائم اور رخصتوں کا ذکر بھی کیا ہے مگر ان میں سے عزائم احسن ہیں(2)۔

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور یہی لوگ دانشور ہیں۔ یعنی ان کی عقلیں توہمات اور رسوم ورواج کی معارضت سے محفوظ اور پاک ہیں۔ اس آیت میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور نفس کے اسے قبول کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ ہدایت کو پیدا کرتا ہے اور نفس انسانی اسے قبول کرتا ہے۔)

أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۖ أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿١٩﴾ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَبْنِيَّةٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَعْدَ اللَّهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْمِيعَادَ ﴿٢٠﴾

''بھلا جس پر واجب ہو گیا عذاب کا حکم۔ تو کیا آپ چھڑا سکتے ہیں اسے جو آگ میں ہے [1] البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے لئے بالا خانے ہیں جن کے اوپر اور بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔ رواں ہیں جن کے نیچے سے نہریں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کیا کرتا [2]۔''

[1] بھلا اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں جس پر عذاب کا حکم واجب ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ یعنی میں نے انہیں آگ کے لئے پیدا کیا ہے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ اے محمد ﷺ! تو کیا آپ چھڑا سکتے ہیں اسے جو آگ میں ہے۔ یعنی آپ اس کی قدرت نہیں رکھتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد ابولہب اور اس کا بیٹا ہے(3)۔ ترکیب کلام میں

اسے آگ سے بچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ (یعنی ایسا قطعاً نہیں ہوسکتا) اس انکار کی تاکید اور بعید از امکان کو ظاہر کرنے کے لئے جزاء میں ہمزہ استفہامیہ کو مکرر ذکر کیا گیا ہے اور اسی لئے ضمیر کی جگہ پر من فی النار اسم ظاہر رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی اس پر دلالت کرنے کیلئے کہ جس کے لئے عذاب کا حکم ہو چکا ہے ایسے ہی ہے گویا اس میں واقع ہو چکا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ خلافی ممتنع ہے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا انہیں ایمان کی طرف دعوت دینے میں انتہائی جدوجہد اور کوشش کرنا انہیں آگ سے بچانے کی ہی سعی اور کوشش تھی۔

اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ افانت تنقذ جملہ مستانفہ ہو اور اسی معنی پر دلالت کرنے کے لئے ہو اور جزاء محذوف ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو۔ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ تَهْدِيْهِ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ۔ کیا جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے آپ اسے ہدایت دے سکتے ہیں۔ کیا آپ اسے چھڑا سکتے ہیں جو آگ میں ہے۔ (یعنی یہ ممکن نہیں) کیونکہ جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے گویا کہ وہ ابھی سے آگ میں ہے۔ پھر اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ شاید رسول اللہ ﷺ کی سعی و کوشش مطلقاً غیر مفید اور بے سود ہے تو اس وہم کا ازالہ کرنے کے لئے مابعد کلام ارشاد فرمایا۔

لٰكِنِ لیکن وہ لوگ جن کے لئے اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں رحمت کا حکم واجب ہو چکا ہے تو وہی اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ آیت طیبہ میں اس مقام پر صیغہ ماضی یہ معنی ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے لئے متقی بننے کا فیصلہ ہو چکا ہے وہ ایسے ہی ہیں گویا کہ تقویٰ کی صفت سے متصف ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے جنت میں انتہائی عالیشان اور بلند و بالا بالا خانے ہیں اور پھر ان کے اوپر ان سے بھی بلند تر بالا خانے ہیں اور ان تمام اوپر والے اور نیچے والے بالا خانوں کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان بالا خانوں کا وعدہ فرما رکھا ہے۔ یہاں وعدًا مصدر ہے جو تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ لهم غرف وعدہ کے معنی میں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کیا کرتا کیونکہ وعدہ خلافی نقص اور عیب ہے (اور اللہ تعالیٰ نقص و عیب سے پاک اور منزہ ہے) اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت محال ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت اوپر کے بالا خانوں میں رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے تم دور مشرق و مغرب کے افق پر باقی رہ جانے والے چمکتے ستارے کو دیکھتے ہو اور ایسا ان کے درمیان مراتب و درجات کے باہمی تفاضل اور فرق کی بناء پر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو انبیاء علیہم السلام کے محلات ہوں گے کوئی اور ان تک نہیں پہنچ سکے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے وہ محلات ایسے لوگوں کے لئے بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ ایمان لائے اور انبیاء و رسل کی تصدیق کی (1)۔
اس بارے میں جو احادیث موجود ہیں ہم نے وہ سورۂ فرقان میں اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا کی تفسیر میں ذکر کر دی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ

ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾

'' کیا تم نہیں دیکھتے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے آسمان سے پانی پھر جاری کیا اسے زمین کے چشموں سے پھر اگاتا ہے اس کے ذریعہ فصلیں جن کے رنگ جدا جدا ہیں پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے پس تو دیکھتا ہے اسے زردی مائل پھر وہ اس کو چورا چورا کر دیتا ہے۔ۖ یقیناً اس (کرشمہ قدرت) میں نصیحت ہے اہل عقل کے لئے ۲ۖ۔''

ۖ مَآءً سے مراد بارش ہے۔ جملے میں استفہام انکاری ہے (چونکہ لَمْ تَرَ (تم نہیں دیکھتے) فعل نفی ہے) اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے (تم دیکھتے ہو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بارش نازل کی ہے) ترکیب کلام میں ان اپنے جملہ کے ساتھ مل کر لم تر کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ کا معنی ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین کے چشموں میں داخل کیا۔ اس میں ظرف سلکه کے متعلق ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِىْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ اور ينابيع ضمیر منصوب سے حال ہے۔ شعبی نے کہا ہے کہ زمین میں جو پانی ہے وہ آسمان سے ہی آتا ہے (۱)۔ یہ بھی جائز ہے کہ ينابيع سلكه کا مفعول ثانی ہو کیونکہ اس میں یہ وسعت ہے جیسا کہ اس جملے میں ہے ادخلته بيتًا في الدار۔ ينبوع کا اطلاق چشمہ اور چشمہ سے نکلنے والے پانی پر ہوتا ہے۔ پہلی ترکیب کے مطابق اس کا معنی چشمے سے نکلنے والا پانی ہے اور دوسری ترکیب کے مطابق اس کا معنی چشمہ ہے۔ پھر اس پانی کے سبب فصلیں اگاتا ہے جن کے رنگ جدا جدا ہیں۔ مختلفًا الوانه سے مراد یا تو فصلوں کی مختلف اقسام ہیں مثلاً گندم، جو وغیرہ۔ یا اس سے مراد رنگوں کی مختلف کیفیات ہیں جیسے سبزی اور سرخی وغیرہ۔

پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے۔ پس تو اسے سرسبز و شاداب ہونے کے بعد خشکی کے وقت زردی مائل دیکھتا ہے۔ پھر وہ اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔ یعنی وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

۲ۖ (یقیناً اس کرشمہ قدرت میں اہل عقل کے لئے نصیحت ہے) ذکری بمعنی تذکیر ہے، اس کا معنی ہے یاد دہانی۔ یعنی یقیناً ان ایجادات اور تغیرات میں اس صانع قدیم کے وجود کی یاد دہانی ہے جو قادر بھی ہے اور ایسا حکیم بھی جس کی تدبیر شے میں کارفرما ہے۔ گویا اس آیت میں اس پر متنبہ کیا کہ حیات دنیوی زمین سے اگنے والی فصل کی مثل ہے (اسی کی مثل اس میں تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں) لہٰذا اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے (اور نہ اس پر فریفتہ ہونا چاہئے) لیکن اہل عقل کے سوا کوئی اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور جو نصیحت نہیں پکڑتا اس کا شمار اہل عقل و دانش میں نہیں بلکہ وہ تو چوپایوں کی مثل ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾

'' بھلا وہ (سعادت مند) کشادہ فرمایا ہو اللہ نے جس کا سینہ اسلام کے لئے تو وہ اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے ۱ۖ پس ہلاکت ہے ان سخت دلوں کے لئے جو ذکر خدا سے متاثر نہیں ہوتے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔''

باطل کو باطل پہچان لیتا ہے۔اور جودین حضور نبی کریم ﷺ علیہ الصلوۃ والتسلیم لے کر آئے بلا شک وشبہ کامل طور پر اس کے بارے اسے یقین آجاتا ہے۔کیونکہ سینہ دل اور روح کا محل ہے اور دل ہی اسلام کو قبول کرتا ہے تو جب اس کا دل احکام اسلام کو قبول کر لیتا ہے تو وہ اس ظرف کی طرح ہو گیا جو اپنے مظروف کے لئے کھل جائے اور وسیع ہو جائے حتیٰ کہ مظروف مکمل طور پر اس میں سما جائے۔

پس جس آدمی کا سینہ اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے کشادہ فرما دے تو وہ شخص اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے۔نور سے مراد بصیرت اور دل کی بینائی ہے۔

افمن میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے اور فاء سابقہ اس ارشاد کے مفہوم پر عطف کے لئے ہے اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۝ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ۔کیونکہ اس سے کافر اور مومن کا فرق سمجھا جا رہا ہے۔ترکیب کلام میں من موصول مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتا ہے اور انکار مضمون فاء کی طرف راجع ہے۔گویا کہ اسطرح فرمایا کہ جب مومن اور کافر کے درمیان فرق ثابت ہو چکا تو پھر وہ آدمی جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کشادہ فرما دیا اور پھر اپنی جناب سے ایسی بصیرت اور نور عطا فرمایا جس کے سبب وہ ایمان کی سعادت سے بہرہ ور ہوا! اور ہدایت سے مزین وآراستہ ہو گیا تو وہ اس آدمی کی طرح نہیں ہو سکتا جس کے دل پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور اس کا دل سخت ہو گیا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰي نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ تلاوت فرمائی تو ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اس آدمی کا سینہ کیسے وسیع ہو جاتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جب وہ نور دل میں داخل ہوتا ہے تو اس کا سینہ وسیع اور کشادہ ہو جاتا ہے۔پھر ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اسکی علامت کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اَلْاِنَابَةُ اِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ وَالتَّجَافِيْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالتَّاَهُّبِ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِهٖ(1)۔دارالخلو دیعنی یوم آخرت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا' دارالغرور مقام فریب یعنی دنیا سے دور ہونا اور موت آنے سے قبل اس کے لئے تیاری کرنا۔اسے علامہ بغوی' حاکم اور علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

ع (پس ہلاکت ہے ان سخت دلوں کے لئے جو ذکر خدا سے متاثر نہیں ہوتے) فویلٌ میں فاء سببیہ ہے اور من ذکر اللّٰہ، القاسیة کے متعلق ہے۔معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی وجہ سے ان کے دل سخت ہوتے ہیں۔یعنی جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے یا ان پر آیات الٰہیہ کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کی قساوت اور سختی اور بڑھ جاتی ہے۔شدید ہو جاتی ہے اور یہ انداز من کی جگہ عن لگانے کی نسبت زیادہ بلیغ ہے کیونکہ جس شے کی وجہ سے دلوں میں قساوت اور سختی آجاتی ہے اسے وہ قطعاً قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ قبول کرنے سے انکار انتہائی شدید ہوتا ہے بخلاف ایسی صورت کے کہ (دعوت اور شے کی طرف ہو) اور قساوت وسختی کا سبب اس کے علاوہ کوئی دوسرا ہو (تو پھر اسے قبول کرنے سے انکار اتنا شدید نہیں ہوتا)

جن لوگوں کا سینہ اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے کشادہ فرما دیتا ہے ان کے وصف قبول اور سخت دلوں کے وصف انکار میں اظہار مبالغہ کے لئے ہے۔جب اللہ تعالیٰ نے شرح صدر کا ذکر فرمایا تو سینہ وسیع کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی اور جب اس کے بالمقابل قساوت قلبی کا ذکر کیا تو اس کی نسبت دل کی طرف کی (کیونکہ بندہ مومن ذکر الٰہی سے متاثر ہوتا ہے اور کافر کی قساوت قلبی او

فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ ۔

بعض نے کہا ہے کہ ذکراللہ سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی اصل عبارت مِنْ تَرْكِ ذِكْرِ اللّٰهِ ہے۔ یعنی جن کے دل اللہ کا ذکر ترک کرنے کی وجہ سے سخت ہو گئے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

مالک بن دینار نے کہا ہے کہ کسی بندے کے لئے قساوت قلبی سے بڑھ کر سزا مقرر نہیں کی گئی اور کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا غضب تب ہی آتا ہے جب اس کے افراد سے رحمت اور نرمی کے جذبات چھین لئے جاتے ہیں (۱)۔ (یعنی جب ان میں رافت و رحمت اور باہمی نرمی ختم ہو جاتی ہے تو پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی گرفت آ جاتی ہے) حاکم وغیرہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوتا رہا اور ایک طویل زمانہ تک آپ لوگوں پر اس کی تلاوت کرتے رہے تو آخر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ ہمارے ساتھ (اس کے علاوہ بھی) کچھ گفتگو فرمائیں (تو وہ بہتر ہو گی) ابن جریر نے حضرت عون بن عبداللہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کچھ اکتا گئے تو عرض کی اگر آپ ہمارے ساتھ (اس کے علاوہ بھی) کچھ گفتگو فرمائیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾

''اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے نہایت عمدہ کلام یعنی وہ کتاب جس کی آیتیں ایک جیسی ہیں ۱؎ بار بار دہرائی جاتی ہیں ۲؎ اور کانپنے لگتے ہیں اس کے (پڑھنے) سے بدن ان کے جو ڈرتے ہیں اپنے پروردگار سے۔ پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے رہنمائی کرتا ہے اس کے ذریعے جسے چاہتا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۳؎۔''

۱؎ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ ارشاد باری تعالیٰ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ کے لئے تقریر و تائید ہے اور ان کے درمیان تمام آیات بطور جملہ معترضہ کے مذکور ہیں۔ اس آیت کی ابتداء میں اسم جلالت لفظ اللہ ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد نزل مذکور ہے تو یہ انداز بیان ایک تو اللہ تعالیٰ کی طرف قرآن کریم کی نسبت ہونے میں تاکید پیدا کرتا ہے۔ دوسرا نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید کی عظمت شان پر دلالت کرتا ہے اور تیسرا حقیقتاً اس کے حسین اور خوبصورت کلام ہونے کی شہادت دیتا ہے۔

كِتٰبًا کا لفظ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ سے بدل ہے یا اس سے حال ہے۔ اور مُّتَشَابِهًا، كِتٰبًا کی صفت ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات طیبات صحت معنیٰ منافع عامہ پر دلالت کرنے اور معجز نما حسن میں باہم ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں (ایسا قطعاً نہیں کہ کوئی آیت دوسری کی تکذیب کرتی ہو)

۲؎ [illegible]

جانے والی کتاب) پس یہ ہمارے اس قول کی طرح ہے کہ قرآن سورتیں ہے اور آیات ہے اور انسان رگیں ہے ہڈیاں ہے گوشت ہے اور اعصاب (پٹھے) ہے۔ (تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ان تمام کا مجموعہ ہے) یا پھر مَثَانِيَ مُتَشَابِهًا سے تمیز ہے۔ جیسا کہ قول ہے رَاَيْتُ رَجُلًا جَسِيْمًا حَسَنًا شَمَائِلَ۔ (تو اس میں شمائل، حسنا سے تمیز ہے) یا پھر مثنیۃ اسم فاعل کی جمع ہے کیونکہ قرآن کریم کی آیات اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کمال کی ثناء بیان کرتی ہیں اس لئے اس کی صفت مثانی (ثنا بیان کرنے والیاں) ذکر کی گئی ہیں۔

۳؎ اور کانپنے لگتے ہیں اس کے پڑھنے سے ان کے بدن جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ یعنی جب آیات وعید پڑھی جاتی ہیں تو اس کے خوف سے یہ کانپ جاتے ہیں۔ ترکیب کلام میں تقشعر منہ کا جملہ کتابا کی تیسری صفت ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عموم مغفرت کا ذکر آتا ہے تو اس کے سبب ان کے بدن اور دل نرم ہو جاتے ہیں۔ آیت طیبہ میں مطلقاً ذکر اللہ فرمایا تو یہ اس بات پر متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ اصل امر تو رحمت ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے (اس لئے ذکر اللہ کے ساتھ علیحدہ رحمت کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں)

تَلِيْنُ فعل الٰی کے واسطہ کے ساتھ ذکر اللہ کی طرف متعدی ہو رہا ہے حالانکہ الٰی ذکر اللہ کی بجائے لذکر اللہ ہونا چاہئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ذکر اللہ سے اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے تو گویا تلین فعل اطمینان اور سکون کے معنی کو متضمن ہے اور ان کا صلہ الٰی آتا ہے۔ (لہٰذا اسی مناسبت سے یہاں لام کی بجائے الٰی ذکر کیا گیا)

ذکر اللہ سے قبل قلوب کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خشیت کا بنیادی اثر دل پر ہی پڑتا ہے اور یہ دل کے عوارض میں سے ہی ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیات وعید میں جب اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مومنین کے دل خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ان کے بدن کانپنے لگ جاتے ہیں۔ اقشعرار کا معنی ہے خوف کے وقت انسان کے بدن کا منقبض ہو جانا' سکڑ جانا اور اس میں تغیر رونما ہونا۔ رعشہ طاری ہونا اور جب قرآن کریم کی ان آیات کی تلاوت کی جاتی ہے جن میں رحمت کا وعدہ ہے تو مومنین کے بدن نرم پڑ جاتے ہیں اور ان کے دلوں کو اطمینان و سکون نصیب ہو جاتا ہے۔

پہلے قرآن کریم کے بارے فرمایا کہ وہ مثانی ہے کیونکہ اس کی آیات وعدہ و وعید کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے اور اس مقام پر وہ اثر بیان فرما دیا جو اہل ایمان وعدہ و وعید کی آیات سنتے وقت قبول کرتے ہیں۔ پس تقدیر کلام اسطرح ہے يَخَافُ مِنْهُ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَتَقْشَعِرُّ جُلُوْدُهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (قرآن کریم پڑھتے وقت ان کے دل خوفزدہ رہتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور ان کے بدن کانپنے لگتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف متوجہ ہوتے وقت ان کے بدن نرم پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل مطمئن ہو جاتے ہیں)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی بندے کا بدن اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپنے لگتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے خشک درخت سے اس کے پتے گرتے ہیں(1)۔ اسے طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور علامہ بغوی نے ایک روایت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جب بندے کا بدن اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم پر حرام قرار دیتے ہیں(2)۔

تعریف اور پسندیدہ وصف ہے یا کہ قبیح اور ناپسندیدہ؟

اس کے بارے امام محی السنۃ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنی تفسیر میں انتہائی سخت موقف اختیار کیا ہے اور اسے انتہائی قبیح اور ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قتادہ نے اس کے بارے یہ ذکر کیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ کے خوف سے بدن کا کانپ جانا یہ اولیاء اللہ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود ان کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ ذکر اللہ کے سبب ان کے بدن کانپنے لگتے ہیں اور ان کے دل راحت وسکون حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کا یہ وصف بیان نہیں فرمایا کہ تلاوت قرآن کے وقت ان کی عقلیں ماؤف ہو جاتی ہیں اور ان پر غشی اور بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسا کرنا اہل بدعت کا خاصہ ہے اور یہ کیفیت شیطان کی جانب سے طاری کی جاتی ہے(1)۔ ہمیں یہ خبر دی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ میں نے اپنی دادی حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے پوچھا (اس مقام پر حضرت عبداللہ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو جدی (دادی) کہا ہے حالانکہ آپ ان کی والدہ تھیں اور جدہ کا لفظ ماں کے لئے مستعمل نہیں۔ شاید یہ عبارت میں سہو ہے) کہ رسول اللہ کے صحابہ کرام کے پاس جب قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی تھی تو ان کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟ تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا تلاوت قرآن کے وقت جو کیفیت ہونے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ان کی وہی کیفیت ہی تھی کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی جھڑ رہے ہوتے اور ان کے بدن لرزہ براندام ہوتے۔ پھر میں نے یہ عرض کی کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے پاس قرآن کریم پڑھا جاتا ہے تو وہ غش کھا کر گر پڑتے ہیں؟ تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہ نے جواب میں یہ پڑھا اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم(2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا گزر (اہل عراق میں سے) ایک کے پاس سے ہوا جو گرا پڑا تھا اور اس پر غشی کی کیفیت طاری تھی تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا اسے کیا ہوا ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ جب اس کے پاس قرآن پاک پڑھا جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر سنے تو یہی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور یہ گر جاتا ہے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا بلا شبہ بالیقین ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں لیکن اس طرح نہ گرتے ہیں نہ بے ہوش ہوتے ہیں اور آپ نے مزید فرمایا کہ شیطان لوگوں کے پیٹ میں داخل ہو جاتا ہے (اور وہ انہیں اس طرح گرا دیتا ہے) حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام تو اس طرح نہیں کرتے تھے(3)۔

میں کہتا ہوں کہ اس حالت کے طاری ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے برکات وتجلیات کا کثرت سے نازل ہونا ہے۔ جبکہ صوفی کا ظرف تنگ اور قوت برداشت اور استعداد کمزور ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر طاری نہیں ہوتی تھی اس کے باوجود کہ ان پر برکات وتجلیات کا نزول وافر اور کثرت سے ہوتا تھا تو اس کا سبب اور وجہ یہ تھی کہ حضور نبی کریم ﷺ کی صحبت کی برکت سے ان کے ظرف انتہائی وسیع اور قوت برداشت انتہائی مضبوط اور زیادہ تھی۔ (لہٰذا نہ ان پر غشی طاری ہوتی اور نہ وہ بیہوش ہو کر گرتے) صحابہ کرام کے علاوہ دیگر صوفیاء میں سے جن پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تو اس کا سبب یا تو نزول برکات کا کم ہونا ہے یا پھر ان کے حوصلہ اور ظرف کا وسیع ہونا ہے۔ لیکن تعجب ہے امام محی السنہ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ پر کہ انہوں نے ان

بھول گئے۔ حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۞۔ حالانکہ آپ نے خود اس آیت کی تفسیر میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی حکم کا ارادہ فرماتا ہے اور وحی کے الفاظ بیان فرماتا ہے تو اس کے سبب (یعنی اللہ تعالیٰ کے خوف سے) تمام آسمانوں پر شدید لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور جب آسمانوں کے مکین اسے سنتے ہیں تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ پھر سب سے پہلے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اپنا سر اٹھاتے ہیں۔ الحدیث۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد اسی طرح نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو کلام سن کر عجز و انکساری کے ساتھ ملائکہ اپنے پر مارتے ہیں تو اس سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے چٹان پر زنجیر لگنے سے آتی ہے۔ پھر جب ان کے دلوں سے وہ گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو (آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا کہا ہے؟ تو دوسرے انہیں جواب دیتے ہیں (اس نے جو فرمایا ہے) وہ حق ہے الحدیث(1)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول کہ شیطان تمہارے پیٹ میں داخل ہو جاتا ہے اور اسی طرح حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم پڑھنا تو انہیں اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ اس مقام پر ان دونوں کو یہ گمان ہوا کہ اس آدمی نے مکر و فریب کے ساتھ اپنے اوپر غشی طاری کر رکھی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ایسے آدمی کی نسبت شیطان کی طرف کی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے حوصلے وسیع تھے، قوت استعداد قوی تھی اس لئے ان پر اور ان کی مثل دیگر افراد پر ایسی حالت کبھی طاری نہ ہوتی تھی۔ (اسی بناء پر انہیں یہ شبہ ہوا کہ اس آدمی نے مکر و فریب سے یہ حالت بنا رکھی ہے) جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر بطور دلیل یہ بھی ہے کہ ابن سیرین کے پاس ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا جو قرآن کریم کی تلاوت سن کر غش کھا کر گر پڑتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے اور ان کے درمیان فرق اس طرح ظاہر ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی مکان کی چھت سے پاؤں نیچے لٹکا کر بیٹھ جائے۔ پھر اسکے پاس اول سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا جائے تو اگر وہاں سے قرآن کریم سن کر وہ گر پڑے اور بیہوش ہو جائے تو جان لو وہ سچا ہے(2)۔ بصورت دیگر اس کی غشی اور اس کے گرنے کو جھوٹ اور مکر و فریب پر ہی محمول کیا جائے گا۔ گویا آپ نے اس کی سچائی اور ایک بلند و بالا مکان کی چھت سے اپنے آپ کو گرانے کے ساتھ معلق کر دیا (تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی ایسے لوگوں کو فریبی خیال کرتے تھے)

جاننا چاہئے کہ انسان کی قوت برداشت ملائکہ کی نسبت زیادہ قوی ہے اور انسان کا حوصلہ اور ظرف ملائکہ کی نسبت زیادہ وسیع ہے۔ جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی شاہد ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ الی قولہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞۔ اور مزید فرمایا اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الآیۃ۔ یہی وجہ ہے کہ ملائکہ جب بھی وحی سنتے ہیں تو ان پر غشی کی حالت طاری ہو جاتی ہے لیکن انسان پر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کا نزول جب مکمل ہو جاتا ہے تو سوائے کسی نادر مثال کے ان کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل رونما نہیں ہوتا اور جب انسان کا عروج تو مکمل ہو لیکن نزول ناقص ہو تو پھر اکثر حالت بدل جاتی ہے۔

جاننا چاہئے کہ جب صوفی حالت سکر میں ہوتا ہے تو شعر اور تغنی کی صورت میں محبوب کا ذکر سنتے وقت اسکی حالت اکثر بدل جاتی

کیونکہ قرآن کریم سننے اور اس کی تلاوت کے وقت ان برکات اصلیہ کا کثرت سے نزول ہوتا ہے جو تجلیات ذاتیہ اور صفات حقیقیہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ لیکن ایسے کثیر صوفیاء جو ایک ہی مقام پر رکے ہوئے ہیں (یعنی ان کے روحانی درجات و مراتب میں ترقی نہیں ہو رہی) وہ ان برکات کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ سماع کے وقت تو ان کی حالت بدل جاتی ہے مگر تلاوت قرآن کے وقت ان میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔

لیکن ایسے صوفیاء جو ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے ہوئے افق اعلیٰ تک جا پہنچے پھر رب العزت کے قریب تر ہوئے اور دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کے مقام پر فائز ہوئے ان کی حالت میں قطعاً تغیر و تبدل رونما نہیں ہوتا مگر صرف اتنا جتنا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے حال میں تغیر رونما ہوتا تھا کہ انکی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی بہنے لگتے تھے اور ان کے بدنوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا پھر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف متوجہ ہونے کے ساتھ ان کے بدن نرم پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل قرار و اطمینان حاصل کر لیتے ہیں۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ الآیۃ یہی خوف و امید یا احسن الحدیث، یعنی قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی (جانب سے) ہدایت ہے۔ اسی ہدایت کے ساتھ جس کے لئے چاہتا ہے راہنمائی فرما کر ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ اور رسوا کر دیتا ہے پھر اسے اس گمراہی سے نکالنے والا اور کوئی نہیں ہوتا۔

اَفَمَنْ یَّتَّقِیْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ قِیْلَ لِلظّٰلِمِیْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

''بھلا وہ شخص جو ڈھال بنائے گا شدید عذاب کے سامنے اپنے چہرہ کو روز قیامت (وہ کتنا بدنصیب ہوگا) [1] اور کہا جائیگا ظالموں کو (اب) چکھو جو کچھ تم کمایا کرتے تھے [2] جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے تو آیا ان پر عذاب وہاں سے جہاں سے وہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے [3] پس چکھائی انہیں اللہ نے ذلت اس دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے۔ کاش! وہ جان لیتے [4]۔''

[1] اَفَمَنْ یَّتَّقِیْ میں استفہام انکاری ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَیَسْتَوِی الْفَرِیْقَانِ فَمَنْ یَّتَّقِیْ بِوَجْهِهٖ کیا دو فریق برابر ہو سکتے ہیں؟ ایک وہ شخص جو اپنے نفس کو بچانے کے لئے اپنے چہرے کو بطور ڈھال اور سپر آگے رکھے گا۔ اصول یہ ہے کہ جب بھی کسی انسان کو کسی حملہ آور کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اپنے چہرے کو اس کے حملہ سے بچانے کے لئے اپنے آگے کر لیتا ہے تا کہ وہ حملہ کو اپنے ہاتھوں پر روک سکے۔ کیونکہ چہرہ تمام اعضاء بدن میں سے اشرف و اعلیٰ عضو ہے لیکن کافر کو جب جہنم میں پھینکا جائے گا تو اس کے دونوں ہاتھ اسکی گردن کے ساتھ بندھے ہوں گے۔ لہٰذا اس کے لئے اپنے آپ کو بچانے کے لئے چہرے کو آگے کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوگا

میں بہت بڑے پہاڑ کی مثل گندھک کی ایک چٹان لٹکی ہوگی۔ پس فوراً اس پتھر میں آگ بھڑک اٹھے گی (۱) یعنی کیا اپنا کا فر اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو عذاب سے مکمل طور پر پر امن اور محفوظ ہوگا۔ یہاں بھی مبتدا کی خبر محذوف ہے جیسا کہ اس جیسے مقامات پر خبر کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ یعنی وہ کتنا بد نصیب ہوگا۔

۲؎ اور ظالموں کو کہا جائیگا۔ اس میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے ایک تو اس لئے تا کہ ان کے ظالم ہونے پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے اور دوسرا اس لئے تا کہ وہ اس سبب پر مطلع ہو جائیں جس کی بناپر انہیں یہ کہا جارہا ہے ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ۔ کہ اب اس کا وبال چکھو جو تم کمایا کرتے تھے۔ ترکیب کلام میں قِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ کا جملہ يتقون کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ سابقہ کلام کے مفہوم پر معطوف ہو اور وہ ہے عذاب۔

۳؎ کفار مکہ سے پہلے آنے والے لوگوں نے بھی اپنے انبیاء ورسل علیہم السلام کو جھٹلایا اور انہوں نے بھی عذاب آنے کی خبر کی تکذیب کی۔ لیکن ان پر عذاب ایسی جہت اور سمت سے آیا جہاں سے عذاب آنے کے بارے ان کے دلوں میں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

۴؎ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دنیوی زندگی میں ذلت چکھائی مثلاً ان کی شکلیں مسخ کر دیں، زمین میں دھنسا دیا، قتل وغارت، ان پر ہوا اور چیخ کا مسلط کرنا، پتھروں کا برسنا اور ان کا غرق کیا جانا وغیرہ۔

اور ان کے لئے جو عذاب آخرت تیار کیا گیا ہے وہ اس دنیوی عذاب کی نسبت اپنی شدت، سختی اور دائمی ہونے کے اعتبار سے بہت بڑا ہے۔ اگر اہل مکہ اہل علم اور نظر وفکر رکھنے والے لوگ ہوتے تو بالیقین اپنے سے پہلے آنے والے لوگوں کے حالات سے درس عبرت حاصل کرتے۔ یا معنی یہ ہے کاش! یہ جھٹلانے والے اس تکذیب کے انجام کو جانتے ہوتے تو کبھی تکذیب نہ کرتے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٢٨﴾

"اور ہم نے بیان کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن (حکیم) میں ہر قسم کی مثالیں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں ۱؎ اور ہم نے دیا ہے (انہیں) قرآن جو عربی زبان میں ہے جس میں ذرا کجی نہیں، تاکہ وہ اللہ سے ڈریں ۲؎۔"

۱؎ ہم نے لوگوں کے فائدے اور تبصرے کے لئے اس قرآن حکیم میں ہر قسم کی ایسی مثالیں بیان کی ہیں جن کی امور دینیہ میں غور وفکر کرنے والے آدمی کو ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اس کے سبب نصیحت قبول کریں۔

۲؎ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا یا تو مدح کی بناء پر منصوب ہے (کہ اس سے پہلے امدح فعل محذوف ہے) یا ھذا سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ بشرطیکہ ہم یہ کہیں کے مجرور مفعول بہ ہے۔ یا پھر تقدیر کلام اس طرح ہے فی تنزیل ھذا القران تو اس صورت میں ھذا القران، تنزیل مقدر کا مفعول ہو جائیگا اور اس میں اعتماد صفت پر ہوگا جیسا کہ اس قول میں ہے جاء نی زید رجلاً صالحًا۔

غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ کا معنی ہے کہ اس میں کسی بھی اعتبار سے کوئی خلل اور اختلال نہیں اور یہ لفظ مستقیم کی نسبت زیادہ بلیغ ہے اور یہ معانی کے ساتھ مختص ہے۔ (یعنی معنوی اعتبار سے بھی اس میں کسی نوع کا کوئی ضعف یا خلل موجود نہیں ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے قرآن کریم میں کوئی اختلاف [illegible]

قرآن کریم میں کوئی التباس اور شک موجود نہیں اور سدی نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ قرآن کریم مخلوق نہیں۔ حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ تعالیٰ سے بھی یہی معنی روایت کیا گیا ہے(1)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے ستر تابعین سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قرآن کریم نہ خالق ہے اور نہ ہی مخلوق(2)۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ یہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین ہے کہ یہ خالق ہو اور نہ یہ اس کا غیر ہے اور اس سے جدا ہے کہ یہ حادث اور مخلوق ہو جائے۔ یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ کلام لفظی قدیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ کیونکہ وہ کلام نفسی جس پر کلام لفظی دلالت کرتی ہے وہ عربی ہونے کی صفت سے متصف نہیں ہو سکتی (کیونکہ عربی اور عجمی ہونا الفاظ کی صفت ہے نہ کہ معانی کی۔)

اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ کلام لفظی کے حروف اس کے حادث ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ (کیونکہ یہ حروف یکے بعد دیگرے ملا کر ایک جملہ اور کلام بنتا ہے اور یہ ترتیب حروف اس کے حادث ہونے کی علامت ہے۔) تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ محل کلام تنگ ہے اور حادث ہے۔ اس لئے تمام حروف یکے بعد دیگرے استعمال ہو کر سارے کلام کو حادث بنا دیتے ہیں۔ لیکن وہ کلام جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں حروف کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے کا وہم کرنا حاضر پر غائب کو قیاس کرنے کی طرح ہے۔ جیسا کہ رؤیت باری تعالیٰ کا انکار کرنے والے ایسے ہی وہم میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے رؤیہ مخلوق پر رؤیۃ خالق کو قیاس کرتے ہوئے یہ شرائط ذکر کر دیں کہ آنکھ کے ساتھ دیدار کے لئے جہت اور مسافت وغیرہ کا پایا جانا شرط ہے۔ لیکن خالق کی رؤیت ان سب شرائط سے پاک ہے کیونکہ نہ تو کوئی ایسی شئی ہے جو اس کی ذات میں اس کی مثل ہو اور نہ کوئی ایسی شئی ہے جو اس کی صفات کے ساتھ متصف ہونے میں اس کی مثل ہو اور نہ کسی شئی میں اس کی صفات میں کوئی صفت اس جیسی موجود ہے بلکہ وہی سب سے اعلیٰ شان والا ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ تا کہ وہ کفر و معاصی کا ارتکاب کرتے وقت اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔ لعلهم يتقون دوسری علت ہے جو پہلی علت لعلهم يتذكرون پر مرتب ہے۔ یا اس سے بدل ہے یا پھر پہلی علت کا بیان ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾

”بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال ایک غلام ہے جس میں کئی حصہ دار ہیں جو سخت بدخو ہیں۔ اور ایک غلام ہے جو پورا ایک مالک کا ہے [1] کیا ان دونوں کا حال یکساں ہے [2] سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے [3]۔“

[1] اللہ تعالیٰ نے مشرک اور موحد کی ایک مثال بیان فرمائی ہے۔ ترکیب کلام میں رجلاً مثلاً سے بدل ہے اور رجلاً سے پہلے مضاف مقدر ہے یعنی مثل رجل۔ متشاکسون کا معنی ہے باہم اختلاف رکھنے والے، سخت بدخو۔ ترکیب کلام میں یہ شرکآء کی صفت ہے اور وہ ظرف

باطل کے مطابق متعدد خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال ایسے غلام سے بیان فرمائی جو متعدد بدخو حصہ داروں کا مشترکہ غلام ہو کہ ان مالکوں میں سے ہر ایک اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور تمام شرکاء باری باری اسے اپنے اپنے کاموں میں مشغول رکھتے ہیں۔ جس کے سبب وہ غلام حیرت اور پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور اس کا دل ہمہ وقت مضطرب اور غمزدہ رہتا ہے، کبھی بھی اسے راحت و سکون نصیب نہیں ہوتا۔ (تو جس طرح مشترک غلام ہمہ وقت پریشان رہتا ہے اسی طرح مشرک بھی سکون اور راحت نہیں پا سکتا)

وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ کا معنی ہے اور ایک غلام ایسا ہے جو خالص ایک ہی آدمی کا مملوک ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے سَلَمًا کو سَالِمًا اسم فاعل کے وزن پر پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے بغیر الف کے حسن کے وزن پر۔ اللہ تعالیٰ نے مومن موحد کی مثال ایسے غلام کے ساتھ بیان فرمائی ہے جس کا مالک صرف ایک ہے، اس کی ملکیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ (مقصود یہ ہے کہ جس طرح یہ غلام پرسکون اور راحت و آرام کی زندگی بسر کرتا ہے۔ پریشانیوں اور غموں سے دور رہتا ہے اسی طرح بندہ مومن بھی اطمینان قلب پاتا ہے اور پرسکون زندگی بسر کرتا ہے)

۲؎ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا۔ کیا ان دونوں غلاموں کا حال یکساں اور مساوی ہے۔ یہ استفہام انکاری اور تقریری ہے۔ یعنی مخاطب سے یہ اقرار کرانا مقصود ہے کہ ان دونوں کی حالت یکساں نہیں (یہ قطعاً مساوی حال میں نہیں) کیونکہ بالیقین ایسا غلام جس کا مالک صرف ایک ہو اس کا حال اس غلام کی نسبت بہت اچھا اور بہتر ہوگا جس کی ملکیت میں کئی شریک ہوں تو اسی طرح مومن موحد کا حال بھی مشرک کے مقابلہ میں کہیں بہتر، اعلیٰ اور راحت بخش ہوگا۔ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا میں تقدیر کلام اس طرح ہے قَالَ اللّٰهُ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا (یعنی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں کا حال یکساں ہوتا ہے) اور یہ جملہ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کے مقصود کا بیان ہے اس کی وضاحت کے لئے ہے اور هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا میں مثلاً کا لفظ تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

۳؎ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ فی الحقیقت حمد و ستائش کے لائق ہونے میں کوئی دوسرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں۔ کیونکہ وہی بذات منعم ہے اور مالک مطلق ہے (کوئی شی اس کی ملکیت اور قدرت سے خارج نہیں) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ لہٰذا وہ اپنی فرط جہالت کی بناء پر دوسروں کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں تقدیر کلام اس طرح ہے قل الحمد للہ۔ یعنی الحمد للہ سے پہلے لفظ قل مقدر ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو نعمت توحید سے نوازنے والا ہے اور تمام تر تعریفیں اسی وحدہٗ لاشریک رب کے ساتھ مختص ہیں جو حقیقۃً قابل ستائش ہے۔ اس صورت میں بل اضراب کے لئے نہیں بلکہ یہ ابتدائیہ ہے جو کہ جاہلین کو بیان کرنے کے لئے ہے۔

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِندَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ ﴿٣١﴾

''بیشک آپ نے بھی (دنیا سے) انتقال فرمانا ہے اور انہوں نے بھی مرنا ہے ۱؎ پھر تم (سب) روز حشر اپنے رب کے حضور میں آپس میں جھگڑو گے ۲؎۔''

۱؎ بیشک آپ نے بھی دنیا سے عنقریب انتقال فرمانا ہے۔ یہاں میت صفت مشبہ کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ [illegible]

ذرہ بھر شک وشبہ نہیں (تو اسی یقین پر دلالت کرنے کے لئے صفت مشبہ کا صیغہ ذکر کیا) اور کفار مکہ یا تمام لوگوں نے موت سے اعراض کے باوجود بالیقین مرنا ہے۔ لہٰذا موت کوئی عیب یا نقص نہیں۔

محلی نے لکھا ہے کہ جب کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کے جلد انتقال کرنے کی خواہش کرنے لگے تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فرآء اور کسائی نے کہا ہے کہ میت (یعنی اگر یاء مشدد ہو تو) اس آدمی کو کہتے ہیں جو مرا نہ ہو اور مستقبل میں مرنے والا ہو اور میت (یعنی اگر یا مخفف ہو تو اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو مر چکا ہو۔ اسکی روح اس سے جدا ہو چکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں میت اور میتون کو یاء مشدد کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے نہ کہ مخفف کے ساتھ۔

۳۔ پھر آپ اور کفار مکہ یا سب لوگ روز حشر اپنے رب کے حضور میں آپس میں جھگڑو گے۔ پس آپ ان کے خلاف حجت پیش کرتے ہوئے کہیں گے۔ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا اور انہوں نے میری تکذیب کی حالانکہ میں عقیدہ توحید میں حق پر تھا اور یہ عقیدہ شرک میں باطل پر تھے۔ میں نے انہیں وعظ وارشاد اور تبلیغ کرنے کی کوشش کی اور یہ اپنے عناد اور تکذیب پر ہی ڈٹے رہے اور کفار اپنے باطل اور جھوٹے اقوال کے ساتھ معذرت پیش کرنے کی کوشش کریں گے مثلاً کہیں گے۔ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشۡرِكِيۡنَ ۞۔ قسم اللہ کی جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں تھے۔ مَاجَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ۔ ہمارے پاس کوئی خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا آیا ہی نہیں اور یہ کہیں گے اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا۔ بیشک ہم نے تو اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور ان کے کہنے پر چلتے رہے) مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا۔ ہم اسی راہ پر چلتے رہے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا۔ لوگ آپس میں (حقوق سے متعلق) ایک دوسرے سے جھگڑا کریں گے۔ پس سب سے پہلے خون کا فیصلہ کیا جائے گا۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون (قتل) کے بارے فیصلہ کیا جائیگا (1)۔

ترمذی، ابن ماجہ، طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مقتول حاضر ہوگا اس طرح کہ ایک ہاتھ میں اپنا سر لٹکائے ہوئے ہوگا اور دوسرے ہاتھ سے قاتل کو پکڑے ہوئے ہوگا اور اس کی گردن کی رگوں سے خون ابل رہا ہوگا یہاں تک کہ عرش کے پاس پہنچ کر عرض کرے گا اے رب العالمین! اس نے مجھے قتل کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قاتل سے فرمائے گا تو ہلاک و برباد ہوا۔ پھر اسے جہنم کی طرف لے جایا جائیگا (2)۔ اسے ترمذی نے حسن کہا ہے۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مقتول اپنے قاتل کو پکڑے ہوئے حاضر ہوگا اور اس وقت اس کی گردن کی رگوں سے خون نکل رہا ہوگا اور عرض کرے گا اے میرے رب! اس سے پوچھئے اس نے مجھے کیوں قتل کیا تھا؟ تو قاتل کہے گا میں نے اسے قتل کیا تھا تا کہ فلاں کو عزت (غلبہ) حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا تمام تر عزت تو فقط اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ہے (3)۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے ذکر فرمایا۔ قاتل اور مقتول دونوں کو لایا جائیگا اور انہیں رحمان کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر قاتل سے پوچھا جائیگا تو نے اسے کیوں قتل کیا تھا؟ اگر اس نے اسے اللہ تعالیٰ

عزت وغلبہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے اور اگر اس نے اسے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کے لئے قتل کیا ہوگا تو پھر کہے گا میں نے اسے اس لئے قتل کیا ہے تا کہ فلاں کو عزت وغلبہ نصیب ہو تو پھر جواباً کہا جائیگا کہ عزت وغلبہ فلاں کے لئے نہیں ہے۔ چنانچہ انتقاماً ہر اس ظالم کو قتل کر دیا جائیگا۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کو قتل کیا ہوگا اور اسے اتنے دنوں تک موت کا مزہ چکھایا جاتا رہے گا جتنے دنوں تک اس نے مقتول کو دنیا میں زندگی سے محروم رکھا ہوگا۔

احمد، ترمذی اور حاکم نے عبد بن زبیر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے ان کے باپ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب آیت طیبہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ نازل ہوئی تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! کیا دنیا میں ہمارے مابین سرزد ہونے والے ہمارے بڑے بڑے گناہ دوبارہ ہمارے سامنے لائے جائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! انہیں تم پر دوبارہ لایا جائیگا یہاں تک کہ ہر حقدار کو اس کا حق پہنچ جائے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا قسم بخدا! معاملہ بڑا سخت اور شدید ہوگا۔ اسے حاکم نے صحیح کہا ہے (1)۔

طبرانی نے ایسی سند کے ساتھ جس پر کوئی اعتراض نہیں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے مرد اور عورت کا جھگڑا پیش کیا جائیگا۔ قسم بخدا! مرد اپنی زبان سے کچھ نہیں بولے گا۔ البتہ عورت کے ہاتھ اور پاؤں اس کے اپنے خلاف ان عیوب کی شہادت دیں گے جو وہ اپنے خاوند میں نکالا کرتی تھی اور پھر مرد کے ہاتھ اور پاؤں اس زیادتی کی شہادت دیں گے جو وہ عورت پر کیا کرتا تھا۔ پھر مرد کو اپنے خدام سمیت بلایا جائیگا پھر اصل بازار کو بلایا جائیگا۔ وہاں دانق اور قیراط نہیں پائے جائیں گے۔ بلکہ وہاں ظالم کی نیکیاں ہوں گی جو مظلوم کو دے دی جائیں گی اور مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پھر ظلم کرنے والوں کو لوہے کے گرزوں کے ساتھ لایا جائے گا اور کہا جائیگا انہیں جہنم میں پھینک دو (2)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے اپنا جھگڑا پیش کرنے والے دو پڑوسی اور ہمسائے ہوں گے (3)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر کسی آدمی نے ظلماً اپنے بھائی کا حق لے رکھا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ دنیا میں ہی اسے ادا کر کے اپنے ذمے سے اتار دے کیونکہ قیامت کے دن کوئی درا ہم ودنانیر نہیں ہوں گے۔ بلکہ اگر اس کے کوئی اعمال صالحہ ہوں گے تو اس حق کی مقدار وہ اس سے لے لئے جائیں گے اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوئیں تو صاحب حق کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے (4)۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی ہم میں مفلس وہی ہے جس کے پاس کوئی درہم ہو نہ ہی کوئی ساز وسامان تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزے اور زکوۃ جیسے اعمال صالحہ لے کر آئے گا۔ لیکن اس نے کسی کے ساتھ بدکلامی کی ہوگی، کسی پر تہمت عائد کی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا یا کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔ پس ایسے برے اعمال کے بدلے اسے پکڑ لیا جائے گا اور اس کی نیکیوں میں سے ان کا بدلہ چکایا جائیگا [illegible]

حقدار کو کچھ دوسرے مستحق کو (حتیٰ کہ تمام حقداروں کو ظلم وزیادتی کے سبب اس کی نیکیاں دی جائیں گی) اگر تمام گناہوں اور زیادتیوں کا بدلہ مکمل ہونے سے قبل اس کی نیکیاں ختم ہوں گی تو پھر ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا(1)۔

میں کہتا ہوں کہ وہ نیکیاں جن کا اجر مظلوم ظالم سے لے جائیگا ان سے مراد ایمان کے علاوہ دیگر نیکیاں ہیں کیونکہ ظلم اور اس کے علاوہ دیگر برائیاں کفر کے سوا تمام گناہوں کی سزا متناہی ہے۔ختم ہو جانے والی ہے۔

اہل السنت والجماعت کا یہی نظریہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کرنے والا ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں رہے گا اور ایمان کی جزاء ہمیشہ جنت میں رہنا ہے اور یہ غیر متناہی ہے۔لہٰذا جو عمل (ظلم وغیرہ) متناہی ہے اس کا بدل غیر متناہی نہیں ہو سکتا۔حاصل کلام یہ ہے کہ جب خطاؤں اور مظالم کا بدلہ چکائے جانے سے قبل ظالم کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور صرف ایمان اس کے پاس باقی رہ جائیگا تو پھر مظلوموں سے ان کے کفر کے سوا دیگر گناہ اور غلطیاں لے کر ظالم کے حصہ میں ڈال دی جائیں گی کیونکہ کفر کی سزا غیر متناہی ہے لہٰذا کفر کو ایسے عمل کا بدل نہیں بنایا جا سکتا جس کی سزا متناہی ہے کہ اسے ظالم پر ڈال دیا جائے۔پھر ظالم کو جہنم میں ڈال دیا جائیگا اگر مظلوم نے اسے معاف نہ کیا اور وہ اپنے گناہوں کی سزا مکمل ہونے تک جہنم میں ہی رہے گا۔بعد ازاں اسے جہنم سے نکال کر اس کے ایمان کے سبب جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہے گا۔علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی میرے قول کی طرح ہی بیان کیا ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن ضرور بر ضرور حقوق ان کے اھل تک لوٹائے جائیں گے۔حتیٰ کہ سینگوں والی بکری سے اس بکری کو بھی حق دلایا جائیگا جس کے سینگ نہیں(2)۔اور ایک روایت میں ہے کہ بغیر سینگوں والی بکری کو سینگوں والی بکری سے اور سرخ چیونٹی کو دوسری چیونٹی سے حق دلوایا جائے گا۔ان کے علاوہ اس بارے میں کثیر احادیث ہیں۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ پر یہ آیت نازل ہوئی ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ تو ہم نے کہا تھا کہ ہم کیسے جھگڑا کریں گے حالانکہ ہمارا دین اور ہماری کتاب ایک ہے حتیٰ کہ میں نے اب دیکھ لیا ہے کہ ہم میں سے بعض بعض کے چہروں پر تلواریں مار رہے ہیں تو میں نے پہچان لیا کہ واقعۃً یہ آیت ہمارے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت کی ہے(3)۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے یہ روایت ہے کہ ہم کہا کرتے تھے ہمارا رب ایک ہے، ہمارا نبی ایک ہے اور ہماری کتاب ایک ہے پھر یہ خصومت اور قیامت کے دن حق طلبی کا مطالبہ کیا ہے؟ پھر جب جنگ صفین ہوئی اور ہم میں سے بعض نے بعض پر تلواروں کے وار کئے تو پھر ہم نے کہا ہاں یہی وہ (خصومت ہے جس کا تذکرہ اس آیت میں کیا گیا ہے)(4)

ابراہیم کا قول ہے کہ جب آیت کریمہ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے کہا ہم کیسے جھگڑا

ہمارا جھگڑا ہے(1)۔

مذکورہ تمام اقوال کا مقتضیٰ یہ ہے کہ صحابہ کرام یہ گمان کرتے تھے کہ یہ قتل وخون کے جھگڑے فقط مومنین اور کفار کے درمیان ہوتے ہیں۔ لیکن جب مسلمانوں کے درمیان باہمی بغاوت اور فساد ظاہر ہوا تو تب ان پر یہ واضح ہوا کہ یہ جھگڑے اہل ایمان کے درمیان بھی ہو سکتے ہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾

”پس اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اور تکذیب کرتا ہے اس سچ کی جب وہ اس کے پاس آیا۔ کیا جہنم میں کفار کا ٹھکانا نہیں ہے 1 اور وہ ہستی جو اس سچ کو لے کر آئی اور جنہوں نے اس سچائی کی تصدیق کی یہی لوگ ہیں جو پرہیزگار ہیں 2۔“

1 فَمَنْ اَظْلَمُ میں فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ کفار کا حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ جھگڑا کرنا ہی ان کے تمام لوگوں سے بڑھ کر ظالم ہونے کا سبب ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اور یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کی اولاد ہے اور (الٰہ ہونے میں) اور بھی اس کا شریک ہے۔

وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ میں صدق سے مراد قرآن کریم اور دیگر پیغام خداوندی ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ لے کر ان کے پاس تشریف لائے۔ لیکن اس نے بغیر کسی توقف کے اور اس کے بارے غور وفکر کیے بغیر ہی اس کی تکذیب کر دی حالانکہ اس کی صداقت اور سچائی پر واضح شواہد اور قطعی دلائل موجود ہیں۔ (کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظالم ہو سکتا ہے؟) اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ۔ مَثْوًى کا معنی ہے اترنے کی جگہ، ٹھہرنے کی جگہ یعنی کیا جہنم میں کفار کا ٹھکانا نہیں ہے۔ یہاں استفہام تقریری ہے۔

انک میت وانھم میتون سے لے کر اس آیت تک تمام آیات میں حضور نبی کریم ﷺ کے لئے تسلی اور اطمینان کا پیغام ہے کہ آپ کی قوم آپ کی تکذیب کرتی ہے۔ آپ ان سے انتقام کے بارے قطعاً فکرمند نہ رہیئے کیونکہ ان کے اعمال کی سزا کے طور پر ان کے لئے جہنم ہی کافی ہے۔

2 وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ میں مراد جنس ہے۔ تاکہ یہ آیت تمام رسل علیہم السلام اور تمام مومنین کو شامل ہو جائے۔ اور اس پر ارشاد باری تعالیٰ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ صیغہ جمع کے ساتھ مذکور ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت والذین جآء وا بالصدق وصدقوا به بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد ہے کہ رسول اللہ ﷺ لا الہ الا اللہ لے کر تشریف لائے اور وَصَدَّقَ بِهٖٓ سے مراد بھی آپ ﷺ کی اپنی ذات ہی ہے کہ آپ ﷺ نے خود اس کی تصدیق کی اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک یہ پیغام پہنچایا(2)۔ اس تفسیر کی بناء پر خبر جمع اس لئے ذکر کی گئی کہ اُولٰٓئِكَ سے آپ ﷺ اور آپ کے تمام متبعین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

صیغہ جمع سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے متبعین ہیں۔

سدی نے کہا ہے کہ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ اور فصدق بہ سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہیں جنہوں نے اس سچ کو قبولیت کے ساتھ لے لیا۔

کلبی اور ابوالعالیہ کا قول ہے کہ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں اور وصدق بہ سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں(1)۔ اسی طرح زجاج نے حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کا قول بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

قتادہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں اور وصدق بہ سے مراد تمام اہل ایمان ہیں۔

حضرت عطار حمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد تمام انبیاء علیہم السلام ہیں اور وصدق بہ سے مراد ان کے متبعین اور پیروکار ہیں(2)۔

صاحب تفسیر مدارک اور بیضاوی نے کہا ہے کہ عربی اصول کے مطابق جآء اور صدق دونوں کا فاعل ایک ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر فاعل مختلف ہو تو وہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک الذی اسم موصول مضمر ہو اور یہ جائز نہیں۔ یا پھر اس سے ایسے فاعل کا مضمر کرنا لازم آتا ہے جس کا مرجع پہلے موجود نہیں اور یہ صورت بھی جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ کیسے یہ حکم لگا دیا گیا ہے کہ اسم موصول کا حذف جائز نہیں۔ حالانکہ تفسیر میں سے کلبی، ابوالعالیہ، قتادہ اور مقاتل نے تو وہی کچھ ذکر کیا ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے اور اس پر بطور استشہاد حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا شعر بھی موجود ہے جس میں اسم موصول محذوف ہے۔

اَمَنْ یَّهْجُوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْهُمْ　وَیَمْدَحُهٗ　وَیَنْصُرُهٗ　سَوَاءٌ

کیا ان میں سے وہ جو رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتا ہے اور (وہ جو) آپ ﷺ کی مدح و ستائش بیان کرتا ہے اور آپ کی مدد کرتا ہے وہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ تو اس میں تقدیر عبارت اس طرح ہے اَمَنْ یَّهْجُوْ وَمَنْ یَّمْدَحُهٗ سَوَاءٌ۔

صاحب البحر المواج نے کہا ہے کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق لف ونشر اجمالی کے باب سے ہو جیسا کہ اس آیت میں ہے قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ کَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ یعنی قَالَتِ الْیَهُوْدُ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ کَانَ هُوْدًا وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَنْ یَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ کَانَ نَصَارٰی۔

یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ الذی سے مراد فریق ہو اور تقدیر کلام اس طرح ہو وَالْفَرِیْقُ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ لہٰذا یہ فریق رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں کو شامل ہو اور دونوں فعلوں کی ضمیر فاعل کا مرجع الذی اسم موصول ہو اور حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کے اعتبار سے جآء بالصدق میں ضمیر فاعل الذی اسم موصول کی طرف راجع رہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات کے اعتبار سے وصدقہ بہ میں ضمیر فاعل اسم موصول الذی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا وَیَجْزِیَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَیُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَمَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ ﴿۳۷﴾

''انہیں ملے گا جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے۔ یہ صلہ ہے محسنوں کا[1] تا کہ ڈھانپ لے اللہ تعالیٰ ان سے ان کے بدترین اعمال کو[2] اور عطا فرمائے انہیں اجر انکے بہترین اعمال کا جو وہ کیا کرتے تھے[3] کیا اللہ کافی نہیں اپنے بندے کیلئے؟ (یقیناً کافی ہے) اور وہ (نادان) ڈراتے ہیں آپ کو ان معبودوں سے جو اللہ کے سوا ہیں۔ اور جسے اللہ گمراہ ہونے دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور جس کو ہدایت بخش دے اللہ تعالیٰ تو اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والا ہے۔''

[1] جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے جنت میں انہیں ملے گا اور یہ محسنین کے احسان کا صلہ ہے۔

[2] تا کہ اللہ تعالیٰ مغفرت کے سبب ان کے بدترین اعمال کو ان سے ڈھانپ لے۔ یہاں اَسْوَاء (بدتر اعمال) کا ذکر مبالغہ کے لئے کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے بدترین اعمال کو معاف فرما دے گا تو پھر ان کی نسبت کم درجہ کے برے اعمال کی مغفرت اور معافی تو بدرجہ اولیٰ ہو جائے گی۔ یہ آیت معتزلہ کے اس نظریہ کی تردید کرتی ہے (کہ کبیرہ گناہوں کی معافی نہیں ہوگی) کیونکہ یہ آیت کبیرہ گناہوں کی معافی پر بھی دلالت کر رہی ہے اور **اسو الذی عملوا** سے اس طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ ان سے جو گناہ بھی سرزد ہوتا ہے وہ اسے بڑا گناہ ہی سمجھتے ہیں اگرچہ فی الواقعہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ (گویا ان کی نظر میں تمام قسم کے گناہ بڑے ہی ہوتے ہیں) اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں صیغہ اسم تفضیل مطلق فضیلت اور برائی کے اظہار کے لئے ہو (یعنی ذاتی اعتبار سے وہ عمل انتہائی قبیح اور برا ہے) کسی دوسرے کے مقابلہ میں برائی اور فضیلت کے اظہار کے لئے نہ ہو۔ (یعنی تفضیل اضافی مراد نہ ہو)

[3] اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا اجر وثواب انہیں عطا فرمائے گا، یعنی ان کے بہت اخلاص کے سبب ان کے اچھے اور بہترین اعمال کے بدلے ایسا اجر وثواب عطا فرمائے گا جو ان کے اعمال کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین اور عظیم ہوگا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں صیغہ اسم تفضیل ''احسن'' مطلقاً زیادتی اور عظمت کے اظہار کے لئے ہو۔ (تفضیل اضافی مراد نہ ہو) مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نیک اور اچھے اعمال پر تو انہیں اجر وثواب اور بدلہ عطا فرمائے گا لیکن ان کے برے اعمال پر انہیں کوئی بدلہ یا سزا نہیں دے گا(1)۔

[4] کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے اور یہ انداز اثبات میں اظہار مبالغہ کے لئے اپنایا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی ہے۔ آیت میں عبد سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

ابو جعفر، حمزہ اور کسائی نے عبدہٗ کو عبادہٗ پڑھا ہے۔ اس صورت میں عباد (بندوں) سے مراد انبیاء علیہم السلام یا حضور نبی رحمت

ہوگی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ وَیُخَوِّفُوْنَکَ۔ (یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کیلئے کافی ہے اور وہ (نادان) آپ کو ڈراتے ہیں) اور یخوفونک سے پہلے ہمزہ مقدر مان کر اسے حال بنانا جائز ہے۔ (یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کیلئے کافی ہے حالانکہ وہ آپ کو خوفزدہ کرتے ہیں) ان معبودوں سے جو اللہ تعالیٰ کے سوا ہیں۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مشرکین حضور نبی کریم ﷺ کو اپنے بتوں کی ناراضگی سے ڈرایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ ہمارے الٰہوں اور معبودوں کو گالی گلوچ دینے اور انکے بارے ناز یبا الفاظ استعمال کرنے سے باز رہیں ورنہ انکی جانب سے آپ پر بدحواسی اور جنون کی کیفیت طاری ہو جائے گی (۱)۔ اسی طرح عبدالرزاق نے بھی بیان کیا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے دے حتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے لئے کافی سمجھنے سے غافل ہو جائے اور ایسی چیزوں سے ڈرنے لگ جائے جو نہ نقصان دے سکتی ہیں اور نہ ہی نفع تو پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں جو اسے رشد و ہدایت کی طرف راہنمائی کرے اور جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخش دے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کیلئے فضل وعظمت کا ارادہ فرمالے تو پھر اسے گمراہ کرنیوالا کوئی نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والا نہیں ہے۔ یہ استفہام بھی انکاری ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ غالب ہے۔ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ (اس سے وہ اپنے فرمانبردار بندوں کو نوازتا ہے) اور وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکتا ہے (یعنی نافرمانوں کو وہ سزا دینے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾

''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو؟ تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔ آپ فرمائیے پھر ذرا یہ تو بتاؤ کہ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا اگر اللہ تعالیٰ مجھے کچھ تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا یہ معبود دور کر دیں گے اس تکلیف کو یا اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر کچھ رحمت فرمانا چاہتا ہے تو کیا وہ روک سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو۔ فرما دیجئے مجھے کافی ہے اللہ تعالیٰ فقط اسی پر بھروسہ کرتے ہیں بھروسہ کرنے والے۔''[1]

[1] اگر آپ کفار مکہ سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے میں واحد و یکتا ہونے کی واضح دلیل ہے اور یہ امر بالکل بدیہی اور ظاہر ہے کہ بت کسی کو بھی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اہل مکہ اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔

اے پیارے محبوب! ان کے اس اعتراف اور اقرار کے بعد آپ ان سے فرمائیے کہ جب تم یہ اعتراف کرتے ہو کہ خالق کائنات صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کوئی اور نہیں تو پھر مجھے یہ بتاؤ کہ اللہ کے سوا جن بتوں کو تم پوجتے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھے کوئی تکلیف اور مصیبت پہنچانا چاہے (یہاں ارادنی کو حمزہ نے یا ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو مفتوحہ پڑھا ہے) تو کیا تمہارے وہ بت

بناء پر نصب دی ہے۔ جبکہ باقیوں نے نے مذکورہ دونوں لفظوں کو اضافت کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ان کے اس اعتراف کے بعد کہ زمین وآسمان کا خالق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے اس بات کا انکار لازم آتا ہے کہ بت اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی گئی کسی تکلیف کو دور کرنے یا اس کی عطا کردہ رحمت کو روکنے کی کوئی صلاحیت رکھتے ہیں۔ (یعنی وہ بالکل قطعی طور پر کوئی ایسی قدرت نہیں رکھتے) مقاتل نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئے کوئی جواب نہ دے سکے۔ تب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ سے یہ ارشاد فرمایا قل حسبی اللّٰہ(1)۔ آپ فرما دیجئے مجھے خیر و برکت پہنچانے کے لئے اور مجھ سے اذیت اور تکلیف کو دور کرنے کے لئے فقط اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ اسی پر بھروسہ کرتے ہیں کیونکہ مومنین یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ کیونکہ مومنین کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ہی توکل اور بھروسہ کریں اس لئے آیت کریمہ میں ان کا ذکر متوکلین کے نام سے کیا گیا ہے۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾

"فرمائیے اے میری قوم! تم عمل کئے جاؤ اپنی جگہ پر میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ پس تم ضرور جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا اور کون ہے جس پر دائمی عذاب اترتا ہے [1]۔ (اے حبیب!) ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ کتاب لوگوں (کی ہدایت) کے لئے حق کے ساتھ۔ پس جو ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ اپنا بھلا کرتا ہے۔ اور جو بھٹکتا ہے تو وہ بھٹکتا ہے اپنے آپ کو گمراہ کرنے کے لئے۔ اور آپ ان (بدبختوں) کے ذمہ دار نہیں [2]۔"

[1] عَلٰى مَكَانَتِكُمْ، علی حالکم کے معنی میں ہے۔ یعنی اے میری قوم تم اپنے حال پر رہتے ہوئے عمل کئے جاؤ۔

مکانۃ بمعنی جگہ ظرف مکاں ہے لیکن یہاں مجازاً حالت کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے جیسا کہ حیث اور ھنا دونوں ظرف زماں ہیں لیکن کبھی کبھی مجازاً ظرف مکاں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

اِنِّيْ عَامِلٌ کے بعد بھی علی مکانتی کے الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی میں اپنی حالت پر کام کرتا رہوں گا۔ حذف سے مقصود کلام میں اختصار اور وعید میں مبالغ کا اظہار ہے اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حالت ایک خاص حد پر ٹھہر نہیں جائے گی بلکہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ آپ کی قوت ونصرت میں مزید اضافہ کرتا رہے گا۔ اسی لئے آپ نے کافروں کو ان کے خلاف دونوں جہاں میں کامیاب وکامران ہونے کی وعید سنائی۔ (کہ میں کامیاب ہوں گا اور تم تباہ وبرباد ہو گے) اور اللہ نے فرمایا کہ تم ضرور جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا۔ کیونکہ آپ ﷺ کے دشمنوں کا رسوا اور ذلیل ہونا ہی آپ کے ان پر غالب آنے کی دلیل ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے کفار کو غزوہ بدر میں ذلیل ورسوا کر بھی دیا۔

عَذَابٌ مُّقِيْمٌ سے مراد دائمی عذاب ہے اور وہ جہنم کا عذاب ہے۔ یعنی اور کون ہے جس پر دائمی عذاب اترتا ہے (یہ تم جان لو گے)

حصول کے۔ ب کلام میں یہ جملہ

قول باری تعالیٰ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ کے ساتھ متصل ہے اور ان دونوں کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں۔ پس جو کتاب سے ہدایت قبول کرے گا تو اس کا فائدہ اور نفع بھی خود ہی حاصل کرے گا اور جو کوئی حق اور مصالح کے راستہ سے بہک جائے گا تو اس کی گمراہی کا وبال اسکی اپنی ذات سے آگے تجاوز نہیں کرے گا (یعنی اس کا ضرر اور نقصان بھی اسے ہی پہنچے گا) اور آپ ان بدبختوں کے ذمہ دار نہیں، یعنی آپ کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی گئی کہ آپ انہیں ہدایت قبول کرنے پر مجبور کریں۔ بلکہ آپ کو تو فقط تبلیغ کرنے کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ آپ نے پہنچا دیا۔ پس اب ان کا گمراہ ہونا آپ کے لئے قطعاً نقصان دہ اور ضرر رساں نہیں۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾

"اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا (ان کی روحیں) حالت نیند میں [1] پھر روک لیتا ہے ان روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے [2] اور واپس بھیج دیتا ہے دوسری روحوں کو مقررہ میعاد تک [3] بیشک اس میں (اس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں ان کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں [4]۔"

[1] اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ بدنوں سے جانوں کو قبض کرتا ہے۔ اس طرح کہ یا تو ان کا تعلق اپنے ابدان سے کلی طور پر منقطع ہو جاتا ہے اور اس کے لئے بدن کے ظاہر اور باطن دونوں میں تصرف کرنا ممکن نہیں رہے گا اور ایسا تب ہوتا ہے جب موت آ جائے اور بدن سے جان کھینچ لی جائے۔ یا پھر اللہ تعالیٰ من وجہ ظاہراً جان قبض کر لیتا ہے اس طرح کہ اس سے قوت حس اور حرکت ارادیہ سلب ہو جاتی ہے اور یہ ایسے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے تعلق کو عالم شھادت سے معطل کر کے عالم مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے تاکہ وہ راحت و سکون حاصل کر لے اور یہ صورت حال نیند کی حالت میں ہوتی ہے۔ توفی سے پہلا معنی (موت اور کلی انقطاع) مراد لینا حقیقت ہے اور دوسرا معنی (نیند) مراد لینا مجاز ہے۔ لہٰذا یہاں کلام کو عموم مجاز پر محمول کیا جائیگا اور وہ ہے مطلق قبض کرنا۔ چاہے صرف ظاہراً قبضہ ہو (یعنی نیند طاری ہو جائے) یا ظاھراً اور باطناً کلی قبضہ ہو (یعنی موت آ جائے) یا پھر اس میں ایک اور فعل مقدر ہوگا یعنی اس طرح کہا ہے وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ یَقْبِضُھَا فِیْ مَنَامِھَا۔ (اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا اللہ تعالیٰ ان کی جانیں صرف حالت نیند میں قبض کر لیتا ہے) یعنی ان کی حس و حرکت کو قبض کر لیتا ہے۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ انسان کے لئے ایک نفس ہے اور ایک روح۔ پس نیند کے وقت نفس نکل جاتا ہے اور روح جسم میں باقی رہتی ہے۔ یہاں نفس سے مراد عقل و شعور اور تمیز کرنے کی قوت ہے۔ یعنی نیند کے وقت آدمی سے وہ قوت سلب کر لی جاتی ہے (جس کے سبب چیزوں کا ادراک ہوتا ہے اور ان میں باہم تمیز کی جاتی ہے) اور وہ روح جسم میں باقی رہتی ہے جس کے ساتھ حیات اور نظام تنفس قائم ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ذکر کیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں نیند کے وقت روح بدن سے نکل جاتی

ہے اور اس کی شعاع جسم میں باقی رہتی ہے۔ اسی کے سبب آدمی خواب دیکھتا ہے (۱) پھر جب آدمی نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس کی روح ایک لحظہ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے بدن کی طرف لوٹ آتی ہے (1)۔

اگر یہ اثر صحیح ہے تو میرے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ بندے کی روح بدن سے باہر نکل کر عالم ملکوت میں عالم مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور یہ خروج نیند کے وقت ہوتا ہے اور اس کی شعاع یعنی اس کا تعلق بدن کے ساتھ اس طرح باقی رہتا ہے جیسے پہلے تھا۔ پس اسی خروج کے سبب وہ خواب دیکھتا ہے اور جب نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس کی روح ایک لحظہ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے بدن کی طرف لوٹ آتی ہے۔

۲۔ پھر ان روحوں کو روک لیتا ہے جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے اور انہیں بدن کی طرف واپس نہیں لوٹائے گا یہاں تک کہ نفخہ بعث وقوع پذیر ہوگا (یعنی قیامت کے دن تک پھر انہیں واپس بدنوں میں نہیں لوٹاتا)

حمزہ اور کسائی نے قضی کو صیغہ مجہول کی صورت میں قضی قاف کے ضمہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور الموت کو مرفوع پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ معروف کی صورت میں قضی پڑھا ہے اور اس میں ھو ضمیر مستتر فاعل لفظ اللہ کی طرف راجع ہے اور لفظ الموت کو مفعولیت کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔

۳۔ اور دوسری روحوں کو مقررہ میعاد تک واپس بھیج دیتا ہے۔ یعنی وہ سونے والے کی جان کو ہوش و حواس اور احساس و ادراک کی طرف موت کے لئے مقررہ وقت تک واپس بھیج دیتا ہے۔

صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رات کے وقت حضور نبی کریم ﷺ آرام کے لئے بستر مبارک پر تشریف لے جاتے تو اپنا دست مبارک اپنے رخسار کے نیچے رکھ کر فرماتے اَللّٰھُمَّ بِکَ اَمُوْتُ وَ اَحْیٰی۔ (اے اللہ! میری موت اور میری زندگی تیرے ہی قبضہ اختیار میں ہے) اور جب نیند سے بیدار ہوتے تو یہ پڑھتے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ(2)۔ (سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں موت (نیند) دینے کے بعد زندگی عطا فرمائی اور اسی کی طرف (قیامت کے دن) اٹھ کر جانا ہے) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آرام کے لئے اپنے بستر کی طرف جائے تو اپنے بستر کو چادر کے پلو سے خوب جھاڑ لینا چاہئے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کی جگہ (بستر میں) کون آ گیا ہے۔ (یعنی سانپ بچھو اور دیگر اذیت ناک کیڑے مکوڑے وغیرہ) پھر زبان سے یہ کہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 18 (الفکر) 2۔ مشکوۃ المصابیح، حدیث: 2382 (الفکر)

(۱) سلیم بن عامر سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا آدمی کا خواب بھی تعجب خیز ہوتا ہے کہ وہ رات کو سوتا ہے اور ایسی چیز عالم خواب میں دیکھتا ہے جس کا تصور تک اس کے دل میں نہیں کھٹکتا۔ پس کبھی تو اس کا خواب ایسا ہوتا ہے جیسے وہ اس کو ہاتھ سے پکڑ کر لے آیا ہے۔ (یعنی اس کا خواب بالکل سچا ہوتا ہے) اور آدمی کبھی ایسا خواب دیکھتا ہے کہ وہ حقیقتاً وہ کوئی شے نہیں ہوتا (یعنی وہ جھوٹا ہوتا ہے) تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اے امیر المومنین! کیا میں آپ کو اس کے بارے خبر نہ دوں؟ بے شک اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ پس اللہ تعالیٰ تمام جانوروں کو قبض کرتا ہے۔ آسمان کی بلندیوں میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے قریب میں جو کچھ یہ دیکھتی ہیں وہ سچے خواب ہوتے ہیں اور جب وہاں سے انہیں جسموں کی طرف واپس بھیجا جاتا ہے تو شیاطین ان سے ملتے

بِاسْمِکَ رَبِّیْ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَبِکَ اَرْفَعُهٗ اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَکَ الصّٰلِحِیْنَ۔(اے میرے رب! میں نے تیرے ہی نام کی برکت سے اپنا پہلو (بستر پر) رکھا ہے اور تیرے ہی نام کی برکت اور مدد سے اس (بستر سے) اٹھاؤں گا اگر تو میری جان کو روک لے تو اس پر رحم فرمانا اور اگر تو اسے واپس آنے کے لئے چھوڑ دے تو اس کی ایسی چیزوں سے حفاظت فرمانا جن سے تو اپنے صالح اور نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ بستر کو جھاڑنے کے بعد دائیں پہلو پر لیٹ جائے اور پھر مذکورہ کلمات کہے اور ایک روایت میں ہے کہ اسے اپنے کپڑے کے پلو سے تین بار بستر جھاڑنا چاہئے اور اس میں اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْهَا کی بجائے اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لَهَا کے الفاظ ہیں۔(یعنی اگر تو میری جان کو روک لے تو اس کی مغفرت فرما دینا)(1)۔

ﷺ بیشک جان قبض کرنے، بعض کو روک لینے اور بعض کو واپس بھیج دینے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے کامل ہونے اور اس کی رحمت کے عام ہونے کی کثیر دلیلیں اور نشانیاں ہیں۔ان کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں کہ بدنوں کے ساتھ روحوں کے تعلق کی کیفیت کیا ہے۔موت کے وقت کلی طور پر انہیں کیسے قبض کیا جاتا ہے اور بدنوں کے فناء ہونے کے باوجود یہ باقی رہتی ہیں اور پھر ان پر سعادت و شقاوت کے آثار کیسے ظاہر ہوتے ہیں اور اس میں کیا حکمت ہے کہ جانوں کو ظاہری طور پر قبض کرلیا جاتا ہے اور پھر وقتاً فوقتاً موت کے مقررہ وقت تک اسے قبض کرنے اور پھر واپس بھیجنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔پس ان تمام میں غور وفکر کرنے والے یہ جان لیتے ہیں کہ وہ ذات جو ان تمام احوال و کیفیات پر قادر ہے وہ بالیقین دوبارہ اٹھانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔یہ آیت قول باری تعالیٰ فلیتو کل المتوکلون کی علت بیان کرنے کے محل میں واقع ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾

''کیا انہوں نے بنالیے ہیں اللہ کو چھوڑ کر اور سفارشی۔پوچھئے اگر چہ وہ (مزعومہ سفارشی) کسی چیز کے مالک نہ ہوں اور نہ عقل وشعور رکھتے ہوں [1]۔ آپ فرمایئے سب شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے۔اسی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے [2]۔''

[1] اَمِ اتَّخَذُوْا میں ام ابتدائیہ ہے اور ہمزہ انکار کے معنی میں ہے۔یا پھر ام متصلہ ہے اور محذوف جملہ پر معطوف ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہے اَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ شُفَعَآءَ۔کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے شریک بنالئے ہیں یا اسے چھوڑ کر اور سفارشی بنالئے ہیں؟ یا یہ ام منقطعہ ہے اور بل اضرابیہ کے معنی میں ہے اور یہ اضراب ان فی ذلک لایت لقوم یتفکرون کے مضمون سے ہے۔

اے محمد ﷺ! آپ پوچھئے اگر چہ وہ (فرعومہ سفارشی) کسی چیز کے مالک نہ ہوں اور نہ عقل وشعور رکھتے ہوں اولو کانوا میں بھی ہمزہ انکار کے لئے ہے۔تقدیر کلام اس طرح تھا اَيَشْفَعُوْنَ لَكُمْ وَلَوْ كَانُوْا عَلٰى هٰذِهِ الصِّفَةِ الَّتِیْ تُشَاهِدُوْنَهُمْ عَلَيْهَا

جمادات ہیں نہ عقل وشعور رکھتے ہیں اور نہ ہی قدرت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہاں یہ ممکن تھا کہ وہ کہہ دیتے ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے مقرب بندوں کی پوجا کرتے ہیں نہ کہ ان بتوں کی بلکہ یہ تو صرف ان کی تصویریں اور مورتیاں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو رد کرنے اور لا یملکون کی علت بیان کرنے کے لئے فرمایا۔

۲ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا۔ کہ آپ فرمائیے سب شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے۔ پھر اس کی تائید اپنے اس قول سے فرمائی لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے لئے ہے۔ یعنی کوئی بھی اس چیز کا مالک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضا کے بغیر کسی معاملے میں گفتگو تک کر سکے۔ پس تمام تر شفاعت وسفارش کا مالک و مختار اللہ تعالیٰ ہے پھر قیامت کے دن تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور وہاں اس وقت بھی بادشاہی اسی کی ہوگی۔

وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْ مَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

"اور جب ذکر کیا جائے اکیلے اللہ کا تو کڑھنے لگتے ہیں ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب ذکر کیا جاتا ہے اسکے سوا دوسروں کا تو اسی وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں ۱؎ آپ عرض کیجئے اے اللہ! اے پیدا کرنیوالے آسمانوں اور زمین کے! اے جاننے والے غیب اور شہادت کے! تو ہی فیصلہ فرمائے گا اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ۲؎۔"

۱ اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان لوگوں کے دل نفرت کرتے ہیں، منقبض ہو جاتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جب اللہ کے سوا بتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسی وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب کہ حضور نبی کریم ﷺ نے سورۃ والنجم ان کے سامنے پڑھی اور شیطان نے اپنی طرف سے اس میں یہ کچھ ڈال دیا تلک الغرانیق العلٰی وان شفاعتھن لترجی تو یہ سن کر کفار انتہائی مسرور ہوئے (۱)۔ ابن منذر نے مجاہد سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اشمئزاز اور استبشار دونوں لفظوں میں انتہائی مبالغہ کا اظہار ہے حتی کہ معنوی طور پر اپنے اعتقاد کو پہنچے ہوئے ہیں۔ کیونکہ استبشار کا معنی ہے دل کا خوشی سے اس طرح بھر جانا کہ اس کے آثار چہرہ سے ظاہر ہو جائیں اور چہرہ فرحت وانبساط سے کھل جائے اور اشمئزاز سے مراد دل کا غم وغصہ سے اس طرح بھر جانا حتی کہ چہرے کی کھال بھی منقبض ہو جائے، سکڑ جائے۔ اذا میں عامل معنی مفاجات ہے (2)۔

۲ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ کو اپنی بارگاہ میں دعا کی التجاء کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ کیونکہ جب آپ ﷺ کفار کے

تعالیٰ ہی تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا ٗ ہمارے تمام احوال اور جو چیزیں ہم سے غائب ہیں اور جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں ان سب کو جاننے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (اس لئے اس نے اپنے محبوب کو اپنی بارگاہ میں التجاء کا حکم ارشاد فرمایا)

کہ تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ یعنی حق پر چلنے والے کی مدد فرمائے گا اور باطل پر چلنے والے کو ذلیل و رسوا کرے گا۔ ان امور میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کن الفاظ سے رات کی نماز شروع کیا کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا۔ آپ ﷺ یہ کہا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَئِيلَ وَ مِيكَائِيلَ وَ إِسْرَافِيلَ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(اے اللہ! جبرائیل و میکائیل اور اسرافیل کے رب! اے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! اے غیب اور شہادت کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔ جب مسائل میں اختلاف ہو جائے تو مجھے اپنے اذن اور حکم کے ساتھ راہ حق کی راہنمائی فرما کیونکہ جسے تو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔)

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝ وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

"اور اگر ان کے پاس جنہوں نے شرک کیا زمین میں جو کچھ ہے سب ہو اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تو چاہیں گے کہ بطور فدیہ ادا کر دیں اسے برے عذاب کے عوض قیامت کے دن ٗ اور (اس روز) ظاہر ہو جائے گا ان پر اللہ کی طرف سے جس کا وہ گمان بھی نہیں کیا کرتے تھے [1] اور ظاہر ہو جائیں گے ان پر وہ برے اعمال جو انہوں نے کمائے تھے اور گھیر لے گا انہیں وہ (عذاب) جس کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے [2]۔"

[1] اگر ان کے پاس جنہوں نے شرک کیا جو کچھ زمین میں ہے سب ثابت ہو جائے اور جمع ہو جائے اور اس کے ساتھ اتنا اور بھی ہو تو وہ چاہیں گے کہ اسے برے عذاب کے عوض بطور فدیہ ادا کریں۔ قیامت کے دن یہ ان کے لئے انتہائی شدید وعید ہے اور انہیں خلاصی پانے سے حد درجہ مایوس اور ناامید کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی ان کے لئے عذاب سے نجات پانے کی قطعاً کوئی امید باقی نہیں ہوگی) اور اس روز ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب دینے کے ایسے مراتب اور درجات ظاہر ہوں گے جن کا وہ وہم و گمان بھی نہیں کرتے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے لئے ارشاد فرمایا فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ۔ (پس کوئی نفس نہیں جانتا جو مومنین کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک مخفی رکھی گئی ہے) تو اس کے مقابل میں انتہائی زجر اور مبالغہ کے ساتھ اہل جہنم کے لئے

کرتے کہ آخرت میں انہیں ایسے عذاب سے واسطہ پڑے گا(1)۔اس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ بت ان کی سفارش کریں گے یا ان کا وہم یہ تھا کہ ان کے لئے حشر ونشر نہیں ہوگا یا اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ آخرت میں ان کی حالت مومنین کی نسبت کہیں اچھی اور بہتر ہوگی۔ لیکن اس دن ان کے وہم و گمان کے خلاف ظاہر ہوگا۔

سدی نے کہا ہے کہ ان کا گمان تھا کہ جو کچھ وہ کررہے ہیں یہ سب نیکیاں ہیں لیکن قیامت کے دن ان کے لئے ظاہر ہو جائے گا کہ وہ سب برائیاں ہیں۔ یعنی وہ بتوں کی پوجا کرنے کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ گمان کرتے تھے تو جب اس پر انہیں سزا دی جائے گی تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کچھ ظاہر ہوگا جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتے(2)۔

؎ جب ان پر ان کے اعمالنامے پیش کئے جائیں گے تو شرک اور اولیاء اللہ کے ساتھ کئے جانے والے ظلم و زیادتی جیسے اعمال کی برائی ان کے سامنے ظاہر ہو جائے گی اور انہیں وہ عذاب گھیر لے گا جس کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ما کانوا میں ما موصولہ ہے اور اس سے مراد عذاب ہے یا ما مصدریہ ہے اور معنی یہ ہے کہ ان کے استہزاء کرنے کی سزا انہیں گھیر لے گی۔

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ۚ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٩﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٥٠﴾

''پس جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف تو ہمیں پکارتا ہے؎ پھر جب ہم عطا کردیتے ہیں اسے نعمت اپنی جناب سے تو کہنے لگتا ہے کہ یہ نعمت مجھے دی گئی ہے (اپنے) علم (وفضل) کے باعث۔ (اے غافل یوں نہیں) بلکہ یہ آزمائش ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے؎ کہی تھی یہ بات ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے (جب ہم نے انہیں پکڑا) تو نہ فائدہ پہنچایا انہیں (مال ودولت نے) جو وہ کمایا کرتے تھے؎۔''

؎ آیت میں الانسان سے مراد کافر انسان ہے (اور اس پر الف لام عہدی ہے) بعض نے کہا ہے کہ الف لام جنس ہے اور اس میں جنس انسان کی خبر دی جارہی ہے لیکن چونکہ کفار کی تعداد زیادہ ہے لہٰذا اس کثرت کے پیش نظر جنس انسان سے مراد کافر انسان ہیں۔ ضر کا معنی ہے شدت، سخت تکلیف۔ یعنی جب کافر انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف قول باری تعالیٰ واذا ذکر اللہ وحدہٗ پر حرف فاء کے ساتھ کیا گیا ہے تاکہ عملاً ان میں پائے جانے والے تناقض کی وضاحت ہو جائے اور یہ بیان ہو جائے کہ وہ اسباب کو الٹا کیسے کرتے ہیں۔ یعنی صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت ان کے چہرے سکڑ جاتے ہیں اور پریشان ہو جاتے ہیں لیکن بتوں کے ذکر کے وقت ان کے چہرے کھل جاتے ہیں، ان پر فرحت وانبساط کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور پھر جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسے ہی پکارتے ہیں جس کا ذکر سن کر چہرے سکڑ گئے تھے نہ کہ انہیں جن کا ذکر سن کر انہیں خوشی ہوئی تھی۔ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان جملے معترضہ ہیں جو انکار کی تاکید کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

؎ پھر جب ہم اسے اپنی مہربانی اور فضل سے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ نعمت تو مجھے اپنے علم وفضل کے باعث دی گئی

مراد ہے کمائی کے اسباب اور ذرائع ۔ یا یہ کہتا ہے کہ یہ نعمت مجھے اسلئے دی گئی ہے کہ میں اس کا مستحق تھا۔ یا یہ کہتا ہے کہ میں جانتا تھا کہ یہ نعمت مجھے عطا کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم ہے۔ اگر ما کو موصولہ بنایا جائے تو پھر اوتیۃ کی ضمیر کا مرجع وہی ہے۔ ورنہ ضمیر نعمۃ کی طرف راجع ہے۔ چونکہ نعمت سے مراد شے ہے اس لئے ضمیر مذکر ہے۔ (اے غافل یوں نہیں) بلکہ یہ نعمت تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے امتحان اور آزمائش ہے کہ کیا بندہ اس نعمت پر اس کا شکر ادا کرتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ یا پھر یہ نعمت انہیں عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے ایک سبب اور خاص تدبیر ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے بلکہ وہ بات جو انہوں نے کہی وہ ایک آزمائش ہے اور موجب عذاب ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے ۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ الانسان سے مراد جنس انسان ہے(1)۔ (کیونکہ لکن حرف استدراک ہے جو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس نادانی کا حکم تمام انسانوں پر نہیں بلکہ اکثر کے لئے ہے)

میں کہتا ہوں کہ اگر الانسان سے مراد کافر انسان بھی ہو تب بھی اکثر کفار سے مراد کل کفار ہی ہوں گے ۔ (لہٰذا جنس انسان مراد نہ لینے میں بھی معنی میں کوئی ضعف پیدا نہیں ہوتا) یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کفار میں سے بعض یہ اعتقاد اور یقین رکھتے تھے کہ وہ باطل پر ہیں جیسا کہ علمائے یہود وغیرہ لیکن وہ محض سرکشی، ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے۔

سے یہ بات ان لوگوں نے کہی تھی جو ان سے پہلے تھے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد قارون ہے کیونکہ اس نے یہ کہا تھا اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (2)۔ چونکہ بہت سے لوگوں نے اس کے اس قول کے ساتھ رضامندی اور اتفاق ظاہر کیا تھا اس لئے ان تمام کی طرف اس قول کی نسبت کرتے ہوئے قبلھم میں ضمیر جمع ذکر کی گئی ہے۔

پس وہ خزانے جن کی چابیاں اٹھانے کے لئے طاقتور لوگوں کی ایک جماعت درکار تھی۔ ان خزانوں اور مال و دولت کے انبار نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

" پس جو برے کام انہوں نے کئے ان کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑا۔ اور جنہوں نے ظلم کیا ہے ان لوگوں میں سے انہیں بھی عنقریب اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتنی ہوگی۔ اور یہ (ہمیں) عاجز نہیں کر سکتے لے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کشادہ عطا فرماتا ہے رزق جس کو چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کو چاہتا ہے) یقیناً اس (تقسیم رزق) میں اس کی (حکمت کی) نشانیاں ہیں اہل ایمان کے لئے ہے۔"

لے فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ میں (سیئہ) برائی کی جزا کو سیئہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ اس لئے ہے کیونکہ یہ برائی کے مقابلہ اور جواب میں واقع ہوتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ اور کفار مکہ میں سے جنہوں نے کفر (ظلم) کیا۔ انہیں بھی عنقریب اپنی بداعمالیوں کی سزا [illegible]

اور ایمان لے آئے۔

وَمَاهُمْ بِمُعْجِزِيْنَ اور یہ ہمیں عاجز نہیں کر سکتے یعنی ہماری گرفت اور عذاب سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔

ع کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بطور امتحان اور آزمائش کشادہ رزق عطا فرما دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بطور امتحان اور آزمائش اس کا رزق تنگ کر دیتا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا الْقَوْلَ يَعْنِيْ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ وَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّ تَوَسعَةَ الرِّزْقِ وَتَضْيِيْقَهٗ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ یعنی وہ یہ قول تو کہتے ہیں کہ ہمیں یہ مال و دولت اپنے علم و فضل کے سبب حاصل ہوا اور وہ یہ نہیں جانتے کہ رزق کی وسعت اور فراخی اور رزق کی تنگی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے۔ وہ کبھی ایسے آدمی کو کشادہ رزق عطا فرما دیتا ہے جو کمائی کے ذرائع اور طریقے نہیں جانتا اور وہ بالکل عزت و کرامت اور خوشحالی کا مستحق نہیں ہوتا اور کبھی اس کی برعکس حالت میں وہ رزق کو تنگ کر دیتا ہے (یعنی وہ آدمی کمانے کے ذرائع سے واقف ہوتا ہے صاحب علم و ہنر ہوتا ہے بظاہر اس کا استحقاق محسوس بھی ہوتا ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اسی کا رزق تنگ ہوتا ہے) یقیناً اس تقسیم رزق میں اہل ایمان کے لئے اس کی حکمت کی نشانیاں ہیں، یعنی ایسے لوگوں کے لئے جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ تمام تر حوادث اللہ تعالیٰ کی جانب سے وقوع پذیر ہوتے ہیں بظاہر اسباب اپنی عادت کے مطابق جاری رہتے ہیں (یعنی بظاہر نتائج کا دارو مدار اسباب پر ہوتا ہے (لیکن کبھی غیر متوقع اور غیر معمولی تغیر و تبدل رونما ہوتا ہے جس سے نتائج بدل جاتے ہیں اور یہ رب کریم کے دائرہ قدرت میں ہے)

شیخین نے صحیحین میں روایت نقل کی ہے کہ مشرکین میں سے کچھ لوگوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور انتہائی کثرت کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی۔ بیشک جو کچھ آپ کہتے ہیں اور جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں وہ اچھا ہے، حسین ہے۔ اگر آپ ہمیں اس پر بھی مطلع کر دیں کہ اب تک جو برے اعمال ہم کرتے رہے ہیں یہ ان کا بھی کفارہ ہو جائے گا۔ اس وقت ایک تو سورہ فرقان کی آیت وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ الی قولہ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا نازل ہوئی (1)۔ اور اس کے ساتھ ہی آیت کریمہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الایہ نازل ہوئی۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

”آپ فرمائیے اے میرے بندو! ؎ جنھوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر، مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے ؎ یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو۔ بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانیوالا ہے ؎۔“

؎ يٰعِبَادِيَ کو ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے سکون یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور وصل کلام اجتماع ساکنین کی وجہ سے یاء کو حذف بھی کر دیا ہے اور باقیوں نے اس میں یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔

ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے نازل

ایسے ہی طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کو دعوت اسلام دینے کیلئے ایک آدمی بھیجا تو اس نے جواباً یہ کہلا بھیجا آپ مجھے اپنے دین کی طرف کیسے دعوت دے رہے ہیں؟ حالانکہ آپ یہ گمان رکھتے ہیں کہ جس نے کسی کو قتل کیا یا شرک کیا یا زنا کا مرتکب ہوا تو وہ ایسا گناہ کرنے والا ہے جس کیلئے اسے قیامت کے دن دوگنا عذاب دیا جائیگا اور میں نے یہ سب کچھ کیا ہوا ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے) تو وحشی نے کہا یہ شرط تو انتہائی شدید اور سخت ہے شاید میں اسے پورا کرنے پر قادر نہ ہوسکوں تو کیا اس کے علاوہ بھی کوئی صورت ہوسکتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۚ۔

وحشی نے کہا چونکہ اس میں مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ موقوف ہے اس لئے میں شبہ میں پڑ گیا ہوں کہ آیا توبہ کرنے کے بعد میری بھی مغفرت ہوگی یا نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت قُلۡ یٰعِبَادِیَ الآیہ نازل فرمائی(1)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں مزید یہ نقل کیا ہے (کہ اس آیت کے نزول کے بعد) مسلمانوں نے عرض کی کیا یہ صرف وحشی کے لئے ہی خاص ہے یا تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ یہ تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ حاکم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ایسا آدمی جس نے اسلام قبول کرنے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے بعد طرح طرح کے مصائب اور آزمائشوں میں مبتلا ہونے کے سبب اپنا دین چھوڑ دیا تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ پس جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ایسے لوگوں کے بارے **یہ** آیت قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا الآیۃ نازل ہوئی(2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ آیت عیاش بن ربیعہ، ولید بن ولید اور مسلمانوں کی ایک جماعت کے بارے نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ پھر وہ آزمائش میں مبتلا ہو گئے اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں دی گئیں چنانچہ تنگ آ کر انہوں نے دین اسلام چھوڑ دیا تو ہم یہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی ان کا کوئی عمل قبول نہیں فرمائے گا چاہے وہ فرض ہو یا نفل۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اول اسلام لائے۔ پھر جب انہیں تکلیفیں اور دکھ پہنچائے گئے تو اسی کے سبب انہوں نے دین اسلام چھوڑ دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیات طیبات نازل فرمائیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے ان آیات کو لکھ کر عیاش بن ربیعہ، ولید بن ولید اور ان لوگوں کی طرف بھیج دیں۔ چنانچہ وہ پھر اسلام لے آئے اور ہجرت کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوئے(3)۔

قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ کا معنی ہے کہ جنہوں نے کفر و معاصی کا ارتکاب کر کے اپنے نفسوں پر بہت زیادہ جرم اور زیادتی کی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اسراف سے مراد گناہ کبیرہ ہیں(4)۔ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یعنی جب تم ایمان لے آؤ گے اور شرک سے توبہ کر لو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کی مغفرت

قید بالا جماع ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ اور اس آیت کے سبب نزول کے بارے جو روایات ذکر کی گئی ہیں وہ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا معنی یہ بنتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید ہو کر ایمان کو محض اس بناء پر نہ چھوڑو کہ تم نے اس سے قبل اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔ بشرطیکہ تم شرک سے توبہ کرلو اور اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کے ساتھ ایمان لے آؤ۔ کیونکہ اسلام سابقہ تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ ختم کر دیتا ہے (1)۔ یہ روایت حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے اور اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔

اس آیت کا شان نزول اگرچہ خاص ہے کیونکہ یہ صرف ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حالت شرک میں گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اور پھر اسلام لے آئے۔ لیکن اس کے الفاظ عام ہیں اور اس پر یہ مفہوم دلالت کرتا ہے کہ بندہ جب ایمان لے آئے (چونکہ اللہ تعالیٰ نے عبادی کی اضافت اپنی ذات کی طرف کرتے ہوئے فرمایا یعبادی تو اس میں محاورہ قرآن کے مطابق یہ دلیل موجود ہے کہ عباد سے مراد مومن بندے ہیں تب ہی اللہ تعالیٰ نے نسبت اپنی طرف فرمائی ہے) اور اگر وہ اسلام لانے کے بعد گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو پھر بھی یہ امید ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس کی مغفرت فرما دے گا اگرچہ اس نے توبہ نہ بھی کی (لہٰذا اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہئے) جیسا کہ اس معنی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ اور اس کی علت یہ ارشاد بیان کر رہا ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔ بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانیوالا ہے۔ کیونکہ الغفور مبالغہ کا صیغہ ہے' اس پر الف لام حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ مغفرت کے بعد رحمت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ آیت کے آغاز میں لفظ یعبادی ہی مغفرت کے عام ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ لفظ عبد عاجزی وانکساری پر دلالت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا اسے اپنی طرف منسوب کرنا اختصاص کا فائدہ دیتا ہے اور پھر عاجزی اور اختصاص دونوں ہی رحم کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ پھر اس میں زیادتی اور گناہ کے ضرر اور نقصان کو نفس کے ساتھ خاص کر دیا اور پھر مطلق رحمت سے مایوس اور ناامید ہونے سے منع فرما دیا چہ جائیکہ کوئی مغفرت سے مایوس ہو۔ اور اس کی علت یہ قول بیان کر رہا ہے اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ (بیشک اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخش دیتا ہے) اور پھر ضمیر کی جگہ لفظ اللہ صراحۃً ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت کرے کہ وہ مستغنی (بے نیاز) ہے اور وہی منعم حقیقی ہے اور پھر لفظ ذنوب کی تاکید جمیعًا سے ذکر کی (تو مذکورہ بالا تمام قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بندہ مومن کے لئے اللہ تعالیٰ کی مغفرت عام ہے چاہے اس سے گناہ کبیرہ سرزد ہوں یا صغیرہ۔ وہ توبہ کرے یا نہ کرے۔ ہر دو حال میں اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہئے) اس بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں اور اس پر اجماع امت بھی ہے۔

مقاتل بن حبان نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کا گروہ یہ خیال کرتے تھے یا کہتے تھے کہ ہماری نیکیوں میں سے ہر نیکی مقبول ہے حتیٰ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ۝ ۔ (اے اہل ایمان! تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو بیکار نہ کرو) تو ہم ...

فواحش ہی ہیں آپ فرماتے ہیں۔ پھر جب ہم کسی کو گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے دیکھتے تو ہم کہتے یہ تو ہلاک ہو گیا ہے تو پھر یہ آیت نازل ہوئی قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا۔الآیہ۔ چنانچہ اس کے بعد ہم دونوں قولوں سے رک گئے۔ پھر جب ہم کسی کو دیکھتے کہ اس سے گناہ صادر ہوا ہے تو ہمیں اس کے بارے (بربادی، اعمال کا) خوف ہونے لگتا اور اگر کسی سے گناہ کبیرہ سرزد نہ ہوتا تو اس کے لئے (قبولیت اعمال کی) امید رکھتے(1)۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ مسجد میں داخل ہوئے وہاں ایک وعظ کرنے والا جہنم کے عذاب اور اس کے طوق وزنجیر کا ذکر کر رہا تھا تو آپ اس کے سر کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور کہا اے ذکر و نصیحت کرنے والے! لوگوں کو (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے) مایوس اور ناامید نہ کر۔ پھر آپ نے یہی آیت قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ الآیہ پڑھی(2)۔ حضرت اسماء بنت زید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پڑھتے سنا قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ولا یبالی(3) آپ فرمایئے! اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دے گا اور وہ کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور شرح السنۃ میں یقرأ کی بجائے یقول کے الفاظ ہیں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی نے ننانوے (99) انسانوں کو قتل کیا تھا پھر وہ ایک راہب (تارک الدنیا آدمی) کے پاس آیا اور (توبہ کے بارے) اس سے دریافت کیا تو اس راہب نے اسے کہا تیرے لئے اب کوئی توبہ نہیں۔ تو اس نے اسے بھی قتل کر دیا اور پھر لوگوں سے پوچھتا رہا (کہ توبہ کے بارے دریافت کرنے کے لئے کہاں جاؤں؟) تو پھر اسے ایک آدمی نے بتایا فلاں گاؤں میں جاؤ (وہاں ایک اللہ تعالیٰ کا ولی ہے اس سے جا کر توبہ کا کوئی سبب اور طریقہ دریافت کرو۔ چنانچہ وہ اس کی راہنمائی پر اس گاؤں کی طرف چل پڑا۔ لیکن ابھی وہاں نہیں پہنچا تھا) کہ راستے میں ہی اسے موت نے آ لیا اور اس نے بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ (دم نکلتے نکلتے) اپنا سینہ اس گاؤں کی طرف اٹھا دیا (یعنی سینے کا رخ ادھر پھیر لیا) اور فوت ہو گیا تو اس کے بارے ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے مابین اختلاف اور جھگڑا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف (گاؤں والی طرف) کی زمین کو حکم فرمایا تو قریب ہو جا (سکڑ جا) اور دوسری طرف (یعنی جدھر سے وہ چل کے آیا تھا) والی زمین کو حکم فرمایا تو دور ہو جا (پھیل جا۔ طویل ہو جا) اور فرشتوں کو حکم فرمایا ان دونوں کے درمیان مسافت ناپ لو۔ چنانچہ ملائکہ نے گاؤں والی طرف کی زمین کو ایک بالشت قریب پایا (طے شدہ سفر کی نسبت باقی ماندہ ایک بالشت کم نکلی) تو اسی کے سبب اسے بخش دیا گیا۔ متفق علیہ (4) اس حدیث کو مسلم بن حجاج نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے مطابق روایت اس طرح ہے کہ اس قاتل کی راہنمائی راہب کی طرف کی گئی۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور کہا میں نے ننانوے افراد کو قتل کیا ہے کیا میرے لئے توبہ کا کوئی ذریعہ ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ چنانچہ اس نے اسے بھی قتل کر کے پورے سو کر دیئے۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ اہل زمین میں سے بڑا عالم کون ہے؟

ذریعہ ہے؟ تو عالم نے جواب دیا کیوں نہیں' آپ کے اور توبہ کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے؟ تم فلاں بستی کی جانب چلے جاؤ۔ کیونکہ وہاں کے کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ مل کر عبادت میں مشغول ہو جاؤ اور اپنی زمین کی طرف لوٹ کر نہ آنا۔ کیونکہ یہ برائی والی زمین ہے۔ چنانچہ وہ اس بستی کی طرف چل پڑا۔ ابھی نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے موت آ گئی۔ اب ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے مابین اختلاف ہو گیا۔ پس ایک فرشتہ ظاہری صورت میں ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے حکم (ثالث) چن لیا تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں جانب کی زمین ناپ لو۔ کونسی جانب کی زمین قریب ہے۔ جس جانب کی زمین قریب ہو (یعنی مسافت کم ہو) یہ اسی جانب کے لئے ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے زمین کو ناپا تو انہوں نے اس جانب کی زمین کو کم اور قریب پایا جس جانب وہ جا رہا تھا تو اس طرح رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح پر قبضہ کر لیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک آدمی تھا جس نے کبھی بھی کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا تو اس نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا پھر نصف راکھ خشکی میں اور نصف کو سمندر میں اڑا دینا۔ کیونکہ قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے اسے گرفت میں لے لیا تو بالیقین اتنا شدید اور سخت عذاب دے گا جتنا وہ پوری کائنات میں سے کسی کو نہیں دے گا۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو گھر والوں نے وہی کچھ کیا جیسے اس نے کہا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم ارشاد فرمایا تو اس نے وہ ساری راکھ جمع کر دی جو اس میں ڈالی گئی تھی۔ پھر خشکی کو حکم دیا تو اس نے بھی وہ ساری راکھ جمع کر دی جو اس میں اڑائی گئی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا اب بتا تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ تو اس نے جواباً عرض کی اے میرے رب! صرف تیرے خوف اور ڈر کی وجہ سے۔ اور تو بہتر جانتا ہے تو اسی پر اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔ متفق علیہ (1)۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ ضمضم بن حوش نے کہا میں مدینہ طیبہ کی مسجد میں داخل ہوا تو مجھے ایک بوڑھے شیخ نے آواز دے کر کہا اے یمانی! میرے قریب آ ؤ حالانکہ میں انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کسی آدمی سے یہ نہ کہنا وَاللّٰهِ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ وَلَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ (قسم بخدا! اللہ تعالیٰ تیری مغفرت نہیں کرے گا اور تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا) تو میں نے سن کر عرض کی اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے آپ کون ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا میں ابو ہریرہ ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا ہم میں سے جب کوئی غصے اور غضب کی حالت میں ہوتا ہے تو یہ کلمات تو وہ اپنے گھر والوں کو بھی کہہ دیتا ہے' اپنی بیوی کو بھی اور اپنے خدام کو ایسے ہی کہہ دیتا ہے تو انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے دو آدمی تھے جو باہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک انتہائی عبادت گزار تھا اور دوسرا گنہگار تھا تو عبادت گزار اپنے دوسرے ساتھی کو کہتا رہتا تھا اب تو گناہوں سے باز آ جا تو وہ جواب دیتا تو مجھے چھوڑ میرا معاملہ میرے رب کے سپرد کر، میں جانوں اور وہ۔ وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ایک دن اس نے اپنے ساتھی کو بہت بڑے گناہ میں مبتلا پایا تو اسی عبادت گزار نے اسے کہا اب تو گناہ چھوڑ دے تو اس نے جواب دیا تو مجھے چھوڑ میرا معاملہ میرے رب کے سپرد کر۔ کیا تجھے میرا نگران (اعمال کی تاک میں رہنے والا) بنا کر بھیجا گیا ہے؟ تو عبادت گزار نے اس کے جواب میں کہا قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کبھی بھی تیری مغفرت نہیں فرمائے گا اور تجھے کبھی بھی جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف موت کا فرشتہ بھیجا۔ اس نے ان دونوں کی ارواح کو قبض کیا۔ اس طرح وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

میں جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس گناہ کرنے والے کو کہا تو میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جا اور دوسرے سے فرمایا کیا تو یہ طاقت رکھتا ہے کہ میرے بندے سے میری رحمت کو روک لے؟ تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار ہرگز نہیں! تو رب تعالیٰ نے اس کے بارے حکم دیا اسے جہنم کی طرف لے جاؤ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اس آدمی نے جو کلمات کہے تھے انہوں نے اس کی دنیا اور آخرت کو تباہ و برباد کر دیا(1)۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بعینہٖ یہی حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آیت طیبہ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ الآیہ سے بڑھ کر دنیا اور اس کی تمام چیزوں میں سے کوئی شے میرے نزدیک پسندیدہ نہیں(2)۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ، ابن جریر، طبرانی نے الاوسط میں اور علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اور جس آدمی نے شرک کیا (کیا اسے بھی اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا) پس آپ ﷺ نے تھوڑی دیر کے لئے سر جھکایا اور پھر فرمایا مگر وہ جس نے شرک کیا آپ ﷺ نے تین بار ایسے فرمایا۔ (یعنی وہ آدمی جو شرک کرتا رہا اور اسی حالت پر اسے موت آ گئی تو اس کی مغفرت نہیں ہو گی)

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ ایک آدمی نے کہا قسم بخدا! اللہ تعالیٰ فلاں آدمی کی مغفرت نہیں فرمائے گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ کون ہے جو میرے نام کی قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ میں فلاں کی مغفرت نہیں کروں گا۔ بیشک میں نے اس فلاں کو بخش دیا اور تیرے اعمال کو ناکارہ کر دیا۔ او **کما قال علیه الصلوٰة والسلام**۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ اِلَّا اللَّمَمَ (ایسے گناہ جنہیں کرنے کے بعد ندامت و شرمندگی محسوس ہو) کے بارے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسے گناہوں کو اللہ تعالیٰ بخش دے گا، اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف فرما دے گا۔ اے اللہ! تیرا کون سا بندہ ہے جس سے گناہ صادر نہ ہو(4)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب ہے۔ ایک طویل حدیث قدسی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں (کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا) میں جو چاہتا ہوں وہی کرتا ہوں میری عطا بھی کلام ہے اور میرا عذاب بھی کلام ہے۔ کسی شے کے بارے میں میرا امر یہ ہے کہ جب میں چاہتا ہوں کہ وہ ہو جائے تو میں اس کے لئے فقط یہ کہتا ہوں کن (تو ہو جا) پس وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ اسے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(5)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نیک اور صالح بندے کے درجات کو جنت میں بلند فرما دے گا تو وہ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب! میرے یہ درجات کیسے بلند ہو گئے؟ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِکَ لَکَ(6)۔ تیرے بیٹے کے تیرے لئے استغفار کرنے کے سبب (تیرا درجہ بلند کر دیا ہے) رواہ احمد۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر میں میت کی حالت اس ڈوبنے والے کی طرح ہوتی ہے جو فریاد کر

رہا ہو مدد کا طالب ہو۔ مرنے والا انسان (اپنی قبر میں) باپ، ماں، بھائی یا کسی دوست کی جانب سے دعائے مغفرت کے پہنچنے کا منتظر رہتا ہے۔ جب کسی کی جانب سے اسے دعا پہنچتی ہے تو وہ دنیا اور اس کی تمام چیزوں کی نسبت اس کے نزدیک زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اہل زمین کی دعا سے پہاڑوں کی مثل ثواب اہل قبور کو پہنچاتا ہے اور زندوں کی جانب سے مردوں کیلئے تحفہ اور ہدیہ ان کے لئے استغفار کرتا ہے۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے (1)۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ بالیقین اپنے بندے کی مغفرت فرما دے گا جب تک کہ حجاب (پردہ) نہ واقع ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! حجاب کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کسی آدمی کا ایسی حالت میں مرجانا کہ وہ مشرک ہو (2)۔ اسے احمد اور بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں روایت کیا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی اس حال میں اللہ تعالیٰ سے جا ملے کہ وہ دنیا کی کسی شے کو اس کے مساوی اور برابر نہ قرار دے پھر اگر اس پر پہاڑوں کی مثل بھی گناہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا۔ اسے بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں۔ اس نے ان میں سے رحمت کا ایک حصہ جن وانس اور دیگر چوپاؤں اور کیڑے مکوڑوں کو ودیعت فرمایا ہے۔ جس کے سبب وہ آپس میں ایک دوسرے سے مہربانی کا سلوک کرتے ہیں، رحم سے پیش آتے ہیں اور اسی کے سبب وحشی جانور بھی اپنی اولاد کے ساتھ رافت وشفقت کا سلوک کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ننانوے حصص اپنے پاس محفوظ رکھے ہیں جن کے سبب قیامت کے دن وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔ متفق علیہ (3)۔ مسلم نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ کے ساتھ (اظہار بندہ نوازی) فرمائے گا۔

حضرت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کچھ قیدی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں لائے گئے تو ان میں ایک عورت بھی تھی اس کے پستان سے دودھ بہہ رہا تھا۔ وہ اسی حالت میں ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھی اور جب بھی وہ قیدیوں میں کوئی شیر خوار بچہ پاتی تو اسے اٹھا لیتی اور اسے اپنے سینے سے لگا کر اسے دودھ پلاتی۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنی اولاد کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟ تو ہم نے عرض کی۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو پوری کوشش کرے گی کہ وہ اولاد کو آگ میں نہ پھینکے تو پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اَللّٰہُ اَرْحَمُ بِعِبَادِہٖ مِنْ ھٰذِہٖ بِوَلَدِھَا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے جتنا کہ یہ عورت اپنی اولاد پر۔ متفق علیہ (4)۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو منبر پر یہ بیان فرماتے سنا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۔ میں نے بھی دوسری بار پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ پھر فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۔ میں نے تیسری بار پھر وہی عرض کی اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی

یارسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ (وہ ایسا بھی کرے) ابوالدرداء کی ناک خاک آلود ہو (وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے) اسے احمد نے روایت کیا ہے (1)۔

حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ ایک آدمی آیا جو اپنے اوپر چادر لپیٹے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے اس نے چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس سے گزرا تو میں نے اس میں کسی پرندے کے بچوں کی آوازیں سنیں چنانچہ میں نے انہیں پکڑ لیا اور اپنی اس چادر میں رکھ لیا۔ اتنے میں ان کی ماں آئی اور وہ میرے سر پر منڈلانے لگی تو میں نے اس کے لئے انہیں ایک بار ظاہر کیا تو وہ فوراً ان پر جھپٹ پڑی لیکن میں نے انہیں اپنی اس چادر میں لپیٹ لیا اور اب وہ میرے پاس ہیں تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا انہیں رکھ دو۔ پس میں نے انہیں رکھا اور ان کی ماں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی رہی (اسے اپنی جان کی فکر قطعاً دامن گیر نہ ہوئی) پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس پر تعجب کناں ہو کہ ان بچوں کی ماں اپنے بچوں پر کتنی مہربان ہے (کتنی شفقت اور پیار کا اظہار کر رہی ہے؟) قسم ہے مجھے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا اور مہربان ہے جتنا کہ ان بچوں کی ماں اپنے بچوں پر۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا) انہیں واپس لے جا اور اسی جگہ پر رکھ دے جہاں سے تو نے انہیں پکڑا ہے۔ ان کی ماں ان کے ساتھ ہی تھی کہ وہ آدمی انہیں واپس چھوڑ آیا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم ایک غزوہ میں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپ ﷺ کا گزر ایک قوم کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تم کونسی قوم ہو؟ انہوں نے عرض کی ہم مسلمان ہیں۔ ان میں ایک عورت ہانڈی پکا رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ جب بھی آگ بھڑکتی اور شعلہ بلند ہوتا تو وہ بچے کو اپنے سے علیحدہ کر کے (آگ کی تپش سے دور رکھتی) وہ عورت حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی کیا آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ پھر اس نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کیا اللہ تعالیٰ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر اس نے عرض کی جتنی شفقت اور مہربانی ماں اپنی اولاد کے ساتھ کرتی ہے کیا اللہ تعالیٰ اس سے بڑھ کر اپنے بندوں پر رحم فرمانیوالا نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر اس نے عرض کی۔ بیشک ماں تو اپنی اولاد کو آگ میں نہیں پھینکتی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے سر اقدس جھکایا اور رونے لگے۔ پھر آپ ﷺ نے سر نیاز اٹھایا اور اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف انہیں ہی عذاب دے گا جو انتہائی سرکش ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہائی معاندانہ اور سرکشی کا سلوک کرتے ہیں اور لا الہ الا اللّٰہ کہنے سے بالکل انکار کرتے ہیں۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (3)۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس بندے نے لا الہ الا اللّٰہ کہا (یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا) اور پھر اسی نظریہ پر قائم رہتے ہوئے اسے موت آ گئی تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے عرض کی اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی۔ میں نے پھر عرض کیا اگرچہ اس نے زنا کیا

اور چوری کی؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابوذر تیری ناک خاک آلود ہو اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی۔ متفق علیہ (۱)۔ اس بارے میں کثیر احادیث ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انجام کار بندۂ مومن جنت میں داخل ہوگا۔ اس طرح نہیں جیسا کہ معتزلہ نے کہا ہے کہ اگر گناہ کبیرہ کرنے والے نے توبہ کی تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

فرقہ مرجیہ والوں نے انہی احادیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ گناہ چاہے صغیرہ ہوں یا کبیرہ ایمان کی موجودگی میں (بندے کے لئے) ضرر رساں نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ حالت کفر میں طاعت وعبادت نفع مند ثابت نہیں ہوگی۔ لیکن ان کا یہ نظریہ باطل ہے اور اس سے ان کثیر آیات واحادیث کا انکار لازم آتا ہے جو گناہوں سے روکنے کے لئے ذکر کی گئی ہیں اور ان میں یہ مذکور ہے کہ گناہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے عذاب تک لے جانے والے ہیں مگر جب کہ مغفرت بندے کی چارہ سازی کرے (تو پھر اس گرفت سے بچ سکتا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ مذہب حق وہی ہے جو اہل السنۃ والجماعۃ نے اختیار کیا ہے۔ بیشک حالت کفر میں طاعت وعبادت نفع بخش ثابت نہیں ہوتی کیونکہ طاعت ہوتی ہی نہیں جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے لئے خالص نہ ہو۔ بلکہ وہ تو معصیت ہوتی ہے اور طاعت وعبادت کے لئے ایمان اسی طرح شرط ہے جیسے نماز کے لئے وضو۔ لیکن معصیت اور گناہ اگر چہ ذاتی اعتبار سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں لیکن اس کا انحصار اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے اگر چاہے تو بندے کی مغفرت فرمادے اور اگر چاہے تو اسے عذاب میں مبتلا کردے پھر اگر وہ اسے معاف فرمانا چاہے گا تو اسے توبہ کے سبب معاف فرمادے گا یا حضور نبی کریم ﷺ کی شفاعت کے سبب یا حضور نبی کریم ﷺ کے متبعین میں سے کسی کی (دعا) کے سبب (یعنی اللہ تعالیٰ کے کسی ولی کی دعا سے) یا پھر اس کی مغفرت محض اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے ہوگی اور اگر وہ اسے عذاب بھی دے گا تو اس کا عذاب دائمی اور ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ وہ بندہ مومن ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (اہل ایمان کے ساتھ) ہر نیکی پر اجر وثواب کا وعدہ فرما رکھا ہے اور ارشاد فرمایا فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ اور ایمان تمام نیکیوں کی اصل اور بنیاد ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ خلافی محال ہے اور اجر وثواب کا محل بالیقین جنت ہے۔ لیکن بندۂ مومن اپنے گناہ کو ایسے خیال کرتا ہے گویا وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہوا ہے (اور وہ اوپر سے گرنے کے قریب ہے) اور فاجر وکافر انسان اپنے گناہ کو ناک پر بیٹھنے والی مکھی کی طرح گمان کرتا ہے اور اس کے بارے یہ کہتا ہے کہ اس طرح ہاتھ کا اشارہ کریں گے تو وہ اڑ جائے گی۔ یہ حدیث حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔

وَ اَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝

''اور (سچے دل سے) لوٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور سرخم کردو اس کے سامنے اس سے پہلے کہ آجائے تم پر عذاب پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی ۱۔ اور پیروی کرو عمدہ کلام کی جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اس سے پیشتر کہ تم پر اچانک عذاب آجائے۔ اور تمہیں خبر تک نہ ہونے پائے ۲۔''

سے پہلے کہ تم پر قبر میں یا قیامت قائم ہونے کے بعد عذاب آ جائے۔ پس اس وقت تمہارا ایمان لانا تمہارے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اس پر ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔ ان الفاظ کا عطف جملہ مستانفہ پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ تُعَذَّبُوْنَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔ یعنی تمہیں عذاب دیا جائے گا پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

۲؎ اور پیروی کرو عمدہ کلام کی جو تمہارے رب کے پاس سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے تو اس میں عمدہ کلام سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ یہ تمام کلاموں سے احسن اور عمدہ ہے یا پھر اس سے مراد عزائم ہیں نہ کہ رخصتیں۔ (یعنی عزائم کو اپناؤ نہ کہ فقط رخصتوں پر عمل کرو) اس سے پیشتر کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے اور تمہیں اس کے آنے کی خبر تک نہ ہو۔

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

''(اس وقت) کوئی شخص یہ کہنے لگے صد حیف! ان کوتاہیوں پر جو مجھ سے سرزد ہوئیں اللہ کے بارے میں اور میں تو تمسخر اڑانے والوں سے تھا۱؎۔ یا یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت دے دیتا تو میں ہو جاتا پرہیز گاروں میں سے ۲؎۔ یا یہ کہنے لگے جب عذاب دیکھے کاش! مجھے ایک بار پھر موقع دیا جائے تو میں نیکوکاروں میں سے ہو جاؤں گا ۳؎۔''

۱؎ اَنْ تَقُوْلَ کا معنی ہے (اس وقت) کوئی شخص مجبوراً یہ کہنے لگے۔ یہ معنی ہے تا کہ کوئی شخص یہ نہ کہے۔ نفس کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے اور اس پر تنوین تقلیل کیلئے ہے کیونکہ قیامت کے دن یہ قول کہنے والے چند لوگ ہی ہوں گے یا تنوین تکثیر کیلئے ہے ترکیب کلام میں ان تقول انیبو فعل کا مفعول لہ ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے۔ اور مبرد نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے بَادِرُوْا وَاحْذَرُوْا اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ(1)۔

يٰحَسْرَتٰى۔ صد حیف' ہائے افسوس! اس کا معنی حسرت اور غم میں اضافہ کا ہونا ہے۔ یہ اصل میں یا حسرتی ہے یا پھر یاء کو استغاثہ کی صورت میں الف کے ساتھ تبدیل کیا گیا ہے۔ بعض نے الف استغاثہ کے بعد پھر یاء کو اس کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جیسا کہ ابو جعفر نے یا حسرتا پڑھا ہے۔

عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ میں ما مصدریہ ہے معنی یہ ہے صد حیف! میری کوتاہی کرنے اور غفلت برتنے پر۔

في جنب الله کا معنی حسن نے یہ کیا ہے۔ قصرت فی طاعة الله۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جو کوتاہی کی' مجاہد نے کہا فی امر الله۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں میں نے جو کوتاہی کی اور سعید بن جبیر نے کہا فی حق الله(2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حق میں جو کوتاہی ہوئی۔ بعض نے فی ذات اللہ بھی معنی کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں جو کوتاہی ہوئی۔ اس صورت میں طاعت یا قرب مضاف محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کی اطاعت میں یا اس کے قرب میں جو کوتاہی ہوئی۔

بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے میں نے کوتاہی کی اس جانب میں جو مجھے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی طرف لوٹاتی تھی۔ وَاِنْ

بناء پر محل نصب میں ہے۔ گویا کہ اس نے یہ کہا۔'' اور میں تو اللہ تعالیٰ کے دین اس کی کتاب اس کے رسول اور اہل ایمان کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کیا کرتا تھا۔''

۲۔ یا کوئی یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے میرے لئے ہدایت ثابت ہو جاتی تو میں بھی شرک اور گناہوں سے بچنے والے پرہیزگاروں میں سے ہو جاتا۔

۳۔ یا عذاب کو ظاہر دیکھ کر کہنے لگے کاش! مجھے دنیا کی طرف لوٹنے کا ایک بار پھر موقع دیا جائے تو میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے نیکوکار ہیں۔ فاکون میں فاء کے بعد ان ناصبہ مقدر ہے، اسی کی بناء پر فعل منصوب ہے اور یہ تمنی کے جواب میں واقع ہے کیونکہ اس سے قبل لو حرف تمنی واقع ہے۔ لو ان لی کرۃ او حرف عطف اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ قیامت کے دن حسرت آمیز اور افسوس سے بھرے کلمات کہے گا لیکن ان میں سے کوئی بھی اس دن نفع بخش اور سود مند ثابت نہ ہوگی تا کہ اس دنیا میں ہی اسے یہ علم ہو جائے کہ اس دن ایسی لغو اور بے معنی گفتگو کی گنجائش نہیں ہوگی۔)

بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰیٰتِیْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَ اسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۵۹﴾ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تَرَى الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِیْنَ ﴿۶۰﴾ وَ یُنَجِّی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا یَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾

'' ہاں! ہاں! آئی تھیں تیرے پاس میری آیتیں پس تو نے انہیں جھٹلایا اور تو گھمنڈ کرتا رہا اور تو کفر کرنیوالوں میں سے تھا ۱ے اور روز قیامت آپ دیکھیں گے انہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اس حال میں کہ انکے چہرے سیاہ ہوں گے کیا نہیں ہے جہنم میں ٹھکانا تکبر کرنیوالوں کا؟ ۲ے اور نجات دے گا اللہ تعالیٰ متقیوں کو کامیابی کے ساتھ۔ نہ چھوئے گی انہیں کوئی تکلیف اور نہ وہ غمگین ہونگے ۳ے۔''

۱ے بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ الآیۃ۔ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم کو کلی طور پر رد کر دیا ہے جسے کہنے والے کا قول لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ متضمن ہے۔ کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت ہی نہیں دی۔ اب اگر ہدایت سے مراد اس کا معنی اراۃ الطریق ہے (یعنی فقط راہنمائی کرنا، راستہ دکھانا) تو اس آیت کا معنی یہ ہوگا کیوں نہیں۔ بلکہ میں نے تو تیری راہنمائی کی تھی اس طرح کہ تیری طرف اپنا رسول بھیجا اور میری کتاب تیرے پاس پہنچی لیکن تو نے اس کی تکذیب کی اُسے جھٹلا دیا تو پھر اس نے اپنے قول لو ان اللہ ھدانی کے ساتھ رسل علیہم السلام کی تبلیغ کا انکار کیا ہے (یعنی نہ میرے پاس کوئی رسول آیا اور نہ مجھے کسی نے اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغام پہنچایا) جیسا کہ حدیث شریف میں موجود ہے کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائیگا اور آپ سے یہ پوچھا جائے گا کیا تم نے تبلیغ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنی امت تک پہنچا دیا تھا؟ تو وہ جواب دیں گے جی ہاں! میں نے پیغام حق اپنی امت تک پہنچا دیا تھا۔ پھر ان کی امت کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائیگا کیا نوح علیہ السلام نے تم تک پیغام پہنچایا تھا تو وہ کہیں گے نہیں۔ ہمارے

ہدایت سے مراد خلق ہدایت اور ایصال الی المطلوب (منزل مقصود تک پہنچانا) ہوتو پھر ان کے قول لو ان اللّٰہ ھدنی الآیۃ کا معنی یہ ہوگا کہ میں تو مجبور محض تھا مجھے ایمان و اطاعت اختیار کرنے کی قدرت ہی حاصل نہ تھی (گویا کہ وہ یہ کہے گا کہ میں ایمان تو تب لاتا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے کوئی اختیار دیتا۔ اس نے مجھے کوئی قدرت ہی نہیں دی پھر میں کیسے مطیع و فرمانبردار بنتا) تو اس قول کا رد کرتے ہوئے رب کریم نے فرمایا بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ الآیۃ یعنی کیوں نہیں میں نے تو تجھ میں قدرت پیدا کی تھی (کہ اپنی مرضی اور پسند سے جو راستہ چاہے اختیار کر لے ہم نے دونوں راستے تیرے لئے واضح کر دیئے ہیں) اسی قدرت اور اختیار کے استعمال پر عذاب وثواب مرتب ہوتا ہے۔ لیکن جب میری آیات تیرے پاس آئیں تو تو نے اپنے اختیار اور پسند کے ساتھ انہیں جھٹلا دیا۔ اس نظریہ سے بندوں کے افعال میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اثر انداز ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے۔

(لو ان اللّٰہ ھدنی الآیۃ ان کا قول مردود ہے اور بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ الآیۃ اس قول کا رد ہے اور ان دونوں کے درمیان ان تقول حین تری العذاب الآیۃ بطور فاصلہ موجود ہے) اب اگر یہ کہا جائے کہ رد اور مردود کے مابین اس فاصلے کی وجہ کیا ہے؟ تو ہم یہ کہیں گے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ اس آیت (قول رد) کو مقدم کرنے سے قرائن متفرق ہو جاتے ہیں، قول مردود مؤخر ہو جاتا ہے اور وہ نظم کلام اور عبارت جو کہ موجود کیفیت سے مطابقت و موافقت رکھتی ہے اس میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ پہلے کوتاہی اور غفلت پر اظہار حسرت و ندامت کر رہا ہے۔ پھر وہ ہدایت یافتہ نہ ہونے کے سبب کف افسوس مل رہا ہے اور پھر وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی خواہش اور آرزو کر رہا ہے۔

قَدْ جَآءَتْكَ میں معنی کے اعتبار سے ضمیر خطاب مذکر ذکر کی گئی ہے۔

۲۔ قیامت کے دن آپ انہیں دیکھیں گے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے تھے" یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے اوصاف بیان کرتے تھے جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا ہرگز جائز نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور اولاد بنانا وغیرہ۔" اس حال میں کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ ترکیب کلام میں جملہ وجوھھم مسودۃ تری کے مفعول سے حال واقع ہو رہا ہے کیونکہ اس کا تعلق رؤیۃ بصر (آنکھ سے دیکھنے) کے ساتھ ہے۔

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ کا معنی ہے کیا ایمان سے تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہے؟ تو یہ استفہام تقریری ہے (یعنی بالیقین ان کا ٹھکانہ جہنم میں ہے) کیونکہ اس وقت وہ خود بھی اسے دیکھ لیں گے۔

۳۔ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کامیابی کے ساتھ جہنم سے نجات دے گا جو شرک سے بچے اور دور رہے۔

حمزہ کسائی اور ابوبکر نے بمفازتھم کو بمفازاتھم الف کے ساتھ جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے بغیر الف کے مفرد حالت میں پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے کامیابی۔ بعض نے اس سے مراد نجات لی ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ بھی کامیابی کی اقسام میں سے ایک مخصوص اور اہم ترین قسم ہے۔ بعض نے اس کا مفہوم سعادت (خوش بختی) اور عمل صالح بیان کیا ہے چونکہ یہ دونوں بھی کامیابی کے اسباب ہیں اس لئے اس میں مسبب بول کر سبب مراد لیا گیا ہے اور بمفازتھم میں باء سببیہ ہے اور یہ ینجی کا صلہ ہے (یعنی اس کے

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۙ وَّ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾

"اللہ تعالیٰ پیدا کرنیوالا ہے ہر چیز کا۔ اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے [1] وہی مالک ہے آسمانوں اور زمین کی کنجیوں کا [2] اور جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا وہی لوگ خسارہ میں ہیں [3]"

[1] اللہ تعالیٰ ہی خیر وشر اور ایمان وکفر میں سے ہر شے کو پیدا کرنیوالا ہے۔ یہ جملہ ارشاد باری تعالیٰ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ کے ساتھ متصل ہے۔ ان کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا نگہبان ہے، یعنی تمام چیزیں اسی کے سپرد ہیں اور وہی ان کی حفاظت فرماتا ہے۔ یہ جملہ معطوف یا حال ہے۔

[2] مَقَالِيْدُ بمقلا دیا مقلید کی جمع ہے جیسا کہ مفتاح کی جمع مفاتیح یا مندیل کی جمع منادیل آتی ہے۔

مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا معنی ہے کہ زمین وآسمان کے خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں' اسی کی ملکیت ہیں، اس کے سوا کوئی بھی ان میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

قتادہ اور مقاتل نے بیان کیا ہے کہ زمین وآسمان کی چابیوں سے مراد رزق اور رحمت ہے۔ کلبی نے کہا ہے اس سے مراد بارش کے خزانے اور نباتات کے خزانے ہیں (1)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے مقالید کے بارے سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کی تفسیر اس طرح بیان فرمائی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (2)۔ (۱) اسے ابو یعلی نے اپنی مسند میں' ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں' عقیلی نے ضعفاء میں' طبرانی نے الدعاء میں اور بیہقی نے الاسماء والصفات میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہی حدیث نقل کی ہے۔ علامہ ابن جوزی نے موضوعات میں اسے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو ان کلمات میں ذکر کی گئی ہیں وہی مقالید کی تفسیر ہیں۔ یعنی وہ ذات جو ان صفات سے متصف ہے وہی زمین وآسمان کے خزانوں کی مالک ہے' تمام خزانے اسی کی ملکیت اور قبضے میں ہیں۔ وہی ان میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 26 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 625 (العلمیۃ)

(۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مقالید کے بارے سوال کا واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اسی طرح مروی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ البتہ اس میں یہ زائد بھی ہے کہ جو آدمی صبح وشام یہ کلمات دس دس بار پڑھے گا اللہ تعالیٰ اسے چھ وصف اور خصلتیں عطا فرمائے گا۔ ایک یہ کہ وہ شیطان اور اس کے لشکر سے محفوظ رہے گا۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں قنطار (اجر عظیم) عطا فرمائے گا، تیسرا یہ کہ اس کی زوجیت میں فراخ چشم حور عطا فرمائے گا۔ چوتھا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا۔ پانچواں یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کی معیت میں ہوگا اور چھٹا یہ کہ موت کے وقت بارہ فرشتے اس کے پاس حاضر ہوں گے وہ اسے حق کی بشارت دیں گے اور قبر سے موقف تک اسے عزت واحترام کے ساتھ لے جائیں گے۔ جب قیامت کے دن اسے کوئی خوف لاحق ہوگا تو فرشتے کہیں گے تو خوفزدہ نہ ہو بلاشبہ تو امن والوں میں سے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر حساب وکتاب کو انتہائی آسان کر

تصرف کرسکتا ہے اور جو اس کا اعتقاد رکھتا ہے اور اس کا ذکر کرتا ہے وہ یہ اہلیت رکھتا ہے کہ اس کے لئے جلدی یا دیر سے خزانوں کے منہ کھول دیئے جائیں۔

سے اور جولوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ خسارہ میں ہیں۔ آیات اللہ سے مراد قرآن کریم اور وہ کلمات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و بزرگی اور وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ یا اس سے مراد وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور زمین وآسمان کے معاملات کا حاکم مطلق ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

خسارے کو صرف کفار کے ساتھ ہی خاص اور محصور کیا گیا ہے کیونکہ ان کے سوا تمام کے تمام رحمت وثواب سے کچھ نہ کچھ حصہ پانے والے ہیں۔ اگر دنیوی نعمتوں میں سے کوئی شے انہیں نہ بھی حاصل ہوئی تو ان کے بدلے انہیں آخرت میں ایسی نعمتیں حاصل ہوں گی جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ ان کے بارے کسی کان نے سنا۔ لیکن کفار کے لئے اگر چہ دنیا میں رزق اور بارش کے خزانوں میں سے حصہ موجود ہے (وہ اس سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں) لیکن شکر میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں اور نہ ہی رحمت کے خزانوں میں ان کے لئے کوئی حصہ ہے اور یہی دنیا کی لذتیں اور نعمتیں جن سے وہ لطف اندوز ہوتے رہے آخرت میں ان کے لئے وبال اور فریب میں بدل جائیں گی۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا کے ساتھ متصل ہو اور ان کے درمیان جملہ معترضہ ہو۔ جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کا نگران ہے ان کے افعال واعمال پر مطلع ہے اور انہی اعمال کی وجہ سے انہیں جزاء اور بدلہ دے گا اور نظم کلام میں تبدیلی اس پر مطلع کرنے کے لئے ہے کہ مومنین کی فلاح اور کامیابی وکامرانی میں سب سے عمدہ اور اعلیٰ چیز اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور کفار کے خسارے میں سے سب سے بڑا خسارہ ان کا آیات الٰہی کے ساتھ کفر کرنا ہے۔ اجر وثواب کے وعدہ کو صراحۃً ذکر فرمایا اور وعید کا ذکر اشارۃً اور تعریضاً کیا اور یہ بھی ایک خاص تدبیر ہے۔ واللہ اعلم۔

طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پیشکش کی کہ ''آپ کو اتنا وافر مال دیں گے کہ وہ مکہ میں امیر ترین آدمی بن جائیں گے اور جس عورت سے آپ چاہیں گے وہ اسی سے آپ کی شادی کر دیں گے' انہوں نے کہا اے محمد! (ﷺ) یہ سب کچھ آپ کے لئے ہوگا بشرطیکہ آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے رک جائیں۔ نازیبا کلمات کے ساتھ آپ ان کا تذکرہ نہ کریں اور اگر آپ یہ نہیں کرتے تو پھر یہ کریں کہ آپ ایک سال تک ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اور پھر ایک سال ہم تیرے معبود کی عبادت کریں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا میں وہی کروں گا جو میرے رب کی طرف سے نازل ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ مکمل سورت نازل فرمائی اور ساتھ یہ آیت بھی نازل فرمائی (1)۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾

کی طرف اور ان کی طرف جو آپ سے پہلے تھے کہ اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال اور آپ بھی خاسرین میں سے ہو جائیں گے ۲؎ بلکہ صرف اللہ کی ہی عبادت کیا کرو اور ہو جاؤ شکر گزاروں میں سے ۳؎''

۱؎ اے محمد ﷺ! آپ فرمائیے اے جاہلو! کیا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں۔ تامرونی میں نافع اور ابن کثیر نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔

علامہ بیہقی نے دلائل میں حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے کہ مشرکین نے حضور نبی کریم ﷺ کو کہا اے محمد ﷺ! آپ تو اپنے آباء واجداد کو گمراہ قرار دیتے ہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مِنَ الشّٰکِرِیْنَ تک نازل فرمائی (1)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مقاتل کا قول ہے کہ کفار مکہ نے آپ ﷺ کو اپنے آباء واجداد کے دین کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی (2) تو تب یہ آیت نازل ہوئی۔

اہل شام نے تامرونی کو دونون مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ نے اس کی قرأت ایک نون مخففہ کے ساتھ کی ہے اور ایک نون کو حذف کر دیا ہے کیونکہ اسے اکثر حذف کر دیا جاتا ہے اور باقیوں نے ادغام کی صورت میں ایک نون مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

افغیر میں ہمزہ برائے انکار ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ اور غیر، اعبد فعل کا مفعول ہے اور اسے محل انکار ہونے کی وجہ سے فعل پر مقدم ذکر کیا گیا ہے اور تامرونی جملہ معترضہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ءَ اَکْفُرُ فَغَیْرَ اللّٰہِ اَعْبُدُ تَاْمُرُوْنِیْ بِذٰلِکَ۔ (کیا میں کفر کروں اور غیر اللہ کی عبادت کروں تم مجھے اس کا حکم دیتے ہو۔)

اور یہ بھی جائز ہے غیر اس فعل کے سبب منصوب ہو جس پر تامرونی اعبد دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ تعبدونی باب تفعیل کے معنی میں ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں اس طرح ہے تَاْمُرُوْنِیْ اَنْ اَعْبُدَ غَیْرَ اللّٰہِ۔ اس سے ان کو حذف کر دیا گیا اور فعل کو مرفوع پڑھا گیا۔ جیسا کہ اس قول میں ہے احضر الوغی اور اس کی تائید اعبد نصب والی قرأت سے بھی ہوتی ہے۔ پس مفہوم عبارت اس طرح ہے کہ کیا اتنے دلائل کے بعد بھی تم پر توحید واضح نہیں ہوئی کہ تم مجھ سے غیر اللہ کی عبادت کی توقع رکھتے ہو اور تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کرنے کا مشورہ اور حکم دیتے ہو۔

۲؎ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ سے آخر آیت تک سارا کلام ایک فرضی مفہوم کے تحت ذکر کیا گیا ہے اور اس سے مراد کفار کو مایوس اور ناامید کرنا ہے اور امت کو حکم پر متنبہ کرنا ہے۔ اسی آیت سے ہم یہ حکم لگاتے ہیں کہ مرتد ہونا تمام نیکیوں کے ثواب اور اجر کو ختم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اسلام اپنے سے قبل کی تمام برائیوں اور گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ اگر کوئی آدمی مرتد ہونے کے بعد نماز کے وقت میں اسلام لے آیا۔ جبکہ وہ مرتد ہونے سے قبل حالت اسلام میں اس وقت کی نماز ادا کر چکا تھا تو اس پر دوبارہ اس نماز کو پڑھنا لازم ہے۔ اسی طرح جس آدمی نے پہلے حج کیا' پھر مرتد ہو گیا پھر دوبارہ اسلام لے آیا تو اس پر دوبارہ حج کرنا واجب ہوگا۔ امام ابن ہمام نے اسی طرح کہا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اعمال کے ضائع کرنے کا حکم مطلق ہے اور یہ ان (انبیاء علیہم السلام) کے خصائص میں

ہے۔ (یعنی ارتداد سے اعمال ضائع تب ہوتے ہیں جب اسی حالت پر موت آ جائے) جیسا کہ اس ارشاد میں صراحۃً موجود ہے۔ وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (1)۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول باطل ہے کیونکہ یہ کہنا کہ ارتداد انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں سے ہے یہ انتہائی قبیح اور برا تصور ہے۔ قریب ہے کہ اس طرح کہنے سے آسمان پھٹ جائے۔ کیونکہ یہ کلام فرض محال کے طریقہ پر ہے اور اس سے مراد دوسروں کے حکم پر متنبہ کرنا ہے اور قول باری تعالیٰ مَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ اس پر دلالت نہیں کرتا جب تک مرتد کی موت حالت کفر پر نہ ہو اس کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے۔ بلکہ زیر بحث آیت مطلق ہے اور ہمارے نزدیک مطلق اپنے اطلاق پر ہی باقی رہتا ہے۔ اسے مقید پر محمول کرنے کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

سے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کیا کرو۔ یہ فی الحقیقت اس قول کا رد ہے جو کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا۔ لفظ اللہ، اعبد فعل کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ فاعبد پر فاء یا تو زائدہ ہے۔ یا پھر یہ اما مقدرہ کے سبب ہے۔ اس میں معمول کی اپنے عامل سے تقدیم کا سبب ارادہ حصر ہے اور بل حرف عطف ہے جو کہ محذوف کلام پر عطف کرنے کے لئے ہے جس پر قول باری تعالیٰ لان اشرکت الخ دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ لَا تَعْبُدْ غَیْرَ اللّٰهِ بَلِ اللّٰهَ اَعْبُدْ اَوْ بَلْ اَمَّا اللّٰهَ فَاعْبُدْ۔ اور اس کے انعام کا شکر ادا کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ اس میں بھی موجب اختصاص کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ ہی تمہیں نعمتوں سے نوازنے والا ہے اور آپ اسی کے شکر گزار بندے بنیں) ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرا اور اس نے کہا اے ابوالقاسم! تم کیا کہتے ہو کہ جب اللہ تعالیٰ آسمانوں کو اس (دست قدرت کی انگلی) پر رکھے گا اور زمینوں کو اس پر رکھے گا اور پانی کو اس پر رکھے گا اور پہاڑوں کو اس پر رکھے گا(2) (تو وہ کیا کرے گا؟) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝

"اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جس طرح قدر پہچاننے کا حق تھا اور (اس کی شان تو یہ ہے) ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان لپٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے لے پاک ہے وہ ہر عیب سے اور برتر ہے لوگوں کے شرک سے ۲۔"

لے یعنی لوگوں نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عظمت نشان کو اس طرح نہیں پہچانا جیسے پہچاننے کا حق تھا۔ اس لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسروں کو شریک ٹھہرا لیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے اوصاف کی نسبت کی جو قطعاً اس کی شان اور عظمت کے لائق اور مناسب نہیں۔ انہوں نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کی جیسے اس کی عبادت کا حق تھا اور نہ ہی اس کی (نعمتوں پر) حق شکر ادا

قَبۡضَتُهٗ کا معنی ہے ایک بار قبضہ کرنا۔ یہ لفظ القبض سے بنایا گیا ہے اس کا اطلاق کسی بھی شئی کی اس مخصوص مقدار پر ہوتا ہے جو مٹھی میں بند ہو۔ یہ لفظ یا تو مصدر بمعنی مفعول ہے یا پھر اس سے پہلے ذات مضاف محذوف ہے، یعنی اس کے قبضہ والی چیزیں۔

یہ آیت آیات متشابہات میں سے ہے جسے اپنے ظاہر معنی سے پھیر دیا گیا ہے اور اس کی حقیقی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کاملہ پر متنبہ کرنا ہے اور اس پر آگاہ کرنا ہے کہ وہ بڑے بڑے اور عظیم افعال جن کے بارے انسانی فہم وفراست حیرت زدہ ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی شان قدرت کے سامنے بالکل ہیچ اور حقیر ہیں اور اللہ تعالیٰ پر ساری کائنات کو درہم برہم کرنا بالکل آسان کام ہے۔

علمائے بلاغت نے بیان فرمایا ہے کہ یہ کلام تمثیل وتخییل کے طریقہ پر وارد ہے۔ قبضہ اور یمین سے نہ تو حقیقی معنی مراد ہے نہ مجازی۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول "شابت لمة الليل" (رات کی زلفیں سفید ہو گئیں۔ اس آیت کے نازل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہودی نے (زمینوں آسمانوں اور پہاڑوں وغیرہ کے بارے میں) ایک بات کہی تھی اور اس نے یہ بات بالیقین تورات سے نقل کی ہو گی۔ گویا یہ آیت اس (نظریہ) کی تائید کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اس طرح مذکور ہے کہ یہودیوں کا ایک عالم حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور کہا اے محمد (ﷺ!) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں کو (اپنے دست قدرت کی) ایک انگلی پر، تمام زمینوں کو انگلی پر، پہاڑوں اور درختوں کو ایک انگلی پر، پانی اور تر مٹی کو ایک انگلی پر اور ساری مخلوق کو ایک انگلی پر روک لے گا۔ پھر انہیں جھنجھوڑے گا اور فرمائے گا میں بادشاہ ہوں اور میں اللہ ہوں تو حضور نبی کریم ﷺ نے اس کی بات پر اظہار تعجب فرمایا اور مسکرا دیئے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ الآیۃ (1)۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ ترمذی اور صحیحین کی روایت کے درمیان تعارض ہے (کیونکہ ترمذی کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودی کے قول کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ جبکہ صحیحین کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے یہودی کے قول کے بعد یہ آیت پڑھی۔ یعنی اس کا نزول پہلے ہو چکا تھا) پھر ان دونوں میں تطبیق کیسے ہو سکتی ہے؟ تو اس کا سبب تطبیق یہ ہے کہ یہ آیت یہودی کے قول کے بعد آپ ﷺ پر نازل ہوئی اور اسی وقت آپ ﷺ نے یہ آیت یہودی پر پڑھ دی۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زمین کو اپنے قبضے میں لے لے گا اور آسمان کو اپنے دائیں دست قدرت میں لپیٹ لے گا اور پھر فرمائے گا میں تو شہنشاہ مطلق ہوں۔ زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟(2)۔

مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آسمانوں کو لپیٹ دے گا پھر انہیں دائیں دست قدرت میں پکڑ کر فرمائے گا کہاں ہیں وہ بڑی قوت وطاقت والے، کہاں ہیں وہ فخر وتکبر کرنے والے۔ پھر زمینوں کو لپیٹ کر اپنے بائیں دست قدرت میں پکڑ لے گا اور ایک روایت میں الفاظ ہیں کہ انہیں دوسرے دست قدرت میں پکڑ کر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں، کہاں ہیں وہ بڑی قوت وطاقت والے؟ کہاں ہیں وہ فخر وتکبر کرنے والے

ابوالشیخ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو اپنی مٹھی میں لے کر فرمائے گا میں اللہ ہوں، میں رحمن ہوں، میں بادشاہ ہوں، میں (تمام عیوب سے) پاک ہوں، میں امن دینے والا ہوں، میں محافظ اور نگران ہوں، میں غالب ہوں، میں زبردست قوت والا ہوں، میں کبریائی اور بڑائی کا اظہار کرنے والا ہوں، میں نے ہی دنیا کو ابتداءً پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی شے نہ تھی اور میں ہی اسے دوبارہ پیدا کر رہا ہوں (آج دنیا کے) بادشاہ کہاں ہیں، بڑی قوت وطاقت والے کہاں ہیں (1)۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قبض، طی اور اخذ تمام الفاظ کا معنی جمع کرنا ہے۔ کیونکہ آج آسمان بھی پھیلے ہوئے ہیں اور زمین بھی بچھی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے ان الفاظ کا معنی اٹھانا، زائل کرنا اور تبدیل کرنا ہے۔

علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ طی سے مراد ختم کر دینا اور فناء کر دینا ہے (2)۔

ابن ابی حاتم نے حسن رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے (پہلے مخلوق کی) گنتی کی پھر انہوں نے آسمانوں، زمین اور فرشتوں کی تخلیق میں غور وفکر کیا۔ جب اس سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ لگانا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (3)۔

حضرت سعید بن جبیر سے یہ قول مروی ہے کہ یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے کلام کیا اور ایسی ایسی باتیں کہیں جنہیں وہ نہ جانتے تھے اور نہ انہوں نے انہیں دیکھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ الآیۃ نازل فرمائی (4)۔

ابن منذر نے ربیع بن انس سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب آیت وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! جب کرسی کی وسعت کا عالم یہ ہے تو پھر عرش کی وسعت کی کیفیت کیا ہوگی تو تب اللہ تعالیٰ نے آیت وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ نازل فرمائی (5)۔

لے سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ وہ ذات جس کی قدرت اتنی وسیع اور مضبوط ہے وہ ان مشرکوں کے شرک کرنے سے انتہائی دور اور بلند وبالا ہے۔ یا وہ اس سے پاک ہے جو اس کی طرف شرک کی نسبت کی جاتی ہے (یعنی اس کی ہم گیر قدرت وطاقت والی ذات وصفات میں کوئی بھی شریک نہیں مشرکین کے یہ سارے نظریات باطل ہیں۔)

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی فَاِذَا هُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَوُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾

''اور پھونکا جائے گا صور پس غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے بجز ان کے جنہیں اللہ چاہے گا

جائیں گے لے اور جگمگا اٹھے گی زمین اپنے رب کے نور سے ۲ے اور رکھ دیا جائیگا دفتر عمل ۳ے اور حاضر کئے جائیں گے انبیاء اور (دوسرے) گواہ ۴ے اور فیصلہ کردیا جائیگا ان کے درمیان انصاف سے اور ان پر (رتی بھر) ظلم بھی نہیں کیا جائیگا ۵ے۔ اور پورا پورا بدلہ دیا جائیگا ہر شخص کو جو اس نے کیا تھا اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کام لوگ کرتے ہیں ۶ے۔''

لے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ سے مراد ہے کہ جب پہلی بار صور پھونکا جائیگا۔ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الآیۃ تو جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے وہ غش کھا کر گر پڑے گا یعنی وہ مر جائیگا۔ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ بجز ان کے جنہیں اللہ چاہے گا۔ تو ان سے کون مراد ہیں اس کی وضاحت ہم نے سورۂ نمل کی آیت وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کی تفسیر میں بیان کر دی ہے۔

حسن نے کہا ہے کہ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ سے مراد صرف اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی ذات ہے(1)۔

پھر دوبارہ جب اس میں صور پھونکا جائیگا تو وہ اچانک اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہو کر حیرت سے دیکھنے لگ جائیں گے۔ مبہوت آدمی کی طرح تمام اطراف میں اپنی نظریں گھمائیں گے یا معنی یہ ہے کہ وہ انتظار کرنے لگیں گے کہ اب ان کے ساتھ کیا کیا جائیگا۔ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس دن کا فاصلہ ہوگا۔ اخریٰ محل نصب اور محل رفع دونوں میں ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اس کے متعلق احادیث سورۃ النازعات میں ذکر کر دی گئی ہیں۔

۲ے وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ کا معنی ہے کہ میدان قیامت کی سرزمین اپنے خالق کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف نفخ فيه اخرى پر ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ فرمانے کے لئے جلوہ افروز ہوگا تو لوگوں کو اپنے رب کے نور کا مشاہدہ کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا جیسا کہ دن کے وقت کھلے آسمان میں چمکنے والے سورج میں انہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔

حسن اور سدی نے کہا ہے کہ بنور ربها سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے کیا جانے والا عدل و انصاف ہے(2)۔ اسے نور اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ عدل و انصاف بھی علاقوں کو مزین کر دیتا ہے اور حقوق کو ظاہر کر دیتا ہے۔ (جیسا کہ نور ہر شے کو ظاہر اور منکشف کر دیتا ہے) اسی طرح ظلم کو ظلمت (تاریکی) کہا گیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ظلم یوم قیامت کی ظلمتیں اور تاریکیاں ہیں۔ متفق علیہ۔

۳ے اور تمام لوگوں کا دفتر عمل ان کے سامنے رکھ دیا جائیگا۔ (چونکہ اسم جنس کا اطلاق جمع پر ہو سکتا ہے) اس لئے یہاں جمع کے لئے الکتاب اسم جنس پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام کے تمام اعمالنامے عرش کے نیچے ہیں۔ پس جب موقف ہوگا (یعنی جب لوگوں کو حساب و کتاب کیلئے ایک جگہ جمع کیا جائیگا) تو رب کریم ایک ہوا چلائے گا اور وہ انہیں دائیں بائیں لوگوں کے ہاتھوں تک اڑا کر لے جائے گی۔ سب سے پہلے اس میں یہ آیت لکھی ہوگی اِقْرَاْ كِتٰبَكَ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور دیلمی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن بندۂ مومن کا نامہ اعمال کا عنوان ہوگا ''حسن ثناء الناس''

ﷺ اور انبیاء علیہم السلام اور دوسرے گواہ حاضر کئے جائیں گے۔ علامہ سیوطی نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے کہا ہے کہ حساب انبیاء علیہم السلام اور دوسرے گواہوں کی موجودگی میں ہوگا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ بن مصیب کا یہ قول ابن مبارک نے نقل کیا ہے کہ لَيْسَ مِنَ الْيَوْمِ اِلَّا وَيُعْرَضُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ اُمَّتُهٗ غَدْوَةً وَّ عَشِيَّةً فَيَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ وَاَعْمَالُهُمْ فَلِذَالِكَ يَشْهَدُ عَلَيْهِمْ۔ (ہر روز صبح و شام حضور نبی کریم ﷺ کی امت آپ پر پیش کی جاتی ہے اور آپ ان کی پیشانیوں سے انہیں اور ان کے اعمال کو پہچان لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ قیامت کے دن ان کے متعلق شہادت دیں گے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ شہدآء سے مراد وہ ہیں جو رسل علیہم السلام کیلئے شہادت دیں گے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت تک پیغام رسالت، یعنی احکام خداوندی پہنچا دیئے تھے۔ اور یہ شہادت حضور نبی کریم ﷺ کی امت دے گی۔

حضرت عطاء نے کہا ہے کہ شہدآء سے مراد اعمالنامے لکھنے والے فرشتے (کراماً کاتبین) ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾ (1)۔

۵۔ اور بندوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائیگا اور ان پر رتی بھر بھی ظلم نہیں کیا جائیگا، یعنی نہ تو ان کے گناہوں میں اضافہ کیا جائیگا اور نہ ان کی نیکیوں میں کوئی کمی کی جائے گی۔

٦۔ اور ہر شخص کو اس کے عمل کی پوری پوری جزاء دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کام لوگ کرتے ہیں۔ حضرت عطاء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے افعال سے خوب واقف اور آگاہ ہے وہ کسی کاتب اور گواہ کا محتاج نہیں (2)۔ بلکہ یہ اعمالنامے اور گواہ فقط عرف اور عادت کے مطابق کافروں کے خلاف ان کے جرائم ثابت کرنے کے لئے ہوں گے (تاکہ انہیں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے)

پھر آئندہ آیت میں اعمال کا پورا پورا بدلہ دینے کی تفصیل بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ قِيْلَ ادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾

''اور ہانکے جائیں گے کفار جہنم کی طرف گروہ درگروہ جب اس کے پاس آئیں گے تو کھول دیئے جائیں گے اس کے دروازے 1۔ اور پوچھیں گے ان سے دوزخ کے پہرے دار کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے جو پڑھ کر

تم ہمیشہ اس میں رہو گے۔ پس کتنا برا ٹھکانا ہے مغروروں کا ہے۔''

لے زمر کا معنی ہے متفرق گروہ جو کہ ضلالت و گمراہی میں اپنے درجات کے مختلف ہونے کی بناء پر وہ آپس میں ایک دوسرے کے پیچھے ہوں گے۔ ابو عبیدہ اور اخفش نے کہا ہے کہ زمر سے مراد ایک فرقہ کے متفرق گروہ ہیں۔ زمر جمع ہے اور اس کی واحد زمرۃ ہے اور یہ الزمر سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے آواز۔ چونکہ کوئی جماعت اور گروہ آواز سے خالی نہیں ہوتی (اسی مناسبت سے جماعت اور گروہ کو ہی زمر کہہ دیا جاتا ہے۔ یا پھر یہ عربوں کے قول شاۃ زمرۃ سے بنایا گیا ہے۔ اس سے مراد ایسی بکری ہوتی ہے جس کے بدن پر بال بہت کم ہوں۔ اسی طرح رجل زمرۃ ایسے آدمی کو کہا جاتا ہے جس میں مروت انتہائی کم ہو۔ اسی وجہ سے قلیل جماعت کو بھی زمرۃ کہا جاتا ہے۔ حتی کہ جب وہ جہنم میں اس کے پاس آئیں گے، ان کے داخل ہونے کے لئے اس کے سارے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ فتحت کو کوفیوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے کثرت پر دلالت کرنے کے لئے اسے مشدد پڑھا ہے۔ یعنی فتحت۔ یعنی جہنم کے سات کے سات دروازے مکمل طور پر کھول دیئے جائیں گے۔ حالانکہ اس سے قبل وہ بند تھے۔

لے اور پھر انہیں جھڑکتے ہوئے اور زجر و توبیخ کرتے ہوئے دوزخ کے پہرے داران سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس تمہاری جنس میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمہیں تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سناتے اور تمہیں اس دن یعنی تمہارے جہنم میں داخل ہونے کے وقت کی ملاقات سے ڈراتے؟

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ آدمی شریعت آنے سے قبل کسی بھی شے کا مکلف اور پابند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہنم کے پہرے دار رسل علیہم السلام اور ڈرانے والی کتب کے آنے کو ہی اپنی زجر و توبیخ کی علت و سبب قرار دیں گے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ آیت اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ رسل علیہم السلام کے نہ ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے والے کو عذاب نہیں دیا جائیگا۔ بلکہ آیت تو اس پر دلالت کر رہی ہے کہ دوزخ کے پہرے دار انہیں خوب ڈانٹ ڈپٹ کر کے کہیں گے کہ جب تمام دلائل مکمل ہو چکے ہیں۔ یعنی پیغمبر تشریف لا چکے، کتب الہیہ کا نزول ہو چکا۔ انبیاء علیہم السلام نے تمہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا تو پھر ایمان نہ لانے اور شرک کرنے کی وجہ کیا ہے؟ کیونکہ فقط عقل اگرچہ شریعت کی پہچان اور معرفت کے لئے کافی نہیں لیکن وہ قطعی دلائل جو کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر قائم ہو چکے ہیں ان کے ہوتے ہوئے توحید باری تعالیٰ کے لئے فقط عقل کا حکم اور فیصلہ ہی کافی ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے رسل علیہم السلام کو بھیج دیا، کتابیں نازل فرما دیں اور مکمل راستہ واضح فرما دیا تو اب کفر و شرک پر مصر رہنے کا کوئی عذر بھی باقی نہیں رہا۔ واللہ اعلم۔

سے کہیں گے بیشک آئے تھے لیکن کفار پر عذاب کا حکم (لوح محفوظ میں) ثبت ہو چکا تھا۔ یعنی ازل سے ہی یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ یہ بد بخت ہیں، اشقیاء ہیں لہٰذا ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب ہوگا۔ الکفرین کا لفظ ضمیر کی جگہ پر صراحۃً ذکر کیا گیا ہے تا کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ یہ حکم کفار کے ساتھ خاص ہے۔

گیا ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ انہیں دیا جائیگا وہ انہیں انتہائی خوفزدہ اور دہشت زدہ کرنے والی بات ہوگی۔

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ پس مغروروں کا ٹھکانہ کتنا برا ہے۔ الْمُتَكَبِّرِيْنَ پر الف لام جنسی ہے اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور وہ جہنم ہے۔ فبئس کے اوپر فا سببیہ ہے۔ کیونکہ کلام سابق اس مذمت کا سبب ہے اور اس میں اس پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم اس لئے ہے کہ انہوں نے حق کو قبول کرنے سے غرور اور تکبر کیا ہے اور یہ بات مذکورہ بالا نظریہ کے منافی نہیں کہ ان کا جہنم میں داخلہ اس لئے ہے کہ ان کے بارے ازل سے ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب دیئے جانے کا فیصلہ ثبت ہو چکا ہے۔ کیونکہ (فی الحقیقت) ان کے تکبر اور دیگر برائیوں اور قباحتوں کا سبب وہی ازلی فیصلہ ہی ہے (اور یہ چیزیں اس کا مسبب ہیں) اس لئے دونوں میں کوئی تضاد نہیں) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک طویل حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جنت جیسے اعمال کراتا رہتا ہے حتیٰ کہ اہل جنت کے اعمال کرتے کرتے اسے موت آ جاتی ہے اور اس کے سبب وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جہنم جیسے اعمال کراتا رہتا ہے حتیٰ کہ ایسے اعمال کرتے کرتے اسے موت آ جاتی ہے اور اسی کے سبب وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسے مالک، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

”اور لے جایا جائیگا انہیں جو ڈرتے رہے تھے (عمر بھر) اپنے رب سے جنت کی طرف گروہ در گروہ حتیٰ کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے ہوں گے تو کہیں گے انہیں جنت کے محافظ تم پر سلام ہو تم خوب رہے پس اندر تشریف لے چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے 1۔“

1۔ اور جو عمر بھر اپنے رب سے ڈرتے رہے تھے انہیں بڑی تیزی کے ساتھ جنت، یعنی مقام عزت کی طرف لے جایا جائیگا۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کی سواریوں کو بڑی تیزی کے ساتھ جنت کی طرف ہانکا جائے گا۔ کیونکہ انہیں سواریوں پر ہی جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ عزت و شرف اور علو مرتبہ میں مختلف ہونے کی بناء پر متعدد گروہوں میں منقسم ہوں گے۔ حتیٰ کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان کے وہاں آنے سے قبل ان کی عزت و تعظیم کی خاطر جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تاکہ انہیں وہاں انتظار نہ کرنا پڑے تو اس وقت انہیں جنت کے محافظ کہیں گے تم پر سلام ہو، یعنی تمہیں کبھی بھی کوئی ناپسندیدہ امر لاحق نہ ہو۔ فتحت کو کوفیوں نے مخفف پڑھا ہے اور باقیوں نے تکثیر کی بناء پر مشدد پڑھا ہے۔ طبتم کا معنی ہے تم خوب رہے یعنی تم گناہوں کی میل کچیل سے پاک رہے۔ یہ طہارت یا تو اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے (قابل مؤاخذہ) گناہوں کا ارتکاب کیا ہی نہیں یا یہ مفہوم ہے کہ مغفرت کے سبب وہ اپنے گناہوں سے پاک ہو چکے ہیں یا پھر یہ معنی ہے کہ وہ گناہوں کی سزا برداشت کر چکنے کے سبب اب ان سے پاک ہو چکے ہیں۔

حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ جب اہل جنت جہنم کی مسافت طے کر چکیں گے تو جنت اور جہنم کے درمیان انہیں ایک پل پر روک لیا

داخل ہوں گے اس وقت رضوان جنت اور اس کے ساتھی اہل جنت کو کہیں گے سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ (1)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ متقی لوگوں کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ جب وہ جنت کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کے پاس ایک درخت پائیں گے اس کے تنے کے نیچے سے دو چشمے جاری ہوں گے۔ پس بندۂ مومن ان میں سے ایک میں غسل کرے گا تو اس کا ظاہر پاک صاف ہو جائے گا۔ اور دوسرے چشمے سے پیئے گا تو اس کے سبب اس کا باطن پاک صاف ہو جائے گا اور فرشتے جنت کے دروازوں (ا) پر ان سے ملاقات کریں گے اور یہ کہہ کر ان کا استقبال کریں گے سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ۔

زجاج نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ تم دنیا میں شرک اور گناہوں کی نجاست اور گندگی سے پاک تھے(2)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس کا معنی ہے تمہارے لئے یہ مقام (جنت) پاکیزہ اور صاف ہے۔ فادخلوھا میں فاء سببیہ ہے اور یہ اس معنی پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ ان کی پاکیزگی اور طہارت ہی ان کے جنت میں داخل ہونے اور اس میں ہمیشہ رہنے کا سبب ہے۔ اس کی تاویلات اور توجیہات بھی سابقہ آیت کی توجیہات کی مثل ہی ہیں۔ لہٰذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ان کے محل اور مقام کا پاک ہونا ان کے جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے۔ یعنی چونکہ جنت ایک پاکیزہ اور محترم مقام ہے۔ اس لئے وہ اہل جنت کا محل ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ خلدین کا معنی ہے کہ جنت میں ہمیشہ رہنا ان کا مقدر بن چکا ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ۝

"اور وہ (خوش بخت) کہیں گے ساری تعریفیں اس اللہ (کریم) کے لئے جس نے پورا فرمایا ہمارے ساتھ اپنا وعدہ اور وارث بنا دیا ہمیں اس (پاک) زمین کا۔ اب ہم ٹھہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے۔ پس کتنا عمدہ اجر ہے نیک کام کرنیوالوں کا[1]۔"

[1] وَقَالُوا کا عطف محذوف کلام پر ہے اور وہی اذا کا جواب ہے اور اسے اس معنی پر دلالت کرنے کے لئے حذف کیا گیا ہے کہ انہیں جنت میں داخل ہونے کے ساتھ ایسی عزت و کرامت حاصل ہوگی جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی جب وہ جنت کے پاس پہنچیں گے اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے ہوں گے تو انہیں جنت کے محافظ کہیں گے تم اس کے اندر تشریف لے چلو پس جونہی وہ اس میں داخل ہوں گے تو اس میں ایسی ایسی نعمتیں پائیں گے جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا تک نہیں۔ ان کے بارے کسی کان نے سنا تک نہیں بلکہ کسی کے دل میں ان کا تصور تک نہیں آیا اور نہ الفاظ سے ان کا بیان ممکن ہے تو وہ ان انعامات خداوندی پر شکر ادا کرتے ہوئے کہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 30 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 30 (الفکر)

(ا) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے اپنے مال میں سے جوڑا (سونا چاندی) اللہ کے راستے پر خرچ کیا تو اسے جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا اور جنت کے کئی دروازے ہیں پس جو نماز ادا کرنے والا ہوگا اسے باب الصلوٰۃ سے پکارا جائے گا۔ روزے دار کو باب الریان سے آواز دی جائے گی۔ صدقہ و خیرات کرنے والے کو باب الصدقہ سے بلایا جائے گا اور اہل جہاد کو باب الجہاد سے پکارا جائے گا [illegible]

گے الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ کہ ساری تعریفیں اس اللہ کریم کے لئے ہیں جس نے جنت میں داخل کرنے اور وہ مخفی نعمتیں جو آنکھوں کے لئے باعث راحت وٹھنڈک ہیں عطا فرمانے کا وعدہ ہمارے ساتھ پورا فرما دیا اور ہمیں سرزمین جنت کا وارث یعنی مالک بنا دیا۔ ہمیں سے ہر ایک جنت کی وسیع زمین میں جہاں چاہے ٹھہر سکتا ہے اور جب کوئی انبیاء علیہم السلام اور دیگر بلند رتبہ لوگوں کی زیارت کرنا چاہے تو اس کے لئے یہ سہولت میسر ہے۔

طبرانی، ابونعیم اور ضیاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! بیشک آپ میرے نزدیک میری جان اور اہل وعیال سے زیادہ محبوب ہیں۔ میں جب گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کا ذکر کرتا ہوں تو پھر میں صبر نہیں کر سکتا حتی کہ میں آپ کے پاس حاضر ہو کر آپ کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہوں (اور راحت وسکون کا سامان کر لیتا ہوں) لیکن جب میں اپنی موت اور آپ کے وصال کا تصور کرتا ہوں تو بالیقین یہ جانتا ہوں کہ آپ تو جنت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تشریف فرما ہوں گے اور اپنے بارے یہ ڈر اور خوف محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں جنت میں داخل ہو بھی گیا تو آپ کی زیارت اور دیدار سے تو شاد کام نہیں ہو سکوں گا تو آپ ﷺ نے اسے کوئی جواب نہ دیا (بلکہ سکوت اختیار فرمایا) یہاں تک کہ جبرئیل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہو گئے وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا ؀(1)۔ (اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور نیک لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوگا۔ اور یہ سب بہت اچھے ساتھی ہوں گے۔

فنعم اجر العاملین پس نیک کام کرنے والوں کا کتنا عمدہ اجر ہوگا یعنی جنت۔

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؀

"اور (اے حبیب!) آپ دیکھیں گے فرشتوں کو حلقہ باندھے کھڑے ہوں گے عرش کے اردگرد تسبیح پڑھ رہے ہوں گے اپنے رب (جلیل) کی حمد کے ساتھ [1] اور فیصلہ کر دیا گیا ہوگا ان کے درمیان حق کے ساتھ۔ اور کہا جائیگا سب تعریفیں اللہ کے لئے جو رب العالمین ہے [2]۔"

[1] حَآفِّیْنَ کا معنی ہے حلقہ بنائے ہوئے، گھیرے ہوئے۔ یعنی اے حبیب! آپ دیکھیں گے کہ فرشتے عرش کے اردگرد حلقہ بنائے کھڑے ہوں گے اور وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر رہے ہوں گے۔ علماء نے کہا ہے کہ فرشتوں کی یہ تسبیح بطور عبادت نہیں ہوگی بلکہ فقط تمتع اور تلذذ کے لئے ہوگی (یعنی فرشتے اس تسبیح سے لطف اندوز ہوں گے اور راحت وسکون حاصل کریں گے۔ کیونکہ یہ اس وقت عبادت کی پابندی تو ساقط ہو چکی ہوگی۔

ترکیب کلام میں یُسَبِّحُوْنَ کا جملہ حآفین کے فاعل سے حال ہے۔

[2] اور مخلوق کے درمیان حق یعنی عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا ہوگا۔ اس طرح کہ اہل ایمان کو جنت میں داخل کیا جائیگا اور

بعض نے کہا ہے کہ بینھم کی ھم ضمیر سے مراد ملائکہ ہیں۔ معنی یہ ہے کہ تمام فرشتوں کو ان کے درجہ اور رتبہ کے مطابق اپنے اپنے مقام پر کھڑا کیا جائیگا (کسی کو قطعاً اپنے حق سے محروم نہیں کیا جائیگا)

تو جب اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ اپنا وعدہ پورا فرمادے گا اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو بطور شکر وہ یہ کہیں گے الحمد للہ رب العالمین۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو جنت میں داخل فرمادے گا اور اپنے دشمنوں کو جہنم کے سپرد کر دے گا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ملائکہ اس وقت کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ زمر کی تلاوت فرماتے تھے۔ اسے ترمذی' نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے (1)۔

تمت بالخیر

سورہ زمر کی تفسیر یکم رمضان المبارک 1207ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے سورۂ زمر کا ترجمہ 30 رمضان 1421ھ بمطابق 27 دسمبر 2000ء بروز بدھ بوقت 1:30 بجے دن اپنے اختتام کو پہنچا۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

سورۃ المؤمن

اٰیاتھا ۸۵ ﴿ سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِ مَكِّيَّةٌ ۴۰ ﴾ رکوعاتھا ۹

سورۃ المؤمن مکی ہے، اس میں پچاسی آیات ہیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

علامہ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قرآن کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جو اپنے گھر والوں کیلئے جائے سکونت اور مویشیوں کے لیے گھاس اور پانی والی جگہ کی تلاش میں نکلتا ہے۔ پس اسی اثنا میں وہ چلتے چلتے ایک جگہ بارش کے اثرات ونشانات کو پاتا ہے تو وہ اس پر تعجب کناں ہوتا ہے پھر وہ چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پر اترتا ہے جہاں کی زمین نرم ہے اور اس میں طرح طرح کے باغات ہیں تو وہ یہ منظر دیکھ کر کہنے لگتا ہے کہ میں تو بارش کے اثرات دیکھ کر ہی تعجب کر رہا تھا مگر یہ منظر تو اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے تو آپ سے یہ کہا گیا کہ پہلی بارش تو عظمت قرآن کی مثال ہے اور نرم زمین کے یہ باغات قرآن کریم میں موجود حم کی مثال ہے(1)۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میں حم پڑھنے میں مشغول ہوتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں گویا میں باغات میں راحت وسکون حاصل کر رہا ہوں(2) اور ایک روایت میں ہے کہ جب میں حم پڑھتا ہوں تو میں (اپنے آپ کو) نرم زمین کے باغات میں پاتا ہوں۔

علامہ بغوی نے بیان کیا ہے کہ ابراہیم کا کہنا ہے کہ ہر حم دلہنوں کی چنبیلی (کی مثل) ہے(3)۔

حاکم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ حم والی سورتیں قرآن کریم کی زینت ہیں(4)۔

حٰمٓ ۚ ﴿١﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٢﴾ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿٣﴾

”حامیم[1] اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے، جو زبردست ہے سب کچھ جاننے والا ہے گناہ بخشنے والا، اور توبہ قبول فرمانے والا۔ سخت سزا دینے والا[2] فضل وکرم فرمانے والا ہے نہیں کوئی معبود اس کے سوا اسی کی طرف (سب نے) لوٹنا ہے[3]“

[1] حٰمٓ حروف مقطعات ہیں اور ان کے بارے گفتگو گزر چکی ہے۔ علامہ بغوی کہا ہے کہ سدی نے کہا ہے حم اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ عکرمہ کے واسطہ سے انہی کا قول مروی ہے کہ الف لام را حا میم نون (ال رح م ن) لفظ الرحمٰن کے حروف مقطعات ہیں [illegible]

اور عطا خراسانی نے کہا ہے کہ حاء اسمائے حسنیٰ میں سے حکیم، حمید، حی اور حیان کا پہلا حرف ہے اور میم رب العالمین کے اسماء میں سے ملک مجید اور منان کا پہلا حرف ہے۔

کسائی نے کہا ہے کہ حم سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ مستقبل میں وقوع پذیر ہوگا اس کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ گویا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حٰمٓ کا معنی ہے حُمَّ (1)۔

ابن کثیر، قالون، حفص اور ہشام نے حم والی تمام سورتوں میں حاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ ورش اور ابو عمرو نے بین بین اور باقیوں نے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔ ترکیب کلام میں تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ خبر مبتدا محذوف کی ہے جو کہ ھذا ہے یعنی ھذا تنزیل الکتب یا پھر تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مبتدا ہے اور اس کی خبر مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ہے عزیز کا معنی ہے کہ وہ اپنی بادشاہی اور حکومت میں زبردست اور غالب ہے اور علیم کا معنی ہے کہ وہ اپنی بادشاہی اور حکومت میں زبردست اور غالب ہے اور علیم کا معنی ہے وہ اپنی مخلوق میں سے سب کچھ جاننے والا ہے شاید یہاں ان دونوں وصفوں کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کا اعجاز اور پر حکمت ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ مومنین کے گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ التوب تاب یتوب توبة کا مصدر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ التوب توبۃ کی جمع ہے جیسے دومۃ کی جمع دوم اور حومۃ کی جمع حوم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخشنے والا ہے جس نے کہا لا الہ الا اللہ اور اس کی توبہ قبول فرمانے والا ہے جس نے کہا لا الٰه الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه۔ غافر الذنب اور قابل التوب دونوں اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں اور ان میں اضافت معنوی ہے (کیونکہ صیغہ صفت کی اضافت اپنے معمول کی طرف ہو رہی ہے۔) کیونکہ ان دونوں وصفوں کے اظہار کیلئے کوئی مخصوص زمانہ مراد نہیں بلکہ یہ توصفات جاریہ ہیں (اس کا اظہار ہمہ وقت ہوتا ہے۔)

ان دونوں صفتوں کے درمیان واو عاطفہ ذکر کی گئی ہے تا کہ اس پر دلالت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں گناہوں کو مٹانے اور توبہ کو قبول کرنے کی دونوں صفتیں جمع ہیں یا داو کو دونوں وصفوں کے درمیان مغائرت ظاہر کرنے کیلئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ بعض ان دونوں وصفوں کو باہم متحد اور ایک ہی گمان کرتے ہیں یا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے واو عاطفہ لگائی گئی ہے کہ دونوں فعلوں کے ظہور کے محل میں مغائرت پائی جاتی ہے کیونکہ غفر کا معنی ہوتا ہے ڈھانپ دینا۔ اس صورت میں گناہ باقی رہتا ہے اور یہ ایسے آدمی کیلئے ہوتا ہے جو توبہ نہ کرے اور توبہ کرنے والا تو اس کی مثل ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں (۱)۔ یہ حدیث موقوف ہے اسے ابن ماجہ نے حضرت ابن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 32 (الفکر)

(۱) یزید بن اصم سے روایت ہے کہ اہل شام میں سے ایک طاقتور اور بہادر آدمی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی جرات و بہادری کے سبب اسے خاص مقام دیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ غائب ہو گیا تو آپ نے اس کے بارے لوگوں سے دریافت کیا تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ اس عرصہ میں مسلسل شراب پیتا رہا ہے تو آپ نے اپنے کاتب کو بلایا اور فرمایا لکھو یہ خط عمر بن خطاب کی جانب سے فلاں کے نام ہے، تم پر سلام ہو۔ میں تیرے سامنے اس اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں ... فضل و کرم فرمانے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں سب [illegible]

مسعود رضی اللہ عنہ سے، حکیم نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے، ابن بخار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور ابن عسا کر و بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے پس یہ تفسیر اس پر دلیل ہے کہ جو توبہ نہ کرے اس کی مغفرت جائز ہے۔

اور جس نے لا الہ الا اللہ نہ کہا اسے سخت سزا دینے والا ہے۔

سے ذِی الطَّوْلِ کے بارے مجاہد نے کہا ہے کہ وہ بڑی وسعت والا اور غنی ہے قتادہ نے کہا ہے وہ نعمتوں والا ہے بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے قدرت رکھنے والا۔ حسن نے کہا ہے فضل فرمانے والا(1)۔ بعض نے کہا ہے غافر الذنب اور اس کے بعد آنے والے تمام الفاظ بدل ہیں صفات نہیں ہیں۔ ان تینوں میں اضافت لفظیہ ہے جو تعریف کا فائدہ نہیں دیتی اس لئے یہ صفات نہیں ہوسکتیں۔ اسی بناء پر ذِی الطَّوْلِ بھی بدل ہے (کیونکہ اسے صفت بنانے سے بدل کا صفت سے مقدم آنا لازم آتا ہے) اور یہ ممتنع ہے۔

صاحب کشاف اور بیضاوی نے کہا ہے کہ پہلی دو کی طرح یہ تمام بھی صفات ہیں اور ان میں اضافت حقیقیہ ہے۔ کیونکہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس سے کوئی مخصوص زمانہ مراد نہیں (لہٰذا یہ اضافت تعریف کا فائدہ دے رہی ہے) او شدید العقاب بمعنی مشددۃ میں بھی اضافت حقیقیہ ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں الشدید عقابہ ہے۔ پھر عبارت کو باہم ملانے کیلئے کسی بھی التباس سے بچنے کیلئے لام کو حذف کر دیا گیا لہٰذا یہ حقیقیہ معرف باللام ہے اور اسے اکیلے بدل بنانے میں نظم کلام میں خرابی لازم آتی ہے(2)۔ زجاج نے کہا ہے کہ شدید العقاب بدل ہے صفت نہیں۔ صاحب مدارک کے نزدیک بھی صحیح یہی ہے کیونکہ نکرہ ہے اس میں لام کو حذف کرنا جائز نہیں۔ اس بناء پر ذِی الطَّوْلِ بھی بدل ہوگا اور جو کچھ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ وہ معنی کے اعتبار سے اولیٰ اور افضل ہے کیونکہ یہ تمام توابع ہیں اور اپنے متبوع کے معانی پر دلالت کر رہے ہیں۔ یہ صفات اللہ تعالیٰ کی مدح، ترغیب و ترہیب اور مقصود اصلی پر برانگیختہ کرنے کیلئے ذکر کی گئی ہیں اور مقصود بالنسبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لہٰذا کلی طور پر اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہونا واجب ہے۔ صاحب مدارک نے کہا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ دوسری صفت ہے جیسا کہ ذِی الطَّوْلِ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مطیع (اطاعت شعار) اور گنہگاروں کو ان کے اعمال کے مطابق ثواب و عذاب کے ساتھ بدلہ دے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 32 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 36-235 (العلمیہ)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے) غافر الذنب تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ وہ مجھے معاف فرما دے گا وقابل التوب اور اس نے میری توبہ قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ شدید العقاب اس نے مجھے اپنے عذاب اور سزا سے ڈرایا ہے۔ ذی الطول اور طول سے مراد خیر کثیر ہے۔ الیه المصیر پس وہ اس آیت کو بار بار مسلسل پڑھتا رہا یہاں تک کہ رونے لگ گیا پھر اس نے گناہوں سے توبہ کی اور خوب اچھی طرح کرلی۔ جب اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا جب تم اپنے کسی بھائی کو راہ حق سے پھسلتے ہوئے دیکھو تو اسی طرح کیا کرو اس کو سیدھا کر دو اس کے ساتھ نرم سلوک کرو اور اس کیلئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور تم اس کے خلاف شیطان کے معاون و مددگار نہ بن جاؤ۔ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک عبادت گزار نوجوان تھا اور حضرت عمرؓ بھی اس سے محبت فرماتے تھے۔ وہ مصر چلا گیا اور اس کے نظریات فاسد ہو گئے اور کسی بھی گناہ کے ارتکاب سے وہ باز نہیں رہتا تھا۔ اس کے گھر کا کوئی فرد حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے اس سے اس نوجوان کے بارے دریافت کیا تو اس نے عرض کی اس کے بارے مجھ سے نہ پوچھیے۔ آپ نے فرمایا کیوں؟ اس نے جواب دیا اس کے نظریات فاسد ہو گئے ہیں، وہ انتہائی اوباش ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کی طرف خط لکھا حٰمٓ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ الآیہ۔ پس اس نوجوان نے وہ خط پڑھا اور مسلسل پڑھتا [illegible]

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ④

''نہیں تنازعہ کیا کرتے اللہ کی آیتوں میں مگر کافر۱؎ پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں ان لوگوں کا (بڑے کروفر سے) آنا جانا مختلف شہروں میں ۲؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلا کر ان کا رد کرنے یا آیات میں تناقض اور اختلاف ثابت کرنے یا آیت متشابہات کی ایسی تاویل کرنے میں جو کہ آیات محکمات یا حدیث متواتر کے خلاف ہو' تنازعہ نہیں کرتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔ عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کو قرآن کریم کے بارے بحث کرتے سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کی بعض آیات کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا۔ حالانکہ کتاب اللہ کا نزول اس طرح ہوا کہ اس کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں لہٰذا تم بعض آیات کے سبب بعض کی تکذیب نہ کرو پس جن کے بارے تم جانتے ہو ان کے بارے گفتگو کرو اور جن کے بارے نہیں جانتے اسے جاننے والے عالم کے سپرد کر دو۔ رواہ البغوی(1) اور مسلم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو (یعنی عمرو بن شعیب کے دادا) نے کہا کہ میں ایک دن دوپہر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں جو قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے اختلاف کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف تشریف لائے، آپ کے چہرہ مقدس پر غضب کے آثار ظاہر تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے لوگ کتاب اللہ میں اختلاف کرنے کے سبب ہی ہلاک ہوئے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن کریم میں جدال (جھگڑا کرنا) کفر ہے۔ اسے علامہ بغوی نے بیان کیا ہے(2)۔

علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں' طیالسی نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے۔ ابو داؤد اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوع حدیث ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ قرآن کریم میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تحقیقاً یہ فرما دیا ہے کہ قرآن کریم اس کی جانب نازل کیا گیا ہے تو پھر اس میں طعن و تشنیع کرنے اور حق کو مغلوب کرنے کیلئے بحث مباحثہ اور جھگڑا کرنا کفر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ۔

اور اگر جھگڑا اور مباحثہ اس بناء پر ہو کہ مسئلہ کی گرہ کھل جائے' حقائق سامنے آ جائیں' اہل باطل کا استدلال رد ہو جائے اور ان کے طعن و تشنیع کا قلع قمع ہو جائے تو ایسا اختلاف اور مباحثہ بہت بڑی عبادت ہے(۱)۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں لفظ جدال نکرہ ذکر فرمایا ہے۔ ''اِنَّ جِدَالًا فِي الْقُرْاٰنِ كُفْرٌ''۔ کیونکہ یہ فی الحقیقت جدال اور اختلاف سے ہی ہیں(3) (تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 33 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 33 (الفکر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 38-237 (العلمیۃ)

(۱) صاحب نہایہ نے لکھا ہے کہ یہ جدال آیات میں جس کی مذمت کی گئی ہے ان آیات سے تعلق رکھتا ہے جن میں تقدیر وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہل کلام، اہل

معلوم ہوا کہ جدال فقط اسی صورت میں ممنوع ہے جب اس سے مقصود حق کی تکذیب اورا سے نیچا دکھانا ہو۔

۲؎ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کوان لوگوں کا بڑے کروفر سے مختلف شہروں میں آنا جانا دھوکہ میں نہ ڈالے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں جومہلت دے رکھی ہے اور یہ اپنی دنیا کمانے میں خوب مصروف ہیں اور نفع بخش تجارت کی غرض سے مختلف شہروں، یعنی بلاد شام اور یمن وغیرہ میں چکر کاٹ رہے ہیں (آپ اس سے نہ دھوکہ کھائیں اور نہ پریشان ہوں)

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۠ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝

"جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح نے اور کئی (دوسرے) گروہوں نے ان کے بعد۔ اور قصد کیا ہر امت نے اپنے رسول کے متعلق کہ اسے گرفتار کرلیں اور جھگڑتے رہے (اس کے ساتھ) ناحق، تاکہ جھٹلا دیں اس کے ذریعے حق کو پس میں نے پکڑلیا انہیں۔ پس کتنا شدید تھا میرا عذاب ۱؎ اور اس طرح واجب ہو گیا اللہ کا فیصلہ کفار پر کہ وہ دوزخی ہیں ۲؎"

۱؎ ابن ابی حاتم نے سدی کے واسطہ سے ابو مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حارث بن قیس سہمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے (1) یعنی عنقریب انہیں اپنے کفر کے سبب اسی طرح پکڑ لیا جائیگا۔ جیسے ان سے پہلے (کفار کو) پکڑ لیا گیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ الایہ۔ یعنی ان سے پہلے قوم نوح نے جھٹلایا تھا اور ان کے بعد ان دوسری قوموں نے جنہوں نے اپنے اپنے رسولوں کے خلاف گروہ بندی کی اور ان کے مقابلے میں اتر آئے۔ جیسا کہ قوم عاد اور قوم ثمود وغیرہ، یعنی ان تمام قوموں نے حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کی تکذیب کی۔ یہ جملہ قول باری تعالیٰ فلا یغرر ک کی علت بیان کر رہا ہے۔

ان میں سے ہر امت نے اپنے رسول کے متعلق یہ قصد کیا کہ اسے گرفتار کرلیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے لیاخذوہ کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ اسے قتل کردیں اور اسے ہلاک کردیں (2)۔ البتہ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ اسے گرفتار کرلیں۔ کیونکہ عرب اسیر (قیدی) کو اخیذ کہتے ہیں۔

اور اسکے ساتھ ناحق جھگڑتے رہے مثلاً یہ کہا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (تم تو ہماری طرح ہی بشر ہو) لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ (ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کئے گئے) اَوْ نَرٰى رَبَّنَا (یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں) اسی طرح کے اور اقوال بھی تھے تاکہ وہ اس جھگڑے کے ساتھ حق کو زائل کردیں اور باطل قرار دیں۔ سو میں نے انہیں پکڑ لیا، یعنی ان کے اس (فاسد) قصد کی سزا دینے کیلئے میں نے انہیں ہلاک اور تباہ و برباد کردیا۔ ترکیب کلام میں فاخذتهم کا عطف جادلوا پر ہے۔ پس ان پر میرا عذاب کتنا شدید تھا۔ کیونکہ تم ان کے ویران گھروں کے پاس سے گزرتے ہو اور اس عذاب کے اثرات اور نشانات دیکھتے ہو۔ یہ استفہام تقریری ہے اور تعجب کیلئے ہے۔

۲؎ جس طرح دنیا میں انہیں ہلاک کرنا ثابت اور متحقق ہو چکا ہے اسی طرح آخرت میں بھی کفار کیلئے عذاب کا فیصلہ ثابت اور متحقق ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ جس طرح سابقہ امتوں میں سے جھٹلانے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب کا فیصلہ ثابت ہو چکا ہے اسی طرح آپ کی امت کے کفار کیلئے بھی عذاب کا فیصلہ [illegible]

بدل کل ہے۔ بشرطیکہ قرأت کلمتہ ربک ہو۔ اور اگر قرأت کلمات ہو تو پھر بدل بعض ہے اور اگر لفظ یا معنی کا ارادہ کر لیا جائے تو پھر بدل اشتمال ہے۔ اخفش نے کہا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے لِاَنَّهُمْ وَبِاَنَّهُمْ اَصْحَابُ النَّارِ۔

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۝

"جو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں عرش کو اور جو عرش کے اردگرد (حلقہ زن) ہیں [1] وہ تسبیح کرتے ہیں حمد کے ساتھ اپنے رب کی اور ایمان رکھتے ہیں اس پر [2] اور استغفار کیا کرتے ہیں ایمان والوں کیلئے۔ (کہتے ہیں) اے ہمارے رب! تو گھیرے ہوئے ہے ہر شے کو (اپنی) رحمت و علم سے۔ پس بخش دے انہیں جنہوں نے (کفر سے) توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راستہ کی اور بچالے انہیں عذاب جہنم سے [3]"

[1] جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو عرش کے اردگرد (حلقہ زن) ہیں، یعنی اس کا طواف کرنے والے ہیں۔ وہی کروبیون ہیں اور تمام ملائکہ کے سردار ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حاملین عرش میں سے ہر ایک کے ٹخنے سے لے کر قدم کے نچلے حصے تک پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور یہ روایت بھی ہے کہ ان کے قدم زمینوں کی تہ میں ہیں اور تمام زمینیں اور آسمان ان کی کمروں تک آتے ہیں۔ (گویا ان کی کمروں سے اوپر کا حصہ تمام آسمانوں سے اوپر نکلا ہوا ہے) اور وہ ہمہ وقت یہ کہہ رہے ہیں سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّةِ وَ الْجَبَرُوْتِ سُبْحَانَ ذِی الْمُلْكِ وَ الْمَلَكُوْتِ سُبْحَانَ الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الرُّوْحِ۔

میسرہ بن عبدربہ نے کہا ہے کہ انکی ٹانگیں پاؤں سب سے نیچے والی زمین میں ہیں اور ان کے سر عرش کے نیچے ہیں۔ وہ انتہائی خشوع وخضوع کی حالت میں ہیں، وہ اپنی نگاہیں اوپر نہیں اٹھاتے' وہ ساتویں آسمان کے باسیوں کی نسبت زیادہ خوفزدہ ہیں' ساتویں آسمان کے مکین اپنے سے نیچے والے آسمان میں رہنے والوں کی نسبت زیادہ ڈر رہے ہیں اور وہ اپنے ساتھ ملنے والے آسمان میں سکونت پذیر ہونے والوں کی نسبت زیادہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔

مجاہد نے کہا ہے کہ ملائکہ اور عرش کے درمیان نور کے ستر حجاب ہیں۔

محمد بن منکدر نے حضرت جابرؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہ اجازت دی گئی ہے کہ میں حاملین عرش میں سے کسی ایک فرشتے کے بارے یہ بیان کروں کہ اس کے کان کی لو سے لے کر کندھے تک درمیان میں سات سو سال کی مسافت ہے(1)۔ اسے ابوداؤد اور الضیاء نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

جعفر بن محمد نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عرش کے پایوں میں سے ہر دو کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ تیز اڑان والا پرندہ تیس ہزار سال میں اڑ کر طے کرتا ہے اور عرش کو ہر روز نور کے ستر ہزار رنگوں کا ایسا لباس پہنایا جاتا ہے

میں چھلا (حلقہ) پڑا ہو۔

مجاہد کا قول ہے کہ ساتویں آسمان اور عرش کے درمیان ستر ہزار حجابات ہیں۔ ایک حجاب نور کا ہے اور ایک ظلمت وتاریکی کا۔ پھر ایک حجاب نور اور ایک حجاب ظلمت وتاریکی کا(1)۔

وہب بن منبہ نے کہا ہے کہ عرش کے اردگرد ملائکہ کی ستر ہزار صفیں ہیں۔ ہر صف دوسری صف کے پیچھے ہے اور وہ عرش کا طواف کر رہے ہیں۔ کبھی وہ سامنے آتے ہیں اور کبھی وہ۔ اور جب ان میں سے کوئی دوسرے کے سامنے آتا ہے تو ایک طرف والے لا الہ الا اللہ کہتے ہیں اور دوسری طرف والے اللہ اکبر کہتے ہیں اور ان کے پیچھے ستر ہزار صفیں ہیں ان کے ہاتھ ان کی گردنوں کی طرف اٹھے ہوئے ہیں درآنحالیکہ وہ انہیں اپنے کندھوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ جب وہ اپنے سے آگے والی صفوں میں موجود ملائکہ کی تہلیل و تکبیر کی آواز سنتے ہیں تو وہ بھی بلند آواز سے یہ کہتے ہیں۔ سُبْحَانَکَ وَبِحَمْدِکَ مَا اَعْظَمَکَ وَ اَجَلَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ غَیْرُکَ اَنْتَ الْاَکْبَرُ اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ رَاجِعُوْنَ اِلَیْکَ اور ان کے پیچھے ملائکہ کی مزید ایک لاکھ صفیں ہیں اور وہ اپنے دائیں ہاتھ بائیں پر رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر فرشتہ ایک دوسرے سے مختلف انداز میں تسبیح وتحمید بیان کرنے میں مشغول ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے دو پروں کے درمیان تین سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور ان کی لو سے لے کر کندھے تک درمیان میں چار سو سال کی دوری موجود ہے اور اللہ تعالیٰ اور حاملین عرش کے مابین ستر حجاب آگ کے' ستر حجاب ظلمت کے' ستر حجاب نور کے' ستر حجاب سفید موتیوں کے' ستر حجاب یاقوت احمر کے' ستر حجاب پیلے یاقوت کے' ستر حجاب سبز رنگ کے زمرد کے' ستر حجاب برف کے' ستر حجاب پانی کے' ستر حجاب اولوں کے اور ایسی ایسی متعدد چیزوں کے حجابات موجود ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حاملین عرش اور عرش کے اردگرد طواف کرنے والے فرشتوں میں سے ہر ایک کے چار قسم کے چہرے ہیں۔ بیل کا چہرہ' شیر کا چہرہ' گدھ کا چہرہ اور انسان کے چہرے کی مثل چہرہ اور ان میں سے ہر ایک کے چار پر ہیں اور وہ دو پر اپنے چہرے پر اس خوف سے رکھے ہوئے ہے (کہ کہیں ایسا نہ ہو) کہ انکی نظر عرش پر پڑ جائے اور وہ گر جائے اور وہ اپنے دو پر اس طرح نیچے کی جانب گرائے ہوئے ہے جیسا کہ پرندہ اپنے پروں کو حرکت دیتے وقت نیچے کی جانب مارتا ہے اور تسبیح وتحمید اور تکبیر وتمجید کے سوا وہ کوئی کلام نہیں کرتے(2)۔

ے وہ تسبیح کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی، یعنی وہ تمام صفات جلال وجمال کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کرتے ہیں اور وہ اپنے رب کی ثناء حمد کے ساتھ ملا کر کرتے ہیں۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ تسبیح کو اصل بنایا گیا ہے اور حمد کو حال۔ کیونکہ حمد ہی فرشتوں کی حالت کا مقتضی ہے، تسبیح مقتضائے حال نہیں(3)۔

اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ یعنی وہ تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے' اس کا وجود واجب ہے، وہی تمام اشیاء کا خالق ہے۔ وہ یکتا ہے۔ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا اور کوئی بھی اسکا ہمسر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ایمان لانے کی خبر دی ایک تو اس لئے تاکہ ایمان کی فضیلت وشرف کا اظہار ہو جائے اور اس لئے تاکہ اہل ایمان کی تعظیم وتکریم واضح ہو جائے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ملائکہ اظہار بندگی' اظہار عجز ونیاز اور ایمان بالغیب رکھنے میں دیگر تمام مخلوق کی طرح ہی ہیں۔ ایسا نہیں جیسا کہ کفار گمان کرتے ہیں کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور اس میں فرقہ مجسمہ (جو اللہ تعالیٰ کے جسم کے قائل ہیں) کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 34 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 34 (الفکر)

تردید بھی ہے۔

شہر بن حوشب سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ حملۃ العرش آٹھ فرشتے ہیں۔ان میں سے چار یہ کہتے ہیں سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰی حِلْمِکَ بَعْدَ عِلْمِکَ۔(اے اللہ! تیری ذات پاک ہے۔ ہم تیری حمد بیان کرتے ہیں تو ہی حمد کے لائق ہے کہ تو جاننے کے باوجود بھی حلم سے کام لیتا ہے) اور ان میں سے چار یہ کہتے ہیں سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰی عَفْوِکَ بَعْدَ قُدْرَتِکَ۔(اے اللہ! تیری ذات پاک ہے۔ہم تیری حمد بیان کرتے ہیں تو ہی حمد کے لائق ہے کہ تو قدرت کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیتا ہے) شہر بن حوشب کا کہنا ہے گویا کہ وہ فرشتے بنی آدم کے گناہوں کو دیکھ رہے ہیں(1) (اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کے حلم اور عفو و درگزر کی تعریف کرتے ہیں)

۳؎ اور وہ اہل ایمان کیلئے استغفار کرتے ہیں۔اس میں اس بات پر متنبہ کیا جارہا ہے کہ فرشتوں کا ایمان لانے میں اہل ایمان انسانوں کے ساتھ شریک ہونا انسانوں کیلئے باعث نصیحت' خیر خواہی اور شفقت ہے۔اگرچہ فرشتوں کی جنس انسانوں کی جنس سے مختلف ہے۔ کیونکہ ایمان کا رشتہ ہی سب سے مضبوط اور قوی رشتہ ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔

وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! تو اپنی رحمت اور علم سے ہر شئے کو گھیرے ہوئے ہے۔(یقولون) ربنا مکمل جملہ یستغفرون کے فاعل سے حال ہے اور وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَۃً وَّعِلْمًا اصل میں وَسِعَتْ کل شیء رحمتک وعلمک ہے۔ یعنی تیری رحمت اور علم ہر شے سے وسیع ہے۔اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔وصف رحمت و علم کی عمومیت میں خوب مبالغہ کے اظہار کیلئے انداز کلام تبدیل کیا گیا ہے اور ان دونوں وصفوں میں چونکہ مقصود بالذات رحمت ہے اس لئے اس کا ذکر علم سے پہلے کیا۔

فاغفر میں فاء سببیہ ہے کیونکہ وسعت رحمت ہی مغفرت کا سبب ہے۔پس بخش دے انہیں جنہوں نے کفر سے توبہ کی ہے۔یعنی جو کفر کو چھوڑ کر اسلام کی طرف لوٹ آئے ہیں اور انہوں نے تیرے راستہ کی پیروی کی ہے،یعنی تیرے اس دین کو اپنا لیا ہے جس کے ساتھ تو نے اپنے رسل علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔

اور انہیں عذاب جہنم سے بچالے۔یعنی عذاب سے ان کی حفاظت فرما۔اغفر میں عذاب جہنم سے بچانے کا ذکر اشارۃً کیا گیا ہے اور یہاں صراحۃً اس کا ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ دعائے مغفرت میں مزید تاکید اور پختگی پیدا ہو جائے۔مطرف نے کہا ہے کہ مومنین کیلئے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے سب سے زیادہ خیر خواہ ملائکہ ہیں اور اہل ایمان کیلئے ساری مخلوق میں سے زیادہ کھوٹے اور منافق شیاطین ہیں(2)۔

رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَ عَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُۙ۝۸ وَ قِهِمُ السَّیِّاٰتِؕ وَ مَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَىٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۝۹

''اے ہمارے رب! داخل فرما انہیں سدا بہار باغوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور جو قابل بخشش ہیں ان کے والدین' ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے ۱؎ بیشک تو ہی سب سے زبردست (اور) حکمت والا ہے ۲؎ اور بچالے

بڑی کامیابی ہے‘‘

۱؎ جنت عدن سدابہار باغ جن میں اقامت اور سکونت دائمی ہوگی۔(۱)

ترکیب کلام میں وَمَنْ صَلَحَ کا عطف ادخلھم کی ھم ضمیر پر ہے۔یعنی اے ہمارے رب! تو نے ان سے اور ان کے آباء میں سے جو قابل بخشش ہیں ان سے جن سدابہار باغوں کا وعدہ فرمار کھا ہے انہیں ان میں داخل فرمادے۔

آیت طیبہ میں صلاح سے مراد نفس ایمان ہے کیونکہ مومن اگرچہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے سبب جنت میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہتا ہے اس کے تمام گناہ معاف فرمادیتا ہے اور ہم نے یہ اس لئے کہا ہے تاکہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغائرت ثابت ہو جائے۔اگر صلاح سے عقائد،اعمال اور تمام اخلاق کی صحت اور درستگی مراد ہو تو پھر مَنْ صَلَحَ کا مفہوم الذین تابوا واتبعوا سبیلک میں داخل ہے(اسے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں)واللہ اعلم۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا کہ مومن جنت میں داخل ہوگا،وہاں پہنچ کر کہے گا میرا باپ کہاں ہے' میری ماں کہاں ہے' میری اولاد کہاں ہے اور میری بیوی کہاں ہے؟۔تو اسے یہ بتایا جائے گا کہ انہوں نے تیری مثل اعمال نہیں کئے(اس لئے وہ یہاں نہیں پہنچ سکے)تو وہ کہے گا میں تو جو عمل بھی کرتا تھا وہ اپنے لئے بھی اور ان کے لئے بھی کرتا تھا تو اس وقت یہ کہا جائے گا کہ انہیں بھی جنت میں داخل کردو(1)۔یہ روایت موقوف ہے لیکن مرفوع کے حکم میں ہے اور یہ صراحۃً اس پر دلالت کررہی ہے کہ آیت کریمہ میں صلاح سے مراد نفس ایمان ہے۔

۲؎ بیشک تو ہی سب سے زبردست ہے جو ہر شے پر قدرت رکھتا ہے اور جس کام کا ارادہ فرماتا ہے کوئی اسے روک نہیں سکتا۔(حکیم) اور حکمت والا ہے،یعنی وہی کچھ کرتا ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے اور وعدہ وفا کرنا بھی اسی میں سے ہے۔

۳؎ اور انہیں بچالے سزاؤں سے یا بُرے اعمال کی جزاء سے۔(سیئات سے مراد سزائیں یا برے اعمال کا بدلہ ہے)یہ تعمیم بعد التخصیص ہے۔یا اسے مَنْ صَلَحَ سے مخصوص کیا گیا ہے۔یا پھر معنی یہ ہے کہ تو انہیں دنیا میں اعمال بد سے محفوظ فرما اور جسے تو یوم جزاء کو یا دنیا میں سزاؤں سے بچالے تو گویا تو نے اس پر بڑی رحمت فرمائی۔فقد رحمۃ محذوف شرط کی جزاء پر دلیل ہے اور یہی جزاء کے قائم مقام ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يُفْلِحُ اِذْفَقَدْ رَحِمْتَهُ۔ جسے تو سزاؤں سے بچالے وہ کامیاب ہوجائے گا کیونکہ تو نے اس پر رحمت فرمادی اور یہ رحمت فرمانا یا سزاؤں سے بچانا یا ان دونوں کا مجموعہ ہی بہت بڑی کامیابی ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ ملائکہ کے مومنین کیلئے جنت میں داخل کرنے کی التجاء اور آرزو کا کیا فائدہ ہے،جبکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمار کھا ہے اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ کی خلاف ورزی محال اور ناممکن ہے۔اسی طرح اہل ایمان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے یہ دعا مانگتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اٰتِ مُحَمَّدَ نِ الْوَسِيْلَةَ وَ الْفَضِيْلَةَ وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَ نِ الَّذِیْ وَعَدْتَّهٗ۔(حالانکہ مومنین یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام محمود کا وعدہ فرمار کھا ہے اور وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے تو پھر اس دعا کا ایک فائدہ ہے؟)

1۔تفسیر بغوی،جلد5،صفحہ35(الفکر)

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے دل میں مومنین کی اور مومنین کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو محبت وعشق پیدا فرمادیا ہے وہی انہیں ان کے لئے دعا پر ابھارتا اور برانگیختہ کرتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جس کیلئے دعا کی جاتی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی مزید برسات ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ان محبوب بندوں کیلئے دعا کرنے کی وساطت سے دعا کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی رضا' خوشنودی اور مزید رحمت حاصل ہوتی ہے۔ (گویا دعا سے انہیں بھی فائدہ ہوتا ہے جن کیلئے دعا کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دعا کرنے والوں کو بھی حظ وافر عطا ہوتا ہے) واللہ اعلم۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِیْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَ اَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝

'' بیشک جن لوگوں نے کفر کیا انہیں ندا دی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کی (تم سے) بیزاری بہت زیادہ ہے اس بیزاری سے جو تمہیں اپنے آپ سے ہے۔ (یاد ہے) جب تم بلائے جاتے ایمان کی طرف تو تم کفر کیا کرتے تھے[1] وہ کہیں گے اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندہ کیا' پس اب ہم اعتراف کرتے ہیں اپنے گناہوں کا[2] سو کیا (یہاں سے) نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے[3] ''

[1] اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا آخر تک مکمل آیت ارشاد باری تعالیٰ مایجادل فی آیات اللہ الاالذین کفروا کے ساتھ متصل ہے اور ان کے درمیان تمام جملے معترضہ ہیں جو کہ ملائکہ کی مدح وتعریف میں ذکر کئے گئے ہیں کہ وہ ایمان کی صفت سے متصف ہیں اور ان مومنین کیلئے استغفار کرتے ہیں جو کفار کے دشمن ہیں۔

بیشک کفر کرنے والوں کو قیامت کے دن جہنم کے پہرے دار ندا دیں گے اس حال میں کہ وہ کفار جہنم میں پڑیں ہوں گے اور اپنے نفوس کے گناہوں کے سبب وہ اپنے آپ سے بھی بیزار ہونگے کیونکہ اس وقت ان کے گناہ ان پر پیش کئے جائیں گے اور وہ ان کا بدلہ اور سزا کا معائنہ کر چکے ہونگے تو اس وقت انہیں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی تم سے بیزاری اس بیزاری سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں اپنے آپ سے ہے۔ یاد ہے جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم کفر کرتے تھے۔ اِذْ تُدْعَوْنَ یہ اس فعل کی ظرف ہے جس پر لمقت اللہ دلالت کرتا ہے۔ مقت اللہ کی ظرف نہیں۔ کیونکہ مقت مصدر ہے۔ (جو مبتدا واقع ہو رہا ہے) اور اس کی خبر اکبر من مقتکم ہے۔ (چونکہ یہ جملہ مکمل ہو چکا ہے اس لئے یہ اِذْ تُدْعَوْنَ میں عمل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جب مصدر کی خبر ذکر کر دی گئی تو پھر اس سے کسی ایسی شے کا تعلق جائز نہیں جو صلہ میں واقع ہو۔ کیونکہ خبر کا مذکور ہونا جملہ کے تام ہونے پر دلالت کرتا ہے اور صلہ میں سے کسی شے کا مصدر کے متعلق ہونا جملہ کے ناقص ہونے پر دلالت کرتا ہے (لہٰذا بالیقین یہ ایسے فعل کی ظرف ہوگی جس پر مقت اللہ دلالت کرتا ہے) اور اِذْ تُدْعَوْنَ مقتکم کی ظرف بھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ انہیں تو اپنے نفسوں سے بیزاری عذاب میں واقع ہونے کے بعد ہوگی۔

باپوں کی صلبوں میں بصورت نطفہ مردہ پیدا کیا۔ پھر تو نے ہمیں ماؤں کی رحموں میں منتقل کر کے دنیا میں زندہ پیدا کر دیا۔ پھر تو نے ہمیں ایک مقررہ مدت گزرنے کے بعد موت دے دی پھر تو نے ہمیں اسی طرح قیامت کے دن زندہ کر دیا۔ ابن عباسؓ قتادہ اور ضحاک نے اسی طرح کہا ہے۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ۔

سدی نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ تو نے ہمیں دنیا میں موت دی پھر ہمیں قبر میں سوال و جواب کیلئے زندہ کر دیا۔ پھر تو نے قبر میں ہمیں موت دی۔ پھر تو نے ہمیں قیامت کے دن زندہ کر دیا۔ اس قول کا دارو مدار اس گمان پر ہے کہ مارنا موت سے پہلے زندہ ہونے (حیات) کا تقاضا کرتا ہے اور یہ خیال غلط ہے کیونکہ اماتت (مارنے) کا معنی کسی شے کو بے جان بنانا ہے۔ (زندہ کو مردہ بنانا نہیں) چاہے وہ ابتدا ہو یا بعد میں زندگی سلب کر کے اسے بے جان بنا دیا جائے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ سُبْحَانَ مَنْ صَغَّرَ الْبَعُوْضَ وَ كَبَّرَ الْفِيلَ (کہ پاک ہے وہ ذات جس نے مچھر کو چھوٹا اور ہاتھی کو بڑا بنایا) (لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پہلے مچھر بڑا تھا پھر چھوٹا کر دیا اور پہلے ہاتھی چھوٹا تھا اور پھر بڑا بنا دیا) اور اگر اسے (اماتت کو) حالت کی تبدیلی کے ساتھ خاص کیا جائے تو پھر فاعل کا دو مفعولوں میں سے ایک کو دو وصفوں میں سے ایک کے ساتھ اختیار کرنا ہوگا اور اس طرح اس کا دوسرے سے پھرنا (اعراض) لازم آئے گا۔

رہا مسئلہ قبر میں سوال و جواب کا تو وہ دنیوی حیات کی مثل حیات کا تقاضا نہیں کرتا (کیونکہ وہ تو حیات برزخی ہے) اور اگر وہ اس کا تقاضا کرے تو پھر عذاب قبر بھی اسی کی مثل حیات کا تقاضا کرتا ہے اور جب سوال و جواب کے بعد صاحب قبر پر موت طاری کر دی جائے تو اس سے کفار سے بھی عذاب قبر کا انقطاع لازم آئے گا۔ حالانکہ ایسا نہیں (کیونکہ کفار کیلئے عذاب قبر کا ہونا احادیث سے صراحۃً ثابت ہے اور نص قطعی سے عذاب قبر ثابت ہے)

فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا پس اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس میں فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ جب وہ دوسری موت کے بعد دوسری حیات کا مشاہدہ کر لیں گے تو وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیں گے۔ گویا ان کے لئے دونوں موتوں اور دونوں زندگیوں کا مجموعہ اس اعتراف کا سبب بن جائے گا۔

سو کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے۔ یعنی کیا اس جہنم کی آگ سے ایک بار نکلنے یا کسی طرح نکلنے کی کوئی صورت ہے کہ ہم تیزی کے ساتھ یا آہستہ آہستہ اس پر چلتے چلتے دنیا کی طرف لوٹ جائیں۔ سبیل کا معنی ایسا راستہ ہے جس پر ہم چلتے ہیں۔ یہ استفہام تمنی کے معنی میں ہے (یعنی کاش! نکلنے کی کوئی راہ ہوتی) تو انہیں پکار کر کہا جائے گا تمہارے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس جملہ کو کلام سے حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ مابعد قول اس پر دلالت کر رہا ہے۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿۱۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَ مَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اس کی وجہ یہ تھی کہ جب پکارا جاتا اللہ تعالیٰ کو اکیلا تو تم انکار کر دیتے۔ اور اگر شریک بنایا جاتا کسی کو اس کا تو تم مان

کرو اللہ تعالیٰ کی خالص کرتے ہوئے اس کیلئے دین کو اگرچہ ناپسند کریں کفار[3]"

[1] تمہارے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہونے اور تمہارے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب اور وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو اکیلا اور واحد پکارا جاتا یا جب اللہ تعالیٰ کو پکارا جاتا اور اس کی وحدانیت کا اعلان کیا جاتا تو تم انکار کر دیتے (دوسری صورت میں اصل عبارت إِذَا دُعِيَ اللّٰهُ تُوَ حَدُّوَ حُدَهٗ ہے۔ پھر فعل کو کلام سے حذف کر دیا گیا اور وحدہ کو حال ہونے کی صوت میں اس کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے) جب یہ کہا جاتا لا الہ الا اللہ تو تم انکار کر دیتے اور یہ کہتے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ (کیا اس نے تمام الہوں کو ایک الہ بنا دیا ہے۔)

اور اگر اس کے ساتھ کسی غیر کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم اس شرک کرنے کی تصدیق کر لیتے اور اسے مان جاتے اور جب تمہارے جہنم میں داخل ہونے کا سبب یہ ہے۔ پس آج تو حکم کا اختیار صرف اس اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جو عبادت کا مستحق ہے اور کسی بھی شریک سے منزہ اور پاک ہے اور اس نے تمہارے کفر کے سبب تمہارے لئے ہمیشہ کیلئے شدید عذاب کا حکم لگا رکھا ہے۔ اگر کوئی اور ان میں سے اس کا شریک ہوتا جن کی تم عبادت کرتے رہے ہو تو وہ تمہیں اس کے عذاب سے نجات دلا دیتا اور تب تمہارے لئے اس سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان تو اس سے بلند تر ہے کہ کسی غیر کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور کسی کو اس کے مساوی اور ہم پلہ قرار دیا جائے۔

[2] وہی ہے جو تمہیں اپنی آیتیں دکھاتا ہے جو کہ توحید پر اور ان تمام چیزوں پر دلالت کرتی ہیں جنہیں جاننا واجب ہوتا ہے اور تمہارے لئے آسمان سے رزق یعنی بارش نازل فرماتا ہے جو تمہارے لئے رزق کا سبب بنتی ہے۔ گویا اس میں ان کی جہالت اور عدم علم کی معذرت کو رد کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ ایسی نشانیاں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں جن سے توحید باری تعالیٰ پر آسانی سے استدلال کیا جا سکتا ہے (لہٰذا ان کا کوئی عذر قبول نہیں) اور ان آیات اور نشانیوں سے وہی نصیحت قبول کرتا ہے جو تعصب اور عناد کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ العلی الکبیر پر اصل جہنم کا جواب مکمل ہو گیا اور پھر ھو الذی سے نئے جملے اور کلام کا آغاز کیا گیا اور اس میں خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔

[3] یعنی جب تم نے یہ سن لیا کہ مشرکین کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹ رہا ہے تو تم صرف اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرو۔ اور طاعت و عبادت کو ہر قسم کے شرک سے پاک کر کے خالص اسی کیلئے کرو اگرچہ کفار کو یہ ناپسند ہی ہو، یعنی اگرچہ تمہارے دشمن کفار اس پر غضبناک ہی کیوں نہ ہوں۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾

"[illegible] عرش کا مالک [illegible] نازل فرماتا ہے وحی اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا

ا؎ اس کے درجات کمال اتنے عالیشان اور بلند مرتبہ ہیں کہ کسی کا کمال اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بعض نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ اپنی بارگاہ قرب میں اپنے انبیاء واولیاء کے درجات ومراتب بلند فرمانے والا ہے اور جنت میں بعض کے مراتب بعض سے اعلیٰ اور فائق ہونگے۔ وہ عرش کا خالق اور مالک ہے۔ وہ اپنے فضل سے وحی نازل فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ آیت میں وحی کو روح کا نام دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جسطرح ارواح کے سبب بدنوں کو حیات ملتی ہے اسی طرح وحی کے سبب مردہ دلوں کو زندگی ملتی ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہاں امر سے مراد فضل ہے اور من امرہ میں مِنْ ابتدائیہ ہے اور بعض نے امر سے مراد قول لیا ہے اور مِنْ کو بیانیہ قرار دیا ہے۔

ترکیب کلام میں یہ تینوں ھومبتدا کی خبریں ہیں اور ھوموصول کے مترادف ہے۔ یہ تینوں اوصاف اللہ تعالیٰ کی توحید اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی کی بلندی اور (آخری جملہ) تمہید نبوت پر دلالت کرتے ہیں اور یہ مبتدا محذوف کی خبریں ہیں جو کہ ھو ہے۔ لینذر، یلقی کے متعلق ہے اور اس میں پوشیدہ ضمیر یا اللہ کیلئے ہے یا روح کیلئے ہے یا من کی طرف راجع ہے۔ یہی زیادہ ظاہر اور قرب ہے۔ اور اس کی تائید قرأت یعقوب بھی کرتی ہے کہ انہوں نے لینذر کی بجائے لتنذر پڑھا ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تا کہ آپ ڈرائیں۔ اس کے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے تا کہ یہ دعوت کے عام ہونے اور اس انذار (ڈرانے) کے جن و انس تمام کو شامل ہونے پر دلالت کرے۔

۲؎ يَوْمَ التَّلَاقِ (ملاقات کا دن) اس سے مراد وہ دن ہے جس میں آسمانوں اور زمین کی رہنے والی تمام مخلوق جمع ہوگی۔ باہم ملاقات کرے گی۔ مقاتل اور قتادہ نے کہا ہے اس سے مراد وہ دن ہے جس میں خالق اور مخلوق باہم جمع ہوں گے۔ میمون بن مہران نے کہا ہے اس دن ظالم اور مظلوم اور آپس میں جھگڑا کرنے والے یعنی مدعی اور مدعی علیہ آپس میں اکٹھے ہوں گے (1)۔ بعض نے کہا ہے اس دن عبادت کرنے والے اور ان کے معبود آپس میں جمع ہوں گے۔ بعض نے یہ معنی کیا ہے اس دن آدمی اپنے اعمال کے ساتھ جمع ہوگا۔ یعنی اپنے اعمال سے جا ملے گا۔

حاکم، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الاھوال میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے پڑھا يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قیامت کے دن تمام مخلوق جن وانس، وحوش وطیور اور چوپاؤں وغیرہ کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا پھر آسمان دنیا پھٹ جائے گا اور اس کے باسی نیچے اتریں گے اور ان کی تعداد زمین میں رہنے والے جن وانس کی نسبت کہیں زیادہ ہوگی (2)۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں ساتوں آسمانوں کے مکینوں کے یکے بعد دیگرے زمین پر اترنے کا ذکر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے نزول اجلال کا تذکرہ بھی ہے اور یہ متشابہات میں سے ہے (جس کی حقیقی کیفیت کا ادراک نہیں کیا جاسکتا) ہم نے اس کی تاویلات اور وضاحت سورۂ فرقان کی آیت يَوْمَ تَشَقَّقُ بِالْغَمَامِ اور سورۂ بقرہ کی آیت أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ کی تفسیر میں بیان کر دی ہے۔

۳؎ يَوْمَ هُم بَارِزُونَ یعنی جس دن وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے یا جس دن وہ ظاہر ہونگے ... [illegible]

اور اسرار و رموز سب ظاہر ہو جائیں گے تو ان کی ذاتوں اعمال اور ان کے احوال میں سے کوئی شے اللہ تعالیٰ پر پوشیدہ نہیں رہے گی۔ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ کا جملہ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ کی تقریر و تاکید کیلئے ہے اور دنیا میں جو احوال مخفی رہنے کا وہم ہو سکتا ہے اسے زائل اور دور کرنے کیلئے ہے۔

آج کے دن کس کی بادشاہی ہے؟ یہ سوال اس دن مخلوق کو فنا کرنے کے بعد اور دوبارہ اٹھانے سے قبل کیا جائے گا اور اسے بطور حکایت یہاں بیان کیا گیا ہے۔ تو اس وقت کوئی بھی اس سوال کا جواب دینے والا نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے فرمائے گا۔ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ (کسی کی نہیں) صرف اللہ کی جو واحد (اور) قہار ہے۔ یعنی وہ جلال ذات اور کمال صفات میں یکتا اور منفرد ہے اور وہ اپنی الوہیت میں کسی بھی شریک سے منزہ اور پاک ہے۔ وہ ساری مخلوق کو موت دینے اور اپنی مشیت کے مطابق اس میں تصرف کرنے کی پوری قدرت اور طاقت رکھتا ہے۔

مخلوق کے فناء ہونے کے بعد اور اسے دوبارہ اٹھائے جانے سے قبل اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس سوال و جواب کا ہونا ایک طویل حدیث میں بیان کیا گیا ہے جسے حضرت ابوھریرہؓ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے مطولات میں، ابویعلی نے مسند میں، بیہقی نے البعث میں اور کئی دوسروں نے بیان کیا ہے۔

ابن ابی داؤد نے البعث میں حضرت ابوسعیدؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک ندا دینے والا بلند آواز سے پکار کر یہ کہے گا اے لوگو! تم پر وہ خاص گھڑی (قیامت) آ گئی (یاایھاالناس اتاکم الساعة) وہ اپنی آواز کو اتنا کھینچ کر بلند کرے گا کہ زندے اور مردے تمام اس آواز کو سنیں گے اور اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول اجلال فرمائے گا۔ پھر ندا دینے والا پکار کر یہ کہے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ(1)۔

علامہ بیہقی نے ایک مرفوع حدیث ونفخ فی الصور الایه کے تحت بیان کی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (بیہوش ہونے اور مرنے سے) تین فرشتوں یعنی جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت علیہم السلام کی استثناء کی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ (جو کہ خود بہتر جانتا ہے) ارشاد فرمائے گا اے ملک الموت کون باقی ہے؟ تو ملک الموت عرض کرے گا ایک تیری کریم ذات اور تیرے بندوں میں سے جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں اور وہ بھی مرنے والا ہے چنانچہ رب کریم فرمائے گا مر جا۔ پھر اللہ تعالیٰ خود ندا فرمائے گا میں نے ہی مخلوق کو پہلی بار پیدا کیا ہے پھر دوبارہ بھی میں ہی اسے زندہ کروں گا۔ کہاں ہیں وہ ظلم و جبر کرنے والے اور غرور و تکبر کرنے والے؟ پھر ندا فرمائے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ۔ (آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟) تو کوئی ایک بھی جواب دینے والا نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود ہی ارشاد فرمائے گا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ پھر دوبارہ صور میں پھونکا جائے گا تو یکدم سب کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگ جائیں گے(2)۔

سیاق آیت اس کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ سوال تب ہوگا جب ساری مخلوق زندہ ہو چکی ہوگی اور اس دن وہ قبروں سے باہر نکل چکے ہونگے۔ یا پھر اس حالت کا بیان ہے جس پر ظاہر حال دلالت کر رہا ہے کہ اس وقت تمام ظاہری اسباب ختم ہو چکے ہونگے اور درمیانی

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿۱۸﴾

''آج بدلہ دیا جائیگا ہر نفس کو جو اس نے کمایا تھا۔ ذرا ظلم نہیں ہوگا آج۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔1 اور آپ ڈرائیے انہیں قریب آنے والے دن سے جب کہ دل گلے میں اٹک جائیں گے خوف و دہشت سے بھرے ہوئے۔ نہ ہوگا ظالموں کیلئے کوئی دوست اور نہ ایسا سفارشی جس کی سفارش مانی جائے 2''

1۔ یعنی اس دن اللہ تعالیٰ کے سوا ہر ایک کی مجازی بادشاہی بھی سلب کر لی جائے گی اور اس دن ظاہری بادشاہی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔ جیسا کہ حقیقی بادشاہی ہمیشہ کیلئے اسی کے ساتھ خاص ہے تو اس دن ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائیگا جو اس نے کمایا تھا۔ اس دن کسی کا ثواب کم کر کے اور سزا میں اضافہ کر کے ذرا بھر ظلم کسی پر نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے عین مطابق ہوگا۔ کیونکہ اس وقت حاکم مطلق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہوگا اور اس سے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ظلم تو وہ ہوتا ہے جو کوئی دوسرے مالک کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو جو تصرف فرمائے گا وہ اپنی ملکیت میں ہی کرے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔ وہ اپنی مشیت کی بناء پر ایام دنیا میں سے نصف دن کی مقدار کے برابر وقت میں تمام لوگوں کا حساب لے گا۔ حالانکہ وہ بالفور آن واحد میں بھی حساب و کتاب لینے کی قدرت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی کام دوسرے کام سے اسے مشغول نہیں رکھ سکتا۔

2۔ وَاَنْذِرْهُمْ کا عطف سابقہ خبروں پر ہے۔ تقدیر کلام ہے یقال لک انذرھم آپ کو کہا جاتا ہے انہیں ڈرایئے۔ یوم الازفتہ قریب آنے والا دن یعنی قیامت۔ چونکہ قیامت قریب آنے والی ہے اس لئے اس کا نام یوم الازفتہ رکھا گیا ہے اور قریب آنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی چیز بالیقین آنے والی ہو تو وہ قریب ہی ہوتی ہے (اور قیامت بھی بالیقین آنے والی ہے) اِذِالْقُلُوْبُ میں اذ، یوم الازفتہ سے بدل ہے اور لدی الحناجر کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن شدت خوف اور سخت دہشت کی وجہ سے دل اپنے مقامات سے اوپر کو اٹھ آئیں گے اور حلق میں پہنچ کر وہاں چمٹ جائیں گے۔ اب نہ تو وہ واپس اپنے مقامات کی طرف جائیں گے کہ آدمی کو راحت وسکون حاصل ہو جائے اور نہ ہی وہ باہر نکلیں گے کہ انہیں موت آ جائے۔

کاظمین کا معنی ہے بے چین، مضطرب، خوف اور غم سے بھرے ہوئے۔ اور کظم سے مراد ایسے غصے، خوف اور غم کا دل میں آ نا جانا ہے جسے وہ برداشت کر سکتا ہو۔ ترکیب کلام میں القلوب مبتدا ہے۔ لدی الحنا جر اس کی خبر ہے اور کاظمین القلوب سے حال ہے کیونکہ القلوب سے مراد اصحاب قلوب ہیں۔ کاظمین کاظم کی جمع سالم ہے کیونکہ کاظم کے ساتھ ایسے فعل کی صفت بیان کی گئی ہے جو ذوی العقول کے افعال میں سے ہے۔

ظالمین سے مراد کفار ہیں۔ ضمائر اگرچہ کفار کیلئے ہیں لیکن یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تا کہ اس پر دلالت کرے کہ یہ کیفیت

کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہوگا لہٰذا اس صورت میں صفت یطاع کا کوئی معنی نہیں ہوگا۔ یا پھر یہ مفہوم ہے کہ مشرکین کا زعم باطل یہ تھا کہ ان کے بت ان کی سفارش کریں گے تو اس کے بارے فرمایا کہ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ان کے بت ان کے لئے سفارش کریں گے تو پھر بھی ان کی سفارش کو قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا۔

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿١٩﴾ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿٢٠﴾

''وہ جانتا ہے خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور ان باتوں کو جنہیں سینے میں چھپائے ہوئے ہیں [1] اور اللہ فیصلہ فرمائے گا حق کے ساتھ۔ اور جنہیں وہ اللہ کے بغیر پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ سننے والا (اور) سب کچھ دیکھنے والا ہے [2]۔''

[1] خَآئِنَةَ صیغہ اسم فاعل ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے۔ یہ اصل میں النظرة الخائنة ہے۔ یعنی خیانت کرنے والی نگاہ۔ جیسا کہ ایسی شے کی طرف دیکھنا جسے دیکھنا حرام ہو اور نظر چرا کر ایسی چیز کی طرف دیکھنا (خیانت نظر کہلاتا ہے) یا خائنة مصدر بمعنی خیانة ہے جیسا کہ عافیة مصدر بمعنی معافاة ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ قول باری تعالیٰ هو الذی یریکم ایاته میں ھو مبتدا کی دوسری خبر ہے اور اللہ تعالیٰ ان رازوں کو بھی جانتا ہے جو ابھی سینوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ کہ جب کوئی آدمی کسی عورت کی جانب شہوت کی نظر سے نظریں چرا کر دیکھتا ہے اور پھر وہ آدمی اس اجنبیہ عورت کے حسن و جمال کے بارے میں اپنے دل میں غور و فکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس غور و فکر سے بھی واقف و آگاہ ہے۔

[2] اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا کیونکہ وہ مالک مطلق ہے، وہ حکیم و دانا ہے اور جو کچھ ظاہر ہے اور جو پوشیدہ ہے وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ لہٰذا وہ وہی فیصلہ فرمائے گا جس کا تقاضا اس کا علم اور حکمت کرے گی اور اس کا تقاضا حق ہی ہوگا۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف یعلم پر ہے۔

اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں، شیاطین اور ظالم حکمرانوں کو پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس فیصلہ کرنے کی قدرت ہی نہیں۔

یَدْعُوْنَ کو نافع اور ہشام نے التفات کی بناء پر تاء کے ساتھ صیغہ خطاب کی صورت میں پڑھا ہے۔ یا اس سے قبل قُلْ مضمر ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ تدعون پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ غیب کی صورت میں یاء کے ساتھ یَدْعُوْنَ پڑھا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ یہ جملہ آنکھوں کی خیانت کے جاننے اور حق کے ساتھ فیصلے کرنے کی تائید کرتا ہے اور جو کچھ کفار کہتے ہیں اور کرتے ہیں اس پر ان کے لئے اس میں وعید بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا جنہیں وہ پکارتے ہیں ان کی حالت پر تعریض بھی ہے کہ وہ نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔

بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

'' کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں۔ تا کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ قوت کے لحاظ سے بھی ان سے طاقتور تھے۔ اور زمین میں (چھوڑے ہوئے) آثار کے لحاظ سے بھی۔ تو پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے باعث اور نہیں تھا ان کے لئے اللہ سے کوئی بچانے والا۔ یہ اس لئے کہ لے کر آتے رہے ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں تو انہوں نے ہر بات ماننے سے انکار کر دیا پس پکڑ لیا انہیں اللہ نے۔ بیشک وہ بڑا طاقتور سخت سزا دینے والا ہے [2] ''

[1] اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَيُنْكِرُوْنَ وَبَالَ الْكُفْرِ وَلَمْ يَسِيْرُوْا۔ کیا وہ کفر کے وبال کا انکار کرتے ہیں اور انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی تا کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ اس سے مراد وہ امتیں ہیں جنہوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا مثلاً قوم عاد اور قوم ثمود وغیرہ۔ حالانکہ وہ قوت و قدرت کے اعتبار سے ان کی نسبت زیادہ طاقتور تھے۔ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً میں هم ضمیر فصل ذکر کی گئی ہے اس لئے کہ صیغہ اسم تفضیل (افعل من کے ساتھ مستعمل ہو تو معرفہ ہوتا ہے اور اس پر الف لام کا داخل ہونا ممتنع ہوتا ہے۔ (لہٰذا اسی صفت اور خبر کے فرق کو واضح کرنے کیلئے کانو اور اشد کے درمیان ضمیر فصل لگا دی گئی ہے تا کہ معلوم ہو کہ ضمیر کا مابعد خبر ہے) ابن عامر نے التفات کے طریقے پر اشد منکم قرات کی ہے۔

اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ سے مراد قلعہ اور فصیل بند شہر ہیں۔ بعض نے کہا ہے اٰثارا کا تعلق اشد سے نہیں بلکہ اکثر محذوف سے ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے۔ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ۔ جیسا کہ عربوں کا قول ہے متقلدا سیفاورمحا۔ (اس میں رمحا کا تعلق متقلد اسے نہیں)

تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا اور انہیں ہوا' چیخ یا اور طریقہ سے ہلاک اور تباہ و برباد کر دیا اور ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے بچانے والا کوئی نہیں تھا کہ وہ اس کے پاس جا کر التجا کرتے تو وہ ان سے عذاب کو روک لیتا (ایسا قطعاً کوئی بھی نہیں تھا) ترکیب کلام میں جملہ وما کان لهم الخ یا معطوف ہے یا پھر حال واقع ہو رہا ہے۔

[2] بینت سے مراد معجزات یا ایسے احکام ہیں جو صحت و صلاح کے اعتبار سے بالکل واضح تھے۔ یعنی ان پر یہ عذاب اور گرفت اس لئے آئی کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح معجزات اور نشانیاں لے کر آتے رہے تو انہوں نے ہر بار ماننے سے انکار کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑ لیا۔ بیشک وہ بڑا طاقتور ہے۔ وہ جس شے کا ارادہ کرتا ہے اسے کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے، یعنی اس کی سزا انتہائی شدید اور سخت ہے۔ یہ جملہ قوت کے ساتھ پکڑنے کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ

''اور بیشک بھیجا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیوں اور روشن سند کے ساتھ ۔ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف تو انہوں نے کہا (یہ) جادوگر ہے بڑا جھوٹا ہے ۱؎ پھر جب موسیٰ لیکر آئے ان لوگوں کے پاس حق ہمارے ہاں سے تو انہوں نے کہا کہ قتل کر ڈالو ان لوگوں کے بچوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے اور زندہ چھوڑ دو ان کی لڑکیوں کو ۔ اور نہیں ہے کافروں کا ہر مکر مگر رائیگاں ۲؎ ''

۱؎ بِاٰيٰتِنَا سے مراد نو معجزات ہیں اور وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ سے مراد واضح اور ظاہر دلائل ہیں اور عطف دونوں وصفوں کے درمیان مغایرت بیان کرنے کیلئے ہے (یعنی بِاٰيٰتِنَا اور وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ سے مراد علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں) یا پھر وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ سے مراد بھی بعض خاص اور اہم معجزات ہیں جیسا کہ عصا وغیرہ تو ان کی تفخیم شان کیلئے انہیں علیحدہ ذکر فرمایا گویا اس صورت میں عطف تخصیص بعد تعمیم کیلئے ہوگا ۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام واضح معجزات اور نشانیاں لے کر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف گئے تو انہوں نے آپ کے بارے کہا یہ تو جادوگر اور کذاب ہے ۔ یہ جملہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث تسکین اور تسلی ہے اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کفار سے پہلے لوگوں کے انجام کا تذکرہ ہے جو اپنی قوت کے اعتبار سے ان سے زیادہ طاقتور ہے اور ان کا زمانہ بھی ان کے زمانے کے قریب تھا ۔

۲؎ پھر جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس سے حق لے کر ان کے پاس آئے تو انھوں نے کہا ان لوگوں کے بچوں کو قتل کر ڈالو جو ان کے ساتھ ایمان لائے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دو ۔ یعنی جیسے تم نے پہلے کیا تھا کہ ان کے بیٹوں کو قتل کرایا تھا اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا تھا تا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہو کر ظاہرا کام کرنے کا راستہ ہی بند ہو جائے (اسی طرح اب بھی کرو کہ ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کے بچوں کو قتل کرا دو تا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے معاون و مددگار نہ بن سکیں اور اپنی خدمت کیلئے ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دو ۔) وما کید الکفرین میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے ایک تو ان کے کفر پر مہر تصدیق ثبت کرنے کیلئے، دوسرا حکم کی عمومیت بیان کرنے کیلئے اور تیسرا حکم کی علت کا اظہار کرنے کیلئے ۔ معنی یہ ہے کہ کافروں کا ہر مکر رائیگاں ہے ۔ ان کی ہر تدبیر بے اثر اور بیکار ہے ۔ کیونکہ انہوں نے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کو باطل کرتے اور آپکے پیام حق کو رد کرنے کا ارادہ کیا ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو انہی پر لوٹا دیا اور انھیں تباہ و برباد کر دیا اور اس کے برعکس موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے متبعین کو زمین کا بادشاہ بنا دیا ۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾

''اور فرعون نے (جھنجھلا کر) کہا مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کروں ۱؎ اور وہ بلائے اپنے رب کو (اپنی مدد کیلئے) مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین بدل نہ دے یا فساد نہ پھیلا دے ملک میں ۲؎ اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا میں پناہ مانگتا

اور تباہی کے خوف سے اسے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے سے روکتے تھے (1) اور اسے یہ کہتے تھے کہ یہ موسیٰ وہ نہیں ہے جس سے تو ڈر رہا ہے بلکہ یہ تو جادوگر ہے اور اگر تو اسے قتل کرا دے گا تو بالیقین لوگ یہ گمان کریں گے کہ تو دلائل کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے (لہٰذا ان کے مزاج بگڑ جائیں گے) علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا یقین تھا اسی لیے وہ آپ کو قتل کرانے سے ڈرتا تھا یا اسے یہ گمان تھا کہ اگر اس نے ان کے قتل کا قصد کیا تو اس کیلئے یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا (2) اور اس کی تائید و لیدع ربہ کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

؎ اور موسیٰ کو چاہیے کہ وہ اپنے اس رب کو بلائے جس کے بارے یہ گمان کرتا ہے کہ اس نے اسے ہماری طرف بھیجا ہے اور وہ آکر اس کی ہم سے حفاظت کرے۔ گویا فرعون نے اس قول میں اپنی اس جرات کا اظہار کیا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو بھی بلائے تو اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس کا قول ذرونی اقتل موسیٰ فقط اپنی قوم کے ساتھ مکر کرنے اور دھوکہ سازی کیلئے تھا اور انہیں یہ وہم دلانا مقصود تھا کہ وہ اسے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے سے روک رہے ہیں (ورنہ میں تو اسے قتل کر دیتا حالانکہ بات اس طرح نہ تھی) کیونکہ حقیقتاً اسے قتل سے روکنے والا وہ عصا کے معجزہ کا خوف تھا جو اس کے دل میں راسخ ہو چکا تھا۔

انی میں نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ کہنے لگا بیشک اگر میں اسے قتل نہ کروں تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دینوں کو بدل دیگا، یعنی جو تم اب بتوں کی پوجا پاٹ میں لگے ہوئے ہو اس میں تبدیلی اور تغیر پیدا کر دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ؎ یا زمین میں فساد برپا کر دے گا۔ اور فساد سے مراد دین کی تبدیلی، بتوں کی عبادت میں تغیر یا دنیا میں جنگ و جدال اور فتنہ و فساد برپا کرنا ہے۔

یعقوب اور اہل کوفہ نے اَوْ اَن اور دوسروں نے وَاَن پڑھا ہے۔ اہل مدینہ اور بصرہ نے یظہر باب افعال سے یاء کو ضمہ اور ھاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور الفساد کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور جبکہ باقیوں نے باب مجرد سے یاء اور ھاء دونوں کو مفتوح یعنی یظھر پڑھا ہے اور الفساد کو فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔

؎ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی تو آپ نے اپنی قوم سے کہا میں پناہ مانگتا ہوں اپنے رب کی اور تمہارے پروردگار کی ہر اس متکبر کے شر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہاں کلام کا آغاز ان سے کیا جو کہ حرف تاکید ہے اور یہ احساس دلانے کیلئے ہے کہ شر کو دور کرنے کا سب سے مضبوط اور پختہ سبب اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا ہے۔ چونکہ یہاں موجود حفاظت اور تربیت ہے اس لئے خاص طور پر (اسماء میں سے) اسم رب ذکر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت ان تمام کی حفاظت کو متضمن اور شامل تھی اس لئے لفظ رب کی اضافت اپنی طرف بھی کی اور ان کی طرف بھی اور اس میں ان کو اس بات پر برانگیختہ کرنا مقصود ہے کہ وہ بھی پناہ طلب کرنے میں آپ کی موافقت کریں (یعنی وہ بھی آپ کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں) کیونکہ اجتماعی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔

یہاں آیت میں فرعون کا نام ذکر نہیں کیا بلکہ ایسا وصف (متکبر) ذکر کیا ہے جو اسے بھی اور دوسروں کو بھی شامل ہے۔ ایک تو اس میں عمومیت مقصود ہے (کہ یہ پناہ فرعون جیسے ہر شریر کے شر سے ہے) دوسرا حق کی رعایت کرتے ہوئے اور تیسرا اس بات پر دلالت

انکار کرتا تھا) یہ بھی جائز ہے کہ ربکم کا خطاب فرعون اور اس کی قوم کو ہو اور اس کے ذریعے انھیں توحید کے اقرار اور شرک کے انکار پر متنبہ کرنا مقصود ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور رب نہیں)۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾

"اور کہنے لگا ایک مرد مومن جو فرعون کے خاندان سے تھا اور چھپائے ہوئے تھا اپنے ایمان کو کیا تم قتل کرنا چاہتے ہو ایک شخص کو اس وجہ سے کہ وہ کہتا ہے میرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے [1]۔ حالانکہ وہ لے آیا ہے تمہارے پاس دلیلیں تمہارے رب کی طرف سے (اسے اپنے حال پر رہنے دو) اگر وہ حقیقتاً جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کی شامت اس پر ہو گی اور اگر سچا ہوا (اور تم نے اسکو گزند پہنچائی) تو ضرور پہنچے گا تمہیں عذاب جس کا اس نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اسے جو حد سے بڑھنے والا بہت جھوٹ بولنے والا ہو [2]۔"

[1] مقاتل اور سدی نے کہا ہے کہ وہ مومن مرد قبطی تھا جو کہ فرعون کے چچا کا بیٹا تھا اور یہ وہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ القصص میں اس طرح بیان کیا ہے وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى بعض نے کہا ہے اس کا نام حبیب تھا۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ اسرائیلی تھا اس کا نام جزئیل تھا اور مجازاً اس آیت میں وہی مقصود ہے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر علما سے اسی طرح مروی ہے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ اس کا نام حبول تھا۔

کیا تم اس آدمی کو قتل کرنے کا قصد کر رہے ہو (ا) جو کہتا ہے میرا رب صرف ایک اللہ ہے۔ یا کیا تم اس آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ کر رہے ہو ایسے وقت میں جبکہ وہ اپنے معاملے میں نظر و فکر کرنے کے بغیر یا کسی قسم کا خوف رکھے بغیر یہ کہہ رہا ہے میرا رب صرف ایک اللہ ہے۔ لفظ ربی کا لفظ اللہ پر مقدم ہونا حصر پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ صدیقی زید میں حصر پایا جا رہا ہے۔

[2] حالانکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیلیں، یعنی ایسے کثیر معجزات لے کر آیا ہے جو اس کی صداقت اور سچائی پر شاہد عادل ہیں۔ کیونکہ ایسے معجزات عطا کرنے کی کوئی بھی قدرت نہیں رکھتا مگر وہی جس نے تمہیں پیدا کیا ہے کیونکہ وہ ہر شے پر قادر ہے اس کے سوا کوئی بھی ایسی قدرت نہیں رکھتا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 40 (الفکر)

(ا) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ نے کہا اے لوگو! مجھے بتاؤ سب لوگوں سے بڑھ کر بہادر کون ہے؟ تو لوگوں نے جواب دیا ہم تو نہیں جانتے، آپ نے فرمایا ابوبکر۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ قریش نے آپکو پکڑ رکھا تھا ایک آپکو نیچے کی جانب جھکا رہا تھا اور دوسرا آپ کو سختی سے کھینچ رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے تو وہ ہے جس نے تمام الہوں کو ایک الہ بنا رکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں قسم بخدا! ہم میں سے سوائے ابوبکر کے کوئی بھی قریب نہ ہوا۔ آپ نے ایک کو ایک طرف دھکا دیا اور دوسرے کو کھینچا ساتھ فرمایا تمہاری ہلاکت ہو اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللّٰہ حضرت علی نے وہ

مِنْ رَّبِّكُمْ میں رب کی اضافت ان کی طرف ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس نے تمہیں پیدا فرمایا ہے اور تمہاری پرورش کی ہے وہ یہ بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر عذاب مسلط کر دے اور تمہیں اپنی گرفت میں لے لے۔ ترکیب کلام میں وقد جاءکم الخ۔ کا جملہ یقول کے فاعل سے حال ہے۔ پھر اس آدمی نے احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے استدلال کرتے ہوئے کہا۔

اگر وہ حقیقتاً جھوٹا ہے جیسا کہ تم گمان کرتے ہو تو پھر اس کے جھوٹ کا وبال اور شامت اسی پر پڑے گی وہ کبھی بھی اس سے بچ نہیں سکتا کسی اور پر نہیں پڑے گا کہ اسے دور کرنے کیلئے اسے قتل کرنے کی ضرورت ہو اور اگر وہ سچا ہے جیسا کہ معجزات اور شواہد اس پر دلالت کر رہے ہیں تو پھر کم از کم اس عذاب کا کچھ حصہ تمہیں ضرور پہنچے گا جس کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے اور وہی بعض تمہاری ہلاکت و بربادی کیلئے کافی ہے۔ اس کلام میں انہیں ڈرانے میں مبالغہ کا اظہار بھی ہے اور تعصب کے بغیر انصاف کا اظہار بھی یہی وجہ ہے کہ کاذباً کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا اور بہت جھوٹ بولنے والا ہو۔ یہ تیسرا استدلال ہے جس میں دو اسلوب اپنائے گئے ہیں۔ اس میں سے ایک یہ ہے کہ اگر وہ حد سے بڑھنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ معجزات اور دلائل کی جانب اس کی راہنمائی تک نہ فرماتا۔ جبکہ اسے اللہ تعالیٰ نے معجزات اور دلائل کے ساتھ قوت و طاقت عطا فرمائی ہے۔

اور ان میں سے دوسرا اسلوب یہ ہے کہ اگر وہ حد سے تجاوز کرنے والا اور بہت جھوٹ بولنے والا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے ذلیل ورسوا کر دے گا۔ وہی اسے ہلاک کر دے گا اور تمہیں اسے قتل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ شاید اس کی اس سے بھی مراد پہلا استدلال ہی ہے اور دوسرا تو فقط اس لئے اختیار کیا تا کہ ان کے غصے اور غضب کو قدرے نرم کر دے اور اس میں فرعون کیلئے یہ تعریض بھی ہے کہ چونکہ وہ حد سے تجاوز کرنے والا اور خوب جھوٹ بولنے والا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ سیدھے اور نجات کے راستے کی طرف اس کی راہنمائی نہیں فرمائے گا۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن العاص رحمہ اللہ عنہ سے پوچھا مجھے اس شدید ترین انتہائی اور سخت برتاؤ کے بارے بتایئے جو مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختیار کیا ہوا تھا تو انہوں نے فرمایا اس اثناء میں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ معظمہ کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک عقبہ بن ابی معیط ادھر آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر کپڑا آپ کے گلے میں ڈال لیا اور اسے بل دینے شروع کر دیئے اور اس نے انتہائی شدید انداز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گلا گھونٹ دیا پس اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رحمتہ اللہ ادھر آئے (۱) اور اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر رسول اللہ سے دور ہٹایا اور

(۱) حضرت عمر بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ شریف کے طواف سے جونہی فارغ ہوئے تو لوگ آپ پر جھپٹ پڑے اور آپ کی پوری چادر کو پکڑ لیا اور کہا کیا آپ ہی ہیں جو ہمیں ان سے روکتے ہیں جن کی عبادت ہمارے آباء واجداد کرتے تھے تو آپ نے فرمایا ہاں میں ہی وہ ہوں تو حضرت ابوبکر صدیق رحمتہ اللہ عنہ اٹھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر سے چمٹ گئے اور پھر فرمایا اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ يَعِدُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۔ آپ نے یہ الفاظ انتہائی بلند آواز سے کہے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے حتیٰ کہ انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ علیہ وسلم کو اتنا شدید مارا کہ آپ پر غشی طاری ہوگئی پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے

فرمایا اتقتلون رجلا ان یقول ربی الله وقد جاء کم بالبینات من ربکم رواہ البخاری(1)۔

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَمَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾

”اے میری قوم! مانا آج حکومت تمہاری ہے (نیز تمہیں) غلبہ حاصل ہے اس ملک میں (لیکن مجھے یہ تو بتاؤ) کون بچائے گا ہمیں خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آ جائے [1] (یہ سن کر) فرعون کہنے لگا میں تو تمہیں وہی مشورہ دیتا ہوں جس کو میں درست سمجھتا ہوں اور نہیں راہنمائی کرتا میں تمہاری مگر سیدھے راستہ کی طرف [2] اور کہنے لگا وہی ایمان والا اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر (بھی کہیں) پہلی قوموں کی تباہی کے دن جیسا دن نہ آ جائے [3] جیسا حال ہوا تھا قوم نوح' عاد اور ثمود کا اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئے۔ اور اللہ نہیں چاہتا کہ بندوں پر ظلم کرے [4]۔“

[1] اے میری قوم! مانا سرزمین مصر میں آج حکومت تمہاری ہے نیز تمہیں اس ملک میں غلبہ حاصل ہے۔ ظھرمن کا معنی ہے غالب ہونا اور بلند مرتبہ ہونا۔ ترکیب کلام میں ظھرین، لکم میں کم ضمیر سے حال ہے۔

لیکن مجھے بتاؤ کون بچائے گا ہمیں خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آ جائے۔ یعنی آج اسی زمین میں تمہاری حکومت اور تمہارا غلبہ ہے۔ لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے نبی کو قتل کر کے اس کے عذاب کو دعوت دے کر اپنی حکومت اور غلبہ کو ضائع اور باطل نہ کرو۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہم پر آ گیا تو کوئی بھی اسے ہم سے روک نہیں سکے گا۔ ینصرونا میں نا ضمیر جمع ذکر کر کے کہنے والے نے اپنے آپ کو بھی اس میں داخل کیا ہے کیونکہ اس کا ان سے قرابت کا تعلق تھا اور ساتھ ہی وہ انہیں یہ بات سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہے اور جو نصیحت وہ انہیں کر رہا ہے وہ اس میں ان کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔

[2] یہ سن کر فرعون کہنے لگا میں تو تمہیں وہی مشورہ دیتا ہوں جس کو میں درست سمجھتا ہوں۔ اُریکم الرّائی سے ماخوذ ہے۔ ضحاک نے یہ معنی کیا ہے کہ میں تمہیں وہی سکھاتا ہوں جسے میں درست سمجھتا ہوں(2)۔ یعنی اُریکم اعلمکم کے معنی میں ہے (اور میں تو موسیٰ علیہ السلام کے قتل کو درست خیال کرتا ہوں) سَبِيْلَ الرَّشَادِ کا معنی ہے سیدھا اور صحیح راستہ' یعنی میں تمہاری راہنمائی نہیں کرتا مگر سیدھے راستہ کی طرف۔

[3] اور وہی ایمان والا کہنے لگا اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بھی کہیں موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب اور انہیں قتل کرنے کے سبب پہلی قوموں کی تباہی کے دن جیسا دن نہ آ جائے۔ اس میں پہلی قوموں سے مراد وہ زمانہ ماضی کی امتیں ہیں۔ جنہوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔ تقدیر عبارت یہ ہے انی اخاف علیکم عذاباً مثل عذاب یوم الاحزاب۔ اس میں نافع' ابن کثیر اور ابوعمرو نے انی کی یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔

ہوتے ہوئے یوم کو جمع ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یا پھر معنی ہی اسطرح ہے۔ عذاب یوم حزب من الاحزاب۔

۳۔ جیسا حال ہوا تھا قوم نوح' عاد اور ثمود کا اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئے۔ مثلاً قوم لوط اور نمرود وغیرہ۔ یعنی جیسے انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور انہیں اذیتیں پہنچائیں (تو ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب آیا مجھے تو تمہارے بارے میں یہی ڈر اور خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آجائے) یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ وہ آدمی قوم فرعون میں سے تھا اور پہلے لوگوں کے حالات سے واقف و آگاہ تھا۔

اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ بندوں پر ظلم کرے۔ للعباد میں لام زائدہ ہے جو ظلماً مصدر کے عمل کو تقویت دینے کیلئے لگایا گیا ہے اور العباد، ظلماً کا مفعول ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ وہ کسی بندے پر ظلم کرے اور بغیر گناہ کے انہیں سزا دے یا بندوں میں سے کسی ظالم کو بغیر انتقام کے چھوڑ دے یا کسی کیلئے اس کی نیکی کے اجر میں کمی کر دے یا پھر کسی کی سزا میں اضافہ کرے۔

وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

''اور اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں تمہارے بارے میں پکار کے دن سے [۱] جس روز تم بھاگو گے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔ نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا۔ اور جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں [۲]۔''

۱۔ اس نے انہیں عذاب دنیا سے ڈرانے کے بعد آخرت کے عذاب سے ڈرایا اور کہا اے میری قوم! میں تمہارے بارے میں پکار کے دن سے ڈرتا ہوں۔ نافع' ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی میں یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔ التناد کو ابن کثیر نے حالت وصل اور وقف دونوں میں یاء کے اثبات کے ساتھ التنادی پڑھا ہے۔ ورش نے صرف حالت وصل میں اس طرح پڑھا ہے۔ قالون سے ان دونوں میں اختلاف منقول ہے اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کر کے التناد پڑھا ہے۔

۲۔ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ، یوم التناد سے بدل ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے جس روز تم پیٹھ پھیرتے ہوئے بھاگو گے مگر بچ نہیں سکو گے (۱)۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ دن ہے جس میں گھبراہٹ پیدا کرنے کیلئے صور میں پھونکا جائے گا۔ یعنی اس سے مراد نفخہ فزع کا دن ہے۔ جو کہ نفخہ صعق سے پہلے ہوگا۔ (یعنی پہلے گھبراہٹ پیدا کی جائے اور پھر بیہوشی طاری ہوگی)

ابن جریر نے مطولات میں' ابو یعلی نے مسند میں' بیہقی نے البعث اور عبد بن حمید اور ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ اس میں آپ نے تین نفخوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو نفخہ اولیٰ کا حکم ارشاد فرمائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا نفخہ فزع (گھبراہٹ پیدا کرنے) کیلئے صور میں پھونک مار تو وہ اس میں پھونک ماردیں گے زمین و آسمان کے تمام باسیوں پر گھبراہٹ طاری ہو جائے گی۔ مگر جن کیلئے اللہ تعالیٰ چاہے گا ان پر گھبراہٹ طاری نہیں ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ حکم دے گا تو حضرت اسرافیل علیہ السلام اس پھونک کو اور

سے غافل ہو جائیں گی۔ حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے، بچے بوڑھے ہو جائیں گے (ان کے بال سفید ہو جائیں گے) اور شیاطین گھبراہٹ کے سبب بھاگنے لگیں گے حتیٰ کہ وہ بھاگتے بھاگتے اطراف میں (کناروں تک) آ پہنچیں گے۔ وہاں ان کی ملاقات ملائکہ سے ہو جائے گی۔ وہ انہیں چہروں پر ضرب لگائیں گے تو یہ واپس لوٹ آئیں گے اور لوگ بھی پیٹھیں پھیر کر بھاگ رہے ہوں گے اور آپس میں ایک دوسرے کو پکار پکار کر کہہ رہے ہوں گے یہ وہی دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوم التناد فرمایا ہے۔ الحدیث۔

بعض نے کہا ہے کہ یوم التناد سے مراد قیامت کا دن ہے، جبکہ تمام لوگوں کو ان کے پیشواء اور امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔ ابونعیم نے ابوحازم الاعرجؒ کا بیان نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا اے اعرج! قیامت کے دن ندا دی جائے گی اے فلاں فلاں گناہ کرنے والو آ جاؤ تو تو ان کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔ پھر آواز دی جائے گی اے فلاں فلاں گناہ کرنے والو آ جاؤ (یہ گناہ پہلے گناہ کے علاوہ دوسرا ہوگا) تو تو ان کے ساتھ بھی اٹھ کھڑا ہوگا۔ اے اعرج! پس میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تو ہر قسم کے گناہ کرنے والوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ابن ابی عاصم نے السنۃ میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا اے اللہ تعالیٰ کے حریفو! اٹھ کھڑے ہو (1)۔ اس سے مراد فرقہ قدریہ والے ہیں کیونکہ وہ انسان کو اپنے افعال کا خود خالق قرار دیتے ہیں اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حریف اور مقابل قرار پائے (اس وقت اہل جنت اہل جہنم کو ندا دیں گے اور دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے اور اصحاب الاعراف بھی پکاریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں بیان کیا ہے۔ اس وقت سعادت و شقاوت کے ساتھ لوگوں کو بلایا جائے گا کہ فلاں بن فلاں ایسا خوش بخت اور سعادتمند بن چکا ہے کہ اس کے بعد کبھی بھی وہ شقی اور بد بخت نہیں ہوگا اور فلاں بن فلاں ایسا بد بخت اور شقی بن گیا ہے کہ اس کے بعد کبھی بھی وہ خوش بخت اور سعادتمند نہیں ہوگا۔

بزار اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن ابن آدم کو لایا جائے گا اور اسے میزان کے دونوں پلڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے گا اور اس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا جائے گا اگر اس کے نیک اعمال کا پلڑا بھاری ہوا تو وہ فرشتہ اتنی بلند آواز سے ندا دے گا کہ ساری مخلوق اسے سن لے گی کہ فلاں ایسا سعادتمند ہو گیا کہ اس کے بعد وہ کبھی بھی شقی نہیں ہوگا اور اگر اس کے نیک اعمال کا پلڑا ہلکا نکلا تو وہ فرشتہ بلند آواز سے پکار کر کہے گا فلاں ایسا بد بخت اور شقی ہو گیا کہ اس کے بعد کبھی بھی وہ سعادتمند نہیں ہوگا اور اس کی یہ آواز ساری مخلوق سنے گی (2) اور اس وقت یہ ندا بھی دی جائے گی کہ میں نے تمہارے لیے ایک نسب اور رشتہ مقرر کیا تھا اور ایک نسب اور رشتہ تم نے مقرر کیا تھا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابو ہریرہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ندا دینے والے کو حکم دے گا اور وہ یہ ندا دے گا خبردار! میں نے تمہارے لیے ایک نسب اور رشتہ مقرر کیا تھا اور تم نے دوسرا نسب مقرر کیا تھا پس میں نے تو یہ مقرر کیا تھا کہ جو تم میں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوگا اتنا وہ زیادہ معزز اور قابل تکریم ہوگا۔ لیکن تم نے اس کا انکار کیا۔ اور تم نے یہ کہا کہ فلاں بن فلاں، فلاں بن فلاں کی نسبت زیادہ بہتر اور افضل ہے۔ آج میں اپنے مقرر کردہ

لوگ کہاں ہیں؟(1) یہ اس وقت ندا دی جائے گی، جبکہ موت کو ذبح کیا جاچکا ہوگا۔ اے اہل جنت! تم نے ہمیشہ جنت میں رہنا ہے تمہیں موت کبھی نہیں آئے گی اور اے اہل دوزخ! تم نے ہمیشہ یہاں رہنا ہے تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اہل جنت جنت کی طرف اور اہل دوزخ دوزخ کی طرف چلے جائیں گے تو اس وقت موت کو لایا جائے گا اور اسے جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کیا جائے گا۔ پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر ندا دینے والا ندا دے گا اے اہل جنت اب تمہارے لیے موت نہیں ہے اور اے اہل دوزخ! اب تمہارے لیے بھی موت نہیں ہے۔ یہ سن کر اہل جنت کو تو انتہائی فرحت و مسرت حاصل ہوگی اور اہل دوزخ کو شدید قسم کا حزن اور غم ہوگا(2)۔ حضرت ابو سعید سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ حاکم اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ضحاک نے یوم التناد کی دال کو مشدد پڑھا ہے، یعنی بھاگنے کا دن اور منتشر ہونے کا دن اور یہ اس لئے ہے کہ لوگ اس دن اس زمین میں منتشر ہونگے اور ادھر ادھر بھاگ رہے ہوں گے جیسا کہ کوئی اونٹ اپنے حاکموں سے بھاگ جائے اور بدکنے لگے۔

ابن جریر اور ابن مبارک نے حضرت ضحاک سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کو حکم ارشاد فرمائے گا تو وہ اپنے باسیوں کے ساتھ پھٹ جائے گا اور اس میں رہنے والے فرشتے اس کی اطراف اور کناروں پر چلے جائیں گے پھر جس وقت اللہ تعالیٰ انہیں حکم ارشاد فرمائے گا تو وہ زمین پر اتر آئیں گے اور وہ زمین اور اس پر بسنے والی ہر شے کو احاطہ میں لے لیں گے۔ پھر اسی طرح یکے بعد دیگرے دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں آسمان کو پھٹنے کا حکم دیا جائے گا اور ان میں رہنے والے فرشتے ان سے نکل کر ایک دوسرے کے پیچھے صفیں بناتے جائیں گے۔ پھر شہنشاہ اعلیٰ نزول اجلال فرمائے گا اس کی بائیں جانب جہنم ہوگی۔ جب زمین والے جہنم کو دیکھیں گے تو بھاگ پڑیں گے۔ مگر زمین کی اطراف میں سے جہاں کہیں بھی پہنچیں گے وہ ملائکہ کی سات صفیں وہاں پائیں گے نتیجۃً وہ اس جگہ واپس لوٹ آئیں گے جہاں وہ پہلے تھے۔ ان تمام چیزوں کا تذکرہ ان آیات طیبات میں موجود ہے۔ انی اخاف علیکم یوم التناد یوم تولون مدبرین مالکم من اللّٰہ من عاصم وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ وَجِایْٓءَ یَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ یَوْمَىِٕذٍ وَّاهِیَةٌ ۙ وَّالْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآىِٕهَا ؕ یعنی جس دوران آسمان پھٹے گا اسی حالت میں جب لوگ ایک آواز سنیں گے تو وہ (مقام) حساب کی طرف متوجہ ہوں گے۔ بعض نے قول باری تعالیٰ یوم تولون مدبرین کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ جس دن تم موقف حساب سے پھرتے ہوئے جہنم کی طرف لوٹ کر آؤ گے(3)۔ کوئی نہیں ہوگا جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائے گا۔ یعنی قطعاً غیر اللہ میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب صرف اس کی رحمت سے ہی دور ہوسکتا ہے اور ان کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی رحمت نہیں ہوگی جو انہیں اس کے عذاب سے بچائے گی۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۟ۚ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

(اے میری قوم!) بیشک آئے تمہارے پاس یوسف (موسیٰ علیہما السلام) سے پہلے روشن دلائل لے کر پس تم شک میں گرفتار رہے اس میں جو وہ لے کر آئے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ وفات پا گئے تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ نہیں بھیجے گا اللہ تعالیٰ ان کے بعد کوئی رسول۔ یونہی گمراہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جو حد سے بڑھنے والا، شک کرنے والا ہوتا ہے[1]۔ (یونہی گمراہ کرتا ہے) انہیں جو جھگڑتے رہتے ہیں اللہ کی آیتوں میں بغیر کسی (معقول) دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو[2]۔ (یہ طریقہ) بڑی ناراضگی کا باعث ہے اللہ کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک۔ اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہر مغرور (اور) سرکش دل پر[3]۔

[1] آیت میں یوسف سے مراد حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں اور یہ تب مراد ہو سکتے ہیں، جبکہ آپ کے زمانے کا فرعون وہی ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا فرعون تھا، اور وہ اتنے طویل زمانے تک زندہ رہا (کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مابین تقریباً چار سو سال کی مدت کا فاصلہ تھا۔) یا پھر اس بناء پر آپ مراد ہو سکتے ہیں کہ آباؤ اجداد کے احوال کی نسبت اولاد کی طرف کر دی جاتی ہے اور مقصود یہ ہو کہ تمہارے آباؤ اجداد کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام واضح معجزات لے کر آئے تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یوسف سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے پوتے یوسف بن ابراہیم بن یوسف بن یعقوب علیہم السلام ہیں، انہیں ان کی طرف بھیجا گیا تھا۔

بِالْبَيِّنٰتِ۔ واضح معجزات لے کر۔ پس تم شک میں گرفتار رہے اس میں جو وہ لیکر آئے تھے۔ مما جا کم بہ کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دین کو اللہ تعالیٰ کیلئے خالص کرتے ہوئے وحدہ لاشریک رب کی عبادت کرنے کا جو پیغام لے کر آئے تھے یہاں تک کہ جب یوسف علیہ السلام وفات پا گئے تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعد کوئی رسول نہیں بھیجے گا، یعنی تم اپنے کفر پر ہی قائم رہے اور یہ گمان کرنے لگے کہ اللہ کوئی اور رسول بھیج کر تم پر تجدید حجت نہیں کرے گا۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ اسی گمراہ کرنے کی طرح اللہ تعالیٰ اسے گناہوں میں پڑے رہنے دیتا ہے جو حد سے بڑھنے والا ہوتا ہے، یعنی شرک کا ارتکاب کرتا ہے اور شک کرنے والا ہوتا ہے، یعنی غلبہ وہم اور تقلید میں منہمک ہونے کی وجہ سے ان امور میں شک کرنے لگتا ہے، جن کے سچا ہونے کی شہادت واضح دلائل اور معجزات پیش کرتے ہیں۔

[2] ترکیب کلام میں الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ پہلے موصول من سے بدل ہے کیونکہ وہ بھی جمع کے معنی میں ہے۔ بغیر سلطن کا معنی ہے بغیر واضح دلائل اور حجت کے یعنی (یونہی گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ) انہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں بغیر کسی ایسی واضح دلیل اور حجت

ہے۔ یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ الخ مبتدا ہو اور کبر مقتا اس کی خبر ہو اور الذین سے پہلے مضاف محذوف ہو اور اسی کے لحاظ سے کبر فعل مفرد ذکر کیا گیا ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو وجدال الذین یجادلون فی ایٰت اللّٰہ کبر مقتا۔ یا یہ ترکیب ممکن ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ مبتدا ہو اور اس کی خبر بغیر سلطن ہو اور کبر کا فاعل کذلک ہو۔ اس طرح کہ کاف اسم بمعنی مثل ہو، یعنی کبر مقتا مثل ذالک الجدال۔ اس صورت میں قول باری تعالیٰ یطبع اللّٰہ جملہ مستانفہ ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ جملہ ان کے آیات الٰہی میں جھگڑنے کے سبب پر دلالت کر رہا ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اسی طرح انہیں گمراہ کرنے کی مثل اللہ تعالیٰ ہر مغرور اور سرکش دل پر گمراہی کی مہر لگا دیتا ہے اور اسے اس طرح گمراہی میں پختہ کر دیتا ہے کہ کہیں سے بھی نور ایمان دل میں داخل نہیں ہو سکتا۔

ابو عمرو اور ابن ذکوان نے قلب کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ تکبر اور تجبر اس کی صفات ہیں کیونکہ یہ دونوں دل ہی کے افعال ہیں۔ جیسا کہ ان کے قول رات عینی وسمعت اذنی (میری آنکھ نے دیکھا اور میرے کان نے سنا) (اس میں دیکھنا اور سننا آنکھ اور کان کے افعال ہیں) یا پھر اس وجہ سے کہ اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے علی قلب کل ذی قلب متکبر جبار (یعنی اللہ تعالیٰ ہر اس آدمی کے دل پر مہر لگا دیتا ہے جس کا دل مغرور اور سرکش ہو) باقیوں نے قلب کو اضافت کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ زُیِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِیْلِ ؕ وَ مَا كَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾

''اور فرعون نے کہا اے ہامان! بنا میرے لیے ایک اونچا محل (اس پر چڑھ کر) میں ان راہوں تک پہنچ جاؤں، یعنی آسمانوں کی راہوں تک پھر میں جھانک کر دیکھوں موسیٰ کے خدا کو[1] اور میں تو یقین کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔ اور یوں آراستہ کر دیا گیا فرعون کیلئے اس کا برا عمل اور روک دیا گیا اسے راہ (راست) سے۔ اور نہیں تھا فرعون کا سارا فریب مگر اس کی اپنی تباہی کیلئے[2]''

[1] فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا میرے لیے اتنا اونچا اور بلند محل بنا دے جو کسی دور سے دیکھنے والے پر بھی مخفی نہ ہو۔ اسی اعتبار سے تصریح بمعنی اظہار ہے (اس پر چڑھ کر) میں آسمانوں کی راہوں تک پہنچ جاؤں۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ سے مراد وہ راہیں اور دروازے ہیں جو ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف جاتے ہیں۔ ہر وہ شے جو کسی دوسری شے تک پہنچانے کا ذریعہ ہو وہ سبب کہلاتی ہے مثلاً رسی اور ڈول پانی تک پہنچنے کا ذریعے ہونے کی وجہ سے پانی کا سبب کہلاتے ہیں۔ دوسرے اسباب پہلے کیلئے بیان ہے پہلے اسباب کو مبہم ذکر کیا پھر اس کی وضاحت فرمائی ایک تو اسلئے تاکہ اس کی فخیم شان کا بیان ہو اور دوسرا اسلئے تاکہ سامع کو اس کی معرفت اور پہچان کا شوق دلایا جائے۔

فاطلع کو حفص نے لعل کا جواب ہونے کی وجہ سے فاء کے ساتھ منصوب پڑھا ہے اور باقیوں نے ابلغ پر عطف کرتے ہوئے [illegible]

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ شاید اس نے کسی بلند مقام پر ایک رصدگاہ تعمیر کرنے کا حکم دیا ہو جس سے وہ ان ستاروں کے احوال کا مشاہدہ کر سکے جو کہ اسباب سماویہ ہیں اور زمینی حوادث پر دلالت کرتے ہیں اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ کیا یہ اسباب سماویہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی طرف بھیجا ہے(1)۔ یا پھر اس سے وہ لوگوں کو یہ دکھانا چاہتا ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کا قول غلط ہے کیونکہ آسمان کے الہ کی جانب سے خبر دینا اس پر اطلاع پانے اور اس تک پہنچنے پر موقوف ہے (یعنی جو اللہ تعالیٰ تک پہنچے گا وہ ہی اس کے حکم پر مطلع ہوگا اور پھر اسکی خبر دے گا) اور اس تک پہنچنا آسمانوں پر چڑھے بغیر ممکن نہیں اور انسان آسمان کی بلندیوں میں چڑھنے کی قوت اور قدرت نہیں رکھتا (اس سے یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دے رہے ہیں وہ سب من گھڑت اور غلط ہے) لیکن فرعون کی یہ ساری گفتگو اور مکر جہالت پر مبنی تھی کیونکہ نہ تو وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وشان سے واقف تھا اور نہ اسے یہ علم تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نبی کیسے بناتا ہے (اور اس تک وہ اپنے احکام کیسے پہنچاتا ہے؟۔)

۲؎ اور میں تو یقین کرتا ہوں کہ موسیٰ اپنے دعویٰ رسالت میں جھوٹا ہے اور جس طرح آسمانوں کے رب پر واقفیت اور اطلاع پانے کیلئے اونچی اور بلند و بالا محل کی تعمیر کو فرعون کی نظروں میں حسین بنا دیا گیا اسی طرح اس کے ہر برے عمل کو اس کیلئے مزین کر دیا گیا۔ یعنی ہر وہ برا عمل جسے عقل سلیم قبول کرنے کیلئے کبھی بھی تیار نہیں وہ فرعون کو حسین اور خوبصورت لگنے لگا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بصیرت کو ختم کر دیا تھا جس کے سبب وہ ہر برے عمل کو خوبصورت دیکھنے لگا اور اسے سیدھی راہ سے روک دیا گیا۔

اہل کوفہ اور یعقوب نے صد کو صیغہ مجہول کی صورت میں صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور فاعل حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہے وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے اور باقیوں نے صاد کو مفتوح پڑھا ہے۔ یعنی فرعون نے لوگوں کو اس قسم کے شبہات اور مکر و فریب سے راہ ہدایت سے روک دیا اور اس کی تائید یہ قول باری تعالیٰ بھی کرتا ہے **وما کید فرعون الا فی تباب** کہ موسیٰ علیہ السلام کے امر کو باطل اور ناکام کرنے کیلئے فرعون کی ہر تدبیر اور مکر بیکار ثابت ہوا اور اس کے لیے خسارے اور ضیاع کا سبب بنی۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۝ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

''اور کہنے لگا وہ جو ایمان لایا تھا اے میری قوم! میرے پیچھے چلو میں دکھاؤں گا تمہیں ہدایت کی راہ ۱؎ اے میری قوم! یہ دنیوی زندگی تو (چندروزہ) لطف اندوزی ہے۔ اور آخرت ہی ہمیشہ ٹھہرنے کی جگہ ہے ۲؎ جو برے کام کرتا ہے اسے سزا دی جائے گی اسی قدر۔ اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ ایماندار ہو تو وہ داخل ہوں گے جنت میں رزق

دونوں میں اثبات یاء کے ساتھ اتبعونی پڑھا ہے۔قالون اور ابوعمرو نے صرف حالت وصل میں اثبات یاء کے ساتھ قرأت کی ہے، جبکہ باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے اور اتبعون پڑھا ہے۔

سَبِيْلَ الرَّشَادِ سے مراد ایسا راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والے کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔اس میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ فرعون اور اس کی قوم نے جو راہ راست اپنا رکھا ہے وہ گمراہی کا راستہ ہے (وہ راہ ہدایت نہیں۔)

۲ اے میری قوم! یہ دنیوی زندگی تو چندروزہ) لطف اندوزی ہے۔یعنی یہ ایک حقیر اور تھوڑا سا سامان ہے جس سے انتہائی قلیل مدت کیلئے لوگ لطف اندوز اور متمتع ہو سکتے ہیں پھر وہ ختم ہو جاتا ہے، جبکہ اس کے برعکس آخرت ہمیشہ ٹھہرنے کی جگہ ہے جو کبھی زائل نہیں ہو گی لہٰذا تم پر لازم ہے کہ ایسے اعمال کرو جو آخرت میں تمہارے لیے نفع بخش اور فائدہ مند ہوں۔

۳ جو برے کام کرتا ہے اسے اسی قدر سزا دی جائے گی اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ ایماندار ہو تو اس میں ایمان کی شرط اسلیئے لگائی گئی ہے کیونکہ ہر نیک اور صالح عمل کی جزاء کیلئے ایمان بنیادی شرط ہے کیونکہ اعمال کی جزاء دینے کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔اس لئے اس کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے تاکہ وہ عمل کیئے جائیں جن سے وہ راضی اور خوش ہوتا ہے کیونکہ جب عمل خالص اس کی رضا کیلئے ہوگا تو وہ جزا بھی عطا فرمائے گا۔

بِغَيْرِ حِسَابٍ کا مفہوم ہے کہ جنت میں انہیں اعمال کا اندازہ لگائے بغیر اور انکا موازنہ کیئے بغیر رزق دیا جائیگا بلکہ اس رزق میں اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل اور رحمت سے کئی گنا اضافہ فرما دے گا۔

وَيٰقَوْمِ مَالِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ﴿٤١﴾ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۚ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿٤٢﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿٤٣﴾

''اور اے میری قوم! میرا بھی عجیب حال ہے کہ میں تو تمہیں دعوت دیتا ہوں نجات کی طرف اور تم بلاتے ہو مجھے آگ کی طرف ۱ تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کردوں اور میں شریک ٹھہراؤں اس کے ساتھ اس کو جس کا مجھے علم تک نہیں۔اور میرا حال یہ ہے کہ میں پھر بھی تمہیں اس خدا کی طرف بلاتا ہوں جو عزت والا، بہت بخشنے والا ہے ۲ سچی بات تو یہ ہے کہ جس کی (بندگی کی) طرف تم مجھے بلاتے ہو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسے پکارا جائے اس دنیا میں اور نہ آخرت میں اور یقیناً ہم سب کو لوٹنا ہے اللہ کی طرف اور یقیناً حد سے گزرنے والے ہی جہنمی ہیں ۳''

۱ مالی میں اہل کوفہ اور ابن ذکوان نے یاء کو ساکن پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔معنی یہ ہے کہ تمہارا حال بھی عجیب ہے۔ یہ تمہارے اس جملے کی مثل ہے مالی اراکم حزینا یعنی تم مجھے خبر دو تمہارے حالات کیسے ہیں جو عقل وعرف کے تقاضوں کے خلاف ہیں کہ میں تو تمہیں اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کے ساتھ ایمان لانے کے سبب آگ سے نجات دلانے کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے اس

میں بدخواہی کر رہے ہیں۔ ندائے ثانی کا نداءاول پر عطف نہیں کیا گیا کیونکہ یہ اپنے ماقبل کا بیان اور تفصیل ہے اور تیسری ندا کا عطف یا دوسری پر ہے یا پہلی پر۔

تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ یہ پہلے تدعوننی سے بدل ہے۔ یا اس کا بیان اور تعلیل ہے۔ دعا بھی مصدر ہدایت کی طرح الی اور لام کے واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ اور میں اس کے ساتھ اس کو شریک ٹھہراؤں جس کے رب ہونے کا مجھے علم تک نہیں بلکہ اس کے رب نہ ہونے پر میرے پاس قطعی اور یقینی دلائل ہیں۔ ایمان کیلئے یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے رب ہونے پر دلائل موجود ہوں اور اعتقاد بغیر ایقان ویقین کے صحیح نہیں ہوتا۔

العزیز کا معنی ہے غالب جو کہ کفر کرنے والے سے انتقام لینے کی پوری قدرت اور طاقت رکھتا ہو۔

الغفار۔ اہل اایمان میں سے جسے چاہے اس کے گناہ بخش دے اور الوہیت کی تمام صفات کا جامع ہے، یعنی اس کی قدرت کاملہ ہے، وہ ہر شی کا علم رکھتا ہے اور اس کا ارادہ مطلق ہے (یعنی وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ کوئی شے اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر نہیں ہوسکتی)

کہا گیا ہے کہ لا جرم میں لا نافیہ ہے اور قوم فرعون جو اس بندہ مومن کو بتوں کی عبادت کی طرف بلاتی تھی اس دعوت کو رد کرنے کیلئے یہ ذکر کیا گیا ہے اور جرم فعل بمعنی حق ہے (یعنی حق اور صحیح بات یہ ہے) اور ان اپنے سارے جملہ کے ساتھ مل کر فعل کا فاعل ہے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ یہ حق اور ثابت شدہ بات ہے کہ تمہارے الہوں کا اپنی عبادت کی طرف بلانا دونوں جہان میں اس کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں۔ کیونکہ یہ جمادات ہیں دنیا میں اپنی عبادت کی طرف قطعاً دعوت نہیں دیتے اور نہ آخرت میں دعوت دیں گے بلکہ اپنے پجاریوں سے برات اور بیزاری کا اظہار کریں گے تو ان میں کوئی بھی ایسی شے نہیں جو ان کے الہ ہونے کا تقاضا کرتی ہو۔ یا معنی یہ ہے کہ یہ بات حق اور ثابت شدہ ہے کہ ان کی دعا کا مقبول نہ ہونا یقینی ہے یا ان کیلئے کسی دعا کا قبول نہ ہونا یقینی ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ یہ بت نہ دنیا میں کسی کیلئے دعا کرتے ہیں نہ آخرت میں کریں گے(1)۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ جرم فعل ہے اور جرم مصدر سے بنایا گیا ہے اس کا معنی ہے القطع۔ (قطع کرنا' کاٹنا) اور لا نافیہ ہے جیسا کہ لا بد میں بد فعل ہے جو تبدید بمعنی تفریق سے بنایا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ بتوں کے الہ ہونے کے دعوی کے باطل ہونے میں کوئی قطع و انقطاع نہیں۔ یعنی کسی وقت بھی اس دعوی کا بطلان منقطع نہیں ہوا پس اس کا معنی یہ بن جائے گا کہ اس کا باطل ہونا ہمیشہ جاری رہا۔ گویا اس میں مابرح اور مازال کا معنی پایا گیا۔ نتیجہ اس کا معنی ہوگا حقا یعنی قطعی اور یقینی ہونا، اور قاموس میں ہے کہ لا جرم کا معنی ہے ضروری ہے حق ہے بالیقین لامحالہ یہ اس لفظ کے اصل معنی ہیں پھر یہی لفظ قسم کے معنی دینے کیلئے استعمال کیا جانے لگا(2)۔ اسی لیے اس کے جواب میں لام واقع ہونا ضروری ہے مثلاً کہا جاتا ہے لاجرم لا تینک (میں بالیقین ضرور تیرے پاس آؤں گے۔)

بعض نے یہ کہا ہے کہ جرم بمعنی کسب ہے اور اس کا فاعل اس میں پوشیدہ ضمیر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے انہیں اس کی طرف

میں بھی لا نافیہ ہے اور ان کے دعویٰ کو رد کرنے کیلئے ہی ہوگا۔

اور یقیناً موت کے بعد ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے وہ ہر ایک کو اتنی اتنی جزا و سزا دے گا جس کا وہ مستحق ہوگا اور یقیناً شرک کرنے اور خون بہانے کے سبب گمراہی اور سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والے ہی جہنمی ہیں وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾

''پس (اے میرے ہموطنو!) عنقریب تم یاد کرو گے جو میں (آج) تمہیں کہہ رہا ہوں۔ اور میں اپنا (سارا) کام اللہ کے سپرد کرتا ہوں بیشک اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو ۱؎ پس بچالیا اسے اللہ تعالیٰ نے ان اذیتوں سے جن کے پہنچانے کا انہوں نے حیلہ کیا اور ہر طرف سے گھیر لیا فرعونیوں کو سخت عذاب نے ۲؎ دوزخ کی آگ ہے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہوگی ۳؎ (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں ۴؎''

۱؎ (اے میرے ہم وطنو!) جو نصیحت آج میں تمہیں کر رہا ہوں یہ عنقریب تم آپس میں ایک دوسرے کو یاد دلاؤ گے۔ جب عذاب کا مشاہدہ تم اپنی آنکھوں سے کرلو گے لیکن اس وقت نصیحت کا یاد کرنا تمہارے لیے نفع بخش ثابت نہیں ہوگا اور میں تو اپنا سارا کام اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ مجھے تکلیف اور برائی سے محفوظ رکھے۔ یہ جملہ (یعنی اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ) تب کہا تھا جب فرعونیوں کے دین کے ساتھ آپ کی مخالفت بالکل ظاہر اور واضح ہوگئی تو فرعونیوں نے اسے آپ کو سزا دینے کی دھمکی دی تھی۔ امری میں نافع اور ابوعمرو نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے، یعنی وہ جانتا ہے کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ پھر وہ بندہ مومن ان کے درمیان سے نکل گیا۔ وہ اسے تلاش کرتے رہے۔ لیکن وہ اسے پانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

۲؎ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے بچالیا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف محذوف جملہ پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے فارا دال فرعون قتله ففر منهم فارسل فرعون جماعة ليا خذ وه فوقه الله۔ کہ قوم فرعون نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو وہ ان سے بھاگ نکلا پھر فرعون نے ایک جماعت اسے پکڑ کر لانے کیلئے بھیجی تو اللہ تعالیٰ نے اسے بچالیا ان اذیتوں سے جن کے پہنچانے کا انہوں نے ارادہ کیا اور ہر طرف سے فرعون اور اس کی قوم کو سخت عذاب نے گھیر لیا۔ یہاں قوم فرعون کے ساتھ فرعون کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے بارے تو یقین تھا کہ عذاب کا سب سے زیادہ مستحق وہی تھا، سُوْٓءُ الْعَذَابِ سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں انہیں غرق کیا گیا اور آخرت میں انہیں جہنم میں ڈال دیا گیا۔

بعض نے کہا ہے حاق بال فرعون سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو سخت عذاب نے گھیر لیا جنہیں فرعون نے اس بندہ مومن کو تلاش کرنے کیلئے بھیجا تھا۔ اس صورت میں سوء العذاب سے مراد قتل ہے کیونکہ جب وہ عبد مومن بھاگ کر پہاڑ کی طرف چلا گیا تو اس جماعت نے اس کا تعاقب کیا اور اسے نماز پڑھنے میں مشغول پایا اور کیا دیکھا کہ جنگلی درندے اس کے اردگرد صفیں باندھے اس کی

۳؎ اَلنَّارُ یُعۡرَضُوۡنَ الایہ جملہ مستانفہ ہے یاالنار مبتدامحذوف کی خبر ہے۔اوریُعرضون بیان اوروضاحت کیلئے جملہ مستانفہ ہے یا پھر اَلنَّارُ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ سے بدل ہےاور یعرضون اسی سے حال ہےیا ال فرعون سے حال ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آل فرعون کی ارواح سیاہ رنگ کے پرندوں کے پیٹوں میں داخل کر کے ہر روز دو مرتبہ آگ پر پیش کی جاتی ہیں۔وہ صبح وشام آگ (جہنم) کی طرف جاتے ہیں اورانہیں کہا جاتا ہے اے آل فرعون! یہ تمہارا ٹھکانہ ہے جب قیامت قائم ہو جائے گی(1)۔اسے عبدالرزاق اورابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔

مقاتل، سدی اورکلبی نے کہا ہے ہر کافر کی روح صبح وشام دوزخ پر پیش کی جاتی ہے جب تک یہ دنیا قائم ہے(2) یعنی قیامت قائم ہونے تک ایسا ہی ہوتا رہے گااوراس کی تائید صحیحین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی بھی فوت ہوتا ہے تو اس پر اس کا ٹھکانہ صبح وشام پیش کیا جاتا ہے اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتو اہل جنت کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہےاوراگر وہ اہل نار میں سے ہوتو اہل دوزخ کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہےاوراسے یہ کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسی پر تجھے اٹھائے گا(3)۔

اس آیت میں نفس (روح) کے باقی رہنے اورعذاب قبر ہونے پر استدلال موجود ہے۔متعدد احادیث سے بھی یہ مسئلہ ثابت ہےاور اسی پر اجماع بھی منعقد ہوا ہے۔

۴؎ ابن کثیر، ابوعمرو، ابن عامراورابوبکر نے ادخلو میں ہمزہ وصل اور خاء کوضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ادخلوا کہ انہیں کہا جائے گا۔ اے آل فرعون! تم شدید ترین عذاب میں داخل ہو جاؤ۔باقیوں نے ہمزہ کو قطعی اور خاء کومکسور پڑھا ہے، یعنی ادخال سے ادخلوا۔کہ ملائکہ کوکہا جائے گا آل فرعون کوشدید ترین عذاب میں داخل کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اَشَدَّ الۡعَذَابِ سے مراد طرح طرح کا عذاب ہے جو کہ اس عذاب سے مختلف ہوگا جو انہیں عالم برزخ میں غرق کیئے جانے کے وقت سے دیا جارہا ہے(4)۔

وَ اِذۡ یَتَحَآجُّوۡنَ فِی النَّارِ فَیَقُوۡلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِیۡبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُلٌّ فِیۡہَاۤ ۙ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ حَکَمَ بَیۡنَ الۡعِبَادِ ﴿۴۸﴾

"(اورکتنا ہوش ربا سماں ہوگا) جب باہم جھگڑیں گے دوزخ میں پس کہیں گے کمزورلوگ انہیں جوتکبر کیا کرتے تھے کہ ہم تو تمہارے تابع تھے پس کیا تم دور کر سکتے ہو ہم سے کچھ حصہ آگ (کے عذاب) کا۱؎ جواب دیں گے متکبر ہم سب آگ میں (بھن رہے) ہیں۔بیشک اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا ہے بندوں کے متعلق (اب اس میں رد وبدل نہیں ہوسکتا)۲؎"

۱؎ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی قوم کے سامنے اس وقت کا تذکرہ کیجئے جبکہ اہل نار جہنم میں باہم جھگڑا کریں گے۔ترکیبی اعتبار سے یہ بھی جائز ہے کہ ظرف کا (واذ یتحاجون) کا عطف غدوا پر ہو۔پس کمزورلوگ ان لوگوں سے کہیں گے جوتکبر کیا کرتے تھے

کہ دنیا میں ہم تو تمہارے تابع تھے۔ تبع واحد بھی ہوسکتا ہے اور جمع بھی کہ اس کا واحد تابع ہے جیسا کہ خدم، خادم کی جمع ہے۔ یہ اہل بصرہ کا موقف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اتباع کرنے والے یعنی ذوی تبع بمعنی اتباع۔ گویا اس سے پہلے مضاف مضمر ہے یا مضاف کو مضمر ماننا جائز ہے۔

اہل کوفہ نے کہا ہے کہ تبع جمع ہے جس کا واحد نہیں آتا البتہ اسکی جمع اتباع ہے(1)۔

پس کیا تم آگ (کے عذاب) کا کچھ حصہ ہم سے دور کر سکتے ہو؟ اس میں استفہام بمعنی امر ہے اور نصیبا یا تو اس کا مفعول ہے جس پر مغنون دلالت کر رہا ہے یا مغنون کا مفعول ہے یا پھر مصدر ہے اور اس کا استعمال اسی طرح ہے جیسا کہ قول باری تعالیٰ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا میں شَيْـًٔا کا استعمال ہے۔ پس اس صورت میں یہ مغنون کا صلہ ہو جائیگا۔

۲۔ تکبر کرنے والے جواب دیں گے کہ ہم سب یعنی ہم اور تم میں سے ہر ایک آگ میں جل رہا ہے پس ہم کیسے تم سے عذاب دور کر سکتے ہیں اگر ہم ایسا کرنے کی قدرت رکھتے تو بالیقین اپنے آپ سے دور کرتے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے بندوں کے متعلق ان میں سے اہل جنت کے جنت میں داخل ہونے اور اہل نار کے دوزخ میں داخل ہونے کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ میں اب کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا اور نہ اس میں اب کوئی ردوبدل ہوسکتا ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾ قَالُوْۤا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾

''اور کہیں گے سارے دوزخی جہنم کے داروغوں کو دعا کرو اپنے رب سے کہ ایک دن تو ہمارے عذاب میں (کچھ) تخفیف فرما دے ۱۔ وہ (جواب میں) کہیں گے کیا نہیں آیا کرتے تھے تمہارے پاس تمہارے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ۔ وہ کہیں گے بیشک! داروغے کہیں گے تم خود ہی دعا مانگو اور حقیقت یہ ہے کہ نہیں ہے کافروں کی دعا مگر محض بے سود ۲''

۱۔ جب اہل جہنم پر عذاب کی شدت بڑھے گی تو اس وقت وہ جہنم کے داروغوں سے کہیں گے کہ تم اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمارے عذاب میں کسی ایک دن تو کچھ تخفیف فرما دے۔ ضمیر کی جگہ جہنم کا لفظ صراحۃً ذکر کیا گیا تاکہ دہشت اور خوف میں اور اضافہ ہو۔

۲۔ جہنم کے داروغے جواب میں کہیں گے کیا تمہارے پاس رسول روشن دلائل لے کر نہیں آیا کرتے تھے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور انہیں اس بات پر زجر و توبیخ کرنے کیلئے ہے کہ انہوں نے دعا کے اوقات ضائع کر دیئے اور قبولیت دعا کے اسباب کھو دیئے۔ ترکیبی لحاظ سے اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اما علمتم في الدنيا مالحقكم في الاخرة من العذاب ولم تك تاتيكم رسلكم بالبينات منذرين به۔ کیا تم دنیا میں نہیں جانتے تھے کہ جو عذاب تمہیں آخرت میں ملے گا اور تمہارے پاس رسول روشن دلائل لے کر ڈرانے کیلئے نہیں آتے رہے تو وہ جواب دیں گے کیوں نہیں۔ بلکہ ہمارے پاس رسول خوشخبری سنانے اور ڈرانے کیلئے آتے رہے تو جہنم کے داروغے انہیں کہیں گے تم خود ہی دعا مانگو۔ یہ امر ہے اور بطور استہزاء وہ انہیں یہ کہیں گے

بھی قبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ جہنم کے داروغوں کے کلام میں سے ہو۔ اس بناء پر حال ہوگا یا جملہ معترضہ ہوگا۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾

"بیشک ہم (اب بھی) مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مومنین کی اس دنیوی زندگی میں اور اس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ (گواہی دینے کے لئے) کھڑے ہوں گے [1]۔ اس روز نفع نہ دے گی ظالموں کو ان کی عذر خواہی اور ان کیلئے لعنت ہوگی۔ اور ان کیلئے (دوزخ کا) بدترین گھر ہوگا [2]۔ اور ہم نے عطا فرمایا موسیٰ کو (نور) ہدایت اور وارث بنایا بنی اسرائیل کو کتاب کا۔ جو سراپا ہدایت اور نصیحت تھی عقلمندوں کیلئے [3]۔"

[1] اس سے قبل فرعون کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کی مدد کرنے اور انہیں فرعون پر غلبہ عطا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد اب بالعموم رسل علیہم السلام اور مومنین کی مدد کرنے کا ذکر کیا جارہا ہے (کہ چونکہ وہ ہماری مدد و نصرت کا استحقاق رکھتے ہیں للہٰذا ہم کبھی انہیں اس سے محروم نہیں رکھتے) چنانچہ فرمایا اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا الایہ۔ ضحاک نے کہا ہے کہ دنیوی زندگی میں اس مدد سے مراد دلائل اور حجت ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد غلبہ عطا فرماتا ہے (1)۔ علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ بعض اوقات بطور آزمائش و امتحان کفار کو بھی غلبہ عطا کیا گیا ہے لیکن اس سے اس آیت کا خلاف لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اعتبار انجام اور امر غالب کا ہوتا ہے (2) (اور انجام کار کے اعتبار سے ہمیشہ ہی انبیاء و رسل علیہم السلام کو غالب فرمایا گیا) بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس مدد سے مراد انبیاء علیہم السلام کے دشمنوں سے دنیا میں ہی انتقام لینا ہے (کہ جس نے بھی نبی علیہ السلام سے عداوت اپنائی وہ اس کی سزا سے محفوظ نہ رہ سکا۔)

وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ سے مراد قیامت کا دن ہے، یعنی قیامت کے دن کراماً کاتبین فرشتے رسل علیہم السلام کے حق میں شہادت دیں گے کہ انہوں نے تبلیغ کا حق ادا کیا (پیغامات الٰہی اپنی اپنی امتوں تک پہنچائے) اور کفار کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی اور انہیں خوب جھٹلایا۔

[2] اس دن ظالموں (کافروں) کو ان کی عذر خواہی باطل ہونے کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ ترکیب کلام میں يَوْمَ لَا يَنْفَعُ، يَوْمَ يَقُوْمُ سے بدل ہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور ابن عامر نے لاتنفع قرات کی ہے کیونکہ اس کا فاعل (معذرتھم) مونث ہے اور باقیوں نے لاینفع پڑھا ہے ایک تو اس لئے کہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے اور ساتھ ہی فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ بھی موجود ہے۔

وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ اور ان کیلئے لعنت ہوگی یعنی رحمت سے بہت دوری ہوگی ترکیب کلام میں یہ الظالمین سے حال ہے۔ اور ان کیلئے دوزخ کا بدترین گھر ہوگا۔

علیہ السلام کو وہ کتاب ہدایت (توریت) عطا فرمائی جس سے دین کے معاملہ میں راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ آپ کو یہ کتاب فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک اور تباہ و برباد کرنے کے بعد عطا کی گئی اور پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کو توریت کا وارث بنا دیا۔ عقلمندوں کی ہدایت اور نصیحت کیلئے (یا پھر مصدر بمعنی اسم فاعل ہے) یعنی ھدی بمعنی ھادیا اور ذکری بمعنی مذکرا ہے۔ یعنی وہ کتاب عقول سلیمہ رکھنے والوں کو ہدایت دینے والی اور نصیحت کرنے والی تھی۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِیْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِیْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۵۶﴾

”پس (اے محبوب!) آپ صبر فرمایئے (کفار کی اذیتوں پر) بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور استغفار کرتے رہئے اپنی (موہومہ) کوتاہیوں پر اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے شام کے وقت اور صبح کے وقت [1]۔ بیشک جو لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کی آیتوں کے بارے میں بغیر کسی سند کے جوان کے پاس آئی ہو۔ نہیں ہے ان کے سینوں میں بجز بڑائی کی ایک ہوس کے جس کو وہ پا نہیں سکیں گے۔ تو آپ اللہ کی پناہ طلب کیجئے۔ بیشک وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے [2]۔“

[1] پس اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ مشرکین کی اذیتوں پر صبر فرمایئے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کیلئے مدد و نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ حق اور سچ ہے۔ قطعاً وعدہ خلافی کا کوئی احتمال اور امکان نہیں اور اس پر بطور استشہاد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ آپ اپنی موہومہ کوتاہیوں پر استغفار کرتے رہئے یہ امر تعبدی ہے بالیقین اس کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتب و درجات میں اضافہ ہوگا (یعنی باوجود اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم عن الخطاء ہیں جب آپ حکم استغفار کی تعمیل میں استغفار کریں تو اس کے سبب آپ کے درجات بلند ہوں گے مراتب قرب میں اضافہ ہوگا) اور اس کے ساتھ امت کیلئے ایک سنت بھی قائم ہو جائے گی۔

اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے۔ یعنی اپنے رب کا شکر بجالانے کیلئے نماز پڑھیے۔ شام کے وقت اور صبح کے وقت۔ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِبْكَارِ کے بارے حسن نے کہا ہے اس سے مراد عصر اور صبح کی نمازیں ہیں اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد پانچوں نمازیں ہیں(1)۔

[2] بیشک جو لوگ بغیر ایسی سند اور حجت کے قرآن کریم کا انکار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہو۔ ان کے سینوں میں نہیں ہے مگر بڑائی کی ہوس۔ یہاں سینے سے مراد دل ہے۔ کیونکہ دل سینے میں ہی ہوتا ہے اور سینہ دل کا محل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ انہیں آپ کی تکذیب پر کوئی شے برانگیختہ نہیں کرتی مگر وہی بڑائی اور عظمت کا تصور جو ان کے سینوں یعنی دلوں میں موجود ہے(2)۔ یعنی وہ اپنے آپ کو آپ سے بڑا خیال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو عظیم اور برتر سمجھتے ہیں اس لئے وہ آپ کی

مَّاهُمْ بِبَالِغِيْهِ اس کے بارے مجاہد نے کہا ہے کہ وہ اس بڑائی اور عظمت کے مقتضی کو کبھی بھی نہیں پاسکیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل ورسوا کردے گا۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ ان کے سینوں میں نہیں ہے مگر حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑائی کی ہوس اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر غالب آنے کی حرص۔ مگر وہ کبھی بھی اپنی اس ہوس اور حرص کو نہیں پاسکیں گے (1) تو آپ ان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کیجئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے قولوں اور باتوں کو سننے والا ہے اور تمہارے افعال واعمال کو دیکھنے والا ہے۔ یہ جملہ پناہ طلب کرنے کے حکم کی علت بیان کررہا ہے۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

”(بیشک پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کا بہت بڑا کام ہے لوگوں کے پیدا کرنے سے لیکن بہت سے لوگ (اس کھلی حقیقت کو) نہیں جانتے ۱؎۔“

۱؎ پس وہ اللہ تعالیٰ جو آسمانوں اور زمین کو ان کے اتنا وسیع اور عظیم ہونے کے باوجود بغیر کسی اصل اور بنیادی شے کے موجود ہونے کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو وہ بالیقین لوگوں کو ان کی اصل کے ہوتے ہوئے دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یہ آیت درحقیقت ان لوگوں کے وہم اور اشتغال کو دور کرنے اور باہمی جھگڑے کو ختم کرنے کیلئے نازل ہوئی کہ جب قرآن کریم نے دوبارہ زندہ کئے جانے اور قیامت قائم ہونے کا تصور دیا تو وہ وہم میں مبتلا ہو گئے اور جھگڑنے لگے کہ دوبارہ زندہ کیا جانا کیسے ممکن ہے؟ تو انہیں یہ اشکال اس لئے پیدا ہوا کہ وہ اپنی کثرت غفلت' خواہشات نفس کی اتباع اور اپنے آباؤاجداد کی اندھی تقلید کے سبب اس نظریہ میں غور وفکر ہی نہیں کرتے اور نہ ہی قیامت کے قیام اور نہ ہی رب العالمین کی قدرتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں (اس لئے وہ اس کی حقیقت سے ناآشنا بھی ہیں اور اس کے منکر بھی۔)

ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے روایت نقل کی ہے کہ کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور انہوں نے دجال کا ذکر کیا اور کہنے لگے وہ آخری زمانہ میں ہم میں سے ہوگا اور انہوں نے اس کی بڑی عظمت وشان اور کارناموں کا تذکرہ کیا کہ وہ فلاں فلاں کام کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ دجال کے فتنہ سے اپنے رب کی پناہ مانگیں۔ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (2) کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا انسانوں کی تخلیق یعنی دجال کو پیدا کرنے سے عظیم اور بڑا عمل ہے۔

کعب الاحبار نے قول باری تعالیٰ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ کے بارے کہا ہے کہ اس سے مراد یہودی ہیں۔ یہ آیت انہی کے بارے نازل ہوئی کیونکہ وہ دجال کا انتظار کررہے تھے (3)۔

عمران بن حصین سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ تخلیق آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت قائم ہونے تک کوئی ایسا واقعہ اور معاملہ نہیں ہے جو دجال کے معاملہ سے بڑھ کر ہو۔ رواہ مسلم (4)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے

دجال دائیں آنکھ سے کانا ہوگا۔ اس کی دائیں آنکھ پر انگور کی طرح ٹینٹ پھولا ہوگا۔ متفق علیہ (1)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی نبی نہیں گزرا مگر اس نے اپنی امت کو کانے کذاب سے ڈرایا ہے۔ خبردار! یہ خوب جان لو کہ وہ کانا ہوگا اور تمہارے رب کی قدرت کی آنکھ میں کوئی عیب نہیں۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان **کفر** لکھا ہوگا۔ متفق علیہ (2)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں دجال کے بارے میں کچھ باتیں نہ بتادوں؟ کیونکہ ہر نبی نے اپنی امت کو اس کے بارے کچھ نہ کچھ بتایا ہے۔ بیشک وہ کانا ہوگا اور وہ جنت اور دوزخ کو اپنے ساتھ لائے گا۔ پس جسے وہ کہے گا کہ یہ جنت ہے حقیقت میں وہ دوزخ ہوگی۔ میں تمہیں اس کے فتنہ سے اس طرح ڈراتا ہوں جیسے نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا تھا۔ متفق علیہ (3)۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دجال ظاہر ہوگا اور اس کے ساتھ پانی اور آگ دونوں ہوں گے۔ پس وہ شے جسے لوگ پانی گمان کر رہے ہوں گے فی الحقیقت وہ جلانے والی آگ ہوگی اور جسے لوگ آگ دیکھ رہے ہوں گے وہ حقیقت میں ٹھنڈا میٹھا پانی ہوگا۔ پس تم میں سے جو کوئی اسے پالے تو اسے چاہیے کہ وہ اس میں گر جائے جسے وہ آگ کی صورت میں دیکھ رہا ہے کیونکہ وہ حقیقت میں ٹھنڈا میٹھا پانی ہے۔ متفق علیہ (4)۔ اور مسلم شریف میں یہ زائد ہے کہ دجال کی ایک آنکھ نہیں ہوگی بلکہ اس کی جگہ پر ایک موٹا ناخونہ ہوگا۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ کافر لکھا ہوا ہوگا اور ہر مومن اسے پڑھ لے گا چاہے وہ خود لکھنا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو (5)۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال بائیں آنکھ سے کانا ہوگا' اس کے بال گھنگریالے ہوں گے۔ اس کے ساتھ اس کی جنت بھی ہوگی اور دوزخ بھی۔ پس جو اس کی دوزخ ہوگی وہ حقیقت میں جنت ہوگی اور جو اس کی جنت ہوگی وہ حقیقت میں دوزخ ہوگی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا اگر وہ میرے تم میں موجود ہونے کی حالت میں ظاہر ہوا تو پھر میں تمہاری طرف سے اس کا مقابلہ کروں گا اور اگر وہ میرے چلے جانے کے بعد ظاہر ہوا تو آدمی اپنا مقابلہ خود کرے گا اور اللہ تعالیٰ میری طرف سے ہر مسلمان کا مددگار اور معاون ہوگا۔ دجال ایک ژولیدہ نوجوان ہوگا اس کی آنکھ میں پھولا ہوگا میں اسے عبدالعزیٰ بن قطعف کے مشابہ قرار دیتا ہوں۔ پس تم میں سے جو کوئی اسے پائے تو سورۂ کہف کی ابتدائی آیات پڑھ کر اس پر دم کرے کیونکہ یہ آیات دجال کے فتنہ سے بچاؤ کا سبب بن جائیں گی۔ اس کا خروج شام اور عراق کے درمیان سبزہ زار میں ہوگا۔ وہ اپنے دائیں بائیں فساد اور تباہی برپا کردے گا۔ ہم نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کتنی دیر تک زمین میں ٹھہرے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چالیس دن۔ ان میں ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا' ایک دن ایک مہینہ کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ہفتہ کے مساوی ہوگا اور بقیہ تمام دن تمہارے ان عام دنوں کی طرح ہی ہونگے تو ہم نے عرض کی وہ دن جو ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس میں ایک دن کی نمازیں ہی ہمارے لیے کافی ہو جائیں گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ

اوقات کا اندازہ لگا لینا (یعنی ہر چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں ہوں گی۔ یہ طویل حدیث ہے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال ظاہر ہوگا تو اہل ایمان میں سے ایک آدمی اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اس سے دجال کے مسلح افراد کی ملاقات ہو جائے گی۔ وہ اس سے پوچھیں گے تو کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟ تو وہ جواب دے گا میں اسکے پاس جانے کا قصد کرتا ہوں جس نے خروج کیا ہے تو وہ مسلح افراد اسے کہیں گے کیا تو ہمارے رب کے ساتھ ایمان رکھتا ہے؟ تو وہ جواب میں کہے گا ہمارے رب سے کوئی شے مخفی نہیں ہے تو وہ کہیں گے اسے قتل کر دو۔ لیکن انھی میں سے کوئی کہے گا کہ تمہارے رب نے تمہیں اس سے منع کیا ہے کہ تم اس کی اجازت کے بغیر کسی کو قتل کرو۔ پس وہ اسے دجال کے پاس لے کر چلے جائیں گے تو جب بندہ مومن اسے دیکھے گا تو کہہ اٹھے گا اے لوگو! یہی وہ دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ سن کر دجال اسے توڑ دینے کا حکم دے گا اور کہے گا اسے پکڑ لو اور اسے پھاڑ ڈالو۔ چنانچہ (نیزے اور تلواریں مار مار کر) اس کی پیٹھ اور پیٹ کو پھاڑ دیا جائیگا۔ پھر وہ دجال اس سے پوچھے گا کیا تو اب بھی میرے ساتھ ایمان نہیں لائے گا؟ تو وہ بندہ مومن اسے جواب دے گا تو ہی مسیح دجال اور کذاب ہے تو اس وقت دجال کی طرف سے یہ حکم دیا جائیگا کہ اسے سر کی چوٹی سے لے کر ٹانگوں کے درمیان تک آری کے ساتھ دو حصوں میں چیر ڈالا جائے۔ پھر دجال اسکے دونوں ٹکڑوں کے پاس چل کر آئے گا اور کھڑے ہو کر کہے گا کھڑا ہو جا۔ چنانچہ وہ آدمی سیدھا کھڑا ہو جائیگا۔ پھر وہ دجال اس سے پوچھے گا کیا تو میرے ساتھ ایمان لے آئے گا؟ تو وہ بندہ مومن جواب دے گا تیرے بارے میں میری بصیرت تو بڑھ گئی ہے۔ پھر وہ بندہ مومن کہے گا اے لوگو! میرے بعد یہ کسی سے بھی ایسا نہیں کر سکے گا۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال اسے ذبح کرنے کیلئے پھر پکڑ لے گا لیکن اللہ تعالیٰ اس کی گردن کی جڑ سے لیکر ہنسلی تک ساری گردن کو تانبا بنا دے گا۔ پس وہ اسے ذبح کرنے میں قطعاً کامیاب نہیں ہوگا۔ پھر وہ اسکے ہاتھ اور پاؤں پکڑ کر اسے آگ میں پھینک دے گا۔ لوگ یہ گمان کر رہے ہونگے کہ دجال نے اسے آگ میں پھینک دیا ہے حالانکہ فی الحقیقت جنت میں پہنچا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رب العالمین کے نزدیک یہ آدمی سب سے عظیم اور بڑا شہید ہوگا اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصفہا کے یہودیوں سے ستر ہزار افراد دجال کی اتباع اور پیروی کریں گے۔ وہ اپنے اوپر شاہانہ قیمتی چادریں اوڑھے ہوں گے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال آئے گا مگر مدینہ طیبہ کی گھاٹیوں میں داخل ہونا اس پر حرام کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ مدینہ طیبہ سے ملحقہ ریگستانی شوریلے علاقے میں اترے گا۔ پس لوگوں میں سے سب سے اچھا یا ایک بہترین انسان اس کی طرف نکل کر جائے گا تو وہ جا کر اسے کہے گا کہ میں شہادت دیتا ہوں تو وہی دجال ہے جس کے بارے میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ فرمایا ہے۔ دجال کہے گا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں اسے قتل کر کے پھر اسے زندہ کر دوں تو کیا تم میرے معاملے میں کوئی شک کرو گے؟ لوگ کہیں گے ہرگز نہیں۔ چنانچہ وہ اسے قتل کر دے گا اور پھر زندہ کر دے گا تو عبد صالح اس وقت پکار اٹھے گا قسم بخدا! مجھے تیرے بارے میں آج سے بڑھ کر کبھی بھی بصیرت حاصل نہیں ہوئی۔ پس دجال یہ سن کر

حضرت ابوبکرہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسیح دجال کا رعب مدینہ طیبہ میں داخل نہیں ہوگا۔ اس وقت مدینہ طیبہ کے سات دروازے ہونگے اور ہر دروازے پر دو فرشتے مقرر ہونگے۔ متفق علیہ (1) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ارشاد فرمایا دجال سرزمین مشرق سے ظاہر ہوگا جسے خراسان کہا جاتا ہے، اس کے پیچھے کئی اقوام ہوں گی جن کے چہرے کوٹی ہوئی (چپٹی) ڈھالوں کی مثل ہونگے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت اسماء بنت یزید بن سکن رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال زمین پر چالیس سال تک ٹھہرا رہے گا۔ اس کا ایک سال (اپنے مختصر اور بے برکت ہونے کے سبب) ایک مہینہ کی مثل ہوگا اور ایک مہینہ ایک ہفتہ کی مثل ہوگا اور ایک ہفتہ ایک دن کی مانند ہوگا اور ایک دن کھجور کی ایک ٹہنی کے آگ میں گر کر جل جانے کی مثل ہوگا (یعنی جتنا قلیل وقت اس ٹہنی کے جلنے میں لگتا ہے اتنے قلیل وقت کا ایک دن ہوگا) اسے علامہ بغوی نے شرح السنۃ اور معالم میں بیان کیا ہے (3)۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے ستر ہزار افراد دجال کی اتباع کریں گے اور وہ تاج پہنے ہوئے ہونگے (اس ارشاد میں شاید امت سے مراد امت دعوت ہے) اسے علامہ بغوی نے شرح السنۃ اور معالم میں ذکر کیا ہے۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس وقت دجال کی اتباع کرنے والے ستر ہزار یہودی ہونگے جو تاج پہنے ہوئے اور تلواریں سجائے ہوئے ہونگے۔ رواہ البغوی (4)۔

حضرت اسماء بنت یزید الانصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں جلوہ افروز تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا بیشک اس کے سامنے تین سال ایسے آئیں گے کہ ایک سال میں آسمان اپنی بارش کا تیسرا حصہ روک لے گا اور زمین نباتات کا تیسرا حصہ روک لے گی (یعنی اس میں سبزہ تیسرا حصہ کم اگے گا) دوسرے سال آسمان دو تہائی بارش کو روک لے گا اور زمین دو تہائی نباتات روک لے گی اور تیسرے سال آسمان مکمل طور پر بارش کو روک لے گا اور زمین مکمل طور پر نباتات کو روک لے گی (یعنی زمین سے کوئی شے نہیں اگے گی) اور ہر طرف قحط سالی پھیل جائے گی۔ نتیجۃً کوئی کھروں اور ڈاڑھوں والا جانور باقی نہیں رہے گا وہ تمام ہلاک ہو جائیں گے اور دجال کے فتنوں میں سے شدید ترین فتنہ یہ ہوگا کہ وہ ایک اعرابی کے پاس آ کر کہے گا تیرا کیا خیال ہے کہ اگر میں تیرے لیے تیرے اونٹوں کو زندہ کروں تو تو یقین نہیں کرے گا کہ میں تیرا رب ہوں؟ وہ جواب دے گا کہ کیوں نہیں۔ پس دجال شیطانوں کو اونٹوں کی شکلوں میں اس کے سامنے کر دے گا۔ جن کے تھن انتہائی حسین اور کوہانیں بڑی بڑی ہوں گی۔ مزید فرمایا ایک ایسا آدمی آئے گا جس کا بھائی اور باپ مر چکے ہونگے تو دجال اس سے کہے گا تیرا کیا خیال ہے اگر میں تیرے بھائی اور باپ کو زندہ کر دوں تو تو مجھے اپنا رب تسلیم کر لے گا؟ تو وہ آدمی جواب دے گا کیوں نہیں۔ پس وہ شیطانوں کو اس کے بھائی اور باپ کی شکل میں اسکے سامنے کر دے گا۔ آپ فرماتی ہیں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام کی غرض سے باہر تشریف لے گئے۔ پھر واپس تشریف لائے تو جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے متعلق بتایا تھا اس کے سبب قوم انتہائی غم واندوہ میں مبتلا ہوگئی۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے دروازے کے دونوں بازو پکڑ کر ارشاد فرمایا

اے اسماء! کیا بات ہے کیوں پریشان ہیں؟ تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم دجال کا ذکر سن کر ہمارے دل باہر نکلے جا رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری ظاہری حیات میں اس کا خروج ہوا تو میں اسکا مقابلہ کروں گا ورنہ میری جگہ ہر مومن کا نگہبان میرا رب ہوگا تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بیشک ہم آٹا گوندھتے ہیں اور ابھی اس کی روٹیاں پکانے نہیں پاتے کہ بھوکے ہو جاتے ہیں تو اس دن مومنوں کا حال کیا ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تسبیح خداوندی ان کے لیے بھی کافی ہوگی جو اہل آسمان کیلئے کافی ہوتی ہے (1)۔ رواہ احمد والبغوی فی العالم۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھ سے بڑھ کر کسی نے بھی دجال کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال نہیں کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا۔ وہ مجھے کوئی نقصان اور ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔ میں نے عرض کی لوگ کہتے ہیں کہ روٹی کا پہاڑ اور پانی کا دریا اس کے ساتھ ساتھ ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ پر اس کی نسبت بہت آسان ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ یہ چیزیں رکھنے کی ضرورت ہی نہیں) متفق علیہ (2) جب اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں ارشاد فرمایا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے) تو آگے آنے والی آیت میں اس پر متنبہ کیا کہ جاہل اندھے کی طرح ہوتا ہے اور عالم صاحب بصارت (دیکھنے والے) کی طرح ہوتا ہے۔

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الْمُسِيْٓءُ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۵۸ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۹

''اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا۔ اور (اسی طرح) مومن نیکوکار اور بدکار یکساں نہیں۔ تم بہت کم غور کرتے ہو[1] یقیناً قیامت آکر رہے گی ذرا شک نہیں ہے اس میں لیکن بہت سے لوگ (قیامت پر) ایمان نہیں لاتے[2]''

[1] جاہل اور عالم، نیکوکار اور بدکار یکساں نہیں ہیں۔ اسی لئے ان کیلئے ایک ایسے محل کا ہونا ضروری ہے جس میں ان کے درمیان تفاوت اور فرق ظاہر ہو۔ دنیا میں تو ان کے مابین کوئی تفاوت محسوس نہیں ہوتا البتہ مرنے کے بعد اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد وہ فرق ضرور ظاہر ہوگا، وَلَا الْمُسِيْٓءُ میں لا زائد ہے۔ کیونکہ مقصود نیکوکار سے اسکی مساوات کی نفی ہے۔ کیونکہ اس کیلئے تو ثواب اور عزت وکرامت ہوگی۔ اور دوسرے حرف عطف کے بعد اسم موصول (الذین) اپنے معطوفات سے مل کر الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ پر معطوف ہے اور عطف سے مقصود دونوں وصفوں میں تغایر پائے جانے کا اظہار ہے۔ یا صراحۃ اور تمثیلاً دو متغایر وصفوں پر دلالت کرنا ہے۔

تم بہت کم غور کرتے ہو۔ اس میں یا تو قلیلا، تذکرا کی صفت ہے۔ یعنی تذکر قلیلا، یا قلیلا زمانا کی صفت ہے یعنی زمانا قلیلا تم تھوڑی دیر کیلئے سمجھتے ہو۔ تتذکرون کو کوفیوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے یا تو مخاطب کو غلبہ دیتے ہوئے یا طریقہ التفات پر یا خطاب کے سبب رسول علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے اور باقیوں نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ آیات کی ابتدا اور آخر

کے آنے میں ذرا شک نہیں کیونکہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور اس کا خلاف ہونا محال اور ناممکن ہے لیکن بہت سے لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے اور اپنی غفلت، بدبختی اور محسوسات میں کم غور و فکر کرنے کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی تصدیق نہیں کرتے اور اسے سچا تسلیم نہیں کرتے۔

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾

''اور تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بیشک جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہونگے ذلیل و خوار ہو کر [1]۔''

[1] ادعونی میں یاء کو ابن کثیر نے مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ تم میری ہی عبادت کرو میرے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو۔ چونکہ عبادت کو دعا سے تعبیر کیا گیا ہے اسی لیے استجیبکم کے محل میں استجب لکم فرمایا۔ (یعنی میں تمہیں ثواب دوں گا کی بجائے فرمایا میں تمہاری دعا قبول کروں گا) اور اس بات پر قرینہ کہ دعا سے مراد عبادت ہے اور قبول کرنے سے مراد ثواب دینا ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ۔ یعنی جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہونگے۔

ابن کثیر، ابو جعفر اور ابو بکر نے سَیَدْخُلُوْنَ یاء کو ضمہ کے ساتھ اور خاء کو فتحہ کے ساتھ صیغہ مجہول کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء اور خاء دونوں کو ضمہ کے ساتھ صیغہ معروف کی صورت میں پڑھا ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ دعا اور عبادت دونوں سے مراد سوال ہے۔ کیونکہ بندہ ہر شے مانگنے اور اس کے بارے سوال کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہوتا ہے اور کسی بھی شے کیلئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف توجہ نہ کرنا ہی کمال عبودیت ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کو بے نیاز تسلیم کرنے اور اپنے آپ کو اس کا محتاج قرار دینے کا اظہار ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے بعض لوگ اپنی تمام تر حاجات و ضروریات کے متعلق اپنے رب سے سوال کرتے ہیں حتیٰ کہ جب ان کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کا سوال بھی اپنے رب ہی سے کرتے ہیں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔ اور حضرت ثابت بنانی کی مرسل روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں یہاں تک کہ وہ نمک کا سوال بھی اپنے رب سے کرتے ہیں اور جب کسی کے جوتے کا تسمہ کٹ جائے تو وہ بھی اپنے رب سے ہی مانگتے ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دعا ہی عبادت ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت طیبہ پڑھی ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ (2) اسے احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اپنی مسانید میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں، حاکم نے مستدرک میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت نعمان بن بشیر سے بھی حدیث نقل کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا [illegible]

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی ان الدعا هو العبادة میں ھو ضمیر فصل ہے اور اعبادۃ خبر معرف باللام ہے تو اس قسم کی ترتیب کلام میں مسند (خبر) کو مسند الیہ (مبتدا) میں محصور کرنا مقصود ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے ان اللّٰه هو الرزاق یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رزاق نہیں اور کبھی مسند الیہ کو مسند پر محصور کرنے کا قصد بھی کیا جاتا ہے جیسا کہ اس قول میں ہے الکرم هو التقوی و الحسب هو الایمان یعنی تقویٰ ہی عزت ہے اس کے سوا کوئی عزت نہیں۔ ایمان ہی نسب ہے اس کے سوا کوئی نسب نہیں مذکورہ حدیث میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں اور یہاں حصر اظہار مبالغ کیلئے ہے۔ شاید اس سے مراد یہ ہے کہ دعا اور عبادت ذات کے اعتبار سے دونوں متحد ہیں اور مفہوم و اعتبار کے لحاظ سے دونوں مختلف ہیں کیونکہ ہر دعا اور سوال عبادت اور طاعت ہے کیونکہ سوال میں عاجزی اور احتیاج کا اظہار ہوتا ہے اور لغت میں عبودیت کا معنی ہے اظہار التذلل و الا فتقار یعنی عاجزی اور احتیاج کا اظہار کرنا اور عبادت میں یہ معنی زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ اس کا معنی ہوتا ہے غایت التذلل۔ یعنی حد درجہ عاجزی و انکساری کا اظہار کرنا عبادت کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی اس کا استحقاق نہیں رکھتا جیسا کہ ارشاد خداوند تعالیٰ ہے۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ اور ہر عبادت و طاعت سوال ہی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کی عرفات میں اکثر یہ دعا تھی لاالہ الااللّٰہ وحدہ لاشریک له له الملک وله الحمد وهو علی کل شیءٍ قدیر (1)۔ اسے ابن ابی شیبہ نے مصنف میں نقل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝۔

علامہ جزری نے نہایہ میں کہا ہے کہ تہلیل و تحمید کو دعا کا نام دیا گیا ہے اس لئے کہ تہلیل (لا الہ الا اللہ) اور تحمید (الحمد للہ کہنا) یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ثواب و جزاء پانے میں دعا کی مثل ہیں (یعنی جس طرح دعا سے اجر و ثواب ملتا ہے اس طرح تہلیل و تحمید سے بھی اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے) جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب میرے بندے کو میری حمد و ثناء کسی شے کے بارے مجھ سے کچھ سوال کرنے اور کچھ مانگنے سے مشغول رکھتی ہے تو میں اسے ان کی نسبت زیادہ دیتا ہوں جتنا سوال کرنے والوں کو دیتا ہوں۔ ترمذی اور مسلم میں حدیث موجود ہے کہ جسے قرآن کریم (کی تلاوت) نے میرے ذکر اور مجھ سے کسی شے کا سوال کرنے سے مشغول رکھا میں اسے مانگنے والوں کی نسبت زیادہ عطا کرتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے جسے قرآن (کی تلاوت) اور میرا ذکر مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھتا ہے الحدیث (2)۔ (میں اسے مانگنے والوں کی نسبت زیادہ دیتا ہوں) جاننا چاہئے بعض مقامات پر دعا فرض ہے۔ مثلاً نماز کے دوران سورۂ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝۔ یا سنت مؤکدہ ہوتی ہے۔ مثلاً آخری قعدہ میں دعا کرنا اور مقامات حج میں دعائیں کرنا وغیرہ۔

بعض دعائیں حرام یا مکروہ ہوتی ہیں۔ مثلاً صرف لذات دنیا کے بارے سوال کرنا، کسی امر معصیت (گناہ) کیلئے دعا مانگنا اور ایسی شے کے بارے سوال کرنا جو کہ محال ہو۔ یا محال کے معنی میں ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا بعض لوگ یہ دعا مانگتے ہیں ربنا اتنا فی الدنیا۔ (اے ہمارے رب ہمیں دنیا عطا فرمایا) تو ایسی دعا کرنے والوں کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (اور تم اس کی آرزو اور خواہش نہ کرو جو اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے)

زاہدوں کے ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ دعا نہ کرنا اور کچھ نہ مانگنا افضل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور رضا بالقضاء کا اظہار زیادہ ہوتا ہے۔

اور کیا گروہ نے یہ کہا ہے کہ اگر مسلمانوں کیلئے کرے تو پھر اچھا ہے اور اگر صرف اپنے لئے ہی دعا کرے تو یہ اچھا نہیں۔ ہمارا موقف کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سے ثابت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر کوئی شے بھی قابل تکریم نہیں (1)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ علاوہ ازیں ابن ماجہ اور حاکم نے بھی بیان کیا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔ اسے ترمذی نے بیان کیا (2)۔ حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے اسکے فضل کے بارے سوال کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتا ہے کہ اس سے کچھ سوال کیا جائے اور افضل ترین عبادت کشائش کا انتظار ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے (3)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو کوئی اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر غضب اور ناراضگی کا اظہار فرماتا ہے (4)۔ اسے ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔

ان احادیث سے مقصود یہ ہے کہ جو کوئی تکبر اور غرور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کچھ نہیں مانگتا تو اللہ تعالیٰ اس پر غضب و ناراضگی کا اظہار فرماتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا کرنے میں عجز (ضعف اور کمزوری) کا اظہار نہ کرو کیونکہ دعا کے ہوتے ہوئے کوئی بھی ہرگز ہلاک نہیں ہوگا (5)۔ اسے ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دعا مومن کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون ہے اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اسے حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے (6)۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے جس کیلئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا اس کیلئے رحمت کے دروازے کھول دیئے گئے اور جس چیز کے بارے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جاتا ہے ان میں اس کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ اس سے عافیت کے بارے سوال کیا جائے (7)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے مستدرک میں اسے بیان کیا ہے اس میں الفاظ اس طرح ہیں کہ اس کیلئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

فصل:۔ یہ فصل اس بیان میں ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے اس کیلئے قبولیت دعا کا وعدہ ہے۔ حضرت ابن عمرو روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جس کیلئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس کیلئے قبولیت کے دروازے کھول دیئے گئے (8)۔ اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سلمانؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 197 (فاروقی)

بیشک تمہارا رب بڑے حیاء والا اور بڑا کریم وسخی ہے۔ اسے اپنے بندے سے حیاء آتی ہے کہ جب بندہ اس کی بارگاہ میں اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو وہ انہیں خالی واپس لوٹا دے(1)۔ اسے ترمذی، ابوداؤد اور بیہقی نے الدعوات الکبیر میں روایت کیا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بھی کوئی مسلمان اپنے رب سے دعا مانگتا ہے درآنحالیکہ نہ اس میں گناہ ہو اور اس میں کوئی قطع تعلقی ہو تو اللہ تعالیٰ تین چیزوں میں سے ایک اسے ضرور عطا فرما دیتا ہے۔ یا تو اس کی دعا جلدی پوری فرما دیتا ہے۔ یا اسے آخرت میں اس کیلئے ذخیرہ کر دیتا ہے۔ یا پھر اس دعا کی مثل اس سے کسی برائی اور شر کو دور فرما دیتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنی زیادہ دعائیں ہم کیوں نہ کریں (تب بھی ہمارے لئے یہ معاوضہ ہوگا؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے پاس سب سے زیادہ ہے اور ضرور عطا فرمائے گا(2)۔ اسے احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بندے کی دعا قبول کر لی جاتی ہے جبکہ وہ گناہ اور قطع تعلقی کے بارے نہ ہو اور بندہ جلدی کا خواہشمند نہ ہو۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عجلت پسندی کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ بندہ کہتا ہے میں نے دعا کی میں نے دعا کی بار بار دعا کی لیکن مجھے اس کی قبولیت کے آثار نہیں دکھائی دیئے۔ پس اس وقت وہ تھک جاتا ہے اور دعا مانگنا چھوڑ دیتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دعا (ان مصائب کو دور کرنے میں) نفع بخش ثابت ہوتی ہے جو دعا سے قبل نازل ہو چکی ہوتی ہیں اور ان کے بارے بھی جو ابھی نازل نہیں ہو چکی ہوتیں (بلکہ بعد میں امکان ہوتا ہے) پس اے اللہ تعالیٰ کے بندو! تم پر لازم ہے کہ دعا مانگو(4)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے ورواہ احمد عن معاذ بن جبل اور ترمذی نے حضرت جابرؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہی عطا فرما دیتا ہے جو وہ مانگتا ہے یا وہ اس کی مثل برائی اور شر اس سے دور فرما دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ گناہ اور قطع تعلقی کے بارے دعا نہ کرے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(5)۔

فصل:۔ یہ فصل ان کے بیان میں ہے جن کی دعا رد نہیں کی جاتی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین (آدمیوں کی) دعائیں مقبول ہوتی ہیں ان کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ والد کی دعا، مسافر کی دعا اور مظلوم کی دعا(6)۔ اسے ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمی ہیں جن کی دعا رد نہیں کی جاتی ایک روزے دار کی دعا، جبکہ وہ روزہ افطار کرتا ہے۔ دوسرا عادل حکمران کی دعا اور تیسرا مظلوم کی دعا۔ مظلوم کی بددعا بادلوں سے اوپر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بلند ہو جاتی ہے اس کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور رب کریم فرماتا ہے مجھے اپنی عزت کی قسم! میں ضرور بہ ضرور تیری مدد کروں گا اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہی ہو۔ رواہ الترمذی(7)۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان آدمی کی اپنے مسلمان بھائی کی عدم

موجودگی میں اس کیلئے دعا مقبول ہوتی ہے۔ جب بھی وہ اپنے بھائی کیلئے بھلائی اور خیر کی دعا کرتا ہے تو اس کے سر کے پاس موجود مقرر فرشتہ اس دعا پر کہتا ہے امین ولک بمثلہ (یعنی تیرے بھائی کے حق میں بھی یہ دعا قبول ہو اور تیرے حق میں بھی یہی قبول ہو جائے) اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا پانچ آدمیوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ ایک مظلوم کی دعا' یہاں تک کہ وہ غالب آ جائے۔ حاجی کی دعا یہاں تک کہ واپس آ جائے۔ مریض کی دعا یہاں تک کہ شفایاب ہو جائے۔ ایک بھائی کی دوسرے مسلمان بھائی کیلئے اس کی عدم موجودگی میں دعا۔ پھر فرمایا تمام دعاؤں کی نسبت زیادہ تیزی اور جلدی کے ساتھ قبول ہونے والی یہی بھائی کی دعا ہے جو وہ دوسرے بھائی کیلئے اس کی عدم موجودگی میں کرتا ہے(2)۔ اسے بیہقی نے دعوت الکبیر میں نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سب سے زیادہ تیزی اور جلدی کے ساتھ قبول ہونے والی دعا ایک بھائی کی دوسرے غائب بھائی کیلئے کی جانے والی دعا ہے(3)۔ اسے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

فصل:۔ یہ فصل دعا کی قبولیت کی شرائط کے بیان میں ہے 1۔ اس میں بنیادی چیز کھانے' پینے اور لباس میں حرام چیزوں سے اجتناب کرنا ہے جو کہ انسان کا کھانا' پینا اور لباس حلال' طیب اور طاہر ہو۔)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک ایک آدمی طویل سفر کرتا ہے۔ اس کے بال پراگندہ ہوتے ہیں (جسم) غبار آلود ہوتا ہے وہ آسمان کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے یارب یارب اے میرے رب' اے میرے پروردگار حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے' اس کا پینا حرام ہے' اس کا لباس حرام ہے اور حرام سے ہی اس نے پرورش پائی ہے تو اس کی دعا کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔

2- دعا کے وقت حضور قلب بھی شرط ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو درآنحالیکہ تمہیں اس کی قبولیت کا یقین ہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل دل سے مانگی جانے والی دعا قبول نہیں فرماتا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے(5)۔

3- تیسری شرط یہ ہے کہ دعا خوب عزم اور کوشش کے ساتھ کی جائے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو یہ نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے۔ بلکہ پورے عزم کے ساتھ اور انتہائی رغبت کے ساتھ دعا مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے جو عطا فرماتا ہے وہ چیز اس کے نزدیک کوئی بڑی نہیں ہوتی۔ رواہ مسلم(6)۔

فصل:۔ یہ فصل دعا کے آداب اور سنن کے بیان میں ہے۔

حضرت فضالہ بن عبیدؓ بیان فرماتے ہیں کہ اس اثناء میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسجد میں) تشریف فرما تھے۔ اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے نماز ادا کی۔ اور یہ دعا مانگی اے اللہ! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا اے نمازی! تو نے جلدی کی ہے۔ جب تو نماز پڑھ چکے اور بیٹھ جائے تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح حمد وثناء بیان کر جس کے وہ اہل ہے اور مجھ پر درود پاک پڑھ پھر دعا مانگ۔ راوی فرماتے ہیں پھر اس کے بعد ایک دوسرا آدمی آیا۔ پس اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان

کی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا اے نمازی اب دعا مانگ۔ تیری دعا قبول کی جائے گی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ اسی طرح سے ابوداؤد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا (اس حال میں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اعظمؓ بھی تشریف فرما تھے۔ پس جب نماز پڑھ کر بیٹھ گیا۔ تو میں نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھا پھر اپنے لئے دعا کی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اب مانگ تجھے عطا کیا جائے گا۔ رواہ الترمذی(2)۔ حضرت عمر بن خطابؓ کا بیان ہے آپ فرماتے ہیں کہ دعا زمین وآسمان کے درمیان ہی موقوف ہو جاتی ہے۔ اس میں سے کوئی شے بھی اوپر نہیں چڑھتی جب تک کہ تو اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھ لے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(3)۔

حضرت مالک بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو، دعا مانگو تو اپنی ہتھیلیوں کو پھیلا کر دعا مانگو۔ اپنی ہتھیلیوں کی پشتیں ظاہر کر کے نہ مانگو(4) اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے۔ سَلُو اللّٰهَ بِبُطُوْنِ اَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْئَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا فَاِذَا فَرَغْتُمْ فَامْسَحُوْا بِهَا وُجُوْهَكُمْ۔ اپنی ہتھیلیوں کے باطن (یعنی اندرونی حصہ) کو پھیلا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ اپنی ہتھیلیوں کے پشتوں کے سبب کچھ نہ مانگو اور جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ اپنے چہروں پر پھیر لو۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(5)۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے ہاتھ دعا کیلئے بلند کرتے تھے تو انہیں اپنے چہرہ مقدس پر پھیرے بغیر نیچے نہیں رکھتے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(6)۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیلئے جامع الفاظ پسند فرماتے تھے اور اس کے علاوہ دیگر الفاظ چھوڑ دیتے تھے۔ رواہ ابوداؤد(7)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے وقت اپنے ہاتھ اتنے بلند فرماتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دینے لگتی تھی(8)۔

حضرت سائب بن یزید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا فرماتے تو اپنے دست مبارک کو بلند کرتے تھے پھر اپنے ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرتے تھے(9)۔ اسے بیہقی نے الدعوات الکبیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا دعا کا طریقہ یہ ہے کہ تو اپنے ہاتھ اپنے کندھوں یا ان کے قریب تک بلند کرے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(10)۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ تمہارا ہاتھوں کو بلند کرنا بدعت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے (سینے سے) زیادہ اپنے دست مبارک بلند نہیں کئے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے(11)۔

حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا ذکر کرتے اور اس کیلئے دعا مانگتے تو دعا کا آغاز اپنے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 186 (فاروقی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 76 (فاروقی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 64 (فاروقی)

آپ سے فرماتے تھے۔اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن، غریب، صحیح ہے(1)۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ النَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۶۲﴾ کَذٰلِکَ یُؤۡفَکُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۶۳﴾

"اللہ ہی ہے جس نے بنائی ہے تمہارے لئے رات تا کہ تم آرام کرو اس میں اور (بنایا ہے) دن کو روشن۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑا فضل (وکرم) فرمانے والا ہے لوگوں پر لیکن بہت سے لوگ (اس کی نعمتوں کا) شکرادا نہیں کرتے۔1 وہ ہے اللہ تمہارا رب پیدا کرنے والا ہر چیز کا۔کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے۔پس کیسے راہ حق سے تم روگردانی کرتے ہو۔اسی طرح (راہ حق سے) منہ پھیر دیا جاتا ہے ان (بدنصیبوں) کا جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں 2"

1۔ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ تا کہ تم رات کے وقت نیند کے سبب راحت وسکون حاصل کرو اور النَّہَارَ مُبۡصِرًا کا معنی ہے دن کو روشن بنایا۔یعنی دن کے وقت ہر جانب دیکھا جا سکتا ہے (رات کے اندھیرے اور تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں) ابصار کی نسبت دن کی طرف مجازی ہے اور مبالغہ کیلئے ہے۔اسی لئے علت بیان کرتے وقت اس سے عدول کیا گیا اور فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ بیشک اللہ تعالیٰ بہت فضل وکرم فرمانے والا ہے۔

لَا یَشۡکُرُوۡنَ لیکن اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکرادا نہیں کرتے اس لئے کہ وہ منعم حقیقی کی معرفت سے جاہل ہیں اور وہ نعمتوں کی اہمیت اور مواقع اور اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کی عظمت سے غافل ہیں اور الناس کا لفظ دوبارہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ کفران نعمت انہی کے ساتھ مختص ہے۔یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو کفران نعمت کرتے ہیں اور شکر بجا نہیں لاتے جیسا کہ اس ارشاد میں بھی ہے اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ ﴿۳۴﴾۔

ترکیب کلام میں جملہ اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمۡ قول باری تعالیٰ هو الذی یریکم ایاته کے ساتھ متصل ہے۔اسم جلالت لفظ اللہ مبتدا ہے اور الذی اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر اس کی خبر ہے۔یا اسم جلالت خبر مبتدا محذوف کی ہے اور اسم موصول اسم جلالت کی صفت ہے۔

2۔ ذلکم ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے مابعد کلام خبر ہے۔وہ ذات جس کے ساتھ وہ تمام افعال خاص ہیں جو الوہیت وربوبیت کا تقاضا کرتے ہیں۔وہی اللہ ہے اس کے سوا اور کوئی تمہارا رب نہیں۔وہی ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے چاہے وہ جواہر ہوں یا اعراض اور بندوں کے افعال۔اس کے سوا کوئی بھی عبادت کا مستحق نہیں۔کیونکہ اس کے سوا کوئی اور ذات ایسا نہیں جو ان صفات میں سے کسی سے متصف ہو جو اس کی الوہیت کا تقاضا کرتی ہوں اور مستوجب عبادت ہو۔پھر کیسے تم اللہ تعالیٰ کی عبادت سے دوسروں کی عبادت کی طرف روگردانی کرتے ہو۔یہ چاروں کی چاروں اخبار مترادفہ ہیں۔جیسے کفار مکہ کا منہ پھیر دیا گیا اسی طرح راہ حق سے ان بدنصیبوں کا منہ پھیر دیا جاتا ہے جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لئے زمین کو قیام کی جگہ اور آسمان کو چھت (کی مانند) اور تمہاری صورت گری کی اور حسین بنادیا تمہاری صورتوں کو اور کھانے کیلئے تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں۔ ایسی (خوبیوں والا) اللہ تمہارا پروردگار ہے۔ پس بڑی ہی برکتوں والا ہے اللہ تعالیٰ جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے [1] وہی ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے پس اس کی عبادت کرو اپنے دین کو اس کیلئے خالص کرتے ہوئے۔ سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے [2]''

[1] قرارا کا معنی ہے مستقر ٹھہرنے کی جگہ۔ قرارگاہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو قرارگاہ بنایا ہے اور آسمان کو تمہارے اوپر چھت بنایا ہے۔ یہ دوسرا استدلال ہے ایسے افعال کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں اور اے لوگو! اس نے تمہاری صورت گری کی اور تمہاری صورتوں کو حسین بنایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری تخلیق فرمائی کہ تمہارے قد سیدھے اور موزوں ہیں۔ جلد صاف ہے اعضاء متناسب ہیں اور انہیں صنعت و کاریگری کے حصول اور کمالات کے اکتساب کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ابن آدم کو سیدھا اور معتدل پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا لیتا اور پکڑتا ہے اور دوسرے اپنے منہ سے کھانا پکڑتے ہیں (1)۔

اور اس نے تمہیں کھانے کیلئے پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں۔ یعنی طرح طرح کے لذیذ کھانے عطا فرمائے۔ ترکیب کلام میں اسم جلالت لفظ اللہ مبتدا ہے اور اسم موصول اسکی خبر ہے۔ یا وہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور وہ ھو ہے اور اسم موصول اس کی صفت ہے اور یہ جملہ سابقہ جملہ کی تقریر و تائید کیلئے ہے۔

ایسی خوبیوں والا اللہ تمہارا پروردگار ہے۔ پس بڑی ہی برکتوں والا ہے اللہ تعالیٰ جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ کیونکہ اس کے سوا ہر شے اسی کی پروردہ ہے۔ بالذات اسی کی محتاج ہے اور زوال پذیر ہے۔

[2] وہی ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ یعنی وہ اپنی اس حیات ذاتیہ میں منفرد اور یکتا ہے جو اس کی ذات اور وجود (کے واجب ہونے کا) تقاضا کرتی ہے۔ اگرچہ وجوب اور وجود دونوں اس کی صفات کمال ہیں لیکن یہ دونوں اس کی ذات کا پرتو ہیں (جیسا کہ دیگر صفات اس کی ذات کا پرتو ہیں)

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ هُوَ مبتدا کی دوسری خبر ہے۔ یعنی عبادت کے مستحق وہی ہوتا ہے جس کی یہ شان ہو اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شے بھی اس طرح نہیں۔ پس تم اس کی عبادت کرو اور اس سے اپنی حاجات کے بارے سوال کیا کرو۔ فادعوہ میں فاسببیہ ہے۔ کیونکہ جو صفات اوپر ذکر کی گئی ہیں وہی عبادت کا موجب ہیں۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کا معنی ہے دین اور اطاعت و عبادت کو شرک اور ریاکاری سے پاک کرتے ہوئے اور خالص اللہ تعالیٰ کے لئے

بعض نے کہا ہے کہ الحمد للہ الخ سے پہلے قائلین محذوف ہے۔ یعنی یہ جملہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ فراء نے کہا ہے کہ یہ جملہ خبر ہے اور اس میں او مضمر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فادعوہ وقولوا الحمد للّٰہ رب العالمین۔ (پس اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ(1)۔

مجاہد نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ جو آدمی یہ کہے لا الہ الا اللہ تو اسے چاہئے کہ اس کے بعد یہ کہے الحمد للہ رب العالمین۔ پس یہی مفہوم رب کریم کے اس ارشاد کا ہے۔ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ(2)۔ و اللّٰہ علم۔

جو یبر نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ اور شیبہ بن ربیعہ نے کہا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس سے رجوع کر لیں اور اپنے آباؤ اجداد کے دین پر کار بند ہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(3)۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ٘ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۶۸﴾

"آپ فرما دیجئے کہ مجھے منع کر دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں ان کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا (میں ان کی عبادت کیسے کر سکتا ہوں) جب آ گئی ہیں میرے پاس دلیلیں اپنے رب کی طرف سے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سر تسلیم خم کر دوں رب العالمین کے سامنے[1] اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پھر گوشت کے لوتھڑے سے پھر نکالا تمہیں (شکم مادر سے) بچہ بنا کر پھر (پرورش کی تمہاری) تا کہ تم پہنچو اپنی جوانی کو پھر (تمہیں زندہ رکھا) تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ[2] اور بعض تم میں سے فوت ہو جاتے ہیں پہلے ہی اور (یہ سارا نظام اس لئے ہے) کہ تم پہنچ جاؤ مقررہ میعاد تک اور تا کہ تم (اپنے رب کی عظمتوں کو) سمجھنے لگ جاؤ[3] وہی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ پس جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو صرف اتنا فرماتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے[4]۔"

[1] لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ۔ جبکہ میرے پاس اپنے رب کی طرف سے ایسی دلیلیں اور نشانیاں آ گئی ہیں جو ادلہ عقلیہ کے سبب قوی اور مضبوط ہیں اور وہ غیر اللہ کی عبادت کرنے سے روکتی ہیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں یعنی اسی کی اطاعت کروں اور اپنے دین کو اسی کیلئے خالص کر دوں۔

[2] طفلاً اطفال جمع کے معنی میں ہے اور مفرد ذکر کر کے مراد جنس لی گئی ہے۔ یا پھر تاویل عبارت اس طرح ہے۔ یخرج کل واحد منکم طفلاً۔ (پھر تم جس سے ہر ایک کو شکم مادر سے بچہ بنا کر نکالا۔ لتبلغوا فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ثم یبقیکم لتبلغوا۔ (پھر تمہیں زندہ باقی رکھا تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ) اور ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا میں بھی اسی طرح ہے۔ اور اس

نافع، ابوعمرو، حفص اور ہشام نے شیو خا میں شین کو مضموم پڑھا ہے اور باقیوں نے شین کو مکسور پڑھا ہے۔

سے اور تم میں سے بعض بڑھاپے یا جوانی کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے تا کہ تم مقررہ میعاد تک پہنچ جاؤ۔ یعنی اس معین وقت تک پہنچ جاؤ جس سے آگے وہ تجاوز نہیں کر سکیں گے۔ اس سے مراد موت تک حیات دنیویہ کی مدت ہے اور تا کہ تم سمجھ لو ان دلائل قدرت اور نشانات عبرت کو جو اس میں موجود ہیں۔

سے فَاِذَا قَضٰی پس جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسے صرف اتنا فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ اسے اس کام کے کرنے کیلئے کسی نوع کی تکلیف اٹھانے کی حاجت محسوس نہیں ہوتی۔ فاذا میں فاء اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ یہ کلام سابقہ کلام کا نتیجہ ہے۔ اسطرح کہ وہ کلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ذاتی ہے وہ کسی ساز و سامان، مواد اور تعداد کی محتاج نہیں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ڕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ۝ فِي الْحَمِيْمِ ڏ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝

" کیا تم نہیں دیکھتے ان (نادانوں) کی طرف جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ کی آیات میں یہ کہاں بھٹک رہے ہیں لے۔ جن لوگوں نے جھٹلایا اس کتاب کو اور اس چیز کو بھی جو دے کر ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا ع انہیں (اپنی تکذیب کا انجام) معلوم ہو جائے گا۔ جب طوق ان کی گردنوں میں ہونگے اور زنجیریں، انہیں گھسیٹ کر لے جایا جائیگا کھولتے ہوئے پانی میں۔ پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے سے۔"

لے کیا تم ان نادانوں کی طرف نہیں دیکھتے جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں، یعنی یہ کہتے ہیں کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہیں یا پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے طریقہ کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اس آیت میں استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات اور تقریر ہوتا ہے اور اس میں اظہار تعجب مقصود ہے۔

اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ یہ کہاں بھٹک رہے ہیں یعنی یہ کیسے حق سے پھیر دیئے گئے ہیں۔ یہ استفہام زجر و توبیخ کیلئے ہے، جھگڑا کرنے والوں کا دوبارہ ذکر مجادلہ اور جھگڑے کی مذمت میں تاکید کیلئے کیا گیا ہے۔ یا پھر اس وجہ سے کہ جھگڑا کرنے والے یا وہ مسائل جن میں جھگڑا کیا جاتا ہے وہ متعدد ہیں (اسی لئے ذکر بھی متعدد بار کیا گیا)

محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ پہلے آیت مشرکین کے بارے میں تھی اور یہ آیت قدریہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

ع الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ الایہ جن لوگوں نے اس کتاب کو جھٹلایا اور ان شریعتوں کی تکذیب کی جو دے کر ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا۔ ترکیب کلام میں یہ آیت الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ سے بدل ہے۔ پس اگر اس سے مراد فرقہ قدریہ جو کہ اس امت کے مجوسی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ کتاب و سنت سے ثابت ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں مثلاً یہ ثابت شدہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ

اور جو ارادہ فرماتا ہے اسی کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اس پر کوئی شے واجب اور لازم نہیں ہے۔ وہ جو کرتا ہے اس کے بارے اس سے باز پرس نہیں کی جاسکتی حالانکہ دوسروں سے باز پرس کی جائے گی فرقہ قدریہ ان تمام چیزوں کی تکذیب کرتا ہے علاوہ ازیں وہ پل صراط، میزان اور شفاعت وغیرہ کے بھی منکر ہیں۔ ترکیبی اعتبار سے یہ بھی جائز ہے کہ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا مبتدا ہو اور اس میں شرط کا معنی ہو اور اس کی خبر فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ہو۔

۳۔ السَّلٰسِلُ مرفوع کا عطف الاغلال پر ہے یا پھر السَّلٰسِلُ مبتدا ہے اور اس کی خبر یسحبون ہے۔ یعنی جب طوق ان کی گردنوں میں ہونگے اور زنجیریں یا زنجیروں کے ساتھ انہیں کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹ کر لایا جائے گا۔ اس میں ضمیر عائد محذوف ہے اصل عبادت ہے يُسْحَبُوْنَ بھا۔ پہلی ترکیب کی صورت میں يُسْحَبُوْنَ حال ہے۔

ابن ابی حاتم نے ابوالجوزا کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے وا لسلسل کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور يُسْحَبُوْنَ کو صیغہ معروف کی صورت میں یاء کے فتحہ کے ساتھ یسحبون پڑھا ہے اور فرمایا ان پر شدید ترین اور انتہائی سخت تکلیف دہ حالت ہی ہوگی کہ وہ زنجیریں کھینچ رہے ہوں گے (1)۔

پھر انہیں دوزخ کی آگ میں جھونک دیا جائے گا، یعنی جلا دیا جائے گا یسجرون سجر التنور سے ماخوذ ہے یہ تب کیا جاتا ہے جب کوئی تنور کو ایندھن سے بھرے۔ مقاتل نے معنی یہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ آگ بھڑکائی جائے گی اور مجاہد نے کہا ہے وہ آگ کا ایندھن ہو جائیں گے (2) اور مراد یہ ہے کہ انہیں مختلف انواع کا عذاب دیا جائے گا لہٰذا بعض سے ایک نوع منقول ہے اور بعض سے دوسری کہ کبھی انہیں کھولتے ابلتے پانی میں ڈالا جائے گا اور کبھی آگ میں پھینکا جائے گا۔

ترمذی نے روایت بیان کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے، نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت یسجرون تک تلاوت فرمائی اور فرمایا در آنحالیکہ آپ نے اپنے سر کی کھوپڑی کی طرف اشارہ بھی کیا کہ اگر سیسے کا ایک گولہ آسمان سے زمین کی طرف چھوڑا جائے، جبکہ آسمان اور زمین کے مابین پانچ سو برس کی مسافت ہے تو وہ گولہ رات ہونے سے پہلے زمین پر پہنچ جائے گا (یعنی وہ اتنی طویل مسافت چند گھنٹوں میں طے کر لے گا) اور اگر دوزخ کی زنجیر کا سرا اوپر سے چھوڑ دیا جائے تو وہ دن رات چالیس سال تک چلتی رہے تب دوزخ کی تہ یا انتہائی گہرائی تک جا پہنچے گی (3) (یعنی دوزخ کی گہرائی زمین و آسمان کی درمیانی پائی جانے والی مسافت کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے۔)

ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾ اُدْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۶﴾

”پھر پوچھا جائے گا ان سے کہاں ہیں وہ جنہیں تم شریک ٹھہرایا کرتے تھے اللہ کے سوا [illegible]

رسوائی) بدلہ ہے اس کا کہ تم خوشیاں منایا کرتے تھے زمین میں (اپنے عارضی اقتدار پر) ناحق اور بدلہ ہے اس کا جو تم (اپنے فانی اموال واملاک پر) اترایا کرتے تھے ۲؎ اب داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں تم وہاں ہمیشہ رہنے والے ہو۔ پس یہ بہت برا ٹھکانا ہے تکبر وغرور کرنے والوں کا ۳؎"

۱؎ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد بت ہیں۔ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا کا معنی ہے۔ وہ ہم سے غائب ہو گئے ہیں پس ہم تو انہیں دیکھ ہی نہیں رہے۔ اپنے الھوں کے اپنے ساتھ ملنے سے پہلے پہلے وہ یہ بات کہیں گے یا پھر اس کا معنی یہ ہے وہ ہم سے ضائع ہو گئے پس ہم ان سے جو توقع رکھتے تھے وہ پوری نہیں ہوئی۔

بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا الخ اس کے بارے بعض نے کہا ہے کہ مشرکین نے یہ کہہ کر گویا شرک کرنے کا صاف انکار کر دیا۔ جب کہ ان کے اس قول میں ہے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (قسم بخدا! اے ہمارے رب! ہم شرک کرنے والے نہیں تھے) بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ ہم نے اس سے قبل کسی ایسی چیز کی عبادت نہیں کی جو ہمیں نہ نفع پہنچا سکتی یا نہ ہم سے کسی تکلیف کو دور کر سکتی۔ حسن بن فضل نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ اس سے پہلے ہم نے کچھ کیا ہی نہیں یعنی ہماری ساری عبادت ضائع ہو گئی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنا کام ضائع کر بیٹھے اور کہے ماکنت اعمل شیئا کہ میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں (1)۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس مشرکین کو یا اس فرقہ قدریہ کو گمراہ کر دیا اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام کافروں کو گمراہ کرتا ہے یہاں تک کہ ان کی ایسی شے کی طرف راہنمائی ہی نہیں کرتا جو ان کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔

۲؎ تمہیں گمراہ ہونے کی سزا اس لیے ملی کہ تم زمین میں خوشیاں منایا کرتے تھے، یعنی تم بغیر حق کے شرک کرتے ہوئے اور سرکش بن کر غرور اور تکبر کرتے تھے اور اکڑ کر چلا کرتے تھے اور یہ رسوائی اسی لئے حاصل ہوئی کہ تم زمین میں اظہار خوشی میں حدود سے تجاوز کرتے تھے اور اپنے فانی اموال واملاک پر اترایا کرتے تھے۔ زجر وتوبیخ میں مبالغہ کرنے کیلئے اس آیت میں خطاب کی طرف عدول کیا گیا ہے۔

۳؎ اب تم جہنم کے ان ساتوں دروازوں میں داخل ہو جاؤ جو تمہارے لیے مقرر کیئے گئے ہیں تمہارے لیے اس میں ہمیشہ رہنا مقدر بنا دیا گیا ہے پس وہ لوگ جو حق سے تکبر کرتے ہیں اور غرور کرتے ہیں ان کے لئے جہنم بہت برا ٹھکانا ہے۔ نظم کلام کا مقتضی یہ تھا کہ فبئس مدخل المتکبرین ہوتا۔ (یعنی تکبر کرنے والوں کے داخل ہونے کی جگہ بہت بری ہے) چونکہ جہنم میں دخول خلود کی قید سے مقید ہے اسی لئے یہی اس کا سبب ہے کہ اسے مثوی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا

کچھ حصہ جس کا ان سے ہم نے وعدہ کیا ہے یا (اس سے پہلے ہی) آپ کو دنیا سے اٹھالیں (یہ بچ نہیں سکتے) آخر کار ہماری طرف ہی لوٹائے جائیں گے [1] اور ہم نے بھیجے تھے پیغمبر آپ سے پہلے بھی ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے آپ سے کر دیا اور ان میں سے بعض کا ذکر (قرآن کریم میں) آپ سے نہیں کیا [2] اور کسی رسول کی مجال نہ تھی کہ وہ لے آتا کوئی نشانی اللہ کی اجازت کے بغیر۔ پس جب آئیگا اللہ کا حکم (تو) فیصلہ کر دیا جائیگا حق (وانصاف) کے ساتھ اور باطل پرست وہاں (سراسر) گھاٹے میں رہیں گے [3]''

[1] اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کی ایذا رسانیوں پر صبر کیجیے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمانے اور کفار کو ہلاک کرنے کا جو وعدہ فرما رکھا ہے وہ بالیقین حق ہے اور پورا ہونے والا ہے۔ فاما اصل میں فان ما ہے، ان شرطیہ ہے جو کہ ما زائدہ میں مدغم ہے اور ما زائدہ شرط میں تاکید پیدا کرنے کیلئے لگایا گیا ہے اسی وجہ سے فعل نرینک کے ساتھ نون تاکید ثقیلہ لگائی گئی ہے۔ **نعد هم** جو ہم نے ان کے بارے قتل اور قید کا وعدہ کر رکھا ہے۔ سو خواہ ہم آپ کو اس عذاب کا کچھ حصہ دکھائیں یا یہ دکھانے سے پہلے ہی آپ کو دنیا سے اٹھالیں۔ آخر قیامت کے دن وہ ہماری طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔ پس ہم انہیں ان کے اعمال کی سزا ضرور دیں گے (وہ ہم سے بچ نہیں سکتے) **فالینا یرجعون** یہ جملہ **نتوفینک** کا جواب ہے اور اسی کی مثل **نرینک** کا جواب محذوف ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہی جملہ دونوں کا جواب ہو۔ معنی یہ ہوگا کہ اگر ہم انہیں آپ کی حیات طیبہ میں عذاب دیں یا نہ دیں بیشک ہم انہیں آخرت میں تو شدید ترین عذاب ضرور دیں گے۔ اس معوض میں صرف رجوع پر اقتصار کرنا ہی عذاب کی شدت اور سختی پر دلالت کرتا ہے (یعنی فقط اتنا فرمایا کہ انہیں ہماری طرف ہی لوٹایا جائیگا تو یہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ان پر عذاب سخت ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے گرفت انتہائی شدید ہوگی)

[2] رسل پر تنوین تکثیر اور تعظیم کیلئے ہے، امام احمد اور ابن راہویہ نے اپنی مسندوں میں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں، اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیاء علیہم السلام کی تعداد کے بارے دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار (انبیاء علیہم السلام تشریف لائے) پھر یہ پوچھا گیا ان میں سے رسل علیہم السلام کتنے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین سو تیرہ کا جم غفیر (1) ابن حبان نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔ ان میں سے ستائیس کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔

[3] کسی رسول کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادہ کے بغیر کوئی معجزہ لے آتا۔ انہیں یہ اختیار قطعاً نہیں کہ ان میں سے کوئی اپنی مرضی اور تجویز کے مطابق کسی معجزہ اور نشانی کا اظہار کر سکے۔

پس جب اللہ کا حکم آئے گا یعنی انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے گا تو حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا یعنی انبیاء علیہم السلام اور مومنین کی مدد کی جائے گا اور کفار پر عذاب مسلط کر دیا جائیگا تو وہاں باطل پرست سراسر گھاٹے میں رہیں گے یعنی وہ کفار جو اتنے سرکش ہیں کہ اپنی پسند کی نشانیاں طلب کرتے ہیں لیکن معجزات کے سبب ان پر حق واضح

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

''اللہ پاک وہ ہے جس نے بنائے تمہارے لیے مویشی تاکہ ان میں سے کسی پر سواری کرو اور کسی کا (گوشت) کھاؤ۔ا اور تمہارے لیے ان میں طرح طرح کے فائدے ہیں اور ان میں سے ایک یہ فائدہ بھی ہے کہ ان پر سوار ہو کر اس منزل تک پہنچو جو تمہارے سینوں میں ہے اور ان مویشیوں پر اور کشتیوں پر تم لدے پھرتے ہو۔ ۲ اور وہ دکھاتا ہے تمہیں اپنی نشانیاں پس اللہ تعالیٰ کی کن کن آیتوں کا تم انکار کرو گے۔ ۳''

ا۔ کیونکہ جانوروں کی جنس میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے مثلاً بھیڑ بکریاں وغیرہ اور بعض ایسے ہیں جن کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے اور ان پر سواری بھی کی جاتی ہے اور وہ اونٹ اور بیل وغیرہ ہیں یہ جملہ اَللّٰهُ الَّذِيْ الخ قول باری تعالیٰ هو الذی یحیی و یمیت سے متصل ہے۔

۲۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اور تمہارے لیے ان میں طرح طرح کے فائدے ہیں مثلاً اون، بال، کھال اور دودھ وغیرہ اور ان میں ایک فائدہ یہ ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر سفر کرتے ہوئے اس منزل مقصود تک پہنچ جاؤ جو تمہارے سینوں میں ہے۔ و لتبلغو ا کا عطف لتر کبوا پر ہے۔ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ اور خشکی میں ان مویشیوں پر اور سمندر میں کشتیوں پر تم کو سوار کیا جاتا ہے۔ یہاں علی الفلک فرمایا ہے فی الفلک نہیں کہا تو ایسا علیہا کی مناسبت سے کیا گیا ہے اور جب کھانے کا ذکر کیا تو وہاں نظم کلام تبدیل ہوا اور فرمایا ومنها تاکلون کیونکہ وہ محض ضرورت کے محل میں ہے اس سے مقصود صرف تعیش اور لذت کا حصول ہوتا ہے۔ جبکہ ان پر سوار ہوتے اور سفر کرتے سے مقصود کبھی ایسے دینی اغراض و مقاصد کا حصول ہوتا ہے جو واجب ہوتے ہیں یا مستحب۔ (پس اسی فرق کو ظاہر کرنے کیلئے اسلوب کلام میں بھی فرق رکھا گیا ہے) یا پھر عین (ذات) اور منفعت کے درمیان فرق کرنے کیلئے اسلوب کلام میں تبدیلی کی گئی ہے۔

۳۔ اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ایسی نشانیاں دکھاتا ہے جو اس کے وجود، کمال قدرت اور اسکی بے پایاں رحمت پر دلالت کرتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی کن کن آیتوں کا تم انکار کرو گے۔ یہ استفہام انکار پر انکار کیلئے ہے۔ کیونکہ یہ آیات اور نشانیاں اتنی کثیر اور واضح ہیں کہ یہ کسی انکار کو قبول ہی نہیں کرتیں، یعنی ان کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا اور وہی فعل اسی کو نصب دے رہا ہے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ

سے پہلے گزرے۔ وہ لوگ ان سے تعداد میں زیادہ تھے اور قوت میں زبردست تھے اور زمین میں اپنی نشانیوں کے لحاظ سے (کہیں ہنر مند تھے) پس یہ بتائیں کہ کیا فائدہ پہنچایا انہیں اس دولت نے جو وہ کماتے تھے [1]۔ پس جب آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر تو انہوں نے کفر کیا اور نازاں رہے اس علم پر جو ان کے پاس تھا اور (آخر کار) گھیر لیا انہیں جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے [2]۔"

[1] أَفَلَمْ يَسِيرُوا میں تقدیر کلام اسطرح ہے الم یخو جو افلم یسیرو اکیا وہ منکر کبھی باہر نہیں نکلے اور انہوں نے زمین میں سیر وسیاحت نہیں کی۔ وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ یعنی ان کے نشانات مثلاً محلات، قلعے اور کارخانے وغیرہ جو زمین میں باقی رہے فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ پس اس دولت میں سے کسی شے نے انہیں کوئی نفع نہیں دیا جو وہ کماتے تھے۔ ما اغنی میں ما نافیہ ہے یا استفہام انکاری کیلئے ہے اور اغنی کے سبب محل نصب میں ہے اور دوسرا ما (ما کانوا) موصولہ ہے یا مصدریہ ہے اور اغنی کا فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

[2] فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ کا عطف ما اغنی پر ہے۔ اور البینت سے مراد معجزات اور واضح آیات ونشانیاں ہیں۔ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ۔ جو علم ان کے پاس تھا اسی پر وہ نازاں رہے اور مغرور ہو گئے اور رسولوں کے علم کو حقیر سمجھنے لگے۔ یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جسے وہ علم نافع گمان کرتے تھے حالانکہ فی الحقیقت وہ یا تو جہل مرکب تھا جیسا کہ الہیات اور بعض طبیعیات اور ریاضیات کے بارے یونانیوں اور دیگر کفار کے اقوال وافکار وغیرہ۔ اسی طرح کفار مکہ کا یہ قول کہ ہمیں ہرگز نہ اٹھایا جائے گا اور نہ کوئی عذاب دیا جائے گا۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے اور یہود ونصاری کا یہ کہنا کہ یہود ونصاری کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یا علم سے مراد وہ ہے جس کا تعلق امور دنیا سے ہے اور اس سے مقصود ان کا امور دنیا کی تدبیر کے بارے معرفت رکھنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ۝ وہ ظاہر حیات دنیا کے بارے میں ہی جانتے ہیں اور آخرت کے بارے میں وہ بالکل غافل ہیں۔ پس جب رسل علیہم السلام ان کے پاس دین کے علوم لے کر آئے اور انہوں نے آ کر یہ تعلیم دی کہ دنیا کی طلب میں حسن و جمال اور اعتدال پیدا کرو اور فقط شہوات وخواہشات کی اتباع و پیروی ترک کر دو تو یہ معلومات ان کے علم سے بعد فاصل رکھتی تھیں اسی لئے انہوں نے ان کی طرف توجہ ہی نہ دی، انہیں حقیر سمجھا اور ان سے استہزاء کرنے لگے حتی کہ انبیاء علیہم السلام سے بھی استہزاء اور تمسخر کرنے لگے اور یہ اعتقاد بنا لیا کہ ان کا اپنا علم انبیاء علیہم السلام کے علم کی نسبت زیادہ نفع بخش اور فوائد لانے والا ہے پس وہ اسی پر اترانے لگے اور تکبر وغرور میں مبتلا ہو گئے۔

یا علم سے مراد ایسی چیزوں کا علم ہے جو آخرت میں انہیں کوئی نفع نہیں پہنچائے گا مثلاً طبیعات، ریاضی، نجوم، سحر اور شعبدہ بازی کا علم وغیرہ جو کہ اہل یونان اور اہل ہند وغیرہ کی طرف منسوب ہیں۔ روایت ہے کہ افلاطون نے حضرت عیسی بن مریم علیہ السلام سے ان کی نبوت کا امتحان لینے کی غرض سے یہ سوال کیا کہ اگر تمام آسمان کمانیں ہوں، حوادث ان سے نکلنے والے تیر ہوں، انسان ان کا نشانہ ہو اور تیر پھینکنے والا اللہ تعالیٰ ہو تو پھر بھاگ کر جانے کی جگہ کہاں ہے؟ تو حضرت عیسی علیہ السلام نے جواباً ارشاد فرمایا فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ تو

سقراط کے بارے یہ قول ہے کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (نبی ہونے کے) بارے سنا تو اسے یہ کہا گیا کہ اگر تو ان کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتا (تو بہتر ہوتا) تو اس نے جواب دیا ہم تو ہدایت یافتہ قوم ہیں ہمیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت نہیں جو ہماری راہنمائی کرے اور ہمیں ہدایت دے۔ بعض نے فرحوا کا معنی اس طرح کیا ہے کہ جو علماء انبیاء علیہم السلام کے پاس تھا وہ اس پر بطور استہزاء ہنستے تھے اور اس کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ فرحوا کی ضمیر رسل علیہم السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی جب انبیاء علیہم السلام نے کفار کی جہالت، سرکشی اور ان کے برے انجام کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں جو علم دیا گیا اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کفار کو ان کی جہالت اور استہزاء کی سزا نے ہر جانب سے گھیر لیا۔

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

"پھر جب انہوں نے دیکھ لیا ہمارا عذاب تو کہنے لگے ہم ایمان لائے ہیں ایک اللہ پر اور ہم ان معبودوں کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم اس کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے [1]۔ پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب [2]۔ یہی دستور ہے اللہ تعالیٰ کا جو (قدیم سے) اس کے بندوں میں جاری ہے۔ اور سراسر خسارہ میں رہے اس وقت حق کا انکار کرنے والے [3]۔"

[1] پھر جب کفار نے موت کے وقت ہمارے عذاب کی شدت اور سختی کو دیکھ لیا تو کہنے لگے ہم ایک اللہ پر ایمان لائے اور ہم ان معبودوں کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم اس کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے، یعنی ہم ان بتوں سے بیزاری اور برات کا اظہار کرتے ہیں جن کی ہم عبادت کرتے تھے۔

[2] پس ان کے ایمان نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ تنازع الفعلین کے قبیلے سے ہے کہ دونوں فعلوں میں سے ایک عمل کر رہا ہے اور دوسرے میں فاعل ضمیر ہے۔ یا پھر لم یک کا اسم ضمیر شان مستتر ہے یا لم یک تامہ ہے (ناقصہ نہیں) اور ینفعھم ان مقدرہ کے ساتھ اس کا فاعل ہے۔

لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ کیونکہ ایسے وقت میں توبہ کی قبولیت ممتنع ہے اسی لیے فرمایا لم یک بمعنی لم یصح اور لم یستقم ہے یعنی اس وقت ان کا ایمان لانا صحیح اور درست نہیں ہے۔

[3] سُنَّتَ اللّٰهِ محذوف فعل کا مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور فعل تاکید کیلئے محذوف کیا گیا ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے سنة الله ذالک سنة مافیه فی العباد ان الایمان عند نزول العذاب لا ینفع۔

کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دستور زمانہ ماضیہ سے ہی بندوں کیلئے جاری کر رکھا ہے کہ نزول عذاب کے وقت ایمان لانا نفع بخش اور فائدہ مند

دونوں جہاں چلے گئے (نہ دنیا باقی رہی اور نہ آخرت کی کوئی نعمت ہاتھ آئی) زجاج نے کہا ہے کہ کافر تو ہر وقت خسارے میں ہوتا ہے۔ لیکن ان پر یہ خسارہ ظاہر تب ہوتا ہے جب وہ عذاب کا مشاہدہ کر لیتے ہیں(1)۔

تمت بالخیر

سورۃ المومن کی تفسیر 28 ذی الحجہ 1207ء اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے اختتام پذیر ہوئی۔ سورۃ المومن کا ترجمہ 13 شوال 1421ء بمطابق 10 جنوری 2001ء بروز بدھ بوقت سہ پہر 4-15 بجے اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر عنایت سے اپنے اختتام کو پہنچا۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقه محمد و علٰی آله و اصحابه اجمعین۔

سورۂ فصلت / حم السجدہ

ایاتہا ۵۴ — سورۃ حم السجدۃ مکیۃ ۴۱ — رکوعاتہا ۶

سورۂ فصلت (حم السجدہ) مکی ہے، اس میں چون آیات اور چھ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۞ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۞ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۞

''حا۔ میم۔ اتارا گیا ہے (یہ قرآن) رحمٰن ورحیم (خدا) کی طرف سے [1]۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں تفصیل سے بیان کردی گئی ہیں۔ یہ قرآن عربی (زبان میں) ہے یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو علم (وفہم) رکھتے ہیں [2]۔ یہ مژدہ سنانے والا اور (بروقت) خبردار کرنے والا ہے۔ بایں ہمہ منہ پھیر لیا ان میں سے اکثر نے پس وہ اسے قبول نہیں کرتے [3]۔''

[1] اگر آپ حٰمٓ کو مبتدا بنائیں تو پھر اس کی خبر تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے اور اگر حٰمٓ کو حروف ہجا شمار کریں تو پھر تَنْزِيْلٌ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے کہ تنزیل نکرہ مابعد صفت سے مخصوصہ ہونے کے سبب مبتدا ہے اور اس کی خبر كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ہے پہلی دونوں ترکیبوں کے اعتبار سے کتب یا تو تنزیل سے بدل ہے یا دوسری خبر ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

چونکہ ان ساتوں سورتوں کا آغاز حم سے کیا گیا ہے شاید اسی وجہ سے ان کا نام بھی حم رکھا گیا ہے اور نظم ومعنی میں ان کے ہم شکل اور باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ان کا آغاز کتاب کے بیان سے کیا گیا ہے۔

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا طٰہٰ۔ طواسین (طسم والی سورتیں) اور حوامیم (حم والی سورتیں) مجھے الواح موسیٰ (موسیٰ علیہ السلام کی تختیاں) میں سے عطا کی گئی ہیں (1)۔ اسے حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے حضرت معقل بن یسار سے نقل کیا ہے۔ اور الرحمٰن اور الرحیم کی طرف تنزیل کی اضافت اس پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ تمام دینی اور دنیوی مصالح اور منافع کا دار ومدار اسی قرآن پر ہے۔ (کیونکہ یہ رحمٰن ورحیم رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے)

[2] یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں تفصیل سے بیان کردی گئی ہیں، یعنی اس میں احکام قصص اور مواعظ پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا یا تو مدح کی بناء پر منصوب ہے۔ (کہ اس سے پہلے امدح فعل محذوف ہے۔) یا اٰيٰتُهٗ کی ضمیر مجرور سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ کیونکہ ضمیر کی طرف فُصِّلَتْ کا فاعل مضاف ہے۔ (اور ضمیر مضاف الیہ ہونے کے سبب مجرور ہے۔) جیسا کہ قول باری

معنی یہ ہے کہ عربی زبان میں قرآن کریم نازل کرنا اللہ تعالیٰ کا ان پر ایک عظیم احسان ہے کہ یہ ان کے لیے پڑھنا اور سمجھنا سہل اور آسان ہے۔ اگر یہ عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو وہ اسے نہ سمجھ سکتے بلکہ ان کے لیے یہ انتہائی ثقیل اور دشوار ہوتا۔ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ یہ فعل لازم کے قائم مقام استعمال ہو رہا ہے، یعنی ایسی قوم کے لئے جو صاحب علم و نظر ہے نہ کہ ان کے لئے جنہوں نے اس سے اعراض کر کے منہ پھیرلیا۔ یا پھر یہ کہا جائیگا کہ یعلمون کا مفعول محذوف منوی ہے، یعنی ایسے لوگوں کے لئے جو قرآن کے معانی کو جانتے ہیں اور اس کے مفاہیم کو سمجھتے ہیں۔ یا اس طریقہ پر کہ جو اسے سنتا ہے اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

اس صورت میں اس کے دو مفعول مقدر ہیں، یعنی لقوم یعلمونه حقا ان لوگوں کے لئے جو اسے حق جانتے ہیں اور پھر یہ جملہ قرانا کی دوسری صفت ہے یا تنزیل یا فصلت کا صلہ ہے، (یعنی ان کے متعلق ہے) صفات کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اسے قرانا کی دوسری صفت بنانا زیادہ اولی اور بہتر ہے۔

؎ یہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو مژدہ سنانے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو بروقت خبردار کرنے والا ہے۔ بایں ہمہ یہ ان میں سے اکثر لوگوں نے قرآن کریم کو قبول کرنے اور اس میں تدبر اور غور و فکر کرنے سے اعراض کرلیا، منہ پھیرلیا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف فصلت پر ہے۔ پس وہ اسے عداوت اور عناد کی بنا پر سنتے ہی نہیں یا يَسْمَعُوْنَ بمعنی ہے کہ وہ اسے قبول نہیں کرتے۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے شفعت الی فلان فلم يَسْمَعْ قولی کہ میں نے فلاں کے پاس سفارش کی مگر اس نے میری بات نہ سنی، یعنی اس نے میری بات قبول نہیں کی یہ جملہ اعراض کا بیان اور اس کی تفصیل ہے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ⑤

''اور (ان ہٹ دھرموں) نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے تم اپنا کام کرو ہم اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔''

وَقَالُوْا کا عطف اَعْرَاضَ پر ہے۔ اور مشرکین مکہ نے کہا۔ ہمارے دل (پردوں میں) لپٹے ہوئے ہیں (ا)۔ اکنة کنان کی جمع ہے۔

(ا) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قریش حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا "تمہیں کون سی شے اسلام قبول کرنے سے مانع ہے تم اسلام قبول کرلو عرب کے سردار بن جاؤ گے"۔ انہوں نے کہا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ کہتے ہیں نہ ہم اسے سمجھتے ہیں اور نہ ہم اسے سن سکتے ہیں کیونکہ ہمارے دلوں پر تو غلاف لپٹے ہوئے ہیں اور ابوجہل نے اپنے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک کپڑا حائل کرتے ہوئے کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قلوبنا فی اکنه مما تدعونا الی و فی اذاننا وقر و من بیننا و بینک حجاب۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا میں تمہیں دو خصلتیں اپنانے کی دعوت دیتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ تم یہ شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، پس جونہی انہوں نے لا الہ الا اللہ کی شہادت کے بارے سنا تو وہ پیٹھیں پھیر کر بھاگ پڑے اور کہنے لگے کیا اس نے تمام معبودوں کی جگہ ایک الہ بنا دیا ہے بیشک یہ بڑی عجیب شے ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو کہا چلو اپنے معبودوں کی عبادت پر ڈٹے رہو۔ بیشک مقصود یہی ہے کہ ہم نے

اس کا معنی ہے پردے، غلاف مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ اس سے جس توحید کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں لہٰذا جو کچھ آپ کہتے ہیں ہم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے وقر کا معنی ثقل گرانی، یعنی ہمارے کان بہرے ہیں جو کچھ آپ کہتے ہیں ہم اسے نہیں سن سکتے۔ اور معنی مقصود یہ ہے کہ ہم آپ کی دعوت قبول نہ کرنے میں اس آدمی کی مثل ہیں جو نہ کچھ سمجھتا ہے اور نہ سنتا ہے، یعنی کسی بھی اعتبار سے ہم آپ کی بات پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب حائل ہے۔ یعنی ایسا دینی اختلاف ہے جو ہمیں آپس میں ملنے سے روکتا ہے اور یہ الفاظ اس پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان یہ حجاب ایسا ہے جو دونوں فریقوں کے درمیان پائی جانے والی مکمل مسافت کو گھیرے ہوئے ہے اس میں کوئی بھی فارغ جگہ باقی نہیں ہے۔ (کوئی ایک فریق اس مقام سے دوسرے فریق کی جانب بڑھ سکے) یہ تمام دعوت کو قبول نہ کرنے اور باہم ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملنے کی تمثیل ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ کی دعوت کو قبول نہ کرنے اور آپ کے ساتھ نہ ملنے میں آپ کے ساتھ ہماری کیفیت اور تعلق ایسے دو افراد کی طرح ہے جن کے درمیان ایک مضبوط اور قوی رکاوٹ موجود ہو۔ (جسے ان میں سے کوئی بھی عبور نہ کر سکتا ہو۔) لہٰذا آپ اپنے دین پر کاربند ہیں یا آپ ہمارے معاملے (دین) کو باطل قرار دینے کی کوشش کرتے رہیں اور ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے اور اسی پر عمل پیرا رہیں گے یا ہم آپ کے معاملہ کو (دین کو) باطل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِیْمُوْۤا اِلَیْهِ وَ اسْتَغْفِرُوْهُ ؕ وَ وَیْلٌ لِّلْمُشْرِكِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۞ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۞

"آپ فرمائیے میں انسان ہی ہوں (بظاہر) تمہاری مانند۔ (البتہ) وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا معبود خداوند یکتا ہی ہے۔ پس متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف اور مغفرت طلب کرو اس سے [1] اور بلاکت ہے مشرکوں کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہی رہتے ہیں [2] بیشک وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان کے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع نہ ہوگا [3]۔"

[1] قُلْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے جواب میں فرما دیجئے۔ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کے بارے حسن نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تواضع اور انکساری کی تعلیم دی ہے (1)، یعنی میں تم ہی میں سے ایک ہوں اگر مجھ پر وحی کا نزول نہ ہوتا تو میرے پاس وہ علم نہ ہوتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 87 (التجاریہ)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے) یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ جب آپ قرآن کریم میں اپنے وحدہ لاشریک رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگتے ہیں اگر اسی طرح ہوتا جیسے وہ گمان کرتے ہیں تو وہ کبھی نہ بھاگتے۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں وہ سنتے ضرور ہیں لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے کیونکہ وہ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ جب دوسرا دن آیا تو ان میں سے ستر افراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر اسلام پیش کیجئے چنانچہ ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور فرمایا الحمد للہ کل تو تم یہ گمان کرتے تھے کہ جس کی طرف ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں اس کی طرف سے تمہارے دل غلافوں میں لپٹے پڑے ہیں۔ اور تمہارے کانوں پر گرانی ہے اور آج صبح ہی تمام مسلمان ہو گئے۔ تو انہوں نے کہا رسول

جوتم دیکھ رہے ہو۔لیکن میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود خداوند یکتا ہی ہے۔لہٰذا تم پر لازم ہے کہ تم خوب کان لگا کر توجہ سے اسے سنو اور اسے قبول بھی کرو۔یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ میں نہ فرشتہ ہوں اور نہ ہی جن کہ تمہارے لیے اس سے کچھ لینا ممکن نہ ہو۔ اور نہ ہی میں تمہیں ایسی شئی کی طرف دعوت دیتا ہوں جو خلاف عقل ہو اور عقلیں اسکا ادراک کرنے سے قاصر ہوں بلکہ میں تو تمہیں اس توحید کی طرف بلاتا ہوں جو عقل ونقل کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔پس تم طاعت وعبادت میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی توجہ کرو اور قطعاً اس کی طاعت سے اعراض نہ کرو۔اور اسی سے ان تمام گناہوں شرک اور دیگر برے اعمال کی مغفرت طلب کرو جو تم کرتے رہے ہو۔

ؔ پھر اللہ تعالیٰ نے نافرمانوں اور مشرکوں کو عذاب سے ڈراتے اور دھمکی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ اور ہلاکت ہے مشرکوں کے لئے۔ترکیب کلام میں ویل مبتلا ہے اور اس کی خبر مشرکین ہے۔

الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو لا الہ الا اللہ کا اقرار نہیں کرتے حالانکہ یہی نفسوں کی زکوۃ ہے۔معنی یہ ہے کہ وہ توحید کا اقرار کر کے اپنے نفسوں کو شرک کی آلودگی اور نجاست سے پاک نہیں کرتے(1)۔

حسن نے کہا ہے کہ وہ لوگ زکوۃ کا اقرار نہیں کرتے اور نہ ہی اسے واجب خیال کرتے ہیں۔اور یہ کہا جاتا تھا کہ زکوۃ اسلام کا پل ہے پس جس نے اس پل کو طے کر لیا وہ نجات پا گیا اور جو پیچھے رہ گیا (یعنی پل کو طے نہ کر سکا) وہ ہلاک و برباد ہو گیا۔مقاتل اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو طاعت وفرمانبرداری میں مال خرچ نہیں کرتے اور نہ ہی وہ صدقہ وخیرات کرتے ہیں۔اور مجاہد نے یہ قول بیان کیا ہے کہ وہ اپنے اعمال کو پاک نہیں کرتے ان کا تزکیہ نہیں کرتے(2)۔

علامہ بیضاوی نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ فروعات (ایمان) میں کفار بھی مخاطب ہیں(3)۔یہ مسئلہ ہم نے سورہ مدثر میں قول باری تعالیٰ لم تک من المصلین۔ الایۃ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ترکیب کلام میں حال ہے اور یہ اس بات پر مطلع کر رہا ہے کہ وہ زکوۃ کا انکار اسلیئے کرتے تھے کیونکہ وہ عقیدہ آخرت کا انکار کرتے تھے اور جو بھی آخرت اور زکوۃ کے ثواب کا اعتقاد نہیں رکھتا اس کے نزدیک فقیر کو مال دینا مال کو ضائع کرنا ہی ہے ۔لامحالہ اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کے انکار کا تذکرہ شرک کرنے اور آخرت کا انکار کرنے کے ساتھ ملا کر کیا ہے۔کیونکہ آدمی کے نزدیک مال انتہائی محبوب اور پسندیدہ اشیاء میں سے ہے۔پس اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی پہلی نشانی اور دلیل ہے گویا اس آیت میں اہل ایمان کو زکوۃ ادا کرنے پر برانگیختہ بھی کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی اس سے انکار کرنے پر شدید زجرو توبیخ بھی کی جا رہی ہے۔

ؔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ غیر ممنون کا معنی ہے ایسا اجر جو منقطع نہ ہوگا۔مقاتل نے کہا ہے ایسا اجر جو ناقص نہ ہو گا بلکہ کامل ہو گا۔اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ ایسا اجر جس کے سبب ان پر احسان نہیں جتلایا جائے گا۔ممنون مَنٌّ سے مشتق ہے اور من کا معنی ہے احسان جتلانا۔مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی بے حساب ہے۔سدی نے کہا ہے یہ آیت مریضوں، اپاہجوں اور بوڑھوں

ہے جس قدر وہ حالت صحت میں عمل کیا کرتے تھے(1)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب خوب اچھے انداز میں عبادت کرتا ہو پھر وہ بیمار ہو جائے تو اس پر مقرر فرشتے کو کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے اسی طرح کا عمل لکھ دو جیسا یہ حالت صحت میں کرتا تھا اور یہ حکم تب تک برقرار رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اس بیماری اور تکلیف سے چھٹکارا اور صحت دلا دے(2)۔ رواہ البغوی فی شرح السنة و التفسیر۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی بیمار ہو یا سفر پر تو اس کے لئے اس طرح کا عمل لکھا جاتا ہے جیسے وہ مقیم اور حالت صحت میں کیا کرتا تھا(3)۔ رواہ البخاری۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی مسلمان کسی جسمانی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتے کو حکم ارشاد فرماتا ہے اس کے لیے اسی طرح کا عمل لکھ دے جیسے یہ اس تکلیف سے قبل کیا کرتا تھا پھر اگر اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرما دے تو (اس بیماری کے سبب) اس کے گناہ دھو ڈالتا ہے اور اسے پاک فرما دیتا ہے اور اگر اس کی روح قبض کر لے تو پھر اس کی مغفرت فرماتا ہے اور اسے اپنی رحمت سے نوازتا ہے(4) رواہ البغوی فی شرح السنة۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بندہ بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے لئے اسی قدر اجر لکھا جاتا ہے جس قدر بیماری سے قبل لکھا جاتا تھا اور پھر بیماری نے وہ عمل کرنے سے اسے روک دیا۔ رواہ رزین۔

قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ۝۹ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ۝

”آپ (ان سے) پوچھئے کیا تم لوگ انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا فرمایا زمین کو دو دن میں اور ٹھہراتے ہو اس کے لئے مدمقابل۔ وہ تو رب العلمین ہے (اس کا مدمقابل کون ہو سکتا ہے [1]) اور اس نے (ہی) بنائے ہیں زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ جو اس کے اوپر (اٹھے ہوئے) ہیں اور اس نے بڑی برکتیں رکھی ہیں اس میں اور اندازہ سے مقرر کر دی ہیں اس میں غذائیں، (ہر نوع کے لئے) چار دنوں میں۔ (ان کا حصول) یکساں ہے طلب گاروں کے لئے [2]“

[1] یہ استفہام زجر و توبیخ کے لئے ہے اور یہ جملہ استفہامیہ مستانفہ ہے جو کہ ایک سوال کے جواب میں واقع ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اگر وہ سیدھی راہ نہ چلیں اور مغفرت طلب نہ کریں تو پھر میں انہیں کیا کہوں؟ تو اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا کہ آپ ان سے یہ پوچھئے کیا تم لوگ اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا فرمایا، یعنی دو دنوں کی مقدار میں پیدا فرمایا۔ ان دو دنوں سے مراد یک شنبہ (اتوار) اور دو شنبہ (پیر) ہے۔ اور اس کے لئے مدمقابل ٹھہراتے ہو حالانکہ کوئی اس کا مدمقابل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا فرمایا ہے اور وہ ان تمام ممکنات کا خالق ہے جو پائی جاتی ہیں اور ہر شئی کو بتدریج نقطہ عروج تک پہنچانے والا ہے۔ العلمین، عالم کی جمع ہے تو چونکہ عالم کی مختلف انواع

ہیں اس لئے عالمین جمع ذکر کی گئی ہے اور پھر ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر غلبہ دیتے ہوئے جمع یا،نون کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔
جملہ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ زجروتوبیخ کی علت بیان کر رہا ہے۔

2۔ اور اس نے ہی زمین میں گڑے ہوئے اور جمے ہوئے پہاڑ بنائے ہیں جو زمین کے اوپر بلند ہیں اور اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ تاکہ ان میں جو دیکھنے کی چیزیں ہیں وہ دیکھنے والوں کے لئے ظاہر ہوں اور ان کے منافع اور فوائد تلاش کرنے والوں کے سامنے ہوں اور اس نے زمین میں بڑی برکتیں رکھی ہیں کہ اس میں سمندر، دریا، پھل، درخت اور حیوانات پیدا فرمائے۔ اور زمین کے باسیوں کے لئے غذائیں بھی زمین میں اندازہ سے مقرر کر دیں۔ اقواتها اصل میں اقوات اهلها ہے، یعنی اس میں مضاف محذوف ہے۔ یا یہ اضافت ادنی ملابست کے لئے ہے، یعنی اقوات خلق فيها، یعنی ساری مخلوق کی خوراک اسی میں مقرر کر دی ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں اور چوپاؤں کا رزق زمین میں تقسیم کر دیا، یعنی جو شے جس کے لئے نفع بخش تھی اور جس کے سبب کوئی زندگی گزار سکتا تھا وہ شئی اسی کے لئے معین کر دی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہاں قرأت ہی قَسَّمَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا کی ہے(1)۔

عکرمہ اور ضحاک نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شہر میں وہ شے مقرر فرمادی جو دوسرے شہر میں پیدا نہیں فرمائی تاکہ لوگ آپس میں ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف تجارت کر کے آسان زندگی گزار سکیں(2)۔

کلبی نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک علاقے کے رہنے والوں کے لئے روٹی مقرر فرمادی، دوسرے علاقے والوں کے لئے جوار، کسی علاقے کے باسیوں کے لئے مچھلی اور کسی علاقے کے رہنے والوں کے لئے کھجوریں مقرر فرمادیں(3)۔

في اربعة ايام، یعنی یہ سب کچھ چار دن مکمل ہونے تک کر دیا، یعنی کام کی تکمیل کے لئے پہلے دونوں کے ساتھ متصل ہی دو دن مزید لگائے اور وہ دو دن سہ شنبہ (منگل) اور چہار شنبہ (بدھ) ہیں۔ یہ جملہ تمہارے اس قول کی طرح ہی ہے کہ میں بصرہ سے بغداد تک دس دنوں میں پہنچا اور کوفہ تک پندرہ دنوں میں پہنچا۔

اور یہاں فِيْ يَوْمَيْنِ نہیں فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ دو دن پہلے دو دنوں کے ساتھ ہی متصل ہیں۔

سواءً یہ منصوب ہے اور اصل عبارت ہے استوت سوا ءاور سوا بمعنی استوار ہے۔ یاقدر تقدیر اسوا ہے۔ اور یہ جملے ایام کی صفت ہے۔ اور اس پر یعقوب کی قرأت بھی دلالت کرتی ہے کہ اس نے سواء کو اربعة کی صفت بناتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ سواء اقواتها یا فيها کی ضمیر سے حال ہے۔ ابو جعفر نے سواء مرفوع پڑھا ہے۔ اس لیے کہ یہ محذوف مبتدا کی خبر ہے اور وہ ھو ہے۔
لِلسَّآئِلِيْنَ کا تعلق محذوف کلام سے ہے۔ یعنی یہ حصر سوال کرنے والوں کے لئے زمین اور اس میں جو کچھ ہے اسے پیدا کرنے کی مدت کو بیان کر رہا ہے (کہ ہر شئی کی تخلیق چار دن میں مکمل ہو گئی۔) قتادہ اور سدی نے اسی طرح کہا ہے۔ یا اس سے قبل قَدَّرَ فعل محذوف ہے، یعنی طلبگاروں اور تلاش کرنے والوں کے لئے زمین میں ہر قسم کی خوراک چار دن میں پیدا کر دی گئی، مقرر کر دی گئی۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ

اَمْرَهَا ؕ وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۗ وَ حِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۱۲﴾

''پھر اس نے توجہ فرمائی آسمان کی طرف، وہ اس وقت محض دھواں تھا [1] پس فرمایا اسے اور زمین کو کہ آ جاؤ (تعمیل حکم اور ادائے فرائض کے لیے [2]) خوشی سے یا مجبوراً۔ دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں [3] پس بنا دیا انہیں سات آسمان دو دنوں میں، [4] اور وحی فرمائی ہر آسمان میں اس کے حسب حال اور ہم نے مزین کر دیا آسمان دنیا کو چراغوں سے اور اسے خوب محفوظ کر دیا یہ (سارا) نظام سب سے غالب سب کچھ جاننے والے (خدا) کا ہے [5]''

[1] پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی، یعنی آسمان کا قصد کیا۔ جیسا کہ یہ قول ہے استوی الی مکان کذا یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی کسی معین شئی کی طرف کامل توجہ کرلے اور اس کے سوا کسی غیر کی طرف رخ نہ پھیرے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہاں ثم دو تخلیقوں کے درمیان تفاوت اور فرق ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے تراخی مدت کے لئے مذکور نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے والارض بعد ذالک دحٰھا کیونکہ زمین کو پہاڑوں کی تخلیق سے پہلے بچھایا گیا۔ (اس لئے یہاں تاخیر زمانی مراد نہیں ہو سکتی۔) اور دخان سے مراد شاید آسمان کا مادہ اور وہ چھوٹے اجزا ہیں جن سے اسے بنایا گیا ہے۔ آسمان کا مادہ دخان ہے جو کہ پانی کے بخارات ہیں۔ علامہ بغوی نے اسی طرح کہا ہے۔

[2] اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو فرمایا جو کچھ تاثیر و تاثر میں نے تم دونوں میں پیدا کیا ہے اس کے ساتھ (تعمیل حکم کے لئے) آ جاؤ اور جو مختلف اوضاع اور متنوع قسم کی کائنات تم میں ودیعت رکھی ہے اس کے اظہار کے لئے آ جاؤ، یا معنی ہے کہ میں تم دونوں سے جو کچھ پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تم میں سے ہر کوئی اسے ظاہر کر دے۔

طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ میں نے تم دونوں میں بندوں کے مصالح کے لئے جو منافع اور فوائد پیدا کیے ہیں انہیں ظاہر کر دو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے آسمان! تو اپنے سورج، چاند اور ستاروں کو طلوع اور نمودار کر اور اے زمین! تو اپنے دریاؤں کو جاری کر دے اور اپنے پھلوں اور نباتات کو باہر نکال دے (1)۔

[3] طَوْعًا اَوْ كَرْهًا (خوشی سے یا مجبورا) یہ ترکیب کلام میں یا تو حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں یعنی دراں حالیکہ لے کر تم دونوں حکم کی تعمیل خوشی خوشی کر و یا مجبوراً کرو۔ یا ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور یہ ضربته سوطا کے طریقہ پر ہے یعنی ایتیا اتیان طوع او کرہ۔ (تم خوشی یا مجبوری سے بالضرور تعمیل حکم کے لئے آؤ۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو فرمایا میں نے تمہیں جو حکم دیا ہے تم اس کی تعمیل کرو ورنہ میں تمہیں اس کی تعمیل پر مجبور کر دوں گا یہاں تک کہ تم مجبوراً اسے کرو گے (2) تو ان دونوں نے خوشی خوشی یہ جواب دیا ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں۔ یہاں طائعین جمع مذکر ذکر کیا گیا ہے طائعتین نہیں کہا تو اس کا سبب یہ ہے کہ حکم کی نسبت آسمانوں، زمین اور ان میں بسنے والی ساری مخلوق کی طرف تھی، یعنی زمین و آسمان نے یہ کہا کہ ہم اپنے اندر بسنے والی ساری کائنات سمیت تعمیل حکم کے لئے خوشی خوشی حاضر ہیں۔ (اور ان میں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں قسم کی مخلوق آباد ہے۔) چنانچہ ذوی العقول کو ترجیح اور غلبہ دیتے

ہوئے طائعین کہا گیا یا جب زمین وآسمان دونوں کی طرف قول کی نسبت کی تو ان دونوں کو تمام ذوی العقول کے قائم مقام قرار دیکر طائعین ذکر کیا۔ (کیونکہ قول کی نسبت ذوی العقول کی طرف ہی کی جاتی ہے۔ لیکن اظہر بات یہ ہے کہ یہ کلام تمثیل کے محل میں واقع ہے۔ اور ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا سے مراد کمال قدرت کا اظہار ہے اور مراد خداوندی کا بالیقین وقوع پذیر ہونا ہے۔ اور قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ سے مراد فوراً بالذات اثر قبول کرنا ہے پس یہ حکم دینے والے حاکم کے حکم اور تعمیل حکم کے لئے اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے کی تمثیل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کن فیکون۔ (کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شئی کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے ہو جاتو وہ فوراً معرض وجود میں آجاتی ہے)یعنی اس میں بھی حکم اور تعمیل حکم کا ہی بیان کیا گیا ہے۔)

ے پس اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا فرمائے کہ انہیں عدم سے وجود عطا کیا اور ان کے تمام معاملات کو انتہائی پختہ اور مضبوط کیا۔ فَقَضٰىهُنَّ میں ضمیر سماء کے لئے ہے چونکہ سماء معنوی طور پر جمع ہے اس لئے ضمیر جمع ذکر کی گئی ہے یا یہ ضمیر مبہم ہے۔ پہلی صورت کے لحاظ سے سَبْعَ سَمٰوٰتٍ حال ہے اور دوسری صورت میں تمیز ہے۔

يَوْمَيْنِ سے مراد جمعرات اور جمعہ کے دن ہیں محلی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جمعہ کی آخری ساعت میں اس تخلیق سے فارغ ہوا۔ اور اسی ساعت میں آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی اسی لیے یہاں سوا نہیں فرمایا۔

میں کہتا ہوں کہ شاید محلی کے قول کا دارومدار اس حدیث پر ہے جو مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن مٹی کو پیدا فرمایا، اتوار کے دن پہاڑ پیدا فرمائے، پیر کے دن درخت پیدا کیے، منگل کے دن مکروہات ومصائب پیدا کئے، بدھ کے دن نور پیدا فرمایا، جمعرات کے دن زمین میں چوپائے پھیلا دیئے اور جمعہ کے دن عصر کے بعد دن کی آخری ساعت میں سب سے آخر میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی آخری ساعت سے مراد عصر اور رات کی درمیانی ساعت ہے(1)۔

ظاہر یہ ہے کہ راوی کو اس حدیث میں وہم ہوا ہے کیونکہ قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق چھ دن میں ہوئی جبکہ اس حدیث میں سات دنوں کا ذکر ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ تخلیق کا آغاز اتوار کے دن سے ہوا اور یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ تخلیق کا آغاز ہفتے کے دن سے ہوا اور آیت رواسی و بارک فیها وقدر فیها اقواتها۔ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو تیسرے اور چوتھے دن (منگل اور بدھ) پیدا فرمایا، جبکہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ پہاڑوں کو اتوار کے دن اور درختوں کو پیر کے دن پیدا فرمایا اور حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کا سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بہت عرصہ بعد میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً الآیۃ اور آدم علیہ السلام کے قصہ میں یہ بھی ہے کہ آپ کی مٹی چالیس روز تک گوندھی گئی لہٰذا اگر یہ صحیح ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کے دن آخری ساعت میں ہوئی تو پھر تخلیق کا آغاز اسی جمعہ کے دن سے ہوا۔ واللہ اعلم۔

ے اور اللہ تعالیٰ نے ہر آسمان میں اس کے حسب حال وحی فرمائی عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ

نہیں جانتا۔

قتادہ اور سدی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان میں سورج، چاند اور ستارے پیدا فرما دیئے اور مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی میں سے جو چاہا وہ ہر آسمان کی طرف وحی فرما دیا (1)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آسمان کی طرف وہ امر وحی فرمایا جس کے سبب ان میں رہنے والی مخلوق کو اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا۔ اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں، یعنی ستاروں سے مزین اور آراستہ کر دیا۔ اور ہم نے اس کی آفات اور چوری کرنے والوں سے حفاظت فرمائی۔ بعض نے کہا ہے کہ **حفظا** مفعول لہ ہے اور معنی یہ ہے کہ ہم نے آسمان دنیا میں زینت اور حفاظت کے لیے ستارے پیدا فرما دیئے۔ یہ سب نظام جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اس خدا کا ہے جو اپنی بادشاہی اور حکومت میں سب سے غالب ہے اور اپنی مخلوق کے بارے میں سب کچھ جاننے والا ہے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُودَ ﴿۱۳﴾ إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿۱۴﴾

''پس اگر وہ (پھر بھی) روگردانی کریں تو آپ فرمائیے کہ میں نے ڈرایا ہے تمہیں اس کڑک سے جو عاد و ثمود کی کڑک کی مانند (ہلاکت خیز) ہوگی [1] (کچھ یاد ہے) جب آئے تھے ان کے پاس رسول سامنے سے اور پیچھے سے (یعنی ہر طرف سے) یہ سمجھانے کے لئے [2] کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو انہوں نے کہا اگر ہمارے رب کی مرضی ہوتی (کہ ہمیں کچھ سمجھائے) تو فرشتے نازل کرتا پس ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے (اسکا سراسر) انکار کرتے ہیں [3]''

[1] فَإِنْ أَعْرَضُوا کا عطف **قل** أَئِنَّكُمْ پر ہے، یعنی اگر کفار مکہ اس بیان کے بعد بھی ایمان لانے سے روگردانی کریں تو آپ انہیں اس سے ڈرائیے کہ ان پر ایسا ہلاکت خیز اور شدید عذاب آئے گا جیسا عذاب قوم عاد اور ثمود پر آیا تھا۔ صَاعِقَةً کا معنی ہے ہر ہلاکت خیز اور تباہ کرنے والی شئی۔

[2] (کچھ یاد ہے جب عاد و ثمود کے پاس رسول آئے تھے۔ ترکیب کلام میں إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ، صَاعِقَةِ عَادٍ سے حال ہے۔ اسے صَاعِقَةً کی صفت بنانا یا **انذرتکم** کی ظرف بنانا جائز نہیں کیونکہ اس سے معنی فاسد ہو جاتا ہے مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ۔ سے مراد ہے تمام اطراف و جوانب سے اور انہوں نے انہیں ہر جہت سے سمجھانے کی پوری کوشش کی۔ یا معنی یہ ہے کہ ان کے پاس زمانہ ماضی کی جہت سے رسول آئے تا کہ انہیں اس عذاب سے ڈرائیں جو گزشتہ زمانہ کے کفار پر آیا تھا اور زمانہ مستقبل کی جہت سے آئے تا کہ انہیں اس سے ڈرائیں جو آخرت میں ان کے لئے تیار کیا گیا ہے ان دونوں لفظوں میں سے ہر ایک دونوں زمانوں کا احتمال رکھتا ہے۔

یا یہ لفظ **من قبلھم و من بعد ھم** کے معنی میں ہیں کیونکہ ان کے پاس پہلے لوگوں کی خبر پہنچی ہوئی تھی اور ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام [illegible]

؎ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا میں ان مخففہ عن المثقلہ ہے اور اس میں ضمیر شان مضمر ہے۔ یا ان مفسرہ ہے کیونکہ یہ رسالت کے ذکر کے بعد ہے اور اس میں قول کا معنی ہے یا ان مصدر یہ ہے اور اس سے قبل باء مقدر ہے، یعنی بان لا تعبدوا (کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) تو عاد و ثمود نے جواب دیا اگر ہمارا رب رسول بھیجنا چاہتا تو وہ اپنے پیغامات دیکر ملائکہ کو نازل فرماتا پس تمہارے گمان کے مطابق جو کچھ تمہیں دیکر بھیجا گیا ہے ہم سرا سر اسکا انکار کرتے ہیں۔ تم بھی ہماری طرح بشر ہو تمہیں ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ابو جہل اور قریش کے چند اور سرداروں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ ہم پر ملتبس اور مخفی ہے۔ (ہمارے ذہن ابھی ان کے بارے میں واضح نہیں) لہٰذا تم کوئی ایسا آدمی تلاش کرو جو شعر، کہانت اور سحر کا علم رکھتا ہو وہ آپ کے پاس حاضر ہو اور گفتگو کرے پھر ہمارے پاس آ کر آپ کے بارے میں تفصیل سے ہمیں آگاہ کرے۔ یہ سن کر عتبہ بن ربیعہ نے کہا قسم بخدا! میں نے شعر، کہانت اور سحر کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور ان کے بارے معلومات بھی رکھتا ہوں اگر آپ ﷺ ان میں سے کچھ ہوا تو وہ مجھ پر قطعاً مخفی اور پوشیدہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ اٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ بہتر ہیں یا ہاشم، آپ اچھے ہیں یا عبدالمطلب آپ بہتر ہیں یا عبداللہ؟ پس آپ ہمارے الٰہوں اور معبودوں کو گالیاں کیوں دیتے ہیں ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کیوں قرار دیتے ہیں؟ پس اگر آپ حکومت اور سرداری چاہتے ہیں تو ہم آپ سے یہ معاہدہ کریں گے کہ آپ ہم میں سے ارجح اور فائق ہیں اور جب تک آپ زندہ ہیں آپ ہمارے سردار ہیں اور اگر آپ شادی کی خواہش رکھتے ہیں تو ہم قریش کی بیٹیوں میں سے ایسی دس عورتوں سے آپ کی شادی کر دیں گے جنہیں آپ پسند کریں گے اور چن لیں گے اور اگر مال و دولت کے خواہشمند ہیں تو ہم آپ کے لئے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ آپ بھی اور آپ کے بعد آنے والی نسل بھی مستغنی اور دولت مند ہو جائے گی۔ اس ساری گفتگو کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے (صرف اس کی گفتگو ساعت فرماتے رہے) پس جب وہ اپنی گفتگو سے فارغ ہوا اور خاموش ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا ...... الی قولہ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ الآیۃ ۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت تک پہنچے تو عتبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنی قرابت اور رشتہ داری کی قسم دیکر یہ التجا کی کہ بس اسی پر رک جائیں آگے نہ پڑھیں۔ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر قریش کے پاس جانے کی بجائے سیدھا اپنے گھر کی طرف لوٹ گیا اور ان سے روپوش ہو گیا چھپ گیا۔

ابو جہل نے کہا اے گروہ قریش! ہم دیکھ رہے ہیں کہ عتبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف جھک گیا ہے اور آپ کے کھانے نے اسے انتہائی خوش اور آپکا گرویدہ بنا دیا ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسے فقر و افلاس نے آ گھیرا ہے پس تم ہمارے ساتھ اس کے پاس چلو۔ چنانچہ وہ ملکر اس کے پاس گئے تو جاتے ہی ابو جہل نے اسے کہا اے عتبہ! تم ہمارے پاس صرف اس لیے نہیں آئے کہ تمہارا جھکاؤ اور میلان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ہو گیا ہے اور تمہیں ان کے کھانے نے انتہائی خوش اور مدہوش کر دیا ہے۔ اگر واقعۃً تم

نہیں) البتہ میں ان کے پاس گیا اور آپ کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا لیکن آپ نے مجھے ایسا جواب دیا جو قسم بخدا! نہ شعر ہے نہ کہانت اور نہ ہی وہ جادو ہے پھر عتبہ نے یہ سورۃ اس قول باری تعالیٰ تک پڑھ کر سنائی اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ۔ (کہ جب آپ نے یہ سورۃ یہاں تک پڑھ کر مجھے سنائی) تو میں نے آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر آپ کو روک دیا اور میں نے آپ کو رشتہ داری کا واسطہ دیکر کہا کہ آپ یہیں رک جائیں۔ اور تم یہ یقیناً جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کوئی شئی کہتے ہیں تو آپ جھوٹ نہیں بولتے۔ اور مجھے تو یہ خوف ہونے لگا کہ تم پر عذاب نازل ہونے لگے گا(1)۔

محمد بن کعب قرظی کا بیان ہے کہ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ عتبہ بن ربیعہ انتہائی حلیم الطبع سردار تھا۔ ایک دن وہ قریش کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا اکیلے مسجد میں تشریف فرما تھے تو اس نے کہا اے گروہ قریش! کیا میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اٹھ کر نہ چلا جاؤں اور آپ سے جا کر کچھ گفتگو کروں اور کچھ امور آپ کے سامنے جا کر رکھوں شاید وہ ان میں سے بعض کو قبول کر لے۔ پس ہم وہ انہیں پیش کر دیں گے اور وہ ہم سے باز آ جائیں گے۔ (یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اسلام قبول کر چکے تھے اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔) تو اہل مجلس نے اسے کہا کیوں نہیں؟ اے ابوالولید! تم اٹھو اور آپ کے پاس جاؤ اور آپ سے گفتگو کرو چنانچہ عتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور جا کر کہا اے بھتیجے! بیشک آپ ہم میں سے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ آپ کا خاندان بھی وسیع ہے اور نسبی اعتبار سے بھی آپ ایک خاص مقام رکھتے ہیں لیکن آپ نے ایک عظیم کام کیا ہے، جس کے سبب آپ نے تمام میں پھوٹ ڈال دی اور انہیں تقسیم کر دیا اور دانا اور عقلمند لوگوں کو تم نے احمق اور بیوقوف قرار دیا، ان کے معبودوں کی عیب جوئی کی اور ان کے آباؤ اجداد کو کافر قرار دیا۔ لہٰذا آپ میری بات سنیں میں چند امور آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں آپ ان میں غور و فکر فرمالیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوالولید! کہو (جو کہنا چاہتے ہو۔) تو اس نے کہا اے بھتیجے! جو دعویٰ کرتے ہو اگر اس سے تمہارا مقصود مال حاصل کرنا ہے تو ہم اپنے اموال میں سے تمہارے لئے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے۔ اور اگر تم اس سے عزت و شرف اور سرداری کی خواہش رکھتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں اور اگر اس دوران آپ کو کوئی چیز (جن بھوت وغیرہ) دکھائی دیتی ہے جسے آپ دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو ہم آپ کے علاج معالجے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا شاید یہ شعر ہوں جن کے سبب تمہارا سینہ جوش مارتا ہو تو اے بنی عبدالمطلب! مجھے اپنی عمر کی قسم تم اس کے بارے وہ قدرت رکھتے ہو کہ تمہارے سوا اس پر کوئی اتنا قادر نہیں۔ یہاں تک جب وہ کلام سے فارغ ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا! اے ابوالولید! کیا تو کلام سے فارغ ہو گیا ہے؟ تو اس نے کہا جی ہاں! (میرا کلام مکمل ہو چکا ہے) تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب مجھ سے سن۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پڑھنا شروع کیا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ پڑھ رہے تھے جبکہ عتبہ اپنے ہاتھ پشت کے پیچھے کر کے ان پر سہارا لیے بیٹھ کر خاموشی کے ساتھ پوری توجہ سے قرآن کریم سن رہا تھا حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت آیت سجدہ پر ختم کی اور سجدہ کیا پھر ارشاد فرمایا اے ابوالولید! تو نے سنا! یہ اس کا جواب ہے جو تو نے کہا۔

تمہارے پاس بدلا ہوا چہرہ لیکر آ رہا ہے (یعنی اب اس کے خیالات وہ نہیں ہیں جو وہ لیکر گیا تھا۔) پس جب وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا تو ساتھیوں نے پوچھا اے ابوالولید! کیسے واپس آئے ہو (کونسی خبر لائے ہو؟) تو اس نے جواب دیا خبر یہ ہے کہ میں نے ایسا کلام سنا ہے خدا کی قسم! میں نے اس کی مثل کلام کبھی بھی نہیں سنا نہ تو وہ شعر ہے اور نہ ہی سحر اور نہ ہی وہ کہانت ہے۔ اے گروہ قریش! تم میری بات مانو اور اس آدمی کا راستہ چھوڑ دو جو کچھ یہ کہتا ہے اسے کہنے دو اور کرنے دو تم اس سے علیحدہ ہو جاؤ اور اس سے کوئی تعرض نہ کرو۔ میں نے اس سے جو کلام سنا ہے قسم بخدا! وہ حقیقت ہو کر رہے گا لہٰذا اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو تم اپنے مقصد کو پانے میں کچھ کئے بغیر کامیاب ہو جاؤ گے اور اگر یہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور اس طرح تم اس کے سبب تمام لوگوں میں زیادہ سعادتمند اور خوش بخت ہو جاؤ گے۔ یہ سن کر ساتھیوں نے کہا اے ابوالید! قسم بخدا! اس نے تجھ پر اپنی زبان سے جادو کر دیا ہے۔ عتبہ نے جواب دیا تمہارے لیے میری یہی رائے ہے اب جو تم چاہو وہ کرو (1)۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝

''پس قوم عاد نے تو سرکشی اختیار کی زمین میں ناحق اور کہنے لگے ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ کیا انہوں نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوی ہے۔ اور وہ (تو) ہمیشہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے [1]۔ پس ہم نے بھیج دی ان پر سخت ٹھنڈی تند ہوا منحوس دنوں میں تاکہ ہم انہیں چکھائیں ذلت آمیز عذاب اس دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب تو بہت زیادہ رسوا کن ہوگا اور ان کی ہرگز مدد نہ کی جائے گی [2]۔''

[1]۔ قوم عاد نے بغیر کسی استحقاق کے اپنے آپ کو اہل زمین سے برتر اور عظیم سمجھا (انہوں نے اتنا تکبر اور رعونت اختیار کر لی کہ جب انہیں عذاب سے ڈرایا گیا تو وہ اپنی شوکت و سطوت اور قوت و طاقت پر غرور و تکبر کرتے ہوئے کہنے لگے ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ یعنی ہم سے بڑھ کر کوئی قوت و طاقت والا نہیں۔ ہم اپنی قوت و طاقت سے عذاب کو دور ہٹا دیں گے (ان کی قوت کا عالم یہ تھا) کہ ان میں سے ہر کوئی پہاڑ سے بھاری بھرکم سخت چٹان اکھیڑ کر جہاں اسے رکھنا چاہتا رکھ لیتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد کرتے ہوئے فرمایا کیا انہوں نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوی ہے؟ اَوَلَمْ يَرَوْا میں استفہام انکاری ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے قالوا ذلک ولم یروا۔ (کیا انہوں نے یہ کہا ہے اور وہ نہیں جانتے؟)۔

اور وہ تو ہمیشہ ہماری آیات یعنی معجزات کا انکار کرتے تھے، یعنی وہ جانتے تھے کہ یہ حق ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ان کا انکار کرتے

یہ الصر سے ماخوذ ہے۔اس کا معنی سردی اور ٹھنڈک ہے اور یصر کا معنی ہے جمع رہنا۔اور مضبوط رہنا۔یاالصرۃ سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے چیخ و پکار، شور وغل۔

فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ میں ابن کثیر، نافع، ابوعمرو اور یعقوب نے حاء کو ساکن پڑھا ہے اور باقیوں نے مکسور۔ان سے مراد وہ دن ہیں جو ان کے حق میں انتہائی منحوس تھے۔ضحاک نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین سال تک ان سے بارش کو روکے رکھا اور ان پر بغیر بارش کے ہوائیں چلتی رہیں (1)۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ شوال کے آخر میں ایک بدھ سے لیکر دوسرے بدھ تک کے ایام تھے۔اور ہر قوم کو عذاب بدھ کے دن ہی دیا گیا۔

عَذَابَ الْخِزْيِ سے مراد رسوا کن اور ذلت آمیز عذاب ہے۔عذاب کی خزی کی طرف اضافت موصوف کی صفت کی طرف اضافت ہے جیسا کہ رجل الحرب اور حاتم الجود میں ہے اور اس کی دلیل وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى ہے۔اصل میں اسی طرح ہے ترکیب کلام میں وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى کا عطف ارسلنا پر ہے دراصل اخزی، معذب (جسے عذاب دیا گیا) کی صفت ہے، لیکن مبالغہ کے لئے مجازاً عذاب کی صفت اخزی بیان کی گئی ہے۔معنی یہ ہے کہ آخرت کا عذاب تو بہت رسوا کن ہوگا اور ان سے عذاب دور کر کے ان کی ہرگز مدد نہیں کی جائے گی۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۚ﴿١٧﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿١٨﴾ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٩﴾

"باقی رہے ثمود تو انہیں ہم نے سیدھی راہ دکھائی انہوں نے پسند کیا اندھے پن کو ہدایت پر تو پکڑ لیا انہیں اس عذاب کی کڑک نے جو رسوا کن ہے ان کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے [1] اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے تھے اور (اللہ کی نافرمانی سے) ڈرتے رہتے تھے [2] اور (ذرا خیال کرو) اس دن کا جب جمع کیے جائیں گے اللہ کے دشمن آتش (جہنم) کی طرف پھر وہ (گروہوں میں) بانٹ دیئے جائیں گے [3]"

[1] ہم نے قوم ثمود کی طرف رسل علیہم السلام کو بھیجا اور خیر وشر کے بارے میں ان کی خوب راہنمائی کی اور راہ ہدایت ان کے سامنے واضح کی۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح بیان کیا ہے (2)۔لیکن انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دی اور ایمان کے مقابلے میں جہالت اور کفر کو اختیار کیا۔تو انہیں آسمان کی طرف سے ذلت آمیز، رسوا کن مہلک ترین عذاب کے لئے صٰعِقَةُ کی ایک چیخ اور کڑک نے پکڑ لیا۔اظہار مبالغہ کے لئے صٰعِقَةُ کی اضافت عذاب کی طرف اور عذاب کی صفت الْهُوْنِ (رسوا کن) بیان کی گئی ہے بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے گمراہی اور ضلالت کو پسند کیا تھا اسی کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہوا۔

[2] اور ہم نے ان لوگوں کو اس عذاب سے بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے تھے۔

[3] اور یاد کرو اس دن کو جب اللہ تعالیٰ کے دشمن جمع کئے جائیں گے۔نافع اور یعقوب نے یحشر کی بجائے صیغہ جمع متکلم معروف

غائب یحشر نصب پڑھا ہے اور اعداء اللّٰہ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ اور انہیں آتش جہنم کی طرف ہانکا اور دھکیلا جائے گا۔

قتادہ اور سدی نے کہا ہے ان میں سے پہلوں کو روک دیا جائے گا تا کہ آخر میں آنے والے ان سے جاملیں(1)۔علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس سے مقصود اہل جہنم کی کثرت کا اظہار ہے(2)۔

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲۰ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۱

''یہاں تک کہ جب وہ دوزخ کے قریب آجائیں گے (تو حساب شروع ہوگا اسوقت) گواہی دیں گے ان کے خلاف ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے[1] اور وہ کہیں گے اپنی کھالوں سے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی وہ کہیں گے (ہم بے بس ہیں) ہمیں تو گویا کر دیا ہے اللہ نے جس نے گویا کیا ہے ہر شے کو اور اسی نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی مرتبہ اور اب اسی کی طرف تم لوٹائے جا رہے ہو[2]''

[1] حتی ابتدائیہ ہے۔یہاں تک کہ جب وہ دوزخ کے قریب حاضر ہوجائیں گے اِذَا مَا میں ما زائدہ ہے جو کہ شہادت کو حضور (حاضری) کے ساتھ ملانے کی تاکید کے لئے ہے۔

سدی اور ایک جماعت کا قول ہے کہ جلود سے مراد شرمگاہیں ہیں۔اور مقاتل نے کہا ہے کہ ان کے اعضاء بول پڑیں گے(3) (اور ان کے خلاف شہادت دیں گے) امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے کہ آپ اچانک مسکرانے لگے۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ کس کے سبب میں مسکرا رہا ہوں؟ ہم نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول معظم صلی اللہ علی وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے مسکرانے کا سبب یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے اس طرح عرض کناں ہوگا اے میرے پروردگار! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دے دی ہے؟ (یعنی کیا تو نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ کسی پر ظلم نہیں کیا جائیگا) تو رب کریم فرمائے گا کیوں نہیں تو پھر بندہ عرض کرے گا میں اپنے خلاف کوئی شاہد قبول نہیں کروں گا مگر وہی جس کا تعلق مجھ سے ہو۔تو رب کریم فرمائے گا آج کے دن تیرے خلاف تیرے نفس کی شہادت ہی کافی ہے۔اور تیرے خلاف اعمال لکھنے والے فرشتے (کراماً کاتبین) ہی شہادت دیں گے۔چنانچہ اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضائے بدن کو کہا جائیگا تم بولو۔چنانچہ وہ اس کے اعمال کے بارے گفتگو کریں گے پھر اس کے منہ سے مہر ہٹا دی جائے گی) اور اعضائے بدن اور اس کے درمیان گفتگو کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی تو وہ انہیں کہے گا دور ہو جاؤ تمہارے لیے پھٹکار ہو میں تو تمہاری طرف سے ہی جھگڑ رہا تھا اور تمہارا ہی دفاع کر رہا تھا(4)۔

بول۔ تو اس کی ران اس کا گوشت اور ہڈی اس کے اعمال کے بارے شہادت دیں گے(1)۔

۲؎ اور جنہیں آتش جہنم کی طرف جمع کیا جائے گا وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ تم دور ہٹ جاؤ تم پر پھٹکار ہو۔ ہم تو تمہاری طرف سے ہی جھگڑ رہے تھے اور تمہارا ہی دفاع کر رہے تھے یہ سوال محض زجر و توبیخ کے لئے ہوگا۔ وہ کہیں گے (ہم تو بے بس ہیں) ہمیں اللہ تعالیٰ نے گویا کر دیا ہے جس نے ہر بولنے والی شئی کو گویا کیا ہے اور اسی نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم لوٹائے جا رہے ہو۔

وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ میں حصر، اہتمام اور رعایت فواصل کے لئے ظرف کو مقدم کیا گیا ہے یہ مکمل جملہ یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ یہ بھی اعضائے بدن کے کلام میں سے ہو۔ اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو۔ مابعد کلام میں بھی یہ دونوں احتمال ہیں۔

شیخین نے صحیحین میں اور علامہ بغوی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ بیت اللہ شریف کے پاس دو ثقفی اور ایک قریشی یا دو قریشی اور ایک ثقفی جمع ہوئے وہ انتہائی بھاری بھرکم آدمی تھے ان کے پیٹوں پر چربی بہت زیادہ تھی لیکن ان میں فہم و فراست کی استعداد بہت کم تھی۔ تو ان میں سے ایک کہنے لگا تمہارا کیا خیال ہے جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں کیا یہ اللہ تعالیٰ سنتا ہے؟ تو دوسرے نے کہا جو کچھ ہم بلند آواز سے کہتے ہیں اسے تو وہ سنتا ہے اور جو ہم آہستہ آواز سے کہتے ہیں وہ نہیں سنتا اور تیسرے نے کہا کہ اگر ہم بلند آواز سے بات کریں تو وہ سنتا ہے تو پھر وہ ہماری ان باتوں کو بھی سنتا ہے جو ہم آہستہ آواز سے کہتے ہیں(2) علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ وہ ثقفی تو عبدیا لیل تھا اور دو قریشی ربیعہ اور صفوان بن امیہ کے داماد تھے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں(3)۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿۲۴﴾

"اور تم نہیں چھپا سکتے تھے اپنے آپ کو اس امر سے کہ گواہی نہ دیں تمہارے خلاف تمہارے کان اور نہ تمہاری آنکھیں اور نہ تمہاری کھالیں بلکہ تم تو یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہی نہیں تمہارے اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو۔ ۱؎ اور تمہارے اسی گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے تمہیں ہلاک کر دیا پس تم ہو گئے نقصان اٹھانے والوں سے ۲؎ پس وہ صبر کریں (یا نہ کریں) آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہے اور اگر وہ (اس وقت) رضائے الٰہی چاہیں گے تو وہ ان میں سے نہیں ہونگے جن پر اللہ راضی ہوا ۳؎"

۱؎ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اکثر اہل علم کے نزدیک تَسْتَتِرُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ تم چھپا نہیں سکتے تھے۔ مجاہد نے کہا ہے اسکا معنی ہے تم ڈرتے نہیں تھے [illegible]

برے اعمال کو نہیں چھپاتے تھے کہ تمہارے کان' تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں تمہارے خلاف شہادت دیں گے۔ جتنا کہ تم ذلت اور رسوائی کے خوف سے لوگوں سے اپنے برے اعمال کو چھپاتے تھے۔ گویا اس کا مفہوم یہ ہوا کہ تم یہ گمان نہیں کرتے تھے کہ تمہارے اعضائے بدن تمہارے خلاف شہادت دیں گے اور اس میں اس بات پر متنبہ کیا جارہا ہے کہ تم یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بہت سے اعمال کو جانتا ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ تم جو اعمال بھی کرتے رہے بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ کرتے رہے۔

۲؎ ذلکم ترکیب کلام میں مبتدا ہے اور ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدٰكُمْ مبتدا کی دو خبریں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ظَنُّكُمُ الَّذِي۔ ذلکم اسم اشارہ سے بدل ہو اور اَرْدٰكُمْ اس کی خبر ہو۔ معنی یہ ہے کہ تمہارے اسی گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے تمہیں ہلاک کر دیا۔ پس تم نقصان اٹھانے والوں سے ہو گئے۔

۳؎ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے حال کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا پس اگر وہ آگ میں صبر کریں (یا نہ کریں) آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہے۔ ان کے لئے اس سے قطعاً نجات نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ اس وقت رضائے الٰہی چاہیں گے اور وہ عقبیٰ کے طالب ہونگے عقبیٰ سے مراد اس شئی کی طرف لوٹنا اور رجوع کرنا ہے جسے وہ پسند کرتے ہیں۔ تو وہ ان میں سے نہیں ہونگے جن پر اللہ راضی ہوا۔ یعنی ان کی خواہش اور آرزو پوری نہیں ہوگی۔

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَّا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ﴿٢٥﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ﴿٢٦﴾

''اور ہم نے مقرر کر دیئے ان کے لئے کچھ ساتھی پس انہوں نے آراستہ کر دکھایا انہیں اگلے اور پچھلے گناہوں کو اور ثابت ہو گیا ان پر فرمان (عذاب) ان قوموں کی طرح جو ان سے پہلے گزر چکی تھیں۔ جنوں اور انسانوں سے۔ وہ سب (اگلے پچھلے) نقصان اٹھانے والے تھے ۱؎ اور کہنے لگے وہ کافر مت سنا کرو اس قرآن کو اور شور و غل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان شاید تم (اس طرح) غالب آجاؤ ۲؎''

۱؎ قَيَّضْنَا کا معنی ہے ہم نے بھیج دیئے اور ہم نے مقرر کر دیئے۔ مقاتل نے کہا ہے اس کا معنی ہے ہم نے مہیا کر دیئے اور ہم نے تیار کر دیئے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف ابتدائے سورہ میں اس قول پر ہے فاعرض اکثرھم وقالوا قلوبنا فی اکنۃٍ اور ان کے درمیان جملے معترضے ہیں۔ لھم کی ضمیر ان کافروں کے لئے۔ قرناد (ساتھی) یہ قرین کی جمع ہے جیسا کہ کریم کی جمع کرماد ہے۔ یعنی شیاطین میں سے ساتھی جو ان پر اس طرح غالب اور مسلط ہیں جیسے انڈے پر اس کا خول ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے قیض سے مراد بدل اور عوض ہے اسی سے بیع مقایضہ ہے۔ (یعنی سامان کا سامان سے تبادلہ کرنا۔)

پس انہوں نے انہیں اگلے اور پچھلے گناہوں کو آراستہ کر دکھایا۔ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ سے مراد امور دنیا اور شہوات کی اتباع و ہوس ہے۔ اور وَمَا

ترکیب کلام میں حَقَّ عَلَيْهِمُ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ یعنی كائنين في جملته امم۔ اور قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ فِيْٓ اُمَمٍ کی صفت ہے۔ یعنی ترجمہ ان امتوں میں سے جو انسانوں اور جنوں میں سے ان سے پہلے گزر چکی تھیں۔ اور انہوں نے ان کی طرح کے اعمال کئے۔

ترکیب کلام میں مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ، امم کی دوسری صفت ہے۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ کا معنی یہ ہے۔ کہ وہ سب اگلے پچھلے نقصان اٹھانے والے تھے کیونکہ انہوں نے عذاب کا سبب بننے والے اعمال کو ایسے اعمال پر ترجیح دی جو رحمت کا سبب بنتے ہیں۔ گویا یہ جملہ ان کے عذاب کا مستحق بننے کی علت بیان کر رہا ہے۔ اور انّهم کی ضمیر یا تو کفار کی طرف لوٹ رہی ہے یا پھر اس کا مرجع امم ہیں۔

۲؎ اور اہل مکہ میں سے بعض کہنے لگے۔ اس قرآن کو مت سنا کرو اور اس کی تلاوت کے درمیان شور و غل مچا دیا کرو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ابوجہل نے کہا جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھو کہ وہ قرآن پڑھ رہے ہیں تو تم ان کے سامنے رجز اور شعر پڑھا کرو یا فضول باتیں خوب کیا کرو۔

مجاہد نے کہا ہے کہ یہاں شور و غل مچانے سے مراد تالیاں اور سیٹیاں بجانا ہے۔ ضحاک نے کہا ہے اس کا معنی ہے تم خوب کثرت سے باتیں کیا کرو اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہوں اسے خلط ملط کر دیا کرو۔ اور سدی کا قول ہے کہ اس کا معنی ہے اس کے سامنے خوب چیخ و پکار اور شور و غل کیا کرو شاید اس طرح تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت پر غالب آ جاؤ۔

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝

"پس ہم ضرور چکھائیں گے کفار کو شدید عذاب (کا مزہ) اور انہیں بدلہ دیں گے بہت برا اس (نافرمانی) کا جو وہ کیا کرتے تھے ۱؎ یہ ہے سزا اللہ کے دشمنوں کی یعنی آگ ان کے لیے اس میں ہی ہمیشہ ٹھہرنے کا گھر ہے۔ یہ سزا ہے اس بات کی کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے ۲؎ اور کافر کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں دکھا وہ دونوں (شیطان) جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا جنوں اور انسانوں سے ہم انہیں روند ڈالیں گے اپنے قدموں کے نیچے تاکہ وہ ہو جائیں پست ترین لوگوں سے ۳؎"

۱؎ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ ایک تو ان کے کفر پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے اور دوسرا اس لئے تاکہ یہ حکم انہیں اور دیگر تمام کفار کو شامل ہو جائے۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ ہم یقیناً انہیں ان کے برے اعمال کا بدلہ دیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم بالیقین انہیں ان کے اس کفر کا بدلہ دیں گے جو ان تمام اعمال میں سب سے برا تھا جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔

۲؎ ذالک (اسم اشارہ) مبتدا ہے اور اس کا مشار الیہ اسوا ہے۔ اور جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ اس کی خبر ہے النار، جزاء سے عطف بیان ہے یا پھر یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ دار الخلد سے مراد دار الاقامہ (قیام گاہ) ہے جزاء فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے [illegible]

یجحدون کا معنی یہ ہے کہ وہ حق کا انکار کرتے تھے یا معنی یہ ہے کہ وہ قراۃ قرآن کے وقت شور وغل اور لغو باتیں کرتے تھے اور یہاں جحود (انکار) کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہ انکار ہی ان کے شور وغل کرنے کا حقیقی سبب تھا۔

۳؎ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے۔ یعنی کفار کو یہ عذاب دیا جائے گا اور وہ آگ میں پھینک دیئے جانے کے بعد کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں دکھا وہ دونوں (شیطان) جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا جنوں اور انسانوں سے۔ یعنی ان دونوں انواع کے وہ دونوں شیطان جو انہیں گمراہی اور گناہ پر اکساتے اور برانگیختہ کرتے تھے۔ وہ دکھا بعض نے کہا ہے کہ دونوں شیطانوں سے مراد ابلیس اور قابیل بن آدم علیہ السلام ہے۔ کیونکہ یہی دونوں کفر ومعصیت کی بنیاد رکھنے والے تھے۔

ارنا کو ابن عامر، ابن کثیر، یعقوب۔ ابوبکر اور السوسی نے تخفیف، یعنی را کے سکون کے ساتھ ارنا پڑھا ہے۔ ان کی یہ قرات اسی مقام کے ساتھ خاص ہے مگر الدوری نے را کے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ اور باقیوں نے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔

ہم انہیں آگ میں اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالیں گے تاکہ وہ پست ترین لوگوں سے ہو جائیں، یعنی تاکہ وہ جہنم کے سب سے نیچے والے حصہ میں ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تاکہ وہ دونوں ہماری نسبت شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو جائیں(1)۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

”بیشک وہ (سعادتمند) جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قول پر پختگی سے قائم رہے ۱؎ اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ۲؎“

۱؎ رَبُّنَا اللّٰهُ کا معنی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہوئے اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر صراط مستقیم کو لازم پکڑ لیا۔ محلی نے کہا ہے کہ یہ آیت طیبہ خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی ہے۔ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ میں ثم اس پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ استقامت کا رتبہ اقرار ربوبیت سے موخر ہے۔ استقامت سے مراد اعتدال اختیار کرنا کج روی اختیار نہ کرنا اور حق سے کسی بھی اعتبار سے انحراف نہ کرنا ہے، نہ ہی اعتقاد کے اعتبار سے اور نہ ہی اخلاق واعمال کے لحاظ سے(2)۔

صاحب قاموس نے کہا ہے استقام بمعنی اعتدال اور قومتہ، بمعنی عدلتہ، میں نے اسے سیدھا کر دیا اور قویم اور مستقیم دونوں ہم معنی ہیں۔ اسی سے صراط مستقیم بھی ہے، یعنی وہ سیدھا اور ہموار راستہ جو چلنے والے کو بالیقین منزل اور مطلوب تک پہنچاتا ہے استقامت ایک مختصر لفظ ہے جو کہ جمیع احکام شرعیہ کو شامل ہے، چاہے ان کا تعلق ایسے اوامر سے ہو جن کی ادائیگی لازم اور ضروری ہے یا ان کا تعلق منہیات سے ہو جن سے اجتناب کرنا اور باز رہنا لازم اور ضروری ہو۔ بشرطیکہ اس ادائیگی اور اجتناب پر دوام وثبات حاصل ہو(3)۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اسلام کے بارے میں مجھے ایسا قول ارشاد فرمائیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد (اور ایک روایت

کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر) کسی سے سوال کی ضرورت نہ پڑے۔تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا ''قل امنت باللّٰہ ثم استقم ''(کہو میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا پھر اس قول پر استقامت اور پختگی اختیار کرلو) اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق (۱) سے استقامات کے بارے میں پوچھا گیا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا(اَنْ لَا تُشْرِکَ باللہ شیئا)

حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا''الاستقامۃ ان تستقیم علی الا مر والنھی و لا تروغ روغان الثعالب''(کہ استقامت سے مراد امر ونہی پر مضبوطی سے عمل کرنا اور لومڑی کی طرح ادھر ادھر مڑنے کی حیلہ سازی نہ کرنا ہے۔)

حضرت عثمان ذوالنورین بن عفان رضی اللہ عنہ نے استقامت کے بارے فرمایا ''اخلصو العمل للّٰہ''کہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرو)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے استقامت کے بارے فرمایاادو الفرائض، یعنی استقا موکا معنی ہے انہوں نے فرائض ادا کئے(2)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی ہے انہوں نے فرائض ادا کرنے میں استقامت اختیار کی۔حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری پر عمل پیرا رہے اور معصیت وگناہ سے اجتناب کرتے رہے۔مجاہد اور عکرمہ کا قول یہ ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت دینے پر مضبوطی سے ڈٹے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ معرفت پر مضبوطی سے قائم رہے اور اسے کبھی نہیں چھوڑا(3)۔

جتنی عبارات ہم نے ذکر کی ہیں ان میں حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے وہ امر ونہی پر مضبوطی سے قائم رہے اور لومڑی کی طرح ادھر ادھر نہ مڑے۔اور حضرت علی، ابن عباس اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے کہ استقامت کا لفظ ان تمام امور کو شامل ہے جنہیں ادا کرنا اور جن سے اجتناب کرنا اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، چاہے ان کا تعلق عقائد سے ہو یا اخلاق واعمال سے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شئی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ انہوں نے اعمال خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کیے ان تمام میں اس چیز کی وضاحت ہے کہ ان کے عمل میں قطعاً شہرت اور ریا کاری مطلوب نہیں ہوتی۔اور یہی معنی مجاہد اور عکرمہ کے قول کا بھی ہے۔پس استقامت کا قلب ونفس کو فنا کئے بغیر

1۔صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 48 (قدیمی)
2۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93-92 (التجاریۃ)
3۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (التجاریۃ)

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے فرمایا تم ان دونوں آیتوں کے بارے کیا کہتے ہو؟ ان الذین قالو ربنا اللّٰہ ثم اسقامو اور الذین امنوا و لم یلبسو ایمانھم بظلم۔تو انہوں نے جواب دیا کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے انہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر اس کے مطابق عمل کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر پوری استقامت کے ساتھ کاربند رہے اور گناہ کا ارتکاب نہ کیا۔ اور لم یلبسو بظلم۔ کا معنی بھی یہی ہے کہ انہوں نے گناہ نہیں کیا ہے۔آپ نے فرمایا تم نے اس آیت کو انتہائی شدید امر پر محمول کیا ہے۔آپ نے فرمایا آیت الذین امنو او لم یلبسو ایمانھم بظلم۔کا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنے ایمانوں کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کیا اور آیت الذین قالو ربنا اللّٰہ ثم استقامو۔ کا مطلب ہے کہ پھر وہ بتوں کی عبادت کی طرف نہیں لوٹے شیخ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالۃ الخفاء میں اسی طرح بیان کیا ہے نسائی، بزار اور ابویعلی وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی

اور معرفت الٰہی حاصل کئے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ صوفیہ نے بھی بیان کیا ہے اور مقاتل کے قول کا مفہوم بھی یہی ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب بھی یہ آیت تلاوت کرتے تھے تو ساتھ یہ دعا کرتے تھے اللهم انت ربنا فارزقنا الاستقامة۔ (اے اللہ! تو ہمارا پروردگار ہے ہمیں استقامت کی توفیق عطا فرما۔)(1) حضرت حسن بصری صوفیہ کے سرخیل تھے اکثر سلاسل کی انتہاء آپ پر ہی ہوتی ہے۔

یعنی ان پر موت کے وقت فرشتے اترتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔

قتادہ اور مقاتل کا قول یہ ہے کہ جب وہ اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو ان پر فرشتے اتریں گے (2)۔

وکیع بن جراح نے کہا ہے خوش خبری، بشارت تین مقامات پر ملے گی موت کے وقت قبر میں اور قبر سے اٹھائے جانے کے وقت (3)، الا تخافوا فرشتے آکر کہیں گے تم خوف نہ کرو۔ اس میں اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ اس وحی کے معنی کو متضمن ہے جو قول کے معنی میں ہے۔ یا یہ ان مخففہ عن المثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے۔ یا پھر ان مصدریہ ہے، یعنی امر آخرت میں سے جس پر تم آگے پیش ہور ہے ہو اس سے خوفزدہ نہ ہو۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے اور جو اہل وعیال اور اولاد میں سے تم پیچھے چھوڑ آئے ہو ان کے بارے غمزدہ نہ ہو کیونکہ ان کی جگہ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ خوف سے مراد ایسا غم ہے جو مستقبل میں آنے والی متوقع مصیبت اور تکلیف پر ہوتا ہے اور حزن سے مراد ایسا غم ہے جو کسی نفع بخش چیز کے ضائع ہونے یا نقصان دہ چیز کے لاحق ہونے کے سبب ہونے والی تکلیف اور دکھ کے سبب ہوتا ہے۔ عطاء بن ابی رباح نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے گناہوں کی بنا پر نہ خوفزدہ ہو اور نہ ہی کوئی حزن وملال کرو، یعنی سزا کا خوف نہ رکھو اور گناہوں کے صادر ہونے پر غمزدہ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا (4)۔ تمہیں بشارت ہو اس جنت کی جس کا دنیا میں رسولوں کی زبانی تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ابونعیم نے ثابت بنانی کے بارے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے جب سورہ حم السجدہ پڑھی تو جب ارشاد باری تعالیٰ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔ پر پہنچے تو فرمایا کہ ہم تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ جب بندہ مومن کو اپنی قبر سے اٹھایا جائے گا تو اس سے وہی دو فرشتے آکر ملیں گے جو دنیا میں اس کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اسے یہ کہیں گے تو نہ خوف کر اور نہ ہی غمزدہ ہو تجھے اس جنت کی بشارت ہو جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اسے خوف سے محفوظ فرمادے گا اور اس کی آنکھوں کو ٹھنڈا رکھے گا۔

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿۳۲﴾

''ہم تمہارے دوست ہیں دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ شے ہے جو تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم مانگو گے[1] یہ میزبانی ہے بہت بخشنے والے ہمیشہ رحم فرمانے والے کی طرف سے[2]۔''

1۔ ہم دنیا میں تمہارے ساتھ تھے۔ شیاطین سے تمہاری حفاظت کرتے تھے اور تمہارے ذہنوں میں اچھی اور خیر کی باتیں القا کرتے

تھے اور آخرت میں بھی ہم تمہارے دوست ہیں۔ ہم تم سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ اور تمہارے لیے جنت میں وہ لذتیں اور عزتیں ہیں جن کی خواہش تمہارے دل کریں گے۔ اور تمہارے لیے ہر وہ چیز ہوگی جس کی تم تمنا اور آرزو کرو گے۔ تدعون، دعا سے ماخوذ ہے یہ طلب کے معنی میں ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ عام ہے۔

لے ترکیب کلام میں نزلا، ما تدعون سے حال ہے۔ اور اس میں اس بات پر مطلع کیا جا رہا ہے کہ جس شئی کی وہ آرزو اور تمنا کریں گے اس کے مقابلہ میں انہیں وہ کچھ عطا کیا جائے گا جس کا تصور تک ان کے دل میں نہیں کھٹکے گا۔ اور ان کے لیے یہ عطا ایسے ہی ہوگی جیسے مہمان کے لئے میزبانی ہوتی ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ میزبان ہوگا اور اہل جنت مہمان ہونگے) بزار، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم جنت میں پرندے کی طرف دیکھو گے اور (اس کا گوشت کھانے کی) خواہش کرو گے تو وہ تمہارے سامنے اس حال میں گر پڑے گا کہ بھونا ہوا ہوگا(1)۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ اہل جنت میں سے جو آدمی جونہی جنت میں پرندے (کا گوشت کھانے کی) خواہش کرے گا تو فوراً بختی اونٹ کی مثل پرندہ اس کے دسترخوان پر آ گرے گا۔ اسے نہ دھوئیں نے مس کیا ہوگا اور نہ ہی آگ نے چھوا ہوگا۔ وہ اس سے کھانے لگ جائے گا یہاں تک کہ سیر ہو جائیگا پھر وہ پرندہ (صحیح سالم) اڑ جائیگا(2)۔ ترمذی اور بیہقی نے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب بندہ مومن جنت میں بچے کی خواہش اور آرزو کرے گا تو فوراً اس کی یہ خواہش پوری ہو جائیگی اور ایک گھڑی میں اس کے حمل، پیدائش اور عمر کے مراحل طے ہو جائیں گے ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے(3)۔

ہناد نے الزہد میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور یہی کامل راحت و سرور کا ذریعہ ہے کیا اہل جنت کی اولاد بھی ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب وہ چاہے گا(4) الخ۔

اصبہانی نے الترغیب میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک غیر مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا جب اہل جنت میں سے کوئی آدمی بچہ پیدا ہونے کی تمنا اور خواہش کرے گا تو اس کے حمل، دودھ پینے اور دودھ چھڑانے کی مدت اور اس کی جوانی کے مراحل سب ایک ہی ساعت میں طے ہو جائیں گے(5)۔

علامہ بیہقی نے مرفوع روایت اس طرح نقل کی ہے کہ آدمی جنت میں بچہ پیدا ہونے کی خواہش کرے گا تو وہ بالفور ہو جائیگا۔ علامہ بیہقی نے اسے تاریخ وغیرہ میں نقل کیا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۳﴾

''اور اس شخص سے بہتر کس کا کلام ہے جس نے دعوت دی اللہ کی طرف اور نیک عمل کئے اور کہا کہ میں تو (اپنے رب کے) فرمانبردار بندوں سے ہوں لے''

لے یعنی کسی شخص کا کلام اس سے بہتر نہیں جس نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی توحید کی طرف دعوت دی۔ اور نیک عمل کئے اور کہا میں تو اپنے رب کے فرمانبردار بندوں سے ہوں۔ قول سے مراد فخر کرنا یا اسلام کو دین اور مذہب بتانا ہے یہ مفہوم عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ هذا قول فلان۔ یعنی یہ فلاں کا مذہب ہے۔

محمد بن سیرین اور سدی نے کہا ہے کہ مَنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات ہے حسن نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ بندہ مومن ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے دعوت اسلام کو قبول کیا اور اعمال صالحہ کئے اور کہا میں تو اپنے رب کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں(1)۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میرا خیال ہے کہ یہ آیت مؤذنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے(2)
حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ سے مراد اذان دینا ہے اور وَعَمِلَ صَالِحًا سے مراد اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت نماز ادا کرنا ہے۔

قیس بن حازم نے کہا ہے کہ عَمِلَ صَالِحًا سے مراد اذان اور اقامت کے درمیان نماز پڑھنا ہے(3)۔

حضرت عبداللہ بن معقل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے، ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار فرمایا ہر دو اذانوں کے درمیان اس کے لئے نماز ہے جو پڑھنا چاہے۔ متفق علیہ (4)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نہیں جانتا، تحقیق حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ دعا رد نہیں کی جاتی جو اذان اور اقامت کے درمیان کی جائے۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے(5)۔

اذان کی فضیلت کا بیان: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا قیامت کے دن تمام لوگوں میں مؤذنین کی گردنیں بلند اور طویل ہوں گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(6)۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جہاں تک مؤذن کی آواز جن وانس اور دیگر مخلوق میں سے کوئی سنتا ہے قیامت کے دن وہ اس کے لئے شہادت دے گا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(7)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا امام ضامن ہوتا ہے اور مؤذن امین ہوتا ہے۔ اے اللہ! اماموں کو ہدایت عطا فرما اور مؤذنوں کی مغفرت فرما(8)۔ اسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی اور امام شافعی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے سات سال تک ثواب حاصل کرنے کے لئے خلوص نیت کے ساتھ اذان کہی اس کے لیے جہنم سے برات لکھ دی گئی(9) اسے ترمذی، ابن ماجہ اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تین آدمی جنت کے ٹیلوں (یعنی بلند مقامات) پر ہونگے ایک وہ

غلام جس نے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقا کا حق بھی، دوسرا وہ آدمی جس نے کسی قوم کی امامت کی ذمہ داری ادا کی اور وہ لوگ اس سے راضی اور خوش رہے۔ اور تیسرا وہ آدمی جو ہر روز پانچ نمازوں کے لئے اذان کہے(1)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جہاں تک موذن کی آواز جاتی ہے اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ ہر خشک و تر شئے اس کے لئے شہادت دے گی۔ نماز میں حاضر ہونے والے کے لئے پچیس نمازوں کا ثواب لکھا جاتا ہے اور دو نمازوں کے درمیان ہونے والے گناہ اس سے مٹا دیئے جاتے ہیں(2)، رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ، حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو (وقت) ہیں جن میں دعا رد نہیں کی جاتی یا بہت کم رد کی جاتی ہے ایک اذان کے وقت دعا اور دوسرا جنگ کے وقت کی دعا جبکہ لوگ آپس میں باہم دست وگریبان ہوں(3)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے بارہ سال تک اذان کہی اس کے لئے جنت واجب ہوگی۔ ہر روز اس کے لئے اذان دینے کے سبب ساٹھ نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور ہر اقامت کہنے کے سبب تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(4)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی اذان کے وقت دعا مانگنے کا حکم دیا جاتا تھا(5)۔ اسے علامہ بیہقی نے الدعوات الکبیر میں نقل کیا ہے۔

فصل:۔ اذان کے جواب کا بیان۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم موذن کی اذان سنو تو تم بھی اسی طرح کہو جیسے وہ کہتا ہے پھر مجھ پر درود پاک پڑھو کیونکہ جو ایک بار مجھ پر درود پاک پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلہ کی دعا مانگو۔ وسیلہ جنت میں ایک مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی ایک کو عطا کیا جائے گا۔ اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں امور خلافت سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اذان دینے کی طاقت رکھتا تو ضرور اذان کہتا۔ پس جو میرے لیے وسیلہ کی دعا مانگے گا اس پر میری شفاعت کھل جائیگی (یعنی اسے میری شفاعت نصیب ہوگی۔) اسے مسلم نے روایت کیا ہے(6)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب موذن کہے اللہ اکبر اللہ اکبر تو تم میں سے بھی ہر کوئی کہے اللہ اکبر اللہ اکبر الحدیث۔ یعنی جیسے موذن کہتا ہے تم نے بھی اسی طرح کہا اور جب موذن نے کہا حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح۔ تو سننے والا یہ کہے لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(7)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیشک موذن تو ہم پر فضیلت پا جائیں گے (ہم سے بڑھ جائیں گے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم وہی کہو جیسے وہ کہتے ہیں۔ جب ختم کر چکو تو (جو چاہو) دعا مانگو تمہیں عطا کیا

1۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 65 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 461 (الرشد) 3۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 66 (قدیمی)

جائے گا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(1)۔

وَ لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٣٥﴾ وَ إِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٦﴾

''نہیں یکساں ہوتی نیکی اور برائی برائی کا تدارک اس (نیکی) سے کرو جو بہتر ہے پس ناگہاں وہ شخص، تیرے درمیان اور اس کے درمیان عداوت ہے، یوں بن جائیگا گویا تمہارا جانی دوست ہے[1] اور نہیں توفیق دی جاتی ان (خصائل حمیدہ) کی بجز ان کے جو صبر کرتے ہیں اور نہیں توفیق دی جاتی ان کی مگر بڑے خوش نصیب کو اور (اے سننے والے) اگر شیطان کی طرف سے تیرے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو تو (اس کے شر سے) اللہ کی پناہ مانگ یقیناً وہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے[2]''

[1] نیکی اور برائی جزاء اور حسن انجام کے اعتبار سے یکساں اور مساوی نہیں ہوتی دوسرا لا زائدہ ہے اور نفی کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی جہاں تک انسان کے لئے ممکن ہو اسے چاہیے کہ وہ بری خصلتوں اور عادات کے مقابلہ میں اچھی اور نیک خصلتوں کو ضرور اختیار کرلے۔ اسے چاہیے کہ وہ غضب اور غصے کے مقابلہ میں صبر، جہالت کے مقابلہ میں حلم و بردباری، انتقام کے مقابلے میں عفو و درگزر، بخل کے مقابلہ میں سخاوت، بزدلی کے مقابلہ میں شجاعت و بہادری اور گناہ کے مقابلہ میں عصمت و پاکدامنی کو اختیار کرے اور ترجیح دے۔ اور برائی کا تدارک اس نیکی سے کرو جو بہتر ہے۔ آیت طیبہ میں احسن سے مراد ایسا اچھا اور نیک عمل ہے جس میں مطلقاً نیکی اور اچھائی زیادہ پائی جاتی ہو۔ (ایسا عمل مراد نہیں جو کہ برائی کے مقابلہ میں نسبتاً اچھا ہو) کیونکہ برائی میں تو بالکل اچھائی پائی ہی نہیں جاتی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے جو کسی پر غضب اور غصے کا اظہار کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں صبر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو کسی پر جہالت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں حلم و بردباری اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جو کسی سے برائی سے پیش آتا ہے تو اس کے مقابلے میں عفو و درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ تمام تر نیکیاں یکساں نہیں ہوتیں اور نہ ہی تمام تر برائیاں مساوی ہوتی ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض کو بعض پر نیکی اور برائی میں فوقیت اور برتری حاصل ہوتی ہے، لہٰذا جب تمہارا کوئی دشمن تمہارے ساتھ برائی سے پیش آئے تو اس کا تدارک اور دفاع نیکیوں میں سے احسن ترین نیکی کے ساتھ کرو، جیسا کہ اگر کوئی آدمی تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو اسے معاف کردینا بھی نیکی ہے لیکن اس سے نیکی کرنا اور اچھا برتاؤ کرنا اس سے حسین تر اور اعلیٰ نیکی ہے۔

فَإِذَا الَّذِي میں اذا مفاجاتیہ ہے۔ اسے جملہ کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور اس میں عامل معنی مفاجات ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ

مبتدا ہے اور کانہ الخ خبر ہے اور اذا ظرف تشبیہ کے معنی میں ہے اور قول باری تعالیٰ ادفع الخ جملہ مستانفہ ہے گویا کہ یہ سوال کیا گیا کہ جب کوئی مجھ سے ناروا اور برا سلوک کرے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تو جواباً ارشاد ہوا ادفع الخ۔

مقاتل بن حیان نے کہا ہے یہ آیت ابوسفیان بن حرب کے بارے میں نازل ہوئی ہے(1) مگر یہ قول صحیح اور پختہ نہیں ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور ابوسفیان فتح مکہ کے بعد مشرف باسلام ہوئے۔

لے وَمَا يُلَقّٰهَآ جملہ معترضہ ہے اور معنی یہ ہے کہ یہ خصلت عطا نہیں کی جاتی، یعنی برائی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کرنے کی توفیق مرحمت نہیں فرمائی جاتی مگر انہیں ہی جو نفس اور خواہش کی مخالفت پر صبر کئے رکھتے ہیں اور انہیں ہی یہ توفیق عطا کی جاتی ہے جو تجلیات ذاتیہ اور صفاتیہ میں سے حظ وافر پانے کے سبب بڑے خوش نصیب ہیں۔ کیونکہ نفس پر جب صفات حسنیٰ کی تجلیات پڑتی ہیں تو پھر بری صفات اس سے نکل جاتی ہیں۔

سے وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ کا عطف ادفع پر ہے۔ اما میں ما زائدہ ہے جو اِنْ شرطیہ کے ساتھ متصل ہے۔ نزغ کو نخس کے مشابہ قرار دیا گیا ہے اس کا معنی ہے کچوکا لگانا، وسوسہ اندازی کرنا۔ اور شیطان کچوکے لگاتا ہے، یعنی وہ وسوسہ اندازی کرتا ہے اور معصیت و گناہ کے ارتکاب پر ابھارتا ہے۔ قاموس میں ہے نزغہ جیسا کہ منعہ اس نے اس میں نیزہ چبھویا(2)، نزغ بینھم اس نے ان کے درمیان فساد برپا کر دیا۔ اس نے برانگیختہ کیا اور وسوسہ ڈالا اور یہ سب شیطان کا فعل ہے مگر مجازاً اس کی نسبت اس کے کچوکا لگانے کی طرف کی گئی ہے۔ جیسا کہ جدّہ جدّہ میں ہے۔ اس بنا پر مِنَ الشَّيْطٰنِ میں مِن ابتدائیہ ہے یا پھر نزغ سے مراد مستد الیہ کچوکا لگانے والا ہے اور مبالغہ کے لئے شیطان کا وصف مصدر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور مِنَ الشَّيْطٰنِ اس کا بیان ہے اور اس سے حال ہے اس صورت میں مِن بیانیہ ہوگا) معنی یہ ہے اگر شیطان تجھ میں وسوسہ اندازی کرے اور تجھے انتقام اور برائی کا مقابلہ برائی کے ساتھ کرنے پر برانگیختہ کرے تو اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ اور قطعاً اس کی اطاعت و پیروی نہ کر۔ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ جواب شرط ہے اور جواب امر محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تجھ سے اس شر کو دور فرما دے گا یقیناً وہی تیرے پناہ طلب کرنے کی التجا کو سننے والا ہے اور تیری نیت و صلاحیت میں سے سب کچھ جاننے والا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْـَٔـمُوْنَ ﴿۳۸﴾

"اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے رات بھی ہے اور دن بھی، سورج بھی ہے اور چاند بھی مت سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو بلکہ سجدہ کرو اللہ کو جس نے انہیں پیدا فرمایا ہے۔ اگر تم واقعی اس کے پرستار ہو لے پھر (بھی) اگر وہ تکبر کرتے رہیں (تو ان کی قسمت) پس وہ (فرشتے) جو آپ کے رب کے پاس ہیں تسبیح کرتے رہتے ہیں اس کی شب و روز اور وہ نہیں تھکتے ہے"

لاشریک ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ لہٰذا تم نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ ہی چاند کو۔ کیونکہ یہ بھی تمہاری طرح مخلوق اور حکم کے پابند ہیں بلکہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کو کریں جس نے ان تمام کو پیدا فرمایا ہے خلقهن میں هن ضمیر مذکورہ بالا چاروں چیزوں (رات، دن، سورج اور چاند) کی طرف راجع ہے حالانکہ مقصود لَا تَسْجُدُوْا فعل کا تعلق شمس وقمر سے قائم کرنا ہے کہ تم سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو۔ (کیونکہ رات اور دن کو کوئی سجدہ کرتا ہی نہیں۔) پھر سورج اور چاند کو سجدہ کرنے سے ممانعت کے مقام پر لیل ونہار کا ذکر اسی لئے کیا گیا ہے تاکہ اس بات پر متنبہ کیا جائے کہ جس طرح رات اور دن کوئی علم اور اختیار نہیں رکھتے، سورج اور چاند بھی اسی طرح ہیں (یعنی جس طرح لیل ونہار سجدہ کے لائق نہیں اسی طرح شمس وقمر بھی اس قابل نہیں کہ انہیں سجدہ کیا جائے) کیونکہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہے۔ امام شافعی کے نزدیک إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ہی مقام سجدہ ہے، کیونکہ سجدہ کرنے کا حکم (واسجدوا لله) اسی کے ساتھ مقترن ہے۔ (یعنی اس مقام پر پہنچ کر سجدہ تلاوت ادا کرنا چاہیے۔) حضرت ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ امام طحاوی نے اپنی سند کے واسطہ سے عبدالرحمٰن بن یزید سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سورۂ حم کی پہلی آیت پر سجدہ کرتے تھے۔ اور امام طحاوی نے حضرت نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے(1)۔

۳۸۔ پھر بھی اگر وہ تعمیل حکم اور سجدہ کرنے سے تکبر کریں (تو ان کی قسمت) فَإِنِ اسْتَكْبَرُوْا شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور اس کی علت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے فان استکبروا لا یضره، یعنی پھر بھی اگر وہ لوگ تکبر کرتے رہیں تو اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں۔ پس وہ جو آپ کے رب کے پاس ہیں ان سے مراد انبیاء، ملائکہ اور اولیاء کرام ہیں عند ربک کے الفاظ سے ان کے لئے جس قرب خداوندی کا ذکر کیا گیا وہ غیر متکیف ہے اس کی کیفیت اور حالت الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

مقربین بارگاہ الٰہی شب وروز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں اور وہ تھکتے نہیں۔ ترکیب کلام میں وهم لا یسئمون کا جملہ یا تو ماقبل پر معطوف ہے یا یہ حال ہے۔ (یعنی واو عاطفہ ہے یا حالیہ ہے۔) معنی یہ ہے کہ وہ تسبیح کرتے کرتے اکتاتے نہیں بلکہ اس سے لذت اور راحت محسوس کرتے ہیں۔ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بلال! مجھے راحت پہنچاؤ(2)۔ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں راحت ملتی تھی)

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ مقام سجدہ ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اسے نقل کیا ہے امام طحاوی نے مجاہد کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے یہ نقل کیا ہے کہ آپ حم تنزیل کی آخری (دوسری) آیت میں سجدہ کرتے تھے(3)۔ اور ایک روایت میں یہ زائد بھی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو قول باری تعالیٰ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ پر سجدہ کرتے دیکھا تو اسے فرمایا تو نے جلدی کی ہے (یعنی مقام سجدہ آنے سے پہلے ہی تو نے سجدہ کر دیا ہے۔)

امام طحاوی نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورۂ حم میں مقام سجدہ کے بارے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا دونوں آیتوں کے آخر میں سجدہ کرو۔

سے بھی اسی طرح مروی ہے اور قتادہ کا قول بھی اسی طرح ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول (روایت کے اعتبار سے) غریب ہے۔ لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احتیاط کے پیش نظر اس قول کو لیا ہے کیونکہ اگر حقیقی مقام سجدہ تعبدون ہو تو پھر سجدہ کو دوسری آیت کے اختتام تک مؤخر کرنا قطعاً نقصان دہ نہیں۔ اور اگر مقام سجدہ لَا يَسْئَمُوْنَ ہو تو پھر اس سے قبل سجدہ ادا کرنا جائز نہیں۔ (اسی لئے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ پر سجدہ تلاوت ادا کیا جائے)۔

امام طحاوی نے کہا ہے کہ حاصل کلام یہ ہے کہ سجدہ تلاوت دوسری آیت میں کرنا نظر وفکر کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ ہم نے دیکھا کہ وہ مقامات جن پر بالاتفاق سجدہ تلاوت ادا کرنا واجب ہے وہ دس ہیں۔

1- سورۂ اعراف اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۔
2- سورۃ الرعد اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۔
3- سورۃ النحل اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۔ 4- سورۂ بنی اسرائیل اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۔ 5- سورۂ مریم اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۔ 6- سورۃ الحج اس میں متفق علیہ آیت سجدہ ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ الآیۃ۔ 7- سورۃ الفرقان اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ؕ الآیۃ۔ 8- سورۂ نمل اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ (الآیۃ) 9- سورۂ الم تنزیل اس میں مقام سجدہ ساتویں ہے اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الایہ۔ 10- سورۂ حم تنزیل اس میں مقام سجدہ میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے وہ یعبدون ہے اور بعض کے نزدیک وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ ہے۔

مذکورہ مقامات میں سے ہر مقام میں کلام بصورت خبر مذکور ہے، یعنی اس میں متکبرین کے تکبر کرنے کا ذکر ہے یا خشوع وخضوع کرنے والوں کے خشوع کا بیان ہے۔ اور ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم تکبر کرنے والوں کی مخالفت کریں اور خشوع کرنے والوں کی موافقت اور پیروی کریں۔ ان میں سے کسی مقام پر بھی سجدہ کرنے کا حکم موجود نہیں۔ اور بعض دیگر مقامات پر ہم نے دیکھا ہے کہ سجدہ کا ذکر صیغہ امر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ لیکن ان مقامات پر بالاجماع سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں نظر وفکر اور غور وتدبر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں صیغہ امر کے ساتھ سجدہ کا حکم دیا گیا ہے اس کو عبادت اور سجدہ نماز پر محمول کیا جائے گا۔ (سجدہ تلاوت پر نہیں) اور وہ تمام مقامات جہاں سجدہ کا ذکر بصورت خبر مذکور ہے وہاں سجدہ تلاوت کی ادائیگی واجب ہوگی۔ یہ نظر وفکر اس کا تقاضا کرتی ہے کہ سورۂ حج میں دوسرا سجدہ نہ ہو کیونکہ وہاں صیغہ امر مذکور ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس سے مراد نماز کا سجدہ ہے اور اس کی دلیل اس کے ساتھ رکوع کا ذکر ہونا ہے (چونکہ رکوع سے مراد تو بالیقین نماز کا رکوع ہے اس لئے سجدہ سے مراد بھی نماز کا سجدہ ہی ہونا چاہیے) [illegible]

یہی نظر وفکر تقاضا کرتی ہے کہ سورۂ ص میں سجدہ تلاوت ہو جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا بخلاف دوسرے ائمہ کے، کیونکہ اس میں بھی مقام سجدہ پر کلام بصورت خبر مذکور ہے نہ کہ بصورت امر۔ اور وہ یہ ارشاد خداوندی ہے فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا۔ اسی طرح سورۂ اذا السماء انشقت میں ہے فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۩ ۔ تو یہ بھی محل اخبار ہے امر نہیں (اس لئے اس مقام پر بھی سجدہ تلاوت ہوگا۔) مگر نظر وفکر یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ سورۃ النجم اور اقراء میں سجدہ تلاوت نہ ہو کیونکہ دونوں سورتوں میں مقامات سجدہ میں صیغہ امر ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ النجم میں ارشاد ربانی ہے فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۩ اور سورۂ اقراء میں ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ ۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ان مقامات پر قاعدہ نظر وفکر کی اتباع وپیروی نہیں کی۔ اس لئے کہ آپ کے نزدیک یہ ثابت ہے کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مقامات پر سجدہ ادا فرمایا جیسا کہ ہم نے ان مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مفصل سورتوں میں کہیں سجدہ تلاوت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہم نے سورۂ حج میں وہ مفصل دلائل ذکر کئے ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اس میں دو سجدے ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۭ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

''اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تو دیکھتا ہے زمین کو کہ وہ (کسی وقت) خشک بنجر ہے پھر جب ہم اتارتے ہیں اس پر (بارش کا) پانی تو جھومنے لگتی ہے اور کھل اٹھتی ہے۔ بیشک وہ (قادر مطلق) جس نے زندہ کر دیا ہے زمین کو وہی زندہ کرنے والا ہے مردوں کو۔ بلاشبہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے[1]۔ بیشک جو لوگ ہماری آیتوں میں اپنی طرف سے اضافے کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں تو کیا جو پھینکا جائے گا آگ میں وہ بہتر ہے یا جو آئیگا امن وسلامتی کے ساتھ قیامت کے دن (وہ بہتر ہے) تم وہ کرو جو تمہاری مرضی۔ یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو، وہ خوب دیکھ رہا ہے[2]۔''

[1] اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل میں سے یہ بھی ہے کہ تو کسی وقت زمین کو خشک غبار آلود دیکھتا ہے، اس میں کہیں نباتات اور سبزہ دکھائی نہیں دیتا۔ خَاشِعَةً کا لفظ خشوع بمعنی تذلل سے مجازاً خشک غبار آلود کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے پھر جب ہم اس پر بارش کا پانی برساتے ہیں تو وہ جھومنے لگتی ہے اور کھل اٹھتی ہے، یعنی نباتات اور سبزہ نکلنے کے سبب ابھرتی اور پھول جاتی ہے۔ بیشک وہ قادر مطلق جس نے زمین کی نباتات اور سبزے کو زندہ کر دیا ہے وہی قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ بلاشبہ وہ زندگی عطا فرمانے اور موت دینے وغیرہ پر پوری طرح قادر ہے۔

ہیں۔سدی نے کہا ہے جو معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور مخالفت کرتے ہیں۔مقاتل نے کہا ہے یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تم اسے اس کے اپنے مقام پر رکھو اور اس میں اپنی خواہشات کی اتباع نہ کرو(1)۔

میں کہتا ہوں کہ **یُلْحِدُوْنَ** کا لفظ عام ہے جو کہ تکذیب کرنے اور لغویات بکنے والوں کو بھی شامل ہے اور تحریف کرنے اور اسلاف کی تأویلات کے خلاف تأویلات باطلہ کرنے والوں کو بھی شامل ہے، یعنی جو لوگ کسی بھی اعتبار سے ہماری آیتوں میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، پس وہ سزا اور انتقام سے بچ نہیں سکتے۔ **افمن یلقی**۔ میں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔تقدیر کلام ہے **یفتخر ھولاء الکفار و یعجبون بانفسھم افمن یلقی فی النار** (یہ کفار فخر کررہے ہیں اور اپنے نفسوں پر اترا رہے ہیں۔کیا جو آگ میں پھینکا جائے گا وہ بہتر ہے یا قیامت کے دن جو امن وسلامتی کے ساتھ آئے گا وہ بہتر ہے؟)ابن منذر نے بشیر بن فتح سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابوجہل اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے نازل ہوئی ہے(2)۔بعض نے کہا ہے کہ **من یاتی امنا**۔سے مراد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہیں۔اور بعض نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مراد لئے ہیں۔آیت کے یہ الفاظ مذکورہ تمام افراد اور دیگر افراد کو بھی شامل ہیں۔اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں پھینکے جانے کے مقابلے میں مبالغہ کے لئے امن وسلامتی کے ساتھ آنے کا ذکر کیا ہے۔حالانکہ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس طرح کہا جاتا کیا وہ بہتر ہوگا جو آگ میں پھینکا جائے گا یا وہ جو جنت میں داخل ہوگا؟ کیونکہ کلام کا مفاد یہی ہے کہ امن وسلامتی کے ساتھ آنے والا اس سے بہتر ہوگا جسے آگ میں پھینکا جائے گا، تو جسے عزت وتکریم دی جائے گی اور وہ جنت میں داخل ہوگا تو اس کے ساتھ مساوات کیسے ممکن ہوسکتی ہے؟

اے کفار! کفر ومعاصی میں سے جو چاہو کرتے رہو یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو وہ خوب دیکھ رہا ہے اور تمہیں اپنے اعمال کی پوری سزا دی جائے گی۔اس جملہ میں ان کے لیے شدید وعید اور جھڑک ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ﴿٤١﴾ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴿٤٣﴾

"بیشک وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کیا جب وہ ان کے پاس آیا (تو وہ ہٹ دھرم لوگ ہیں) اور بیشک یہ بڑی عزت (حرمت) والی کتاب ہے[1] اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ پیچھے سے یہ اتری ہوئی ہے بڑے حکمت والے، سب خوبیاں سراہے کی طرف سے[2] (اے حبیب!) نہیں کہا جاتا آپ کو مگر وہی جو کہا گیا پیغمبروں کو آپ سے پہلے۔بیشک آپ کا پروردگار (اہل ایمان کے لئے) بہت بخشنے والا اور (منکرین کے لئے) دردناک عذاب دینے والا ہے[3]"

1۔ ذکر سے مراد قرآن کریم ہے۔ترکیب کلام میں انّ اپنے جملہ کے ساتھ مل کر اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ سے بدل ہے۔یا جملہ مستانفہ

ھالکون ہے (یعنی وہ ہلاک ہونے والے ہیں) یا پھر خبر یجازیھم بکفرھم ہے۔ (یعنی اللہ انہیں ان کے کفر کی سزا دے گا) اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی خبر بعد میں آنے والا یہ ارشاد گرامی ہے اولئک ینادون من مکان بعید۔'' اور بیشک قرآن کریم بڑی عزت (حرمت) والی کتاب ہے''۔ ترکیب کلام میں وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ یا حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔ کلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ تفسیر نقل کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عزت والی ہے اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اتنی عزت اور غلبہ عطا فرمایا ہے کہ باطل اس کی جانب قطعاً راہ نہیں پا سکتا (1)۔

ے قتادہ اور سدی نے کہا ہے کہ باطل سے مراد شیطان ہے (2) یعنی شیطان اس میں تغیر و تبدل کرنے یا اس میں کمی بیشی کرنے کی قطعاً طاقت نہیں رکھتا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لفظ جن وانس میں سے تمام شیاطین کو شامل ہے۔ جیسا کہ روافض نے قرآن کریم دس پاروں کا اضافہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی اس مذموم کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیر اور مکر وفریب کو رد کر دیا۔ پھر انہوں نے بعض آیات میں بعض الفاظ کا اضافہ کیا مثلاً انہوں نے قول باری تعالیٰ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ کے بعد لفظ علی کا اضافہ کر دیا اور وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا۔ کے بعد آل محمد کے الفاظ بڑھا کر پھر اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ کیا۔ اسی طرح کی انہوں نے ناکام کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی کوشش کو باطل اور مردود قرار دیا اور ان کے بڑھائے ہوئے الفاظ جزو قرآن نہ بن سکے۔

زجاج نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ قرآن کریم محفوظ ہے اس کے نزدیک نہ تو باطل سامنے سے آسکتا ہے یعنی اس میں کمی نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ ہی باطل پیچھے سے اس کے نزدیک آسکتا ہے، یعنی اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس معنی کی بناء پر باطل سے مراد کمی بیشی ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ قرآن کریم کی تکذیب نہ تو ان کتابوں میں سے کسی سے ہو سکتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں اور نہ ہی اس کے بعد کوئی کتاب آئے گی جو اسے باطل قرار دے یا اسے منسوخ کر دے (3)۔ یہ قرآن کریم اترا ہوا ہے اس کی طرف سے جس کی حکمت کامل ہے اور سب خوبیاں سراہا ہے۔ ہر مخلوق اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے کیونکہ ہر مخلوق پر اس کی نعمتیں عیاں ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ہی حمید ہے وہ کسی غیر کی حمد وثناء کا محتاج نہیں۔

سے کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے نازل کی گئی ہے اس طرح کہ جو کچھ کفار مکہ آپ کو کہہ رہے ہیں (وہ کوئی نئی اور انوکھی باتیں نہیں بلکہ) اسی کی مثل آپ سے قبل انبیاء علیہم السلام کو بھی کہا گیا۔ کہ انہ ساحر کذاب۔ لہٰذا آپ بھی انہی کی طرح صبر کیجئے اور قطعاً غمزدہ نہ ہوں۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ آپ کی طرف بھی ایسے ہی وحی کی گئی جیسا کہ آپ سے قبل انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی کی گئی تھی، یعنی توحید باری تعالیٰ کے احکام دین کے اصول وضوابط اہل ایمان کے لئے (دونوں جہاں میں کامیابی وکامرانی کا) وعدہ اور کفار کے لئے طرح طرح کی وعید بذریعہ وحی نازل کی گئی۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ قول کا مقولہ یہ جملہ ہے اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ بیشک آپ کا رب اہل ایمان کے لئے بہت بخشنے والا اور منکرین کے لئے دردناک عذاب دینے والا ہے۔ پہلی تفسیر کی بناء پر یہ جملہ مستانفہ ہے۔

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

''اور بالفرض اگر ہم اسے بنا کر بھیجتے قرآن عجمی زبان میں تو کہتے کیوں نہ کھول کر بیان کی گئیں اس کی آیتیں۔ کیا اچنبھا ہے کتاب عجمی اور نبی عربی [1] آپ فرمایئے! یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لئے تو ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے اور وہ ان پر (ہر حال میں) مشتبہ رہتا ہے۔ انہیں گویا بلایا جاتا ہے دور کی جگہ سے [2] اور ہم نے عطا فرمائی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب پس اس میں بھی بہت اختلاف کیا گیا۔ اور اگر ایک بات طے نہ ہوگئی ہوتی آپ کے رب کی طرف سے تو (ابھی) فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان۔ اور بیشک وہ ایک شک میں مبتلا ہیں اس کے بارے میں جو بے چین کر دینے والا ہے [3] جو نیک عمل کرتا ہے تو اپنے بھلے کے لئے اور جو برائی کرتا ہے اس کا وبال اس پر ہے۔ اور آپ کا رب تو بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں [4]''

[1] جب کفار نے ہٹ دھرمی اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض اعتراض کی غرض سے یہ کہا کیا قرآن کریم کسی عجمی زبان میں نازل ہوا ہے؟ جیسا کہ توریت اور انجیل عجمی زبان میں نازل ہوئیں تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ کہ یہ قرآن جو تم لوگوں کو پڑھ کر سناتے ہوا گر ہم اسے اس طرح بنا دیتے کہ یہ عجمی زبان میں پڑھا جاتا۔ تو پھر اہل مکہ یہ کہتے کہ اس کی آیتیں عربی زبان میں کھول کر واضح انداز میں کیوں نہ بیان کی گئیں؟ تا کہ ہم بھی انہیں سمجھ لیتے اور فہم و فراست حاصل کرتے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ ان جملوں کے ساتھ متصل ہے جو سورت کی ابتداء میں قرآن کریم کی مدح و توصیف میں بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی کتاب فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ۔

[2] ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ کو ہشام نے ایک ہمزہ کے ساتھ بغیر مد کے خبر ہونے کی بناء پر اعجمی پڑھا ہے، یعنی **کتاب اعجمی و رسول عربی**۔ (کتاب عجمی ہے اور رسول عربی ہے) اور باقیوں نے اسے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ استفہام انکاری ہے۔ ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے دونوں ہمزوں کو ثابت رکھا ہے۔ جبکہ باقیوں نے ایک ہمزہ اور مدہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون اور ابو عمرو دونوں اسے اشباع کے ساتھ پڑھتے ہیں کیونکہ ان کا قول ہے کہ ہمزہ محققہ اور ہمزہ ملینہ کے درمیان الف کو داخل کرنا چاہئے۔ ورش نے اس کے اصول کے مطابق دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل دیا ہے اور دونوں ہمزوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ علامہ ابن کثیر نے بھی اصل کے مطابق دوسرے ہمزہ کو بغیر کسی فاصل کے بین بین پڑھا ہے۔ حفص اور ابن ذکوان نے بھی صرف اس مقام پر اسی طرح پڑھا ہے۔

مقاتل نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عامر حضرمی کے غلام یسار کے پاس تشریف لے جاتے تھے وہ یہودی اور عجمی نژاد تھا۔ اس کی کنیت ابوفکیہہ تھی۔ مشرکین کہنے لگے کہ یسار آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے آقا نے اسے خوب مارا اور کہا تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تعلیم دیتا ہے؟ تو یسار نے کہا (ایسا ہرگز نہیں بلکہ) وہ مجھے تعلیم دیتے ہیں۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے

علامہ ابن جریر نے سعید بن جبیر سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قریش نے کہا یہ قرآن عربی اور عجمی دونوں زبانوں میں کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے آیت لَقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ اور یہ نازل فرمائی اور اس آیت کے بعد اس میں لکل لسان نازل فرمایا(1)۔

ابن جریر نے کہا ہے کہ اَعجمی کی قرآت بغیر ہمزہ استفہام کے ہے۔

۲؎ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے یہ قرآن کریم اہل ایمان کے لئے ضلالت وگمراہی سے ہدایت دینے والا اور سینہ میں موجود مرض جہالت اور قلب ونفس کو اوصاف رذیلہ جیسی امراض کے لئے بہت بڑی شفاء ہے۔ شفاء میں تنوین اور تنکیر تعظیم کے لئے ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم جسمانی بیماریوں اور دردوں کے لئے شفا ہے۔ ترکیب کلام میں وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ مبتدا ہے اور اس کی خبر فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ ہے۔ وقر کا معنی ثقل اور بوجھ اور بہرہ پن ہے۔ عمی سے مراد ظلمت' تاریکی اور شبہات ہیں۔ قتادہ نے کہا ہے کہ ایمان نہ لانے والے قرآن کریم سے اندھے اور بہرے تھے۔ اس لئے وہ اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتے تھے(2)۔ اخفش نے کہا ہے دو عاملوں کے دو معمولوں پر عطف جائز ہے۔ اور مجرور مقدم ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک الذین اسم موصول لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًی وَّ شِفَآءٌ پر معطوف ہے۔ اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ میں کفار کے قرآن کریم کو نہ سننے اور اسے قبول نہ کرنے کو اس آدمی کے ساتھ بطور تشبیہ وتمثیل بیان کیا ہے جسے بہت دور مسافت سے پکارا جارہا ہو (اگرچہ وہ کچھ آواز سنتا تو ہے مگر سمجھتا کچھ نہیں)

۳؎ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی پس اس میں بھی بہت اختلاف کیا گیا۔ فاختلف فیه محذوف قسم کا جواب ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مابین کتاب کی تصدیق وتکذیب کرنے کے اعتبار سے بہت اختلاف ہوا جیسا کہ قریش نے قرآن کریم کے بارے اختلاف کیا ہے۔

اور اگر جھٹلانے والوں سے قیامت کے دن تک عذاب مؤخر کرنے یا ایک مقررہ مدت تک عذاب مؤخر کرنے کی ایک بات آپ کے رب کی طرف سے طے نہ ہوگئی ہوتی تو ابھی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، یعنی انہیں دنیا میں ہی عذاب دے دیا جاتا اور ہلاک وبرباد کر دیا جاتا۔ بیشک تکذیب کرنے والے توریت یا قرآن کریم کے بارے میں ایک شک میں مبتلا ہیں۔

۴؎ جو نیک عمل کرتا ہے تو وہ اپنے نفع اور فائدہ کے لئے کرتا ہے اور جو برائی کرتا ہے اس کا وبال اور نقصان اسی پر ہے۔ آپ کا رب تو بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ پس وہ نیکی کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کرے گا اور گناہ کرنے والوں کی سزا میں اضافہ نہیں کرے گا۔

کفار پر یہ تعریض کرنے کے لئے کہ وہ بہت زیادہ ظلم کرنے والے ہیں اور ظلم وزیادتی میں انتہائی مبالغہ کرتے ہیں ظلام مبالغہ کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں تو قطعاً ظلم وزیادتی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا (چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ) کیونکہ ظلم وہ ہوتا ہے جو غیر کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کیا جائے۔ (اور اللہ تعالیٰ تو ساری کائنات کا خود مالک ہے اسلئے یہاں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔)

شَهِيْدٍۚ ۝ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ۝

''اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے قیامت کا علم۔ اور نہیں نکلتا کوئی پھل اپنے غلافوں سے اور نہ حاملہ ہوتی ہے کوئی مادہ اور نہ بچہ جنتی ہے اس کے علم کے بغیر۔ اور جس روز وہ انہیں پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک؟ کہیں گے ہم (پہلے) عرض کر چکے ہیں ہم میں سے کوئی بھی (اس پر) گواہی نہ دے گا۱۔ اور گم ہو جائیں گے ان سے جن کی وہ پہلے عبادت کیا کرتے تھے اور وہ یقین کر لیں گے کہ اب بھاگ جانے کی کوئی جگہ نہیں ۲۔''

۱۔ قیامت قائم ہونے کے وقت کا علم اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ یعنی جس سے بھی قیامت قائم ہونے کے وقت کے بارے سوال کیا جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ یہ کہے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے (اللہ اعلم) کیونکہ اس کے سوا کوئی بھی اس کے بارے نہیں جانتا۔ اور کوئی پھل اپنے غلافوں سے نہیں نکلتا۔ اکمام، کم کی جمع ہے اس کا معنی غلاف اور خول ہے۔ نافع ابن عامر اور حفص نے ثمرات جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے بطور جنس واحد کی صورت میں ثمرہ پڑھا ہے۔ اور ما نافیہ ہے۔ من ثمرات میں من زائدہ استغراق کے لئے ہے اور ثمرات محل رفع میں ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ما موصولہ ہو اور الساعۃ پر معطوف ہو اور من بیانیہ ہو۔ بخلاف اس ارشاد کے وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى۔ اس میں بالیقین ما نافیہ اور من زائدہ ہے۔ اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے علم کے بغیر بچہ جنتی ہے۔ یعنی اس کے علم کا تعلق اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح اس کے سوا قیام قیامت کا علم کوئی نہیں رکھتا اسی طرح جو پھل غلافوں سے نکلتے ہیں اور جو مادہ حاملہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے بارے بھی کوئی نہیں جانتا۔ ترکیب کلام میں الا بعلمہ، استثنا مفرغ ہے اور یہ علی سبیل التنازع سابقہ تینوں افعال کی طرف متوجہ ہو رہا ہے آخری فعل اس میں عامل ہے اور پہلے دونوں میں اسے مقدر مانا گیا ہے۔ اور جس دن اللہ تعالیٰ مشرکین کو اس قول کے ساتھ پکارے گا این شرکاء ی؟ (کہاں ہیں میرے شریک؟) ابن کثیر نے شرکاءی میں یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ یعنی اللہ تعالیٰ بطور استہزاء و رز جر و توبیخ کے لیے ان سے پوچھے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جنہیں تم الٰہ گمان کرتے تھے؟ مشرکین جواب دیں گے اب ہم تجھے عرض کر رہے ہیں ہم میں سے کوئی بھی اس پر گواہی نہ دے گا، یعنی ہم میں سے کوئی بھی نہیں جو ان کے لئے شرک کی شہادت دے گا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ حال ہے۔ یعنی جب وہ عذاب کا مشاہدہ آنکھوں سے کر لیں گے تو وہ ان معبودان باطلہ سے اپنی برات کا اظہار کریں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جو ان کا مشاہدہ کر رہا ہو کیونکہ وہ ہم سے غائب ہو چکے ہیں۔

۲۔ اور ان سے گم ہو جائیں گے جن کی وہ پہلے عبادت کیا کرتے تھے، یعنی وہ انہیں کوئی نفع اور فائدہ نہیں پہنچائیں گے یا وہ ان سے غائب ہو جائیں گے اور وہ انہیں نظر تک نہیں آئیں گے۔ من قبل سے مراد ہے آج کے دن سے پہلے، یعنی دنیا میں۔ وظنوا کا معنی ہے اور وہ یقین کر لیں گے مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ۔ کہ اب ان کے لئے بھاگ جانے کی کوئی جگہ نہیں۔ محیص بھاگ جانے کی جگہ۔ ظن کو حرف نفی کے سبب عمل سے روک دیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ جملہ منفیہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہے۔

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ؗ وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ

رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝

”نہیں اکتاتا انسان بھلائی کی دعا کرنے سے۔ اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بالکل مایوس (اور) ناامید ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہم چکھائیں اسے رحمت اپنی جناب سے اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچتی ہے تو کہتا ہے میں اسی کا مستحق ہوں۔ اور میں نہیں خیال کرتا کہ قیامت برپا ہوگی۔ اور اگر میں لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میرے لئے اس کے پاس بھی اکرام ہی اکرام ہوگا (یہ احمق کیا سوچ رہے ہیں) ہم تو آگاہ کریں گے کافروں کو جو کرتوت انہوں نے کئے اور ہم ضرور چکھائیں گے انہیں سخت عذاب“

۱۔ کافر انسان بھلائی کی دعا کرنے سے نہیں اکتاتا، یعنی مسلسل اللہ تعالیٰ سے مال و دولت اور صحت و تندرستی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہی رہتا ہے۔ اور اگر اسے فقر و افلاس اور بیماری میں سے کوئی تکلیف آ پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی راحت و رحمت سے بالکل مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے۔

۲۔ اور اگر ہم کافر کو اپنی جناب سے رحمت چکھائیں اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچتی ہے۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور رحمۃ سے مراد مال و دولت اور صحت و عافیت ہے۔ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ۔ لفظاً جواب قسم ہے اور معنی شرط ہے۔ یعنی کہتا ہے یہ تو میرا حق ہے کیونکہ مجھ میں جو فضل و کمال اور علم و عمل پایا جاتا ہے (اس کا تقاضا ہے کہ یہ مجھے حاصل ہو) یا یہ سب میرے لئے دائمی اور ہمیشہ رہنے والا ہے کبھی زائل نہیں ہوگا۔ اور میں تو گمان بھی نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا۔ ابوعمرو اور نافع نے قالون سے اختلاف روایت کے ساتھ ربی کی یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ تو یقیناً میرے لئے اس کے پاس بھی اکرام ہی اکرام ہوگا۔ یعنی اگر بالفرض قیامت قائم بھی ہوگئی تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے پاس بھی عزت و کرامت کے ساتھ میری حالت اچھی اور بہتر ہوگی۔ اور اس قول کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں (مال و متاع اور صحت و عافیت) اس کے پاس ہے وہ اس کا استحقاق ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے پاس بھی اس سے یہ عزت و کرامت کبھی جدا نہ ہوگی۔

۳۔ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ محذوف قسم کا جواب ہے اور فاء سببیہ ہے۔ معنی یہ ہے ہم تو کافروں کو آگاہ کریں گے جو کرتوت انہوں نے کئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ معنی یہ ہے ہم بالیقین انہیں ان کی بداعمالیوں پر فتنہ اور آزمائش میں مبتلا کریں گے (1)۔ اور ہم انہیں سخت عذاب ضرور چکھائیں گے جس سے دور ہونا اور بچنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔

وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۝

تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگ جاتا ہے۔[1] آپ فرمائیے (اے کافرو!) تم مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہو پھر تم اس کا انکار کرو تو کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو اختلاف میں بہت دور نکل گیا ہو[2]۔"

[1] اور جب ہم کافر انسان پر احسان فرماتے ہیں تو وہ (تکبر کے سبب) شکر کرنے سے منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرنے لگتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جانب سے مراد کنایۃً نفس ہے جیسا کہ قول باری تعالیٰ جنب اللّٰہ میں جنب سے مراد ذات ہے۔ یعنی وہ اپنے نفس کو ادائے شکر سے دور لے جاتا ہے اور انتہائی زیادہ غفلت کے سبب کلی طور پر وہ شکر سے دور ہو جاتا ہے۔ اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگ جاتا ہے۔ یعنی بہت زیادہ کثرت سے دعائیں مانگنے لگتا ہے۔ آیت میں عریض بمعنی کثیر ہے اور یہ اس شئی سے مستعار ہے جس کا عرض وسیع ہو اور مقصود کثرت کی خبر ہے۔ محاورہ عرب میں طول وعرض (لمبا چوڑا) کثرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے اطال فی الکلام و الدعاء و اعرض۔ (اس نے کلام اور دعا میں کثرت کی) اور عریض طویل کی نسبت زیادہ بلیغ ہے کیونکہ طول (لمبائی اور چوڑائی کی دو مسافتوں میں سے) طویل اور لمبی مسافت کو کہا جاتا ہے اور جب عرض بھی اسی کی مثل ہو جائے تو پھر اس کی وسعت کے بارے آپ کا کیا خیال ہے؟ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جنت کی وسعت کے بارے ارشاد فرمایا جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ[1]۔

قول باری تعالیٰ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ کے مابین بظاہر منافاۃ اور تضاد نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ کیونکہ پہلی آیت میں اور قوم مراد ہے۔ جبکہ دوسری آیت میں ان کے سوا دوسرے لوگ ہیں۔ شاید پہلی آیت کفار کے بارے ہے کیونکہ وہی مایوس اور ناامید ہوتے ہیں جیسا کہ ان ارشادات میں بھی ہے وَلَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۔

دوسری آیت، یعنی فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ غافل مومنین کے بارے ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں آیتیں کفار کے بارے ہوں اور مراد یہ ہے کہ جب انہیں تکلیف اور کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اللہ کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے پورے خلوص نیت کے ساتھ دعا مانگتے ہیں۔ اور جب دعا کی قبولیت میں ذرا تاخیر دیکھتے ہیں تو بالکل مایوس اور ناامید ہو جاتے ہیں جبکہ صالح مومنین کی حالت اس کے برعکس ہوتی ہے کیونکہ وہ کبھی بھی مایوس اور ناامید نہیں ہوتے بلکہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ بالیقین کسی حکمت کے تحت دعا کی قبولیت میں تاخیر ہوئی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ انہیں یا تو جلد ہی (دنیا میں) عطا فرما دیتا ہے یا پھر ان کے لئے اسے اپنے پاس ذخیرہ کر لیتا ہے۔ یا پھر یہ کہا جائیگا کہ وہ دل سے تو مایوس اور ناامید ہوتے ہیں اور زبان سے کثرت سے لمبی چوڑی دعائیں کرتے ہیں یا معنی یہ ہے کہ وہ بتوں سے ناامید ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کثرت سے دعائیں مانگتے ہیں۔

مسئلہ:۔ جو آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ شدت اور مصیبت کے وقت میں اس کی دعا قبول ہو تو اسے چاہئے کہ وہ فراخی اور خوشحالی کی حالت میں کثرت سے دعائیں مانگے۔ حدیث طیبہ میں اسی طرح ہے۔

[2] آپ فرمائیے (اے کافرو!) تم مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو پھر تم اس کا انکار کرو تو کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو اختلاف میں بہت دور نکل گیا ہو

ہونے کی علت بیان ہو سکے۔ کیونکہ یہ ارشاد اس قول کے معنی میں ہے کہ اگر یہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے تو بلا شبہ یہ حق اور سچ ہے اور مخالفت کرتے ہوئے اس کا انکار حق سے انتہائی زیادہ دوری ہے اور تم نے اس کا انکار کیا ہے لہٰذا تم سے بڑھکر کوئی گمراہ نہیں۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٥٣﴾ أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ﴿٥٤﴾

''ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے اپنے نفسوں میں ۱؎ تا کہ ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن واقعی حق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ آپ کا رب ہر چیز پر گواہ ہے ۲؎ سنو! یہ لوگ شک میں مبتلا ہیں اپنے رب سے ملنے کے بارے میں۔ یاد رکھو! وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ ۳؎''

۱؎ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ آیات فی الافاق سے مراد گزشتہ امتوں کے مکانات اور گھروں کے (کھنڈرات) ہیں۔ اور آیات فی الانفس سے مراد واقعہ بدر ہے۔ (جس میں کفار مکہ کو ہر قسم کی قوت و طاقت ہونے کے باوجود شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا) قتادہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آیات فی الانفس سے مراد جسمانی امراض اور مصائب آلام ہیں۔ مجاہد اور سدی نے کہا ہے کہ آیات فی الافاق سے مراد ان شہروں اور بستیوں کی فتوحات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو عطا فرمائیں اور فِيٓ أَنفُسِهِمْ سے مراد فتح مکہ ہے (1)۔

عطا اور ابن زید نے کہا ہے کہ آیات فی الآفاق سے مراد وہ علامات اور نشانیاں ہیں جو زمین و آسمان کی اطراف میں پائی جاتی ہیں مثلاً سورج، چاند، ستارے، نباتات، درخت اور دریا وغیرہ اور فِيٓ أَنفُسِهِمْ سے مراد لطیف صنعت اور عمدہ حکمت ہے (2)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ آیات فی الآفاق سے مراد زمانہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے وہ واقعات ہیں یا زمانہ ماضی میں ہونے والے حوادث کے وہ آثار ہیں جن کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی اس کے علاوہ مشرق و مغرب کے ممالک پر اللہ تعالیٰ نے جو غلبہ اور فتوحات اپنے پیارے محبوب ﷺ اور آپ کے خلفا کو بطور معجزہ و کرامت عطا فرمائیں وہ بھی آیات فی الآفاق میں شامل ہیں (3)۔ اور آیات فی الانفس سے مراد وہ واقعات ہیں جو اہل مکہ کو پیش آئے یا جو مصائب اہل مکہ پر نازل ہوئے یا پھر اس سے مراد انسانی بدن میں پائی جانے والی عجیب اور نادر صنعت و کاریگری ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کرتی ہے۔

۲؎ تا کہ ان پر واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن کریم حق ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے یا توحید کی تائید اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا دین حق ہے یا اللہ تعالیٰ حق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ آپ کا رب ہر چیز پر گواہ ہے بربک میں باء زائدہ ہے اور ربک فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ اور صرف مادہ کفیٰ میں ہی فاعل پر باء زائدہ آتی ہے۔ انه كل شئى شهيد فاعل سے بدل ہے۔ آیت میں استفہام انکاری ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت

نشانات کو ظاہر کرنے کا وعدہ کیا ہے وہ انہیں ضرور پورا فرمائے گا۔ جیسا کہ اس نے ان تمام اشیاء کو پورا کیا ہے جن کا اس نے وعدہ فرمایا تھا۔ یا شہید کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مطلع ہے لہٰذا وہ آپ کے حال کو بھی جانتا ہے اور ان کے حال سے بھی واقف ہے۔ یا معنی یہ ہے کیا انسان گناہوں کے ارتکاب سے نہیں رکا اور اسے روکنے کے لئے یہی بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر مطلع ہے اور کوئی بھی چھپنے والی چیز اس پر مخفی نہیں ہے؟ وہ ہر شئی پر اسے بدلہ اور جزا دے گا۔

مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تیرا رب بذات خود اس پر شاہد ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے (1) اور اس کی شہادت یہ ہے کہ اس نے قرآن کو معجزہ بنایا ہے۔

زجاج نے کہا ہے کفایۃ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے دلائل بیان کر دیئے ہیں جو تصدیق کے لئے کافی ہیں یعنی کیا تیرے رب کی شہادت کافی نہیں (یعنی وہ یقیناً کافی ہے) کیونکہ وہ ہر شئی پر شاہد ہے کوئی شئی بھی اس سے غائب اور مخفی نہیں۔

سنو یہ کفار مکہ اپنے رب سے ملاقات کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ لقاء ربھم سے مراد بعث بعد الموت اور اعمال کی جزا وسزا کا ملنا ہے۔ یادرکھو! اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی وہ ہر شئی کا اجمالی اور تفصیلی علم رکھتا ہے اور ہر شئی پر قدرت رکھتا ہے کوئی شئی بھی اس کے دائرہ قدرت سے باہر نہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ ہر شئی کا ذاتی طور پر احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ احاطہ غیر متکیف ہے (یعنی اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی) کوئی شئی بھی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

تمت بالخیر

سورۂ فصلت کی تفسیر 28 ماہ صفر 1208ھ کو اختتام پذیر ہوئی

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سورہ فصلت کا ترجمہ بمطابق 17 ذیقعدہ 1421ھ 12 فروری 2001ء بروز پیر بوقت ساڑھے دس بجے رات اپنے اختتام کو پہنچا۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

سورة الشوریٰ

اٰیاتها ۵۳ ﴿ سُوْرَةُ الشُّوْرٰى مَكِّيَّةٌ ۴۲ ﴾ رکوعاتها ۵

سورۂ شوریٰ مکی ہے اس میں ترپن آیات اور پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۞ عٓسٓقٓ ۞ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۞

''حا۔میم۔عین۔سین۔قاف۔[1] اسی طرح (کے مطالب نفیسہ) وحی فرما تا رہا ہے آپ کی طرف اور ان (پیغمبروں) کی طرف جو آپ سے پہلے گزرے ہیں اللہ جو زبردست (اور) بہت دانا ہے۔اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔اور وہی سب سے اعلیٰ (اور) عظمت والا ہے [2]''

[1] علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حسن بن فضل سے پوچھا گیا حٰمٓ عٓسٓقٓ کو علیحدہ علیحدہ کیوں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ کٓهٰیٰعٓصٓ کو اس طرح علیحدہ علیحدہ کاٹ کر ذکر نہیں کیا گیا؟ تو انہوں نے جواب دیا اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جن کا آغاز حٰمٓ سے کیا گیا ہے تو یہاں عٓسٓقٓ کو علیحدہ کر دیا گیا ہے تاکہ یہ سورت بھی مستقل طور پر دوسری سورتوں کی مثل ہو جائے۔یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ترکیب کلام میں حٰمٓ مبتدا ہے اور عٓسٓقٓ اس کی خبر ہے (اور خبر مبتدا سے علیحدہ ہی ذکر کی جاتی ہے)۔یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ترکیب کلام میں حٰمٓ مبتدا ہے اور عٓسٓقٓ اس کی خبر ہے۔(اور خبر مبتدا سے علیحدہ ذکر کی جاتی ہے) یہ سبب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دو علیحدہ علیحدہ آیتیں ہیں جبکہ ان کی طرح کے دیگر الفاظ مثلاً کھیعص اور المص کو ایک آیت ہی شمار کیا گیا ہے۔

بعض نے کہا ہے اہل تاویل کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کھیعص اور ان کے دیگر اخوات حروف تہجی ہیں اور کچھ نہیں۔جبکہ حٰمٓ کے بارے ان کے مابین اختلاف ہے۔بعض نے حٰمٓ کو حروف کے محل میں ذکر کیا ہے اور اسے فعل قرار دیا ہے اس کا معنی ہے حم الامر یعنی اس امر کا فیصلہ کر دیا گیا جو ہونے والا ہے(1)۔

عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ سے قول نقل کیا ہے کہ حاء سے مراد اللہ تعالیٰ کا حلم ہے۔م سے مراد مجد، یعنی اس کی (عظمت و بزرگی) ہے'ع سے مراد اس کا علم ہے' س سے مراد اس کی سنا (نور' بلندی) ہے' اور ق سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان تمام کی قسم اٹھائی ہے(2)۔

والا ذلیل ورسوا ہوجاتا ہے۔م سے مراد ملک ہے جو ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ع سے مراد قریش کے دشمن ہیں جو ان کا قصد کرتے ہیں۔س سے مراد قحط ہے۔ق سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ قدرت ہے جو اس کی مخلوق میں نافذ ہوئی ہے(1)۔

ع حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کوئی صاحب کتاب نبی نہیں ہے جس کی طرف حٰمٓ عٓسٓقٓ وحی نہ کی گئی ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کَذٰلِكَ یُوْحِیْۤ اِلَیْكَ وَ اِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ الخ(2)۔

العزیز کا معنی ہے وہ اپنی قوت وطاقت کے سبب سب پر غالب ہے۔الحکیم کا معنی ہے صحیح فیصلہ کرنے والا اپنے فیصلہ میں غلطی اور خطا نہ کرنے والا۔آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو معانی اس سورت میں بیان کئے گئے ہیں انہی کی مثل یا جس طرح یہ سورت بذریعہ وحی بھیجی گئی ہے اسی طرح کی وحی اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف اور آپ سے قبل رسولوں کی طرف بھی وحی فرمائی ہے۔آیت میں یوحی صیغہ مضارع، ماضی کی حالت بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ استمرار وحی پر دلالت کرے اور اس بات پر دلالت کرے کہ اس طرح وحی کرنا اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے۔

جمہور نے یُوحیٰ کو حاء کے کسرہ کے ساتھ مضارع معروف کی صورت میں پڑھا ہے اور اس کا فاعل لفظ اللہ ہے۔جبکہ ابن کثیر نے حاء کو فتحہ کے ساتھ مضارع مجہول کی صورت میں یوحی پڑھا ہے۔اس صورت میں کذلک مثل ذالک کے معنی میں مبتدا ہونے کی بناء پر مرفوع ہے اور یوحی اس کی خبر ہے جو اس کی ضمیر کی طرف مسند ہے۔یا کذلک مصدر یہ کی بناء پر منصوب ہے اور یوحی الیک کی طرف مسند ہے۔اور لفظ اللہ فعل محذوف کا فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے جس پر ایک سوال مقدر دلالت کرتا ہے، یعنی سوال یہ ہے کہ ان کی طرف وحی کرنے والا کون ہے؟ تو اس کے جواب میں فرمایا گیا اللہ۔اسی طرح شاعر کے قول میں بھی ہے لیبک یزید ضارع لخصومة۔اس میں فعل مجہول ہے۔(اور یزید فعل محذوف کا فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے) اور الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ہیں جنہیں موحی ہ کی علوشان کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔یا پھر لفظ اللہ مبتدا ہے اور العزیز اور اس کا مابعد کلام اس کی خبریں ہیں۔یا الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ دونوں اس کی صفتیں ہیں۔اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ صفت ہے اور اس سے قبل الذی مقدر ہے یا یہ حال ہے۔وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ کا معنی ہے وہی اپنی ساری مخلوق پر سب سے اعلیٰ ہے اور عظمت والا ہے۔ترکیب کلام میں یہ دوسرا حال ہے یا تذییل ہے۔اور یہ دوسری وجوہ کی بناء پر دونوں جملے مستانفے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عزت وغلبہ اور اس کی حکمت ودانائی کی تائید کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَ الْمَلٰٓىٕكَةُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ اللّٰهُ حَفِیْظٌ عَلَیْهِمْ ۖؗ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ۝

"قریب ہے کہ (جلال الٰہی سے) آسمان پھٹ پڑیں اپنے اوپر سے [1] اور (ایسا نہیں ہوتا کیونکہ) فرشتے تسبیح کر رہے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور بخشش طلب کر رہے ہیں اہل زمین کے لئے۔سن لو! یقیناً اللہ ہی بہت بخشنے والا ہمیشہ

حالات سے اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں سے۔''

لے نافع اور کسائی نے تکاد کو یاء کے ساتھ یکاد پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے (اس لئے فعل کو مذکر ذکر کرنا بھی جائز ہے) جبکہ باقیوں نے السَّمٰوٰتُ فاعل کے مونث ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ تکاد پڑھا ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ کا معنی یہ ہے کہ قریب ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال اور علوشان کے سبب آسمان پھٹ پڑیں۔

ارشاد باری تعالیٰ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ کے بعد اس کا ذکر اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ قریب ہے مشرکین کے اس قول۔ اتخذ اللّٰہ ولدًا کے سبب آسمان پھٹ پڑے اسی کی مثل سورۂ مریم میں یہ ارشاد بھی ہے لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۙ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ قریب ہے ملائکہ کی کثرت کے سبب آسمان پھٹ پڑیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آسمان چر چرایا اور اس کا حق بھی ہے کہ وہ چر چرائے، قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے آسمان میں ایک بالشت بھر بھی ایسی جگہ نہیں جس میں کوئی فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے سجدہ ریز نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح بیان نہ کر رہا ہو۔ اسے ابن مردویہ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور علامہ بغوی کی روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ آسمان میں قدم رکھنے کی جگہ بھی ایسی نہیں جس میں کوئی فرشتہ قیام رکوع یا سجدہ کرنے میں مشغول نہ ہو۔

بصریان اور ابوبکر نے یتفطرن کو ینفطرن پڑھا ہے جو کہ انفطار سے ماخوذ ہے۔

مِنْ فَوْقِهِنَّ کا مفہوم یہ ہے کہ آسمانوں کے پھٹنے کی ابتدا اوپر والی جہت سے ہوگی۔ پہلی تفسیر کے مطابق اس جہت کی تخصیص اس وجہ سے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کی علامات میں سے عظیم تر ہے اور اس کی علوشان اور برتری پر سب سے زیادہ دلالت کرتی ہے۔ اور دوسری تفسیر کے مطابق اوپر والی جہت کی تخصیص اس لئے ہے تاکہ یہ اس پر دلالت کرے کہ نیچے والی جہت بطریق اولیٰ پھٹ جائے گی۔ اور تیسری تفسیر کے مطابق تخصیص کا سبب یہ ہے کہ ملائکہ کا اژدھام اوپر والی جہت پر ہی ہے۔ (لہٰذا اس کا بار بھی اوپر والی جہت پر ہی پڑے گا اس لئے وہ اسی جہت سے پھٹ پڑیں گے)

بعض نے کہا ہے کہ مِنْ فَوْقِهِنَّ کی ضمیر الارض کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ الارض سے مراد جنس ہے۔ (اور جنس کی طرف جمع کی ضمیر لوٹ سکتی ہے) اور یہ قول دوسری تفسیر کے مطابق درست ہے۔

٢ اور (ایسا نہیں ہوتا کیونکہ) فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر رہے ہیں۔ یعنی ظالم جو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو قطعاً اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں فرشتے انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ ایسے تمام اقوال سے اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت شان اور علومرتبت ملاحظہ کر رہے ہیں لہٰذا وہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی تحمید و تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ اور وہ زمین میں بسنے والے مومنین کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش طلب کر رہے ہیں۔ چونکہ مومنین ایمان قبول کرنے میں ملائکہ کے ساتھ شریک ہیں اس لئے ان کا حق بنتا ہے کہ ملائکہ ان کے لئے مغفرت طلب کریں

۳؎ اور جنہوں نے بنا رکھے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور دوست، یعنی شریک اور مدمقابل۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے احوال و اعمال پر خوب آگاہ ہے۔ وہ ان کی نگرانی کر رہا ہے اور انہیں ان کی سزا یقیناً دے گا۔ اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں آپ کے سپرد اس طرح نہیں کیا گیا کہ آپ ان سے اپنا مطلوب حاصل کر سکیں۔ یا آپ ان کے ذمہ دار نہیں، یعنی ان کا معاملہ آپ کے سپرد نہیں کیا گیا۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝

''اور یونہی ہم نے وحی کے ذریعے اتارا ہے آپ کی طرف قرآن عربی زبان میں تاکہ آپ ڈرائیں اہل مکہ کو اور جو اس کے آس پاس (آباد) ہیں اور تاکہ آپ ڈرائیں اکٹھے ہونے کے دن سے جس (کی آمد) میں کچھ شبہ نہیں۔ (اس دن) ایک فریق جنت میں اور دوسرا فریق بھڑکتی آگ میں ہوگا ۱؎''

۱؎ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ یوحی کے مصدر کی طرف اشارہ ہے اور قول باری تعالیٰ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یا اشارہ آیت متقدمہ کے معنی کی طرف ہے کیونکہ اس کا ذکر قرآن کریم میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے۔ اس صورت میں ک (کاف) مفعول بہ ہوگا اور قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا اس سے حال ہوگا۔

اُمَّ الْقُرٰى سے مراد مکہ مکرمہ ہے چونکہ عرب کی اکثر بستیاں مکہ مکرمہ سے ہی نکل کر بنی ہیں اس لئے مکہ مکرمہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ ڈرائیں اہل مکہ کو اور جو اس کے آس پاس آباد ہیں۔ تاکہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ میں آپ کے معاون اور مددگار ثابت ہوں۔ یا پھر مَنْ حَوْلَهَا سے مراد ساری زمین کی بستیاں ہیں، چاہے وہ زمین کے شرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال کی جانب ہوں یا جنوب کی طرف۔

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے پانچ چیزوں کے ساتھ دوسرے انبیاء (علیہم السلام) پر فضیلت دی گئی ہے 1۔ مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے 2۔ میری شفاعت کو میری امت کے لئے جمع رکھا گیا ہے۔ (یعنی قیامت کے دن امت کے لئے مجھے شفاعت کرنے کا اختیار دیا گیا ہے) 3۔ رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے ایک مہینہ آگے اور ایک مہینہ پیچھے کی طرف۔ (یعنی ایک مہینہ کی مسافت پر آگے پیچھے دشمنوں کے دلوں میں میرا رعب ڈال دیا جاتا ہے۔) 4۔ میرے لئے زمین کو مسجد اور پاکیزہ بنا دیا گیا ہے۔ (یعنی وہ تمام مقامات جہاں ظاہرا کوئی نجاست نہ ہو وہاں نماز پڑھنے اور وہاں سے تیمم کرنے کی اجازت دی گئی) 5۔ میرے لئے مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا ہے حالانکہ مجھ سے قبل کسی کے لئے حلال نہیں تھا (1)۔ اسے طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سائب بن یزید سے روایت کیا ہے، امام مسلم نے صحیح میں اور امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے دوسرے انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے۔ 1۔ مجھے جوامع الکلم عطا کئے گئے ہیں۔ (یعنی مجھے مختصر الفاظ میں معانی کا ایک سمندر سمیٹنے کی قوت اور ملکہ عطا فرمایا گیا ہے) 2۔ رعب ... لئے زمین کو پاکیزہ اور مسجد بنایا گیا ہے۔

قیامت کے دن سے ڈرائیں جس میں پہلے بعد میں آنے والے تمام لوگ جمع ہونگے۔

پہلے تنذر کے دوسرے مفعول کو اور دوسرے تنذر کے پہلے مفعول کو تہویل و تعمیم پر دلالت کرنے کے لئے خذف کر دیا گیا ہے۔ لَا رَیْبَ فِیْہِ جملہ معترضہ ہے ترکیب میں اس کا کوئی محل نہیں۔ معنی یہ ہے کہ اس دن کی آمد میں کچھ شبہ نہیں اس دن ایک فریق جنت میں اور ایک فریق بھڑکتی ہوئی آگ میں ہوگا۔ وہاں تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ فَرِیْقٌ منھم فِی الْجَنَّۃِ وَ فَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ۔ اور منھم کی ضمیر جمع ہونے والوں کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ جمع اسی پر دلالت کر رہی ہے اور یہ دونوں جملے جمع ہونے والوں سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہیں یعنی تاکہ آپ انہیں ڈرائیں اس دن سے جس میں وہ جمع ہونگے درآنحالیکہ دارالثواب (جنت) اور دار العقاب (دوزخ) میں متفرق ہونگے۔ یا پھر یہ دونوں جملے مستانفہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ اپنے دست مبارک میں دو کتابیں پکڑے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو آپ کے دائیں دست مبارک میں تھی کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے اس میں اہل جنت کے اسماء ہیں ان کے باپوں کے نام ہیں۔ ان کے خاندانوں کا ذکر ہے اور ان کی تعداد درج ہے اور یہ تحریر ان کے باپوں کی صلبوں اور ماؤں کی رحموں میں نطفہ قرار پذیر ہونے سے پہلے کی ہے۔ ابھی تک وہ (ان کے خمیر) مٹی میں گوندھے جا رہے تھے۔ پس نہ ان میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کچھ کمی ہو سکتی ہے۔ یوم قیامت تک آنے والے تمام اہل جنت کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ اجمالی تحریر ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمل کرو۔ صحیح اور پختہ عمل کرو اور قریب ہوتے چلو کیونکہ جنتی آدمی کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر ہوگا۔ اگرچہ اس نے پہلے جو عمل بھی کئے ہوں اور دوزخی کا خاتمہ اہل جہنم کے عمل پر ہوگا اگرچہ اس نے پہلے جو عمل بھی کئے ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَ فَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انصاف اور عدل ہوگا(1)۔ اسے علامہ بغوی نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۞ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞

''اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا ان (سب) کو ایک امت لیکن وہ داخل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں اور جو ظلم کرنے والے ہیں نہ ان کا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار[1]۔ کیا انہوں نے بنا لئے ہیں اسے چھوڑ کر دوسرے کارساز۔ پس اللہ ہی حقیقی کارساز ہے اور زندہ کرتا ہے مردوں کو اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے [2]۔''

1۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ۔ الایہ کا عطف فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ کے مضمون پر ہے، یعنی امت دو حصوں میں تقسیم ہو جائیگی۔ حضرت ...

کر دیتا(1)۔ اور اس کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى۔ (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام کو ہدایت پر جمع فرما دیتا) لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اسے دین اسلام کی طرف ہدایت دیکر اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔ اور جو ظلم کرنے والے، یعنی کافر ہیں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہیں، یعنی وہ انہیں اپنی رحمت میں داخل نہیں کرتا۔ اس لئے نہ ان کا کوئی دوست ہوگا جو ان سے عذاب کو دور کر سکے گا اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا جو انہیں جہنم کی آگ میں جانے سے بچا سکے گا۔

شاید اس کے مقابلہ میں طرز کلام کی تبدیلی وعید میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے کیونکہ یہ کلام انہیں ڈرانے کے لئے کیا گیا ہے۔ (طرز کلام میں تبدیلی اس طرح ہے کہ پہلے فرمایا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے مقابلۃً یوں ہونا چاہئے تھا کہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل نہیں کرتا لیکن ایسا نہیں فرمایا بلکہ فرمایا جو ظلم کرنے والے ہیں ان کا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار تو یہ تبدیلی وعید میں مبالغہ کے لئے ہے)

ؔ أَمِ اتَّخَذُوْا کا عطف والظالمون پر ہے۔ اس میں ام منقطعہ بمعنی بل اضرابیہ ہے اور ہمزہ برائے انکار ہے۔ یعنی کفار نے اللہ تعالیٰ کو دوست اور مددگار نہیں بنایا بلکہ انہوں نے اسے چھوڑ کر بتوں اور شیاطین وغیرہ کو کارساز بنا لیا ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا یا پھر معنی یہ ہے کہ جنہیں کارساز بنایا گیا ہے وہ ان کے دوست اور مددگار نہیں ہونگے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی حقیقی کارساز ہے۔ ترکیب کلام میں فاللہ ھو الولی محذوف شرط کا جواب ہے۔ یعنی اگر انہوں نے کارساز بنانے کا ارادہ کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہی حقیقی کارساز ہے، یعنی وہی یہ حق رکھتا ہے کہ اسے کارساز بنایا جائے۔ اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا تا کہ وہ ہر نفس کو اس کے عمل کے مطابق جزا اور بدلہ دے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے یہ جملہ، یعنی وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ قول باری تعالیٰ ھو الولی کی علت بیان کر رہا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ آپکا بھی ولی، یعنی مددگار ہے اور ان کا بھی جو آپ کے پیروکار ہیں(2)۔ اس صورت میں فاللہ کی فا حرف عطف کے لئے ہوگی نہ کہ شرط کی جزا کے لئے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ إِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ڰ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ ⑩ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۭ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَّمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪

"اور جس بات میں تمہارے درمیان اختلاف رونما ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد کر دو۔ یہی اللہ میرا رب ہے اور اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں ۱؎ وہ پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا اسی نے بنائے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے اور مویشیوں سے بھی جوڑے بنائے۔ وہ پھیلاتا رہتا ہے تمہاری نسل کو اس کے ذریعہ ۲؎ نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز اور وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے ۳؎"

۱؎ اے لوگو! امر دین میں سے جس بات میں تمہارے درمیان اختلاف رونما ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے وہی

کی طرف رجوع کرو۔ (یعنی کوئی ایسی تاویل نہ کرو جو کسی محکم آیت کے حکم کے خلاف ہو) وہ جو تمہارے درمیان فیصلہ فرمائے گا وہ اللہ ہے۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرما دیجئے یہی اللہ میرا رب ہے۔ (ترکیب کلام میں ربی لفظ اللہ سے بدل ہے یا عطف بیان ہے) میں نے دشمنوں کے مکر وفریب کو رد کرنے میں اور تمام امور میں اسی پر بھروسہ کیا ہے۔ اور سخت مشکلات میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

۱؎ وہ آسمانوں اور زمین کو بنانے والا ہے۔ ترکیب کلام میں فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، ذٰلِكُمُ کی دوسری خبر ہے۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ خود مبتدا ہے اور اس کا مابعد کلام اس کی خبر ہے۔

اسی نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے بنائے ہیں، یعنی عورتیں پیدا کی ہیں۔ اور مویشیوں کے لئے ان کی جنس سے جوڑے بنائے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں کی کئی صنفیں پیدا کی ہیں یا ان میں سے مذکر اور مونث پیدا کئے ہیں۔ جعل کا جملہ پہلی دونوں تفسیروں کے مطابق حال واقع ہو رہا ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔

یذرؤ کم۔ کا معنی ہے وہ تم میں اضافہ کرتا رہتا ہے وہ پھیلاتا رہتا ہے۔ یہ ذرء سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی پھیلانا اور بکھیرنا ہے۔ کم ضمیر سے مراد مخاطبین اور انعام (چوپائے) تمام ہیں۔ لیکن مخاطبین کو غلبہ دیتے ہوئے خطاب کی ضمیر ذکر کی گئی ہے۔

فیہ سے مراد ہے اس تدبیر میں اور تدبیر سے مراد لوگوں اور مویشیوں کو جوڑا جوڑا بنانا ہے تا کہ اس کے سبب سلسلہ توالد جاری رہے اور نسل بڑھتی رہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس ذریعہ تمہاری نسل پھیلاتا رہتا ہے۔

بعض نے فیہ کی ضمیر سے مراد رحم اور بعض نے پیٹ مراد لیا ہے۔ اور بعض نے فی کو باء کے معنی میں قرار دیا ہے۔ یعنی وہ اس کے سبب تمہیں پھیلاتا رہتا ہے۔ بعض نے اس کا معنی بیان کیا کہ وہ جوڑے بنا بنا کر تمہاری تعداد کو کثیر کر رہا ہے۔

۲؎ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ اس کی مانند کوئی چیز نہیں ہے۔ اس میں لفظ مثل زائد ہے اور معنی یہ ہے کہ کسی شئی کی طرح نہیں ہے۔ اور اس میں لفظ مثل تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ۔ بعض نے کہا ہے کہ کاف زائدہ ہے اور معنی یہ ہے کہ اس کی مثل کوئی شئی نہیں ہے جو اس سے موافقت اور مناسبت رکھتی ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کی کوئی نظیر نہیں ہے(1)۔ بعض نے کہا ہے یہ کنایہ کے باب سے ہے۔ اسی کی مثل ان کا یہ قول ہے کہ جب کسی سے فعل کی نفی کرنے میں مبالغہ مقصود ہو تو کہا جاتا ہے مثلک لایفعل کذا۔ تیری مثل آدمی اس جیسا کام نہیں کیا کرتا۔ کیونکہ جب مخاطب سے مناسبت رکھنے والے اور اس کا قائم مقام بننے والے سے کام کی نفی کر دی جاتی ہے تو بطریق اولی مخاطب سے اس کام کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ کنایہ ہے تو پھر یہ تقاضا نہیں کرتا کہ اس کی کوئی مثل ہو کیونکہ کنایہ میں معنی حقیقی کا تحقق اور ثبوت شرط نہیں ہوتا۔ جیسا کہ لمبے قد والے آدمی کے لئے کہا جاتا ہے فلاں طویل النجاد۔ (فلاں آدمی کا پرتلہ طویل ہے یعنی وہ دراز قد والا ہے) اگر چہ اس کا پرتلہ بالکل ہی نہ ہو (پھر بھی کلام صحیح ہوگا) اسی کی مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے۔ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۔ یہ سخی ہونے سے کنایہ ہے اس کے باوجود کہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لئے اعضا کا ہونا محال ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مثل بمعنی صفت ہے، یعنی اس کی صفت کی طرح کسی شے کی صفت

والوں کو قوت سماعت اور دیکھنے والوں کی قوت بصارت اللہ تعالیٰ سے مستعار لی ہوتی ہے یہاں ان دو صفتوں کا ذکر اس لیے فرمایا تا کہ کہیں یہ وہم نہ پیدا ہو جائے کہ جس طرح اس کی کوئی مثل موجود نہیں اسی طرح شاید اس کی کوئی صفت بھی نہیں۔ اس وہم کا ازالہ کرنے کے لئے اور صفات ثابت کرنے کے لئے یہاں ان صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔)

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾

"اسی کے قبضہ میں ہیں کنجیاں آسمانوں اور زمین (کے خزانوں) کی کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) بیشک وہ چیز کو خوب جاننے والا ہے [1] اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لیے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا نوح کو اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف اور جس کا ہم نے حکم دیا تھا ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو [2] کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور تفرقہ نہ ڈالنا اس میں [3] بہت گراں گزرتی ہے مشرکین پر وہ بات جس کی طرف آپ انہیں بلاتے ہیں اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف جو (اس کی طرف) رجوع کرتا ہے [4]"

[1] مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے مراد آسمانوں اور زمین میں پائے جانے والے رزق کے خزانے ہیں۔ کلبی نے کہا ہے اس سے مراد بارش اور نباتات ہے۔

يَبْسُطُ الرِّزْقَ الآیہ کا معنی ہے کہ وہ اپنی مشیت کے مطابق بطور آزمائش اور امتحان جس کے لئے چاہتا ہے رزق وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے اور وہ ویسے ہی کرتا ہے جیسے کرنا مناسب ہوتا ہے۔

[2] شَرَعَ لَكُمْ میں کم ضمیر سے خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہے۔ اور الیک میں (ضمیر سے خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ آیت طیبہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین اسلام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے مقرر فرمایا ہے وہ کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ وہی تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے۔ کیونکہ حق ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور حق کے بعد ضلالت اور گمراہی ہوتی ہے۔ اور اہل کتاب نے محض عداوت اور عناد کے پیش نظر اس دین کا انکار کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری راہنمائی کے لئے ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ پھر آپ [illegible]

کی اتباع کرو۔)اسے احمد،نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے(1)۔

اور وہ دین اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی ذات وصفات کے ساتھ ایمان لانا۔تمام انبیاء علیہم السلام ان پر نازل ہونے والی کتب،ملائکہ اور بعث بعد الموت پر ایمان لانا۔علاوہ ازیں ان تمام چیزوں کو تسلیم کرنا جو انبیاء علیہم السلام لیکر آئے اور جن کاموں کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا ہے انہیں بجالانے اور جنہیں کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان سے رکے رہنے کو تسلیم کرنا۔ان بنیادی تمام امور کو تسلیم کرنا اور ان پر ایمان لانا ایک ایسا جامع امر ہے جس پر تمام شریعتیں متفق ہیں۔بعض احکام عملیہ کے منسوخ ہونے کے سبب یہ لازم نہیں آتا کہ ادیان میں اختلاف ہے۔کیا آپ نہیں جانتے کہ کبھی ایک نبی کے دین میں بھی نسخ ہو جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرمائی اور پھر کعبہ معظمہ کی طرف رخ زیبا پھیر کر نماز ادا فرمانے لگے تو جس طرح یہ نسخ ادیان کے اختلاف کو مستلزم نہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں فروعی اختلاف ہونے کے سبب بھی ادیان میں اختلاف کا ہونا لازم نہیں آتا۔(یعنی اس سے وحدت دینی متاثر نہیں ہوتی) کیونکہ تمام ادیان کا مدعی اور مقصود ایک ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے اوامر کو بجالانا اور اس کی نواہی سے اجتناب کرنا۔

ؔ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ میں ان مفسرہ ہے جو کہ اوحینا اور وصینا کی تفسیر بیان کر رہا ہے کیونکہ ان میں قول کا معنی موجود ہے یا اَنْ مصدریہ ہے اور مصدر منصوب مَا وصّٰی سے بدل ہے جو کہ شرع کا مفعول ہے یا مصدر مرفوع ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے اور وہ ھو ہے مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمہیں عطا فرمائیں بغیر کسی انحراف اور کج روی کے اسے لے لو۔(یعنی تمام احکام پر بغیر کسی لیت و لعل کے عمل کرو۔)

اور محض آراء اور خواہشات کی اتباع کرتے ہوئے یا محض تعصب اور عناد کی بناء پر دین میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

کیونکہ آراء اور خواہشات کی اتباع و پیروی کے سبب ہی حضور نبی کریم ﷺ کی امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث طیبہ ابھی ہی بیان کی ہے اس کا مقصود بھی یہی ہے۔حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خط کھینچا تو فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے اور پھر دائیں بائیں بہت سے خطوط کھینچے اور فرمایا یہ راستے ہیں جن میں ہر راستے پر شیطان ہے۔

اور پھر دو نصاریٰ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے تو اس کا سبب محض ان کا عناد اور تعصب تھا۔حضرت علیؓ نے فرمایا ہے تفرقہ نہ ڈالو۔پاس جماعت (اکٹھا رہنا) رحمت ہے اور فرقت (بکھر جانا) عذاب ہے۔حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے بالشت بھر بھی جماعت سے علیحدگی اختیار کی اس نے اسلام کا پھندا اپنے گلے سے اتار دیا(1)۔

اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔اسے سند حسن کے ساتھ ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان انسان کے لئے بھیڑیا ہے جیسا کہ بکریوں کا بھیڑیا ریوڑ سے بچھڑنے والی دور رہ جانے والی اور ایک طرف چلنے والی بکری کو پکڑ لیتا ہے (اسی طرح شیطان بھی جماعت سے علیحدہ رہنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے) اور تم گھاٹیوں (کناروں) سے بچو اور تم پر لازم ہے کہ جماعت اور جمہور کے ساتھ رہو۔

لے وہ دین مستقیم جس کی طرف مشرکین کو دعوت دیتے ہیں وہ ان پر انتہائی گراں گزرتا ہے کیونکہ وہ دین توحید کی دعوت دیتا ہے اور بتوں کو چھوڑنے کا حکم دیتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اپنے دین کی طرف یا اس کی طرف جس کی طرف آپ انہیں دعوت دے رہے ہیں یا اپنی طرف جسے چاہتا ہے چاہے جسے چُنا گیا ہے اس کی طرف سعی وارادہ پایا جائے یا نہ پایا جائے۔

اور اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف آتا ہے۔ صوفیہ نے کہا ہے وہ آدمی جس کے اختیار کے بغیر اللہ تعالیٰ اسے اپنی ذات کی طرف چُن لیتا ہے اور کھینچ لیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مراد ہوتا ہے اور وہ انبیاء علیہم السلام اور صدیقین کا گروہ ہے اور وہ اولیاء کرام اور دیگر نیک اور متقی بندوں کا گروہ ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۴﴾

”اور نہ بٹے وہ فرقوں میں مگر اس کے بعد کہ آ گیا ان کے پاس (صحیح) علم (یہ تفرقہ) محض باہمی حسد کے باعث تھا۱؎ اور اگر یہ فرمان پہلے نہ ہو چکا ہوتا آپ کے رب کی طرف سے کہ انہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دی جائے تو فیصلہ ہو چکا ہوتا ان کے درمیان، اور جو لوگ وارث بنائے گئے تھے کتاب کے، ان کے بعد وہ اس کے متعلق ایسے شک میں مبتلا ہیں جو قلق انگیز ہے۲؎“

۱؎ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا کا عطف شرع پر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، یعنی اہل کتاب فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے۔ مگر اس کے بعد کہ سابقہ کتب سماویہ کے سبب ان کے پاس صحیح علم آ گیا تھا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہے۔ اور جو حضور نبی رحمت محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ الثناء کی طرف وحی کی گئی ہے وہ وہی دین ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر تشریف لائے۔

بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ یہ تفرقہ محض باہمی حسد کے باعث تھا۔ عطاؒ نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے ان کے درمیان حسد، تکبر اور رعونت پیدا ہو گئی تھی (1)۔ قاموس میں ہے بغی علیه یبغی بغیا۔ وہ بلند ہو گیا، اس نے ظلم کیا، انصاف نہ کیا اور انتہائی لمبا ہو گیا (2) (یعنی حد سے تجاوز کر گیا)

۲؎ اگر آپ کے رب کی طرف سے دار جزاء (یوم آخرت) تک عذاب مؤخر کرنے کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا، یعنی ان کے درمیان جو دنیا میں ایمان لائے اور جنہوں نے کفر کیا۔ اس طرح کہ اہل باطل کو جڑ سے اکھیڑ کر نیست و نابود کر دیا جاتا اور اہل حق کو غلبہ اور سرفرازی عطا کر دی جاتی۔

کتاب کے بعد۔ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ وہ اپنی کتاب یا قرآن کریم کے متعلق ایسے شک میں مبتلا ہیں جو قلق انگیز ہے۔ یعنی وہ اسے اس طرح نہیں جانتے جیسے جاننے کا حق ہے اور نہ وہ اس کے ساتھ اس طرح ایمان رکھتے ہیں جیسے ایمان لانے کا حق ہے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ؕ﴿۱۵﴾

"پس اس دین کی طرف آپ دعوت دیتے رہئے۔ اور ثابت قدم رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور نہ اتباع کیجئے ان کی خواہشات کا۔ اور (برملا) فرمائیے کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عدل کروں تمہارے درمیان۔ اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ کسی بحث و تکرار کی ضرورت نہیں ہمارے اور تمہارے درمیان۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف (سب نے) پلٹنا ہے [1]"

[1] اہل کتاب کے تفرقہ کے سبب آپ لوگوں کو اقامتہ دین کی طرف دعوت دیتے رہئے اور تفرقہ نہ ڈالیے اور جو کچھ آپ کو عطا کیا گیا ہے اس کی اتباع و پیروی کرنے کی تلقین کرتے رہئے۔ فادع پر فا اَمَّا محذوف کے جواب میں واقع ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اما انت فادع الناس الی اقامة الدین الخ۔

اور آپ اس پر ثابت قدم رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور آپ ان کی ٹیڑھی اور کج رو خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔ اور برملا فرمائیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان لایا۔ نہ کہ اس طرح جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کہا نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿﴾ ۔ (کہ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ درمیانی راہ نکالنا چاہتے ہیں) اور مجھے عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ احکام شرعیہ کی تبلیغ کرنے اور متخاصمین کے درمیان فیصلہ کرنے میں تمہارے درمیان عدل کروں۔ پہلا یعنی اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قوۃ نظریہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے اور یہ لاعدم بینکم قوۃ عملیہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے وہ تمام کا خالق ہے اور تمام کے امور کا متولی ہے۔

ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ یعنی ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دی جائے گی۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کسی بحث و تکرار کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تمہارے اعمال ہمیں کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے اور ہمارے اعمال تمہارے ضرر رساں ثابت نہیں ہوں گے۔ ہم تو تمہاری نصیحت اور فائدے کی خاطر تمہیں اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ عداوت اور بحث کے تکرار کی قطعاً کوئی وجہ نہیں۔

یہ آیت جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی پھر آیت قتال (جہاد) کے ساتھ اس کا حکم منسوخ ہو گیا اور اس کا ناسخ یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ...... الی قوله بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ

وَ الَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ عَلَیْهِمْ غَضَبٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۶﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ ؕ وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ ﴿۱۷﴾

”اور جو لوگ حجت بازی کرتے ہیں اللہ (کے دین) کے بارے میں اس کے بعد کہ (اکثر حق شناس) اس کو مان چکے ہیں¹ سوان کی حجت بازی لغو ہے ان کے رب کے نزدیک اور ان پر (اللہ کا) غضب ہے اور انہی کے لئے سخت عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے نازل کیا ہے کتاب کو حق کے ساتھ اور (نازل کیا ہے) میزان کو۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔²“

¹ ابن منذر نے عکرمہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب سورۂ نصر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۙ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ نازل ہوئی تو مشرکین مکہ نے اپنے درمیان رہنے والے مؤمنین سے کہا اللہ تعالیٰ کے دین میں لوگ گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں تم بھی ہمارے درمیان سے نکل جاؤ کب تک تم ہمارے درمیان قیام پذیر رہو گے اس وقت آیت وَ الَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰهِ نازل ہوئی(1)۔

عبدالرزاق نے قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ حجت بازی کرنے والے یہود و نصاریٰ تھے وہ کہتے ہیں ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے، ہمارا نبی تمہارے نبی سے مقدم ہے لہٰذا ہم تم سے بہتر اور افضل ہیں یہی ان کا جھگڑا تھا(2)۔ اس کے بعد کہ اکثر حق شناس لوگ آپ کی دعوت کو قبول کر چکے ہیں اور وہ اسلام قبول کر کے آپ کے دین میں داخل ہو چکے ہیں کیونکہ آپ کے معجزات اور حسن دعوت بالکل ظاہر اور واضح ہے۔ سوان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک لغو ہے، ان کی خصومت اور جھگڑا باطل اور لایعنی ہے یا معنی یہ ہے کہ جسے وہ حجت گمان کرتے ہیں فی الحقیقت وہ ایک باطل شبہ ہے۔ ان کے اسی معاندانہ رویہ کے سبب ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور ان کے کفر کے سبب انہی کے لئے شدید عذاب ہے۔

² کتاب سے مراد جنس کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے کتاب کو نازل فرمایا ہے درآنحالیکہ وہ حق کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور باطل سے بہت دور ہے۔ یا اس کے نزول کا مقصد عقائد حقہ اور احکام صحیحہ کی حقیقت کو واضح کرنا اور ان کی تعلیم دینا ہے۔

قتادہ، مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ میزان سے مراد عدل ہے۔ چونکہ میزان ہی انصاف اور مساوات کا آلہ ہے اسی لئے عدل کو میزان کہا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میزان کے ذریعے صحیح صحیح پورا تولنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور تولنے میں کمی کرنے سے منع فرمایا ہے(3)۔

بعض نے کہا ہے میزان سے مراد شریعت ہے کیونکہ شریعت کے سبب ہی حقوق میں توازن اور لوگوں کے مابین مساوات اور عدل قائم رہ سکتا ہے۔

پر عمل پیرا رہو اور عدل و انصاف پر مواظبت اختیار کرو اس لیے کہ ہم اچانک تم پر قیامت برپا کر دیں گے اس وقت تمہارے اعمال کا وزن کیا جائیگا اور ان پر تمہیں پورا پورا بدلہ اور جزا دی جائے گی۔

الساعۃ مونث ہے اور قریب مذکر ہے ان کے درمیان موافقت قائم کرنے کے لئے بعض نے کہا ہے کہ قریب ذات قرب کے معنی میں ہے یعنی قرب والی (گویا مونث معنی میں ہی استعمال ہو رہا ہے) یعنی قریب بروزن فعیل مونث ہے) یا توجیہہ یہ ہے کہ یہاں الساعۃ بمعنی البعث ہے ترکیب کلام میں لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ جملہ یدریک کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اس میں لعل نے ہی فعل کو عمل کرنے سے روکا ہے۔

مقاتل نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کا ذکر فرمایا اس وقت آپ کے پاس مشرکین موجود تھے تو انہوں نے اس کی تکذیب کرتے ہوئے کہا قیامت کب آئے گی؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی (1)۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ⑱ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ⑲

"جلدی مچاتے ہیں اس کے لیے وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے اس پر۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ خوفزدہ رہتے ہیں اس سے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے۔ خبردار! جو لوگ شک کرتے ہیں قیامت کے متعلق وہ بڑی گمراہی میں (مبتلا) ہیں [1] اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر [2] رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اور وہی قوی (اور) زبردست ہے [3]"

[1] وہ لوگ جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی۔ وہ بطور استہزاء اور تمسخر اس کے جلدی آنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں وہ عذاب کے احتمال کے سبب اس سے خوفزدہ رہتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے اور بالیقین آئے گی۔

يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ کا معنی یہ ہے وہ لوگ جو قیامت کے بارے جھگڑا کرتے ہیں اور اس کے آنے کے بارے شک کرتے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ المریۃ اور المریۃ کا معنی شک اور جھگڑا ہے۔ ماراہ ممارا ۃ فلاں نے اس میں شک کیا۔ فی الحقیقت یہ مرنت الناقۃ سے ماخوذ ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب اونٹنی کی کھیری کو دودھ دوہنے کے لئے زور سے دبایا جائے۔ چونکہ جھگڑا کرنے والے بھی ایک دوسرے کے لیے انتہائی سخت کلام زبان سے نکالتے ہیں اسی لئے ان کے جھگڑا کو مریۃ کہا جاتا ہے۔

لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ۔ وہ بڑی گمراہی میں مبتلا ہیں، یعنی حق سے بہت دور ہیں۔ کیونکہ قیامت کے دن دوبارہ اٹھایا جانا ایک ایسا امر ہے جو کتاب وسنت اور شہادت عقل سے صراحۃ ثابت ہے کہ دارالجزا کا ہونا ضروری اور لازم ہے۔ اس لیے یہ ابھی اگرچہ غائب ہے لیکن یہ دلائل سے اتنا واضح ہے کہ امر محسوس کے مشابہ ہے اس لیے وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کے باوجود قیامت قائم ہونے کا

۲؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انتہائی مہربان ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرنے والا ہے۔ سدی نے کہا ہے وہ نرمی کرنے والا ہے اور مقاتل نے کہا ہے وہ نیک اور گنہگار تمام بندوں پر مہربان ہے(1) اس طرح کہ وہ گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی سزا کے طور پر ہلاک و برباد نہیں کرتا۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے وہ اپنے لطیف ادراک کے سبب منافع پہنچانے اور مصائب و آلام کا رخ پھیرنے میں بڑا لطیف اور باتدبیر ہے۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ مخفی اور مشکل امور کے بارے اس کا علم باریک بیں اور دقیقہ رس ہے جرائم سے درگزر کرنے میں اس کا حلم انتہائی عظیم ہے، وہ نیکیوں اور اچھائیوں کو پھیلاتا ہے اور عیوب و نقائص پر پردہ ڈالتا ہے، وہ بندے کو حاجت و ضرورت سے کہیں زیادہ عطا فرماتا ہے اور بندے کی قوت و طاقت سے کم عبادت و طاعت کا اسے مکلف و پابند بناتا ہے۔

۳؎ وہ جسے جتنا چاہتا ہے رزق عطا فرماتا ہے، بندوں میں سے ہر ایک کے لئے جتنی بھلائی اور احسان کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے وہ اسے عطا فرماتا ہے اور وہ ہر مومن و کافر اور ذی روح کو رزق عطا فرماتا ہے پس یہ سب ان میں سے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انہیں رزق دے۔ حضرت امام جعفر بن محمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق عطا فرمانے میں دو تدبیریں کی ہیں ایک یہ کہ اس نے تمہیں پاکیزہ اور طیب رزق عطا فرمایا ہے اور دوسرا یہ کہ اس نے تمہیں سارا ایک ہی بار نہیں دے دیا(2)۔

اور وہی قوی ہے یعنی اس کی قدرت بالکل ظاہر اور واضح ہے اور زبردست ہے ایسا کہ اس پر غلبہ نہیں پایا جاسکتا ترکیب کلام میں وَهُوَ الْقَوِیُّ کا جملہ حال ہے۔

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ حَرۡثَ الۡاٰخِرَةِ نَزِدۡ لَهٗ فِىۡ حَرۡثِهٖ‌ ۚ وَمَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ حَرۡثَ الدُّنۡيَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ نَّصِيۡبٍ ﴿۲۰﴾ اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ‌ ؕ وَلَوۡلَا كَلِمَةُ الۡفَصۡلِ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ‌ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۲۱﴾

''جو طلبگار ہو آخرت کی کھیتی کا تو ہم (اپنے فضل و کرم سے) اس کی کھیتی کو اور بڑھا دیں گے اور جو شخص خواہشمند ہے (صرف) دنیا کی کھیتی کا تو ہم اسے دیں گے اس سے اور نہیں ہوگا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ ۱؎ کیا ان کے ایسے شریک ہیں جنہوں نے مقرر کیا ہے ان کے لیے ایسا دین جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ اور اگر ان کے فیصلہ کی بات پہلے سے طے نہ ہوتی تو ان کا قصہ کبھی کا چکا دیا گیا ہوتا۔ اور جو ظالم ہیں یقیناً ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۲؎''

۱؎ حَرۡث کا معنی ہے زمین میں بیج ڈالنا اور زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کو بھی حَرۡث کہہ دیا جاتا ہے۔ قاموس میں ہے کہ حَرۡث کا معنی کمائی، مال جمع کرنا اور کھیتی ہے(3)۔ اور یہاں حَرۡث سے مراد ثواب آخرت ہے۔ چونکہ آخرت کا ثواب دنیا میں کیئے جانے والے عمل کا ثمرہ اور پھل ہوتا ہے اسی لئے اسے زرع (کھیتی) کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی

میں ثواب بھی حاصل ہوگا۔

جو آخرت کی کھیتی کا طلبگار ہو تو ہم اپنے فضل و کرم سے اس کی کمائی اور کھیتی کو اور بڑھادیں گے اور ہم اسے ایک کے بدلے دس سے لیکر سات سو گنا تک عطا فرمائیں گے جیسا کہ ایک دانہ سے سات بالیاں اگیں اور ہر بالی میں ایک سو دانہ ہو "كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ"۔

اور جو شخص اپنے عمل کے عوض صرف دنیوی کھیتی اور حصے کا ارادہ رکھتا ہے تو ہم اسے اس میں سے دیں گے جو ہم نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اور آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ ترکیب کلام میں وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ الخ کا عطف نؤتہ پر ہے۔ حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔ اور ہر آدمی کے لئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی پس جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی ہوگی اور جس نے دنیا کو پانے کے لئے یا عورت سے شادی کرنے کی غرض سے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہوگی جس کے لئے اس نے ہجرت کی یہ روایت متفق علیہ ہے(1)۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس امت کو نور و چمک، رفعت و بلندی فتح و نصرت اور زمین میں غلبہ و اقتدار کی بشارت دے دو۔ پس ان میں سے جو بھی آخرت کا عمل دنیا کے لئے کرے گا آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اسے علامہ بغوی نے روایت کیا ہے(2)۔

ﮯ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا میں ام منقطعہ بمعنی بل ہے اور ہمزہ انکار کے لئے ہے، یعنی بلکہ کیا ان کے لئے وہ ہیں جنھیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک گمان کر رکھا ہے چونکہ انہوں نے شریک بنائے ہوئے تھے اسی لئے شرکاء کو انہی کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ کیا شرکاء نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، یعنی انہوں نے دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین مقرر کر دیا ہے(3) جس میں شرک، دوبارہ زندہ کئے جانے سے انکار اور محض دنیا کے لئے عمل کرنے کی ترغیب و تعلیم ہے۔ اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ شرع لکم من الدین سے متصل ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ام متصلہ ہے اور محذوف جملہ کے مقابلہ میں آرہا ہے جس کا آغاز ہمزہ سے ہو رہا ہے۔ تقدیر عبادت اس طرح ہے ایقبلون ماشرع اللہ ام یقبلون ماشرع لهم شرکاؤھم۔ کیا وہ اس دین کو قبول کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے یا اسے جسکو ان کے شرکاء نے مقرر کیا ہے۔

اگر قیامت کے دن تک جزا اور بدلہ کو مؤخر کرنے کا فیصلہ پہلے ہی نہ ہو چکا ہوتا تو مؤمنین اور کفار کے درمیان ابھی فیصلہ کر دیا جاتا اور اللہ تعالیٰ آپ کی تکذیب کرنے والوں کو دنیا میں ہی عذاب دے چکا ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرما رکھا ہے بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ۔ ترکیب کلام میں و لولا کلمۃ الفصل جملہ معترضہ ہے۔

بیشک ظلم کرنے والوں، یعنی مشرکین کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے آیت میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر الظّٰلِمِيْنَ ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس کی وضاحت ہو جائے کہ وہ اپنے شرک کی وجہ سے دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔ تقدیر عبادت اس طرح ہے۔ انهم لهم عذاب الیم لما کانوا ینکرونه۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَ هُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾

"آپ دیکھیں گے ظالموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے ان (کرتوتوں) سے جو انہوں نے کمائے اور وہ ان پر واقع ہو کر رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے وہ بہشتوں کے باغوں میں ہونگے انہیں ملے گا جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے یہی بڑا فضل ہے[1] یہ وہ چیز ہے جس کی خوشخبری اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے ہیں[2] آپ فرمایئے میں نہیں مانگتا اس (دعوت حق) پر کوئی معاوضہ بجز قرابت کی محبت کے۔ اور جو شخص کماتا ہے کوئی نیکی ہم دوبالا کر دیں گے اس کے لیے اس میں حسن بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے[3]"

[1] آپ دیکھیں گے کہ مشرکین قیامت کے دن شرک اور دیگر ان گناہوں کی سزا سے ڈر رہے ہونگے جو انہوں نے کمائے۔ ترکیب کلام میں مشفقین، تری فعل کا مفعول ثانی ہے یا حال ہے۔

ان کے کرتوتوں کی سزا بالیقین ان پر واقع ہو کر رہے گی چاہے وہ ڈریں یا نہ ڈریں۔ ترکیب کلام میں وَهُوَ وَاقِعٌ حال مقدرہ ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ بہشتوں کے باغوں میں ہونگے، یعنی وہ انتہائی پاکیزہ، حسین عمدہ اور تفریح کی مقامات پر ہونگے۔ وہاں وہ جس چیز کو چاہیں گے اور خواہش کریں گے وہی ان کے لئے ان کے رب کے پاس سے حاضر اور موجود ہوگی۔ اور جنت کی جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہی بہت بڑا فضل ہے، یعنی دنیا میں جتنی نعمتیں ان کے پاس تھیں وہ اس نعمت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

[2] یہ وہ ثواب ہے جس کی خوشخبری اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو، حمزہ اور کسائی نے یبشر کو تخفیف کے ساتھ يَبْشُرُ پڑھا ہے جو کہ بشرۃ سے ماخوذ ہے۔ جبکہ باقیوں نے باب تفعیل سے يُبَشِّرُ پڑھا ہے۔

[3] اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرما دیجئے کہ میں تمہیں جو وعظ و تبلیغ کر رہا ہوں اور دعوت حق دے رہا ہوں اس پر بجز قرابت کی محبت کے تم سے کوئی اجرت (نفع) نہیں مانگتا۔ یعنی میری تمہارے ساتھ جو قرابتداری ہے اس کے سبب تم مجھ سے مودت و محبت رکھو۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ اور فِي الْقُرْبٰى الْمَوَدَّةَ سے حال ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں عبدالملک بن میسرہ کی سند سے طاؤس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

قرابتداری کا رشتہ قریش کے ہر بطن میں موجود تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ فرمایا کہ میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ قرابت موجود ہے تم اسے قائم رکھو(1) (مزید کسی اجرت یا معاوضہ کی مجھے قطعاً ضرورت نہیں۔)

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اسی طرح شعبی نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے اَلْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى یہ ہے کہ تم میری قرابت کی حفاظت کرو میرے ساتھ مودت قائم کرو اور صلہ رحمی کرو۔ یہی موقف مجاہد، عکرمہ۔ مقاتل، سدی اور ضحاک کا بھی ہے(2)، عکرمہ نے کہا ہے کہ میں تمہیں جو دعوت حق دے رہا ہوں اس پر تم سے کسی معاوضہ کا طالب نہیں بجز اس کے کہ تم میری اور میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ قرابت ہے اس کی حفاظت اور پاسداری کرو۔ آیت کا وہ مفہوم نہیں جو کذاب لوگ کہا کرتے ہیں۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ ایک گروہ نے کہا ہے یہ آیت منسوخ ہے۔ یہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی۔ مشرکین مکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف اور اذیت پہنچاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مودت ومحبت کا اظہار کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرما ہوئے اور انصار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے اور ہر اعتبار سے آپ کی مدد ونصرت کی تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ملا دے جیسا کہ انہوں نے اپنی اپنی امت کو یہ کہا تھا وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (3)۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حکم نازل فرمایا قل لا اسئلکم علیه اجرا پس پہلا حکم اس آیت اور اس ارشاد باری تعالیٰ کے ساتھ منسوخ ہو گیا قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ علاوہ ازیں بھی اس مفہوم کی کئی آیات ہیں۔ یہ موقف ضحاک بن مزاحم اور حسین بن فضل نے پیش کیا ہے۔ علامہ بغوی نے بیان کیا ہے کہ یہ قول پسندیدہ نہیں کیونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کی محبت ومروت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر تکلیف دہ شے کو دور کرنا اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب سے محبت رکھنا فرائض دین میں سے ہے(4)۔ میں کہتا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اقارب سے محبت رکھنا انتہائی مضبوط اور محکم فریضہ ہے۔ یہ نسخ کا احتمال نہیں رکھتا کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث پاک مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی بھی (کامل) مؤمن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کے نزدیک میری ذات اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب ہو جائے(5)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی دوسری حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین چیزیں ہیں جس میں وہ پائی جائیں گی ان کے سبب وہ حلاوت ایمان کو پالے گا۔ ایک وہ آدمی جس کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام ماسوا کی نسبت زیادہ محبوب ہوں۔ دوسرا وہ آدمی جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کسی بندے سے محبت کرتا ہو اور تیسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے ایک بار کفر سے محفوظ رکھ لیا تو پھر کفر کی جانب لوٹنا ایسے ناپسند کرتا ہو جیسے آگ میں پھینکا جانا ناپسند کرتا ہے(6)۔ ان دونوں حدیثوں کو شیخین نے صحیحین میں بیان کیا ہے۔ اور اسی پر اجماع بھی منعقد ہے لیکن یہ کہنا ممکن ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو طلب اجرت کا جو حکم دیا تھا وہ منسوخ ہو۔ ابن نجیح نے مجاہد کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کے یہ معنی روایت کیے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اور اطاعت کے سبب اس کا قرب حاصل کرو۔ یہی قول حسن کا بھی ہے آپ فرماتے ہیں کہ قربیٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب ہے مفہوم یہ ہے کہ تم طاعت و عبادت اور عمل صالح کے سبب اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کرو اور اس سے اظہار مودت و محبت کرو۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ تم میرے قرابتداروں اور میری اولاد سے محبت کرو اور ان کے معاملہ میں تم میرا لحاظ رکھو۔ یہی قول سعید بن جبیر اور عمرو بن شعیب کا ہے(1)۔

ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی گئی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے قرابتدار کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علی، فاطمہ اور ان کے دو بیٹے رضی اللہ عنہم(2)۔

شیعہ حضرات نے مذکورہ حدیث کی روشنی میں اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ خلافت فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں ہی محصور ہے اور پہلے تینوں خلفاء رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت باطل ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں مذکورہ حدیث اور اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت واجب ہے اور آپ کے سوا کسی اور کی محبت واجب نہیں۔ اور محبت کا وجوب اطاعت کے وجوب کو مستلزم ہوتا ہے پس نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آپ ہی امام برحق ہیں کسی اور کی امامت وخلافت صحیح نہیں۔ مگر ان کا یہ استدلال متعدد وجوہ سے باطل ہے۔

1: ۔ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس کی سند میں ایک روای حسین الاشعری ہے جو انتہائی سخت غالی شیعہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور وہاں حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے پاس کوئی بیٹا نہیں تھا۔

2: ۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں کی محبت واجب ہے لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کے سوا کسی کی محبت واجب نہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **حب ابی بکر وعمر ایمان وبغضهما کفر** (کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان ہے اور ان کا بغض رکھنا کفر ہے۔ جس نے میرے صحابہ کرام کے بارے سب وشتم اور گالی گلوچ کا اظہار کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ہے اور جس نے ان کے معاملہ میں میرا لحاظ رکھا تو میں قیامت کے دن اس کی حفاظت کروں گا۔

اسے ابن عساکر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار کا بغض نفاق کی علامت ہے یہ حدیث نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے(3)۔

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قریش کی محبت ایمان ہے اور ان کا بغض کفر ہے اہل عرب کی محبت ایمان ہے اور

مجھے سے بغض رکھا(1)۔اس روایت کو طبرانی نے الاوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور شیعہ حضرات کا یہ قول کہ جس کی محبت واجب ہے وہ امام اور خلیفہ ہوگا۔اس کی اطاعت و پیروی فرض ہوگی یہ نظریہ باطل اور غلط ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ان کی محبت واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے جن پر صدقہ وزکوۃ حرام ہے اور وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب ہیں جو زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام میں کبھی بھی متفرق اور جدا جدا نہیں ہوئے۔بعض نے کہا ہے وہ آل عقیل۔آل جعفر اور آل عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔انہی کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے میں تم میں دو بھاری بھرکم چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب اللہ اور ایک اپنے اہل بیت اطہار۔میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدیر خم (ایک چشمہ کا نام ہے) کے پاس خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔یہ چشمہ مکہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان واقع ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور وعظ و ذکر کرنے کے بعد فرمایا اے لوگو! میں بھی ایک بشر ہوں قریب ہے کہ میرے رب کا قاصد میرے پاس آ جائے اور میں اس پیغام پر لبیک کہوں گا۔میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ان میں سے پہلی کتاب اللہ ہے اس میں ہدایت اور نور ہے پس تم اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پکڑو اور اسے مضبوطی سے تھام لو۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ پر عمل پیرا ہونے پر خوب برانگیختہ کیا اور اس کے بارے ترغیب دی۔پھر فرمایا اور میرے اہل بیت میں تمہیں اپنے اہل بیت۔کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں(2)۔

علامہ بغوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت زید بن ارقم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل بیت کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے کہا وہ آل علی عقیل اور آل عباس رضی اللہ عنہم ہیں(3)۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ رسالت کی اجرت کے طور پر اپنی اور اپنے قرابتداروں کی محبت کا حکم کیسے دیا؟ جبکہ تبلیغ رسالت تو آپ پر فرض تھی اور فرض کی ادائیگی پر اجرت کا مطالبہ کرنا بلکہ نفلی عبادت پر بھی اجرت کا مطالبہ جائز نہیں جیسا کہ ہم ارشاد باری تعالیٰ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ حَرۡثَ الدُّنۡيَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا وَمَا لَهٗ فِي الۡاٰخِرَةِ مِنۡ نَّصِيۡبٍ ۝ کی تفسیر میں یہ حدیث طیبہ بیان کر چکے ہیں کہ جس کسی نے آخرت کا عمل دنیا کے لئے کیا تو اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا؟۔

تو ہم اس شبہ کا ازالہ اس طرح کریں گے کہ تبلیغ رسالت کے بالمقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شئی کی طلب کا سائل اظہار فرمایا اس پر لفظ اجرت کا اطلاق مجازاً اور مشاکلہ ہم شکل ہونے کے طور پر ہے (حقیقی طور پر نہیں) کیونکہ حقیقی اجرت تو وہ ہوتی ہے جو مسائل کے لئے نفع بخش ہو اور وہ اپنے ذاتی فائدہ اور نفع کی خاطر اس کا مطالبہ کرے۔لیکن یہاں صورت حال اس طرح نہیں۔بلکہ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت سے اپنی اور اپنے قرابتداروں کی مودت ومحبت کا مطالبہ کیا ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مطالبے کا حکم ارشاد فرمایا ہے وہ اسی لئے ہے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سبب لوگوں کو فائدہ اور نفع حاصل ہو۔کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا نتیجہ اور ثمر یہ ہے کہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرب نصیب ہوتا ہے۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ آیت کی تاویل وتفسیر میں یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ میں تم سے مطالبہ نہیں کرتا مگر صرف یہ کہ تم میرے قرابتداروں، اہل بیت اطہار اور میری اولاد سے محبت کرو۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو خاتم النبیین ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہوسکتا لہٰذا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعوت الی اللہ کا فریضہ علماء امت کو ہی ادا کرنا ہے، چاہے وہ علوم ظاہرہ کے ماہر ہوں یا علوم باطنہ کے شہسوار۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی امت کو اپنی اہل بیت سے محبت ومودت رکھنے کا حکم دیں، کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آپ کی اولاد میں سے ہونے والے ائمہ کرام کمالات ولایت کے قطب تھے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی (رضی اللہ عنہ) اس کا دروازہ ہیں(1)۔ یہ حدیث بزار اور طبرانی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اور اس کی شواہد دیگر احادیث حضرت ابن عمر، ابن عباس، حضرت علی رضی اللہ عنہم اور آپ کے بھائی سے بھی مروی ہیں۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مشائخ تصوف کے سلاسل کی انتہا ائمہ اہل بیت پر ہوتی ہے۔ اور سادات عظام میں کثیر اولیاء کاملین گزر چکے ہیں مثلاً غوث الثقلین محی الدین شیخ عبد القادر جیلی الحسنی والحسینی، حضرت شیخ بہاوالدین نقشبندی، السید السند حضرت شیخ مودود چشتی، حضرت معین الحق والدین سید شیخ معین الدین چشتی اور حضرت شیخ ابوالحسن الشاذلی وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں تم میں دو عظیم چیزیں چھوڑے جارہا ہوں کتاب اللہ اور اپنی اولاد۔ اکثر علماء تفسیر کی رائے یہ ہے کہ یہاں مستثنیٰ منقطع ہے اور لفظ اجر اپنے حقیقی معنی میں مستعمل ہے اور معنی یہ ہے میں کبھی بھی تم سے اجر کا خواہشمند اور طالب نہیں۔ لیکن تمہیں قربیٰ کی محبت یاددلاتا ہوں اور میرا تم سے جو رشتہ قرابت ہے اس کی یاددلاتا ہوں۔ جیسا کہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے کہ میں تمہیں اپنی اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یاددلاتا ہوں(2)۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے اقرباء کے ساتھ محبت کرنے کا جو مطالبہ اپنی امت سے کیا تاکہ اس کے سبب امت کو فوائد اور منافع حاصل ہوں اسی مفہوم کی تائید ارشاد باری تعالیٰ **و من یقترف حسنۃ** الخ سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی جو شخص کوئی نیکی کماتا ہے اس سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی آل پاک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین کی محبت ہے۔ ورنہ اس جملہ کی سابقہ کلام سے کوئی مناسبت قائم نہیں ہوگی۔ البتہ حسنۃ کا لفظ عام ہے جو ہر نیکی کو شامل ہے۔

نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا۔ ہم اس کے لیے اس میں حسن دوبالا کردیں گے۔ اس طرح کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی آل (یعنی مشائخ طریقت) کی محبت کا ثمر یہ ہے کہ اس کے سبب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سبب اللہ تعالیٰ کی محبت وقرب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ صوفی کو سب سے پہلے فنافی الشیخ کا مقام حاصل ہوتا ہے پھر وہ فنافی الرسول کی سعادت حاصل کرتا ہے اور آخر میں فنافی اللہ تعالیٰ کے عالی مرتبہ پر فائز ہوتا ہے۔ اور فنا سے مراد محبت کی ایسی وارفتگی اور شدت ہے کہ محب، محبوب کے ذکر کے وقت اپنی ذات کو بھول جائے اور ماسوائے محبوب کے نہ اسے کچھ دکھائی دے اور نہ کوئی اور [illegible]

عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اہل بیت کے معاملہ میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ رکھو(1)۔

جو کوئی اللہ تعالیٰ کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے اولیاء سے محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے شاید ارشاد باری تعالیٰ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ ۔ سے یہی مراد ہے کہ مقصود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولیاء اور دوستوں کے گناہ ہوں۔ اور وہ شکور ہے، یعنی اپنی اطاعت و محبت کرنے والوں کا بڑا قدردان ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَ يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے[1] پس اگر اللہ چاہتا تو مہر لگا دیتا آپ کے دل پر[2] اور مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ باطل کو اور ثابت کرتا ہے حق کو اپنے ارشادات سے[3] بیشک وہ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے[4]''

[1] اَمْ يَقُوْلُوْنَ میں ام منقطعہ ہے اور جملہ قول باری تعالیٰ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا سے متصل ہے۔ ہمزہ انکار و توبیخ کے معنی میں ہے اور اس میں ادا اجر سے اضراب کے لئے بل کے معنی بھی ہیں یعنی انھم لا یودون اجر الرسالة بل یقولون وہ اجر رسالت تو ادا نہیں کرتے بلکہ کفار مکہ یہ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ نبوت کے سبب یا قرآن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے۔

[2] فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ الخ جملہ معترضہ ہے۔ یہ اس لیے ذکر کیا گیا ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ آپ جیسی ذات سے افتراء پردازی بعید از امکان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی جرأت وہی کر سکتا ہے جس کے دل پر جہالت کی مہر ثبت ہو۔ لیکن جو صاحب بصیرت ہو، اپنے رب کی معرفت رکھتا ہو وہ قطعاً ایسا نہیں کر سکتا۔ گویا اس آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کی ذلت و رسوائی چاہتا تو یقیناً آپ کے دل پر مہر لگا دیتا تا کہ آپ اس کے خلاف افتراء پردازی اور بہتان باندھنے کی جرأت نہ کرتے۔

مجاہد نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو صبر کے ساتھ مضبوط کر دے گا حتی کہ کفار کی اذیتیں اور ان کا یہ قول کہ آپ افتراء پرداز ہیں آپ پر شاق اور گراں نہیں گزرے گا(2)۔

قتادہ نے کہا ہے۔ اس کا معنی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو آپ کے دل پر مہر لگا دیتا جس کے سبب قرآن اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے سب بھول جاتا۔ پس آپ انہیں خبر دے دیں کہ اگر میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا تو پھر اللہ تعالیٰ وہ کچھ کرتا جس کی اطلاع اس نے اس آیت میں دی ہے(3)۔

[3] وَ يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ الخ جملہ مستانفہ ہے جو افتراء پردازی اور بہتان بازی کی نفی کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اگر یہ جھوٹ اور بہتان ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے کہ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور وحی یا اپنے فیصلے کے ساتھ حق کو ثابت رکھتا ہے۔ یا یہ مفہوم ہے کہ اس نے ان کے باطل کو مٹانے کا وعدہ کر رکھا ہے اور آپ کے حق کو قرآن یا

اپنے اس فیصلے کے ساتھ ثابت رکھنے کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اور جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

کسائی نے کہا ہے کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی اصل عبارت اس طرح ہے واللہ یمحو الباطل۔ اور یہ کلام محل رفع میں ہے اس کا عطف یختم فعل مجزوم پر نہیں ہے کیونکہ محو (مٹانا) شرط کے ساتھ معلق نہیں بلکہ یہ مطلق وعدہ ہے۔ پھر لفظ کی اتباع کرتے ہوئے یمحو کے آخر سے کتابت میں واو کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ویدع الانسان اور سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ⑱ میں واو کو حذف کیا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرما دیا کہ ان کے باطل کو مٹا دیا اور اپنی آیات واحکام نازل فرما کر کلمہ اسلام کو بلند فرما دیا۔

؂ علامہ بغوی اور طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب آیت قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ نازل ہوئی تو بعض لوگوں کے دلوں میں عجیب سا خیال پیدا ہوا چنانچہ وہ کہنے لگے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے بعد اپنے ساتھ رشتہ قرابت رکھنے والوں کی اتباع و پیروی پر ہمیں برانگیختہ کریں۔ پس جبرئیل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور آپ کو اطلاع دی کہ یہ لوگ اس طرح آپ کو متہم کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ تک نازل فرمائی ہے۔ یہ سن کر ان لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم یہ شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں اور اس وقت درج ذیل آیت نازل ہوئی (1)۔

وَ هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَ يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۲۶﴾

''اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی ؂ اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے اور جانتا ہے جو تم کرتے ہو ؂ اور وہی قبول کرتا ہے دعائیں ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور (ان کے حق سے بھی) انہیں زیادہ (اجر) دیتا ہے اپنی مہربانی سے۔ اور کفار ان کے لیے سخت عذاب ہے ؂''

؂ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا عَنْ عِبَادِهٖ سے مراد اللہ تعالیٰ کے اولیاء اور اس کی طاعت وعبادت کرنے والے لوگ ہیں۔ کہا جاتا ہے قبلت منه الشیء۔ میں نے اس سے چیز لے لی اور میں نے اسے مبدا قبول بنایا۔ (یعنی قبل کا صلہ من ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے لے لینا اور قبول کر لینا۔) اور قبلت عنه کا معنی ہے میں نے اسے اس سے جدا کر دیا علیحدہ کر دیا (یعنی جب صلہ عن ہو تو اس کا معنی جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہوتا ہے۔)

بعض نے توبہ کا یہ معنی بیان کیا ہے ''اَلتَّوْبَةُ تَرْكُ الْمَعَاصِيْ نِيَّةً وَّ فِعْلًا وَّالْاِقْبَالُ عَلَى الطَّاعَةِ نِيَّةً وَّفِعْلًا'' یعنی توبہ سے مراد نیۃً اور عملاً گناہوں کو ترک کرنا ہے اور نیۃً اور عملاً عبادت وطاعت کی طرف متوجہ ہونا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا ہے ''اَلتَّوْبَةُ انْتِقَالٌ مِنَ الْاَحْوَالِ الْمَذْمُوْمَةِ اِلَى الْاَحْوَالِ الْمَحْمُوْدَةِ'' یعنی توبہ سے مراد

پر ہوتا ہے 1۔اپنے گناہوں پر ندامت کا اظہار کرنا 2۔ضائع ہو جانے والے فرائض کو دوبارہ ادا کرنا 3۔ظلم وستم اور (دوسروں کی حق تلفی) سے باز آنا 4۔نفس کو طاعت وعبادت میں اسی طرح پگھلانا جیسے اسے معصیت اور گناہ میں پگھلایا ہے۔
5۔نفس کو طاعت وعبادت کی تلخی اور کڑواہٹ چکھانا جیسے اسے معصیت گناہ کی حلاوت وشیرینی چکھائی 6۔جیسے پہلے ہنستا رہا اس کے بدلے اب اسی طرح رونا(1)۔

علامہ بغوی نے شرح السنۃ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ توبہ شرمندگی اور ندامت کا نام ہے۔اور گناہ سے توبہ کرنے والا اس کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں(2)۔

فصل:۔حضرت حارث بن سوید کا بیان ہے کہ میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے گیا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی توبہ سے اس آدمی کی نسبت کہیں زیادہ خوشی ہوتی ہے جو کسی ہلاک کر دینے والے صحرا میں ہو، اس کی اونٹنی اس کے ساتھ ہو جس پر اس کا کھانا اور پانی وغیرہ سب لدا ہوا ہو پس وہ (تھوڑا سا آرام کرنے کے لئے) ایک مقام پر اترے اور سو جائے۔جب نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا اونٹنی غائب ہے چنانچہ اس کی تلاش میں ادھر ادھر خوب گھوما اور چکر لگائے یہاں تک کہ اسے سخت پیاس لگ گئی اس نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اسی مقام کی طرف لوٹ جاؤں جہاں میری اونٹنی تھی اور وہیں مر جاؤں چنانچہ وہ اس مقام کی طرف واپس لوٹا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔پھر بیدار ہوا تو اچانک دیکھا اونٹنی اس کے پاس موجود ہے اور اس کا کھانا اور پانی سب اس پر موجود ہے(3)۔(تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنی خوشی اور مسرت اس آدمی کو اپنا ساز وسامان دیکھ کر ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ خوشی رب کریم کو اس وقت ہوتی ہے جب اس کا بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی غرض سے اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے۔)اسے علامہ بغوی نے روایت کیا ہے۔

امام مسلم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے جب کوئی بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کو اس آدمی کی نسبت زیادہ فرحت ومسرت ہوتی ہے جو کسی ویران بیاباں زمین میں ہو۔اس کی اونٹنی اس کے ساتھ ہو جس پر اس کا کھانا اور پانی لدا ہوا ہو پھر وہ اونٹنی گم ہو جائے اور وہ آدمی اسے تلاش کر کر کے مایوس وناامید ہو جائے اور ایک درخت کے سائے میں پہنچ کر لیٹ جائے پس جونہی وہ نیند سے بیدار ہو تو اچانک دیکھے اس کی اونٹنی اس کے پاس کھڑی ہے۔پھر وہ اس کی مہار پکڑے اور فرحت ومسرت سے مغلوب ہو کر یہ کہہ دے اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں یعنی اس نے فرط مسرت اور شدت فرحت کے سبب یہ قول کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا(4)۔

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جب (اپنے گناہ کا) اعتراف کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔متفق علیہ(5)۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سورج کے مغرب

کی جانب سے طلوع ہونے سے پہلے پہلے جس نے توبہ کر لی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالے گا(1)۔

ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گناہ سے توبہ کرنے والا اس آدمی کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کوئی گناہ نہیں کیا(2)۔

ع اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے اس کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے درگزر کر لیتا ہے اور معاف فرما دیتا ہے چاہے وہ (گناہ کرنے والا) توبہ کرے یا نہ کرے

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک آدمی تھا جس نے کبھی بھی کوئی اچھا اور نیک عمل نہیں کیا تھا اس نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی کہ جب وہ مر جائے تو اسے جلا دیں پھر اس کی نصف راکھ خشکی میں اڑا دیں اور نصف سمندر میں پھینک دیں قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے اس پر قابو پالیا تو وہ بالیقین اسے ایسا شدید عذاب دے گا جیسا پوری کائنات میں سے کسی کو نہیں دے گا۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو گھر والوں نے ویسے ہی کیا جیسے اس نے وصیت کی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم فرمایا تو جو خاک اس میں تھی وہ اس نے جمع کر دی اور پھر خشکی کو حکم دیا تو اس نے بھی وہ سب راکھ جمع کر دی جو اس میں تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے دریافت فرمایا تو نے ایسے کیوں کیا؟ تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو بہتر جانتا ہے میں نے یہ فقط تیرے خوف اور ڈر کی وجہ سے ایسے کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی، اسے بخش دیا(3)۔

امام احمدؒ نے حضرت ابو درداء سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ ۔(اور جو اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے تو اس کو دو باغ ملیں گے) تو حضرت ابو الدرداؓ کہتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ ۔ میں نے دوبارہ عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار پھر فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ ۔ میں نے بھی تیسری بار پھر عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابو الدردا! تیری ناک خاک آلود ہو (اگر چہ اس نے ایسا بھی کیا تب بھی رب تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرنے والے کے لئے دو جنتیں ہوں گی)(4)۔

اور وہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ حمزہ، کسائی اور حفص نے تفعلون تا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب مشرکین کو ہے۔ اور باقیوں نے اسے یاء کے ساتھ یفعلون پڑھا ہے۔ کیونکہ یہ غیب قوم کے بارے دو خبروں کے درمیان میں واقع ہے اس سے پہلے خبر عن عبادہ ہے اور اس کے بعد وَیَزِیۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ہے۔

ع ترکیب کلام میں وَیَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ کا عطف یقبل پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرماتا ہے جب وہ اس سے دعا مانگتے ہیں۔ الذین سے پہلے لام کو حذف کیا گیا ہے جیسا کہ وَ اِذَا کَالُوۡهُمۡ۔ میں لام حذف کیا گیا ہے۔ والذین اصل میں للذین تھا اور کالوھم اصل میں کالولھم تھا۔ حضرت عطاءؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ معنی

طاعت وعبادت پر ثواب عطافرماتا ہے۔ کیونکہ طاعت وعبادت بھی دعا اور طلب ہی ہوتی ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افضل ترین دعا الحمد للہ ہے(1)۔اسے ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کے بارے روایت ہے کہ آپ سے عرض کی گئی کیا وجہ ہے ہم دعائیں کرتے ہیں لیکن وہ قبول نہیں ہوتیں؟ تو آپ نے جواب دیا اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں (طاعت وعبادت کی طرف) دعوت دی اور تم نے اسے قبول نہیں کیا ہے۔

وَيَزِيْدُهُمْ کا معنی یہ ہے کہ وہ انہیں اس سے کہیں زیادہ عطافرماتا ہے جو وہ اس سے مانگتے ہیں یا جو ان کا استحقاق ہوتا ہے۔ اور مِّنْ فَضْلِهٖ کے ضمن میں ابوصالح نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بھائیوں کے بارے میں ان کی شفاعت کو قبول فرمائے گا۔ اور زیادہ دینے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے فضل اور مہربانی سے ان کے بھائیوں کے بھائیوں (دوستوں کے دوست) کے بارے میں بھی ان کی شفاعت قبول فرمائے گا(2)۔ اور جو اجر وثواب اور فضل ومہربانی مؤمنین کو عطا فرمائے گا اس کے مقابلہ میں کافروں کے لئے اتنا شدید اور سخت عذاب ہوگا۔ ترکیب کلام میں جملہ وَالْكٰفِرُوْنَ ارشاد باری تعالیٰ هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ پر معطوف ہے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٢٧﴾

''اور اگر کشادہ کر دیتا اللہ تعالیٰ رزق کو اپنے (تمام) بندوں کے لئے تو سرکشی کرنے لگتے زمین میں ۱؎ لیکن وہ اتارتا ہے ایک اندازے سے جتنا چاہتا ہے۔ بیشک وہ اپنے بندوں (کے احوال) سے خوب آگاہ ہے' سب کچھ دیکھنے والا ہے ۲؎''

۱؎ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت خباب بن ارتؓ نے کہا ہے کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے بنی قریظہ' بنی نضیر اور بنی قینقاع کے حالات کا مشاہدہ کیا (کہ وہ بڑے خوشحال ہیں ان کے پاس مال ودولت کی ریل پیل ہے) تو ہم بھی اس کی آرزو اور خواہش کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ الایہ(3)۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کے لئے رزق کشادہ کر دیتا تو وہ تکبر اور سرکشی کرنے لگتے اور زمین میں فساد برپا کر دیتے۔ لبغوا کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض پر غلبہ پانے اور ایک دوسرے سے اونچا ہونے کی کوشش کرتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے بغیھم کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ ان کا ایک درجے کے بعد دوسرے درجہ کی' ایک سواری کے بعد دوسری سواری کی اور ایک لباس کے بعد دوسرے لباس کی طلب اور خواہش کرنا۔ بغی کا اصل معنی یہ ہے کہ ہر وہ شئی جو کمیت (مقدار) اور کیفیت (حالت) کے اعتبار سے تقسیم کو قبول کرتی ہے اس کے حصول اور اس کی خواہش کرنے میں راہ اعتدال سے تجاوز کر جانا۔

۲؎ لیکن اللہ تعالیٰ ایک خاص اندازے سے جس کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے۔ ان کے رزق اتارتا ہے۔ ترکیب کلام میں مایشاء میں ما موصولہ ہے جو کہ ینزل کا مفعول ہے۔ اور بقدر اسم موصول سے حال ہے جو اس پر مقدم ہے۔ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ کا معنی

دیکھنے والا ہے۔

حاکم نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ آپؓ نے فرمایا یہ آیت اصحاب صفہ کے بارے نازل ہوئی۔ اس لئے کہ انہوں نے کہا تھا کاش ہمارے پاس بھی (مال) ہوتا۔ گو اس طرح انہوں نے غنی اور مالدار ہونے کی تمنا اور آرزو کی (1)۔ طبرانی نے حضرت عمرو بن حریث سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ علامہ بغوی نے اپنی سند سے حضرت انس بن مالکؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے واسطہ سے رب کریم کا یہ قول بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو کوئی میرے ولی کی اہانت اور تذلیل کرتا ہے وہ مجھے جنگ کے لئے دعوت مبارزت دیتا ہے اور میں اپنے اولیاء کے بارے میں ایسے ہی غضبناک ہوتا ہوں جیسے کاٹ کھانے والا شیر غضبناک ہوتا ہے۔ میرا مؤمن بندہ (کسی بھی عمل سے) اتنا میرے قریب نہیں ہوتا جتنا میرے لازم کردہ فرائض کو ادا کرنے سے ہوتا ہے میرا مؤمن بندہ نوافل ادا کرنے کے سبب مسلسل میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کے کان، آنکھ اور ہاتھ ہو جاتا ہوں اور میری تائید اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ اگر وہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں، مجھے کسی کام کے کرنے میں اتنا تردد نہیں ہوتا میں اسے کر گزرتا ہوں جتنا اپنے مؤمن بندے کی روح کے قبض میں تردد ہوتا ہے (کیونکہ) وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں بھی اسے دکھ اور تکلیف پہنچانا ناپسند کرتا ہوں۔ لیکن موت کے بغیر اس کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔ میرے مؤمن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جو مجھ سے عبادت کا دروازہ کھولنے کی التجا کرتے ہیں لیکن میں انہیں اس سے روک لیتا ہوں تاکہ فخر اور تکبر ان میں داخل ہو کر ان کے ایمان کو فاسد نہ کر دے۔ میرے بعض مؤمن بندے ایسے ہیں جن کے ایمان کی اصلاح اور سلامتی مال و دولت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر میں انہیں محتاج کر دوں، فقر و افلاس ان پر غالب کر دوں تو وہ ان کے ایمان کو فاسد اور خراب کر دے، بعض مؤمن بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے ایمان کی حفاظت فقر و افلاس کے بغیر نہیں ہو سکتی اگر میں انہیں غنی کر دوں (وافر مقدار میں مال و دولت سے نواز دوں) تو وہ ان کے ایمان کو ضائع کر دے۔ اور میرے مؤمن بندوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ بیماری کے بغیر ان کا ایمان سلامت اور محفوظ نہیں رہ سکتا اگر میں انہیں صحت عطا کر دوں تو یقیناً وہ ان کے ایمان کو خراب اور فاسد کر دے۔ بیشک میں اپنے بندوں کے معاملات کی تدبیر اپنے علم کے مطابق کرتا ہوں۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے میں اسے خوب جاننے والا اور خوب باخبر ہوں (2)۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَ یَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَ هُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۲۸﴾ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَ هُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾

"اور وہی ہے جو برساتا ہے مینہ اس کے بعد کہ لوگ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور پھیلا دیتا ہے اپنی رحمت کو اور وہی

قدرت رکھتا ہے ۲ ''

۱ ترکیب کلام میں وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ کا عطف وھو الذی یقبل التوبہ پر ہے۔اور درمیان میں جو جملہ شرطیہ ذکر کیا گیا ہے وہ جملہ معترضہ ہے۔نافع' ابن عامر اور عاصم نے ینزل کو باب تفعیل سے مشدد پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ ینزل پڑھا ہے۔غیث سے مراد ایسی نفع بخش بارش ہے جو قحط کے وقت لوگوں کی فریادرسی اور معاونت کرتی ہے۔قنطوا کا معنی ہے لوگ بارش کے نزول سے مایوس اور ناامید ہو گئے۔

رَحْمَتَهُ سے مراد یا تو بارش ہے یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خاص رزق ہے جو وہ نباتات اور حیوانات کی صورت میں ہموار میدانوں اور پہاڑوں میں پھیلا دیتا ہے۔

وَهُوَ الْوَلِيُّ یعنی وہی ہے جو اپنے احسانات کے سبب اپنے بندوں کی کارسازی کرتا ہے اور ان پر اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے۔الحمید کا معنی ہے وہی سب تعریفوں کے لائق ہے ایک تو اس لئے کہ وہ فی ذاتہ مستحق حمد وستائش ہے اور دوسرا اس لئے کہ احسان فرمانے والا ہے (اور اس کے احسانات کا تقاضا ہے کہ اس کی حمد وستائش کی جائے)

۲ اللہ تعالیٰ کے وجود' اس کی وحدانیت' قدرت باہرہ اور صفات کمال کے دلائل اور علامات میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق بھی ہے۔کیونکہ یہ تمام اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے ایسے صانع کے وجود پر دلالت کر رہے ہیں جو قادر بھی ہے اور حکیم بھی۔
وَمَا بَثَّ فِيهِمَا کا عطف یا تو سموت پر ہے یا خلق پر ہے۔مِنْ دَآبَّةٍ سے مراد ہر جاندار اور زندہ رہنے والا ہے۔(کیونکہ دابہ کا لغوی معنی ہے رینگنے والا اور رینگنا زندگی کی علامت ہے) لہٰذا یہاں اسم مسبب کا اطلاق سبب پر کیا گیا ہے۔پس اس صورت میں لفظ دابہ ملائکہ' جنات' شیاطین' انسان اور تمام حیوانات کو شامل ہوگا۔یا دابہ سے مراد وہ جانور ہیں جو زمین پر رینگ کر چلتے ہیں۔اس صورت میں فیہما کی ضمیر تثنیہ اگرچہ زمین وآسمان دونوں کی طرف راجع ہے لیکن مراد صرف زمین ہوگی۔اور وہ چیز جو ان دونوں میں سے کسی ایک میں ہو اس کے بارے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شئی من جملہ زمین وآسمان میں ہے۔

وَهُوَ عَلَى جَمْعِهِمْ اور اللہ تعالیٰ جب چاہے وہ انہیں جمع کرنے پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے۔پس وہ انہیں قیامت کے دن جمع فرمائے گا۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾

''اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے اور وہ (کریم) درگزر فرما دیتا ہے (تمہارے) بہت سے کرتوتوں سے ۱ اور تم عاجز نہیں کر سکتے (اللہ تعالیٰ کو) زمین میں' اور نہ تمہارا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ۲ اور اس کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے وہ سمندر میں تیرنے والے جہاز جو

معنی کو متضمن ہے۔ اسی وجہ سے اس کی خبر میں فاء لائی گئی ہے۔ جمہور کی قرأت اسی طرح ہے۔ نافع اور ابن عامر نے بغیر فاء کے بما کسبتہ پڑھا ہے۔ اسی طرح مدینہ طیبہ اور شام کے مصاحب میں بھی فاذکر نہیں کی گئی کیونکہ ما میں سببیت کا معنی ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت نہیں۔

وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيْرٍ کا عطف جملہ اسمیہ پر ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کسی لکڑی کی خراش، قدم کی پھسلاہٹ اور کسی رگ کی پھڑک بغیر کسی گناہ کے نہیں ہوتی اور جن سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمالیتا ہے وہ گناہ کہیں زیادہ ہیں(1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بندہ مؤمن کی بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے(2)۔ اسے حاکم نے مستدرک میں اور علامہ بیہقی نے روایت کیا ہے۔

علامہ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپؓ نے فرمایا کیا میں تمہیں کتاب اللہ میں سے افضل ترین آیت کے بارے نہ بتاؤں جس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا (پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی) وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۝ ۔ (پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اے علی! اب میں تیرے لئے اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں کہ جو بیماری، سزا یا دنیوی ابتلاء تم پر آتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب ہی پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انتہائی کریم ہے۔ اس کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ آخرت میں دوبارہ انہی بندوں کو سزا دے۔ اور جس گناہ سے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمالیا ہے (اور اسے معاف کر دیا ہے) تو اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے وہ معافی کے بعد پھر سزا نہیں دیگا(3)۔ اسے احمد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت مجرموں کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ مجرمین کے علاوہ دوسرے لوگوں کو جو مصیبت اور تکلیف آتی ہے اس کے اسباب اور ہوتے ہیں ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ ابتلاء اور مصیبت میں صبر کرنے کے سبب اسے اجر عظیم عطا کیا جائے(4)۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ عکرمہ کا قول ہے کہ جو بھی معمولی خراش یا اس سے زائد جو تکلیف بھی آتی ہے وہ کسی گناہ کے سبب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے بغیر اس کا گناہ معاف نہیں فرماتا یا پھر کسی درجہ اور رتبہ پر فائز کرنے کے لئے ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بغیر وہ رتبہ پر نہیں پہنچ سکتا(5)۔

۱؎ اور زمین میں تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے، یعنی جن مصائب و آلام کا تمہارے لئے فیصلہ کر دیا گیا ہے تم ان سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔ ترکیب کلام میں و ما انتم الخ اصابکم کے مفعول سے حال ہے یا پھر ما اصابکم کے جملہ پر معطوف ہے اور ارشاد باری تعالیٰ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا عطف و ما انتم الخ پر ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست نہیں جو تمہیں اس مصیبت سے محفوظ رکھے اور نہ کوئی مددگار ہے جو تم سے ان مصائب کو دور کرے۔

۲؎ الجوار کو ابن کثیر نے وصل اور وقف دونوں حالتوں میں یاء کے ساتھ الجواری پڑھا ہے۔ نافع اور ابو عمرو نے صرف حالت وصل میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کر دیا ہے۔ الجوار فی البحر کا معنی ہے وہ جہاز جو سمندر میں

... جلد 4 صفحہ 287 (الفکر)

تیرتے ہیں۔ کالاعلام وہ پہاڑوں کی مانند ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ الجوار کی صفت ہے۔ اسی طرح مابعد آنے والا جملہ شرطیہ بھی اس کی صفت ہے جیسا کہ وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ میں ہے۔

إِنْ يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَىٰ ظَهْرِهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿٣٣﴾ أَوْ يُوبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ ﴿٣٤﴾ وَيَعْلَمَ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِنَا مَا لَهُمْ مِنْ مَحِيصٍ ﴿٣٥﴾

”اور اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کردے پس وہ رکے رہیں سمندر کی پشت پر۔ بیشک اس میں اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں ہر کمال درجہ صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے لئے[1] یا (اگر وہ چاہے تو تباہ کردے انہیں لوگوں کے اعمال بد کی وجہ سے اور درگزر فرمادیا کرتا ہے بہت سے گناہوں سے[2] اور (اس وقت) جان لیں گے جو جھگڑا کرتے رہتے ہیں ہماری آیتوں میں کہ ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں[3]“

[1] اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس ہوا کو ساکن کردے جس کے سبب جہاز چلتے ہیں اور ہوا کے ساکن ہونے کے بعد وہ سمندر کی پشت پر ہی رکے رہیں ٹھہر جائیں اور چل نہ سکیں۔ بیشک اس میں ہر کمال درجہ صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، یعنی ہر مؤمن کے لئے نشانیاں ہیں کیونکہ یہ بندہ مومن کی صفت ہے کہ وہ تکلیف اور شدت کی حالت میں صبر کرتا ہے اور خوشحالی کی صورت میں شکر ادا کرتا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ الخ جملہ معترضہ ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایمان دو حصوں میں منقسم ہے نصف صبر میں ہے اور نصف شکر میں۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

[2] اَوْ يُوْبِقْهُنَّ کا عطف فیظللن پر ہے یعنی او ان یشایسکن الریح فیوبقھن بدوام السکون۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہواؤں کو ہمیشہ ساکن رکھ کر جہازوں میں سوار لوگوں کو ہلاک کردے اور جہازوں کو تباہ کردے۔ بعض نے کہا ہے اس کا عطف یسکن الریح پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اویر سلھا عا صفة فیو بقھن۔ یا سخت طوفان اور آندھیاں بھیج دے اور انہیں تباہ کردے۔

بِمَا كَسَبُوْا کا مطلب یہ ہے ان گناہوں کے سبب جو ان میں سوار لوگوں نے کمائے۔

وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ جملہ معترضہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کے گناہوں سے درگزر فرما کر انہیں نجات عطا فرما دیتا ہے یا یہ جملہ سابقہ کلام پر معطوف ہے اور تقدیر عبادت اس طرح بنتی ہے ان یشا یسکن الریح فیظللن رواکد او یرسلھا عاصفة فیوبقھن اوطیبة فیعف عن کثیر۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہوا کو ساکن کردے اور وہ وہیں رکے رہیں یا سخت طوفان بھیج دے اور انہیں تباہ کردے یا مناسب ہوا بھیج دے اور بہت سے لوگوں سے درگزر فرمائے۔ اصل مقصود پر ہی اقتصار کرتے ہوئے درمیان سے کلام کو حذف کردیا گیا ہے۔

[3] نافع اور ابن عامر نے استئناف [illegible]

چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے تا کہ جہاز والوں سے انتقام لے اور تا کہ جان لیں وہ لوگ جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہوئے اور انہیں باطل قرار دیتے ہوئے ان میں جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا عطف جزا پر ہے اور اس کو نصب دی گئی ہے ان مقدرہ کی وجہ سے کیونکہ یہ اشیائے ستہ (نفی نہی وغیرہ) کے جواب میں واقع ہے اس بنا پر کہ مصدر کا عطف مصدر پر ہے۔ یعنی ان یشا اللّٰہ تعالٰی اسکان الریح واھلاک قوم وانجاء قوم وعلم من یجادل فی ایا تنا۔ (اگر اللہ تعالٰی ہوا کو ساکن کرنا، قوم کو ہلاک کرنا، قوم کو نجات دینا اور آیات میں جھگڑا کرنے والوں کو اس طرح بتانا چاہے کہ ان کے لیے عذاب سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں) ترکیب کلام میں مالھم من محیص جملہ یعلم کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ حرف نفی کے سبب اس میں تعلیق موجود ہے، یعنی وہ لوگ جو قرآن کی تکذیب کرتے ہیں اور اللہ تعالٰی کی آیات سے سبق حاصل نہیں کرتے جب قیامت قائم ہونے کے بعد وہ اللہ تعالٰی کی بارگاہ میں پہنچیں گے تو جان لیں گے کہ عذاب سے بھاگ کر نکل جانے کی کوئی جگہ نہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ جس وقت سمندر میں ہوائیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیں تو وہ جان لیں کہ اب ان کے لئے تباہی سے بچ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں۔

فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

”پس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہت عمدہ اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں [1]۔ اور جو لوگ بچتے رہتے ہیں بڑے بڑے گناہوں اور بدکاریوں سے اور جب وہ غضبناک ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں [2]۔“

[1] پس جو کچھ تمہیں دنیا میں دیا گیا ہے یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے، یعنی تم اس سے اپنی فانی زندگی کی مدت حیات تک لطف اندوز ہو سکتے ہو اور منافع حاصل کر سکتے ہو لیکن یہ تمہاری آخرت کے لئے توشہ اور زاد راہ نہیں۔ لہٰذا تم اس کی طلب میں حسن پیدا کرو اور اتنی مقدار پر اکتفاء کرو جو تمہاری ضرورت ہو اور اس سے اجتناب کرو جو تمہیں آخرت سے غافل کر دے۔ اور وہ ثواب جو آخرت میں اللہ تعالٰی کے پاس ہے وہ مقدار اور کیفیت میں اس سے کہیں زیادہ بہتر اور مفید ہے اور وہ کسی مشقت کی آمیزش کے بغیر خالص منفعت اور فائدہ ہی فائدہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارے کا سارا مال اللہ تعالٰی کی راہ میں صدقہ کر دیا تو کچھ لوگوں نے آپ کے اس عمل پر آپ کو ملامت کی۔ تو اس وقت یہ آیات نازل ہوئی۔ آیت میں پہلا ما موصولہ ہے جو شرط کے معنی کو متضمن ہے اس طرح کہ جو کچھ انہیں دیا گیا اس کے دینے کا سبب دنیوی زندگی میں اس سے لطف اندوز ہونا اور فائدہ اٹھانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے جواب فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا پر فاء ذکر کی گئی ہے۔ بخلاف دوسرے ما کے (کہ وہ شرط کے معنی کو متضمن نہیں) کیونکہ ... میں ... کہ اگرچہ ... مومن اور کافر دونوں اس اعتبار سے مساوی اور برابر ہیں کہ دونوں کے پاس دنیوی سامان ہوتا

۲؎ وَالَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ کا عطف قول باری تعالیٰ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا پر ہے۔حمزہ اور کسائی نے سورۂ نجم اور یہاں پر کبیر الاثم صیغہ واحد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے کَبٰٓئِرَ جمع پڑھا ہے۔

فواحش سے مراد گناہ کبیرہ ہیں۔سدی نے کہا ہے اس سے مراد زنا ہے اور مقاتل نے کہا ہے فواحش سے مراد ایسے گناہ ہیں جو حد واجب کرتے ہیں(1)۔ہم نے سورۃ النساء میں کبیرہ گناہوں کا تذکرہ کیا ہے وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا هُمۡ یَغۡفِرُوۡنَ کا عطف یجتنبون پر ہے۔ اس میں ظرف اذا یغفرون کے متعلق ہے۔اور خبر ہونے کی وجہ سے یغفرون لھم ضمیر پر محمول کیا گیا ہے تا کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ بیشک وہی حالت غضب میں معاف کر دینے کے اہل ہیں۔ترکیب کلام میں یہ جملہ صلہ پر معطوف ہے اور موصول لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا پر عطف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے یا مدح کی بنا پر منصوب ہے یا پھر مرفوع ہے۔

وَالَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ ۪ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الۡبَغۡیُ هُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾

''اور جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔اور ان کے سارے کام باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں ۱؎ اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اس کا (مناسب) بدلہ لیتے ہیں ۲؎''

۱؎ اور جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، یعنی طاعت وعبادت میں سے جس جانب اللہ تعالیٰ نے انہیں دعوت دی انہوں نے اسے قبول کیا اور سر تسلیم خم کر دیا۔شوریٰ مصدر ہے جیسا کہ فتیا ہے اس کا معنی ہے باہم مشورہ کرنا، یعنی وہ آپس میں مشورہ کرتے ہیں ان تمام معاملات میں جو انہیں پیش آتے ہیں اور ان کا فیصلہ کرنے میں وہ قطعاً جلدی نہیں کرتے۔اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بندہ مؤمن اپنے مؤمن بھائی سے مشورہ کرتا ہے تو وہ اسے ایسا ہی مشورہ دیتا ہے جو دارین میں اس کے لیے خیر وبرکت کا سبب ہوتا ہے وہ اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس سے مشورہ طلب کیا جائے تو وہ مشورہ دینے میں امین ہوتا ہے(2)۔اسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، ترمذی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

طبرانی نے الاوسط میں حسن سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے میں امین ہوتا ہے لہٰذا جب کسی سے مشورہ لیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ ایسا مشورہ دے جسے وہ اپنی ذات کے لئے کرنا بھی پسند کرے۔

طبرانی نے الکبیر میں حسن سند کے ساتھ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے میں امین ہے اگر چاہے تو اشارہ کرے اور اگر چاہے تو اشارہ نہ کرے(3)۔وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس سے وہ خیر اور نیکی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ترکیب کلام میں یہ جملہ یا معطوف ہے یا حال ہے۔

۲؎ اَلۡبَغۡیُ کا معنی ظلم، زیادتی اور عداوت ہے۔اور هُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ کا معنی ہے۔وہ ظلم کرنے والوں سے انتقام اور بدلہ لیتے ہیں مگر بدلہ لینے

اوپر ظلم کرنے والوں سے درگزر کر لیتے ہیں اور ان سے انتقام لیے بغیر انہیں معاف کر دیتے ہیں۔ اور دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو ظلم کرنے والوں سے انتقام اور بدلہ لیتے ہیں انہی لوگوں کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

ابراہیم نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ذلیل ورسوا ہونا ناپسند کرتے ہیں اور جب قدرت اور قابو پالیتے ہیں تو پھر معاف کر دیتے ہیں۔

عطاء نے کہا ہے ان سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جنہیں ظلماً بغیر حق کے مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا۔ ان کا جرم فقط یہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سرزمین پر غلبہ اور اقتدار عطا فرمایا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کرنے والوں سے مناسب انتقام اور بدلہ لے لیا(1)۔

علامہ بیضاوی نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان لوگوں کے تمام بنیادی اور اہم ترین فضائل واوصاف کا تذکرہ فرمایا ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ذلت ورسوائی کو ناپسند کرتے ہیں اور یہ وصف ان کے وصف غفران کے خلاف نہیں۔ (یعنی ان کے درمیان اس طرح کوئی تضاد نہیں کہ ان کا وصف عفو ودرگزر بھی اور پھر ان کا وصف انتقام اور بدلہ لینا بھی ہے۔ تو بظاہر ان میں تضاد دکھائی دیتا ہے حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں۔) کیونکہ وصف غفران اس پر مطلع کر رہا ہے کہ جس کو معاف کیا جا رہا ہے وہ مکمل طور پر عاجز آچکا ہے۔ اور لفظ انتصار (انتقام لینا) اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا دشمن عاجز نہیں آتا بلکہ مقابلہ کرتا ہے۔ اور عاجز سے حلم وبردباری سے پیش آنا پسندیدہ اور قابل ستائش ہے۔ اور مقابلہ کرنے والے سے درگزر کرنا مذموم اور ناپسندیدہ عمل ہے کیونکہ اس طرح اسے ظلم وزیادتی پر مزید جرات اور انگیخت ملتی ہے(2)۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ظالم اللہ تعالیٰ اور عامۃ المؤمنین کے حق میں زیادتی اور حدود سے تجاوز کرنے والا ہو تو ایسی صورت میں اس سے انتقام لینا صرف بہتر ہی نہیں بلکہ واجب ہے، تاکہ فتنے کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ اور اگر وہ کسی فرد واحد کے حق میں زیادتی کرنے والا ہو تو پھر بھی اس پر زیادتی کئے بغیر اس سے انتقام اور بدلہ لینا جائز ہے لیکن عفو ودرگزر کرنا، اصلاح کرنا اور برائی کا ازالہ اچھائی اور نیکی سے کرنا افضل ہے(ا)۔ واللہ اعلم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (التجاریہ)   2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 644 (فراس)

(ا) ابن عون نے ذکر کیا کہ میں قول باری تعالیٰ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ۞ کے بارے یہ پوچھتا رہتا تھا کہ اس میں انتصار سے مراد کیا ہے۔ چنانچہ علی بن زید بن ضرعان نے مجھے اپنی سوتیلی ماں ام محمد سے ایک یہ روایت بیان کی ہے کہ ابن عون نے کہا ہے۔ (کہ ان کا گمان ہے کہ ام محمد ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ایک حضرت زینب بنت جحش میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں کہ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اپنے دست مبارک کے ساتھ کچھ کرنے لگے۔ تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے آپ کو زینب کے موجود ہونے کی اطلاع دی تو آپ نے ہاتھوں کو روک لیا۔ زینب حضرت عائشہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور کچھ سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے روکا مگر وہ باز نہ آئیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ سے فرمایا تم بھی اسے سخت سست الفاظ کہو چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا تو حضرت زینب اٹھ کر حضرت علی کے پاس چلی گئیں۔ اور وہاں جا کر بتایا کہ عائشہ نے تمہیں ایسے ایسے

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۰﴾

"اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے 1۔ پس جو معاف کردے اور اصلاح کردے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے، بیشک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا 2۔"

1۔ جب اللہ تعالیٰ نے انتقام اور بدلہ لینے کے جائز ہونے کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی ظلم و تعدی اور زیادتی کرنے سے روک دیا اور فرمایا برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ آیت میں جزاء، بدلہ اور انتقام کو سیئہ (برائی) کا نام دیا گیا ہے۔ اسی لئے کہ جزا اور برائی صورت کے اعتبار سے دونوں باہم مشابہ ہوتی ہیں۔ یا اس وجہ سے کہ جس ظالم سے یہ انتقام لیا جاتا ہے وہ اسے برائی خیال کرتا ہے یا پھر یہ وجہ ہے کہ عفو کے مقابلہ میں انتقام ہوتا ہے۔

مقاتل نے کہا ہے کہ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سے مراد زخموں اور قتل کا قصاص لینا ہے۔ مجاہد اور سدی نے کہا ہے اس سے مراد برے الفاظ کا جواب دینا ہے، مثلاً جب کوئی یہ کہے اخزاک اللہ (اللہ تجھے رسوا اور ذلیل کرے) تو جواب میں دوسرا بھی یہی الفاظ کہہ دے۔ اور جب ایک آدمی گالی گلوچ دے تو دوسرا بھی بغیر کسی اضافہ اور زیادتی کے اسی کی مثل الفاظ اسے کہہ دے(1)۔

حضرت سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت سفیان ثوری رضی تعالیٰ عنہما سے قول باری تعالیٰ۔ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا کے بارے پوچھا کیا اس کا یہ مفہوم ہے کہ اگر ایک آدمی تجھے گالی گلوچ دے تو تم بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کرو۔ یا ایک آدمی جیسا فعل تمہارے ساتھ کرے تم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی فعل کرو؟ تو میں نے ان کے پاس سے اس کا کوئی جواب نہ پایا۔ پھر میں نے ہشام بن حجیرہ سے اسی آیت کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا جب کوئی زخم لگانے والا زخمی کردے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ اگر وہ تجھے گالیاں دے تو تو بھی اسی کی مثل گالیاں دینا شروع کردے(ا)۔

ہشام کے قول کی تائید حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسے دو آدمی جو آپس میں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں وہ شیطان ہیں دونوں ایک دوسرے کے خلاف بہتان تراشی کرتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف جھوٹ بولتے ہیں(2)۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری نے باب الادب میں صحیح سند کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (التجاریہ)

(ا) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما تھے حضور یہ سن کر تعجب کناں ہوئے اور تبسم فرمانے لگے جب اس آدمی نے زیادہ گالیاں دیں تو آپ نے بھی کچھ الفاظ کا اسے جواب دیا۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہو کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق بھی آپ سے جا ملے۔ عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ مجھے گالیاں دیتا رہا تو آپ تشریف فرما رہے اور جب میں نے بعض الفاظ کا اسے جواب دیا تو آپ ناراض ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے (اس کی وجہ کیا ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو تیری طرف سے جواب دے رہا تھا جب تو نے خود جواب لوٹایا تو وہاں شیطان آ گیا اور میں شیطان کے پاس نہیں بیٹھ سکتا۔ پھر فرمایا اے ابوبکر! تین باتیں ہیں اور تینوں حق ہیں 1- جب کسی آدمی پر کوئی ظلم کرے اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کے لئے معاف کردے تو اللہ

ساتھ عیاض بن حمار سے اسے نقل کیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا قیامت کے دن بکثرت لعن طعن کرنے والوں کی نہ شہادت قبول ہوگی نہ شفاعت (یعنی نہ وہ شاہد ہونگے اور نہ ان کی شفاعت قابل قبول ہوگی) اسے مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باہم گالی گلوچ دینے والوں کے بارے جو کچھ فرمایا ہے تو اس کا اطلاق ابتدا کرنے والے پر ہوتا ہے یہاں تک کہ مظلوم جواب دینے میں اس سے آگے بڑھ جائے(1)۔ (تو پھر دونوں اس زمرہ میں آجائیں گے) اسے امام احمد، مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ابتداء کرنے والا زیادہ ظالم ہے اور جواب دینے والے کے لئے (اسی کی مثل جواب دینے کی) رخصت ہے۔

۲۔ پس جو کوئی اپنے ساتھی کا ظلم معاف کر دے اور اپنے اور ظالم کے درمیان صلح کر لے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے۔ بیشک بالیقین اللہ تعالیٰ اسے اجر عطا فرمائے گا۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک پکارنے والا ندا دے گا کون ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے وہ کھڑا ہو جائے؟ تو صرف وہی کھڑا ہوگا جس نے اپنے ساتھ جرم اور زیادتی کرنے والے کو معاف کیا ہوگا(2) پھر انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

بیشک وہ ظلم کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا، یعنی گالی گلوچ میں ابتدا کرنے والوں اور انتقام و بدلہ لیتے وقت حد مساوات سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو ظلم و زیادتی کرنے کی ابتداء کرتے ہیں(3)۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾

''اور جو بدلہ لیتے ہیں اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد پس یہ لوگ ہیں جن پر کوئی ملامت نہیں ۱۔ بیشک ملامت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور فساد برپا کرتے ہیں زمین میں ناحق یہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے ۲۔ اور جو شخص (ان مظالم پر) صبر کرے اور (طاقت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے ۳''

۱۔ بَعْدَ ظُلْمِهٖ میں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے، یعنی جو بدلہ لیتے ہیں ظالم سے ان پر ظلم کرنے کے بعد۔ تو یہ انتقام لینے والے وہ لوگ ہیں جن کے لئے کوئی عتاب نہیں اور نہ ہی ان پر کوئی مؤاخذہ ہے۔

۲۔ بیشک آخرت میں سزا اور دنیا میں عتاب اور مؤاخذہ ان لوگوں پر ہوگا جو لوگوں کو ضرر اور نقصان پہنچانے کی ابتداء کرتے ہیں۔ اور ناحق ان کو جان و مال اور عزت و آبرو کے اعتبار سے انہیں اذیت پہنچاتے ہیں۔ اور زمین میں ناحق فساد برپا کرتے ہیں۔ قاموس میں

پر صبر کرے اور ظلم کو معاف کر دے اور اس سے انتقام نہ لے، ترکیب کلام میں یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو کہ فھو افضل الناس ہے۔ (یعنی وہ لوگوں میں سے افضل ہے) تو کلام سے خبر کو حذف کر کے اس کے مقام پر اس کی علت کو رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ قول ہے اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ کہ بیشک یہ صبر اور معاف کرنا یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ یہاں عزم بمعنی معزوم ہے اور اس کا معنی مطلوب شرعی۔ یعنی صبر کرنا اور معاف کرنا ان امور میں سے ہیں جو شرعاً مطلوب ومقصود ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے یہ ان امور میں سے ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا ہے زجاج نے کہا ہے کہ صابر کو اس کے صبر کے سبب ثواب عطا کیا جاتا ہے اور ثواب میں رغبت رکھنا ہی کامل طلب ہے(1)۔

وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤٤﴾ وَ تَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿٤٥﴾ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿٤٦﴾

''اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کا کوئی کارساز نہیں اس کے بعد۔ اور آپ ملاحظہ کریں گے ظالموں کو جب وہ دیکھیں گے عذاب (تو ٹپٹا جائیں گے) پوچھیں گے کیا واپس لوٹنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟ [1] اور آپ انہیں دیکھیں گے کہ پیش کیے جا رہے ہونگے دوزخ پر اس حال میں کہ عاجز و درماندہ ہونگے ذلت کے باعث دیکھتے ہونگے انکھیوں سے چوری چوری۔ اور کہیں گے اہل ایمان کہ حقیقی گھاٹے میں وہی لوگ ہیں جنہوں نے گھاٹے میں ڈالا اپنے آپ کو اپنے گھر والوں کو قیامت کے روز۔ سن لو ظالم لوگ ضرور ابدی عذاب میں ہونگے [2] اور نہیں ہونگے (اس روز) ان کے لیے مددگار جو مدد کر سکیں ان کی اللہ کے بغیر۔ اور جس کو گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو اس کے لیے (بچنے کی) کوئی راہ نہیں [3] ''

[1] جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اسے رسوا اور ذلیل کرنے کے بعد اس کے لئے کوئی مددگار نہیں جو اسے راہ ہدایت پر گامزن کر سکے اور عذاب الٰہی سے اسے بچا سکے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

اے مخاطب! آپ ظالموں کو ملاحظہ کریں گے کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے (تو ٹپٹا جائیں گے) چونکہ انکا قیامت کے دن عذاب کو دیکھنا ایک ثابت شدہ اور یقینی امر ہے اسی لئے آیت میں مضارع کی بجائے ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ ترکیب کلام میں يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ کا جملہ تری فعل کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ یعنی آپ انہیں یہ قول کہتے ہوئے دیکھیں گے۔ ھل لفظا استفہامیہ ہے لیکن یہاں سوال، درخواست اور التجا کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی التجا اور درخواست کریں گے۔

۲ے اور آپ انہیں دیکھیں گے کہ وہ جہنم کی اس آگ پر پیش کیے جارہے ہونگے، جس پر لفظ عذاب دلالت کر رہا ہے اس حال میں کہ وہ انتہائی خوفزدہ، عاجز اور درماندہ ہونگے اور ہر جانب سے ان پر ذلت ورسوائی چھارہی ہوگی۔

ترکیب کلام میں ینظرون، یعرضون کے فاعل سے ایک حال کے بعد دوسرا حال ہے۔

يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ کا معنی ہے وہ چوری چوری کنکھیوں سے دیکھتے ہونگے یعنی وہ اپنی پلکوں کو آہستہ آہستہ حرکت دیکر وہ آگ کی طرف دیکھنا شروع کردیں گے۔ جیسا وہ آدمی جو رسیوں میں جکڑا ہوا ہو وہ اپنی ذات کے بارے خوفزدہ ہو کر بڑی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ جلاد کی تلوار کی جانب چوری چوری دیکھا کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ میں من ابتدائیہ یا سببیہ کے معنی میں ہے۔

اَهْلِيْهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر میں ان کی اتباع اور پیروی کی۔ وہ بھی کفار کے ساتھ دائمی عذاب کے لئے پیش کیے جائیں گے (اس طرح وہ بھی خسارے اور گھاٹے میں پڑ جائیں گے) بعض نے کہا ہے کہ اهليهم سے مراد حوریں ہیں۔ جو کہ جنت میں ان کے لیے تیار کی گئی تھیں اگر وہ ایمان لے آتے۔ لیکن ایمان نہ لانے کے سبب وہ ان تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوئے اسی لئے وہ خسارے میں رہے۔

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، خسرو ا کی ظرف یعنی قیامت کے دن وہ خسارے میں رہیں گے۔ اور اہل ایمان نے یہ قول دنیا میں ان کے لیے کہا۔ یا یہ قول کی ظرف ہے، یعنی قیامت کے دن جب اہل ایمان انہیں اس حالت پر دیکھیں گے تو وہ انہیں ایسا کہیں گے۔ سن لو ظالم لوگ ضرور ابدی اور دائمی عذاب میں ہونگے۔ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ کے الفاظ پر یا تو اہل ایمان کے قول کی تکمیل ہو رہی ہے یا پھر ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے قول کی تصدیق کی جارہی ہے۔

۳ے اس روز اللہ تعالیٰ کے بغیر ان کے لیے کوئی ایسے مددگار نہیں ہونگے جو ان سے عذاب کو دور کرسکیں۔ ترکیب کلام میں مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے الفاظ اولیاء سے حال ہیں۔

اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردے تو اس کے لئے دنیا میں حق تک پہنچنے کے لئے اور آخرت میں جنت تک پہنچنے کے لئے کوئی راہ باقی نہیں رہتی اور اس پر بھلائی اور نیکی کے تمام راستے بند ہوجاتے ہیں۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿٤٧﴾ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿٤٨﴾

"(لوگو!) مان لو اپنے رب کا حکم اس سے پیشتر کہ آجائے وہ دن جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹلنے والا نہیں، نہ ہوگی تمہارے لیے کوئی پناہ گاہ اس روز اور نہ تمہاری طرف سے کوئی روک ٹوک کرنے والا ہوگا۔ پس اگر وہ (پھر بھی) روگردانی کریں

باعث (تو شور مچانے لگتا ہے) بیشک انسان بڑا ناشکر گزار ہے ۳؎ ''

۱؎ اِسْتَجِيبُوا لِرَبِّكُمْ کا معنی ہے (لوگو!) تم اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے اس کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرلو۔ وہ دن آنے سے پہلے جس کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اسے واپس نہیں لوٹائے گا۔ اس صورت میں مِنَ اللّٰهِ کا تعلق مرد سے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنَ اللّٰهِ اَنْ يَّاْتِيَ کے متعلق ہے، یعنی اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ دن آ جائے جسے لوٹانا ممکن نہیں ہوگا۔ اس دن سے مراد موت کا دن ہے یا قیامت کا دن ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں ہوگی جہاں تم پناہ لے سکو۔ ملجا کا معنی ہے بھاگنے کی جگہ، پناہ گاہ۔ اور جو کچھ تم نے اعمال کئے ہیں اس دن تم ان کا انکار نہیں کر سکو گے کیونکہ وہ سب تمہارے اعمال ناموں میں لکھے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف تمہاری زبانیں اور دیگر اعضائے بدن شہادت دیں گے یا نکیر بمعنی منکر برائیاں ہے۔ یعنی اس دن جتنی برائیاں اور بداعمالیاں تمہارے ساتھ ہوں گی ان کے سوا تمہارے لیے کوئی برائی نہیں ہوگی۔

۲؎ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر وہ پھر بھی آپ کی اطاعت و فرمانبرداری سے روگردانی کریں تو آپ قطعاً غمزدہ اور پریشان حال نہ ہوں کیونکہ ہم نے آپ کو ان پر نگہبان اور ان کے اعمال کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا کہ ان کی روگردانی اور اعراض کی صورت میں مؤاخذہ آپ سے کیا جائیگا۔ کلام میں شرط کی جزا کو حذف کر دیا گیا ہے اور علت کو اس کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَلَا تَحْزَنْ لِاَنَّ مَا اَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ رَقِيْبًا مُؤَاخِذًا عَلٰى اِعْرَاضِهِمْ۔

آپ کا فرض تو صرف احکام پہنچا دینا ہے اور آپ وہ فرض ادا کر چکے ہیں۔ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ قول باری تعالیٰ ما ارسلناک علیهم حفیظا. کی علت بیان کر رہا ہے۔

۳؎ اور جب ہم اپنی رحمت کا مزا انسان کو چکھا دیتے ہیں تو اس سے وہ خوش ہو جاتا ہے۔ اس میں انسان سے مراد جنس انسان ہے۔ اور رحمة سے مراد مال و دولت اور صحت ہے(1)۔ سیئة سے مراد قحط، فقر و افلاس یا مرض ہے۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ یعنی ان گناہوں کے سبب جو انہوں نے اس سے قبل کیے اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچے (تو وہ شور مچانے لگتا ہے۔) چونکہ اکثر افعال ہاتھوں کے ساتھ ہی کیے جاتے ہیں اسی لئے انہیں ایدیهم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بیشک انسان انتہائی زیادہ ناشکر گزار ہے۔ یعنی جب بھی اس پر معمولی سی تکلیف اور ہلکی سی مصیبت آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہونے والی سابقہ تمام نعمتوں اور رحمتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ بار بار تکلیف اور دکھ کا ذکر کرتا ہے اور انہیں خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے لیکن اس کے اسباب میں غور و فکر نہیں کرتا۔

اگرچہ یہ حکم مجرموں کے ساتھ مختص ہے تب بھی اس کی نسبت جنس انسان کی طرف کرنا صحیح ہے کیونکہ تمام کے تمام مجرم بھی جنس انسان میں شامل ہیں۔ پہلے جملہ شرطیہ میں اذا ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے میں حرف شرط اِنْ ذکر کیا گیا ہے، وجہ فرق یہ ہے کہ نعمتوں کا مزہ چکھانا اور رحمتوں سے بہرہ ور کرنا ایک ثابت شدہ امر ہے اور اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے اور اس کی رحمت ذاتیہ اس کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے اس کے ذکر کے ساتھ بطور حرف شرط اذا ذکر کیا گیا ہے (کیونکہ یہ ثابت شدہ اور محقق امر پر دلالت کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے) جبکہ اس کے برعکس آزمائش میں مبتلا کرنا نہ تو اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے اور نہ ہی اس کی رحمت اس کا تقاضا کرتی ہے، بلکہ یہ کسی جرم اور گناہ کے سبب آتی ہیں اس لیے اس کے ذکر کے ساتھ اِنْ حرف شرط ذکر کیا گیا ہے (جو مطلق شک کے معنی دیتا

ہے۔) کلام میں جزا کی علت کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور دوسرے جملہ میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تا کہ اس پر دلالت کرے کہ اس جنس کو کفران نعمت کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ یَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ﴿۵۰﴾ وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ﴿۵۱﴾

''اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے بچیاں اور عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے فرزند یا ملا جلا کر دیتا ہے انہیں بیٹے اور بیٹیاں اور بنا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بانجھ۔ بیشک وہ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قادر ہے [1] اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راست) مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ بھیجے کوئی پیغامبر (فرشتہ) اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ بلاشبہ وہ اونچی شان والا بہت دانا ہے [2]''

[1] آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اس لیے وہ جیسے چاہے اس میں تصرف کر سکتا ہے چاہے نعمتوں سے نوازے یا اعمال بد پر انتقام اور بدلہ لے۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا جملہ قول باری تعالیٰ ومن ایتہ الجوار سے متصل ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے یہ جملہ سابقہ کلام کی علت ہے۔ اور قول باری تعالیٰ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا الآیۃ بعض کے قول کے مطابق خلق کا بیان اور تفصیل ہے، یعنی وہ بعض لوگوں کو صرف بچیاں عطا فرماتا ہے ان کے ہاں بچہ موجود نہیں ہوتا۔ چونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے پہلے بچیوں کا ذکر کیا ہے اسی لئے بعض نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی عورت کے ہاں سب سے پہلے بچی کا پیدا ہونا اس کے لئے باعث رحمت و برکت ہوتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ جنہیں چاہتا ہے صرف بچے عطا فرماتا ہے اور ان کے پاس بچیاں نہیں ہوتیں۔ اور بعض کے لئے دونوں کو جمع کر دیتا ہے۔ اور ان کے پاس بچے اور بچیاں دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے اور اس کے پاس کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ بیشک اللہ تعالیٰ جسے پیدا کرتا ہے اسے خوب جانتا ہے اور جو چاہتا ہے اس کی قدرت رکھتا ہے اور وہ اپنا کام اپنی کمال حکمت و دانائی اور اختیار کے ساتھ کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جملہ وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ الخ یخلق سے بدل بعض ہے۔

[2] علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر آپ نبی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتے اور اسے دیکھتے کیوں نہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور اس کا دیدار کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا(1)'' تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آیت وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ نازل فرمائی۔ کہ کسی بشر کے لئے یہ صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے براہ راست کلام کرے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 107 (التجاریہ)

و حیا اور اس کے معطوفات مصدر ہونے (مفعول مطلق ہونے) کی بنا پر منصوب ہیں کیونکہ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ کلام محذوف کی صفت ہے۔ اور ارسال بھی کلام کی ایک نوع ہے، یعنی وہ کلام جو کہ رسول کے واسطہ سے ہو۔ اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ یہ حال ہونے کی وجہ منصوب ہو اور مصدر بمعنی مفعول استعمال ہو رہا ہو۔ اور تقدیر عبارت اس طرح ہو الا موحی او مستمعامن وراء حجاب او مرسلا۔ (مگر وہ کلام وحی کیا جائے یا پردے کے پیچھے سنا جائے یا رسول کے واسطہ سے بھیجا جائے۔)

لغت میں وحی سے مراد انتہائی تیز اشارہ ہے''الاشارة السريعة والمراد ههنا كلاما خفيا غير مركب من حروف مقطعة متعاقبة يلقيه تعالىٰ في قلب النبي صلى الله عليه وسلم في المنام او اليقظة۔

یعنی یہاں وحی سے مراد ایسا مخفی کلام ہے جو یکے بعد دیگرے آنے والے حروف مقطعات سے مرکب نہ ہو (یعنی بسیط ہو) اللہ تعالیٰ یہ کلام حالت نیند یا حالت بیداری میں اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر القا کر دیتا ہے اس کو الہام بھی کہا جاتا ہے اور یہ بالمشافہ کلام کو بھی شامل ہے جیسا کہ حدیث معراج میں ذکر ہے اور اس حدیث میں جس کے آخر میں رویت باری تعالیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور غیبی آواز سنائی دینے کو بھی شامل ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی طوی اور طور پر اتفاق ہوا، (اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں 1۔ بلاواسطہ کلام کرنا 2۔ غیبی آواز سنائی دینا) لیکن قول باری تعالیٰ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مذکورہ دونوں قسمیں وحی کی قسم اول کے ساتھ خاص ہیں اور وحی کی دوسری قسم من وراء حجاب ہے۔ یہ آیت رویت باری تعالیٰ کے جائز ہونے پر تو دلیل ہے لیکن اس سے رویت کی نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ بغوی نے اس آیت کا جو شان نزول ذکر کیا ہے وہ تو دنیا میں وحی کے وقت اللہ تعالیٰ کے دیدار کی نفی پر دلالت کرتا ہے لہٰذا یہاں وحی کا معنی کلام بسیط کا دل میں القا کرنا ہوگا۔'' القا كلام بسيط في القلب''اور قول باری تعالیٰ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ سے مراد وہ کلام جو فرشتے کے واسطہ کے بغیر سنا جائے اور اللہ تعالیٰ کو دیکھا نہ جائے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی طوی اور کوہ طور پر اتفاق ہوا تھا اسی طرح علامہ بغوی نے کہا ہے یا وہ کوئی پیغامبر، یعنی فرشتہ بھیجے چاہے وہ فرشتہ جبرئیل امین ہو یا کوئی اور فرشتہ ہو۔ اور وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کرے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔

جمہور نے وحیاً پر عطف کرتے ہوئے یوسل اور یوحی کو منصوب پڑھا ہے اور ان سے پہلے ان مصدر یہ مقدر ہے۔ اور نافع نے بطریق استیناف انہیں مرفوع پڑھا ہے، یعنی جبریل کی لام کو ضمہ کے ساتھ اور فیوحی کی یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قرأت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا دو قسموں میں محصور ہو جاتا ہے۔ 1۔ وہ فرشتے کے واسطہ کے بغیر کلام فرماتا ہے۔ 2۔ وہ فرشتہ کے واسطہ سے انبیاء علیہم السلام سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس وحی کیسے آتی ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کبھی تو ایسے وحی آتی ہے جیسے گھنٹی بجنے کی آواز ہوتی ہے اور یہ وحی مجھ پر انتہائی شدید اور ثقیل ہوتی ہے۔ جب وہ سلسلہ مجھ سے منقطع ہوتا ہے تو اس میں جو کلام ہوتا ہے وہ مجھے یاد ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے پاس آتا

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا انتہائی سخت ٹھنڈے دن میں وحی کا نزول ہو رہا ہے تو جب یہ سلسلہ منقطع ہوا تو آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(1)۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا ہے تو آپ مضطرب ہو جاتے اور آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہو جاتا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (اعلان نبوت کے بعد) پندرہ برس تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ سات برس تک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آواز سنتے تھے اور روشنی بھی دیکھتے تھے لیکن کوئی شئی نظر نہیں آتی تھی اور آٹھ سات تک آپ کی طرف وحی آتی رہی۔ اور دس سال تک آپ مدینہ طیبہ میں مقیم رہے اور وہیں آپ کا وصال ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک پینسٹھ (65) برس تھی۔ متفق علیہ (3)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں سب سے اول جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آغاز ہوا وہ حالت نیند میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے خواب تھے۔ الحدیث متفق علیہ (4)۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی صفات سے اونچی شان والا ہے اور بہت دانا ہے وہ وہی کچھ کرتا ہے جس کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے پس کبھی بغیر واسطہ کے کلام فرماتا ہے اور کبھی واسطہ کے ساتھ۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝

"اور اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی بھیجا آپ کی طرف ایک جانفزا کلام اپنے حکم سے۔ نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن (اے حبیب!) ہم نے بنا دیا اس کتاب کو (سراپا) نور، ہم ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعہ جس کو چاہتے ہیں اپنے بندوں سے۔ اور بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف [1] جو اللہ تعالیٰ کی راہ ہے وہ اللہ جو مالک ہے ہر اس چیز کا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ خوب سن لو! سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے [2]"

[1] وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا سے مراد یہ ہے کہ تمام رسولوں کی طرف وحی بھیجنے کی طرح آپ کی طرف بھی بذریعہ وحی ایک جانفزا کلام بھیجا۔ یا جس طرح ہم نے آپ سے بیان کیا اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی آپ کی طرف کلام بھیج دیا۔

روحاً سے مراد کتاب، یعنی قرآن مجید ہے اسی طرح کلبی اور مالک بن دینار نے کہا ہے(5)۔ سدی نے کہا ہے کہ جس طرح ابدان،

ارواح کے سبب زندہ رہتے ہیں اسی طرح دلوں کی زندگی قرآن سے وابستہ ہوتی ہے۔اسی وجہ سے قرآن مجید کو روح کہا گیا ہے۔ربیع نے کہا ہے کہ روح سے مراد حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہیں(1) اور معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کی طرف جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا روح سے مراد نبوت ہے۔اور حسن نے کہا ہے روح سے مراد رحمت ہے(2) پس اس سے مراد بھی قرآن کریم ہی ہے کیونکہ قرآن نبوت اور رحمت کا اثر (نشان) ہے۔

مِّنْ اَمْرِنَا کا مفہوم یہ ہے ہم جو وحی آپ کی طرف بھیجتے ہیں۔اپنے حکم سے بھیجتے ہیں من امرنا روح کے لئے ظرف مستقر ہے،یعنی روح ہمارے امر سے ہے۔مَا كُنْتَ تَدْرِيْ ترکیب کلام میں الیک کی کاف ضمیر سے حال ہے،یعنی درآنحالیکہ وحی سے پہلے آپ نہیں جانتے تھے۔مَا الْكِتٰبُ تدری کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور حرف استفہام نے اسے عمل سے روک دیا ہے۔(کہ کتاب کیا ہے اور یہ کہ ایمان کیا ہے؟) یعنی آپ ان شرائع اور احکام کو نہیں جانتے تھے جنہیں جاننے کا سمع اور نقل کے بغیر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔(یعنی عقلی طور پر انہیں جاننا محال اور ناممکن تھا۔)

محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ اس مقام پر ایمان سے مراد نماز ہے جیسا کہ اس ارشاد میں بھی ہے" ماکان اللہ لیضیع ایمانکم"(3) (اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہاری نمازوں کو ضائع کردے) اس تفسیر کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو ایمان کے بارے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ الہام آگاہ کیا گیا چنانچہ وہ اسی الہام کے سبب عالم کے لیے ایک ایسا صانع تسلیم کرتے ہیں جو تمام صفات کمالیہ سے متصف ہونے،عیوب ونقائص سے منزہ اور زوال پذیر ہونے سے مبرأ ہونے کے اعتبار سے یکتا اور منفرد ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے قبل دین ابراہیمی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔یہ ایسا قول ہے جس کی تائید نہ عقلی دلائل سے ہوتی ہے اور نہ ہی نقلی سے۔کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو امی تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔اور نہ ہی دین ابراہیمی قریش میں رائج اور عام تھا بلکہ وہ تو پتھروں کی پوجا کرتے تھے ہاں اتنا ضرور تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گوشۂ تنہائی پسند فرماتے تھے،اور خلوت نشیں رہا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کامل مومن تھے حقیقت ایمان کا یقین رکھتے تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اسی حالت کا نام ایمان ہے۔واللہ اعلم۔

وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ضمیر سے مراد ایمان ہے اور سدی نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے(4) یعنی جہالت کی تاریکی کو دور کرنے کے لئے ہم نے ایمان کو یا قرآن کو نور بنایا۔اور ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اس کے سبب اسے دنیا میں خالص اور سچے عقیدہ تک اور آخرت میں جنت اور مراتب قرب تک پہنچا دیتے ہیں۔اور اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ آپ تمام لوگوں کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔اور صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے جو جنت تک پہنچانے والا ہے اور یہاں ہدایت سے مراد۔ اراءۃ الطریق (راستہ دکھانا) ہے۔

۲؎ صِرَاطِ اللّٰهِ۔ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ سے بدل ہے۔ آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والی ہر شئی اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کی مخلوق ہے۔ اور سن لو آخرت میں تمام مخلوق کے امور کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔ تمام واسطے اور تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ اس آیت طیبہ میں اطاعت شعار اور فرمانبردار لوگوں کے لئے (اچھے انجام کا) وعدہ ہے اور جرائم پیشہ لوگوں کے لئے (عذاب کی) وعید ہے۔ واللہ اعلم۔

تمت بالخیر

سورۂ شوریٰ کی تفسیر بروز ہفتہ 13 ربیع الاول 1208ء اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے عظیم فضل و احسان اور اس کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ لطف و کرم کے طفیل سورۂ شوریٰ کا ترجمہ 22 فروری 2001ء بمطابق 27 ذوالقعدہ 1421ء بروز جمعرات رات ایک بج کر پینتالیس منٹ پر اپنے اختتام کو پہنچا۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و علی الہ وصحبہ اجمعین۔

سورۂ زخرف

اٰیاتھا ۸۹ | سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ مَكِّيَّةٌ ۴۳ | رکوعاتھا ۷

سورۃ الزخرف مکی ہے، اس میں اناسی آیتیں اور سات رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾ وَ اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ ﴿۴﴾

”حامیم قسم ہے اس کتاب مبین کی [1]۔[2] ہم نے اتارا ہے اسے قرآن، عربی زبان میں تاکہ تم (اس کے مطالب کو) سمجھو[3] اور بے شک یہ قرآن ہمارے ہاں لوح محفوظ میں ثبت ہے اونچی شان والا حکمت سے لبریز۔[4]“

[1]، [2] کتاب مبین۔ سے مراد قرآن ہے جو اپنے اعجاز کے ذریعے گمراہی سے ہدایت کے راستے کو واضح کرنے والا ہے جب کتاب کی یہ شان ہے تو یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس پر ایمان اس چیز کو واجب کرتا ہے کہ شرعی احکام سے آگاہی حاصل کی جائے دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جن کا انسان محتاج ہوتا ہے اس میں واؤ قسم کے لیے ہے اگر حم ان چیزوں میں سے ہو جن کی قسم اٹھائی جارہی ہے تو یہ واؤ عاطفہ ہوگی اور مابعد کلام اس کا جواب قسم۔

[3] ہ ضمیر سے مراد الکتاب ہے، قرآن کی قسم اس اعتبار سے اٹھائی کہ قرآن عربی زبان ہی میں ہے تو یہ کلام کے محاسن میں سے ہے کیونکہ اس طرح مقسم بہ 1۔(جس کے ساتھ قسم اٹھائی گئی)2۔اور مقسم علیہ جس پر قسم اٹھائی گئی کے درمیان مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اشیاء کی جو قسم اٹھاتا ہے شاید اس کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ ان اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر جو دلالت ہوتی ہے اس سے استدلال ہوتا ہے۔ اسے عربی زبان میں نازل کرنے کی حکمت یہ ہے تاکہ تم اس کے مفاہیم کو سمجھو ورنہ قرآن تو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو غیر مخلوق ہے۔

[4] ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے اس کا عطف انا پر ہے اُمِّ الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے کیونکہ یہ ہر کتاب کی اصل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **بل هو قرآن مجيد في لوح محفوظ** حضرت ابن عباس کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا اسے لکھنے کا حکم دیا(1) پھر آپ نے یہ آیت پڑھی وَ اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ۔

لدینا یہ عندنا کے معنی میں ہے اس کے پاس ہونا اور اس کے قریب ہونے کو کسی کیفیت اور مکانیت سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تقدیر کلام یہ ہے وہ ہمارے پاس تغیر و تبدل سے پاک ہے اس کی شان کسی کے ادراک سے بالا ہے [illegible]

کتابوں میں اس طرح ہے جس طرح دائرہ میں مرکز کو حیثیت حاصل ہوتی ہے پس مرکز اصل ہوتا ہے اور تمام دائرے کا خلاصہ ہوتا ہے بلکہ وہ تمام دائرے سے افضل ہوتا ہے۔کشف کی نظر میں وہ بہت ہی مختصر نظر آتا ہے جبکہ وہ رتبہ اور درجہ میں دیکھنے والے سے بہت بلند ہوتا ہے جس طرح چاند دیکھنے والے کے لیے ہالے سے چھوٹا نظر آتا ہے حالانکہ وہ ہالہ سے بہت وسیع ہوتا ہے۔

فرمایا یہ حکمت بالغہ والا ہے یا یہ محکمہ ہے کوئی اور اسے منسوخ نہیں کر سکتا علی اور حکیم دونوں اِنَّ کی خبریں ہیں فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ جار مجرور علیٌ کے متعلق ہے علیٌ پر لام مفتوح اسکے متعلق ہونے سے مانع نہیں یا یہ ظرف مستقر ہے جو علیٌ سے حال ہے اور لدینا اس سے بدل ہے یا یہ اُمِّ الۡکِتٰبِ سے حال ہے یا اُمِّ الۡکِتٰبِ میں جو ضمیر پوشیدہ ہے اس سے حال ہے۔

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ ۝

''کیا ہم روک لیں گے تم سے اس ذکر کو ناراض ہو کر اس وجہ سے کہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو۔''

ہمزہ استفہام انکار کے معنی میں ہے اور فاء عاطفہ ہے اور نضرب کا عطف فعل محذوف پر ہے۔تقدیر کلام یہ ہوگی اَنُهۡمِلُكُمۡ فَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ یہاں ذکر سے مراد قرآن ہے جب تو کسی چیز کو چھوڑ دے اور اس سے رک جائے تو اس وقت یہ جملہ بولا جاتا ہے۔ ضربت عنہ واضربت عنہ۔صفحا مفعول مطلق ہے جو مذکورہ فعل کا مصدر نہیں بلکہ اس کے ہم معنی فعل کا مصدر ہے۔جب تو کسی چیز سے اعراض کرے تو اس وقت یہ جملہ بولا جاتا ہے صفحت عنہ۔ترک کرنا اور دور کرنے سے مراد اعراض کرنا ہے یا صفحا مفعول لہ ہے یا صافحین کے معنی میں ہو کر حال ہے۔اس کا اصل معنی ہے کہ تو گردن کے ایک حصہ کو کسی شے کی طرف کر دے۔انکار (حرف استفہام کا معنی) اہمال اور ذکر شکر ترک کرنے کی طرف راجع ہے، یعنی قرآن تو اس لیے عربی زبان میں نازل کیا گیا تھا تا کہ وہ اسے سمجھیں اب اس پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہو رہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملے کا عطف اِنَّهٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ پر ہو اور ہمزہ استفہام جو انکار کے معنی میں ہے اس انکار کو فاء کے معنی کی طرف لوٹایا جائے۔پھر معنی یہ ہوگا کہ اس کے بعد تو قرآن اس شان کا حامل ہے ہم تم پر قرآن نازل کرنا چھوڑ دیں گے۔

نافع، حمزہ اور کسائی نے اَنۡ كُنۡتُمۡ میں اَن کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو اس صورت میں جملہ شرطیہ اس بنا پر مذکور ہوگا کہ ایک ثابت شدہ امر شک کے انداز میں ذکر کیا گیا کیونکہ وہ جاہل بنتے ہیں اور انہیں یہ شعور دلانا ہے کہ اسراف ایک ایسا امر ہے جس کو عقل جائز قرار نہیں دیتی گویا محال امر کو فرض کیا گیا ہے۔اس کی جزاء محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کرتی ہے۔معنی یہ ہوگا کیا اس لیے کہ تم حد سے تجاوز کر گئے ہو ہم تمہیں مہلت دیں گے اور تم پر وحی کرنا چھوڑ دیں گے؟ جبکہ باقی قراء نے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے اس صورت میں اس سے پہلے لام حرف جر محذوف ہوگا۔حقیقت میں حد سے تجاوز کرنا یہ اس امر کی علت ہے جو اعراض ترک کرنے کا تقاضا کرتی ہے مگر اسے اعراض کی علت بنا دیا ہے اور اس پر ہمزہ انکار کو داخل کر دیا ہے۔معنی اس کا یہ ہوگا کیا تمہارے اسراف کی وجہ سے وحی کرنا چھوڑ دیں گے؟ اور تمہیں بعض امور کا حکم نہ دیں گے اور بعض سے نہیں روکیں گے۔امام بغوی نے کہا قتادہ نے کہا اللہ کی قسم

چھوڑ دیں گے اور تمہارے کفر کی وجہ سے تمہیں کوئی سزا نہ دیں گے (1)۔

وَ كَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِیٍّ فِی الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاَهْلَكْنَاۤ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّ مَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِیْنَ ۝

”اور ہم نے بکثرت بھیجے ہیں نبی پہلے لوگوں میں ۱ اور نہیں آیا ان کے پاس کوئی نبی مگر وہ (کفار) اس کا مذاق اڑایا کرتے ۲ پس ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا جو ان سے زیادہ طاقتور تھے اور گزر چکا ہے حال پہلے لوگوں کا ۳“

۱ ہم نے کثیر انبیاء مبعوث کیے۔

۲ یَاْتِیْهِمْ میں فعل مضارع صیغہ حال ماضی کی حکایت کے طور پر ہے اور یہ ارسلنا کا معطوف ہے یا یہ جملہ حال ہے مِنْ نَّبِیٍّ میں من زائدہ ہے اور نبی محل رفع میں ہے۔ كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ یہ مستثنیٰ ہے اور محل نصب میں ہے۔ اور یاتیھم کے مفعول بہ سے حال ہے معنی یہ ہوگا ان کے پاس کوئی نبی نہیں آتا تھا مگر یہ اس کے ساتھ مذاق کرنے والے تھے یا یہ محذوف مفعول مطلق کی صفت ہے۔ تقدیر کلام یہ ہو گی یاتیھم من اتیانا الا اتیا نا کا نوابه یستهز ؤن یا یہ مفعول فیہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کوئی نبی کسی زمانہ میں انکے پاس نہیں آتا مگر وہ نبی کے ساتھ مذاق کرنے والے ہوتے ہیں جسطرح آپکی قوم آپکا مذاق اڑاتی ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے۔

۳ منھم میں ہم ضمیر سے مراد فضول خرچی کرنے والے ہیں ھم ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں اس میں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات (کلام کو پھیرا گیا ہے)۔ معنی یہ ہوگا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا حالانکہ وہ مشرکین مکہ سے زیادہ طاقتور تھے۔ بطش کا معنی قوت ہے یہ اشد کی نسبت سے تمیز ہے یا یہ اھلکنا سے مفعول مطلق ہے۔

پہلے لوگوں کے ہلاک ہونے کا عجیب وغریب قصہ گزر چکا ہے حق تو یہ تھا کہ وہ ضرب المثل کے طور پر مشہور و معروف ہوتا اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وعدہ ہے اور استہزاء کرنے والوں کے لیے اس قسم کے عذاب کی وعید ہے جس کا سامنا پہلے لوگوں نے کیا تھا۔

وَ لَىٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ ۝ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَ الَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝

”اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو تو ضرور کہیں گے پیدا کیا ہے انہیں بڑے زبردست سب کچھ جاننے والے نے ۱ جس نے بنا دیا ہے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ اور بنا دیئے ہیں تمہارے لیے

کر دیا اس سے ایک مردہ شہر کو یونہی تمہیں بھی (قبروں) سے نکالا جائیگا۔[3]"

[1] ھم ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے کیونکہ لئن میں لام مفتوح ہے خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ وہ جواب دیتے ہیں یہ ارشاد اس کو لازم ہے یا وہ جو جواب دیتے تھے اس پر یہ اجمالی طور پر دلالت کرتا ہے۔ لازم کو جواب کے جواب کے قائم مقام اس لیے رکھا گیا تا کہ ان پر الزام حجت ہو جائے کیونکہ کئی مواقع پر یہ بات صراحت کے ساتھ آئی ہے کہ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا ہے کیونکہ عزیز و حکیم صرف اللہ تعالیٰ کی صفات ہی ہیں یہ بھی جائز ہے کہ یہی ان کا مقولہ ہو اور مابعد جملہ مستانفہ ہے۔

[2] زمین کو بچھونا بنا دیا جس طرح بچے کے لیے بچھونا ہوتا ہے اور اس میں ایسے راستے بنا دیے جن میں تم چلتے ہو تا کہ تم اپنے مقاصد تک پہنچ سکو یا ان چیزوں میں غور و فکر کر کے صانع کی حکمت تک پہنچ سکو۔

[3] قدر سے مراد ایسی مقدار ہے جو نفع دیتی ہے نقصان نہیں دیتی فانشرنا میں غائب کے صیغہ سے تکلم کے صیغہ کی طرف التفات ہے جس کا معنی ہے ہم نے زندہ کر دیا، یعنی جس طرح ہم نے بارش کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کیا ہے اس طرح ہم تمہیں قبروں سے زندہ کریں گے كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ یہ جملہ معترضہ ہے شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس کا فاصلہ ہوگا لوگوں نے پوچھا اے ابو ہریرہ کیا وہ چالیس دن ہونگے؟ تو جواب دیا میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا چالیس سال ہونگے؟ تو جواب دیا میں اس سے بھی انکار کرتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش نازل فرمائے گا تو لوگ زمین سے اس طرح نکل آئیں گے جس طرح سبزیاں اگتی ہیں انسان کے جسم کی ہر چیز بوسیدہ ہو جائیگی مگر ایک ہڈی باقی رہے گی جسے دم گزے کی ہڈی کہتے ہیں اس سے اس کا سارا جسم جوڑا جاتا ہے(1) ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے ابن جریر نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ ایک وادی عرش کے نیچے سے بہتی ہے اسی سے روئے زمین پر ہر جانور پیدا ہوتا ہے پھر روحیں اڑتی ہیں انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جسموں میں داخل ہو جائیں اللہ تعالیٰ کے فرمان يَآيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ۔ کا بھی یہی مطلب ہے۔ امام احمد اور ابو یعلی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز لوگوں کو اٹھایا جائے گا جبکہ آسمان سے ان پر ہلکی بارش ہوگی۔

وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اور جس نے ہر قسم کی مخلوق پیدا فرمائی اور بنا دیں تمہارے لیے کشتیاں اور مویشی جن پر تم سوار ہوتے ہو[1] تا کہ تم جم کر بیٹھو ان کی پیٹھوں پر پھر (دلوں میں) یاد کرو اپنے رب کی نعمت کو جب تم خوب جم کر بیٹھ جاؤ ان پر اور (زبان سے) یہ کہو پاک ہے وہ ذات جس نے فرمانبردار بنا دیا ہے اسے ہمارے لیے اور ہم اس پر قابو پانے کی قدرت نہ رکھتے

ہے کہ اپنے مفعول کی طرف بغیر واسطہ کے متعدی ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے یہاں واسطہ کے بغیر متعدی ہونے کو غلبہ دیا ہے کیونکہ یوں جملہ کہا جاتا ہے رکبت الدابة و رکبت في السفينة۔ یا جسے اللہ تعالیٰ نے سواری کے لیے پیدا کیا ہے اسے انسان کی بنائی ہوئی چیز پر غلبہ دیا ہے یا جو چیز عموماً سواری کے لیے استعمال ہوتی ہے اسے کبھی کبھی سواری کے لیے استعمال ہونے والی چیز پر غلبہ اسی وجہ سے دیا فرمایا جن پر تم سوار ہوتے ہو ان کی پشتوں پر جم کر بیٹھ جاؤ۔

۲؎ یہاں ظہور کا لفظ ما کے معنی کے اعتبار سے جمع ذکر کیا ہے پھر دل سے اپنے رب کی نعمتوں کو یاد کرو خواہ وہ سواری خشکی پر ہو یا سمندر میں ہو اور تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اپنی زبانوں سے یہ کہو کہ میں اس ذات پاک کی تسبیح بیان کرتا ہوں جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کیا جبکہ ہم اس کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ یہ اقرن الشي سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی آدمی اس کو قابو کرنے کی طاقت رکھتا ہو اصل میں اس کا معنی ہے کہ اس نے اسے اپنا ساتھی بنالیا جبکہ کوئی قوی چیز کمزور کا ساتھی نہیں ہوتی۔ وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ یہ هذا سے حال ہے یا لنا کی ضمیر سے حال ہے۔

۳؎ لَمُنْقَلِبُوْنَ کا معنی ہے کہ ہم لوٹنے والے ہیں۔ ماقبل کلام کے ساتھ اس کے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سوار انسان اس لیے ہوتا ہے تاکہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جبکہ سب سے بڑا انتقال اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنا ہے یا یہ بہت ہی عظیم الشان چیز ہے اس لیے اسے غافل نہیں ہونا چاہیے اور اسے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے کوشش کرنی چاہیے یہ جملہ ہے اور دوسرا حال ہے۔

ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور بغوی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ جب آپ اپنا پاؤں رکاب میں رکھتے تو کہتے بسم اللہ۔ جب اس پر سوار ہو جاتے تو کہتے الحمد للہ۔ پھر کہتے سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ پھر آپ نے تین دفعہ الحمد للہ کہا اور تین دفعہ اللہ اکبر کہا۔ پھر کہا لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ۔ پھر آپ مسکرائے آپ سے عرض کی گئی کس چیز نے آپ کو ہنسایا ہے تو فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے جسطرح میں نے کیا ہے اور جو کچھ میں نے کہا تھا وہ آپ نے کیا پھر آپ مسکرائے تھے ہم نے عرض کی تھی آپ کو کس چیز نے ہنسنے پر مجبور کیا تھا فرمایا جب کوئی بندہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ کہتا ہے تو اللہ خوش ہوتا ہے(1) الذی جعل لکم الارض۔ اور اس کے تمام معطوفات العزیز العلیم کی صفات ہیں اگر انہیں جملہ مستانفہ بنایا جائے تو یہ مبتداء محذوف کی خبریں ہونگی یا یہ اعنی کا مفعول بہ ہونگے۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۟ؕ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ۟

”اور بنا دی ہے (مشرکوں نے) اس کیلئے اس کے بندوں سے اولاد بے شک انسان کھلا ہوا ناشکر گزار ہے ۱؎ کیا اللہ تعالیٰ نے پسند کر لی ہیں (اپنے لیے) اپنی مخلوق سے بیٹیاں اور مخصوص کر دیا ہے تمہیں بیٹوں کے ساتھ ۲؎۔“

۱؎ اس جملے کا عطف ولئن سالتھم پر ہے اس کے ساتھ اتصال کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کلاموں کے درمیان تناقض ہے کیونکہ انھوں

جس چیز کی تقسیم کی جا سکے اس کے لیے واجب الوجود ہونا محال ہے اور اس کا خالق ہونا بھی محال ہے۔ یہاں اس سے مراد ان کا یہ قول ہے الملئکة بنات اللّٰه کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ بچہ والد کے نطفہ سے جنم لیتا ہے اور نطفہ والد کا جزء ہوتا ہے اسی وجہ سے بچے کو والد کا جزء یا بضعہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے فاطمة بضعة منی فمن اغضبها اغضبنی۔ فاطمہ میرا جزء ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا(1) اسے امام بخاری نے مسور بن مخرمہ سے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور حاکم کے نزدیک ان الفاظ کے ساتھ روایت مروی ہے فَاطِمَةُ بُضْعَةٌ مِّنِّيْ يُغْضِبُنِيْ مَا يُغْضِبُهَا وَيُبْسِطُنِيْ مَا يُبْسِطُهَا۔ قیامت کے روز تمام رشتے ختم ہو جائیں گے مگر میرا نسب اور سسرالی رشتہ قائم رہے گا۔

فرمایا انسان واضح ناشکری کرنے والا اور بہت زیادہ جہالت سے کام لینے والا ہے کیونکہ وہ یہ نہیں پہچانتا کہ اسے کس چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا چاہیے اور کسے منسوب نہیں کرنا چاہیے۔

۲؎ اس جملے کا عطف یخلق پر ہے یا یہ تخلق فعل کے فاعل سے حال ہے یا جملہ مستأنفہ ہے اور اس سے پہلے قول مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی قُلْ لَّهُمْ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ۔ اسی قول کی وجہ سے کم ضمیر کا ذکر کرنا جائز ہے ورنہ یہ دو ایسی کلاموں کے درمیان واقع ہے جو غائب کی طرف منسوب ہیں۔ دو کلاموں سے میری مراد و جعلوا له من عباده جزءا اور اذا بشر احدهم ہے۔

ام منقطعہ یہ ہمزہ کے معنی میں ہے۔ مقصود توبیخ انکار اور تعجب کا اظہار ہے بلکہ یہ انکے قول ان لله ولدا سے اضراب ہے۔ معنی یہ بنے گا کہ انہوں نے اسی پر قناعت نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ کے اجزاء بنا دیے بلکہ اس کی مخلوقات میں سے کمزور چیزوں کو اس کا جزء بنایا جبکہ وہ اجزاء (بیٹیاں) انکے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہیں کیونکہ جب انہیں اس چیز (بیٹی) کی خوشخبری دی جاتی ہے تو انکے غم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾

"اور جب اطلاع دی جاتی ہے ان میں سے کسی کو اس کی جس کی نسبت اس نے رحمان کی طرف کی ہے تو اس کا چہرہ (فرط رنج سے) سیاہ ہو جاتا ہے اور اس کا دل غم سے بھر جاتا ہے ۱؎ کیا وہ (ایسی اولاد جنے گا) جو پروان چڑھتی ہے زیوروں میں اور وہ مباحثہ کے وقت اپنا مدعا واضح نہیں کر سکتی ۲؎۔"

۱؎ مثل سے مراد یا تو وہ جنس ہے جسے اللہ تعالیٰ کی جنس بتایا گیا کیونکہ بچے کے لیے ضروری ہے کہ وہ والد کی جنس سے ہو۔ یا مثل سے مراد صفت اور حالت ہے۔ معنی ہوگا جب ان میں سے کسی کو اس وصف کی بشارت دی جائے جسے وہ اللہ تعالیٰ کا وصف قرار دیتے ہیں تو شدت غم کی وجہ سے انکے چہرے سخت سیاہ ہو جاتے ہیں جبکہ ان کا دل کرب سے بھرا ہوتا ہے جملہ شرطیہ کو مبتدا مقدر ماننے کے ساتھ هم ضمیر مقدر سے حال ہے تقدیر کلام یہ ہوگی هُمْ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ۔

۲؎ حفص، حمزہ اور کسائی نے يُنَشَّؤُ کو باب تفعیل سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ جس کا معنی ہے جس کی تربیت کی گئی ہو جبکہ باقی قراء

منحصر ہوتا ہے اور زیورات سے آراستہ ہوتی ہیں تاکہ حسن بڑھ جائے۔ مردوں کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ ان کا عمومی حسن اوصاف واقدار کی وجہ سے ہوتا ہے اس وجہ سے وہ زیورات کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زیب و زینت میں پروان چڑھنا اچھائی میں سے نہیں اس لیے مردوں پر ضروری ہے کہ وہ اس سے اجتناب کریں اور تقوی کے لباس سے اپنے آپکو آراستہ کریں۔

کیونکہ عقل میں کمی جسموں اور دلوں میں کمزوری ہونے کی وجہ سے وہ مقابلہ اور جھگڑے میں زبان اور تلوار سے اپنا مدعا بیان نہیں کر سکتیں۔ قتادہ نے کہا جو عورت بھی اپنے حق میں بات کرنا چاہتی ہے وہ ایسی بات کر دیتی ہے جو اس کے خلاف دلیل بن جاتی ہے (1) من ینشؤ۔ یہ محل نصب میں ہے اس کا عطف بنات پر ہے۔ ہمزہ کو مکرر اس لیے ذکر کیا تاکہ انکار کی تاکید تو بیخ اور تعجب کے اظہار کا فائدہ دے۔ یہاں معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت صفات میں اختلاف کی صورت میں ہے۔ معنی یہ ہوگا کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے بیٹیوں کو اپنا جزء بنایا ہے کفار کے نزدیک مبغوض اور ناپسند ہیں انکے چہروں کی سیاہی کا باعث ہیں زیورات پہنے پروان چڑھتی ہیں۔ دل، عقل اور جسم کے اعتبار سے کمزور ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو، مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو اس کا عطف مبتدا محذوف پر ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی امن کان شانه ماذکر ومن ینشوا فی الحلیه ومن هو فی الخصام غیر مبین ولد الله سبحانه۔ کیا جس کی مذکورہ شان ہے اور جو زیورات میں پروان چڑھتی ہے اور جو جھگڑے کے وقت اپنا نقطہ نظر بیان نہیں کر سکتی وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے؟

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْ شَاۗءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۭ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۤ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝

”اور انہوں نے ٹھہرالیا ہے فرشتوں کو جو (خداوند) رحمان کے بندے ہیں عورتیں کیا یہ موجود تھے ان کی پیدائش کے وقت لکھ لی جائیگی ان کی گواہی اور ان سے باز پرس ہوگی ۱؎ اور (کفار) کہتے ہیں کہ اگر چاہتا (خداوند) رحمٰن تو ہم انہیں نہ پوجتے انہیں اس حقیقت کا کوئی علم نہیں وہ محض قیاس آرائیاں کر رہے ہیں ۲؎۔“

۱؎ نافع اور ابن کثیر نے عند پڑھا ہے کہ یہ ظرف ہے جبکہ باقی قراء نے عباد پڑھا ہے جو عبد کی جمع ہے۔ اس جملے کا عطف و جعلوا له من عباده جزاء پر ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ذکر کی ہے جو اس کے شایان شان نہیں انہوں نے یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے اس کا ایک بیٹا ہے جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت نہیں بلکہ اس کی تذلیل ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بہترین اور مقرب بندے ہیں انکی کوئی کیفیت نہیں یہ بات کر کے انہوں نے فرشتوں کی تذلیل کی ہے۔

اہل مدینہ نے اوشہدوا پڑھا ہے پہلا ہمزہ استفہام انکاری ہے اور مذکورہ طعن و تشنیع کی علت بیان کرتا ہے جبکہ دوسرا ہمزہ مضموم ہے اور یہ باب افعال سے فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ قالون نے ابی نشیط کی روایت سے اس کے برعکس پڑھا ہے وہ دونوں ہمزوں

ہے پہلی قرأت کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کیا انہیں حاضر کیا گیا تھا دوسری قرأت کی صورت میں معنی یہ ہوگا کیا جب فرشتوں کو مونث بنایا جا رہا تھا اس وقت وہ حاضر تھے تو فرشتوں کے خلاف ان لوگوں کی گواہی لکھی جائے گی کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور انھیں شرمندہ کرنے کے لیے قیامت کے روز ان سے سوال کیا جائے گا۔

ابن منذر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ منافقوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا جنوں سے رشتہ ازدواج قائم ہے۔ نعوذ باللہ اور فرشتے اس کی اولاد ہیں تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (1) امام بغوی نے کہا کلبی اور مقاتل نے کہا جب اہل مکہ نے یہ قول کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تمہیں یہ کس نے بتایا؟ کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں تو انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے آباء واجداد سے سنا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کی شہادت لکھ لی جائے گی اور قیامت کے روز ان سے باز پرس ہوگی (2)۔

لے اس جملے کا عطف جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ پر ہے وہ کہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم فرشتوں کی عبادت نہ کرتے۔ یہ قتادہ، مقاتل اور کلبی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا یہاں ھم ضمیر سے مراد بت ہیں (3) انہوں نے یہ استدلال کیا کہ ان کی عبادت پر اللہ تعالیٰ کی مشیئت کی نفی نہیں کی گئی اس لیے ان کی عبادت کے بارے میں نہی بھی موجود نہیں۔ یا انہوں نے یہ استدلال کیا کہ انکی عبادت کرنا اچھا عمل ہے یہ سب باطل ہے کیونکہ مشیئت تو ایک ممکن کو دوسرے ممکن پر ترجیح دیتی ہے خواہ وہ ممکن مامور ہو یا ممنوع ہو، حسین ہو، یا قبیح ہو انکی جہالت اور قباحت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں یا اللہ تعالیٰ فرشتوں یا بتوں کی عبادت پر راضی ہے ان کا یہ دعویٰ کسی محسوس یا عقلی دلیل کی طرف منسوب نہیں جو علم کو ثابت کرے۔ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ یہ سابقہ کلام کی تاکید ہے، یعنی وہ ظن وتخمین سے باطل قول کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انکے گمان کے فساد کی وجہ کو ظاہر کیا اور انکے شبہ کو بیان کیا پھر اس بات کی نفی کی کہ انکے پاس محسوس یا معقول دلیل موجود ہو پھر کلام کو ایک صورت کی طرف پھیر دیا کہ انکے پاس کوئی نقلی دلیل بھی موجود نہیں۔

اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْۤا اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ كَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾

'' کیا ہم نے دی انہیں کوئی کتاب اس سے پہلے پس وہ اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں لے بلکہ وہ خود کہتے ہیں ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر اور ہم ان کے نقوش پا پر چل رہے ہیں ٹے اور اسی طرح جب بھی ہم نے بھیجا آپ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا تو کہا وہاں کے عیش پرستوں نے کہ ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر اور ہم ان کے نشانات قدم کی پیروی کرنے والے ہیں ۳۔''

پاس آسمانی کتاب کا علم تھا۔قبلہ میں ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے، یا ان کا دعویٰ ہے یعنی کیا اس سے پہلے بھی کوئی ایسی چیز تھی جو ان کے قول کی صحت پر دلالت کرے اور وہ اسی پر مضبوطی سے قائم ہیں؟

۲؎ اس کا عطف ام اتیناھم پر ہے۔معنی یہ ہوگا وہ انکی پیدائش کے وقت حاضر نہیں تھے اور نہ انہیں کوئی کتاب دی گئی بلکہ وہ تو اپنے آباء واجداد کی تقلید کی وجہ سے یہ باتیں کہے جا رہے ہیں یہاں امت سے مراد دین اور ملت ہے۔دین اور ملت کو امت کا نام اس لیے دیا کیونکہ ان کا بھی قصد کیا جاتا ہے جس طرح جس شخص کی طرف کوچ کیا جائے اسے رحلۃ کہہ دیتے ہیں۔مجاہد نے کہا یہاں امت کا معنی امام ہے(1) یعنی انکے پاس نہ عقلی دلیل ہے اور نہ ہی نقلی دلیل ہے بلکہ وہ تو اپنے جاہل آباء واجداد کی تقلید کی طرف مائل ہو گئے اور اسی تقلید کو اہتداء کا نام دیا۔

۳؎ الا قال یہ استثناء مفرغ ہے جو قریۃ کی صفت ہے۔تقدیر کلام یہ ہوگی الا فی قریۃ قال مترفوھا مترف کا معنی مالدار ہے اس آیت کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ان جیسے امور میں تقلید انکی گمراہی ہے اور ان کے آباء واجداد کے پاس بھی کوئی ایسا علم نہیں تھا جو حقیقت میں علم کے اسباب کی طرف منسوب ہو یہاں خوشحال لوگوں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعور دلایا جائے کہ خوشحالی بھی صحیح نظر وفکر سے تقلید کی طرف جانے کا سبب ہے۔

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾

"اس نبی نے فرمایا کہ اگر میں لے آؤں تمہارے پاس زیادہ درست چیز اس سے جس پر پایا ہے تم نے اپنے باپ دادا کو (تب بھی؟) انہوں نے جواب دیا کہ ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے اس کو نہیں مانتے ۱؎ پس ہم نے ان سے انتقام لیا ذرا دیکھو کیسا (المناک) انجام ہوا جھٹلانے والوں کا ۲؎۔"

۱؎ حفص نے ماضی کا صیغہ قال پڑھا ہے کیونکہ نذیر نے جو انھیں کہا اس کی خبر ہے جبکہ باقی قراء نے اسے امر کا صیغہ پڑھا ہے اس صورت میں امر ماضی کی حکایت ہوگی جو اس سے پہلے نذیر کی طرف وحی کی گئی یا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوگا پہلی قرأت کی تائید کلام کا سیاق کرتا ہے کیونکہ فانتقمنا منھم ماضی کا صیغہ ہے۔

ابو جعفر نے لو جئناکم جمع کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے واحد متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔فعل سے پہلے ہمزہ استفہام انکاری ہے جبکہ واؤ حالیہ ہے۔تقدیر کلام یہ ہوگی أتتبعون اباءکم و لو جئتکم۔یعنی کیا تم پھر بھی اپنے آباء واجداد کی اتباع کرو گے جبکہ جو میں تمہارے پاس پیغام لایا ہوں وہ زیادہ ہدایت کا باعث ہے؟ اس کی نسبت جس پر تم نے اپنے آباء اجداد کو پایا تھا تو کافروں نے انبیاء کے جواب میں کہا ہم اس پیغام کا انکار کرنے والے ہیں جو تم لائے ہو اگرچہ وہ دین زیادہ ہدایت کا باعث ہو انکے اس قول کرنے کا مقصود یہ تھا کہ وہ انبیاء کو اس امر سے مایوس کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس دین میں غور وفکر کریں گے۔اھدی صفت کا صیغہ ہے اس سے پہلے دین یا طریقہ کا لفظ بطور معطوف محذوف ہے۔

۲؎ فرمایا ہم نے انہیں تباہ و برباد کر کے ان سے انتقام لیا آپ دیکھیں کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسے ہوا؟ جن لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے ہم ان سے بھی اسی طرح انتقام لیں گے اس لیے آپ انکے جھٹلانے سے غمگین نہ ہوں۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖۤ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ ﴿۲۷﴾ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلْ مَتَّعْتُ هٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۹﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''اور (یاد کیجیے) جب کہا ابراھیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہ میں بیزار ہوں ان سے جن کی تم عبادت کرتے ہو۱؎ بجز اس کے جس نے مجھے پیدا فرمایا بے شک وہی میری رہنمائی کریگا۲؎ اور آپ نے بنادیا کلمہ توحید کو باقی رہنے والی بات اپنی اولاد میں تاکہ وہ (اس کی طرف) رجوع کریں۳؎ بلکہ میں نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو یہاں تک کہ آ گیا ان کے پاس حق اور کھول کر بیان کرنیوالا رسول۴؎ اور جب آ گیا ان کے پاس حق تو وہ کہنے لگے یہ تو جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں ۵؎''

۱؎ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں تمہاری عبادت یا تمہارے معبودوں سے بری ہوں۔ یہاں براء مصدر ذکر کیا اسے صفت کے صیغہ کی جگہ بطور مبالغہ ذکر کیا ہے اسی وجہ سے اس کا تثنیہ اور جمع کا صیغہ ذکر نہیں کیا جاتا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے برأت کا اظہار کیا تھا تاکہ یہ لوگ بھی اندھی تقلید سے برأت کریں اور قطعی دلیل کی پیروی کریں یا اگر تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقلید کرو کیونکہ یہ سب اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ انکے آباء میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے معزز ہیں۔

۲؎ فطرنی کا معنی ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے یا متصل ہے۔ متصل کی صورت میں ما ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو عام ہوگا کیونکہ وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے جو ذوالعقول نہیں یا یہ استثناء نہیں بلکہ صفت ہے کیونکہ ماتعبدون میں ما موصوفہ ہے اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی اِنَّنِي بَرَآءٌ مِّنَ اٰلِهَةٍ تَعْبُدُوْنَهَا غَيْرَ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ۔ یعنی جس نے مجھے پیدا کیا ہے وہ مجھے ہدایت پر ثابت قدم رکھے گا یا وہ مجھے یکے بعد دیگرے ہدایت کے درجات عطا فرماتا جائے گا۔

۳؎ جعلھا میں ضمیر مرفوع سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات ہے اور ھا ضمیر منصوب سے مراد یہ کلمہ توحید ہے جو آپ کے فرمان اننی برآء سے سمجھا جارہا ہے عقبہ سے مراد آپ کی اولاد ہے۔ قتادہ نے کہا آپ کی اولاد میں سے ہمیشہ ایسے افراد موجود رہے جو اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرتے تھے(1) قرطبی نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی وصیت کو آپ کی نسل اور اولاد میں باقی رکھا۔ ابن زید نے کہا اس سے مراد آپ کا یہ ارشاد ہے اسلمت لرب العالمین(2) ساتھ ہی اس کی تلاوت کی هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ۔

؎ بل اضراب کے لیے ہے اور یہ جملہ لعلھم یرجعون سے اضراب ہے۔ یعنی میں نے ان موجود کفار کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر ہیں اور ان کے آباء واجداد جو شرک پر ہی مرے انہیں لطف اندوز ہونے کا موقع دیا انکے کفر پر انہیں جلد سزانہ دی یہاں تک کہ انکے پاس قرآن اور رسول تشریف لے آیا۔ ضحاک نے کہا حق سے مراد اسلام ہے رسول کی صفت مبین اس لیے ذکر کی کیونکہ آپ کی رسالت معجزات کے ساتھ ظاہر ہے۔ یا آپ توحید کو دلائل کے ساتھ ظاہر کرنے والے ہیں یا آپ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے احکام کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

؎ یہاں حق سے مراد قرآن ہے، یعنی جب انکے پاس قرآن آ گیا تو انہوں نے کہا یہ قرآن تو جادو ہے انہوں نے قرآن کو جادو اس لیے کہا کیونکہ وہ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے۔

ابن جریر نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تو عربوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا اللہ تعالیٰ اس سے بہت برتر ہے کہ اس کا رسول کوئی بشر ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَآ...... نازل فرمائی (1) جب اس جیسی آیات بار بار نازل ہونے لگیں تو انھوں نے کہا اگر بشر رسول ہو سکتا ہے تو پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ لوگ اس کے زیادہ مستحق ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ﴿۳۱﴾ اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا ؕ وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾

"اور کہنے لگے کیوں نہ اتارا گیا یہ قرآن کسی ایسے آدمی پر جو ان دو شہروں میں بڑا ہے ؎ کیا وہ بانٹا کرتے ہیں آپ کے رب کی رحمت کو؟ ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو اس دنیوی زندگی میں اور ہم نے ہی بلند کیا ہے بعض کو بعض پر مراتب میں تا کہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور آپ کے رب کی رحمت (خاص) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ ؎"

؎ قریتین سے مراد مکہ مکرمہ اور طائف ہے، یعنی ایسے شخص پر کیوں قرآن نازل نہیں ہوا جو مرتبہ اور مال والا تھا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالت ایک عظیم منصب ہے جو عظیم آدمی کے ہی شایان شان ہے وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ایک روحانی رتبہ ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان فضائل و کمالات سے آراستہ ہو اور اس میں تجلیات ذاتیہ اور صفاتیہ کے متحمل ہونے کی کامل استعداد موجود ہو نہ کہ اس کے لیے دنیاوی شان و شوکت کی ضرورت ہے۔

ابن منذر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے کہا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں اگر یہ حق ہوتا تو یہ قرآن مجھ پر یا مسعود ثقفی پر نازل ہوتا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

گیا کہ مکہ مکرمہ میں سے ولید بن مغیرہ اور طائف سے حبیب بن عمرو مراد ہے یہ بھی گمان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے تو اللہ تعالیٰ نے انکے رد میں فرمایا(1)۔

۲۔ اس میں استفہام انکاری ہے رحمت سے مراد نبوت ہے اس میں انکے فیصلہ پر انکی جہالت کا اظہار ہے۔ انہیں شرمندہ کیا گیا ہے اور تعجب کا اظہار کیا گیا۔ معیشت سے مراد رزق ہے نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ والے جملہ میں انکی جہالت اور انہیں شرمندہ کرنے کی علت بیان کی جارہی ہے۔ درجات ترکیب کلام میں یہ نسبت سے تمیز ہے۔ معنی یہ ہوگا ہم نے درجات کو بلند کیا جو مال اور مرتبہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بلند ہیں۔ ہم نے بعض کو غنی بنایا اور بعض کو فقیر بنایا۔ بعض کو مالک بنایا اور بعض کو مملوک بنایا۔ لیتخذ جار مجرور رفعنا کے متعلق ہے سخریا کے آخر میں یائے نسبت ہے۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا ان میں سے بعض اپنے مال کے ذریعے دوسرے کا مالک بن جاتا ہے لیکن وہ اپنے رزق میں اضافہ نہیں کرسکتا اور دوسرے کے رزق میں کمی نہیں کرسکتا اور نہ ہی اسے یہ حق حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مال میں جو کمی کی ہے اس پر اعتراض کرے(2) رَحْمَتُ رَبِّكَ میں رحمۃ سے مراد نبوت اور اس کے متعلقات ہیں تیرے رب کی رحمت، یعنی نبوت جو دنیا کی نعمتوں سے سب سے بہتر ہے جب انسانوں میں سے کوئی بھی دنیا میں اپنے طور پر اعلیٰ مقام حاصل نہیں کرسکتا تو اس کے لیے یہ کیسے ممکن ہے؟ کہ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین مرتبہ اپنے لیے مختص کرسکے جس کے لیے وہ چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم نعمت نبوت ہے دنیا کے سامان اور رزق عظیم نہیں یہ جملہ یا تو معطوف ہے یا حال ہے۔

کفار کے نزدیک کیونکہ عظمت و رفعت کا معیار دنیاوی مال و متاع تھا تو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا حقیر اور ناپسندیدہ چیز ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾

''اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک امت بن جائیں گے تو ہم بنادیتے ان کیلئے جو انکار کرتے ہیں رحمٰن کا ان کے مکانوں کے لیے چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں (وہ بھی چاندی کی) ۱؎ اور ان کے گھروں کے دروازے بھی چاندی کے اور وہ تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں وہ بھی چاندی ۲؎ اور سونے کے اور یہ سب (سنہری روپہلی) چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہیں اور آخرت (کی عزت و کامیابی) آپ کے رب کے نزدیک پرہیزگاروں کیلئے ہے ۳؎۔''

۱؎ کیونکہ لوگ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور آخرت سے غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں اگر ان سب کے کافر ہوجانے کا خدشہ نہ ہوتا تو ہم چاندی کے چھت اور سیڑھیاں بنادیتے جن کے ذریعے وہ اوپر چڑھتے۔ ترکیب کلام میں ان اپنے صلہ سے مل کر مبتداء ہے اور اسکی خبر محذوف ہے جو حاصل ہے۔ لو لا کا جواب لجعلنا ہے لبیوتھم یہ لمن یکفر سے بدل اشتمال ہے یا اسکی علت ہے جس طرح تیرا

صیغہ ہے اور جنس مراد ہے جبکہ باقی قراء نے سقف کی جمع سقفا پڑھا ہے جس طرح رھن کی جمع رُھُنٌ آتی ہے ابوعبیدہ نے کہا اس کی کوئی اور مثال نہیں ہے کہ فَعْلٌ کی جمع فُعُلٌ کے وزن پر ہو(1) ایک قول یہ کیا گیا یہ سقیف کی جمع ہے ایک قول یہ کیا گیا یہ جمع کی جمع ہے، یعنی سقف کی جمع سقوف اور سقوف کی جمع سقف آتی ہے۔ معارج کا معنی چاندی کی سیڑھیاں ہیں۔ معارج کی صفت مِن فِضَّةٍ ذکر نہیں کی کیونکہ یہ اس کے معطوف میں مذکور ہے وہاں اس کا ذکر کافی ہے۔

یہ سر کی جمع سرر ہے یعنی ہم انکے لیے چاندی کی چارپائیاں بنا دیتے۔

یہ زخرف کا معنی زینت ہے اس کا عطف سقف پر ہے یا اس کا معنی سونا ہے جسطرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ۔ اس کا عطف مِن فِضَّةٍ کے محل پر ہے۔ کفار کے لیے دنیا کی تخصیص اس لیے ہے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہے اور کافر بھی اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہے اس لیے مبغوض چیز مبغوض کو دے دی جائیگی۔ ذلک اسم اشارہ سے مراد چاندی کا چھت، زینے، دروازے، پلنگ اور انکی زینت سب ہیں۔

عاصم، حمزہ اور ہشام نے لما کو کما پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہاں ان نافیہ ہے۔ اور لَمّا اِلَّا کے معنی میں ہے۔ معنی یہ بنے گا یہ سب نہیں ہے مگر دنیاوی زندگی کا سامان ہے اس کو کوئی بقاء حاصل نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت ہے جبکہ باقی قراء نے لما کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اِن مثقلہ سے مخففہ ہے۔ لام نافیہ اور تاکید میں فرق رکھنے کے لیے ہے او اس میں ما زائدہ ہے۔ جبکہ دار آخرت اللہ تعالیٰ کے علم اور فیصلہ میں متقین کے لیے ثابت ہے۔ اَلْآخِرَةُ صفت ہے اس کا موصوف الدار ہے۔ یہاں متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ اس آیت میں اس امر پر دلالت ہے کہ آخرت میں عظیم چیز عظیم لوگوں کے لیے ہوگی دنیا میں ایسا ہونا ضروری نہیں ساتھ ہی یہ شعور بھی دلایا جا رہا ہے کہ دنیا کی تمام آسائشیں مؤمنوں کے لیے کیوں نہیں بنائی گئیں ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لیے مختص کر دی گئی ہیں کیونکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض ہے اس لیے مناسب تو یہ تھا کہ یہ سب کی سب کافروں کے لیے مختص کر دی جائیں مگر یہ اندیشہ تھا کہ کہیں سارے لوگ کفر پر ہی جمع نہ ہو جائیں۔ اگر دنیا کی آسائشیں اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہوتیں تو کسی کافر کو بھی ان میں سے کچھ بھی عطا نہ کیا جاتا۔

حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی قدر رکھتی تو کافر کو پانی کا گھونٹ بھی نصیب نہ ہوتا(2) ایک روایت میں پانی کا قطرہ نصیب نہ ہوتا کے الفاظ ہیں اسے امام ترمذی اور ضیاء نے روایت کیا ہے۔

مستورد بن شداد سے مروی ہے کہا میں ان لوگوں میں شامل تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بکری کے ایک مردہ بچے کے پاس ٹھہرے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم دیکھ رہے ہو کہ یہ چیز مالکوں کے نزدیک بے وقعت ہوگی یہاں تک کہ انہوں نے اسے باہر پھینک دیا صحابہ نے عرض کی اس کے بے قدر ہونے کی وجہ سے ہی اسے پھینکا گیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دنیا اس سے بھی بڑھ کر حقیر چیز ہے اسے امام بغوی نے روایت کیا(3)۔

ابونعیم نے داؤد بن ہلال صنعی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحف [illegible]

پیدا کر دیا ہے۔ میں نے تجھ سے زیادہ حقیر کوئی چیز پیدا نہیں کی تو ہر اعتبار سے حقیر ہے تیرا انجام فناء ہونا ہے، جس وقت میں نے تجھے پیدا کیا تھا اسی وقت فیصلہ کیا تھا کہ تو کسی کے پاس ہمیشہ نہیں رہے گی اور نہ ہی کوئی تیرے لیے ہمیشہ رہے گا اگر چہ مالک تیرے لیے کتنا حریص کیوں نہ ہو اور تیرے بارے میں بخل کیوں نہ کرے نیک لوگوں کو مبارک ہو جو راضی دلوں کے ساتھ مجھے دیکھتے ہیں اور صدق و استقامت پر قائم رہتے ہوئے۔ وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کے لیے میرے پاس جو جزاء ہے وہ انکے لیے مبارک ہو جب وہ قبروں سے اٹھ کر میری طرف آئیں گے تو نور انکے سامنے دوڑ رہا ہو گا فرشتے انھیں گھیرے ہوئے ہونگے یہاں تک کہ وہ نور انہیں اس رحمت تک پہنچا دے گا جس کی وہ مجھ سے امید کرتے تھے۔

حضرت جابر سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے سب ملعون ہے مگر جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو(1) اسے ضیاء نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے اور طبرانی نے اوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعود سے اسی جیسی مرفوع روایت نقل کی ہے صرف استثناء میں یہ ذکر ہے مگر اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے لوازمات، عالم اور متعلم۔ بزاز نے حضرت ابن مسعود سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اس میں استثناء یہ ہے مگر نیکی کا حکم یا برائی سے روکنا یا اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ طبرانی نے کبیر میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو درداء سے اسی طرح کی مرفوع روایت نقل کی ہے استثناء یہ ہے مگر جس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت مروی ہے کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کا آخرت میں کوئی گھر نہ ہو اور اس کا مال ہے جس کا (آخرت میں) کوئی مال نہ ہو اسے وہی جمع کرتا ہے جس میں کوئی عقل نہ ہو(2)۔ اسے امام احمد اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے موقوف روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابن عمر سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ اور خفیف سا خواب ہے جب وہ دنیا چھوڑتا ہے تو وہ قید خانہ اور خواب کو چھوڑتا ہے(3)۔ اسے امام احمد طبرانی، حاکم نے مستدرک میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے(4)۔ اسے امام احمد، مسلم نے صحیح میں اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی اور حاکم نے حضرت سلمان سے اور بزار نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ مومن دنیا میں اگر چہ خوشحال ہی ہو تاہم آخرت میں اس کے لیے جو ثواب تیار کیا گیا ہے دنیا اس کے مقابلہ میں قید خانہ اور خواب ہے۔ کافر اگر چہ دنیا میں مصیبت اور تکلیف سے دوچار ہو تاہم آخرت میں اس کے لیے جو عذاب تیار کیا گیا ہے اس کے مقابلہ میں دنیا اس کے لیے جنت ہے واللہ اعلم۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مسند فردوس کے مؤلف نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل آخرت کے لیے دنیا حرام ہے اور اہل دنیا کے لیے آخرت حرام ہے جبکہ اہل اللہ کے لیے دونوں حرام ہیں(5) تو اس کا کیا مفہوم ہے۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ مؤمنین پر دنیا کی محبت حرام ہے دنیا کے سامان سے لطف اندوز ہونا حرام نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 470 (العلمیۃ)
2۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 515 (الفکر)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 447 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 407 (قدیمی)
5۔ مسند الفردوس، جلد 2، صفحہ 230 (العلمیۃ)

خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔(اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی آسائشیں مؤمنوں پر حرام نہیں) جو آدمی دنیا کی محبت میں منہمک ہو گیا اس نے آخرت میں اپنا نقصان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے دنیا سے محبت کی اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا۔ جس نے آخرت سے محبت کی اس نے اپنی دنیا کو نقصان پہنچایا اس لیے فانی چیز پر باقی کو ترجیح دو (1) امام حاکم نے مستدرک اور امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ جس کے پیش نظر صرف دنیاوی مقاصد ہوں اس پر آخرت کی نعمتیں حرام ہوتی ہیں اس سے مراد کافر ہیں انہیں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ اہل اللہ پر دنیا اور آخرت کی محبت حرام ہے اہل اللہ وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھرے ہوتے ہیں انکے دل دنیا و آخرت کی کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت مائی رابعہ بصریہ نے اپنے ایک ہاتھ میں پانی کا برتن لیا اور دوسرے ہاتھ میں آگ لی ان سے عرض کی گئی کہاں کا ارادہ ہے؟ تو فرمایا میرا ارادہ ہے کہ میں جہنم کو بجھا دوں اور جنت کو جلا دوں تا کہ لوگ جنت کے لالچ اور جہنم کے خوف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کریں بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے اسکی عبادت کریں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا حضرت مائی رابعہ بصریہ کا یہ ارشاد سکر پہ مبنی ہے مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ جنت کی خواہش کرے لیکن محض جنت کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے خواہش کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا محل ہے۔ جہنم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غصہ کا محل ہے ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا جائز ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ یا بندے کے حق کی وجہ سے حرام نہ ہوں جس طرح ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں روزی کمانا جائز ہے بلکہ فرض ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ کے فرض کی ادائیگی کے بعد حلال روزی کی تلاش فرض ہے (2)۔ اسے طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے تو پھر دنیا اور دنیا کی محبت کا کیا معنی ہوگا؟

میں کہتا ہوں دنیا کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے آخرت پر ترجیح دے اس کے حصول اور اس کی لذتوں میں منہمک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ثواب حاصل کرنے اور عذاب سے بچنے سے غافل ہو جائے مال جمع کرنے اور لمبی آرزؤں کا حریص ہو جائے اغنیاء کو فقراء سے بہتر جانے اغنیاء کی دولت و ثروت کے باعث انہیں فقراء پر ترجیح دے کسی کی اذیت سے بچنے یا احسان کا بدلہ چکانے کے لیے انکی تعظیم نہ کرے یا کسی اور جائز امر کی وجہ سے انہیں ترجیح نہ دے یا وہ زمین میں برتری حاصل کرنے یا فساد کے ارادہ سے ایسا کرے جہاں تک روزی کی تلاش اور اموال کے حاصل کرنے کا تعلق ہے اگر وہ روزی کماتا ہے تا کہ وہ اسے اپنی ذات پر خرچ کرے جس کے نتیجے میں وہ عبادت کے قابل ہو جائے یا اہل خانہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے مال کمائے تو یہ کوئی مکروہ نہیں بلکہ اس طرح مال حاصل کرنے کی صورتوں میں کچھ صورتیں واجب ہیں اور کچھ مستحب ہیں اور کچھ مباح ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے حلال مال کمایا خود کھایا یا اسے پہنا اور پھر دوسروں کو اس سے کھلایا یا پہنایا تو اس کا یہ عمل اس کی زکوٰۃ بن جائے گا ابن حبان نے اپنی صحیح میں ابوسعید کی حدیث سے روایت کیا ہے لیکن مسنون طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی طلب میں وہ باوقار انداز اپنائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا کی طلب میں باوقار انداز اپناؤ کیونکہ ہر ایک کو اسی چیز کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے ...

وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور جو شخص (دانستہ) اندھا بنتا ہے رحمان کے ذکر سے [1] تو ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کیلئے ایک شیطان پس وہ ہر وقت اس کا رفیق رہتا ہے [2] اور شیاطین روکتے ہیں ان (اندھوں) کو راہ ہدایت سے اور یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں [3] ''

1۔ یعنی جو آدمی قرآن سے اعراض کرتا ہے دنیاوی لذتوں میں مشغول ہونے اور شہوات میں منہمک ہونے کی وجہ سے اس سے اندھا بننے کی کوشش کرتا ہے (۱) جب اس فعل کا صلہ الی استعمال ہوتو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے کہ تو نے ہدایت پاتے ہوئے اس کا قصد کیا اور جب اس کا صلہ عن استعمال ہوتو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے تو نے اس سے اعراض کیا۔ جس طرح یہ جملے بولے جاتے ہیں عدلت الی فلان وعدلت عنه۔ یعنی میں نے اس کی طرف میلان کیا اور اس سے انحراف کیا اسی طرح رغبت فيه اور رغبت عنه کا معنی ہوتا ہے خلیل بن احمد نے کہا عشو کا معنی ہے کمزور نظر سے دیکھنا (1)۔

2۔ یعقوب نے نقیض کو واحد مذکر غائب کا صیغہ یقیض پڑھا ہے اس صورت میں ھو ضمیر لفظ الرحمٰن کی طرف لوٹے گی جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے جمع کا صیغہ تعظیم کے لیے ذکر کیا، یعنی ہم شیطان کو اس کا ساتھی بنا دیتے ہیں اور اس پر مسلط کر دیتے ہیں تو شیطان ہی اس کا ساتھی ہوتا ہے جو اس سے جدا نہیں ہوتا۔ شیطان اس کے لیے برے اعمال کو مزین کر کے پیش کرتا ہے اور اس کے سامنے یہ تصویر پیش کرتا ہے کہ وہ ہدایت پر ہے۔

3۔ هم ضمیر سے مراد شیاطین ہیں، یعنی شیاطین اسے ہدایت کے راستہ سے روک دیتے ہیں ھُمْ ضمیر منْ موصولہ کی طرف لوٹ رہی ہے اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اسے جمع ذکر کیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کے راستہ سے اندھے بنتے ہیں ساتھ ہی ساتھ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ يَحْسَبُوْنَ والا جملہ ليصدونهم میں ھُمْ ضمیر منصوب سے حال ہے اور پھر یہ مکمل جملہ جملہ معترضہ ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾

'' یہاں تک کہ جب وہ (اندھا) ہمارے پاس آئیگا تو (آنکھیں کھل جائیں گی) کہے گا کاش! میرے درمیان اور (اے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 113 (التجاریۃ)

(۱) حضرت محمد بن عثمان مخزومی سے مروی ہے کہ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر صحابی کے لیے ایک آدمی معین کیا جو اسے اپنا ہمنوا بنائے حضرت ابوبکر صدیق کے لیے انہوں نے طلحہ بن عبید اللہ کو معین کیا۔ طلحہ حضرت ابوبکر صدیق کے پاس اس وقت آیا جب آپ اپنی قوم میں تشریف فرما تھے حضرت ابوبکر [illegible] عبادت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے پوچھا

شیطان) تیرے درمیان مشرق ومغرب کی دوری ہوتی تو تو بہت برا ساتھی ہے ۱؎ اور یہ (شور وفغاں) تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا آج جبکہ تم (دنیا میں) ظلم کرتے رہے تم (سب) اس عذاب میں حصہ دار ہو ۲؎۔''

۱؎ یہ جملہ انکے گمان کی غایت ہے ابوبکر کے علاوہ عراق کے قراء نے جاءنا مفرد کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے تثنیہ کا صیغہ پڑھا ہے پھر معنی یہ ہوگا جب اندھا بننے والا اور اس کا شیطان آئے گا ان دونوں کو ایک ہی سلسلہ میں رکھا گیا ہے تو اندھا بننے والا شیطان کے بارے میں کہے گا کاش میرے اور اس کے درمیان مشرق ومغرب کی دوری ہوتی۔ یہاں حرف یا تنبیہ کے لیے ہے یا منادی محذوف ہے۔ اصل عبادت اس طرح تھی یا قرین۔ مشرقین سے مراد مشرق ومغرب ہے مشرق کو مغرب پر غلبہ دیا اور اس کا تثنیہ بنادیا اور بعد کی انکی طرف اضافت کردی۔ یا اس سے مراد موسم گرما اور موسم سرما کا مشرق ہے حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے جب کافر کو اپنے شیطان ساتھی کے ساتھ اٹھایا جائے گا تو وہ اس سے جدا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ جہنم میں جا پہنچے گا(1)۔

۲؎ یہاں الیوم سے مراد آخرت ہے اذا ،الیوم سے بدل ہے، یعنی جب یہ واضح ہوگیا کہ تم نے شرک کیا ہے اور تم نے دنیا میں اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو پھر جس طرح تم عذاب کا باعث بننے والی چیز میں مشترک تھے اس طرح تم عذاب میں بھی اکٹھے رہو گے یہ بھی جائز ہے کہ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ یہ لن ینفعکم کا فاعل ہو پھر معنی یہ ہوگا تمہارا عذاب میں اکٹھے ہونا تمہیں کچھ نفع نہ دے گا جس طرح کسی مصیبت میں گرفتار لوگ ایک دوسرے کی مدد کر کے فائدہ پہنچاتے تھے، یعنی وہ ایک دوسرے کا بوجھ اٹھاتے اور تکالیف کو تقسیم کر لیتے۔ عذاب میں ان کے اکٹھا ہونے کے باوجود انہیں نفع حاصل نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کیونکہ جہنمی اور اس کا ساتھی شیطان، شیطان سے پورا پورا حصہ لے رہا ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ولن ینفعکم یہ قال یا لیتنی کے فاعل سے حال ہو اور غائب کے صیغہ سے مخاطب کے صیغہ کی طرف التفات ہو۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۞ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۞ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ۞

''کیا آپ سنانا چاہتے ہیں بہروں کو یا راہ دکھانا چاہتے ہیں اندھوں کو اور انہیں جو کھلی گمراہی میں ہیں ۱؎ پس اگر ہم لے جائیں آپ کو (اس دار فانی سے) تو پھر بھی ہم ان سے بدلہ لیں گے ۲؎ یا ہم آپ کو دکھا دیں گے وہ عذاب جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ پس ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں ۳؎''

۱؎ انت ضمیر سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ کا عطف العمی پر ہے جملہ کے آغاز میں استفہام انکار اور تعجب کے لیے ہے۔ فاء عاطفہ ہے اور اس کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ا انت ترید ان تھدیھم فانت تسمع الصم، یعنی آپ ان لوگوں کو ہدایت دینے پر قادر نہیں کیونکہ یہ کفر میں بہت آگے نکل چکے ہیں اور گمراہی میں اس قدر مستغرق ہیں کہ کفر کی تاریکی انکی آنکھوں پر پردہ اور کانوں میں گرانی بن چکی ہے گویا وہ نہ آپ کا کلام سنتے ہیں اور نہ اس راستہ کو دیکھتے ہیں جس کی طرف آپ ان کی راہنمائی کرتے ہیں۔

سے فعل کے آخر میں نون تاکید ثقیلہ موجود ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر انہیں عذاب دینے سے پہلے ہم آپ کو موت عطا کردیں تو ہم آپ کے بعد ان سے دنیا اور آخرت میں انتقام لیں گے۔

سے یا ہم نے انہیں عذاب دینے کا جو آپ سے وعدہ کیا وہ دنیا میں ہی آپ کو دکھا دیں گے اور ہم اس پر قادر ہیں اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہم انہیں عذاب دینے کی قدرت رکھتے ہیں وہ ہم سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہم جس طرح چاہتے ہیں ہم انہیں عذاب دے سکتے ہیں۔ ھُمْ ضمیر سے مراد مکہ کے مشرک ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بدر کے روز انتقام لیا یہی اکثر مفسرین کا قول ہے حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے مسلمان ہیں کیونکہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عزت سے نوازا آپ نے اپنی امت میں ایسی چیزیں ہی دیکھیں جس سے آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوئی۔ مصائب کو آپ کے بعد تک موقوف کر دیا (1) روایت کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کچھ دکھایا گیا جو آپ کے بعد آپ کی امت میں وقوع پذیر ہونے والا تھا تو اس کے بعد آپ کو مسکراتے اور خوش نہ دیکھا گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو قبض کر لیا (2) میں کہتا ہوں شاید اس سے مراد حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہو اور بنو امیہ کے حکمرانوں نے جو کچھ کیا تھا وہ مراد ہو۔ عبد الرحمٰن بن مسعود عبدی سے مروی ہے کہ حضرت علی شیر خدا نے اس آیت کریمہ کو پڑھا اور فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور آپ کے دشمنوں میں اللہ کا عذاب باقی رہا۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞ وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ ۚ وَ سَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ۞

''پس مضبوطی سے پکڑے رہیے اس (قرآن) کو جو آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے۔ بے شک آپ سیدھی راہ پر ہیں لے اور بے شک یہ بڑا شرف ہے آپ کیلئے اور آپ کی قوم کیلئے اور (اے فرزندان اسلام) تم سے جواب طلبی ہوگی ۲ے''

لے الذی اوحی الیک سے مراد وحی متلو اور وحی غیر متلو دونوں ہیں انہیں یاد رکھیے اور ان پر عمل کیجئے۔ اس میں فاء سببیہ ہے یہ جملہ انا جعلنا ہُ قُرْآناً عربیاً۔ کے ساتھ متعلق ہے درمیان میں جملے معترضہ ہیں آپ ایسے راستہ پر ہیں جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں یہ جملہ استمسک فعل امر کی علت ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 113 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 113 (التجاریۃ)

(ا) حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے دل میں میری قوم کی جو محبت ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی قوم کے ساتھ عزتوں سے نوازا۔ ارشاد فرمایا وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ ۚ وَ سَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے میری قوم کو اپنی کتاب میں عزت و شرف عطا فرمایا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ o وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ پس اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے اس نے میری قوم سے میرا صدیق، میری قوم سے شہید اور میری قوم سے امام بنائے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو الٹ پلٹ دیا قریش عربوں میں سے بہترین ہیں یہی وہ مبارک درخت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ

[illegible] ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

۲ؔ ہ ضمیر سے مراد قرآن حکیم ہے۔ یعنی قرآن آپ کے لیے اور آپ کی قوم (۱) قریش کے لیے شرف اور بزرگی ہے یہ جملہ استمسک کے فاعل سے حال ہے امام بغوی نے کہا ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ جب حضور ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے کوئی جواب نہ دیا پھر یہ آیت نازل ہوئی اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب آپ سے سوال کیا جاتا کہ آپ کے بعد خلافت کا امر کس کے لیے ہوگا فرمایا قریش کے لیے (۱) حضرت ابن عمر سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک قریش کے دو فرد بھی باقی رہیں یہ امر قریش میں رہنا چاہیے (۲) حضرت معاویہ سے مروی ہے آپ نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ یہ امر قریش میں ہی رہے گا جو بھی ان سے اس معاملہ میں مخالفت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کرے گا مگر شرط یہ ہے کہ وہ دین پر قائم رہیں (۳) مجاہد نے کہا یہاں قوم سے مراد عرب ہیں قرآن انکے لیے شرف کا باعث ہے کیونکہ یہ انکی زبان میں نازل ہوا پھر عربوں میں سے یہ شرف انہیں میں سے خاص لوگوں کے لیے خاص ہوا وہ قریش ہیں اور قریش میں سے یہ شرف بنی ہاشم کے لیے ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت عطا فرما کر آپ کو شرف سے نوازا اور آپ کی قوم کو ہدایت سے نواز کر شرف عطا فرمایا (4)۔ قیامت کے روز آپ سے قرآن اور اس کے حقوق کے بارے میں پوچھا جائیگا یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾

"اور آپ پوچھئے ان سے جنہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے اپنے رسولوں سے کیا ہم نے بنائے ہیں خداوند رحمٰن کے علاوہ اور خدا تا کہ انکی پوجا کی جائے ۱ؔ اور ہم نے بھیجا موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف پس آپ نے (انہیں) کہا بیشک میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں ۲ؔ پس جب آپ آئے ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر تو اس وقت وہ ان سے ہنسنے لگے۔ ۳ؔ"

۱ؔ امام بغوی نے کہا جن سے یہ سوال کیا جائے گا انکے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کرائی گئی تو حضرت آدم اور آپ کی اولاد میں سے انبیاء کو اٹھایا گیا حضرت جبرئیل امین نے آذان کہی پھر آپ نے ہی اقامت کہی اور کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھئے اور ان انبیاء و رسل کو نماز پڑھائیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے سے فارغ ہوئے تو جبرئیل امین نے کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سابقہ رسولوں سے پوچھئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لیے یہی کافی ہے۔ یہ امام زہری، سعید بن جبیر اور ابن زید کا بھی قول ہے کہ معراج کی رات تمام انبیاء و رسل کو جمع کیا گیا تا کہ آپ ان سے اس بارے میں پوچھیں آپ کو کیونکہ اس بارے میں کوئی شک نہ تھا اس لیے آپ نے کوئی سوال نہ کیا (5)۔

اکثر مفسرین نے کہا اس کا معنی ہے کہ آپ پہلے رسولوں کی امتوں اور انکے علماء دین سے پوچھیں تمام روایات میں ...

عباس کا قول ذکر کیا گیا ہے جو مجاہد، قتادہ، ضحاک، سدی، حضرت حسن بصری سے مروی ہیں اسی کے اوپر حضرت ابن مسعود اور ابی بن کعب کی روایت دلالت کرتی ہے جو یہ ہے وسئل الذین ارسلنا علیھم سوال کرنے کے حکم کا مطلب قریش پر یہ ثابت کرنا تھا کہ غیر اللہ کی عبادت کے بارے میں نہ کوئی کتاب نازل ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی رسول مبعوث کیا ہے (1)۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قصہ کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے اور مشرکین مکہ جو کہتے تھے ان کا رد کیا جائے وہ یہ کہتے کہ یہ قرآن مکہ مکرمہ اور طائف کے کسی عظیم سردار پر کیوں نازل نہیں کیا گیا ساتھ ہی ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے توحید کی طرف دعوت پر استدلال کیا گیا ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہ معجزات لے آئے جو آپ کی رسالت پر دلالت کرتے تھے جیسے عصا اور ید بیضا وغیرہ جب کفار نے پہلی دفعہ ان معجزات کو دیکھا تو سوچے سمجھے بغیر ان کا مذاق اڑانے لگے لما ظرف ہے جو مابعد جملے کی طرف مضاف ہے اور مفاجات کے معنی کے ساتھ متعلق ہے جو اذا میں عامل ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لَمَّا جَاءَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا فُوجِیَ وَقْتَ کَوْ نِھِمْ یَضْحَکُوْنَ۔ فوجی کا عطف اللہ تعالیٰ کے فرمان فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پر ہے۔

وَ مَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا٘ وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۝۴۸ وَقَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ۝۴۹

"اور ہم نہیں دکھاتے تھے انہیں کوئی نشانی مگر وہ بڑی ہوتی پہلی سے اور ہم نے مبتلا کر دیا انہیں عذاب میں تا کہ وہ باز آ جائیں ۱ے اور وہ بولے اے جادوگر! دعا مانگئے ہمارے لیے اپنے رب سے بسبب اس عہد کے جو اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے ہم ضرور ہدایت قبول کریں گے ۲ے"

۱ے عذاب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی دکھاتے جیسے قحط، طوفان، ٹکڑیاں، جوئیں، مینڈک، خون وغیرہ یہ سب نشانیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر دلیل تھیں اور جو بھی نئی نشانی ظاہر ہوتی وہ پہلی سے بڑی ہوتی۔ مَا نُرِیْهِمْ والا جملہ سابقہ آیت میں منھا کی ضمیر سے حال ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ معنی کیا جائے کہ ان عذابوں میں سے ہر ایک عذاب اعجاز کے آخری حد کو پہنچا ہوا تھا جو بھی اسے دیکھتا وہ یہی گمان کرتا کہ ہر عذاب دوسرے عذاب سے بڑھ کر ہے۔ جس طرح شاعر کا قول ہے ان میں سے جسے بھی تو ملے گا تو سردار کو ملے گا جس طرح ستارے جن کی روشنی میں تو چلتا ہے، یعنی ان کا ہر آدمی سردار محسوس ہوتا ہے جس طرح ہر ستارہ دوسرے سے بڑھ کر روشنی دیتا ہے یا یہ معنی کیا جائے گا کہ نشانی اپنے اندر اعجاز کی ایک مستقل صورت رکھتی ہے جس وجہ سے وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر تھی۔ اَخَذْنٰهُمْ میں ھُمْ ضمیر سے مراد فرعون کی قوم ہے انہیں عذاب میں پکڑنے کی وجہ یہ ہے تا کہ وہ کفر سے لوٹ آئیں وَاَخَذْنٰهُمْ جملے کا عطف ولقد ارسلنا پر ہے۔

۲ے فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے جادوگر۔ ابن عامر نے ایه کی ہا کو وصل کی صورت میں مضموم پڑھا ہے

اور اپنی ہدایت کو ان کی دعاء اور عذاب کے ختم ہونے کے ساتھ معلق کر دیا لیکن اس کے باوجود آپ کو نبی کے نام سے یاد نہیں کیا بلکہ آپ کو ساحر کہا جس طرح اس سے پہلے وہ آپ کو ساحر کہتے تھے یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ کفر کے حد درجہ حریص اور انتہائی احمق تھے۔ زجاج نے کہا انہوں نے اس نام سے انہیں اس لیے بلایا کیونکہ پہلے بھی وہ آپ کو اسی نام سے یاد کرتے تھے (1) ایک قول یہ کیا گیا انہوں نے آپ کی تعظیم اور توقیر کے لیے اس نام سے یاد کیا کیونکہ ان کے نزدیک جادو عظیم علم اور پسندیدہ صفت تھی گویا انہوں نے یہ کہا اے کامل اور ماہر عالم میرے نزدیک یہ تعبیر درست نہیں کیونکہ جب انہوں نے آپ کی نبوت کا انکار کیا تھا تو انہوں نے پہلی دفعہ آپ کو اس نام سے یاد کیا تھا اور کہا تھا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۞ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ۔ انہوں نے کہا یہ واضح جادو ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا جب حق تمہارے پاس آ چکا تو تم اسے جادو کہتے ہو جبکہ جادوگر تو فوز و فلاح پانے والے نہیں۔

بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ جار مجرور ادع فعل کے متعلق ہے۔ یعنی آپ نے اپنے بارے میں جو یہ کہا کہ جب میں دعا کروں گا تو یہ عذاب ختم ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے یہ جملہ مستانفہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی التجاء پر عذاب کے خاتمے کی التجاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کو ان سے اٹھالیا۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۞ وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۞ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّ لَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۞

''پس جب ہم نے دور کر دیا ان سے عذاب تو فوراً وہ عہد شکنی کرنے لگے اور پکارا فرعون اپنی قوم میں (اور) کہنے لگا اے میری قوم! کیا میں مصر کا فرمانروا نہیں؟ اور یہ نہریں جو میرے نیچے بہہ رہی ہیں کیا تم (انہیں) دیکھ نہیں رہے؟[1] کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا[2]۔''

[1] جب عذاب فرعونیوں سے ختم ہو چکا تو فرعون نے اپنی قوم کے مجمع یا اپنی مجلس میں یہ کہا کیونکہ اسے خوف تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی مسلمان ہی نہ ہو جائے۔ انہار سے مراد نیل سے نکلنے والی چار بڑی نہریں نفیس، نہر ملک، نہر طولون، نہر رمیاط اور نہر تنیس۔ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ کا عطف مُلْكُ مِصْرَ پر ہے۔

نافع ابو عمرو اور بزی نے تحتی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی کیا یہ نہریں میرے محلات کے نیچے سے یا میرے حکم سے یا میرے سامنے باغوں سے نہیں بہتیں؟ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ یہ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ سے حال ہے یہ بھی جائز ہے کہ ہذہ اسم اشارہ موصوف ہو الانہار اس کی صفت ہو کر مبتدا اور بعد والا جملہ اسکی خبر ہو اور مبتداء و خبر مل کر حال بن رہا ہو ذلک اسم اشارہ محذوف تُبْصِرُوْنَ کا مفعول بہ ہے۔

[2] میں اس مملکت اور خوشحالی کے باعث حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہتر ہوں کیونکہ وہ ضعیف اور حقیر ہے اپنے ضعف اور قلت کی وجہ

دعا کی وجہ سے ختم ہوگئی تھی آپ نے یہ التجا کی تھی وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۙ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۔ یہاں ام منقطع ہے اور ہمزہ قد کے معنی میں ہے کیونکہ آپ کی فضیلت کے اسباب متحقق ہو چکے تھے۔ امام بغوی نے کہا ام، بل کے معنی میں ہے۔ اکثر مفسرین کی یہی رائے ہے(1) فراء نے کہا امْ پر وقف ہے اس میں کلام مضمر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی افلا تبصرون ام تبصرون(2) بعد میں نئی کلام ہے اس صورت میں امْ متصلہ ہوگا ایک قول یہ کیا گیا کہ امْ متصلہ ہے کیونکہ مسبب کو سبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے کیونکہ انا خیر کا معنی ہے تم خوب جانتے ہو کہ میں بہتر ہوں۔ بہتر ہونے کا علم دیکھنے کا سبب ہے گویا کلام یوں کی گئی اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اَمْ تُبْصِرُوْنَ فَتَعْلَمُوْنَ اَنِّیْ خَیْرٌ۔

فَلَوْ لَاۤ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ ﴿۵۶﴾

"(اگر یہ سچا نبی ہے) تو کیوں نہ اتارے گئے اس پر سونے کے کنگن یا کیوں نہ آئے اس کے ساتھ فرشتے قطار در قطار 1 یوں اس نے احمق بنا دیا اپنی قوم کو سو وہ اس کی پیروی کرنے لگے در حقیقت یہ نافرمان لوگ تھے 2 پس جب انہوں نے ہمیں ناراض کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا پھر ہم نے ان سب کو غرق کر دیا 3 اور بنا دیا انہیں پیش رو اور کہاوت پچھلوں کے لیے 4"

1 علیہ میں ضمیر سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فلو میں فاء سببیہ ہے کیونکہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو غربت اور تنگدستی کا طعن کرتا تھا یہ چیز اس کا سبب تھی کہ لوگوں کو باخبر کیا جائے کہ ان کے پاس عزت و شرف نہیں۔ حفص اور یعقوب نے اسورۃ پڑھا ہے جو سوار کی جمع ہے جبکہ باقی قراء نے اساورۃ پڑھا ہے جو جمع الجمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اصل میں اساویر ہے یا کے عوض تاء(ا)۔ رکھی گئی ہے ایک قرأت میں اس طرح پڑھا بھی گیا۔ مجاہد نے کہا مصریوں میں رواج تھا جب وہ کسی کو سردار بناتے تو اس کے ہاتھوں میں کنگن ڈالتے اور گلے میں سونے کا طوق ڈالتے اور یہ اظہار کرتے کہ اب یہ ہمارا سردار ہے اور اس کی اطاعت ہم پر لازم ہے۔ مُقْتَرِنِیْنَ یعنی پے در پے فرشتے یکے بعد دیگرے کیوں نہیں آتے جو آپ کی صداقت کی گواہی دیتے اور آپ کی مدد کرتے۔

2 استخف کا عطف نادی پر ہے۔ قومہ سے مراد قبطی لوگ ہیں، یعنی اس نے اپنی قوم کو جاہل پایا ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کو سفلی افعال اور جہالت کے کاموں پر برانگیختہ کیا جس طرح کہا جاتا ہے استخف رایه، یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اسے جہالت پر برانگیختہ کرے اور صحیح راہ سے بھٹکا دے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس نے اپنی اطاعت میں ان سے خفت اور جہالت کا مطالبہ کیا تو قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وعدہ توڑنے میں فرعون کی اطاعت کی کیونکہ قوم فاسق تھی اس لیے انہوں نے فاسق کی ہی اطاعت کی۔

3 جب انہوں نے دشمنی، نافرمانی میں زیادتی کر کے ہمیں غصے کیا جس طرح کہا جاتا ہے اسف فلان یہ اس وقت کہتے ہیں جب آدمی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 115 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 115 (التجاریہ)

سخت غصے ہو۔ لما ظرف انتقمنا کے متعلق ہے انتقمنا کا عطف اطاعوہ پر ہے اسی طرح اغرقنھم کا اس پر عطف ہے، یعنی ہم نے ان سب کو بحر نیل میں غرق کر دیا۔

ٹ حمزہ اور کسائی نے سلف کو سین اور لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا یہ سلیف کی جمع ہے جس طرح رغیف کی جمع رغف آتی ہے یہ سلف یسلف سے مشتق ہے جس کا معنی آگے ہونا ہے یا یہ سالف کی جمع ہے جسطرح صابر کی جمع صبر آتی ہے یا یہ سلَف کی جمع ہے۔ جبکہ باقی قراء نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر ہے اس کے ساتھ صفت ذکر کی گئی ہے یا یہ سالف کی جمع ہے جس طرح خادم کی جمع خدم آتی ہے ہم نے پہلے بھیجا تا کہ بعد والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ مَثَلًا کا معنی عبرت اور نصیحت ہے ایک قول یہ کیا گیا کہ معنی یہ ہے کہ اس امت کے کفار کے لیے جہنم کی طرف جانے والوں کے پیشرو بنیں اور بعد والوں کے لیے نصیحت اور عبرت بنیں۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ بعد والوں کے لیے ضرب المثل بنیں کیونکہ یہ عجیب وغریب واقعہ ہے یہ اس طرح زبان زد خاص و عام ہو۔ جس طرح ضرب المثل ہوتی ہے تو کہا جائے گا تمہاری مثال قوم فرعون کی مثال جیسی ہے واللہ اعلم۔

امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ اور طبرانی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر جس کی بھی پوجا کی جاتی ہے اس میں کوئی خیر نہیں تو قریش نے کہا کیا یہ آپ نہیں کہتے کہ حضرت عیسیٰ نبی اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہیں جبکہ انکی عبادت بھی کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا(1)۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ﴿٥٧﴾ وَقَالُوٓا ءَأٰلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ﴿٥٨﴾

"اور جب بیان کیا جاتا ہے مریم کے فرزند (عیسیٰ) کا حال تو آپ کی قوم اس سے شور وغل مچا دیتی ہے اور کہتے ہیں کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ، وہ نہیں بیان کرتے یہ مثال آپ سے مگر کج بحثی کے لیے درحقیقت یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہیں لے"

لہ ابن مردویہ اور ضیاء نے مختار میں حضرت عباس سے روایت نقل کی کہ عبداللہ بن زبعری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ اے محمد تم یہ گمان کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿٩٨﴾ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا ہے تو کہنے لگا سورج چاند فرشتوں اور حضرت عزیر کی بھی تو عبادت کی گئی ہے تو کیا یہ سب ہمارے معبودوں کے ساتھ جہنم میں ہونگے تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿١٠١﴾ (2) اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا خَصِمُوْنَ۔

اہل مدینہ اہل شام اور کسائی نے یصدون پڑھا ہے جس کا معنی ہے وہ اس سے اعراض کرتے ہیں یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اس سے رک جاتے ہیں یا لوگوں کو اس سے روکتے ہیں جبکہ باقی قراء نے صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں قراٗتوں کا معنی ایک جیسا ہے۔ کسائی نے کہا اسکی یہ دونوں لغتیں ہیں جس

ہے وہ تعجب کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا وہ جزع فزع کرتے ہیں۔ قرطبی نے کہا وہ دل کی تنگی کا اظہار کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اسکی عبادت کریں اور اسے اپنا معبود بنالیں جس طرح نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنایا تھا (1)۔

۲۔ کوفیوں نے اسے دونوں ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے ان دونوں ہمزوں کے بعد الف ساکن ہے جبکہ باقی قراء نے دوسرے ہمزے کو تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے ان دونوں کے بعد الف ہے لیکن کسی قاری نے ان دونوں ہمزوں کے درمیان الف ساکن داخل نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہتر ہیں کہ ہم انکی عبادت کریں اور انکی اطاعت کریں جبکہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں ابن زید اور سدی نے کہا ام ہو میں ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جس کی بھی عبادت کی جاتی ہے وہ سب جہنم میں ہیں تو ہم اس بات پر راضی ہیں کہ ہمارے معبود حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر اور فرشتوں کے ساتھ جہنم میں ہوں (2)۔

انہوں نے یہ مثال محض جھگڑے کے لیے بیان کی ہے حق اور باطل میں تمیز دینے کے لیے ذکر نہیں کی کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عبادت کروانا چاہتے یا اس کا مطلب ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس آیت سے مراد بت ہیں کیونکہ ما غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔

بلکہ وہ قوم سخت جھگڑالو ہے اور اس کی عادی ہے حضرت ابو امامہ سے مروی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو قوم بھی ہدایت کے بعد گمراہ ہوئی اسے جدل (حجت بازی) کا ملکہ دیا گیا تھا، یعنی پہلے وہ جھگڑتے ہیں پھر گمراہ ہو جاتے ہیں پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی (3)۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام احمد، امام ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿٥٩﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾

''نہیں ہے عیسیٰ مگر ایک بندہ ہم نے انعام فرمایا ہے ان پر اور ہم نے بنادیا ہے انہیں ایک نمونہ بنی اسرائیل کیلئے اور اگر ہم چاہتے تو ہم بسا دیتے تمہارے بدلے فرشتے زمین میں جو تمہارے جانشین ہوتے ۲۔ اور بے شک وہ ایک نشانی ہیں قیامت کیلئے پس ہرگز شک نہ کرو اس میں اور میری پیروی کیا کرو یہ سیدھا راستہ ہے ۳۔''

۱۔ هو ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندہ ہیں بیٹا نہیں۔ ہم نے اس پر نبوت اور اپنے قرب کا انعام کیا ہے اور ہم نے اسے ضرب المثل مثالی اور عبرت بنادیا ہے جس کی مدد سے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچان سکتے ہیں کہ جس طرح وہ چاہے کرسکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ کے بغیر پیدا کیا ہے۔

۲۔ یہ جملہ معترضہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بیان ہے اگر ہم چاہتے تو انسانوں میں سے فرشتے بنا دیتے یا اس کا معنی ہوگا اگر ہم

اور میری اطاعت کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے نائب ہوئے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان بے شک عجیب ہے تاہم ہم اس سے زیادہ عجیب پر قادر ہیں فرشتے تمہاری مثل ہیں کیونکہ وہ بھی تمام ممکن ہیں جس طرح انہیں ابتداءً مثال کے بغیر پیدا کرنا ممکن ہے اسی طرح انہیں ولادت کے ذریعے بھی پیدا کرنا ممکن ہے تو وہ معبود بننے کے کیسے مستحق بن سکتے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟

ہے انه میں ہ ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تشریف لانا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے جس کے ذریعے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قیامت بہت ہی قریب ہے۔ حضرت ابن عباس ابو ہریرہ اور قتادہ نے اسے یوں پڑھا ہے وانه لعلم الساعة۔ یعنی علم کو لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی نشانی علامت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی جب حضرت ابن مریم تم میں اتریں گے اور تمہارا امام تمہیں میں سے ایک فرد ہوگا اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے (1)۔

حضرت حذیفہ بن اسید غفاری سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اچانک تشریف لائے جبکہ ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے آپ نے پوچھا کس کے بارے میں باتیں کر رہے ہو؟ فرمایا ہم قیامت کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں آپ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دس نشانیاں ظاہر نہ ہوں گی۔ دخان (دھواں) دجال، دابہ (جانور) مغرب سے سورج کا طلوع ہونا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں سے اترنا، یاجوج و ماجوج کا آنا، تین جگہ زمین کا دھنسنا، ایک مشرق میں ہوگا ایک مغرب میں ہوگا اور ایک جزیرہ عرب میں ہوگا سب سے آخر میں ایک آگ ہوگی جو یمن سے نکلے گی جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہانک کر لے جائے گی (2) ایک روایت میں دسویں نشانی یہ ہے کہ ایک ہوا چلے گی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے نواس بن سمعان سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا پھر ایک طویل حدیث ذکر کی یہاں تک یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم کو بھیجے گا آپ دو زرد کپڑے پہنے اپنی ہتھیلیوں کو دو فرشتوں کے پروں پر رکھے دمشق کی مشرقی جانب سفید منارہ کے پاس اتریں گے جب آپ سر جھکائیں گے تو (پسینے کے قطرے) گریں گے جب سر اوپر اٹھائیں گے تو پھر بھی موتیوں کی طرح سفید قطرے گریں گے اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ وقت قریب ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک عادل حاکم کی حیثیت سے نازل ہونگے آپ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ ختم کر دیں گے آپ مال (پانی کی طرح) بہائیں گے یہاں تک کہ مال قبول کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اس وقت ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔ اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے (4) امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم ایک عادل حاکم کی حیثیت سے نازل ہونگے آپ صلیب کو توڑ دیں گے خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ ختم کر دیں گے آپ اونٹنیاں چھوڑ دیں گے کوئی انہیں نہیں پکڑے گا آپ باہمی بغض و عناد کو ختم کر دیں گے آپ مال دینے کے لیے لوگوں کو بلائیں گے مگر کوئی بھی اسے قبول نہ کرے گا۔

امام مسلم نے حضرت جابر سے حدیث نقل کی ہے کہ تمہارا امام کہے گا آؤ ہمیں نماز پڑھاؤ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس امت کے احترام میں فرمائیں گے تمہیں میں سے بعض بعض کے امیر ہیں (1) امام بغوی نے ذکر کیا ہے حضرت عیسیٰ السلام بیت المقدس پہنچیں گے لوگ عصر کی نماز پڑھ رہے ہوں گے امام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے پیچھے ہٹے گا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی کو آگے کھڑا کریں گے اور خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق نماز ادا کریں گے آپ خنزیر کو قتل کریں گے صلیب کو توڑ دیں گے یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو گرا دیں گے نصرانیوں کو قتل کریں گے مگر جو آپ پر ایمان لائے گا اسے قتل نہیں کریں گے (2) حضرت حسن بصری نے کہا انہ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہوگا قرآن قیامت کی نشانی ہے جو قیامت کے قائم ہونے کے بارے میں آگاہ کرتا ہے اس کے احوال اور ہولناکیوں کے بارے میں خبر دیتا ہے (3)۔

فلاتمترن میں فاء سببیہ ہے، یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے واقع ہونے کی علامت ہیں تو اس کے برپا ہونے میں شک نہ کرو۔ حضرت ابن عباس نے کہا اس کا معنی ہے تم اس کو نہ جھٹلاؤ۔ ابوعمرو نے وصل کی صورت میں واتبعون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں اس کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے، معنی یہ ہوگا میری ہدایت کی اتباع کرو یا میری شریعت کی اتباع کرو یا میرے رسول کی اتباع کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اتبعونی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ تو تقدیر کلام یہ ہوگی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ یہ کہیں کہ میری اتباع کرو اور جس امر کی طرف میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں یہی صراط مستقیم ہے جس راہ پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوگا هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ یہ اتبعونی کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٢﴾ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٦٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦٤﴾

"کہیں روک نہ دے تمہیں شیطان (اس راہ سے) بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور جب آئے عیسیٰ (علیہ السلام) روشن نشانیاں لے کر تو فرمایا میں آیا ہوں تمہارے پاس حکمت لیکر اور میں بیان کروں گا تم سے کچھ وہ بات جس میں تم اختلاف کرتے ہو پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور میری فرمانبرداری کیا کرو۔[2] یقیناً اللہ تعالیٰ وہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے پس اس کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے[3]۔"

[1] شیطان تمہیں میری اطاعت سے نہ روکے۔ اس جملے کا عطف اتبعون پر ہے شیطان کی تم سے عداوت ظاہر و باہر ہے کیونکہ اسی نے تمہیں جنت سے نکالا اور تمہیں مصیبتوں پر پیش کیا حق کی پیروی اور جنت تک پہنچنے سے تمہیں روکا۔

[2] بینات سے مراد معجزات ہیں یا انجیل کی آیات ہیں یا شریعت کے واضح احکامات ہیں۔ حکمت سے مراد علوم حقہ ہیں باء مع کے معنی میں ہے یا فعل کو متعدی بنانے کے لیے ہے لِاُبَيِّنَ لَكُمْ کا تعلق فعل محذوف کے ساتھ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے و جئتکم لابین لکم

علیہ وسلم نے فرمایا یہودی اکہتر (71) فرقوں میں تقسیم ہوئے تھے نصرانی بہتر (72 فرقوں میں تقسیم ہوئے جبکہ میری امت تہتر (73 فرقوں میں تقسیم ہوگی)(1) اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے زجاج نے کہا یہودی جن امور کے بارے میں باہم اختلاف کرتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے بارے میں ہدایت لاتے اور جن چیزوں کی انہیں ضرورت تھی انجیل کے علاوہ انہیں ہدایت عطا کی (2) فَاتَّقُوا اللّٰهَ میں فاء سببیہ ہے

کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حکمت لانا تقوی کا سبب ہے۔

؎ اس آیت میں اس امر کی وضاحت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اطاعت کا حکم دیا وہ توحید کا اعتقاد رکھنا اور شریعت کے احکام کی پیروی کرنا ہے۔ ھذا کے ساتھ عقیدہ توحید اور شریعت کے احکام کی پیروی کی طرف اشارہ ہے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کا تتمہ ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ مستأنفہ ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اطاعت کا تقاضا کرنے والی چیز یہی ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ﴿۶۵﴾ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾

”پھر اختلاف کرنے لگ گئے (ان کے) گروہ آپس میں پس ہلاکت ہے ظالموں کیلئے دردناک عذاب کے دن سے ؎ کیا یہ لوگ قیامت برپا ہونے کے منتظر ہیں کہ آجائے ان پر اچانک اور انہیں خبر تک نہ ہو۔ ؎ “

؎ احزاف کا معنی مختلف فرقے ہیں۔ اس جملے کا عطف قد جئتکم پر ہے بینھم میں ھم ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے جس طرح پہلے حدیث میں گزر چکا ہے کہ وہ بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے یا ھُم ضمیر سے مراد نصاریٰ اور یہودی ہیں جنہوں نے اپنی خواہشات کی اتباع کرتے ہوئے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور کتاب وسنت کے احکام کو چھوڑ دیا ان کے لیے ہلاکت ہے۔ فویل میں فاء سببیہ ہے ان کا باہمی اختلاف ہلاکت کا سبب بنا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت پر وہ احوال آئیں گے جو بنی اسرائیل پر گزرے کچھ فرق نہ ہوگا اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں کے ساتھ اعلانیہ بدکاری کی ہوگی تو میری امت میں سے ایسا ضرور ہوگا جو یہ فعل بد کرے گا بنی اسرائیل بہتر (72) فرقوں میں تقسیم ہوئی تھی میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی ایک کے سوا سب جہنم میں ہونگے۔ صحابہ نے عرض کی جنت میں کون ہونگے فرمایا جو اس راستہ پر ہونگے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں (3)۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت معاویہ سے روایت کی ہے بہتر فرقے جہنم میں ہونگے اور ایک جنت میں ہوگا وہ جماعت ہے۔

؎ واؤ ضمیر سے مراد قوم ہیں یا جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ قیامت کا انتظار کر رہے ہیں اَنْ تَاْتِیَهُمْ، الساعۃ سے بدل ہے، یعنی قیامت ضرور آکر رہے گی وہ اچانک آجائے گی جبکہ انہیں احساس بھی نہ ہوگا، یعنی وہ دنیا میں مشغول ہونے کی وجہ سے قیامت سے بالکل غافل ہونگے نیز وہ قیامت کا انکار بھی کرتے تھے۔ وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ والا جملہ ینظرون کے فاعل سے حال ہے یا تاتیھم کے مفعول سے حال ہے۔

عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَ لَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾

''گہرے دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے بجز ان کے جو متقی (اور پرہیز گار) ہیں ۱؎ اے میرے (پیارے) بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم (آج) غمزدہ ہو گے ۲؎ (یعنی) وہ بندے جو ایمان لے آئے تھے ہماری آیتوں پر اور فرمانبردار تھے ۳؎ (حکم ہوگا) داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں خوشی خوشی ۴؎''

۱؎ امام بغوی نے حضرت علی شیر خدا سے روایت کی ہے فرمایا اس آیت میں دو دو دوستوں کا ذکر ہے دو دوست مؤمن ہیں اور دو دوست کافر ہیں۔ مؤمنوں میں سے ایک فوت ہو جاتا ہے تو وہ عرض کرتا ہے اے میرے رب! فلاں مجھے تیری اور تیرے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا تھا وہ مجھے بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا تھا اور مجھے بتاتا کہ میری تجھ سے ملاقات ہوگی اے اللہ! میرے بعد اسے گمراہ نہ کر دینا جس طرح تو نے مجھے ہدایت دی ہے اسے بھی ہدایت دینا جس طرح تو نے مجھے عزتوں سے نوازا ہے اسے بھی عزتوں سے نوازنا۔ جب اس کا مومن ساتھی فوت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جمع کر دیتا ہے انھیں فرماتا ہے تم دونوں میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کی تعریف کرے اور وہ کتنا اچھا بھائی ہے کتنا اچھا دوست ہے کتنا اچھا ساتھی ہے۔ حضرت علی نے کہا ایک کافر فوت ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے اے میرے رب! فلاں مجھے تیری اطاعت اور تیرے رسول کی اطاعت سے منع کرتا تھا مجھے برائی کا حکم دیتا تھا مجھے بھلائی سے روکتا مجھے بتاتا کہ میری تجھ سے ملاقات نہ ہوگی تو وہ کہے گا وہ کتنا برا بھائی ہے کتنا برا دوست ہے اور کتنا برا ساتھی ہے (1)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا میری وجہ سے باہم محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ مجھے اپنے جلال کی قسم میں انھیں آج اپنے خاص سائے میں جگہ عطا کروں گا آج میرے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دو آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر باہم محبت کریں ان میں سے ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان دونوں کو ضرور جمع فرمائے گا اور کہے گا تو اس سے میری وجہ سے محبت کرتا تھا (3) اسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے واللہ اعلم۔

۲؎ قول کے مقدر ماننے کے ساتھ یہ ایک اور جملہ مستانفہ ہے تقدیر کلام یہ ہے یقول الله للمتحابین المتقین یومئذ یا عباد۔ امام بخاری نے معتمر بن سلیمان سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ میں نے سنا کہ جس آدمی کو بھی قیامت کے روز اٹھایا جائے گا تو وہ گھبرایا ہوا ہوگا ایک منادی کرنے والا یہ ندا کرے گا اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ ہی تم غمگین ہو گے۔ لوگوں میں کچھ امید پیدا ہوگی اور اس کے پیچھے چل پڑیں گے (4)۔

۳؎ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ منادی کی صفت ہے، یعنی جو لوگ ہماری آیات پر ایمان لائے تھے انہیں کوئی خوف نہیں در آنحالیکہ وہ مسلمان تھے وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ یہ اٰمَنُوْا کے فاعل سے حال ہے، معنی یہ ہوگا جو اخلاص کے ساتھ ایمان لائے۔ اس جملہ نے پہلے کلام کی ہی تاکید بیان کی

ہے تو پھر مسلمانوں کے علاوہ تمام لوگ مایوس ہو جائیں گے۔

ؔ تم اور تمہاری مسلمان بیویاں خوشی خوشی جنت میں داخل ہو جائیں اور خوشی کے آثار تمہارے چہروں سے ظاہر ہونے چاہئیں یا تو آراستہ پیراستہ ہو کر جنت میں داخل ہو یہ حبور سے مشتق ہے جس کا معنی اچھی شکل وصورت ہے یا اس کا معنی ہے پورے عزت واحترام کے ساتھ تم اور تمہاری بیویاں جنت میں داخل ہو جائیں۔ یہ جملہ بھی منادی کو خطاب ہے۔ انتم مبتداء ہے اور ازواجکم اس کا معطوف علیہ ہے اور تحبرون اس کی خبر ہے یہ بھی جائز ہے کہ انتم ضمیر منفصل ضمیر متصل کی تاکید ہو جو ادخلوا فعل میں ہے ازواجکم ضمیر متصل پر معطوف ہو اور تحبرون والا جملہ معطوف معطوف علیہ سے حال ہو۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّ اَكْوَابٍ ۚ وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَ اَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾

”گردش میں ہوں گے ان پر سونے کے تھال اور جام اور وہاں ہر چیز موجود ہوگی جسے دل پسند کریں اور آنکھوں کو لذت ملے (مزید براں) تم وہاں ہمیشہ رہو گے [1] اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنا دیئے گئے ہو ان اعمال کے باعث جو تم کیا کرتے تھے [2] تمہارے لیے یہاں بکثرت پھل ہیں ان میں سے کھاؤ گے (جو جی چاہے) [3]“

[1] ان جنتیوں پر ایسے بچے گردش کر رہے ہونگے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے۔ صحاف صحفہ کی جمع ہے اس کا معنی بڑا پیالہ ہے۔ اَکْوَاب کوب کی جمع ہے یہ گول سرے والا گول برتن ہے جس کی سنت نہیں ہوتی یہ ایک اور جملہ مستانفہ ہے اس میں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔ وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ کا عطف یطاف پر ہے مدینہ اور شام کے قراء نیز حفص نے تَشْتَهِيْهِ پڑھا ہے انکے مصاحف میں بھی قرأت اسی طرح ہے جبکہ باقی قراء نے مفعول کی ضمیر کو حذف کیا ہے ہر کسی کے لیے وہ کچھ ہوگا جو اس کا نفس خواہش کرے گا تاہم صوفی کی خواہش تو بلا حجاب وصال ہے جس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی اور دائمی دیدار ہے تو اس کے لیے ہی نعمت میسر ہوگی۔ باقی دوسرے جنتیوں کے لیے جنت کی دوسری نعمتیں ہونگی جن کی وہ خواہش کرے گا۔ امام بغوی نے عبدالرحمٰن بن سابط سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کیا جنت میں گھوڑے ہونگے؟ کیونکہ مجھے تو گھوڑے پسند ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں داخل کرے گا تو تو سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہوگا۔ تو جنت میں جہاں چاہے گا وہ تجھے لے کر اڑتا رہے گا۔ ایک اعرابی نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا جنت میں اونٹ ہوگا؟ کیونکہ مجھے اونٹ پسند ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اعرابی! اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے جنت میں داخل فرمایا تو تو وہاں جو خواہش کرے گا تو اسے پالے گا اور تیری آنکھ اس سے لطف اندوز ہوگی (1) امام ترمذی اور بیہقی نے بردہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ طبرانی اور بیہقی نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن بن ساعدہ سے اور ترمذی نے ابوایوب سے گھوڑے کا ذکر نقل کیا ہے۔ وَ اَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ میں غائب کے صیغوں سے خطاب کے صیغوں کی طرف التفات ہے۔

موصول اس کی خبر ہے اور جملہ ادخلوا کے فاعل سے حال ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر جہنمی کو حسرت دلانے کے لیے جنت میں اس کے ٹھکانے کو دکھایا جائے گا تو وہ یہ کہے گا اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت عطا کرتا تو میں بھی متقین میں سے ہوتا۔ ہر جنتی کو بھی جہنم میں اس کا ممکنہ ٹھکانہ دکھایا جائے گا تو وہ کہے گا اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت یافتہ نہ ہوتے۔ یہ کلام بطور شکر کرے گا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر ایک کے لیے جنت اور جہنم میں ٹھکانہ ہے مؤمن جنت میں کافر کے ٹھکانہ کا وارث بن جائے گا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ(1)۔

۳؎ یہ جملہ ظرفیہ حال ہے۔ بزار اور طبرانی نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے جنتی کوئی پھل نہیں لے گا مگر اس کی جگہ اس کی مثل پیدا کر دیا جائے گا بزار نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم کو جنت سے نکالا تو انھیں زادراہ کے طور پر جنت کا پھل عطا کیا ہر چیز کی تعریف کی تعلیم دی تمہارے یہ پھل جنت کے پھل ہی ہیں فرق یہ ہے یہ خراب ہو جاتے ہیں اور وہ خراب نہیں ہوتے(2)۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ وہ شام میں تھے تو لوگوں نے جنت کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا جنت کے انگور کا گچھا یہاں سے صنعا تک ہوگا(3) ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جنت کے پھل کی لمبائی بارہ ہاتھ ہوگی اس میں گٹھلی نہ ہوگی۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾

''بے شک مجرم عذاب جہنم میں ہمیشہ رہیں گے ۱؎ نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے (یہ عذاب) اور وہ اس میں آس توڑ بیٹھیں گے ۲؎ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن وہ (اپنی جانوں پر) ظلم ڈھانے والے تھے اور وہ پکاریں گے اے مالک بہتر ہے کہ تمھارا رب ہمارا خاتمہ ہی کر ڈالے وہ جواب دے گا کہ تمہیں تو یہاں ہمیشہ (جلتے) رہنا ہے ۳؎۔''

۱؎ یہاں مجرمین سے مراد کامل مجرم ہیں، یعنی کافر کیونکہ یہاں انہیں مؤمنوں کے مقابل ذکر کیا گیا ہے۔ یہ جملہ اور بعد والا جملہ، جملہ مستانفہ ہیں۔

۲؎ ان سے عذاب میں کوئی تخفیف نہ کی جائے گی یہ فترت عنه الحمى۔ سے مشتق ہے یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب بخار میں تخفیف ہو۔ وہ اس عذاب میں اس طرح رہیں گے کہ انہیں اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی امید نہ ہوگی۔

۳؎ نادوا کا عطف انّ کی خبر پر ہے۔ مالک جہنم کے داروغے کا نام ہے۔ جہنمی مالک کو ندا کرتے ہوئے عرض کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں موت عطا کر دے تا کہ ہم آرام پائیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یا مالک ہزار سال کے بعد کہے گا تم نے عذاب میں یہاں ہی رہنا ہے

اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے ہزار سال تک انہیں کوئی جواب نہ دیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ یا مالک، جہنم کا داروغہ انہیں جواب دے گا اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ۔ ہناد، طبرانی، ابن ربی، حاتم، حاکم، بیہقی، عبداللہ بن احمد نے زوائد زہد میں عبداللہ بن عمرو بن عاص سے نقل کیا ہے جبکہ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ جہنمی مالک کو ندا کریں گے اور کہیں گے اے مالک! اللہ تعالیٰ ہمیں موت دے دے وہ چالیس سال تک انہیں یوں ہی چھوڑے رہے گا کوئی جواب نہ دے گا پھر انہیں یہ جواب دے گا اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ پھر وہ اپنے رب کو ندا کریں گے رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿106﴾ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿107﴾ اے ہمارے رب ہم پر بدبختی غالب آگئی ہم گمراہ قوم تھے اے ہمارے رب ہمیں اس سے نکال اگر ہم دوبارہ ایسے کام کریں تو ہم ظالم ہونگے۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک عرصہ تک کوئی جواب نہ دے گا جتنا عرصہ دنیا کے دو زمانوں کے برابر کو محیط ہوگا پھر اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا **اخسئوا فیھا و لا تکلمون** اس کے بعد جہنمی کوئی بات نہ کریں گے وہاں جہنم کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ ہوگی(1)۔

سعید بن منصور اور بیہقی نے محمد بن کعب سے نقل کیا ہے کہ جہنمی پانچ دفعہ ندا کریں گے اللہ تعالیٰ چار دفعہ انہیں جواب دے گا جب پانچویں دفعہ وہ ندا کریں گے تو اس کے بعد کبھی بھی کلام نہ کریں گے وہ عرض کریں گے۔ تو نے ہمیں دو دفعہ زندہ کیا اور دو دفعہ ہمیں موت عطا کی ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا ہے۔ کیا اس جہنم سے نکلنے کی کوئی راہ ہے؟ تو انہیں یہ جواب دیا جائے گا جب اللہ وحدہ لا شریک کی طرف تمہیں دعوت دی گئی تو تم نے کفر کیا اگر اس کے ساتھ شرک کیا جاتا تھا تو تم اسے مان لیتے تھے آج فیصلہ اللہ تعالیٰ کا ہوگا پھر وہ کہتے اے ہمارے رب ہم نے دیکھا ہم نے سنا ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج ہم اچھے اعمال کریں ہم یقین رکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے اب اس کا مزہ چکھو ہم تمہیں بھول چکے ہیں جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس کے بدلے میں دائمی عذاب چکھو۔ پھر وہ کہتے اے ہمارے رب! تھوڑی مدت تک ہمیں مہلت دو ہم تیری دعوت کو قبول کریں گے ہم تیرے رسولوں کی اتباع کریں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا کیا تم نے اس سے قبل قسم نہیں اٹھائی تھی پھر وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہمیں اس سے نکال ہم اچھے اعمال کریں گے جو اس عمل سے مختلف ہوگا جو ہم پہلے عمل کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا کیا ہم نے تمہیں مہلت نہیں دی تھی اس میں نصیحت حاصل کرتا تھا جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا تھا اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا پس چکھو اب ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ پھر وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم پر بدبختی غالب آگئی تھی اور ہم ظالم قوم تھے اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا اس میں ذلیل و رسوا ہو کوئی بات نہ کرنا اس کے بعد وہ کوئی بات نہ کریں گے۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿78﴾ اَمْ اَبْرَمُوْۤا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿79﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَ رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿80﴾

”بے شک ہم لے آئے تمہارے پاس (دین) حق لیکن تم میں سے اکثر حق سے نفرت کرنے والے تھے[1] ہاں اگر انہوں نے کوئی قطعی فیصلہ کرلیا ہے تو ہم بھی اپنا قطعی فیصلہ کرنے والے ہیں

1؎ اگر سابقہ جملہ میں قال میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو یہ جواب کا تتمہ ہے۔ اگر قال کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے نہ ہو تو یہ آیت جواب ہوگا گویا فرشتوں کے جواب کے بعد اللہ تعالیٰ نے انکے جواب سے اعراض فرمایا، یعنی ہم نے رسولوں کو مبعوث کر کے اور کتابیں نازل کر کے حق تمھارے پاس بھیجا لیکن تم حق کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ اس میں نفس کے خلاف احکام ہیں۔

2؎ ام منقطعہ ہے اور یہ انکار اور اضراب کے معنی میں ہے، یعنی وہ حق کو ناپسند کرتے ہیں اور اس میں ترقی کر رہے ہیں، یعنی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکر کرنے اور حق کو جھٹلانے میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ وہ صرف ناپسندیدگی پر اکتفاء نہیں کرتے اس لیے ہم بھی انہیں جزاء دینے میں محکم ہیں۔

ابن جریر نے محمد بن قرظی سے روایت نقل کی ہے تین آدمی کعبہ شریف اور اس کے پردہ کے درمیان تھے ان میں سے دو قریش اور ایک ثقفی تھا یا دو ثقفی اور ایک قریشی تھا ان میں سے ایک نے کہا تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ ہماری باتیں سنتا ہے دوسرے نے کہا جب تم بلند آواز سے باتیں کرتے ہو تو وہ سنتا ہے جب تم رازدارانہ انداز میں بات کرتے تو نہیں سنتا تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

3؎ ام منقطعہ ہے جو انکار اور اضراب کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہوگا بلکہ کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انکی رازدارانہ باتیں اور سرگوشیاں نہیں سنتے کیوں نہیں ہم انہیں سنتے ہیں اور کراماً کاتبین سب کچھ لکھ رہے ہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَأَنَا أَوَّلُ الْعٰبِدِينَ ﴿٨١﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿٨٢﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿٨٣﴾

"آپ فرمائیے (بفرض محال) اگر رحمٰن کا کوئی بچہ ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کا پجاری ہوتا 1؎ پاک ہے آسمانوں اور زمین کا پروردگار (اور) عرش کا رب ہر اس عیب سے جو یہ بیان کرتے ہیں 2؎ پس (اے حبیب) آپ رہنے دیں انہیں کہ بے ہودہ باتیں بناتے رہیں۔ اور کھیل (تماشہ) کرتے رہیں حتیٰ کہ ملاقات ہو جائے ان کی اپنے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے 3؎"

1؎ حمزہ اور کسائی نے واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اے محبوب کہو اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ اور جو چیز اس کے شایاں شان ہے اور جو اس کے شایان نہیں سب کچھ دوسروں کے بنسبت زیادہ جانتے ہیں اور جس کی تعظیم بجالانا واجب ہے اس کی ضرور تعظیم بجالاتے جو والد کی تعظیم بجالاتا ہے وہ بیٹے کی تعظیم بھی ضرور بجالاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و نے فرمایا فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جو اسے تکلیف دیتا ہے وہ مجھے تکلیف دیتا ہے ایک روایت میں ہے جس نے اسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا(2) امام بخاری نے اسے مسور سے روایت کیا ہے اس آیت کریمہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا جائز ہے یا اس کی عبادت کرنا جائز ہے کیونکہ محال چیز محال کو ہی مستلزم ہوتی ہے بلکہ

کا مقصود یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے ہونے کا انکار کسی عناد کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ اگر اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے پہلے اور اکمل انداز میں اعتراف کرتے۔ سدی نے یہی بات کہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے جس طرح تم گمان کرتے ہو (تو ہوا کرے) میں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا ہوں اور اس کی توحید کا اقرار کرنے والا ہوں، یعنی میں اس طرح کی بات کرنے والا نہیں جس طرح تم گمان کرتے ہو ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے میں تمہارے قول کا سب سے پہلے منکر ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے میں سب سے پہلا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے غضبناک ہوا، یعنی جب کوئی یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے تو میں سب سے زیادہ اس سے نفرت کرنے والا ہوں۔ قاموس میں ہے عبد کا لفظ جب باء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی غصہ، سخت جنگ، شرمندگی، نفس کی ملامت، لالچ اور انکار ہے جب عبد باء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو پھر بھی اس کا معنی یہی ہے۔ یہاں مناسب یہ ہے کہ اس کا معنی غضب اور انکار ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا نہیں میں سب سے پہلے اس کی شہادت دیتا ہوں اس سے پتہ یہ چلا کہ یہاں ان نافیہ ہے شرطیہ نہیں (1)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے جو کفار مکہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے جب آسمان، زمین اور عرش جو طویل عرصہ تک باقی رہنے والے ہیں جب ان چیزوں سے پاک ہیں جن سے دوسرے اجسام متصف ہیں تو انکے خالق کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟

۳۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہیں چھوڑ دو کہ وہ باطل اعتقادات میں بھٹکتے رہیں اور دنیاوی زندگی میں کھیل کود میں ہی لگے رہیں یہاں تک کہ قیامت کے روز وہ عذاب کو دیکھیں اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ ان کا قول سراپا جہالت اور خواہش نفس کی اتباع ہے اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ انکے دلوں پر مہر لگا دی گئی انہیں آخرت میں عذاب دیا جائے گا۔

وَ هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۴﴾ وَ تَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۚ وَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَ لَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَ قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

''اور وہی ایک آسمان میں خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے اور وہی بہت دانا، سب کچھ جاننے والا ہے۱۔ اور بڑی برکت والا ہے وہ جس کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور اسی کے پاس ہے قیامت کا علم اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۲۔ اور نہیں اختیار رکھتے جنہیں یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں شفاعت کرنے کا ہاں شفاعت کا حق انہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اس کو) جانتے بھی ہیں ۳۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں

اے میرے رب یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے ۵ پس (اے حبیب) رخ انور پھیر لیجئے ان سے اور فرمائیے تم سلامت رہو وہ (اس کا انجام) ضرور جان لیں گے ۶۔''

۱۔ قتادہ نے کہا آیت کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی زمین و آسمان میں معبود ہے اس کے سوا کوئی ایسی ذات نہیں جو مستحق عبادت ہو (1) فِی السَّمَآءِ اور فِی الْاَرْضِ الٰہ کے متعلق ہے کیونکہ یہ معبود کے معنی میں ہے۔ یا معبود کے معنی کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے جس طرح تیرا قول ہے هو حاتم في البلد یہاں جار مجرور حاتم کے متعلق ہے حالانکہ یہ اسم مشتق نہیں بلکہ اسم مشتق کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی مخلوقات میں تدبیر فرمانے کی وجہ سے حکیم ہے اور انکے مصالح کو جاننے کی وجہ سے علیم ہے۔ یہ دونوں صفات اس کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہیں۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو سابقہ کلام کی تاکید بیان کرتا ہے اسی طرح جو جملے اس پر معطوف ہیں ان میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔

۲۔ زمین و آسمان اور اس کے درمیان فضاء کی بادشاہت اس کے پاس ہے۔ قیامت کے واقع ہونے کا علم صرف اسی کے پاس ہے اور جزاء کے لیے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے یرجعون پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے مخاطب کا صیغہ ہے۔

۳۔ کفار اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے جس طرح کفار یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے ہاں شفیع ہیں مگر وہی شفاعت کرنے کا حق رکھے گا جو لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دے گا۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستثنیٰ متصل ہے۔ من شهد سے مراد ملائکہ ہیں۔ انہیں سابقہ حکم سے الگ اس لیے کیا گیا کیونکہ کچھ کافر فرشتوں کی عبادت کرتے تھے اور کہتے یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں جو کچھ وہ اپنی زبانوں سے کہتے تھے وہ اپنے دل سے اس کا اعتقاد بھی رکھتے تھے۔

۴۔ وہ کفار جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ دوسری چیزوں کی عبادت کرتے ہیں اگر کوئی ان سے پوچھے انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یہی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ مخلوقات کو جمادات کی طرف منسوب کرنا ممنوع ہے۔ جب وہ اس کا اعتراف کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی انکی خالق ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کس کی عبادت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۵۔ عاصم اور حمزہ نے قیلہ کو لام کے جر اور ہاء کو مکسور پڑھا ہے اس کا عطف الساعة پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس قیامت کا علم اور اس قول کا علم ہے جبکہ باقی قراء نے لام کو منصوب اور ہاء کو مضموم پڑھا ہے۔ اس کا عطف الساعة کے محل پر ہے یا اس کا فعل مضمر ہے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی بارگاہ میں شکایت کرتے ہوئے عرض کی اے میرے رب! کفار مکہ ایسی قوم ہیں جو ایمان نہیں لائیں گے۔

۶۔ اے محبوب مکرم! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دعوت دینا چھوڑ دیں کیونکہ آپ ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو چکے ہیں اور فرما دیجئے ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق نہیں تم ہم سے سلامت ہو اور ہمیں بھی سلامتی سے رہنے دو۔ عنقریب انہیں اپنے عقائد، اقوال اور اعمال کی جزاء کا علم ہو جائے گا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے مدینہ اور شام کے قراء نے خطاب کے صیغہ کے طور پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ مقاتل نے کہا اس آیت کے حکم کو جہاد والی آیت نے

سورۃ الدخان

آیاتها ۵۹ | سُوْرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ ۴۴ | رکوعاتها ۳

سورۃ الدخان مدنی ہے، اس میں انسٹھ آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۚ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ ﴿۲﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾

"حامیم حق کو واضح کرنیوالی کتاب کی قسم [1] بے شک ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں ہماری یہ شان ہے کہ ہم بروقت خبردار کر دیا کرتے ہیں [2]۔"

[1] کتاب مبین۔ سے مراد قرآن حکیم ہے اسکی مبین صفت اس لیے ذکر کی کیونکہ یہ حلال و حرام کے احکام کو ظاہر کرنے والا ہے اگر حم کی قسم اٹھائی گئی تو پھر واو عاطفہ ہوگی اور اگر اس کی قسم نہ اٹھائی گئی ہوتو پھر یہ واو قسمیہ ہوگی اور مابعد اس کا جواب قسم ہے۔

[2] اَنْزَلْنٰهُ میں ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ اسے برکت والی رات اس لیے کہا کیونکہ اس میں قرآن نازل ہوا جو دینی اور دنیاوی منافع کا سبب ہے۔ اسی میں فرشتے، رحمت نازل ہوتی ہے اور دعا کی قبولیت ہوتی ہے اس رات سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر میں قرآن کو ام الکتاب سے آسمان دنیا پر نازل فرمایا پھر جبرئیل امین بیس سال (۱) تک آیات کی صورت میں نازل کرتے رہے (1) جو یہ قول کیا گیا کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد نصف شعبان کی رات ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **شهر رمضان الذی انزل فیه القران** اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ اور قاسم بن محمد سے جو روایت مروی ہے جسے وہ اپنے باپ یا چچا سے روایت کرتے ہیں پھر دادا سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شعبان کی نصف رات کو آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور ہر انسان کو بخش دیتا ہے مگر ایسے انسان کو نہیں بخشتا جس کے دل میں کینہ ہو۔

یا وہ مشرک ہو۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے (2) اور کہا اس روایت میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ قرآن حکیم پندرہ شعبان کی رات کو نازل ہوا۔

فرمایا ہم قرآن حکیم میں سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ یہ جملہ متانفہ ہے یا یہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ سے بدل اشتمال ہے۔

فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۙ ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۵﴾ رَحْمَةً

مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُۙ۝۶ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَاۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ۝۷

''اسی رات میں فیصلہ کیا جاتا ہے ہر اہم کام کا۱؎ ہر حکم ہماری جناب سے صادر ہوتا ہے ہم ہی (کتاب و رسول) بھیجنے والے ہیں ۲؎ سراپا رحمت آپ کے رب کی طرف سے بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۳؎ وہ جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم ایمان دار ہو ۴؎۔''

۱؎ اس رات ہر اہم فیصلہ کیا جاتا ہے یا ایسا فیصلہ کیا جاتا ہے جس میں حکمت ہوتی ہے اَمْرٍ حَكِیْمٍ میں اسناد مجازی ہے یعنی تقدیر کلام یوں ہے امر حکیم صاحبہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یا لیلۃ کی دوسری صفت ہے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ محکم امور کا اس میں فیصلہ ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس میں قرآن حکیم نازل ہو جو سب سے عظیم امر ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس کا فرمان ہے کہ لیلۃ القدر کی رات ام الکتاب سے وہ تمام چیزیں لکھ لی جاتی ہیں جو اگلے سال وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہے جیسے اچھائی، برائی، رزق، موت یہاں تک کہ یہ بھی لکھ لیا جاتا ہے کہ فلاں حج کرے گا(1)۔

حضرت حسن بصری، مجاہد اور قتادہ نے کہا رمضان شریف میں لیلۃ القدر کی رات موت، عمل، پیدائش، رزق اور اس سال وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو لکھ لیا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا لیلۃ مبارکۃ سے مراد شعبان کی نصف رات ہے جس میں سال کے امور کو لکھ لیا جاتا ہے۔ زندوں سے جنہیں موت نے آنا ہوتا ہے انہیں لکھ لیا جاتا ہے نہ ان میں اضافہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان میں کمی کی جاتی ہے(2)۔ امام بغوی نے محمد بن میسرہ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شعبان سے دوسرے شعبان تک مرنے والے افراد کو لکھ لیا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک آدمی نکاح کرتا ہے اس کا بچہ ہوتا ہے جبکہ اس کا نام مردوں میں ہوتا ہے(3)۔ ابوالضحیٰ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کو فیصلے فرماتا ہے اور لیلۃ القدر کو فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے(4)۔

۲؎ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا۔ سے مراد ہے کہ ایسا امر جو ہماری طرف سے حاصل ہوتا ہے اور وہ ہماری حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ مِّنْ عِنْدِنَا کی صفت کی وجہ سے امر کی عظمت کا بیان ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کل امر سے حال ہو یا حکیم میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہو یہ بھی جائز ہے کہ یہ یفرق کا مفعول بہ ہو اور كُلُّ اَمْرٍ سے بدل ہو۔ یہ بھی جائز ہے امر سے مراد اصطلاحی معنی ہو جس میں اپنے آپ کو بدتر جانتے ہوئے فعل کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس صورت میں یہ یفرق کا مفعول مطلق ہوگا یا اپنے مضمر فعل کا مفعول مطلق ہوگا یا انزلنٰہ میں جو دو ضمیریں ہیں ان میں سے ایک سے حال ہے اگر فاعل سے حال ہو تو امرین کے معنی میں ہوگا اگر مفعول بہ سے حال ہو تو مامور بہ کے معنی میں ہوگا۔ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ یہ جملہ انا کنا منذرین سے بدل ہے اور مرسلین سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے پہلے رسول مراد ہیں، یعنی ہم نے قرآن کو نازل کیا کیونکہ ہمارا طریقہ ہے کہ ہم لوگوں کو خبردار کرتے ہیں اور کتابوں کے ساتھ رسولوں کو بندوں کی طرف بھیجتے ہیں۔

۳؎ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ارسال یا تفریق فعل کا مفعول لہ ہے یا یہ مرسلین کا مفعول بہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ کا

ذکر کیا مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ یہ ربوبیت کا تقاضا ہے فرمایا اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال سنتا ہے اور ان کے احوال جانتا ہے۔ اس آیت اور مابعد آیت میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ثبوت ہے۔ جس میں یہ صفات ہوں وہی رب ہونے کا مستحق ہے۔

[۳] اہل کوفہ نے رب کو جر کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ربک سے بدل ہے جبکہ باقی قراء نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ان کی دوسری خبر ہے۔ یا یہ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ کی صفت ہے یا مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ شرط ہے جس کی جزاء محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر تم علم میں یقین رکھتے ہو یا اگر تم اپنے اقرار میں یقین رکھتے ہو تم سے یہ پوچھا گیا تھا کہ اس کائنات کو کس نے پیدا کیا؟ تو تم نے کہا تھا اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تو تم نے جان لیا کہ بات تو اسی طرح ہے جس طرح ہم نے کہا تھا یا معنی یہ ہے کہ اگر تم یقین کا ارادہ رکھتے ہو تو اس کا یقین کر لو یا اگر تمہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کا رب ہے تو یقین کر لو کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۸ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝۹ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۰ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۱

”نہیں کوئی معبود بجز اس کے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی رب ہے [۱] بلکہ وہ شک میں پڑے کھیل رہے ہیں [۲] پس آپ انتظار کریں اس دن کا جب ظاہر ہو گا آسمان پر صاف نظر آنے والا دھواں جو چھا جائے گا لوگوں پر یہ دردناک عذاب ہو گا [۳]۔“

[۱] اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی مستحق عبادت نہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی خالق نہیں۔ یہ جملہ بھی رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے معنی کی وضاحت کر رہا ہے۔ یا یہ اِنّ کی دوسری خبر ہے۔ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ یہ اِنّ کی ایک اور خبر ہے، یعنی جس طرح تم مشاہدہ کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے یا یہ ھو سے حال ہے۔ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمْ یہ ان کی ایک اور خبر ہے یا یہ ھو سے بدل ہے۔

[۲] بل اضراب کے معنی میں ہے بلکہ وہ دوبارہ اٹھانے یا قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ یلعبون یہ ظرف میں موجود ضمیر سے حال ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم وہ قرآن اور آپ کا مذاق اڑاتے ہیں اس میں غائب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔

[۳] یہاں فاء سببیہ ہے یوم، ارتقب کا مفعول بہ ہے اس دھوئیں کے بارے میں اختلاف ہے حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ ابن جریر، ثعلبی اور بغوی نے حضرت حذیفہ کی حدیث سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی پہلی نشانیوں میں سے دھواں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور آگ ہوگی جو عدن کی غار سے نکلے گی جو لوگوں کو میدان محشر کی طرف ہانکے گی جب لوگ قیلولہ کریں گے تو آگ بھی ٹھہر جائے گی۔ حضرت حذیفہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ دخان کیا چیز ہے تو آپ نے یہ آیت تلاوت کی فرمایا دھواں مشرق و مغرب کو بھر دے گا۔ وہ

گا دھواں اس کے نتھنوں کانوں اور دبر سے نکل رہا ہو گا(1)۔ طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ ابو مالک اشعری سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے رب نے تمہیں تین چیزوں سے ڈرایا ہے۔ دھواں جس سے مومن کو زکام لگ جائے گا کافر اس دھواں سے پھول جائے گا دوسرا دابہ اور تیسرا دجال اس روایت کی کئی شواہد بھی ہیں۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ﴿١٢﴾ أَنَّىٰ لَهُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿١٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ﴿١٤﴾ إِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلًا ۚ إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿١٥﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ ﴿١٦﴾

''(اس وقت کہیں گے) اے ہمارے رب دور کر دے ہم سے یہ عذاب ہم (ابھی) ایمان لاتے ہیں[1] ان کے نصیحت قبول کرنے کی امید کہاں حالانکہ ان کے پاس تشریف لے آیا روشن رسول۔[2] پھر انہوں نے منہ پھیر لیا تھا اس سے اور کہا سکھایا ہوا ہے دیوانہ ہے[3] ہم دور کرنے والے ہیں عذاب کو قلیل عرصہ کے لئے تم پھر کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے[4] جس روز ہم انہیں پوری شدت سے پکڑیں گے (اس روز) ہم (ان سے) بدلہ لے لیں گے[5]''

[1] اس جملہ سے پہلے قول مقدر ہے اور یہ جملہ مقولہ ہے اور پھر حال بن رہا ہے إِنَّا مُؤْمِنُونَ اگر عذاب دور ہو جائے تو یہ ان کی طرف سے ایمان لانے کا وعدہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یقول الکافرون من الناس ھذا القول۔ لوگوں میں سے کافر یہ قول کریں گے۔

[2] اس میں کلمہ استفہام انکار کے معنی میں ہے، یعنی اس حالت میں ان کے لئے نصیحت کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ ھل یتذکرون یعنی کیا وہ نصیحت حاصل کریں گے؟ وَقَدْ جَاءَهُمْ میں واؤ حالیہ ہے اور وہ جملہ حال بن رہا ہے۔ یعنی اس حال میں کہ ان کے پاس شان والا رسول آیا تھا جس کی دلیل واضح تھی اور وہ ان کے لئے ایسی آیات اور معجزات ظاہر کرنے والا تھا جو اس نصیحت کو واجب کرنے والے تھے۔

[3] انہوں نے آپ سے اعراض کیا اور کہا انہیں سکھایا گیا، سکھانے والا ایک عجمی غلام ہے جو بنو ثقیف کے ایک آدمی کا ہے۔ بعض نے کہا یہ مجنون ہے۔

[4] یہ کلام ان کے قول رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ کا جواب ہے، یعنی ہم چالیس روز تک تم سے عذاب کو دور کرنے والے ہیں قَلِيلًا یا تو مفعول مطلق ہے مفعول فیہ کی صورت میں منصوب۔ اس سے مراد ان کی باقی ماندہ عمریں ہیں یا دنیا کی باقی ماندہ عمر ہے إِنَّكُمْ عَائِدُونَ یہ كَاشِفُو الْعَذَابِ کی علت ہے۔

[5] یوم سے مراد یوم قیامت ہے یہ ظرف اس فعل کے متعلق ہے جس پر مُنتَقِمُونَ دلالت کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس تفسیر کا انکار کیا۔ امام بغوی نے ابو الضحیٰ سے انہوں نے مسروق سے روایت کیا ہے فرمایا ایک آدمی کندہ کے محلہ میں بیان کر رہا تھا کہ قیامت کے روز ایک دھواں ہو گا جو منافقوں کے کانوں اور آنکھوں کو ناکارہ بنا دے گا اور مومنوں کو اس قدر تکلیف ہو گی جیسے زکام لگ [illegible]

میں تساہل سے کام لیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں بددعا کی اے اللہ! قریش کے خلاف میری مدد فرما کہ انہیں سات سال تک خشک سالی آلے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں خشک سالی آئی تھی انہیں خشک سالی نے آلیا اس میں لوگ ہلاک ہوئے، مردار اور ہڈیاں کھائیں، بھوک کی شدت کی وجہ سے آسمان اور زمین کے درمیان دھوئیں جیسی سفید چیز کو دیکھتے۔ ابوسفیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں جبکہ آپ کی قوم ہلاک ہوتی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فارتقب یوم تاتی السماء سے اس آیت تک آیات کی تلاوت کی۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا اَلْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى سے مراد بدر کا دن ہے (1)۔ امام بغوی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ پانچ چیزیں گذر چکی ہیں بدر کا دن، روم، پکڑ، چاند کا شق ہونا اور دھواں (2) امام بخاری نے حضرت ابن مسعود سے صحیح میں نقل کیا ہے کہ جب قریش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنے میں حد سے بڑھ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کے قحط کی بددعا کی تو قریش کو بھی قحط نے آلیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہڈیاں کھائیں ایک آدمی آسمان کی طرف دیکھتا تو بھوک کی شدت کی وجہ سے اسے دھوئیں جیسی چیز نظر آتی تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا تو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی یا رسول اللہ! مضر کے لئے بارش کی دعا کیجئے وہ تو ہلاک ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کی دعا کی تو بارش ہو گئی تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ جب دوبارہ خوشحالی آ گئی تو کفر کی طرف پھر پلٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آخری آیت کو نازل فرمایا (3) یہاں یوم سے مراد یوم بدر ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾

''اور ہم نے آزمایا تھا ان سے پہلے قوم فرعون کو اور آیا تھا ان کے پاس معزز رسول [1] (اس نے فرمایا تھا) کہ میرے حوالے کر دو اللہ کے بندوں کو میں تمہارے لئے معتبر رسول ہوں [2] اور نہ سرکشی کرو اللہ کے مقابلے میں، میں لے آیا ہوں تمہارے پاس اپنی رسالت کی روشن دلیل [3] اور میں نے پناہ لے لی ہے اپنے رب کی اور تمہارے رب کی کہ تم مجھ پر پتھراؤ کر سکو [4]''

[1] یہ جملہ جواب قسم ہے۔ کفار مکہ سے پہلے ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو بھی آزمایا تھا ان کے پاس بھی عظیم الشان رسول آیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یا مومنوں کے ہاں یا اپنے حسب ونسب میں بڑا معزز تھا اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

[2] یہاں اَنْ مصدریہ ہے۔ آپ نے فرعونیوں سے فرمایا بنی اسرائیل میرے حوالے کر دو انہیں میرے ساتھ جانے دو انہیں آزاد کر دو انہیں اذیتیں نہ دو یا اس کا معنی ہے اے اللہ کے بندو! اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور میری دعوت کو قبول کرو۔ یہاں عباد اللہ۔ سے مراد فرعون اور اس کی قوم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اَنْ مفسرہ ہو کیونکہ رسول رسالت اور دعوت کے ساتھ ہی آتا ہے اور رسالت و دعوت میں قول کا

معنی پایا جاتا ہے۔ یا یہ مثقلہ سے مخففہ ہے۔ بے شک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے رسول ہوں اور اس کی وحی پر امین ہوں مجھ پر کوئی تہمت نہیں کیونکہ معجزات میری صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ والا جملہ ادوا کی علت بیان کر رہا ہے۔

۳ لا تعلوا کا عطف ادوا پر ہے ان مصدریہ، مفسرہ اور مخففہ ہوسکتا ہے۔ یعنی مجھے حقیر جان کر اور اطاعت کو ترک کر کے مجھ پر بڑے نہ بنو۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں تمہارے پاس ایسی دلیل لایا ہوں جو میری صداقت پر واضح دلیل ہے۔ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ یہ لا تعلوا کی علت ہے امین کو اداء کے ساتھ اور سلطان کو تعلّی کے ساتھ اس لئے ذکر کیا کیونکہ ان کی آپس میں باہم واضح مناسبت ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یہ کہا تو انہوں نے آپ کو رجم کرنے کی دھمکی دی۔

۴ ورش نے وصل کی صورت میں ترجمون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ترجمونی جبکہ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ نے کہا معنی یہ ہے کہ تم مجھے رجم کر کے قتل کر دو۔ حضرت ابن عباس نے کہا تم مجھے گالی دو اور تم مجھے جادوگر کہو(1) تاہم ظاہر پہلا معنی ہے کیونکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام گالی دینے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے التجاء کرتے تو وہ بعد میں آپ کو برا بھلا نہ کہہ سکتے۔ جبکہ انہوں نے یہ کہا تھا۔ هذا سحر مبین۔

وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ﴿۲۹﴾

"اور اگر تم ایمان لانے کے لئے تیار نہیں تو پھر مجھ سے کنارہ کش ہو جاؤ ۱ پس پکارا موسیٰ نے اپنے رب کو (الٰہی) بلاشبہ یہ مجرم لوگ ہیں ۲ (حکم ملا) لے چلو میرے بندوں کو راتوں رات تمہارا تعاقب کیا جائے گا ۳ اور رہنے دو سمندر کو تھما ہوا بے شک وہ ایسا لشکر ہے جو غرق ہو کر رہے گا ۴ وہ چھوڑ گئے بہت سے باغات اور چشمے (سرسبز) کھیتیاں اور شاندار مکانات اور بہت سارا ساز و سامان جس میں وہ عیش کیا کرتے تھے ۵ یونہی ہوا ہم نے وارث بنا دیا تمام چیزوں کا دوسرے لوگوں کو ۶ پس نہ رویا ان (کی بربادی) پر آسمان اور نہ زمین۔ اور نہ انہیں مزید مہلت دی گئی ۷۔"

۱ ورش نے لِیْ کی یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اسی طرح ورش نے فَاعْتَزِلُوْنِ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کو حذف کیا ہے، یعنی اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ تھلگ ہو جاؤ نہ میرے خلاف ہو اور نہ ہی میرے حق میں ہو اور نہ ہی میرے ساتھ برا سلوک کرو۔

ساتھ تعبیر کیا۔

۳؎ فاسر میں فاء جزائیہ ہے۔ یہاں قول محذوف ہے، معنی یہ بنے گا اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اور فرمایا اگر بات اس طرح ہے تو رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ بے شک فرعون اور اس کی قوم تمہارا پیچھا کرے گی۔ نافع اور ابن کثیر نے فاسر میں ہمزہ وصلی پڑھا ہے یہ سری یسری سے مشتق ہے جبکہ باقی قراء نے اسری یسری سے ہمزہ قطعی پڑھا ہے یہاں عبادی سے مراد بنی اسرائیل ہیں جب فرعون کو یہ معلوم ہوگا کہ تم نکل گئے ہو تو وہ تمہارا پیچھا کرے گا یہ جملہ مستانفہ ہے۔

۴؎ رھوا یہ البحر سے حال ہے جس کا معنی کھلا ہوا، سوراخ والا وسیع اور ساکن ہے، یعنی جب آپ اور اس کے ساتھی سمندر سے نکل جائیں تو اسے ملانے کے لئے اپنا عصا سمندر پر نہ مارنا۔ قتادہ نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر عبور کر لیا تو اس طرف مائل ہوئے کہ سمندر میں اپنا عصا ماریں تاکہ وہ مل جائے اور یہ بھی خوف ہوا کہ کہیں فرعون اور اس کے لشکر ان کا پیچھا نہ کریں تو اسے کہا گیا سمندر کو اسی طرح کھلا رہنے دیں جس طرح وہ تھا۔ رھوا مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں ہے اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ جملہ مستانفہ ہے جو علت کی جگہ واقع ہے۔

۵؎ انہوں نے بہت سارے باغات، چشمے، کھیتیاں، مزین محافل اور خوبصورت گھر چھوڑے اور ایسی نعمتیں چھوڑیں جن سے وہ لطف اندوز ہو رہے تھے کَمْ تَرَكُوْا والا جملہ، جملہ معترضہ ہے۔

۶؎ کلبی نے کہا اس کا معنی یہ ہے جو میری نافرمانی کرتا ہے میں اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا معاملہ اسی طرح ہے اور ثُمَّ کا عطف کلام محذوف پر ہے جو سلبنا ھا ہے قَوْمًا اٰخَرِیْنَ سے مراد بنی اسرائیل ہیں یا اور ثنا کا عطف ترکوا پر ہے۔

۷؎ اس جملے کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے، یعنی کفار کو ہلاک کیا گیا تو ان پر آسمان وزمین نہیں روتے۔ یہ کلام اس چیز سے مجاز ہے کہ ان کی ہلاکت اور ان کے موجود ہونے کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔ جس طرح اس کی نقیض میں یہ کلام کی جاتی ہے بکت علیھم السماء و کسفت علیھم الشمس، یعنی آسمان ان پر رویا اور سورج کو گرہن لگ گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ کلام اپنے حقیقی معنی میں ہے اس کا مؤمن کے خلاف معاملہ ہے جب مؤمن مرتا ہے تو اس پر زمین وآسمان روتے ہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر بندے کے لئے آسمان میں دو دروازے ہیں۔ ایک دروازے سے اس کا عمل چڑھتا ہے اور دوسرے دروازے سے اس کا رزق نیچے اترتا ہے۔ جب اسے موت آجاتی ہے تو دونوں اسے نہیں پاتے اور اس پر روتے ہیں(1) ابن جریر اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان سے فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا ہاں مخلوقات میں سے ہر ایک کے لئے آسمان میں سے ایک دروازہ ہوتا ہے جس سے اس کا رزق اترتا ہے اور اس پر عمل اوپر چڑھتا ہے جب مؤمن فوت ہوتا ہے تو آسمان کا وہ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ دروازہ روتا ہے زمین کے جس حصے پر وہ نماز پڑھتا تھا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا تھا جب وہ نماز کی جگہ اسے نہیں پاتی تو وہ اس پر روتی ہے(2)۔

امام بغوی، ابو یعلی اور ابن ابی حاتم نے حضرت انس سے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت کیا ہے(3)

الْاَرْضُ کی تلاوت کی۔ ابن جریر نے شریح بن عبینہ حضرمی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مومن حالت سفر میں فوت ہوتا ہے اس کے رشتہ دار اس کے پاس موجود نہیں ہوتے تو اس پر زمین و آسمان روتے ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی قرأت کی فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ پھر فرمایا کافر پر یہ دونوں نہیں روتے (1)۔ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ۔ کا عطف هلکوا پر ہے یعنی انہیں مہلت نہیں دی جاتی۔

وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۙ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۚ﴿۳۲﴾ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

"اور بے شک ہم نے نجات دی بنی اسرائیل کو رسوا کن عذاب سے [1] (یعنی) فرعون (کی غلامی) سے بلاشبہ وہ بڑا متکبر (اور) حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا [2] اور ہم نے چنا تھا بنی اسرائیل کو جان بوجھ کر جہان والوں پر [3] اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں ایسی نشانیاں جن میں صریح آزمائش تھی [4]"

[1] عذاب مھین سے مراد ان کے بیٹوں کا قتل، ان کی عورتوں کا زندہ رکھنا، مردوں کو غلام بنالینا اور ان سے سخت کام لینا ہے۔

[2] مِنْ فِرْعَوْنَ یہ مِنَ الْعَذَابِ سے بدل ہے۔ فرعون کو عذاب قرار دینا بطور مجاز ہے وہ لوگوں کو بہت زیادہ عذاب دیتا تھا اس لئے اسے عذاب قرار دیا گیا۔ یا لفظ فرعون سے پہلا عذاب کا لفظ محذوف ہے اس صورت میں یہ العذاب سے بدل کل ہوگا یا مِنْ فِرْعَوْنَ الْعَذَابِ سے حال ہے، کیونکہ یہ عذاب فرعون کی طرف سے واقع ہوتا تھا۔ یا یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ فرعون تکبر، سرکشی اور شرارت میں حد سے زیادہ تجاوز کرنے والا تھا، مِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ کان کی دوسری خبر ہے، یعنی وہ تکبر اور فضول خرچ تھا یا عالیا میں جو ضمیر ہے اس سے یہ حال ہے کیونکہ وہ ان میں اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ مکمل جملہ یا تو جملہ معترضہ ہے یا جملہ مستأنفہ ہے۔

[3] ھُمْ ضمیر سے مراد حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل ہیں۔ عَلٰى عِلْمٍ ترکیب کلام میں نا ضمیر سے حال ہے، یعنی ہم جانتے تھے کہ بنی اسرائیل اس کے حقدار ہیں یا معنی یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنی اسرائیل بعض مواقع پر گمراہ ہو جائیں گے ہم نے انہیں تمام جہانوں پر منتخب کیا۔

[4] آیات سے مراد سمندر کا پھٹ جانا، سمندر کا سایہ دینا، من اور سلویٰ کا نازل ہونا۔ قتادہ نے بلاء کا معنی نعمت کیا ہے، یعنی اس میں واضح نعمت ہے۔ ابن زید نے کہا ان کی آزمائش، خوشحالی اور تنگی کی صورت میں ہوتی پھر یہ آیت پڑھی کہ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً (2)۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۙ﴿۳۴﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۶﴾ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَكْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۳۷﴾

"بے شک یہ (کفار مکہ) بھی کہتے ہیں [1] نہیں ہے (ہمارے لئے) مگر ہماری (یہی) پہلی موت اور نہ ہمیں دوبارہ

بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ہم نے انہیں (بہمہ شوکت وحشمت) ہلاک کردیا بے شک وہ مجرم تھے ؎۔''

۱؎ ھولاء سے مراد قریش کے کفار ہیں کیونکہ گفتگو انہیں کے متعلق ہورہی ہے۔ فرعون اور اس کی قوم کا قصہ اس لئے ذکر کیا گیا تاکہ اس امر پر دلالت ہو کہ کفار مکہ بھی گمراہی پر اصرار کرنے میں انہیں کی طرح ہیں۔ انہیں بھی اس قسم کے عذاب سے ڈرایا جارہا ہے جو عذاب فرعونیوں پر نازل ہوا تھا۔

۲؎ وہ کہتے اس امر کی انتہا وہ پہلی موت ہے جو دنیوی زندگی کو ختم کردے گی اس میں دوسری موت کو ثابت کرنے کا مقصد نہیں جس طرح کہا جاتا ہے زید نے پہلا حج کیا اور مرگیا۔ ایک قول یہ کیا گیا جب انہیں کہا گیا تمہیں موت آئے گی پھر اس کے بعد زندگی ہوگی جس طرح تم پہلے مردہ تھے اور تمہیں زندگی دی گئی تو انہوں نے کہا وہ موت جس کے بعد زندگی دی گئی وہ پہلی ہے دوسری کے بعد زندگی نہ ہو گی اور ہمیں اس موت کے بعد دوبارہ نہ اٹھایا جائے گا۔

۳؎ خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو ہے، یعنی کفار نے انہیں کہا کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھانا ممکن ہے تو ہمارے ان آباؤ اجداد کو زندہ کرو جو فوت ہو چکے ہیں اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ شرط ہے جس کی جزاء محذوف ہے کیونکہ سابقہ کلام جزاء پر دلالت کرتا ہے اس لئے اسے جزا کی ضرورت نہیں جبکہ فَاْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ کی شرط محذوف ہے۔

۴؎ قوت، شوکت اور تعداد کی زیادتی میں یہ بڑھ کر ہیں، یا تبع کی قوم بڑھ کر تھی اس میں استفہام، انکار اور تقریر کے معنی میں ہیں، یعنی تم تبع کی قوم سے بہتر نہیں بلکہ تبع کی قوم تم سے بہت بہتر تھی۔ تبع ایک آدمی کا نام ہے اسے تبع اس لئے کہتے کیونکہ اس کے پیروکار بہت زیادہ تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا تبابع بہت سارے افراد تھے۔ انہیں تبع اس لئے کہا گیا کیونکہ وہ یکے بعد دیگرے حکومت سنبھالتے رہے۔

محمد بن اسحاق اور دوسرے لوگوں نے حضرت ابن عباس اور دوسرے لوگوں سے روایت کیا ہے کہ آخری تبع کا نام اسعد ابو کرب بن ملیک تھا(1) امام بغوی نے اس کا قصہ اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے جبکہ میں نے سورۃ ق میں لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قوم کی تو مذمت کی ہے لیکن تبع کی مذمت نہیں کی کیونکہ وہ مسلمان ہوگیا تھا اور اس کی قوم نے اس کو جھٹلایا تھا۔ محمد بن اسحاق نے مبتداء اور ابن ہشام نے تیجان میں ذکر کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف آوری کے موقع پر حضرت ایوب کے گھر ٹھہرے تھے اس گھر کو پہلے تبع نے بنایا تھا اس کا نام تبان بن سعد تھا میں نے اس واقعہ کو سورۂ جمعہ میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کا عطف قوم تبع پر ہے اس سے مراد قوم عاد، ثمود اور اس جیسی کافر قومیں ہیں۔ اَهْلَكْنٰهُمْ یہ جملہ مستانفہ ہے یا قد کے مضمر ہونے کے ساتھ حال ہے۔

یا یہ اسم موصول کی خبر ہے۔ مُجْرِمِيْنَ سے مراد مشرک ہیں جو چیز اس قوم کی ہلاکت کا باعث بنی اس کی یہ علت ہے اور اس کے تقاضا کرنے والے کا بیان ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ

عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤١﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٤٢﴾

''اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر۔[1] نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمان و زمین کو مگر حق کے ساتھ لیکن ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے [2] یقیناً فیصلہ کا دن ان سب کو (دوبارہ زندہ کرنے کے لئے) مقررہ وقت ہے [3] جس روز کوئی دوست کسی دوست کے ذرا کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔[4] سوائے ان کے جن پر اللہ نے رحم فرمایا ہے بے شک وہ سب پر غالب ہمیشہ رحم کرنے والا ہے [5]۔''

[1] ہم نے زمین و آسمان اور اس کے درمیان جو کچھ پیدا کیا یہ عبث اور باطل نہیں یہ جملہ سابقہ جملہ کے مضمون سے حال ہے کیونکہ وہ اپنے ضمن میں دوبارہ اٹھائے جانے کے انکار کے معنی کو لئے ہوئے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے انکر وا البعث والحال انه ما خلقنا السموات والارض یعنی انہوں نے دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیا جبکہ ہم نے زمین و آسمان کو فضول پیدا نہیں فرمایا بلکہ ہم نے انہیں اس لئے پیدا کیا تا کہ ہم اس سے اپنے وجود اور صفات کمالیہ پر دلیل قائم کریں نیز انسان کی آزمائش کے لئے انہیں پیدا کیا۔

[2] ہم نے زمین و آسمان کو اس لئے پیدا کیا تا کہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے واجب ہونے کو واضح کریں تا کہ ہم مطیع کو ثواب دیں اور گناہ گار کو عذاب دیں۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کی تاکید اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔

لیکن اکثر لوگ اس چیز کو نہیں جانتے کہ ان چیزوں کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے تا کہ توحید پر استدلال کیا جائے اور لوگوں کو آزمایا جائے ان کے نہ جاننے کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں نظر و فکر کی صلاحیت کم ہے اور وہ دنیا میں منہمک ہیں۔

[3] يَوْمَ الْفَصْلِ سے مراد یوم قیامت ہے جس میں حق کو باطل سے اور حق پرست کو باطل پرست سے الگ کیا جائے گا۔ مِيْقَاتُهُمْ سے مراد ان کے حشر اور جزاء کا وقت ہے یہ جملہ بھی سابقہ جملہ کی وضاحت کرتا ہے کہ ان کی تخلیق کا مقصد استدلال اور آزمائش ہے۔

[4] يَوْمَ لَا يُغْنِيْ یہ يَوْمَ الْفَصْلِ سے بدل ہے یا يَوْمَ الْفَصْلِ جس فعل پر دلالت کرتا ہے اس سے ظرف ہے، یعنی اس روز کوئی رشتہ دار کسی دوسرے رشتہ دار کو نہ نفع دے گا اور نہ ہی تکلیف دور کرے گا اور نہ ہی وہ عذاب سے محفوظ رہیں گے هُمْ ضمیر پہلے مولیٰ کے لئے ہے کیونکہ معنی کے اعتبار سے وہ عام ہے۔

[5] مگر جنہیں معاف فرما کر اور ان کے حق میں شفاعت قبول فرما کر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے وہ مومن ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کے حق میں شفاعت کریں گے انہیں شفاعت کی اجازت بھی ہوگی۔ مستثنیٰ محل رفع میں ہے کیونکہ وہ ینصرون کی ضمیر سے بدل ہے یا یہ مستثنیٰ ہونے کی حیثیت میں منصوب ہے۔ اللہ تعالیٰ غالب ہے وہ جسے عذاب دینے کا ارادہ کرلے کوئی اسے عذاب سے بچا نہیں سکتا۔

سعید بن منصور نے ابو مالک سے روایت کیا ہے کہ ابو جہل کھجور اور مکھن لاتا اور کہتا زقوم چکھو کیونکہ یہ وہ زقوم ہے جس سے تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ڈراتا ہے(1)۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿٤٤﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿٤٥﴾ كَغَلْيِ

"بلاشبہ زقوم کا درخت ۱؎ گناہ گار کی خوراک ہوگا ۲؎ پگھلے تانبے کی مانند پیٹوں میں جوش مارے گا ۳؎ جیسے کھولتا پانی جوش مارتا ہے ۴؎"

۱؎، ۲؎ اثیم کا معنی بہت زیادہ گناہ کرنے والا ہے اس سے مراد کافر ہے یہ جملہ اور مابعد جملے سابقہ کلام کا بیان ہے جس میں حق پرست اور باطل پرست میں فرق کیا گیا ہے۔

۳؎ کَالْمُهْلِ یہ ان کی ایک اور خبر ہے۔ مہل سے مراد وہ معدنیات ہیں جو آگ میں پگھل جاتی ہیں ایک قول یہ کیا گیا تیل کی سیاہ تلچھٹ ہے قاموس میں اسی طرح ہے(1) یغلی یہ ان کی ایک اور خبر ہے ابن کثیر اور حفص نے یغلی پڑھا ہے اس صورت میں ھو ضمیر طعام اور زقوم کے لئے ہوگی، مہل کے لئے نہ ہوگی کیونکہ جملہ انہیں دو میں سے ایک سے حال ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں ضمیر شجرہ کے لئے ہوگی۔

۴؎ زقوم کفار کے پیٹ میں یوں کھولے گا جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح ڈرنے کا حق ہے اگر زقوم کا ایک قطرہ زمین پر گرے تو تمام دنیا والوں کی زندگی کو کڑوا کر دے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کا یہی کھانا ہے اور کوئی کھانا نہیں(2) امام ترمذی نے، امام نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔ عبداللہ بن احمد نے زوائد زہد میں اور ابونعیم نے ابوعمرو خولانی سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ کہ انسان دنیا سے جو حصہ لیتا ہے دنیا بھی اس سے اتنا ہی حصہ ہی لے لیتی ہے

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ﴿۴۹﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾

"(حکم ہوگا) اس (نابکار) کو پکڑ لو پھر اسے گھسیٹ کر لے جاؤ جہنم کے وسط میں ۱؎ پھر انڈیلو اس کے سر کے اوپر کھولتا پانی (اسے) عذاب دینے کے لئے ۲؎ لو چکھو تم بڑے معزز و مکرم ہو ۳؎ بے شک یہ وہ ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے ۴؎"

۱؎ جہنم کے داروغوں سے کہا جائے گا اس گناہ گار کو پکڑ لو یہ جملہ اپنے قول کے ساتھ مل کر ان کی ایک اور خبر ہوگی۔ کوفہ کے قراء، ابوجعفر اور ابوعمرو نے فاعتلوا کی تاء کو مکسور جبکہ باقی قراء نے مضموم پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں، یعنی اسے زبردستی جہنم کے وسط میں لے جاؤ عتل کا معنی کسی چیز کو ہر طرف سے پکڑ لینا ہے اور زبردستی کھینچنا ہے۔

۲؎ مراد یہ ہے کہ اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی انڈیلو تاہم مبالغہ کے لئے یوں کلام کی جاتی ہے صبوا فوق راسه عذابا هو الحمیم۔ پھر عذاب کو حمیم کی طرف مضاف کیا گیا تا کہ تخفیف کا فائدہ دے۔ یہاں مِنْ کو ذکر کیا تا کہ اس پر دلالت ہو کہ جس چیز کو ان پر انڈیلا گیا وہ اس نوع کا کچھ حصہ ہے۔

۳؎ اس سے پہلے قول محذوف [illegible]

پڑھا ہے۔ یعنی اس سے پہلے لام حرف جار محذوف ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستأنفہ ہے۔
امام بغوی نے کہا مقاتل نے کہا جہنم کا داروغہ اس جہنمی کے سر پر ضرب لگائے گا اور دماغ تک اس کے سر میں سوراخ کر دے گا اس میں کھولتا ہوا پانی انڈیلے گا جو گرمی میں انتہاء کو پہنچا ہوا ہوگا پھر اسے کہا جائے گا ذُقۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡكَرِیۡمُ یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ابو جہل کہتا تھا میں اس وادی کا سب سے معزز اور محترم ہوں۔ جہنم کے داروغے اسے یہ الفاظ شرمندہ کرنے کے لئے کہیں گے (1)۔ اموی نے عکرمہ سے مغازی میں نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ابوجہل سے ملے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں کہوں اولی لک فاولی تو ابوجہل نے اپنے ہاتھ سے کپڑا اتارا اور کہا تو اور تیرا صاحب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تو خوب جانتا ہے کہ میں اس وادی کا سب سے طاقتور اور عزت والا آدمی ہوں۔ غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ نے اسے قتل کر دیا اسے ذلیل و رسوا کیا اور ان کلمات کے ساتھ اسے شرمندہ کیا (2) اور اس آیت کو نازل فرمایا۔ ابن جریر نے قتادہ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔
۵؎ یہ وہی عذاب ہے جس میں تم شک کرتے تھے۔

اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ مَقَامٍ اَمِیۡنٍ ﴿۵۱﴾ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۵۲﴾ یَّلۡبَسُوۡنَ مِنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ ۟ وَ زَوَّجۡنٰهُمۡ بِحُوۡرٍ عِیۡنٍ ﴿۵۴﴾

''یقیناً پرہیزگار امن کی جگہ میں ہوں گے ۱؎ باغات میں اور (بہتے ہوئے) چشموں میں ۲؎ پہنے ہوئے ہوں گے لباس باریک اور دبیز ریشم کا آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ۳؎ ہاں یونہی ہوگا اور ہم بیاہ دیں گے انہیں گوری گوری آہو چشم عورتوں سے ۴؎''

۱؎ اہل مدینہ اور اہل شام نے مقام کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مصدر میمی ہے اور اقامت کے معنی میں ہے، جبکہ باقی قراء نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں یہ ظرف کا صیغہ ہوگا۔ اس جگہ کو امین اس لئے کہا گیا کیونکہ جو وہاں پہنچ جائے گا وہ تمام مصیبتوں اور وہاں سے منتقل ہونے سے محفوظ ہو جائے گا۔
۲؎ یہ مقام سے بدل ہے۔ بدل ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جگہ صاف ستھری ہے اور اس میں لطف عطا کرتے والے کھانے اور مشروبات ہوں گے۔
۳؎ یہ ان کی دوسری خبر ہے یا اس ضمیر سے حال ہے جو اس شبہ فعل میں پائی جا رہی ہے فِیۡ مَقَامٍ اَمِیۡنٍ جس کے متعلق ہے یا یہ جملہ مستأنفہ ہے۔ سندس باریک ریشم کو کہتے ہیں اور استبرق موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کعب احبار سے نقل کیا ہے کہ اگر جنت کا کوئی کپڑا آج پہنا جائے تو جو اسے دیکھے گا وہ بے ہوش ہو جائے گا اور لوگوں کی آنکھیں اسے برداشت نہ کر سکیں گی۔ صابونی نے مائتین میں عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ ایک جنتی حلہ پہنے گا تو ایک وقت میں اس کے ستر رنگ ہوں گے وہ جنتی ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے تاکہ وہ ایک دوسرے سے مانوس ہوں۔
۴؎ کذلک خبر ہے اس کا مبتدا الامر ہے وَ زَوَّجۡنٰهُمۡ بِحُوۡرٍ عِیۡنٍ قد کے مضمر ہونے کے ساتھ حال ہے یا انّ کی خبر پر اس کے ساتھ

موقع پر زوجہ بامرۃ نہیں کہا جاتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا اس کا معنی ہے ہم نے انہیں حوروں کے ساتھ جوڑا جوڑا بنا دیا ہے جس طرح ایک جوتا دوسرے جوتے کے ساتھ مل کر جوڑا بن جاتا ہے حور وہ عورتیں ہیں جو پاکیزہ صاف ستھری اور سفید رنگ کی ہوں گی ان کی سفیدی اور رنگ کی صفائی کی وجہ سے آنکھیں متحیر ہو جائیں گی۔ حور حوراء کی جمع ہے، عین عیناء کی جمع ہے جس کا معنی بڑی آنکھوں والی ہے۔ طبرانی نے ابو امامہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حور عین زعفران سے بنائی گئی ہے (1)۔ بیہقی نے اسی کی مثل حضرت انس سے مرفوع اور حضرت ابن عباس سے موقوف روایت نقل کی ہے۔ مجاہد سے بھی اسی طرح روایت مروی ہے۔ ابن مبارک نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حور عین کو مٹی سے پیدا نہیں فرماتا اللہ تعالیٰ انہیں کستوری، کافور اور زعفران سے پیدا فرماتا ہے (2)۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر حور سمندر میں لعاب ڈالے تو اس کے لعاب کے مٹھاس کی وجہ سے سارا سمندر میٹھا ہو جائے (3)۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اگر حور زمین و آسمان کے درمیان اپنی ہتھیلی باہر نکالے تو تمام مخلوق اس کے حسن کی وجہ سے اس کی فریفتہ ہو جائے اگر وہ اپنی اوڑھنی نکالے تو اس کے حسن کے سامنے سورج ایک دیئے کی صورت اختیار کر لے اور اس کی کوئی روشنی نہ رہے اگر حور اپنے چہرے کو باہر نکالے تو اس کا حسن زمین و آسمان کے درمیان کو روشن کر دے (4)۔

ہناد نے حبان بن ابحلیہ سے روایت کیا ہے کہ جب دنیا کی عورتوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا تو انہیں اعمال کی وجہ سے حور عین پر فضیلت دی جائے گی۔

يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ ﴿٥٥﴾ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿٥٦﴾ فَضْلًا مِّن رَّبِّكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٥٧﴾ فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ فَارْتَقِبْ إِنَّهُم مُّرْتَقِبُونَ ﴿٥٩﴾

”وہ منگوا لیا کریں گے وہیں ہر قسم کا پھل اطمینان سے ۱؎ نہ چکھیں گے وہاں موت کا ذائقہ بجز اس پہلی موت کے اور اللہ نے بچا لیا ہے انہیں عذاب جہنم سے ۲؎ محض آپ کے رب کی مہربانی سے یہی وہ بڑی کامیابی ہے (جس کی انہیں آرزو تھی) ۳؎ پس ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں ۴؎ سو آپ بھی انتظار کیجئے وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں ۵؎“

۱؎ اس پھل کے ختم ہونے اور اس کی تکلیف سے وہ امن میں ہوں گے۔ یہ جملہ ایک اور حال ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن منذر نے اپنی تفاسیر میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ دنیا میں جو پھل بھی میٹھا یا کڑوا ہوگا وہ جنت میں بھی ہوگا یہاں تک کہ تنبہ بھی ہوگا۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور بیہقی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جنت میں جو پھل ہیں دنیا میں اس کے صرف نام ہیں۔

۲؎ یہ جملہ ایک اور حال ہے، یعنی وہ جنت میں موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے بلکہ ہمیشہ زندہ رہیں گے یہاں مستثنیٰ منقطع ہے یا متصل ہے فیھا۔ میں ضمیر آخرت کے لئے ہے اور موت آخرت کا پہلا مرحلہ ہے۔ یا ھا ضمیر سے مراد جنت ہے اور میت موت کے ساتھ جنت

میں پہنچ جاتا ہے اور موت کے ساتھ ہی اس کا مشاہدہ کر لیتا ہے گویا اس کی موت جنت میں واقع ہوئی یا نفی میں عموم اور موت کے ممتنع ہونے کے مبالغے کے لئے استثناء ذکر کی گئی۔ گویا یہ فرمایا وہ جنت میں یا آخرت میں موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔ مگر اس صورت میں کہ مستقبل میں موت کا چکھنا ممکن ہو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ یہ جملہ لَا يَذُوْقُوْنَ کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد محذوف ہے یا ان کی خبر پر اس کا عطف ہے۔

۳؎ فَضْلًا یہ مقدر فعل کا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فضلوا فضلا منه واعطوا کل ذلک عطاء منه، یعنی انہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل کے طور پر دیا گیا یہ اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں۔ حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ ہی جہنم سے اسے بچائے گا یہاں تک مجھے بھی مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہی ایسا ہوگا اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(1) یہی عظیم کامیابی ہے کیونکہ اس میں تکلیف دہ چیزوں سے رستگاری اور مقاصد کا حصول ہے۔

۴؎ يَسَّرْنٰهُ میں ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے بلسانک یہ ضمیر سے حال ہے، یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں اتار کر آسان بنا دیا ہے تاکہ لوگ اس کو سمجھیں اور اس سے نصیحت حاصل کریں یہ جملہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کے ساتھ متصل ہے یہ اس صورت کا نتیجہ ہے۔

۵؎ یہ جملہ محذوف شرط کا جواب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وان لم یتذکروا فارتقب اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان پر جو عذاب آنے والا ہے اس کا انتظار کیجئے جس طرح وہ آپ پر آزمائش آنے کی انتظار کر رہے ہیں یا اس کا معنی ہے آپ اپنی فتح کا انتظار کریں جس طرح وہ اپنے گمان کے مطابق آپ پر قہر نازل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ امام ترمذی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رات میں سورۂ دخان پڑھی ستر ہزار فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے ہیں(2)۔ انہیں سے ضعیف سند کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے جمعہ کی رات سورۂ دخان پڑھی اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے گئے(3)۔ طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ ابوامامہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے جمعہ کی رات یا جمعہ کے دن سورۂ دخان پڑھی اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لئے ایک گھر بنا دیتا ہے(4)۔

سورۂ جاثیہ

آیاتہا ۳۷ ۔ سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ مَكِّيَّةٌ ۴۵ ۔ رکوعاتہا ۴

سورۃ الجاثیۃ مکی ہے، اس میں سینتیس آیات اور چار رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۞ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۞ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۞ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۞

”حامیم[1] اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبردست (اور) حکمت والا ہے[2] بے شک آسمانوں اور زمین میں (اس کی یکتائی)، (قدرت کی) نشانیاں ہیں اہل ایمان کے لئے[3] اور (خود) تمہاری پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو وہ پھیلا رہا ہے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔[4]“

[1]، [2] اگر حٰمٓ کو مبتدا بنایا جائے تو تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ اس کی خبر ہوگی اور اگر یہ حروف مقطعات ہوں تو اس صورت میں تنزیل الکتاب مبتدا ہوگی اور مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ اس کی خبر ہوگی عزیز صفت ذکر فرمائی کیونکہ وہ انتقام لینے میں غالب ہے اور حکیم صفت ذکر فرمائی کیونکہ وہ تدبیر میں حکمت والا ہے اگر حٰم کو مبتدا بنایا جائے تو مِنَ اللّٰهِ تَنْزِيْلُ کے متعلق ہوگا ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے کہ حٰم کے ساتھ قسم اٹھائی گئی ہے اور تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ اس کی صفت ہے اور مابعد آیات اس کا جواب قسم ہیں۔

[3] آسمان و زمین میں ایسی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آیت کا معنی وہی ہو جو ظاہر طور پر سمجھا جا رہا ہے۔ یعنی زمین و آسمان میں مؤمنوں کے لئے نشانیاں ہیں یا اس کا یہ معنی ہوگا کہ ان کی تخلیق میں مؤمنوں کے لئے نشانیاں ہیں جس طرح مابعد آیت میں ہے۔

[4] تمہیں نطفہ، جمے ہوئے خون اور گوشت کے لوتھڑے اور مکمل انسان کی صورت میں پیدا کرنے میں قدرت کی نشانیاں ہیں وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ کا عطف کم ضمیر پر کرنا بھی جائز ہے تاہم زیادہ بہتر یہ ہے کہ کہا جائے کہ اس کا عطف خَلْقِكُمْ پر کیا جائے کیونکہ جانوروں کا زمین میں پھیلا ہوا ہونا، اس کی مختلف اقسام کا ہونا اور ان چیزوں پر مشتمل ہونا جس سے انسان کی زندگی مکمل ہوتی ہے ان میں ایسی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور کمالات پر دلائل ہیں۔ حمزہ، کسائی اور یعقوب نے آیات پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ان کے اسم پر ہے جبکہ باقی قراء حضرات نے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ان کے اسم کے محل پر ہے۔ فرمایا ان دلائل سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے اور قیامت کے برحق ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

’’نیز گردش لیل ونہار میں اور جو اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے رزق (کا سبب مینہ) پھر زندہ کر دیا اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور ہواؤں کے اِدھر اُدھر چلنے میں نشانیاں ہیں ان کے لئے جو عقلمند ہیں [1]۔‘‘

[1] موسم گرما اور موسم سرما کے آنے جانے یا رات اور دن کے آنے جانے‘ آسمان سے رزق نازل کرنے‘ زمین کے خشک ہو جانے کے بعد اس کو سرسبز و شاداب کرنے اور ہواؤں کے رخ بدلنے میں عقل مند لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ریح کو واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس سے جنس مراد ہوگی جبکہ باقی قراء نے اسے جمع کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ ہوا مختلف سمتوں سے چلتی ہے جنہیں قبول‘ دبور‘ جنوب اور شمال کہتے ہیں۔ حمزہ، کسائی اور یعقوب نے آیات کو تاء کی جر کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ محل نصب میں ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف دو مختلف عاملوں کے معمولوں پر ہے وہ عامل فی اور ابتداء ہیں۔ یا اختصاص کے طریقہ پر آیات کو نصب دی گئی ہے۔ یا ھی ضمیر مضمر ہے اور آیات مرفوع ہے کیونکہ یہ خبر ہے۔ امام بیضاوی نے کہا یہاں تین آیات کا اختتام تین مختلف الفاظ پر کیا گیا ہے کیونکہ ان میں جو دلائل ہیں وہ وقت اور ظہور میں مختلف ہیں (1) جبکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ کلام کے محاسن کے اعتبار سے ہے ورنہ ایمان اور ایقان کا معنی ایک ہے کیونکہ عقل سلیم اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ آسمان و زمین کے خالق پر ایمان لایا جائے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝

’’یہ سب نشانیاں ہیں اللہ کی (قدرت کی) ہم بیان کرتے ہیں انہیں آپ پر حق کے ساتھ پس وہ کون سی ایسی بات ہے جس پر وہ اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد ایمان لائیں گے [1]۔‘‘

[1] یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ مبتداء اور خبر ہے نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ حال ہے اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔ یا یہ مبتداء کی دوسری خبر ہے بالحق، نتلوا کے فاعل سے یا مفعول سے حال ہے فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ فاء جزائیہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فان لم تومنوا بایات اللّٰہ فبای حدیث بعد اللّٰہ و آیۃ یومنون۔ یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرنے والے جو دلائل ہیں ان کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ کفار کسی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ابن عامر‘ حمزہ‘ کسائی‘ ابوبکر اور یعقوب نے يُؤْمِنُوْنَ کو تؤمنون پڑھا ہے۔ اس صورت میں غائب کے صیغہ سے خطاب کی طرف التفات ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

’’ہلاکت ہے ہر جھوٹے بدکار کے لئے [1] جو سنتا ہے اللہ کی آیتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں اس کے سامنے پھر بھی وہ (کفر

لے اَفَّاکٍ کا معنی بہت ہی جھوٹا ہے اَثِیْمٍ بہت زیادہ گناہ کرنے والا۔ اس سے نضر بن حارث مراد ہے یہ جملہ معترضہ ہے۔

ﷺ یَّسْمَعُ اٰیٰتِ اللّٰهِ جملہ فعلیہ اَثِیْمٍ کی صفت ہے تُتْلٰى عَلَیْهِ یہ جملہ فعلیہ آیات سے یا ضمیر مرفوع سے حال ہے۔ ثُمَّ یُصِرُّ کا سمع پر عطف ہے ثم کا لفظ اس لئے ذکر کیا تا کہ اس امر پر دلالت ہو کہ آیات سننے کے بعد بھی اصرار بہت ہی عجیب بات ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ ایمان سے تکبر کرتے ہوئے اصرار کرتا ہے کان یہ مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے لَّمْ یَسْمَعْهَا یہ جملہ حال کے محل میں ہے، یعنی وہ نہ سننے والے آدمی کی طرح اصرار کرتا ہے۔ فَبَشِّرْهُ میں فاء سببیہ ہے اور بشارت ایسی خبر کو کہتے ہیں جو چہرے پر خوشی کے آثار کو ظاہر کر دے یہاں لفظ بشارت کا ذکر ایسی خبر کی صورت میں جو چہرے پر حزن کو ظاہر کرے بطور استہزاء ہے۔

وَ اِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ؕ﴿۹﴾ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَ لَا یُغْنِیْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَیْـًٔا وَّ لَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ؕ﴿۱۰﴾ هٰذَا هُدًى ۚ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾

''اور جب وہ آگاہ ہوتا ہے ہماری آیتوں میں سے کسی پر تو ان کا مذاق اڑانے لگتا ہے یہی وہ (بدقماش) ہیں جن کے لئے رسوا کن عذاب ہے لے ان کے آگے جہنم ہے اور ان کے ذرا کام نہ آئے گا جو انہوں نے (عمر بھر) کمایا اور نہ وہ کسی کام آئیں گے جن کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مددگار بنایا تھا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا ﷺ یہ قرآن سراپا ہدایت ہے اور جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا ان کے لئے دردناک عذاب ہے سخت ترین عذاب میں سے ﷺ''

لے اِذَا عَلِمَ کا عطف یسمع پر ہے۔ معنی یہ ہے جب قرآن میں سے کوئی چیز اس تک پہنچتی ہے تو اسے مذاق بنالیتا ہے اتخذھا میں ھا ضمیر شیئًا کے لئے ہے اور شی آیت کے معنی میں ہے اس لئے ضمیر مونث ہے یا ضمیر آیاتنا کی طرف لوٹ رہی ہے ھزوا اسم مفعول کے معنی میں ہے ان تمام جھوٹوں کے لئے قبروں میں ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب ہے۔

ﷺ یہ جملہ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ میں جو ھم ضمیر ہے اس سے حال ہے وراء اس جہت کا نام ہے جس کے مقابل شخص موجود ہے خواہ وہ پیچھے ہو یا سامنے ہو۔ جہنم کے سامنے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنم کی طرف منہ کیے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کے پیچھے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جہنم ان کی موتوں کے بعد ہوگی۔ ان کے مال اور اولاد میں انہیں جہنم سے کچھ فائدہ نہ دیں گی اسی طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کو اپنا دوست بنایا ہے وہ بھی انہیں کوئی فائدہ نہ دیں گے یہاں اولیاء سے مراد یا تو وہ بت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے یا وہ روساء ہیں جن کی وہ اتباع کرتے تھے یہاں ما مصدریہ ہے یا موصولہ ہے یہ وَلَا یُغْنِیْ والا جملہ لھم کی ضمیر سے حال ہے وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ایک اور حال ہے۔

ﷺ اسم اشارہ سے قرآن مراد ہے، یعنی قرآن سراپا ہدایت ہے جس کے ذریعے انسان گمراہی سے ہدایت پاتا ہے یہ جملہ معترضہ ہے جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا ان کے لئے سخت ترین عذاب ہے۔ ابن کثیر، یعقوب اور حفص نے الیم کو مرفوع پڑھا ہے

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

" اللہ وہ ہے جس نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لئے سمندر کو تا کہ رواں رہیں اس میں کشتیاں اس کے حکم سے اور تا کہ (تم بحری تجارت سے) تلاش کرو اس کا فضل اور تا کہ تم اس کا شکر ادا کیا کرو ۱؎ اور مسخر کر دیا ہے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے بے شک اس (نظام) میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں ۲؎ "

۱؎ اللہ تعالیٰ نے سمندر کی سطح کو چکنا، ہموار بنایا لکڑی جیسی چیز اس کے اندر جانے کے بعد اس پر تیرنے لگتی ہے اور اس میں غوطہ لگانے میں کوئی رکاوٹ نہیں سمندر و دریا کو اس طرح اسی لئے بنایا تا کہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلتی رہیں اور تجارت، غوطہ لگانے اور شکار کے ذریعے اس میں سے اپنا رزق کماؤ مِنْ فَضْلِهٖ یہ تبتغوا کے محذوف مفعول بہ سے حال ہے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اس کا عطف لِتَبْتَغُوْا پر ہے معنی یہ ہوگا تا کہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ اَللّٰهُ الَّذِیْ والا جملہ ان آیات کے ساتھ متصل ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کا ذکر تھا درمیان میں معترضہ جملے ہیں۔

۲؎ اس کا عطف سخر پر ہے مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے مراد سورج، چاند، ستارے پانی اور برف وغیرہ ہیں ما فی الارض سے مراد حیوانات، نباتات، معدنیات چشمے اور نہریں ہیں۔ جمیعًا یا تو تاکید ہے یا حال ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے چند امور کے لئے انہیں مسخر کیا جن کا نفع تمہیں ہی پہنچتا ہے منہ جار مجرور ما موصولہ سے حال ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سب کو تمہارے لئے مسخر کیا یا یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی ھی جمیعا منه یا یہ مَا فِی السَّمٰوٰتِ کی خبر ہے یا مَا فِی الْاَرْضِ کی خبر ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے زجاج نے کہا اس کا معنی ہے یہ سب اس کی طرف سے فضل ہے (1)۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور وفکر کرتے ہیں ان کے لئے ان میں بڑی نشانیاں ہیں۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

" (اے حبیب) فرمائیے اہل ایمان کو کہ درگزر کرتے رہیں ان لوگوں سے جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تا کہ اللہ خود بدلہ دے ہر قوم کو جو وہ کیا کرتے تھے ۱؎ جو نیک عمل کرتا ہے پس وہ اپنے بھلے کے لئے کرتا ہے اور جو برا کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہوگا پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا ۲؎ "

میں گالی دی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارادہ کیا کہ اسے پکڑ لیں (1) تو اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا یہاں قول کا مقولہ حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ جواب امر اس پر دلالت کرتا ہے جواب امر یغفروا ہے معنی یہ بنے گا آپ انہیں کہیں کہ معاف کر دو اگر آپ انہیں معاف کر دینے کا کہیں گے تو وہ معاف کر دیں گے اور درگذر سے کام لیں گے۔ لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان ایام کی توقع اور خوف نہیں رکھتے جن میں ان پر مصیبت آ سکتی ہے یہاں اس سے مراد کفار ہیں۔ عربوں کے ہاں جنگ کے واقعات کو ایام العرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی کفار ان اوقات کا خوف نہیں رکھتے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی فتح اور ان کی جزاء کے لئے معین کر رکھا ہے۔ امام بغوی نے کہا قرظی اور سدی نے کہا یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ ابھی انہیں جہاد کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور مشرک انہیں سخت اذیتیں دیا کرتے تھے۔ ان صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (2) پھر اس آیت کا حکم جہاد والی آیت سے منسوخ کر دیا۔ ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے لنجزی جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے تاکہ عظمت شان کا اظہار ہو، جبکہ باقی قراء نے واحد مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے واحد مذکر غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں فعل مصدر کی طرف منسوب ہوگا۔ کسائی نے یہی قول کیا ہے۔ یہاں جزاء سے مراد وہ چیز ہوئی جس کے ساتھ جزاء دی جاتی ہے کیونکہ جب مفعول بہ موجود ہو تو پھر فعل کی مصدر کی طرف نسبت کرنا ضعیف ہوتا ہے۔ قوم سے مراد یا تو مومن ہیں پھر معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ مومنوں کو بدلہ عطا فرمائے گا کیونکہ وہ کفار کی اذیتوں پر صبر کرتے رہے ہیں یا قوم سے مراد کفار ہیں تو پھر معنی ہوگا اللہ تعالیٰ کفار کو کامل جزاء دے گا۔ دنیا میں اس سے انتقام لینے کی وجہ سے ان کو سزا میں کوئی کمی نہیں کرے گا یا معنی یہ ہے دونوں قوموں کو ان کے اچھے برے عمل کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

15۔ جو انسان اچھا عمل کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی کرتا ہے کیونکہ اس کا ثواب اسے ہی ملتا ہے اور جو برا عمل کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی برا کرتا ہے کیونکہ اس کا برا انجام اسی کو دیکھنا ہوتا ہے۔ جب تم اپنے اعمال کی وجہ سے جزاء اور سزا کے مستحق بن جاؤ گے تو پھر تمہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اگر اچھا عمل کیا ہوگا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائے گا اگر برا عمل کیا ہوا ہوگا تو سزا دے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶﴾ وَاٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی بنی اسرائیل کو کتاب حکومت اور نبوت اور ہم نے ان کو پاکیزہ رزق دیا اور انہیں بزرگی دی (اپنے زمانے کے) اہل جہان پر۔ اور ہم نے انہیں دین کے معاملہ میں واضح دلائل دیئے پس آپس میں انہوں نے جھگڑنا شروع نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ انہیں (حقائق) کا صحیح علم آ گیا محض باہمی حسد وعناد کے باعث یقیناً آپ کا

لے یہاں الْکِتٰبَ سے مراد تورات، انجیل اور زبور ہے۔ حکم سے مراد علماء اور بادشاہ ہیں، یعنی حکم والے عطا کئے۔ نبوت کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کیونکہ بنی اسرائیل میں کثیر انبیاء ہوگزرے ہیں۔ پاکیزہ رزق سے مراد من وسلویٰ اور دوسرے لذیذ کھانے ہیں اور انہیں اس زمانہ کے لوگوں پر فضیلت عطا کی کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوا۔ فَضَّلْنٰهُمْ میں هم ضمیر بنی اسرائیل کی طرف اس اعتبار سے لوٹائی گئی کہ ان میں سے بعض (انبیاء) کو اس زمانہ کے لوگوں پر فضیلت عطا کی۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان سے بڑھ کر کوئی معزز نہ تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا ان سے بڑھ کر کوئی محبوب تھا(1) اس آیت میں یہ دلالت موجود ہے کہ خاص بشر خاص فرشتوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔

۲۔ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ سے مراد ایسے دلائل ہیں جو دین کو واضح کرنے والے ہیں کیونکہ اس کے ذریعے انہیں ان چیزوں کا علم حاصل ہوگیا جس کا جاننا اور اعتقاد رکھنا واجب تھا۔ ساتھ ہی انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی نشانیوں کا علم بھی حاصل ہوگیا۔ وہ آپ کو یوں پہچانتے تھے جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے۔ علم حاصل ہونے کے بعد انہوں نے دین کے معاملہ میں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختلاف محض دشمنی، حسد اور خواہش نفس کی غلامی کی وجہ سے کیا، ان کی مخالفت کسی قطعی دلیل کی طرف منسوب نہ تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اکہتر یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہونا کسی دلیل کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ وہ نصوص قطعیہ کے مقابلے میں وہم کی پیروی کرتے تھے جس طرح معتزلہ نے فلاسفہ کی پیروی کی، جبکہ ان کا گمان یہ ہے کہ کافی ادراکات کے لئے عقل کافی ہے جس طرح مجسمہ ہیں۔ انہوں نے کہا موجود کا جسم ہوتا ہے یا رافضیوں اور خارجیوں کی طرح انہوں نے حسد اور عناد کی پیروی کی۔

دین کے معاملہ میں جو وہ اختلاف کرتے تھے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کا مواخذہ کر کے اور ان کے اعمال کا بدلہ دے کر فیصلہ فرما دے گا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

"پھر ہم نے پختہ کر دیا آپ کو صحیح راہ پر دین کے معاملہ میں پس آپ اس کی پیروی کرتے رہیں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو بے علم ہیں لے یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آپ کو قطعاً کچھ فائدہ نہ پہنچا سکیں گے۔ بلاشبہ ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کا دوست ہے ۲۔ یہ بصیرت افروز باتیں ہیں سب لوگوں کے لئے اور (باعث) ہدایت و رحمت ہے ان کے لئے جو یقین رکھتے ہیں ۳۔"

لے شریعت سے مراد صراط مستقیم اور حق کا راستہ ہے جن پر تمام رسولوں کو مبعوث کیا گیا۔ عَلٰى شَرِيْعَةٍ یہ جعلنا کا دوسرا مفعول ہے۔ امر سے مراد دین کا امر ہے تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ حق کے راستہ کی اتباع کریں یہاں فاء سببیہ ہے وَلَا تَتَّبِعْ میں اگرچہ خطاب ظاہر

الٰہی کا علم نہیں خواہ وہ جہل مرکب ہو جیسے فلاسفہ کا علم یا جہل بسیط ہو جیسے قریش کے سرداروں کا علم یا ان لوگوں کے پاس کتاب الٰہی کا علم تو ہو لیکن انہوں نے کتاب پر عمل کرنا جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو یا انہوں نے اس میں جھوٹی اور غلط تاویلیں کر لی ہوں گویا وہ حقیقت میں کچھ علم بھی نہیں رکھتے جس طرح یہودیوں کے علماء اور گمراہ فرقوں کے علماء خواہ ان کا تعلق مسلمانوں سے ہی کیوں نہ ہو۔

ع وہ لوگ جو آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ حق کا راستہ چھوڑ کر ان کی اتباع کریں اگر آپ ان کی اتباع کریں گے تو وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے مِنَ اللّٰہِ جار مجرور شَیْئًا سے حال ہے اور شَیْئًا، مفعول بہ ہے یا شیئا یغنوا کا مفعول مطلق ہے من عذاب الله میں مِنْ بعضیہ ہے اور یہ مکمل جملہ لَا تَتَّبِعْ کی علت بیان کر رہا ہے۔

ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اس لئے انہیں اپنا دوست نہ بنائیں کیونکہ باہم اکٹھے ہونے کے لئے ہم جنس ہونا ضروری ہوتا ہے (جبکہ وہ ظالم ہیں اور تم ظلم سے دور رہتے ہو) اللہ تعالیٰ متقین کا دوست ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو اپنا دوست بناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور شریعت کے احکام کی اتباع کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ دونوں جملے اس قول سے کنایہ ہیں کہ وہ آپ کو کچھ نقصان نہیں دے سکتے کیونکہ ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کا دوست ہے ان دونوں دوستیوں میں کتنا فرق ہے اللہ تعالیٰ کی دوستی قوی ہے اس لئے وہ ظالم آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

سے اسم اشارہ سے مراد قرآن یا شریعت کی اتباع ہے، یعنی اس میں ایسے اسباب ہیں جو لوگوں کے لئے دونوں جہانوں میں ان کی کامیابی کی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں اس میں گمراہی سے ہدایت اور اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے والی قوم کے لئے رحمت ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''کیا خیال کر رکھا ہے ان لوگوں نے جو ارتکاب کرتے ہیں برائیوں کا کہ ہم بنا دیں گے انہیں ان لوگوں کی مانند جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ یکساں ہو جائے ان (دونوں) کا جینا اور مرنا بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں لے اور پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ تاکہ بدلہ دیا جائے ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر (قطعاً) ظلم نہیں کیا جائے گا ع''

لے اس جملے کا عطف هذا بصائر پر ہے۔ ام منقطعہ ہے اس میں ہمزہ انکار اور شرمندہ کرنے کے لئے ہے اور ام ضراب کے معنی میں ہے آیت کا معنی یہ ہو گا یہ لوگ یقین نہیں رکھتے کہ قرآن سراپا ہدایت ہے بلکہ جنہوں نے گناہ کئے وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح بنا دیں گے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے۔ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ نجعل کا دوسرا مفعول ہے۔ یہ آیت مشرکین مکہ کے حق میں نازل ہوئی۔ وہ مومنوں سے کہتے تھے جو تم دوبارہ زندہ کئے جانے کے بارے میں کہتے ہو اگر وہ حق ہے تو ہم آخرت میں بھی تم سے فضیلت رکھنے والے ہوں گے جس طرح ہم دنیا میں تم سے بہتر حالت میں ہیں۔ حمزہ، کسائی اور حفص نے سواء کو منصوب پڑھا

ہوں گی تو پھر سواء دوسرے اسم موصول سے حال ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے دونوں ضمیریں دونوں جماعتوں کے لئے ہوں تو سواء، کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے بدل ہوگا یا دوسرے اسم موصول یا پہلے کی ضمیر سے حال ہوگا۔ باقی قراء نے سواء کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ خبر مقدم ہے اور مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ مبتدا ہے اور جملہ دوسرے مفعول سے بدل ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ جملہ مفعول ثانی ہو یا یہ جملہ مستانفہ ہو اور اس انکار کا تقاضا کرنے والا امر کی وضاحت کرتا ہے یا یہ حال ہے اور ضمیریں دونوں جماعتوں کے لئے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ موت کے بعد وہ دونوں برابر ہوں یا مواخذہ نہ کئے جانے میں برابر ہوں جس طرح وہ دنیا میں رزق اور صحت میں برابر تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں ضمیریں دونوں جماعتوں کے لئے ہیں اور جملہ مستانفہ ہے۔ معنی یہ ہوگا مومن دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا محب اور محبوب ہوتا ہے، جبکہ کافر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا مبغوض ہوتا ہے۔

وہ مساوات کا جو فیصلہ کرتے ہیں وہ کتنا ہی برا ہوتا ہے امام بغوی نے کہا مسروق نے کہا اہل مکہ کے ایک آدمی نے مجھے کہا یہ تیرے بھائی تمیم داری کی قیام گاہ ہے اللہ کی قسم ایک رات صبح ہو چکی تھی یا صبح ہونے والی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے آیت پڑھتے تھے رکوع کرتے، سجدہ کرتے اور روررہے تھے اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ(1)۔

۲؎ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا تاکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی قدرت اور صفات کمال پر دلالت کریں گویا یہ مذکورہ امور پر دلیل ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو فضول پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کی یہ شان اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مظلوم کو ظالم سے بدلہ دلائے، گناہ گار اور نیکوکار میں فرق کرے اور اگر دنیاوی زندگی میں ایسا نہیں ہوا تو موت کے بعد ضرور ایسا ہونا چاہیے۔ لتجزی کا عطف بالحق پر ہے کیونکہ وہ علت کے معنی میں ہے یا اس کا عطف محذوف علت پر ہے۔ معنی یہ ہوگا تاکہ لوگ اس کے ذریعے صانع، اس کی قدرت اور اس کے عدل پر استدلال کریں اس کی اطاعت پر قائم رہیں اور ہر نفس کو اچھے برے عمل کی جزاء دی جائے گی۔ نہ ان کے ثواب میں کمی کی جائے گی اور نہ ہی ان کے عذاب میں اضافہ کیا جائے گا۔ یہاں اسے ظلم کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا، جبکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل بھی ظلم نہیں۔ اس میں مشاکلہ کا قاعدہ جاری ہو رہا ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور یہ فعل کرتا تو یہ ظلم ہوتا جس طرح ابتلاء اور اختبار اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور سے صادر ہو تو وہ ظلم ہوتا ہے۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۳

”ذرا اس کی طرف تو دیکھو جس نے بنالیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو اور گمراہ کر دیا ہے اسے اللہ نے باوجود علم کے اور مہر لگا دی ہے اس کے کانوں اور اس کے دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ پس کون ہدایت دے سکتا ہے اسے اللہ کے بعد (لوگو!) کیا تم غور نہیں کرتے ۱؎۔“

۱؎ فاء عاطفہ ہے۔ اس جملہ کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اتبهتم ان تهديهم فرایت۔ من شرطیہ ہے، اتخذ و اوالا جملہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر شرط ہے، جس وجہ سے رایت معلق ہو گیا ہے فَمَنْ یَّهْدِیْهِ شرط کی جزاء ہے هواء، اتخذ کا مفعول اول

دیا اور منہیات سے اعراض کرنا ترک کر دیا، اپنی خواہشات کی پیروی کی گویا اس کو اپنا معبود بنالیا۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن اور قتادہ نے کہا وہ کافر ایسا ہے جس نے اپنا دین اپنی خواہشات کو بنالیا وہ کسی چیز کی خواہش نہیں کرتا مگر اسے اپنے اوپر سوار کر لیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر کماحقہ یقین نہیں رکھتا اس لئے ڈرتا نہیں اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام کی ہوتی ہیں انہیں حرام نہیں جانتا۔ دوسرے علماء نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے اپنا معبود خواہش نفس کو بنالیا ہے۔ اس کا نفس جو خواہش کرتا ہے تو وہ اس کی عبادت کرنے لگتا ہے(1) ابن جریر اور ابن منذر نے یہی روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے سعید بن جبیر کا ایسا ہی قول ذکر کیا ہے کہ عرب پتھر، سونے اور چاندی کی عبادت کرتے تھے اگر وہ پہلے سے خوبصورت پتھر کو دیکھتے تو پہلے پتھر کو پھینک دیتے، اسے توڑ دیتے اور دوسرے کی عبادت کرنے لگ جاتے(2) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ امام شعبی نے کہا خواہش کو ھوی اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ خواہش کرنے والے کو جہنم میں گرا دیتی ہے(3)۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے گمراہی کو مقدر کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی گمراہی اور استعداد کے فساد کو جانتا تھا، ایک قول یہ کیا گیا کہ اس انسان کی تخلیق سے پہلے اس کے علم میں تھا کہ یہ انسان گمراہ ہو جائے گا۔ امام احمد نے ایک صحابی سے روایت کیا ہے جسے لوگ حضرت ابوعبداللہ کہتے آپ کے ساتھی حضرت ابوعبداللہ کی عیادت کرنے کے لئے آئے، جبکہ آپ رو رہے تھے۔ ساتھیوں نے پوچھا کیوں روتے ہو! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں یہ نہیں فرمایا تھا اپنی مونچھیں کاٹ لو پھر اس پر ثابت قدم رہو یہاں تک کہ مجھے ملو تو ابوعبداللہ نے کہا کیوں نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دائیں ہاتھ میں ایک مٹھی بھری اور بائیں ہاتھ میں دوسری مٹھی بھری فرمایا یہ (دائیں) اس (جنت) کے لئے ہیں اور یہ (بائیں) اس (جہنم) کے لئے ہیں مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں اب میں کچھ نہیں جانتا کہ میں کس مٹھی میں سے ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہے اس لئے وہ نہ نصیحت کو سنتا ہے اور نہ آیات میں غور وفکر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے کانوں پر پردہ ڈال دیا ہے اس لئے وہ عبرت کی نظر سے آیات میں نظر وفکر نہیں کر سکتا۔ حمزہ نے غشوۃ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے غشاوۃ پڑھا ہے یہ بھی جائز ہے کہ من موصولہ ہو اور وہ صلہ کے ساتھ مل کر رایت کا مفعول اول ہو اور اس کا دوسرا مفعول محذوف ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی۔ اَرَاَيْتَهٗ تَهْتَدِيْ۔

فمن یھدی کا عطف رایت پر ہے۔ اس میں استفہام انکاری ہے۔ معنی یہ ہوگا جب اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں گمراہی کو مقدر کر دیا ہے تو اب اسے کوئی ہدایت عطا نہیں فرمائے گا اور افرایت والا جملہ جملہ معترضہ ہوگا۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ کا عطف محذوف کلام پر ہو گا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی الا تعقلون۔ فَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔

ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت ابوہریرہ سے روایت نقل کی ہے کہ دور جاہلیت میں لوگ یہ کہا کرتے تھے رات دن ہمیں ہلاک کر دیتے ہیں(4) تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ

بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾

'' اور وہ کہتے ہیں نہیں (کوئی دوسری) زندگی بجز ہماری دنیا کی زندگی کے (یہیں) ہم نے مرنا اور زندہ رہنا ہے اور نہیں فنا کرتا ہمیں مگر زمانہ حالانکہ انہیں اس حقیقت کا کوئی علم نہیں وہ محض ظن (وتخمین) سے کام لے رہے ہیں ۱؎ ۔''

۱؎ اس جملے کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے، یعنی کافر اپنی خواہشات کی اتباع کر کے گمراہ ہو گئے اور انہوں نے یہ کہا کہ زندگی تو صرف دنیاوی زندگی ہے جس میں کسی وقت ہمیں موت آ سکتی ہے اور کسی وقت ہم زندہ ہوتے ہیں، اس میں زندگی کو دنیاوی زندگی پر محدود کرنے کا بیان ہے۔ یہاں نَمُوْتُ وَنَحْيَا کے الفاظ اس امر پر دلالت نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک زندگی موت کے بعد ہوتی ہے کہ واؤ صرف جمع کے معنی پر دلالت کرتی ہے، ترتیب پر دلالت نہیں کرتی۔ زجاج کا یہی قول ہے وَمَا يُهْلِكُنَآ کا عطف نَمُوْتُ وَنَحْيَا پر ہے، یعنی زمانے کا گذرنا ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ کیونکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انسان بوڑھا ہو جاتا ہے اور اس سے موت آ جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے تھے۔ دھر کا لفظ اصل میں اس مدت کو کہتے ہیں جو عالم کی پیدائش سے لے کر عالم ختم ہونے تک محیط ہوتا ہے پھر ہر طویل عرصہ کو بھی دھر کہہ دیتے ہیں۔ زمانہ کا اطلاق چھوٹی بڑی دونوں مدتوں پر ہوتا ہے۔ ان کے پاس کوئی علم نہیں کیونکہ علم یا تو بدیہی طور پر حاصل ہوتا ہے یا برہان کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں بلکہ دلیل تو اللہ تعالیٰ کے وجود پر قائم ہے جو حکیم بھی ہے اور قدیم بھی ہے۔ یہ جملہ قالوا کے فاعل سے حال ہے۔ وہ علم اور دلیل کے بغیر ہی فیصلہ کئے جا رہے ہیں۔ یہ سابقہ کلام کی تاکید ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دھر کو گالی نہ دو کیونکہ اللہ ہی زمانہ (زمانہ کو پھیرنے والا) ہے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(1) امام بغوی نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابن آدم تو یہ نہ کہا کر اے زمانہ کی تباہی و بربادی کیونکہ میں ہی زمانہ ہوں، رات دن میں ہی بھیجتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو اسے قبض کر لوں(2) حدیث کا معنی یہ ہے تم میں سے جب کوئی زمانے کو گالی دیتا ہے تو اس کا گمان یہ ہوتا ہے کہ حادثات اور مصائب لانے والا زمانہ ہے، جبکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہوتا ہے، کوئی اور چیز اس میں مؤثر حقیقی نہیں تو تمہاری زمانے کو گالیاں اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ آتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان فان الله هو الدهر کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمانے اور زمانے میں جو کچھ ہے اس کو پیدا فرمانے والا ہے تو تمہارا زمانے کو گالی دینا تمہارے اس گمان کے مطابق ہے کہ زمانہ انہیں پیدا کرتا ہے تو یہ شرک ہو گیا اس لئے ایسی بات کرنے سے اجتناب کرو۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

'' اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری روشن آیتیں تو (ان کے جواب میں) ان کے پاس کوئی دلیل

تمہیں پھر وہی مارے گا تمہیں پھر جمع کرے گا تمہیں روزِ قیامت جس میں ذرا شک نہیں لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ ۲؎ ‘‘

۱؎ بَیِّنٰتٍ ترکیب کلام میں اٰیٰتُنَا سے حال ہے، یعنی جب ہماری آیات ان پر تلاوت کی جاتی ہیں جو واضح طور پر معتقدات کے خلاف امر پر دلالت کرتی ہیں یا موت کے بعد دوبارہ اٹھانے پر دلالت کرتی ہیں یا آیات کی حقیقت کو واضح کرنے والی ہیں تو ان آیات کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ اس چیز کا سہارا لیتے ہیں کہ ہمارے ان آباء و اجداد کو زندہ کر دو جو مر چکے ہیں اگر تم (مسلمان) دوبارہ اٹھائے جانے کے دعویٰ میں سچے ہو۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ اس سے پہلے جو کلام ہے وہ اس جواب پر دلالت کرتی ہے۔ اسے حجت کا نام دینے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کے گمان کے مطابق کلام کی یا اس اسلوب کے مطابق کلام کی تَحِيَّتُهُمْ بَيْنَهُمْ ضَرْبٌ وَجِيْعٌ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جب کسی شے کی حالت متحقق نہیں ہوتی تو نفس شے کا متحقق ہونا ممتنع ہے۔ اذا تتلی علیهم کا عطف قالوا ما هي الاحياتنا الدنيا پر ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے گا تمہیں زندہ کر دے گا۔ جب تمہاری موت کا ارادہ کرے گا تمہیں موت عطا کرے گا جس طرح دلائل دلالت کرتے ہیں۔ پھر جزاء کے لئے قیامت کے روز تمہیں زندہ کرے گا۔ یہاں الی کا کلمہ زائدہ ہے یا الی لام کے معنی میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے جو پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوسری دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت جزاء کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کی تاکید ہے لیکن اکثر لوگ اس پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو نہیں جانتے کیونکہ وہ سوچ بچار کم کرتے ہیں اور ان کی نظر و فکر میں کوتاہی پائی جاتی ہے۔ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ والا جملہ جملہ مستانفہ ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

’’اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جس روز برپا ہوگی قیامت اس روز سخت نقصان اٹھائیں گے باطل پرست ۱؎ اور آپ دیکھیں گے ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا ہوا ہر گروہ کو بلایا جائے گا اس کے صحیفہ (عمل) کی طرف (انہیں کہا جائے گا) آج تمہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔ ۲؎ ‘‘

۱؎ پہلے خصوصی قدرت کا ذکر کیا اب عمومی قدرت کا ذکر ہے۔ اس جملے کا عطف خلق الله السموات والارض پر ہے۔ يَوْمَئِذٍ پہلے یوم سے بدل ہے اور ظرف یخسر کے متعلق ہے، یعنی باطل پرستوں کا خسارہ ظاہر ہے کہ وہ جہنم میں ہی جائیں گے۔

۲؎ اس جملے کا عطف یخسر پر ہے۔ امام بغوی نے کہا کہ جاثیۃ کا معنی ہے گھٹنے کے بل بیٹھا ہوا ہونا۔ یہ حاکم کے سامنے مخاصم کے بیٹھنے کو کہتے ہیں جو فیصلے کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور فیصلہ کے لئے بیٹھوں گا۔ ہم نے اس کا ذکر سورۂ حج میں هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ کے ضمن میں کر دیا ہے۔ حضرت سلمان فارسی نے کہا

اللہ مجھے معاف کردے میں اپنے سوا کسی کے بارے میں تجھ سے سوال نہیں کرتا(1)۔ایک قول یہ کیا گیا کل امۃ جاثیہ رد مجتمع جماعت یہ جثوۃ سے مشتق ہے جس کا معنی جماعت ہے۔جزری نے نہایہ میں حضرت ابن عمر کی حدیث ذکر کی ہے ان الناس یصیرون یوم القیامتہ جثاء جثاء کو جثی بھی روایت کیا گیا ہے جو جاث کی جمع ہے،یعنی قیامت کے روز اپنے اپنے نبی کے پیچھے جماعت در جماعت چل رہے ہوں گے۔جب یہ جاث کی جمع ہوتو پھر اس کا معنی ہوگا وہ گھٹنے کے بل بیٹھا ہوا ہے۔عبداللہ بن احمد نے زوائد زہد میں اور بیہقی نے عبد بن ثانیہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گویا میں تمہیں جہنم سے پرے کرم کے مقام پر اکٹھے دیکھ رہا ہوں پھر سفیان نے اس آیت کی تلاوت کی وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً(2) ابن حجر نے کہا یہاں کرم سے مراد وہ بلند جگہ ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہوگی۔

یعقوب نے كُلُّ اُمَّةٍ میں کل منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ پہلے كُلُّ اُمَّةٍ سے بدل ہے یا اس کی تاکید لفظی ہے اور مابعد اس کی صفت ہے یا یہ تری کا دوسرا مفعول ہے،جبکہ جمہور قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے اور تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا اس کی خبر ہے یعنی اسے اپنے اعمال کے صحیفوں کو پڑھنے کی دعوت دی جائے گی جس طرح فرمان باری تعالیٰ ہے اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۝ حضرت انس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تمام نامہ اعمال عرش کے نیچے ہیں۔جب حشر برپا ہوگا اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا۔وہ دائیں بائیں ان صحیفوں کو اڑائے گی۔اس میں سب سے پہلی تحریر ہوگی اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۝ اسے امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ والا جملہ یا تو كُلُّ اُمَّةٍ کی دوسری صفت ہے یا دوسری خبر ہے اور اس سے پہلے قول محذوف ہوگا۔تقدیر کلام یہ ہوگی یقال لھم الیوم تجزون یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝

''یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ ہم لکھ لیا کرتے تھے جو تم(دنیا میں)عمل کیا کرتے تھے[1]۔پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا یہی وہ روشن کامیابی ہے[2]۔اور جو لوگ کفر کرتے رہے(ان سے پوچھا جائے گا)کیا میری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت نہیں کی جاتی تھیں پھر تم(سن کر)تکبر کیا کرتے تھے اور تم لوگ(عادی)مجرم تھے[3]۔''

[1] یہ تمہارے نامہ اعمال ہیں جن کو ہمارے حکم سے کراما کاتبین نے لکھا ہے۔اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے ان اعمال کو لکھا ہے اس لئے کتاب کی اضافت اپنی ذات کی طرف کی۔كِتٰبُنَا یہ هٰذَا کی صفت ہے اور خبر يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ ہے،یعنی جو کچھ تم اعمال کرتے رہے ہو

عامل اسم اشارہ کا معنی ہے بالحق یعنی سچائی کے ساتھ۔ نہ اس میں اضافہ ہوگا اور نہ ہی کوئی کمی ہوگی۔ جو تم عمل کیا کرتے تھے ہم فرشتوں سے لکھوا لیتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ نَسْتَنْسِخُ کا معنی ہے ہم نسخہ لے لیتے ہیں اس کی صورت یہ تھی کہ فرشتے انسانوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں لے جاتے جن اعمال پر ثواب اور عقاب مرتب ہو اللہ تعالیٰ اسے باقی رکھتا اور لغو عمل ختم کر دیتا جس طرح عربوں کا قول ہے ھلم و اذھب یہ جملہ لینطق کی علت بیان کر رہا ہے۔

۲؎ یہ جملہ الیوم تجزون کی تفصیل ہے۔ اس کی رحمت میں جنت بھی شامل ہے اَلْفَوْزُ الْمُبِیْنُ سے مراد ظاہر کامیابی ہے کیونکہ وہ ہر آمیزش سے پاک ہے۔

۳؎ اَفَلَمْ تَكُنْ میں ہمزہ نفی کے انکار کے لئے ہے اور جس چیز کی نفی کی جا رہی ہے اسکو ثابت کرتا ہے۔ افلم میں فاء عاطفہ ہے۔ مابعد جملے کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی الم یاتکم رسلی فلم تکن ایاتی تتلی علیکم اس سے پہلے قول اور معطوف حذف کر دیا گیا اور کلام سے جو مقصود تھا اسی پر اکتفاء کیا گیا اور قرینہ کی وجہ سے اس کلام کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

یعنی کیا تم پر ہماری آیات تلاوت نہ کی گئی تھیں تو تم نے ان پر ایمان لانے سے تکبر کیا تھا۔ تم ایسی قوم ہو کفر اور جرم کرنا جن کی عادت ہے۔ مقابلہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ کلام یوں ہوتی و اما الذین کفروا فید خلکم ربھم فی غضبہ اس کے غضب میں سے جہنم بھی ہے لیکن کلام کو اس کی طرف پھیر دیا گیا۔ مقصود یہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے اس پر آمادہ کیا جائے۔

وَ اِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ ﴿۳۲﴾ وَ بَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ قِیْلَ الْیَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۳۴﴾

"اور جب (تمہیں) کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت (کے آنے) میں کوئی شک نہیں تو تم (بڑے غرور سے) کہتے ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے ہمیں تو یونہی ایک گمان سا ہوتا ہے اور ہمیں اس پر (قطعاً) یقین نہیں ۱؎ اور ظاہر ہو گئے ان کے لئے برے نتائج ان کے کرتوتوں کے اور (ہر طرف سے) گھیر لیا انہیں اس (عذاب) نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ۲؎ اور (انہیں) کہہ دیا گیا آج ہم تمہیں فراموش کر دیں گے جس طرح تم نے فراموش کیے رکھا اپنے اس دن کی ملاقات کو اور تمہارا ٹھکانا آگ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ۳؎"

۱؎ اس جملے کا عطف استکبر تم پر ہے، یعنی جب تمہیں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے۔ یہاں وعد سے مراد موعود (اسم مفعول) ہے یا اس سے مراد مصدر ہے یا وعدہ جس کے ساتھ متعلق ہے، یعنی دوبارہ اٹھانا حق ہے اور ضرور ہو کر رہے گا۔ حمزہ نے الساعۃ کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ان کے اسم پر ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ اس کا عطف انّ کے اسم کے محل پر ہے، یعنی قیامت ضرور واقع ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ جس بارے میں خبر دے اس کے خلاف ہونا محال ہے تو تم نے کہا ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے ان کا یہ

نکرہ اس لئے ذکر کیا تا کہ اس کی حقارت کا بیان ہو۔ معنی یہ بنے گا ہم وہم کے مرتبہ والا گمان رکھتے ہیں کیونکہ ظن کا اطلاق بعض اوقات علم پر بھی ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ بعض اوقات ظن کا اطلاق وہم پر بھی ہوتا ہے۔ پہلے ظن سے مراد علم ہے اور دوسرے ظن سے مراد وہم ہے ظن کی نفی کو وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ کے ساتھ مؤکد کیا۔

۲۔ دنیا میں جو وہ اعمال سینہ کرتے رہے ان کی قباحت ظاہر ہوئی یا انہوں نے جو اعمال کئے ان کی جزاء ظاہر ہوئی۔ اس کا عطف سابقہ جملہ کے مضمون پر ہے، یعنی جنہوں نے کفر کیا اللہ تعالیٰ اپنے غضب میں داخل کرے گا اور ان کے لئے اپنے اعمال کی جزاء ظاہر ہوئی اور استہزاء کی جزا بھی ان پر نازل ہوگی۔

۳۔ اس جملے کا عطف بدا الھم پر ہے۔ آج ہم تمہیں عذاب میں اس طرح چھوڑ دیں گے جس طرح ایک بھلائی گئی چیز کو چھوڑ دیا جاتا ہے جس طرح تم نے اس دن کی تیاری کو بھلا دیا تھا اور تم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ لقاء کی یوم کی طرف اضافت اسی طرح ہے جس طرح مصدر کی اضافت ظرف کی طرف ہوتی ہے، یعنی تم اپنے رب کی ملاقات کے دن کو بھول گئے تھے یا تم اپنے اعمال کی جزاء کی ملاقات کے دن کو بھول گئے تھے۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے اور کوئی ایسا مددگار نہیں ہوگا جو تمہیں اس مصیبت سے نجات دے یہ دونوں جملے یا تو ماقبل مقولہ کے معطوف ہیں یا ننسا کم کے مفعول بہ سے حال ہیں۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۞ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞

''یہ اس لئے کہ تم نے بنا رکھا تھا اللہ کی آیتوں کو مذاق اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا تمہیں دنیوی زندگی نے پس آج وہ نہیں نکالے جائیں گے آگ سے اور نہ انہیں توبہ کر کے اپنے رب کو راضی کرنے کا موقع دیا جائے گا ۱۔ پس اللہ کے لئے ہیں سب تعریفیں جو رب ہے آسمانوں کا اور رب ہے زمین کا (اور وہی) سارے جہانوں کا پروردگار ہے ۲۔ اور فقط اسی کے لئے بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی عزت والا حکمت والا ہے ۳۔''

۱۔ عذاب میں تمہیں اس لئے چھوڑا جا رہا ہے کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے بارے کوئی سوچ و بچار نہیں کرتے تھے۔ یہاں ھزوا اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ دنیاوی زندگی نے تمہیں دھوکہ دیا، یعنی تمہارا یہ گمان تھا کہ دنیاوی زندگی کے سوا کوئی زندگی نہیں اور نہ ہی کوئی حساب ہوگا۔ یہ جملہ آخر تک جملہ مستانفہ ہے حمزہ اور کسائی نے يَخْرُجُوْنَ کو معروف کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کا عطف اما الذین کفروا پر ہے اور ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا جائے گا کہ توبہ کر کے اپنے رب کو راضی کریں کیونکہ اب توبہ کا وقت گذر چکا ہے۔ یہ عتبی سے مشتق ہے جس کا معنی رضا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

اطاعت کی طرف پلٹ آئیں(1) مسند الیہ کو مقدم کرنا، جبکہ خبر جملہ فعلیہ ہے یہ تخصیص پر دلالت کرنے کی وجہ سے ہے کیونکہ کفار سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، جبکہ مومنوں کا معاملہ مختلف ہے۔

1۔ ایمان لانے والوں اور جھٹلانے والوں میں وعدہ کو پورا کرنے کا وصف جمیل صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لفظ اللّٰہ سے بدل ہے۔ لفظ رب کو مکرر ذکر کیا کیونکہ ہر چیز کی پرورش اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل نعمت ہے جو اس کے کمال پر دال ہے۔ الْاَرْضِ اور السَّمٰوٰتِ میں حرف عطف کا ذکر کیا مقصود ان دونوں میں مغائرت کو بیان کرنا ہے، جبکہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے پہلے حرف عطف ذکر نہیں کیا کیونکہ دونوں معنی کے اعتبار سے متحد ہیں کیونکہ زمین و آسمان کائنات کے عظیم افراد میں سے ہیں گویا یہ دونوں عالمین کے معنی میں ہیں۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کے آثار زمین و آسمان میں ظاہر ہیں یا کہا جا سکتا ہے کہ ظرف محذوف کے متعلق ہے۔ معنی ہوگا زمین و آسمان والے یہاں فیصلہ کرتے ہیں وہ غالب ہے کوئی اس پر غالب نہیں اور نہ ہی کسی کے لئے جائز ہے کہ اس پر اپنی بڑائی کا اظہار کرے اور اس نے جو بھی اندازہ لگایا اور فیصلہ کیا اس میں حکمت کا اظہار کیا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار (تہ بند) ہے ان میں کسی نے مجھ سے جھگڑا کیا میں اسے جہنم میں داخل کروں گا۔ ایک روایت میں ہے کہ میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا۔ امام مسلم نے اسے روایت کیا(1)۔

سورۃ الاحقاف

ایاتھا ۳۵ — سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ مَكِّيَّةٌ ٤٦ — رکوعاتھا ۴

سورۃ الاحقاف مکی ہے، اس میں پینتیس آیات اور چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴﴾

"حامیم اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ کی طرف سے جو سب پر غالب بہت دانا ہے [1] نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور مدت مقررہ تک اور کفار اس چیز سے جس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے روگردانی کرنے والے ہیں [2] فرمائیے (اے کفار) کبھی تم نے (غور سے) دیکھا ہے جنہیں تم اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) پکارتے ہو (بھلا) مجھے بھی تو دکھاؤ جو پیدا کیا ہے انہوں نے زمین سے یا ان کا آسمانوں (کی تخلیق) میں کچھ حصہ ہے۔ لاؤ میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے اتری ہو یا کوئی (دوسرا) علمی ثبوت اگر تم سچے ہو [3]۔"

[1] اس کی تفسیر سورۃ جاثیہ میں گزر چکی ہے۔

[2] ہم نے آسمانوں زمین اور ان کے درمیان جو مخلوق بھی پیدا کی ہے وہ حق کے ساتھ پیدا کی۔ وہ مخلوق صانع کے موجود ہونے، اس کے قدیم ہونے اور اس کے حکیم ہونے پر دلیل ہے نیز جزاء کے لئے دوبارہ اٹھانے کے برحق ہونے پر دلیل ہے جس طرح حکمت اور عدل کا تقاضا ہے ان کے لئے وقت مقرر کر دیا گیا جس وقت کے آنے پر زمین و آسمان ختم ہو جائیں گے اس اجل سے مراد یوم قیامت ہے۔ عَمَّآ اُنْذِرُوْا میں ما مصدریہ ہے یا ما موصولہ ہے۔ ما مصدریہ ہو تو معنی ہوگا جنہوں نے انذار کا انکار کیا۔ ما موصولہ ہو تو معنی ہوگا قرآن میں قیامت کے دن کے جس عذاب سے انہیں ڈرایا گیا تھا اس کا انکار کیا۔ وہ اعراض کرنے والے ہیں، وہ سوچ و بچار نہیں کرتے کہ یہ عذاب عقل کے اعتبار سے جائز ہے اور نقلی دلیل سے بھی ثابت ہو چکا ہے کیونکہ اس کے بارے میں اس نے بتایا جسے معجزات کی شہادت نصیب

مجھے دکھاؤ اریتم میں ہمزہ تقریر کے لئے ہے، یعنی مخاطب کو اس بات پر برانگیختہ کیا کہ وہ اقرار کریں۔ مَاذَا خَلَقُوْا میں ما استفہامیہ محل نصب میں ہے جو خلقوا کا مفعول بہ ہے یا یہ محل رفع میں ہے اور اسی شے کے معنی میں ہے۔ مِنَ الْاَرْضِ یہ ماء کا بیان ہے اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ میں ام منقطعہ ہے۔ معنی ہوگا بلکہ انہیں آسمانوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشارکت حاصل ہے مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔۔۔ موصولہ مل کر اریتم کا مفعول اول ہے اور ارونی والا جملہ دوسرا مفعول ہے۔ معنی یہ ہوگا اپنے معبودوں کی حالت میں غور وفکر کر کے ۔۔۔ کیا عقل فیصلہ کرتی ہے کہ ان بتوں نے کائنات کی کوئی چیز پیدا کی ہے یا اس کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی چیز کے بنانے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہیں، یعنی اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تو پھر تم یہ کیسے فیصلہ کرتے ہو کہ یہ بت مستحق عبادت ہیں۔ آسمانوں کی تخلیق میں شرکت کی تخصیص اس لئے کی کیونکہ بعض لوگوں کا وہم ہے عالم سفلی (زمین) میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں عالم علوی (آسمان) کا عمل دخل ہوتا ہے تو ان سے سوال کیا گیا کہ کیا آسمان کی تخلیق میں ان بتوں کا کوئی عمل دخل ہے۔ جب ان کا عمل دخل نہیں تو یہ کس طرح عبادت کے مستحق بن سکتے ہیں۔

میرے پاس ایسی کتاب لے آؤ جو شرک کی دعوت دیتی ہو، جبکہ قرآن تو توحید کی دعوت دیتا ہے اور اسی کے بارے میں اظہار کرتا ہے۔

امام احمد نے حضرت ابن عباس سے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ کا معنی کیا ہے یعنی علم سے لکھی ہوئی چیز (1) مجاہد اور عکرمہ نے اثارة کا معنی روایت کیا ہے۔ قتادہ نے اس کا معنی خاص کیا ہے۔ کلبی نے اس کا معنی باقی ماندہ کیا ہے۔ قاموس میں ہے الاثر یعنی باقی ماندہ شے (2)۔ من علم یعنی پہلے انبیاء کے علم سے جو وحی قطعی کی طرف منسوب ہو اور وہ کلام شرک پر دلالت کرے۔ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بتوں کی عبادت کا حکم دیا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ سابقہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے، یعنی عقلی اور نقلی کوئی ایسی دلیل نہیں جو ان بتوں کے مستحق عبادت ہونے پر دلالت کرے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝٦

”اور کون زیادہ گمراہ ہے اس (بدبخت) سے جو پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود کو جو قیامت تک اس کی فریاد قبول نہیں کر سکتا اور وہ اس کے پکارنے سے ہی غافل ہیں [1] اور جب جمع کئے جائیں گے لوگ (روزِ محشر) تو وہ معبود ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے۔ [2]“

[1] اس جملے کا عطف قول کے مقولہ پر ہے، یعنی اس آدمی سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتا ہے اور ان سے حاجات طلب کرتا ہے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دیں گے، یعنی جب وہ بتوں کو بلاتا ہے بفرضِ محال اگر وہ ان کی آواز سن بھی لیں تب بھی وہ ان کی حاجت پوری نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے معانی کو نہیں جانتے اور نہ ان کی مصلحتوں کی رعایت کر سکتے ہیں

۲؎ اس جملے کا عطف لَا یَسْتَجِیْبُ پر ہے، یعنی جب قیامت کا دن ہوگا تو یہی معبودان عبادت کرنے والوں کے دشمن ہوں گے، عبادت کرنے والوں کو تکلیف دیں گے، انہیں کوئی نفع نہ دیں گے اور وہ ان کی عبادت سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے اور کہیں گے تبرنا الیک ما کانوا ایانا یعبدون، یعنی اے اللہ یہ جو ہماری عبادت کرتے رہے ہیں ہم ان سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں جہانوں میں ان کے لئے اس عمل میں کوئی نفع نہ ہوگا۔ دنیا میں ان کے اس عمل نے انہیں کوئی نفع نہ دیا تھا اور آخرت میں انہیں ان کا یہ عمل انہیں نقصان دے گا تو اس آدمی سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جس نے ان بتوں کی عبادت کی اور اللہ تعالیٰ جو سمیع، بصیر، خبیر، قادر اور مجیب ہے اس کی عبادت کو چھوڑ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ کَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ کٰفِرِیْنَ میں جمع کی ضمیر ان عبادت کرنے والوں کے لئے ہے جو یہ کہتے ہیں وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ ﴿۲۳﴾۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ؕ﴿۷﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِیْ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۸﴾

"اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں جو روشن ہیں تو کہتے ہیں کفار حق کے بارے میں جب ان کے پاس آیا کہ یہ کھلا جادو ہے ۱؎ کیا وہ کہتے ہیں کہ نبی نے اس کو خود گھڑ لیا ہے فرمائیے اگر میں نے اس کو خود گھڑا ہے تو تم اس طاقت کے مالک نہیں کہ مجھے اللہ سے چھڑا لو وہ خوب جانتا ہے جن باتوں میں تم مشغول ہو وہ کافی ہے بطور گواہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان اور وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ ۲؎"

۱؎ اس جملے کا عطف والذین کفروا پر ہے یا یدعوا پر ہے جو من یدعوا میں ہے الحق سے مراد بھی آیات ہی ہیں اسم ضمیر کی جگہ یہاں اسم ظاہر ذکر کیا جس طرح الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کو بھی ضمیر کی جگہ ذکر کیا کیونکہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو عَلَیْهِمْ کی ضمیر سے مراد ہیں۔ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ آیات حق میں ان کا صدق ظاہر ہے، جبکہ ان پر کفر اور گمراہی میں منہمک ہونے پر مہر لگاتا ہے۔ جونہی ان پر حق نازل ہوتا ہے تو سوچے سمجھے بغیر منہ سے کہہ اٹھتے ہیں یہ واضح جادو ہے۔

۲؎ یا کہہ دیتے ہیں اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی طرف سے گھڑا ہے۔ یہاں ام منقطعہ ہے۔ استفہام انکار اور تعجب کے اظہار کے لئے ہے اور ان کے قول انه سحر سے اضراب ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہو اگر میں نے اسے اپنی طرف سے گھڑا ہے اور تمہارے سامنے بیان کر دیا ہے تا کہ تم بھی میری اتباع کرو تم تو اس بات پر قادر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مجھے بچا سکو تو پھر میں اللہ تعالیٰ پر ایسا بہتان باندھنے کی کیسے جرأت کر سکتا ہوں اور جب تمہاری طرف سے مجھے نہ نفع کی امید ہے اور نہ نقصان کا اندیشہ ہے تو میں اپنے آپ کو کیسے عذاب پر پیش کر سکتا ہوں۔ جو تم آیات کو جھٹلاتے ہو اور اسے جادو اور من گھڑت بات قرار دیتے ہو اللہ تعالیٰ اسے

کرنے پر بھی گواہ ہے۔ وہ آیات کی جو تکذیب کرتے تھے اس کے بارے میں یہ آیت ان کے لئے وعید ہے۔ جو آدمی توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اس کے لئے آیت میں مغفرت اور رحمت کا وعدہ بھی ہے نیز اس میں یہ شعور بھی دلایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معاملہ میں حلم سے کام لیتا ہے اور ان کے اتنے بڑے جرم کے باوجود جلدی عذاب نازل نہیں فرماتا۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

''آپ کہئے میں کوئی انوکھا رسول تو نہیں ہوں اور میں (ازخود) نہیں جان سکتا کہ کیا کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا کیا جائے گا تمہارے ساتھ میں تو پیروی کرتا ہوں جو وحی میری طرف بھیجی جاتی ہے اور میں نہیں ہوں مگر صاف صاف ڈرانے والا۔[1]''

[1] بدعا، بدیعا کی مثل ہے جس طرح نصف، نصیف کی مثل ہے، یعنی میں کوئی پہلا رسول نہیں کہ میں تمہیں ایسی چیز کی طرف دعوت دے رہا ہوں جس کی طرف مجھ سے قبل کسی نے دعوت نہ دی ہو۔ مجھ سے قبل کثیر رسول مبعوث کئے گئے تو معجزہ کی گواہی کے بعد تم کس لئے میری نبوت کا انکار کرتے ہو یا اس کا معنی یہ ہے میں ان چیزوں پر قادر نہیں جن پر پہلے رسول قادر نہیں تھے، یعنی تمہارے ہر بے معنی سوال کا جواب دینا اور تمہاری خواہشات پر معجزات کا ظہور میری شان نہیں۔

مَا يُفْعَلُ بِيْ میں ما یا تو موصولہ ہے اور یہ محل نصب میں ہے یا استفہامیہ ہے اور محل رفع میں ہے اور لا اس نفی کی تاکید بیان کر رہا ہے جو نفی مَا يُفْعَلُ بِيْ میں موجود ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مشرک خوش ہوئے اور کہالات وعزیٰ کی قسم ہمارا اور محمد کا معاملہ ایک جیسا ہے۔ اسے ہم پر کوئی فضیلت نہیں اگر یہ اپنی طرف سے گھڑ کر ہمارے سامنے بیان نہ کرتا تو جس نے اسے مبعوث کیا ہے وہ ضرور اسے بتا دیتا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانے والا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کو نازل فرمایا۔ صحابہ نے عرض کی اے اللہ کے نبی آپ کو مبارک ہو اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ جو سلوک کرنے والا ہے ہم اسے جان چکے ہیں۔ اب بتایئے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ کو نازل فرمایا اور اس آیت کو نازل فرمایا وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۝ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے ساتھ کئے جانے والے سلوک کو واضح کر دیا(1) امام بغوی نے کہا یہ حضرت انسؓ قتادہؒ حضرت حسن بصری اور عکرمہ کا قول ہے۔ یہ آیت اس آیت سے قبل نازل ہوئی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح حدیبیہ کے موقع پر بتایا گیا تھا کہ آپ کی خطائیں معاف کر دی گئی ہیں تو اس آیت کے ساتھ مذکورہ آیت کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ میرے نزدیک یہ قول پسندیدہ نہیں کیونکہ کوئی بھی خواہ مکی ہو یا مدنی ہو مومنوں کے لئے وعدہ اور کافروں کے لئے وعید سے خالی نہیں۔ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ حکم نازل ہوا کہ آپ اپنے قبیلہ کو آنے والے خطرات سے آگاہ کریں، یعنی انہیں بتائیں کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو انہیں عذاب الٰہی کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس سورت میں یہ آیات بھی

[illegible] اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ

نہ تھا اور کتاب میں پہلے مذکور نہ تھا کیونکہ یہ تو کفار کے اس اعتراض کا تقاضا کرتا ہے کہ ہمارا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ایک جیسا ہے۔ ہم اپنے اوپر آپ کی کوئی فضیلت نہیں دیکھتے تو پھر اپنے آباء کے دین کو چھوڑنے اور رسولوں کی اتباع کا کیا فائدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان لِّیَغْفِرَلَکَ اللّٰہُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَاتَاَخَّرَ اور لِّیُدْخِلَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ کو دس سال کے بعد نازل کرنا یہ ضرورت کے وقت سے بیان کو موخر کرنے کو لازم کرتا ہے جو محال ہے(1)۔

اگر یہ کہا جائے کہ امام بغوی نے اپنی سند سے خارجہ بن یزید سے روایت نقل کی ہے کہ ام العلاء انصاریہ کہا کرتی تھیں جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو انصار نے انہیں رہائش دینے کے لئے قرعہ اندازی کی۔ ہمارے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون آئے۔ وہ مریض ہو گئے۔ ہم نے ان کی تیمارداری کی پھر ان کا وصال ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ میں بھی آپ کے پاس حاضر ہوئی۔ میں نے کہا اے ابو مصائب تجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے عزتوں سے نوازا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھے کس چیز نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عزت بخشی۔ میں نے عرض کی اللہ کی قسم میں کچھ نہیں جانتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہاں تک اس کا معاملہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو موت آئی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اس کے لئے خیر ہوگی۔ اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، جبکہ میں اللہ کا رسول ہوں تو ام العلاء نے عرض کی اللہ کی قسم میں اس کے بعد کسی کے بارے میں ایسا تذکرہ نہ کروں گی۔ ام العلاء نے کہا بعد میں میں نے حضرت عثمان بن مظعون کو خواب میں دیکھا کہ ان کے لئے ایک چشمہ جاری ہے۔ میں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ آپ کا عمل ہے۔ یہ حدیث ان لوگوں کے قول کی تائید کرتی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے روز میرے اور تمہارے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کو میں نہیں جانتا ورنہ اس حدیث کا کیا معنی ہو سکتا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی معین شخص کے بارے میں نجات اور ہلاکت کا حکم لگائے کیونکہ یہ علم غیب کا دعویٰ بن جاتا ہے۔ باطن اور سر کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہاں اگر کسی آدمی کا ظاہر حال اچھا ہو تو اس کے بارے میں خیر کی امید کرنی چاہئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کہ میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، جبکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اولین اور آخرین کے علوم عطا فرمائے ہیں۔ اس کے باوجود میں تفصیل سے نہیں جانتا کہ مخصوص عمل پر میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا تو تم نے ایک معین آدمی کے حق میں کیسے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عزت سے نوازا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا کیونکہ میں علم غیب نہیں جانتا۔ سیاق کلام اس تفسیر سے موافقت نہیں رکھتا کیونکہ سیاق کلام تو یہ ہے کہ کفار تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ان کے دین کی پیروی کریں اور آپ کو وہ یہ لالچ دیتے کہ وہ آپ کے لئے مال جمع کریں گے اور بغیر مہر کے آپ کی شادی کر دیں گے۔ اتباع نہ کرنے کی صورت میں وہ آپ کو اذیتیں دیتے اور آپ کو دھمکاتے تھے۔ اس آیت کے سیاق کا مفہوم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ آپ کو ان سے کوئی لالچ نہیں [illegible]

رہے ہیں اس پر یہ قادر نہیں کیونکہ خیر اور شر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے تو پھر اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ فتح اور شکست میں سے جو کچھ میرے ساتھ کیا جانے والا ہے میں اسے نہیں جانتا تاہم میں تمہاری کسی صورت بھی اتباع کرنے والا نہیں (1)۔

میں تو قرآن کی اتباع کروں گا، کسی حال میں بھی اسے نہ چھوڑوں گا۔ امام بیضاوی نے کہا کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی غیب کی خبروں کے بارے میں سوال کیا تھا جن کے بارے میں وحی نہیں آئی تھی، اس کا یہ جواب ہے یا مسلمانوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ انہیں مشرکوں کی اذیتوں سے نجات مل جائے انہیں اس مطالبہ کا جواب دیا گیا امام بغوی نے بھی یہی قول کیا ہے۔ ایک جماعت نے کہا مَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ کا معنی ہے کہ دنیا میں میرے اور تمہارے ساتھ جو سلوک ہونے والا ہے اسے میں نہیں جانتا۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس بارے میں تو آپ کو یقینی علم تھا کہ آپ جنت میں ہوں گے اور آپ کو جھٹلانے والے جہنم میں ہوں گے پھر ان کا اس تعبیر میں اختلاف ہے (2) حضرت ابن عباس نے کہا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر ظلم و ستم بڑھ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھا جیسے سونے والا خواب دیکھتا ہے، جبکہ آپ مکہ مکرمہ میں تھے کہ ایک ہموار زمین ہے اور وہاں کھجور کے درخت ہیں اور آپ اس جگہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ آپ کے صحابہ نے آپ سے عرض کی آپ کب ہجرت کریں گے؟ آپ خاموش رہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل۔ فرمایا مراد یہ ہے کہ میں نہیں جانتا میں اس جگہ رہوں گا یا تمہارے ساتھ اسی جگہ ہجرت کر جاؤں گا جو میرے لئے ظاہر کی گئی (3)۔

بعض علماء نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس دنیا میں میرا انجام کیا ہوگا؟ کیا میں دنیا سے اسی طرح پردہ کروں گا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے یا مجھے شہید کر دیا جائے گا جس طرح کئی انبیاء کو شہید کیا گیا، جس طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا گیا تھا۔ اے تصدیق کرنے والو میں تمہارے بارے میں نہیں جانتا کہ تمہیں میرے ساتھ نکالا جائے گا یا تمہیں چھوڑ دیا جائے گا یا تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور اے جھٹلانے والو میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ تم پر پتھروں کی بارش کی جائے گی جس طرح حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسائے گئے یا تمہیں زمین میں دھنسا دیا جائے گا جس طرح قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا تھا یا سابقہ جھٹلانے والی قوموں کے ساتھ جو طرز عمل اپنایا گیا تھا ان میں سے کون سا عمل تمہارے ساتھ اپنایا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو یہ خبر دی کہ وہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرے گا۔ ارشاد فرمایا هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ اور آپ کی امت کے بارے میں فرمایا۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ ۔ ان آیات میں یہ بتا دیا گیا کہ آپ کے ساتھ اور آپ کی امت کے ساتھ کیا سلوک کیا جانے والا ہے (4)۔

اور میں تو کفار کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ واضح شواہد کے ساتھ اور ایسے معجزات کے ساتھ جو میری تصدیق کرنے والے ہیں میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں علم غیب رکھتا ہوں اور نہ ہی مجھے تم پر مسلط کیا گیا ہے کہ میں تمہیں ایمان لانے پر مجبور کروں۔

عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

’’فرمایئے کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ اگر یہ اللہ کی طرف سے ہو تو تم اس کا انکار کر دو (تو اس کا کیا انجام ہوگا) حالانکہ گواہی دے چکا ہے ایک گواہ بنی اسرائیل سے اس کی مثل پر اور وہ ایمان بھی لے آیا اور تم نے تکبر کیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ظالم لوگوں کو [1]۔‘‘

[1] انہیں فرمایئے کہ مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہو، جبکہ اے مشرکو تم نے اس کا انکار کیا ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ وَكَفَرْتُمْ میں واؤ حالیہ نہ ہو بلکہ واؤ عاطفہ ہو۔ اسی طرح وَشَهِدَ شَاهِدٌ میں واؤ عاطفہ ہو۔ پھر معنی ہوگا مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہو اور تم نے اس کا انکار کیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کی گواہی دے۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا یہاں گواہ سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام ہیں جو بنی اسرائیل کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ امام بخاری اور بیہقی نے حضرت انس سے، محمد بن اسحٰق نے حضرت عبداللہ بن سلام کے خاندان کے ایک فرد سے، امام احمد اور یعقوب بن سفیان نے حضرت عبداللہ بن سلام سے، بیہقی نے موسیٰ بن عقبہ اور ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا جب میں نے حضور ﷺ کے متعلق سنا اور میں نے آپ کی صفت، نام، شکل وصورت اور جن چیزوں کی ہم آپ میں توقع رکھتے تھے کو پہچان لیا تو میں نے اس بات کو دل میں ہی رکھا اور اس پر خاموش رہا یہاں تک کہ حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ جب آپ یہاں تشریف لائے تو ہمارے پڑوس میں بنی عمرو بن عوف کی بستی میں قیام کیا۔ ایک آدمی نے مجھے آپ کے آنے کی خبر اس وقت دی، جبکہ میں ایک کھجور پر چڑھا ہوا کام کر رہا تھا۔ میری پھوپھی خالدہ بنت حارث نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ جب میں نے آپ کے آنے کی خبر سنی تو میں نے اللہ اکبر کہا تو پھوپھی نے کہا اگر تو حضرت موسیٰ بن عمران کے آنے کی خبر سنتا تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہتا۔ میں نے کہا اے میری پھوپھی اللہ کی قسم! یہ آنے والا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھائی اور آپ کے دین پر ہے۔ آپ کو اسی دین کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے جس دین کے ساتھ حضرت موسیٰ کو بھیجا گیا تھا تو ان کی پھوپھی نے کہا یہ تو سنی ہوئی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا پھر میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے نکل پڑا۔ جب میں نے آپ کے چہرے کو دیکھا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں۔ میں نے حضور ﷺ سے سب سے پہلی بات یہ سنی تھی۔ اے لوگو! کھانا کھلاؤ، ایک دوسرے کو سلام دیا کرو، صلہ رحمی کیا کرو، رات کو نماز پڑھا کرو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں، تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ عرض کی اے محمد ﷺ میں آپ سے تین باتیں پوچھ رہا ہوں جنہیں صرف نبی ہی جانتا ہے۔ 1۔ قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟ 2۔ جنتیوں کا پہلا کھانا کونسا ہے۔ 3۔ اولاد ماں یا باپ کی ہم شکل کیوں ہوتی ہے۔ 4۔ چاند میں یہ سیاہ دھبہ کیسا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا جبرئیل امین نے ابھی ابھی مجھے ان کے بارے میں بتایا ہے۔ عبداللہ بن سلام نے کہا جبرئیل امین نے بتایا؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ہاں جبرئیل امین نے بتایا تو عبداللہ بن سلام نے کہا وہ فرشتوں میں سے یہودیوں کے دشمن ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا قیامت کی پہلی نشانی یہ ہے کہ مشرق سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو مغرب کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔ جنتی سب سے پہلا کھانا جو کھائیں گے وہ مچھلی کے جگر کی بڑھی ہوئی چیز ہوگی۔ جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آ جاتا ہے تو بچہ باپ کا ہم شکل ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے

فرمایاوَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وہ سیاہی جو چاند میں تم دیکھتے ہو وہ وہی روشنی کا مٹادینا ہے تو حضرت عبداللہ بن سلام نے یہ سن کر فوراً کلمہ شہادت پڑھا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّكَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پھر اپنے گھر آئے۔ انہیں بھی اسلام قبول کرنے کا حکم دیا، وہ سب مسلمان ہو گئے اور اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔

پھر عبداللہ بن سلام حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کی مجھے علم ہے کہ یہودی خوب جانتے ہیں کہ میں ان کا سردار ہوں سردار کا بیٹا ہوں، ان میں سے سب سے بڑا عالم ہوں اور سب سے بڑے عالم کا بیٹا ہوں تا ہم وہ بڑے بہتان باز (1) ہیں۔ اگر انہیں میرے اسلام لانے کا پہلے سے علم ہو گیا تو وہ مجھ پر ایسے ایسے جھوٹے بہتان باندھیں گے اور ایسی ایسی باتیں کریں گے جو مجھ میں نہیں' میں پسند کرتا ہوں کہ مجھے اپنے گھر میں پہلے بٹھالیں۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سلام کو پہلے گھر میں بٹھالیا پھر یہودیوں کی طرف پیغام بھیج دیا۔ یہودی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے فرمایا اے جماعت یہود تم پر افسوس ہے اللہ سے ڈرو قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم خوب جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں، میں تمہارے پاس پیغام حق لایا ہوں۔ اسلام قبول کر لو تو انہوں نے جواب دیا ہم تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ حضور ﷺ نے پوچھا عبداللہ بن سلام تم میں سے کیسا آدمی ہے تو یہودیوں نے جواب دیا وہ ہم میں سے بہترین ہے، بہترین فرد کی اولاد ہے۔ وہ ہمارا سردار ہے اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے۔ وہ ہم سے بڑا عالم ہے اور بڑے عالم کا بیٹا ہے۔ فرمایا اگر وہ اسلام قبول کر لے تو تمہاری کیا رائے ہو گی تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ اسے اس کام سے محفوظ رکھے۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سلام کو کہا باہر آ جاؤ۔ وہ باہر آئے اور کلمہ شہادت پڑھا اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اے جماعت یہود! اللہ سے ڈرو اور آپ جو پیغام تمہارے پاس لائے ہیں اسے قبول کرو۔ اللہ کی قسم تم اچھی طرح جانتے ہو یہ اللہ کے رسول برحق ہیں تم تورات میں اس کا نام اور اس کی صفات لکھی ہوئی پاتے ہو۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ ان کی تصدیق کرتا ہوں اور انہیں پہچانتا ہوں تو یہودیوں نے کہا تم جھوٹے ہو۔ تم ہم سب سے برے ہو اور سب سے برے کے بیٹے ہو اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں اسی بات سے ڈرا کرتا تھا۔ کیا میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا یہ بہتان باندھنے والے' دھوکے باز' جھوٹے اور بدکردار ہیں۔ انہوں نے اپنا اور اپنے گھر والوں کا اسلام ظاہر کر دیا۔ انکی پھوپھی بنت حارثہ بھی مسلمان ہو گئیں اور بہترین مسلمان بنیں (1)۔

طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ عوف بن اشجعی سے روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ تشریف لے گئے میں بھی آپکے ساتھ تھا۔ آپ یہودیوں کی عبادت گاہ میں پہنچے۔ یہ ان کی عید کا دن تھا۔ انہوں نے ہمارا وہاں آنا پسند نہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے یہودیوں کی جماعت مجھے اپنی جماعت میں سے ایسے بارہ آدمیوں کے بارے میں بتاؤ جو یہ گواہی دیتے ہوں لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ ہر اس یہودی سے جو آسمان کے نیچے رہ رہا ہے اپنے غضب کو ختم کر دے گا۔ وہ سب خاموش رہے، ان میں سے کسی نے بھی جواب نہ دیا پھر آپ وہاں سے واپس مڑے تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی آپ کے پیچھے ہے۔ اس نے کہا اے محمد

اللہ کی قسم ہم اپنی قوم میں تم سے بڑا عالم اور فقیہ کسی کو نہیں جانتے۔ اسی طرح تیرے باپ اور دادا سے بڑھ کر کسی کو بڑا عالم اور فقیہ نہیں جانتے پھر حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے وہی نبی ہیں جس کا ذکر تم تورات میں پاتے ہو۔ انہوں نے کہا تم نے جھوٹ بولا پھر اس کا رد کیا اور اس کے بارے میں سخت غلط باتیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1)۔

شیخین نے حضرت سعید بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے۔ کہ میں نے حضور ﷺ سے کسی زندہ کے بارے میں نہیں سنا کہ وہ جنتی ہے مگر آپ نے حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں کہا انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ۔ راوی نے مالک سے روایت کی راوی جن کا نام عبداللہ بن یوسف ہے جو امام بخاری کے شیخ ہیں انہوں نے کہا امام مالک نے خود اپنی طرف سے اس آیت کو پڑھا ہے یا حضرت سعید بن وقاص کی حدیث میں یہ حصہ مذکور تھا(2)۔

ابن جریر نے عبداللہ بن سلام سے روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی(3) اس تعبیر کی صورت میں یہ آیت مدنی ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن سلام مدینہ طیبہ میں اسلام لائے تھے۔ عَلٰی مِثۡلِهٖ میں مثل کا لفظ زائد ہے۔ ہ ضمیر قرآن کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے اس بات کی گواہی دی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یا معنی یہ ہوگا کہ جس طرح میں نے کہا بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے بھی ایسی گواہی دی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام اسلام لے آئے اور جماعت یہود تم نے ایمان لانے سے تکبر کیا، یعنی امن میں ضمیر حضرت عبداللہ بن سلام کے لئے ہے۔

مسروق نے اس بات کا انکار کیا کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے حق میں نازل ہوئی اور کہا اللہ کی قسم یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے حق میں نازل نہیں ہوئی کیونکہ یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جبکہ حضرت عبداللہ بن سلام مدینہ طیبہ میں مسلمان ہوئے تھے(4)۔ یہ آیت اس استدلال کے بارے میں نازل ہوئی جو حضور ﷺ نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہادت دی اور تورات میں شہادت یہ خبر ہے کہ حضور ﷺ مبعوث ہوں گے۔ عَلٰی مِثۡلِهٖ سے مراد وہ معانی ہیں جو تورات میں موجود ہیں جو قرآن کی تصدیق کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ایمان لائے، جبکہ اے جماعت قریش تم نے ایمان لانے سے تکبر کیا۔ اِنۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَنْ اَضَلُّ مِنْكُمْ او اَلَسْتُمْ ظٰلِمِيْنَ۔ محذوف جواب پر اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ دلالت کرتا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ افعال شرط جیسے کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَ کَفَرۡتُمۡ بِهٖ، شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ فَاٰمَنَ وَ اسۡتَكۡبَرۡتُمۡ سب یقینی ہیں تو پھر ان میں حرف شرط ان استعمال کرنیکی کیا وجہ ہے جبکہ حرف ان تو شک کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں تمام جملوں میں واؤ جمع کے معنی پر دلالت کرتی ہے اور ان شرطیہ کا کلمہ توبیخ کے لئے استعمال ہوا ہے، شک کی جگہ یقینی افعال کا لانا اس امر پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ عقل سلیم کے نزدیک اس کا انکار جائز نہیں، جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہے۔ جب اہل علم اس کی شہادت دے اور ایمان لے آئے تو پھر تکبر کرتے ہوئے اس کا انکار درست نہیں۔ یہ بھی

اس ارشاد کی مثل ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۔ واللہ اعلم۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَيْهِ ؕ وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۝

”اور کفار اہل ایمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ (اسلام) کوئی بہتر چیز ہوتی تو یہ ہم سے سبقت نہ لے جاتے اس کی طرف اور کیونکہ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوئی قرآن سے تو یہ اب ضرور کہیں گے کہ (اجی) یہ تو وہی پرانا جھوٹ ہے۔ لہ“

لہ اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا للحق پر ہے۔ ان کفار نے ان مومنوں سے کہا جو ان کی قوم سے تعلق رکھتے تھے اگر حضرت محمد ﷺ کا دین حق ہوتا تو یہ ہم سے پہلے مومن نہ ہوتے بلکہ ہم سب سے پہلے ایمان لے آتے۔ ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ مشرکوں میں چند لوگوں نے کہا ہم زیادہ عزت والے اور بہتر ہیں اگر اس دین میں کوئی خیر ہوتی تو فلاں فلاں اس کی طرف سبقت نہ لے جاتے تو یہ آیت نازل ہوئی(1)۔ ابن منذر نے عون بن ابی شداد سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب کی ایک لونڈی تھی جو حضرت عمر سے پہلے اسلام لائی تھی جس کا نام زنین تھا۔ حضرت عمر اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اسے مارتے تھے یہاں تک کہ اس کے اوسان خطا ہو جاتے۔ قریش کے کفار کے لئے اگر اس دین میں کوئی بھلائی ہوتی تو زنین ہم سے سبقت نہ لے جاتی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اس کے متعلق نازل فرمایا(2)۔ ابن سعد نے اسی کی مثل ضحاک اور حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے اس روایت پر اعتماد کرتے ہوئے کہ سابقہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں نازل ہوئی کہا کہ یہودیوں کافروں نے ان مسلمانوں کے بارے میں کہا جو انہی کی قوم سے تعلق رکھتے تھے اگر اس دین میں کوئی بھلائی ہوتی تو حضرت عبداللہ بن سلام اور آپ کے ساتھی ہم سے سبقت نہ لے جاتے(3)۔

اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ میں ظرف محذوف فعل کے متعلق ہے جو ظهر عنادهم یا ضلوا ہو سکتا ہے۔ بہ میں ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ اس جملے کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر ہے، یعنی ان کافروں نے قرآن سے اس طرح ہدایت حاصل نہ کی جس طرح اہل ایمان نے قرآن سے ہدایت حاصل کی۔ فَسَيَقُوْلُوْنَ میں فاء سببیہ ہے کیونکہ یہ قول ان کے عناد اور گمراہی کے ظہور کا نتیجہ ہے۔ یہ قول بھی ان کے اس قول کی طرح ہے اساطير الاولين، یعنی یہ پہلے لوگوں کے جھوٹ ہیں جنہیں پہلے لوگوں نے گھڑا تھا پھر ان سے محمد (ﷺ) نے اخذ کر لیا۔

وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ

''حالانکہ اس سے پہلے کتاب موسیٰ رہنما اور رحمت بن کر آ چکی ہے اور یہ کتاب (قرآن) تو اس کی تصدیق کرنے والی ہے عربی زبان میں ہے تاکہ بروقت خبردار کر دے ظالموں کو اور خوشخبری ہے نیکوکاروں کے لئے ۔[1] بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے پس کوئی خوف نہیں انہیں اور نہ غمگین ہوں گے ۔[2] یہی لوگ جنتی ہیں ہمیشہ رہیں گے اس میں یہ جزاء ہے ان نیکیوں کی جو وہ کیا کرتے تھے ۔[3]''

[1] مِنْ قَبْلِهٖ کی ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے اور جار مجرور کتب موسیٰ کی خبر مقدم ہے۔ کتاب سے مراد تورات ہے۔ اماما یہ قبلہ کی ضمیر سے حال ہے۔ امام کا معنی ہے جس کی اقتداء و پیروی کی جاتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے رحمت ہے تاکہ وہ فلاح دارین حاصل کر لیں۔ یہ مکمل جملہ جملہ معترضہ ہے۔

یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب یا اپنے اعجاز کی وجہ سے حضور ﷺ کی تصدیق کرتی ہے۔ مصدق یہ کتاب کی صفت ہے۔ لسانا عربیا یہ مصدق میں موجود اس ضمیر سے حال ہے جو کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے یا یہ کتاب سے حال ہے کیونکہ اس کی صفت مذکور ہونے کی وجہ سے وہ نکرہ مخصوصہ بن چکا ہے اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔ ان دو تعبیروں کا فائدہ یہ ہے کہ دلالت سے یہ شعور دلایا جائے کہ قرآن حکیم تورات کی تصدیق کرتا ہے جس طرح یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حق ہے اور اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ وحی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا لسانا عربیا یہ مصدق کا مفعول بہ ہے او راس کا مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی مصدق ذالسان عربی۔ اس صورت میں اس سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہوگی۔

نافع، بزی، ابن عامر اور یعقوب نے لینذر کو لتنذر مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کا فاعل کتاب یا اللہ تعالیٰ کی ذات یا رسول اللہ ہوگا۔ اس کلام کا تعلق ھذا کتاب کے ساتھ ہوگا، یعنی یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی کہ آپ ڈرائیں یا یہ ڈرائے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور یہ خوشخبری ہے احسان کرنے والوں کے لئے۔ بشری یہ فعل محذوف کا مصدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یبشر بشری یا اس کا مفعول لہ ہے اور اس کا عطف لینذر کے محل پر ہوگا۔ یہ تعبیر اس وقت ہی جائز ہوگی جب لینذر کو غائب کا صیغہ پڑھا جائے، اس صورت میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی تاکہ اس کا فاعل اور مفعول لہ کے فعل کا فاعل ایک ہی ہو اور وہ فعل انزل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ بشری مبتدا محذوف کی خبر ہو جو ھو ہے۔ اس جملے کا عطف ماقبل جملے پر ہوگا۔

[2] ہم نے استقامت کی تفسیر سورۂ حٰم سجدہ میں بیان کر دی ہے۔ ان خوش نصیبوں کو موت کے بعد کسی ناپسندیدہ چیز کے لاحق ہونے اور کسی محبوب چیز کے فوت ہونے کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ فلا خوف میں فاء اس لئے ہے کیونکہ مبتدا میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔

[3] خالدین اس ضمیر سے حال ہے جو اصحاب میں موجود ہے۔ اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔ یہ جملہ خوف کی نفی کی علت بیان کر رہا ہے۔ جزاء اس محذوف فعل کا مفعول مطلق ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی جوزوا جزاء، یعنی وہ جنت میں ہمیشہ اس لئے رہیں گے کیونکہ یہ ان کے علمی اور عملی اچھے اعمال کا بدلہ ہے۔

أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِيٓ ۚ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۵﴾

''اور ہم نے حکم دیا انسان کو کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے (اپنے شکم میں) اٹھائے رکھا اس کو اس کی ماں نے بڑی مشقت سے اور جنا اس کو بڑی تکلیف سے اور اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے تک تیس مہینے لگ گئے یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا تو اس نے عرض کی اے میرے رب مجھے والہانہ توفیق عطا فرما کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیری اس نعمت کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی اور میں ایسے نیک کام کروں جن کو تو پسند فرمائے اور صلاح (و رشد) کو میرے لئے میری اولاد میں راسخ فرما دے۔ بے شک میں توبہ کرتا ہوں تیری جناب میں اور میں تیرے حکم کے سامنے سر جھکانے والوں میں سے ہوں[1]۔''

[1] اَلْاِنْسَانَ میں الف لام عہد خارجی کا ہے اور انسان سے مراد ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی۔ حضرت علی شیر خدا سے بھی یہی مروی ہے، آپ نے کہا یہ آیت ابوبکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ کے والدین مسلمان ہوئے۔ مہاجرین میں سے آپ کے علاوہ کسی کے دونوں والدین اسلام نہیں لائے (1) سدی اور ضحاک نے کہا یہ آیت حضرت سعد بن ابی وقاص کے حق میں نازل ہوئی (2) ہم نے ایک واقعہ سورۂ عنکبوت میں بیان کیا ہے ایک قول یہ کیا گیا۔ یہ الف لام جنسی ہے اگرچہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق یا حضرت سعد کے حق میں نازل ہوئی تاہم سیاق کلام اس قول کی تائید نہیں کرتا جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

بِوَالِدَيْهِ جار مجرور کا تعلق محذوف فعل کے ساتھ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی۔ یحسن و الدیه حضرت ابوبکر صدیق کے والدین حضرت ابو قحافہ، عثمان بن عمر اور ام الخیر بنت خیر بن صخر بن عمر تھیں۔

کوفہ کے قراء نے باب افعال کا مصدر احسانا پڑھا ہے۔ یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، جبکہ باقی قراء نے مجرد سے حسنا پڑھا ہے اور یہ بو الدیه سے بدل اشتمال ہے۔ اس صورت میں احسانا کے منصوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بو الدیه کا اعتبار کیا گیا ہے۔ کرھا سے پہلے ذات کا لفظ مضاف محذوف ہے۔ یہ امه سے حال ہوگا یا یہ جملہ کی صفت ہے پھر یہ فعل کا مفعول مطلق ہوگا۔ اس کا معنی مشقت ہے۔ حجاز کے قراء ہشام اور ابو عمرو نے دونوں جگہ کرھا کو کاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا جب کاف پر ضمہ ہوگا تو یہ اسم ہوگا اور جب اس پر فتحہ ہوگا تو یہ مصدر ہوگا۔ حملته امه کرھا اور وضعته کرھا یہ دونوں جملے جملہ معترضہ ہیں اور احسانا کی علت بیان کر رہے ہیں۔ ان آیات میں یہ شعور بھی دلایا جا رہا ہے کہ ماں احسان کی زیادہ مستحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اپنے باپ کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اس کے بعد جو زیادہ قریبی ہے پھر اس کے بعد جو

حملہ و فصالہ اور مابعد اس کی خبر ہے، یعنی حمل اور رضاعت کی مدت تیس ماہ ہے۔ یہ بھی جملہ معترضہ ہے۔ طویل مدت میں مشقت کی شدت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کیا۔ اس آیت کریمہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ (ا) ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وفصالہ فی عامین کیونکہ دو سال چھ ماہ کے عرصہ میں سے دو سال نکل جائیں تو پیچھے چھ ماہ رہ جاتے ہیں۔ حمل کی کم سے کم مدت میں اسی عرصہ پر اتفاق ہے۔ تاہم زیادہ سے زیادہ عرصہ میں اختلاف ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے ہے اس کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ حضرت امام مالک سے کئی روایات مروی ہیں۔ چار سال سے پانچ سال اور سات سال۔ حضرت امام شافعی نے کہا چار سال۔ امام احمد سے دو روایات مروی ہیں مشہور روایت امام شافعی کے مذہب کے موافق ہے، جبکہ دوسری روایت امام ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق ہے۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل حضرت عائشہ صدیقہ کا قول ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں دو سال سے زیادہ اتنا عرصہ بھی نہیں ٹھہر سکتا جتنا کہ تکلہ کا گھراؤ ہو۔ ایک روایت تکلہ کے سائے کی مقدار کے الفاظ ہیں امام ابوحنیفہ نے فرمایا اس قسم کی بات سماع سے ممکن ہے کیونکہ مقداروں کو اندازے سے معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے آپ کا قول صحیح ہو اور آپ کے تجربہ پر مبنی ہو جس طرح عمومی عادت ہے۔ جس طرح امام مالک اور امام شافعی کا قول تجربہ پر مبنی ہو۔ میں کہتا ہوں حمل کی کم سے کم مدت پر اس آیت سے استدلال اس امر پر مبنی ہے کہ الانسان میں الف لام جنسی ہے۔ اگر الف لام عہد خارجی کا ہو تو پھر اس آیت سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس میں ایک واقعہ کا بیان ہے۔ اس آیت سے امام ابوحنیفہ کے مذہب کا استدلال بھی درست نہیں کہ رضاعت کی مدت تیس ماہ ہے۔ اس کے متعلق اور رضاعت کے دوسرے مسائل کے متعلق مسائل سورۂ نساء میں گزر چکے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے عکرمہ نے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ جب عورت نو ماہ تک حاملہ رہے تو اکیس ماہ دودھ پلائے۔ جب چھ ماہ تک حاملہ رہے تو پھر چوبیس ماہ دودھ پلائے (1)۔ واللہ اعلم۔

حتی اذا بلغ کا تعلق فعل محذوف کے ساتھ ہے جس کا عطف وضعتہ پر ہے تقدیر کلام یہ ہے رَبَّیَاهُ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ یعنی ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 134 (التجاریۃ)

(ا) قتادہ ابوالحرب بن اسود دوئلی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر کی خدمت میں ایک عورت کو پیش کیا گیا جس نے چھ ماہ میں بچہ جنا تھا۔ آپ نے صحابہ کرام سے اس بارے میں دریافت کیا۔ حضرت علی نے کہا اس پر رجم نہیں کیونکہ آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وحملہ وفصالہ ثلثون شہرا اور دوسری جگہ فرمایا وفصالہ فی عامین تو پھر حمل کی مدت چھ ماہ رہ گئی۔ حضرت عمر نے اس عورت کو چھوڑ دیا پھر ہمیں ایک خبر پہنچی کہ ایک اور عورت نے بھی چھ ماہ کے عرصہ میں بچہ جنا۔ حضرت نافع بن جبیر سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے انہیں خبر دی کہ جس عورت کو حضرت عمر کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا میں نے اس عورت کے حق میں دلیل دی تھی۔ اس عورت نے چھ ماہ میں بچہ جنا تھا۔ لوگوں نے اس کا برا منایا۔ میں نے حضرت عمر فاروق سے عرض کیا آپ کیسے اس پر ظلم کر سکتے ہیں آپ نے فرمایا ظلم کیسا۔ میں نے عرض کی اس آیت کو پڑھیں وحملہ وفصالہ ثلاثون شھرا اور دوسری آیت والولدات یرضعن اولادھن حولین کاملین میں نے عرض کی حول کتنا ہوتا ہے؟ فرمایا ایک سال۔ میں نے عرض کی سال کتنے عرصہ کا ہوتا ہے؟ فرمایا بارہ ماہ۔ میں نے عرض کی چوبیس ماہ پورے دو سال ہوئے۔ تاہم حمل کو اللہ تعالیٰ جتنا مؤخر کر دے۔ یا جتنا پہلے کر دے حضرت عمر اس استدلال سے مطمئن ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے غلام ابوعبیدہ سے مروی ہے کہ ایک عورت کو حضرت عثمان کی خدمت میں پیش کیا گیا جس [illegible]

دونوں والدین نے اس کی تربیت کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا اور پھر چالیس سال کی عمر کو پہنچ گیا اور اس کی عقل کامل ہو گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق حضور ﷺ کے اس وقت دوست بنے تھے جب آپ کی عمر اٹھارہ سال تھی یہ جوانی کی عمر ہے جبکہ حضور ﷺ کی عمر بیس سال تھی اور اکٹھے شام کی طرف تجارت کے لئے گئے تھے جب چالیس سال کے ہوئے تو حضور ﷺ پر ایمان لے آئے اور اپنے رب کے حضور التجاء کی شاید راوی کو حضرت ابوبکر کی عمر چالیس سال ذکر کرنے میں سہو ہوا ہے کیونکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عمروں میں دو سال کا فرق تھا۔

ورش اور بزی نے اوزعنی کی یاء کو مفتوح، جبکہ باقی قراء نے ساکن پڑھا ہے۔ معنی ہے مجھ پر الہام کر۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ مجھے یوں بنا دے کہ میں اپنے آپ کو ناشکری سے روک لوں۔ مجھے اور میرے والدین کو اسلام قبول کرنے کی جو نعمت عطا فرمائی ہے یا عمومی نعمت مراد ہے جو اسلام اور دوسری نعمتوں کو شامل ہے اس پر تیرا شکر ادا کروں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ صالحا کو تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا یا جنس میں سے ایک ایسی نوع کا ارادہ کیا جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کی عرضداشت کو قبول فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے ان نو غلاموں کو آزاد کیا جنہیں ایمان لانے کی وجہ سے عذاب دیا جا رہا تھا اور بھلائی کے جس کام کا بھی آپ نے ارادہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسے مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ انہوں نے اپنی اولاد کے نیک ہونے کی بھی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی قبول فرمایا۔ آپ کی جتنی اولاد تھی سب مسلمان ہو گئے تھے۔ آپ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آپ کے والدین اور اولاد سب مسلمان ہوئے تھے (1)۔ حضرت ابن عباس نے اسی طرح کہا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق کے والد ماجد حضرت ابو قحافہ' حضرت ابو بکر صدیق' آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن اور ان کے صاحبزادے ابو عتیق نے صحابیت کا شرف حاصل کیا۔ کسی اور صحابی کو یہ شرف حاصل نہ ہوا (2)۔

میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں کفر سے' ہر ایسے عمل سے جس سے تیری رضا نصیب نہ ہو یا ہر ایسے عمل سے جو تجھ سے مجھے غافل کر دے اور مخلص مسلمانوں میں سے ہوں۔ حتی اذا بلغ سے لے کر آخر تک تمام چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ الانسان پر الف لام عہدی ہے، اس سے معین شخص مراد ہے کیونکہ اگر یہ الف لام جنسی ہو تو پھر یہ درست نہیں رہتا کیونکہ قدیمی نعمت کو چالیس سال تک دعا کے لئے مؤخر کرنا جائز نہیں۔ اصل میں یہ آیت ایک واقعہ کو بیان کرتی ہے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق تقریباً چالیس سال کی عمر میں مسلمان ہوئے اور شکر بھی وہی معتبر ہوتا ہے جو ایمان کی صورت میں ادا کیا جائے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایک روایت میں یہ مذکور ہے کہ حضرت ابو قحافہ فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے تھے، جبکہ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق کی عمر (تقریباً) ساٹھ سال تھی، جبکہ یہ آیت ہجرت سے پہلے نازل ہوئی کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق کی عمر چالیس سال تھی تو اس وقت ابو قحافہ کافر تھے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ احسان کرنے کا کیسے حکم دے سکتا ہے اور حضرت ابوبکر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ۔

ہم اس کے بارے میں یہ کہیں گے یہ روایت گزر چکی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اڑتیس سال کی عمر میں مسلمان ہوئے تھے اور ان

لانے کی یہی روایت صحیح ہے۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اور ابوقحافہ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا تو پھر بھی کافر والدین کے ساتھ حسن سلوک کی معصیت جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ عنکبوت میں فرمایا وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَ إِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ اس صورت میں نعمت سے مراد ایسی نعمت ہوگی جو دینی اور دنیاوی دونوں نعمتوں کو عام ہوگی۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ الانسان پر الف لام جنسی ہے تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا جب انسان مضبوط جسم کا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے پھر جب وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو عقل کے کامل ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرے۔ واللہ اعلم۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ⑯ وَ الَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا أَتَعِدَانِنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِي ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ آمِنْ ۚ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۚ فَيَقُولُ مَا هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ⑰ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ⑱

''یہی وہ (خوش نصیب) ہیں قبول کرتے ہیں ہم جن کے بہترین اعمال کو اور درگزر کرتے ہیں ہم جن کی برائیوں سے۔ یہ جنتیوں میں سے ہوں گے یہ (اللہ کا) سچا وعدہ ہے جو (اہل ایمان سے) کیا گیا ہے [1] اور جس نے کہا اپنے والدین کو افسوس ہے تمہارے حال پر کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو اس کی کہ میں (قبر سے) نکالا جاؤں گا حالانکہ گزر چکی ہیں کئی صدیاں مجھ سے پہلے (ان میں سے تو کوئی اب تک زندہ نہ ہوا) اور اس کے والدین بارگاہ الٰہی میں فریاد کرتے ہیں (اور اسے کہتے ہیں) تیرا خانہ خراب ہو ایمان لے آ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو وہ (جواباً) کہتا ہے نہیں ہیں یہ دھمکیاں مگر پہلے لوگوں کی فرسودہ کہانیاں [2]۔ یہی وہ (بدبخت) ہیں جن پر ثابت ہو چکا ہے عذاب کا فرمان ان گروہوں میں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں جنوں اور انسانوں میں سے بے شک وہ سراسر گھاٹے میں تھے [3]''

[1] اگر سابقہ آیت میں مذکور الانسان سے مراد جنس ہو تو اولئک سے اشارہ ان افراد کی طرف ہوگا جو متقدمہ صفات سے متصف ہیں اور یہ تعبیر ظاہر ہے اگر الانسان سے مراد حضرت ابوبکر یا حضرت سعد ہو تو پھر اشارہ آپ کی طرف اور اس فرد کی طرف ہوگا جو ان مذکورہ صفات سے متصف ہو۔ اس صورت میں حضرت ابوبکر اور حضرت سعد پر حکم عموم کے ضمن میں بطور کنایہ ہوگا۔ یہ صریح حکم سے بلیغ ہے کیونکہ کنایہ کی صورت میں حکم لگانا ایسا ہے جیسا دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی ہو۔ مباح عمل حسن تو ہوتا ہے لیکن اس پر ثواب نہیں ہوتا، جبکہ یہ ایسے عمل کا ذکر ہے جس پر انہیں ثواب دیا جائے گا اس لئے اسے احسن فرمایا یا یہاں صفت اپنے موصوف کی طرف مضاف ہے، یعنی

مقصود عظمت بیان کرنا ہے اور احسن کو مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ان دونوں کو واحد مذکر غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور احسن کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ نائب فاعل ہے۔ فِیٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ، اولئک کی دوسری خبر ہے یا عنهم اور عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ میں جو هم ضمیر ہے اس سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا اس حال میں کہ وہ ان کی تعداد میں ہوں گے یا اس حال میں کہ انہیں ثواب دیا جائے گا یا ان میں وہ شمار ہوں گے وعد الصدق مفعول مطلق ہے اور تاکید کا فائدہ دے رہا ہے کیونکہ عمل قبول کرنا اور گناہوں سے صرف نظر کرنا یہ بھی وعدہ ہے، یعنی میں نے تم سے سچا وعدہ کیا ہے۔ وعدہ کی صدق کی طرف اضافت اسی طرح ہے جس طرح حاتم الجود میں حاتم کی جود کی طرف اضافت ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس مذکورہ انسان کی جزاء کو بیان کرتا ہے۔

ے جب والدین نے اسے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور زبان سے اقرار کرنے کی دعوت دی۔ اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہے۔ اس کی خبر اگلی آیت ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ سابقہ آیت میں جن افراد کا ذکر تھا ان کے مخالفین کے حکم کا بیان ہے۔ اف یہ ناپسندیدگی کے اظہار کا حکم ہے۔ نافع اور حفص نے اسے تنوین اور فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ ابن کثیر اور ابن عامر نے تنوین کے بغیر فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فاء کے کسرہ کے ساتھ تنوین کے بغیر پڑھا ہے۔ ہشام نے اتعداننی کو ایک نون مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے دو مکسور نونوں کے ساتھ پڑھا ہے۔

نافع اور ابن کثیر نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اس میں استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے جو اف کی علت کے مقام میں ہے، یعنی کیا تم مجھے اس بات کی دھمکی دیتے ہو کہ مجھے موت کے بعد قبر سے زندہ نکالا جائے گا جبکہ کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔ قَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ، اخرج کے فاعل سے حال ہے۔ یہاں جملہ محذوف ہے جس کا عطف اس جملہ پر ہے جس محذوف جملہ کی تقدیر یہ ہے وَلَمْ یُخْرَجْ اَحَدٌ مِّنْهُمْ، جبکہ اس کے والدین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں یہ دعا کرتے ہیں تجھ سے اللہ کی پناہ یا یہ التجا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے ایمان کی توفیق عطا فرمائے۔ هما یستغیثان الله جملہ والدیه سے حال ہے۔ ویلک یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ہلکت ھلاکات۔ اس جملہ سے پہلے قول مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ویقولون له ویلک۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لا یا موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان لا۔ دوبارہ اٹھائے جانے کا وعدہ حق ہے۔ ان وعد الله حق یہ جملہ اٰمن کی علت کے محل میں ہے۔ وہ کافر اپنے والدین سے کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کے جھوٹ ہیں۔

امام بخاری نے یوسف بن ماھک کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ نے مروان کو حجاز پر والی مقرر کیا۔ اس نے خطبہ میں یزید بن معاویہ کا ذکر کیا تا کہ حضرت معاویہ کے بعد اس کی بیعت کی۔ جائے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے کچھ فرمایا تو مروان نے اپنے کارندوں سے کہا اسے پکڑ لو تو حضرت عبدالرحمٰن حضرت عائشہ کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وجہ سے حکومتی کارندے آپ کو نہ پکڑ سکے۔ مروان نے کہا یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں مذکورہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ تو حضرت عائشہ صدیقہ نے حجاب کے پیچھے سے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری پاکدامنی کے علاوہ قرآن میں کوئی چیز ہمارے بارے میں نازل نہیں

روایت کیا ہے کہ یہ آیت عبدالرحمٰن کے اسلام لانے سے پہلے اس کے متعلق نازل ہوئی پھر وہ مسلمان ہو گئے اور بہترین مسلمان ثابت ہوئے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس، سدی اور مجاہد نے کہا یہ آیت عبداللہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ عبدالرحمٰن کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے والدین اسے اسلام کی دعوت دیتے تھے، جبکہ وہ انکار کرتا تھا اور کہتا میرے لئے عبداللہ بن جدعان، عامر بن کعب اور قریش کے سرداروں کو زندہ کرو تا کہ میں ان سے تمہاری باتوں کے بارے میں سوال کروں۔

میں کہتا ہوں جنہوں نے یہ کہا کہ یہ آیت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے حق میں نازل ہوئی اس کا انحصار مروان کی بات پر ہے۔ تم سن چکے ہو کہ مروان کا قول دشمنی پر مبنی تھا۔ امام بغوی نے کہا حضرت عائشہ صدیقہ نے اس بات کا انکار کیا کہ یہ آیت حضرت عبدالرحمٰن کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ نے فرمایا فلاں آدمی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور اس آدمی کا نام بھی لیا تھا۔ حافظ ابن حجر نے کہا حضرت عائشہ کی نفی والی روایت سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اور قبولیت کے زیادہ لائق ہے۔ زجاج نے کہا جس نے یہ کہا کہ یہ آیت حضرت عبدالرحمٰن کے اسلام لانے سے پہلے ان کے حق میں نازل ہوئی۔ اگلی آیت ان کے قول کو باطل کر دیتی ہے(1)۔

سے یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ فیصلہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ لوگ جہنمی ہیں کیونکہ حضرت عبدالرحمٰن تو جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ فی یہاں مع کے معنی میں ہے۔ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ یہ امم کا بیان ہے قد خلت والا جملہ امم کی صفت ہے فی امم حق کے ساتھ متعلق ہے جو اسم موصول کا صلہ ہے اور اسم موصول اسم اشارہ کی خبر ہے اور مکمل جملہ وَ الَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ کی خبر ہے اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ یہ تذییل ہے۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَ لِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ وَ یَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝

''اور ہر ایک کے لئے مرتبے ہوں گے ان کے اعمال کے مطابق اور اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا لہ اور جس روز لا کر کھڑا کر دیا جائیگا کفار کو آگ کے سامنے (تو انہیں کہا جائیگا) تم نے ختم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں اور خوب لطف اٹھایا تھا تم نے ان سے آج تمہیں رسوائی کا عذاب دیا جائے گا بوجہ اس گھمنڈ کے جو تم زمین میں ناحق کیا کرتے تھے اور بوجہ تمہاری نافرمانیوں کے ۲ ''

لہ انہوں نے جو اچھے اعمال کئے اس کی جزاء(۱) کے کئی درجات ہیں یا کیونکہ انہوں نے جو اچھے اعمال کیے ہیں اس کی وجہ سے ان کے کئی درجے ہیں۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا اس آیت سے مراد یہ ہے جس نے پہلے اسلام قبول کیا اس کا درجہ بعد میں اسلام قبول کرنے سے بڑا ہے، اگر چہ اس نے صرف ایک گھڑی پہلے اسلام قبول کیا مقاتل نے کہا ہر ایک کے ان کے اعمال

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

کے مطابق فضائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ان کے اعمال کی جزاء دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا مومنوں اور کافروں میں سے ہر ایک جماعت کے اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے روز ان کے اعمال کے مطابق درجات اور منازل ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے مطابق انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ ابن زید نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا جہنمیوں کے درجے پستی کے اعتبار سے اور جنتیوں کے درجے بلندی کے اعتبار سے ہوں گے۔

ابن کثیر' ابوعمرو' ہشام اور عاصم نے لیوفیهم کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ مقصود عظمت بیان کرنا ہے یہ محذوف فعل کی محذوف علت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فَعَلْنَا ذٰلِكَ اَوْ فَعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ لِحِكَمٍ وَّ مَصَالِحَ وَلِيُوَفِّيَهُمْ۔ یعنی انہیں ان کے اعمال کی پوری پوری جزاء دے گا اور کسی کے ثواب میں کمی یا عذاب میں اضافہ کر کے ظلم نہیں کرے گا۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ یہ جملہ لیوفیهم کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔

۲۔ یعنی اس روز کفار کو آگ کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔ اصل کلام یوں ہے یعرض النار علیهم مبالغہ کے اظہار کے لئے اس میں قلب کیا گیا جس طرح عربوں کا قول ہے عَرَضْتُ النَّاقَةَ عَلَى الْحَوْضِ۔ اذ هبتم سے پہلے قول مقدر ہے تقدیر کلام یوں ہے يُقَالُ لَهُمْ اَذْهَبْتُمْ۔ ظرف یعنی یوم کو اذهبتم فعل نصب دے رہا ہے۔

ابن کثیر' ابن عامر' ابوجعفر اور یعقوب نے ء اذهبتم پڑھا ہے۔ ابن ذکوان نے دونوں ہمزوں کو اپنی اصل پر رکھتے ہوئے پڑھا ہے اور مد کے ساتھ نہیں پڑھا۔ ابن کثیر' ابوجعفر' یعقوب اور ہشام نے ہمزہ اور مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے ہمزہ کو اصل پر رکھتے ہوئے مد پڑھی ہی ہے، جبکہ ابن کثیر نے دوسرے ہمزہ میں تسہیل کی ہے، جبکہ باقی قراء نے ایک ہمزہ کے ساتھ جملہ خبریہ پڑھا ہے، یعنی ہمزہ استفہام نہیں ہے۔ امام بغوی نے کہا دونوں لغتیں فصیح ہیں کیونکہ عرب توبیخ کے لئے استفہام کا کلمہ لاتے ہیں اور کلمہ استفہام کو ترک بھی کر دیتے ہیں۔ طیبات سے مراد لذائذ ہیں۔ یعنی تمہارے حق میں جو لذائذ مقدر کئے گئے تھے تم دنیا میں ان سے لطف اندوز ہو چکے ہو۔ اب ان میں سے کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ فالیوم میں فاء سببیہ ہے۔ اس جملے کا عطف استمتعتم پر ہے، یعنی آج تمہیں ایسا عذاب دیا جائے گا جو ذلت و رسوائی عطا کرنے والا ہے۔ اس عذاب کا سبب تمہارا ناحق تکبر اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے فسق ہے۔

امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ نے کافروں کو تنبیہ کی کہ وہ دنیاوی لذات سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ نے دنیا کی لذات سے اجتناب کو ترجیح دی تا کہ آخرت کا ثواب حاصل ہو۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیحین میں روایت نقل کی ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ خالی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے، اس پر کوئی بستر نہ تھا۔ اس چٹائی کے نشانات آپ کے جسم پر لگے ہوئے تھے۔ آپ نے چمڑے کے ایک تکیہ پر ٹیک لگائی ہوئی تھی جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو فراخی عطا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایرانیوں اور رومیوں کو فراخی عطا فرمائی ہے، جبکہ وہ اللہ کی عبادت بھی نہیں کرتے تو آپ نے فرمایا اے ابن خطاب کیا تو بھی یہ سوچتا ہے؟ وہ ایسی قوم ہیں جنہیں لذتیں دنیا میں جلدی عطا کر دی گئی ہیں (1) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کیا تم اس بات پر راضی

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت مروی ہے کہ حضور ﷺ کے گھر والوں نے کبھی بھی دو دن لگا تار جو کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا یہاں تک کہ حضور ﷺ نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا(1)۔ امام بخاری نے سعید مقبری اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت کے پاس سے گزرے جن کے سامنے بھنی ہوئی بکری پڑی تھی۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ کو کھانے کی دعوت دی تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا حضور ﷺ دنیا سے پردہ فرما گئے ہیں، جبکہ آپ نے جو کی روٹی سے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا(2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کبھی کبھی ایسا مہینہ بھی آجاتا کہ ہمارے گھروں میں آگ نہ جلتی اور ہمارے پاس پانی اور کھجور کے سوا کوئی چیز نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ انصار کی عورتوں کو جزاء خیر دے۔ کبھی کبھی وہ ہمارے پاس دودھ تحفہ کے طور پر بھیج دیتی تھیں۔

امام احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ آپ لگا تار کئی کئی راتیں بھوکے گزارتے تھے۔ گھر والوں کے پاس رات کا کھانا نہیں ہوتا تھا۔ ان کا اکثر کھانا جو کی روٹی ہوتا تھا(3) امام ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جتنا ڈرایا گیا اتنا کسی اور کو نہیں ڈرایا گیا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اذیتیں دی گئیں اتنی اذیتیں کسی اور کو نہیں دی گئیں مجھ پر تیس روز ایسے بھی گزرے کہ میرے اور بلال کے پاس کوئی ایسا کھانا نہیں تھا جسے لوگ کھاتے ہیں ہاں صرف وہ چیز تھی جسے بلال کی بغل نے چھپا لیا تھا(4)۔ امام ترمذی نے کہا اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ حضور ﷺ مکہ سے باہر چلے گئے تھے اور آپ کے ساتھ صرف حضرت بلال تھے۔ حضرت بلال کے پاس صرف اتنا کھانا تھا جسے وہ بغل کے نیچے دبا لیتے تھے(5)۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے ستر اصحاب صفہ دیکھے۔ ان میں سے کسی کے پاس رداء نہ تھی یا تو ان کے پاس صرف تہبند تھا یا ایک لمبی سی چادر تھی جسے انہوں نے اپنے گلے میں باندھ رکھا تھا۔ یہ چادر کسی کی پنڈلی اور کسی کے ٹخنے تک پہنچتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے چادر کو پکڑے رکھتے تاکہ کہیں ان کی شرمگاہ نہ کھل جائے(6)۔

امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ میں حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں جو کی روٹی اور نمکین روغنی تیل لے آیا۔ حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن کے طور پر رکھی تھی اور گھر والوں کے لئے اس سے جو لئے تھے۔ میں نے آپ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا آل محمد نے کبھی بھی ایک صاع گندم اور ایک صاع دانے کے ساتھ شام نہیں کی تھی، جبکہ اس وقت آپ کے عقد میں نو عورتیں تھیں(7)۔ امام ترمذی نے ابوطلحہ سے روایت کیا ہے ہم نے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بھوک کی شکایت کی، ہم نے پیٹ سے کپڑا ہٹایا نیچے ایک ایک پتھر تھا۔ حضور ﷺ نے پیٹ سے کپڑا اٹھایا تو نیچے دو پتھر تھے(8)۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔ امام مسلم نے عبدالرحمٰن سے روایت کی ہے کہ تین آدمی حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آئے، جبکہ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہا اے ابو محمد اللہ کی قسم ہمارے پاس کچھ بھی نہیں' نہ کھانا ہے' نہ سواری ہے اور نہ ہی دوسری ضروریات زندگی۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا جو تم چاہو

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 187 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2066 (ابن کثیر)

3۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 187 (الفکر) 4۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 198

اگر تم چاہو تو ہماری طرف آ جاؤ ہم تمہیں وہ عطا کر دیں گے جس سے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی پیدا کر دے گا۔ اگر تم چاہو تو ہم تمہارا معاملہ تمہارے سلطان کے پاس پیش کر دیں۔ اگر تم چاہو تو صبر کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مہاجر فقراء غنی فقراء سے جنت میں چالیس سال پہلے جائیں گے تو انہوں نے کہا ہم صبر کریں گے کسی سے کوئی سوال نہ کریں گے (1)۔

امام احمد نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں یمن بھیجا فرمایا عیش و عشرت سے دور رہنا کیونکہ اللہ کے بندے عیش و عشرت میں نہیں پڑتے (2)۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو انسان تھوڑے رزق سے اللہ پر راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے عمل پر راضی ہو جائے گا (3)۔ امام بغوی نے عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ ان کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا، جبکہ وہ روزہ سے تھے فرمایا حضرت مصعب بن عمیر کو شہید کیا گیا، جبکہ آپ مجھ سے افضل تھے آپ کو ایک چادر میں کفن دیا گیا تھا اگر آپ کے سر کو ڈھانپا جاتا تو پاؤں ننگے ہو جاتے تھے اگر پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر ننگا ہو جاتا۔ میرا خیال ہے انہوں نے کہا حضرت حمزہ شہید ہوئے۔ جبکہ آپ مجھ سے بہتر تھے پھر ہمارے لئے دنیا کشادہ کر دی گئی یا فرمایا ہمیں دنیا دی گئی ہمیں ڈر ہے کہ ہماری نیکیوں کا بدلہ ہمیں جلد دیا گیا ہے۔ پھر آپ رونے لگے یہاں تک کہ آپ نے کھانا چھوڑ دیا۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے میرے ہاتھ میں گوشت لٹکتا ہوا دیکھا پوچھا اے جابر یہ کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے گوشت کی خواہش ہوئی میں نے اسے خرید لیا۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ اے جابر جب بھی تیری خواہش ہوگی تو خرید لے گا۔ کیا تو اس آیت سے ڈرتا نہیں اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا (1)۔ حضرت ابن عمر کی حدیث میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے۔

حضرت جابر کی حدیث میں ہے کیا تم میں سے کوئی ایسا نہیں کہ وہ اپنے پڑوسی اور اپنے چچازاد بھائی کے لئے بھوکا رہے۔ رزین نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ ایک روز حضرت عمر نے پانی طلب کیا آپ کی خدمت میں پانی پیش کیا گیا، جبکہ اس میں شہد ملا ہوا تھا فرمایا یہ بہت اچھا ہے لیکن میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنتا ہوں۔ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا تو میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ جلدی (۱) ہی نہ دے دیا جائے پھر آپ نے اس پانی کو نہ پیا۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 410 (قدیمی)　2۔ مسند امام احمد، جلد 5، صفحہ 244 (صادر)
3۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 139 (العلمیۃ)　4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(۱) حضرت سالم بن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر ارشاد فرمایا کرتے تھے ہمارے پیش نظر لذات زندگی کا یہی مطلب نہیں کہ ہم بکری کے بچہ کو بھوننے کا حکم دیں جسے بھون دیا جائے۔ میدے کی روٹی پکانے کا کہیں تو روٹی پکائی جائے ہم کشمش کو برتن میں ڈالنے کا حکم دیں اور اس کی ہمارے لئے نبیذ بنائی جائے یہاں تک کہ وہ نر چکور کی آنکھوں کی طرح ہو جائے پھر ہم اس کھانا کو کھائیں اور اس نبیذ کو پئیں۔ بلکہ ہم تو یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی نیکیاں آخرت کے لئے باقی رکھیں کیونکہ ہم نے اپنے اللہ کا فرمان سن رکھا ہے اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا۔

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا کہ حضرت عمر بن خطاب ارشاد فرمایا کرتے تھے اگر میں چاہوں تو میں تم سے سب سے اچھا کھانا کھانے والا اور عمدہ لباس پہننے والا ہوتا لیکن میں اپنی نیکیاں آخرت کیلئے چھوڑتا ہوں۔ ہمارے سامنے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضرت عمر شام تشریف لے گئے تو آپ کے لئے ایسا کھانا تیار کیا گیا جیسا کھانا پہلے آپ نے نہیں دیکھا تھا۔ فرمایا یہ ہمارے لئے ہے تو ان مسلمان فقراء کے لئے کیا ہوگا جو

وَ اذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۲۱﴾

"(اے حبیب!) ذکر سنایئے انہیں قوم عاد کے بھائی (ہود) کا جب ڈرایا اس نے اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے ڈرانے والے ان سے پہلے بھی اور ان کے بعد بھی کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو (ورنہ) مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آ جائے [1]"

[1] اَخَا عَادٍ سے مراد حضرت ہود علیہ السلام کی ذات ہے۔ آپ نے اپنی قوم عاد کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ اذا اپنے مضاف الیہ سے مل کر اَخَا عَادٍ سے بدل اشتمال ہے، یعنی جب وہ اپنی قوم عاد کو ڈرا رہے تھے اس کو یاد کرو۔ بِالْاَحْقَافِ میں باء، فی کے معنی میں ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا احقاف عمان اور مہرہ کے درمیان واقع ہے۔ مقاتل نے کہا عاد کے گھر یمن میں حضر موت کے اس علاقہ میں تھے جس کو مہر کہتے۔ مہر یہ اونٹ اسی جگہ کی طرف منسوب ہیں۔ وہ موسم بہار میں تجارت کے لئے گھروں سے نکل پڑتے۔ جب گرمی زیادہ ہو جاتی تو گھروں کو لوٹ آتے۔ یہ ارم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قتادہ نے کہا ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ عاد ایک قبیلہ تھا جو یمن میں آباد تھا۔ یہ سمندر کے کنارے اس ریگستان میں رہتا تھا جسے شجر کہتے۔ احقاف حقف کی جمع ہے جس کا معنی ایسا ریگستان ہے جو مستطیل اور خم درخم ہو۔ ابن زید نے کہا حقف اس ریگستان کو کہتے ہیں جو پہاڑ کی شکل کا ہو لیکن پہاڑ جتنا بلند نہ ہو۔ کسائی نے کہا گول ریگستان کو حقف کہتے ہیں (1)۔

اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ یہ جملہ معترضہ ہے یا یہ انذر کے فاعل سے حال ہے۔ بَیْنِ یَدَیْهِ سے مراد حضرت نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء و رسل ہیں اور وَ مِنْ خَلْفِهٖ سے مراد حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور دوسرے انبیاء و رسل ہیں۔ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا میں ان مفسرہ ہے اور یہ انذر کی تفسیر بیان کرتا ہے یا مصدریہ ہے اور اس سے پہلے باء مقدر ہوگا کیونکہ جب کسی چیز سے منع کیا جاتا ہے تو اس میں اس تکلیف سے خبردار کیا جاتا ہے۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) عمر نے حفص سے فرمایا تمہیں کیا ہو گیا ہے ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تو حفص نے عرض کیا اے امیر المومنین میرے گھر والے میرے لئے جو کھانا بناتے ہیں وہ آپ کے کھانے سے نرم ہوتا ہے اس لئے آپ کے کھانے کی بجائے اس کھانے کو میں پسند کرتا ہوں تو حضرت عمر نے فرمایا۔ تیری ماں تجھے روئے کیا تم جانتے نہیں اگر میں چاہوں تو میں ایک موٹا تازہ بکری کا چھوٹی عمر کا بچہ ذبح کرنے کا حکم دوں، اس کے بال اتار لئے جائیں اور اسے بھونا جائے پھر میں آٹے کے بارے میں حکم دوں جسے باریک کپڑے میں چھانا جائے پھر اس سے نرم نرم روٹی بنائی جائے۔ میں ایک صاع کشمش کے بارے میں حکم دوں جسے پانی کے ایک بڑے برتن میں ڈال دیا جائے اس کا رنگ اسی طرح سرخ ہو جائے جس طرح ہرن کی آنکھ ہوتی ہے۔ حفص نے عرض کی میں جانتا ہوں آپ عمدہ کھانوں کو پہچانتے ہیں تو حضرت عمر نے فرمایا تیری ماں تجھ پر روئے۔ مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر مجھے یہ ناپسند نہ ہوتا کہ قیامت کے دن نیکیوں میں کمی کر دی جائیگی تو میں ضرور تمہارے ساتھ عمدہ اور نرم کھانوں میں شریک ہوتا۔

حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ بصرہ سے ایک وفد حضرت موسیٰ کی قیادت میں حضرت عمر بن خطاب کی خدمت میں حاضر ہوا ہر روز آپ کے کھانے پر کوئی چیز لگی ہوتی تھی کبھی دیکھتے کہ اس پر دودھ لگا ہوا کبھی اس پر خشک گوشت کا قیمہ بنا کر لگایا گیا ہوتا اور کبھی گوشت کا سالن ہوتا لیکن یہ بہت ہی کم

ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کو ساکن پڑھا ہے، یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرو گے تو مجھے ڈر ہے کہ تمہیں اس دن کے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا جس کی آزمائش سخت ہوگی۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٢﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿٢٣﴾

"وہ (برافروختہ ہوکر) بولے (اے ہود!) کیا تم اسلئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے برگشتہ کر دو۔ لے آؤ (وہ عذاب) جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے رہتے ہو اگر تم سچے ہو [1]۔ ہود نے فرمایا کہ نزول عذاب کا علم تو اللہ کے پاس ہے [2]۔ میں (برابر) پہنچا رہا ہوں تمہیں وہ پیغام جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں لیکن میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم جاہل قوم ہو [3]۔"

۱؎ اَجِئْتَنَا میں استفہام تقریری ہے، یعنی یقیناً آپ اس لئے آئے ہیں تاکہ آپ ہمیں ان بتوں کی عبادت سے دور کر دیں اگر آپ اپنی دھمکی میں سچے ہیں تو شرک پر وہ عذاب لے آئیں۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ سابقہ جملہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

۲؎ تمہارے عذاب کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے مستقبل میں جو وقت اس کا مقرر ہے۔ اس میں عذاب آجائے گا۔ اسی وقت عذاب کے نہ آنے کی صورت میں میرا جھوٹا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس میں میرا کوئی عمل دخل بھی نہیں کہ تم مجھ سے جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کر دو میں تو تمہیں وہی کچھ بتاتا ہوں جو میری طرف توحید، احکام اور عذاب کے نازل ہونے کی خبریں وغیرہ کی وحی کی جاتی ہے۔ عذاب اس صورت میں نازل ہوگا اگر تم ایمان نہیں لاؤ گے۔ نافع، ابوعمرو اور بزی نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ میں تمہیں جاہل خیال کرتا ہوں کیونکہ تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ علیم وقدیر ہے، جبکہ رسولوں کو تو مبعوث ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کریں اور پیغام حق پہنچائیں۔ انہیں عذاب دینے اور عذاب طلب کرنے کے لئے مبعوث نہیں کیا گیا۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٤﴾

"پس جب انہوں نے دیکھا عذاب کو بادل کی صورت میں کہ وہ ان وادیوں کی طرف آرہا ہے تو بولے یہ بادل ہے ہم پر برسنے والا ہے (نہیں نہیں) بلکہ یہ تو وہ عذاب ہے جس کے لئے تم جلدی مچا رہے تھے (یہ تند) ہوا ہے اس میں دردناک عذاب ہے [1]۔"

۱؎ رَاَوْهُ میں ہ ضمیر ما تعدنا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس سے عذاب مراد ہے یا یہ ضمیر مبہم ہے اور مابعد اس کی تفسیر بیان کرتا ہے۔ وہ عذاب بادل کی شکل میں تھا اور آسمان کے عرض سے نمودار ہوا اور ان کی وادیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ دو سال سے ان کے ہاں بارش نہیں ہو رہی تھی۔ بادل کو دیکھ کر وہ بڑے خوش ہوئے۔ ان کا واقعہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ کہنے لگے یہ بادل ہے جو ہم پر بارش

ھی ریح یا اسم موصول ما سے بدل ہے۔ فِيْهَا عَذَابٌ یہ ریح کی صفت ہے۔ الیم یہ عذاب کی صفت ہے۔

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۲۵

''تہس نہس کر کے رکھ دے گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے پس جب ان پر صبح ہوئی تو نہ دکھائی دی کوئی چیز بجز ان کے (ویران) مکانوں کے اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں مجرموں کو[1]۔''

[1] وہ ہوا ان میں سے جس پر گزرے گی اور جس مال کے پاس سے گزرے گی اسے ہلاک کر دے گی۔ شدید آندھی آئی جس نے خیموں اور ان کی سواریوں کو اٹھا لیا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ یہ سب چیزیں ٹڈی دل ہیں۔ سب سے پہلے ان لوگوں نے اس عذاب کو پہچانا جنہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے وہ اموال جو شہر سے باہر تھے ہوا انہیں زمین و آسمان کے درمیان اڑا رہی ہے۔ وہ لوگ واپس پلٹ آئے اور اپنے دروازوں کو بند کر لیا سخت آندھی آئی اور اس نے ان کے دروازوں کو توڑ دیا اور انہیں زمین پر پٹخ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا تو ہوا نے ان پر ریت ڈال دی۔ وہ سات راتیں اور آٹھ دن تک ریت کے نیچے پڑے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا تو ہوا نے انہیں ریت سے ننگا کر دیا۔ ہوا نے انہیں اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔

فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى کا عطف قال اللہ اور قال ھود محذوف پر ہے۔ عاصم، حمزہ اور یعقوب نے یریٰ کو مضارع مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ انہیں قراء نے مَسٰكِنُهُمْ کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ یریٰ کا نائب فاعل ہے، جبکہ باقی قراء نے لا تریٰ مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔ خطاب حضور ﷺ کو ہے یا مخاطب کو خطاب ہے اور مَسٰكِنُهُمْ کو مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ میں آپ کا کوا دیکھ سکتی۔ آپ ہمیشہ مسکراتے تھے۔ جب آپ بادل یا ہوا دیکھتے تو پریشانی آپ کے چہرے پر دیکھی جا سکتی۔ متفق علیہ (1)۔ امام بغوی کے ہاں ایک روایت میں ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جب لوگ بادل دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، انہیں امید ہوتی ہے کہ بارش نازل ہوگی۔ جب آپ بادل دیکھتے ہیں تو پریشانی کے آثار آپ کے چہرے سے عیاں ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے عائشہ مجھے خوف ہوتا ہے کہیں اس میں عذاب ہی نہ ہو کیوں کہ ایک قوم کو ہوا سے عذاب میں مبتلا کیا گیا تھا۔ قوم نے عذاب کو دیکھا تھا تو انہوں نے کہا یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا۔ آپ سے ہی ایک اور روایت مروی ہے جب ہوا چلتی تو حضور ﷺ یوں دعا کرتے اے اللہ! میں تجھ سے اس کی بھلائی، اس میں جو خیر ہے اور جس خیر کے ساتھ تو نے اسے بھیجا ہے اس کا سوال کرتا ہوں۔ اس کے شر، اس میں جو شر ہے اور جس شر کے ساتھ تو نے اسے بھیجا ہے اس سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ جب آسمان ابر آلود ہوتا تو آپ کا رنگ بدل جاتا آپ کبھی باہر تشریف لے جاتے کبھی اندر تشریف لاتے کبھی رخ انور ادھر کرتے کبھی دوسری طرف کر لیتے۔ جب بارش ہوتی تو کیفیت بدل جاتی تو میں نے یہ صورت پہچان لی اسی لئے میں نے سوال کیا فرمایا اے عائشہ شاید بات اسی طرح ہو جس طرح عاد نے کہا تھا۔ **فلما راوہ عارضا مستقبل اودیتھم قالوا ھذا عارض ممطرنا**(2) ایک روایت میں ہے جب آپ بارش دیکھتے

ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ اور شافعی کے نزدیک ایک روایت میں ہے کہ جب حضور ﷺ آسمان پر آندھی یا بادل وغیرہ دیکھتے آپ اپنا کام چھوڑ دیتے۔ آسمان کی طرف چہرۂ انور کرتے اور یوں گویا ہوتے اس میں جو شر ہے اس سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ (الحدیث) (1) حضرت ابن عباس سے مروی ہے جب بھی تیز ہوا چلتی تو حضور ﷺ گھٹنوں کے بل جھک جاتے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں یوں عرض کرتے اے اللہ اسے رحمت بنادے، اسے عذاب نہ بنانا۔ (الحدیث) (2) اسے امام شافعی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَآ اَبْصَارُهُمْ وَ لَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور ہم نے ان کو وہ قوت و طاقت بخشی تھی جو ہم نے تمہیں نہیں دی اور ہم نے عطا کیے تھے انہیں کان، آنکھیں اور دل لیکن ان کے کسی کام نہ آئے ان کے کان، نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل کیونکہ وہ انکار کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا اور احاطہ کر لیا ان کا اس (عذاب) نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے [1]۔''

[1] ھم ضمیر سے مراد قوم عاد ہے۔ فیما میں ما موصولہ ہے یا موصوفہ ہے اور ان نافیہ ہے یہاں ما کی بجائے ان نافیہ ذکر کرنا زیادہ مناسب ہے تاکہ لفظوں میں تکرار لازم نہ آئے، یعنی ہم نے قوت اور مال میں انہیں قدرت دی تھی، تمہیں اس کی قدرت عطا نہیں کی یا ما شرطیہ ہے، اس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام کی صورت میں اس کا معنی یہ بنے گا ہم نے انہیں قدرت عطا کی اگر تمہیں بھی اتنی قدرت عطا کرتے تو تمہاری سرکشی زیادہ ہوتی، جبکہ پہلی تعبیر زیادہ واضح ہے کیونکہ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے احسن اثاثا۔ قوم عاد مشرکین مکہ سے تعداد' قوت میں بڑھ کر تھے۔

ہم نے انہیں کان' آنکھیں اور دل عطا فرمائے تاکہ وہ ان کے ذریعے نعمتوں کو پہچانیں اور نعمتیں عطا فرمانے والے کو پہچانیں اور اس کا شکر بجالانے پر مواظبت اختیار کریں۔ ان کے کانوں' آنکھوں اور دلوں نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ من شئی میں من زائدہ ہے۔ اذ ظرف ہے مگر علت کے قائم مقام ہے کیونکہ جس کی طرف اذ مضاف ہو رہا ہے اس پر حکم مرتب ہوگا تو یہ ما اغنی کی علت ہے اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی ان پر نازل ہو گیا۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اور ہم نے برباد کر دیئے وہ گاؤں جو تمہارے اردگرد (آباد) تھے اور ہم نے مختلف انداز میں اپنی نشانیاں پیش کیں شاید وہ (حق کی طرف) لوٹ آئیں [1]۔''

[1] کم ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں۔ قری سے مراد قوم ثمود اور قوم لوط کی بستیاں ہیں۔ یعنی ان بستیوں میں رہنے والے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ ان پر دلائل بار بار بیان فرمائے تاکہ اھل مکہ کفر سے باز آجائیں لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ یہ صرفنا کی علت ہے۔ اس میں خطاب

فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

''پس کیوں مدد نہ کی ان کی ان معبودوں نے جنہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب کے لئے (اپنے) خدا بنا رکھا تھا بلکہ وہ تو ان سے روپوش ہو گئے اور یہ محض ان کا ڈھونگ تھا اور بہتان جو وہ باندھتے تھے [1]۔''

[1] جن کو ان لوگوں نے معبود بنایا تھا جن کے وسیلہ سے وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہتے تھے ان معبودوں نے انہیں عذاب سے نہ بچایا۔ وہ اپنے معبودوں کے بارے میں کہتے تھے هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ کا پہلا مفعول اسم ضمیر جو اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے وہ محذوف ہے۔ قربانا اس کا دوسرا مفعول ہے اور الهة دوسرے مفعول سے بدل ہے یا عطف بیان ہے یا الهة دوسرا مفعول ہے اور قربانا اس سے حال ہے یا تقرب کے معنی میں ہو کر مفعول لہ ہے یا یہ مفعول مطلق ہے بلکہ جب عذاب نازل ہوا تو ان کی مدد کرنے سے ان کے معبود غائب ہو گئے اور ان کے لئے اپنے معبودوں سے مدد اسی طرح ممتنع ہو گئی جس طرح اس آدمی سے مدد ممتنع ہوتی ہے جو موجود نہ ہو۔ جن چیزوں کی یہ حیثیت ہے انہیں معبود بنانا ان کا جھوٹ اور حق سے انحراف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ذلک کا مشار الیہ ان کی مدد کی نفی ہے۔ اسم اشارہ مبتدا ہے اور افکھم مضاف کے حذف کے ساتھ اس کی خبر ہے۔ معنی یہ ہوگا ان کی مدد اس لئے نہیں ہوئی کیونکہ یہ ان کے جھوٹ کا نتیجہ ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور مشار الیہ کے سبب کو بیان کرتا ہے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعود سے روایت نقل کی ہے کہ جن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جبکہ وادی نخعہ میں قرآن حکیم کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب انہوں نے قرآن حکیم کو سنا تو کہا خاموش ہو جاؤ یہ کل نو جن تھے ان میں سے ایک زوبعہ بھی تھا(1)۔

وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا یٰقَوْمَنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۳۰﴾ یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۱﴾ وَ مَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۲﴾

''اور جس وقت ہم نے متوجہ کیا آپ کی طرف جنات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن سنیں تو جب آپ کی خدمت میں پہنچے تو بولے خاموش ہو کر سنو پھر جب تلاوت ہو چکی تو لوٹے اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے ہوئے [1] انہوں نے (جا کر) کہا اے ہماری قوم ہم نے (آج) ایک کتاب سنی ہے جو اتاری گئی ہے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد تصدیق کرنے والی ہے پہلی کتابوں کی رہنمائی کرتی ہے حق کی طرف اور راہ راست کی طرف [2] اے ہماری قوم قبول کر لو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو اور اس پر ایمان لے آؤ بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہوں کو اور بچالے گا تمہیں دردناک

عذاب سے ۳ ؎ اور جو قبول نہیں کرتا اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو تو وہ اللہ کو عاجز کرنے والا نہیں زمین میں (کہ اس سے بچ کر بھاگ نکلے) اور نہیں اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار یہ (منکر لوگ) کھلی گمراہی میں ہیں ۴ ؎ ''

۱ ؎ یہ جملہ آخر تک جملہ معترضہ ہے۔ مقصود حضور ﷺ کو تسلی دینا ہے۔ ہم نے آپ کی طرف جنوں کی ایک جماعت بھیجی۔ نفر ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس کی تعداد دس سے کم ہو۔ اس کی جمع انفار آتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ نصیبین کے سات جن تھے۔ حضور ﷺ نے انہیں اپنی قوم کی طرف اپنا قاصد بنا کر بھیجا، جبکہ دوسرے علماء نے فرمایا ان کی تعداد نو تھی۔ امام بغوی نے فرمایا عاصم نے زر بن حبیش سے روایت کیا ہے کہ زر بعد ان نو جنوں میں سے تھا جنہوں نے قرآن حکیم سنا تھا۔ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ یہ نفر سے حال ہے۔ جب وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے یا جب انہوں نے قرآن حکیم سنا تو جنوں نے ایک دوسرے کو کہا خاموش ہو جاؤ تاکہ ہم قرآن حکیم کو سنیں۔ جب حضور ﷺ قرأت سے فارغ ہوئے تو وہ اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے تاکہ حضور ﷺ کے حکم سے دوسرے جنوں کو ڈرائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیں۔ ہم نے جنوں کے اس واقعہ کو سورۂ جن میں بیان کیا ہے۔

۲ ؎ عطاء نے کہا ہے ان جنوں کا پہلا دین یہودیت تھا (1) میں کہتا ہوں شاید ان کے قول اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى کا مطلب یہ ہے جو تورات کی ناسخ ہے۔ انجیل اور زبور کا ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ دونوں تورات کے اکثر احکام کی ناسخ نہ تھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ اور آپ کے قول کی حکایت کرتے ہوئے کہا وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ یعنی تاکہ میں تم پر بعض ان احکام کو حلال کروں جنہیں تم پر حرام کیا گیا ہے۔ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد تورات، انجیل اور دوسری آسمانی کتابیں ہیں۔ مُصَدِّقًا یا تو انزل کے فاعل سے حال ہے یا کتابا کی دوسری صفت ہے۔ یہ قرآن حکیم عقیدہ حقہ اور شریعت کے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

۳ ؎ دَاعِيَ اللّٰهِ سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے جو اسلام کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمہارے ان گناہوں کو بخش دے گا جو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں جو حقوق العباد ہیں۔ وہ صرف ایمان لانے سے معاف نہیں ہوتے نیز تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔ ان جنوں کی دعوت کو ستر جنوں نے قبول کیا وہ سب حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور بطحاء میں آپ سے ملے۔ حضور ﷺ نے انہیں قرآن سنایا۔ آپ نے انہیں چند چیزوں کا حکم دیا اور چند چیزوں سے انہیں منع کیا۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ حضور ﷺ جنوں اور انسانوں سب کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ہم نے سورۂ جن میں مومن جنوں کے بارے میں علماء کا اختلاف ذکر کر دیا ہے۔

۴ ؎ جو اللہ تعالیٰ کے داعی، یعنی حضور ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کرے تو اللہ تعالیٰ جب اسے عذاب دینے کا ارادہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتا اور نہ اس کے کوئی ایسے دوست ہیں جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رکھ سکیں۔ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءُ یہ جملہ لَيْسَ بِمُعْجِزٍ کے فاعل سے حال ہے اور جملہ شرطیہ جملہ معترضہ ہے۔ جن لوگوں نے حضور ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ واضح گمراہی میں ہیں۔

عَلٰۤى اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۳﴾

"کیا انہوں نے نہ جانا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ذرا تھکن محسوس نہ کی ان کے بنانے میں وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دے بلکہ وہ تو ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے[1]۔"

[1] اَوَلَمْ یَرَوْا میں استفہام انکاری ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔ جملہ کا عطف محذوف جملے پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَیُنْكِرُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ الْكُفَّارُ عَنِ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَلَمْ یَرَوْا یعنی کیا وہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور ان کی تخلیق سے عاجز نہیں آیا کیونکہ اس کی قدرت ذاتی ہے نہ کم ہوتی ہے اور نہ ہی ایجاد سے ختم ہوتی ہے۔ بقادر میں باء زائدہ ہے۔ اسم فاعل محل نصب میں ہے کیونکہ یہ مفعول ثانی ہے۔ ان مفتوحہ کی خبر پر باء داخل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان اپنے جملہ کے ساتھ مل کر یروا کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ افعال قلوب میں نفی دوسرے مفعول کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ یہ جمہور کی قرأت ہے۔ حضرت ابن مسعود کی قرأت میں قادر باء کے بغیر ہے۔ یعقوب نے اسے یقدر فعل مضارع کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾

"اور جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (ان سے کہا جائیگا) کیا یہ حق نہیں کہیں گے ہمارے رب کی قسم یہ حق ہے اللہ فرمائیگا اچھا اب چکھو عذاب کا مزا اس کفر کے باعث جو تم کیا کرتے تھے[1]۔"

[1] جس روز کفار کو جہنم پر پیش کیا جائے گا تو انہیں کہا جائے گا جس کا تم انکار کرتے تھے کیا یہ عذاب برحق نہیں۔ کفار جواب میں عرض کریں گے کیوں نہیں یہ عذاب برحق ہے۔ ساتھ ہی اپنے رب کی قسمیں اٹھائیں گے اور سب باتیں مانیں گے لیکن اس وقت ان کا ماننا انہیں کوئی نفع نہ دے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا جو تم کفر کرتے رہے ہو اس کے بدلے میں عذاب چکھو۔ فذوقوا میں فاء سببیہ ہے کیونکہ عذاب کا برحق ہونا اور دنیا میں ان کا انکار کرنا ہی ان کے عذاب پانے کا سبب بنا۔ یہاں فذوقوا امر کا صیغہ انہیں ذلیل کرتے اور شرمندہ کرنے کیلئے ہے۔ وَیَوْمَ یُعْرَضُ والا جملہ پہلے یَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کے ساتھ متصل ہے درمیان میں معترضہ جملے ہیں۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

"پس (اے محبوب) آپ صبر کیجئے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا تھا اور ان کے لئے (بددعا کرنے میں) جلدی نہ کیجئے جس روز وہ اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے تو خیال کریں گے کہ وہ نہیں ٹھہرے تھے دنیا میں مگر دن کی فقط ایک گھڑی۔ یہ پیغام حق ہے پس کیا نافرمانوں کے علاوہ بھی کسی کو ہلاک کیا جائیگا[1]۔"

[1] خطاب حضور ﷺ کو ہے۔ اس میں فاء سببیہ ہے، یعنی جب آپ کو علم ہے کہ وہ جہنم کا عذاب چکھیں گے تو صبر کریں اور انتقام کی

صاحب عزم' احتیاط والأرائے والا اور کامل عقل والا تھا(1) مِنَ الرُّسُلِ میں مِن بیانیہ ہے۔ بعض علماء نے کہا تمام انبیاء اولوالعزم ہیں مگر حضرت یونس بن متی ان میں شامل نہیں کیونکہ انہوں نے جلدی کی تھی۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حضور ﷺ کو فرمایا کہ آپ مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں(2) ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت یونس ان میں شامل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت آدم ان میں شامل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ ایک قوم نے کہا یہ وہ جلیل القدر رسول ہیں جن کا ذکر سورۂ انعام میں آیا ہے، وہ اٹھارہ رسول ہیں حضرت ابراہیم' حضرت اسحٰق' حضرت یعقوب' حضرت داؤد' حضرت نوح' حضرت سلیمان' حضرت ایوب' حضرت یوسف' حضرت موسیٰ' حضرت ہارون' حضرت زکریا' حضرت یحییٰ' حضرت عیسیٰ' حضرت الیاس' حضرت اسماعیل' حضرت یسع' حضرت یونس اور حضرت لوط علیہم السلام۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذکر کے بعد فرمایا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ کلبی نے کہا یہی وہ لوگ ہیں جنہیں جہاد کا حکم دیا گیا اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ مقاطعہ کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ان رسولوں کی تعداد چھ ہے۔ حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط' حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام۔ سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء میں انہیں کا ذکر ہے۔ مقاتل نے کہا یہ چھ ہیں حضرت نوح علیہ السلام جنہوں نے اپنی قوم کی اذیتوں پر صبر کیا' حضرت ابراہیم علیہ السلام آپ نے نار نمرود پر صبر کیا، حضرت اسحٰق علیہ السلام انہوں نے ذبح ہونے پر صبر کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے گم ہونے اور آنکھیں ختم ہو جانے پر صبر کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام آپ نے کنویں اور قید میں صبر کیا۔ حضرت ایوب علیہ السلام آپ نے بیماری پر صبر کیا۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا اولوالعزم رسولوں سے مراد حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ جو شریعتوں والے تھے ان کے ساتھ حضور ﷺ بھی شامل ہیں ان کی تعداد پانچ ہے۔ امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ نے ان کا خاص طور پر اس ارشاد میں ذکر فرمایا۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ اسی طرح اس ارشاد میں ذکر فرمایا۔ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ (3)۔

حضرت شیخ مجدد الف ثانی نے فرمایا اولوالعزم رسول چھ ہیں۔ حضرت آدم' حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ اور سید المرسلین حضرت محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ پہلے پانچ تو اس لئے ان میں شامل ہیں کیونکہ ان کا میثاق میں خصوصی ذکر ہوا۔ ساتھ ہی صاحب شریعت بھی ہیں۔ ان کے بعد جو بھی آیا اس نے ان کی شریعتوں ہی کی تائید کی۔ جہاں تک حضرت آدم علیہ السلام کا تعلق ہے وہ یقیناً جدید شریعت کے حامل ہوئے کیونکہ وہ سب سے پہلے ہوئے۔

امام بغوی نے مسروق سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے مجھے فرمایا اے عائشہ محمد اور آل محمد کے لئے دنیا زیبا نہیں۔ اے عائشہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم رسولوں سے مشکلات پر صبر اور مرغوب چیزوں کو چھوڑنے پر صبر کو پسند کیا ہے اور میرے بارے میں بھی اسی امر پر راضی ہے کہ مجھے ان امور کا مکلف بنائے جن کا انہیں مکلف بنایا اور ارشاد فرمایا فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ اب میرے لئے اس کی اطاعت کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ اللہ کی قسم میں اسی طرح صبر کروں گا جس طرح انہوں نے صبر کیا۔ میں بھی اسی طرح کوشش کروں گا جس طرح انہوں نے کوشش کی۔ امور پر قوت اللہ کی تائید سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

اور زخمی کر دیا۔ وہ نبی اپنے چہرے سے خون صاف کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ میرے مقام و مرتبہ کو نہیں جانتے۔ متفق علیہ (1)۔

اے محبوب آپ کفار کے قریش کے بارے میں عذاب نازل ہونے کی بددعا نہ کریں کیونکہ وقت مقررہ میں ان پر عذاب ضرور نازل ہوگا۔ گویا قوم کی مخالفت کی وجہ سے آپ کا دل تنگ ہوا تھا تو آپ نے یہ پسند کیا کہ جو انکار کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو تو اللہ تعالیٰ نے صبر اور جلدی ترک کرنے کا حکم دیا پھر یہ خبر دی کہ جلد ہی عذاب نازل ہوگا گویا جب وہ آخرت میں عذاب دیکھیں گے تو وہ خیال کریں گے کہ وہ دنیا میں بہت تھوڑا وقت رہے ہیں گویا وہ اس کی ہولنا کی دیکھ کر دنیا میں ٹھہرنے کے عرصے کو وہ مختصر خیال کریں گے یہاں تک کہ وہ گمان کریں گے کہ وہ تو صرف ایک گھڑی دنیا میں ٹھہرے ہیں اگرچہ وہ طویل عرصہ تک دنیا میں رہے تھے لیکن جب وہ وقت ختم ہو گیا تو گویا وہ وقت تھا ہی نہیں۔ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ والا جملہ وَلَا تَسْتَعْجِلْ والے جملہ کی علت کے محل میں ہے پھر فرمایا اسی چیز کی تمہیں نصیحت کی گئی یا یہ سورت یا یہ قرآن اور جو کچھ اس میں وضاحت ہے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں کافی ہے یا یہ رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ ہے۔ بلاغ کو نکرہ اس لئے ذکر کیا تاکہ تعظیم اور تفخیم کا اظہار ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا بلاغ مبتدا ہے اور لھم اس کی خبر ہے۔ درمیان میں جملہ معترضہ ہے، یعنی ان کے لئے وقت ہے جس تک وہ پہنچیں گے۔ گویا جب وہ اس وقت تک پہنچیں گے اور اس میں جو کچھ ہے اسے دیکھیں گے تو اپنی عمر کی مدتوں کو چھوٹا خیال کریں گے۔

فَهَلْ يُهْلَكُ میں استفہام انکاری ہے، یعنی عذاب کے ساتھ کسی کو بھی ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ مگر انہیں لوگوں کو جو نصیحت حاصل کرنے اور اطاعت سے خارج ہیں۔ زجاج نے کہا اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے ہوتے ہوئے کوئی ہلاک نہیں ہوتا مگر فاسق قوم ہی ہلاک ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ایک قوم نے کہا اس آیت سے بڑھ کر کوئی اور آیت نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی قوی امید ہو (2)۔

سورۂ محمد

آیاتھا ۳۸ — سُورَةُ مُحَمَّدٍ مَدَنِيَّةٌ ۴۷ — رکوعاتھا ۴

سورۂ محمد مدنی ہے، اس میں اڑتیس آیات اور چار رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ① وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ②

''جنہوں نے (خود بھی) حق کا انکار کیا اور (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے رہے، اللہ نے ان کے عملوں کو برباد کر دیا[1] اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایمان لے آئے جو اتارا گیا (رسول معظم) محمد ﷺ پر اور وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے دور کر دیں ان سے ان کی برائیاں اور سنوار دیا ان کے حالات کو[2]''

[1] جب انہوں نے لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکا کیونکہ وہ خود اسلام میں داخل ہونے اور اس راہ پر چلنے سے رک گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انکے اعمال کو ضائع کر دیا کیونکہ انہوں نے ان اعمال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد نہیں کیا تھا۔ دنیا میں انہیں ان اعمال کا بدلہ بطور اللہ تعالیٰ کے فضل کے ملتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے لئے ثواب نہیں بنایا۔ یہاں اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو ظاہر میں اچھے ہیں جس طرح لوگوں کو کھانا کھلانا' صلہ رحمی کرنا' قیدی چھڑانا' پڑوسیوں کی حفاظت کرنا۔ ضحاک نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ جو مکر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو باطل کر دیا اور اس کا وبال انہیں پر پلٹا دیا(1)۔

[2] وہ چیزیں جن پر ایمان لانا واجب ہے ان میں سے حضور ﷺ پر نازل کردہ چیز کی تخصیص آپ کی عظمت بیان کرنے کے لئے ہے اور یہ شعور دلانے کے لئے ہے کہ ایمان اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ یہی ایمان کی اصل ہے اور دوسری تمام ایمانیات کو شامل ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس فرمان کے ساتھ اس کی تاکید لگائی۔

وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ یہ جملہ معترضہ ہے اور حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کے حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ناسخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور ان کے اعمال صالحہ کی وجہ سے ان کے گناہوں کو بخش دیا اور ان پر پردہ

حالت کو بہتر بنایا اور جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضا میں انہیں ہمیشہ کے لئے داخل کر کے ان کی حالت کو درست کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کا معنی ہے دنیاوی زندگی میں انہیں محفوظ رکھا(1) ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ پہلی آیت میں مذکور کافروں سے مراد مشرکین مکہ ہیں اور اس آیت میں مذکور مومنین سے مراد انصار ہیں(2) میں کہتا ہوں لفظ عام ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝۳ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ۬ ذٰلِكَ ؕۛ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۠ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۴

"(یوں) اس لئے کہ جنہوں نے کفر کیا وہ باطل کی پیروی کرتے تھے اور جو ایمان لائے تھے وہ حق کی پیروی کرتے تھے جو ان کے رب کی طرف سے تھا اسی طرح اللہ بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے ان کے حالات [1] پھر جب (میدان جنگ میں) تمہارا کفار سے آمنا سامنا ہو تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ جب انہیں خوب قتل کر لو تو پھر کس کر باندھو رسیاں بعد ازاں یا تو احسان کر کے ان کو رہا کر دو یا ان سے فدیہ لو یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ یہی حکم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا لیکن وہ آزمانا چاہتا ہے تمہیں بعض کو بعض سے اور جو مارڈالے گئے اللہ کی راہ میں پس اللہ ان کے اعمال ضائع نہیں ہونے دے گا [2] "

[1] ذٰلِكَ اسم اشارہ سے مراد اضلال (گمراہ کرنا) نعمتوں کی ناشکری اور اصلاح وغیرہ، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے وہ مراد ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ آیت کریمہ میں باطل سے مراد شیطان ہے اور حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ اَمْثَالَهُمْ میں ضمیر سے مراد لوگ ہیں یا جن دو جماعتوں کا ذکر کیا گیا تھا وہ مراد ہیں۔ معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے تا کہ لوگ ان دونوں جماعتوں کی مثالوں سے عبرت حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے عمل کو باطل کی اتباع' ان کے خائب و خاسر ہونے کو عمل ضائع کر دیئے' مومنوں کے عمل کو حق کی اتباع کرنے اور ان کی کامیابی کو گناہوں کے بخشے کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔

[2] آیت کریمہ میں لقاء سے مراد دشمنوں سے جنگ کرنا ہے۔ ضرب الرقاب مفعول مطلق ہے، اس کا فعل محذوف ہے۔ اصل میں کلام یوں تھی فاضربوا الرقاب ضربا فعل کو حذف کر دیا گیا اور مصدر کو فعل کے قائم مقام رکھ دیا گیا پھر مصدر کو مفعول بہ کی طرف مضاف کیا ہے تا کہ تاکید اور اختصار کا فائدہ دے۔ قتل کو ضرب الرقاب سے تعبیر کیا۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ مناسب یہ ہے کہ جنگ میں جہاں تک ممکن ہو گردن کو اڑایا جائے کیونکہ اس سے عموماً موت واقع ہوتی ہے، جبکہ دوسرے زخموں سے ایسی صورتحال نہیں ہوتی۔ فرمایا جب تم انہیں خوب قتل کر لو اور ان سے سختی کے ساتھ نبٹ چکو تو انہیں قید کر لو۔ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ یہ ثخین سے مشتق ہے، یعنی انہیں مضبوطی سے باندھ لو تا کہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ وثاق کو واؤ کے کسرہ اور فتحہ دونوں صورتوں میں

کلام میں مفعول مطلق ہیں۔ ان کے فعل محذوف ہیں۔ تقدیر کلام کا معنی یوں ہے کہ انہیں گرفتار کرنے کے بعد بطور احسان آزاد کر دو۔ یا فدیہ لے کر آزاد کر دو امام بغوی نے فرمایا علماء نے اس آیت کے حکم میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قوم نے یہ کہا اس آیت کا حکم اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ سے منسوخ ہے۔ قتادہ ضحاک، سدی اور ابن جریج کا یہی قول ہے، اوزاعی کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ میں کہتا ہوں فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ کو اس آیت کا ناسخ بنانا درست نہیں، جبکہ اقتلوا المشرکین کا حکم بعض مشرکوں کے ساتھ خاص ہے کیونکہ قیدیوں کو غلام اور ذمی بنانا ہمارے احناف اور مالکیہ کے نزدیک درست ہے۔ اس آیت کا حکم ظنی ہے کیونکہ یہ ایسا عام ہے جس میں سے بعض افراد خاص ہیں اس وجہ سے وہ اس آیت کی ناسخ نہیں بن سکتی کیونکہ اس کا حکم قطعی ہے۔

دوسرے علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ محکم آیات میں سے ہے۔ کفار میں سے جو لوگ گرفتار کیے جائیں ان کے بارے میں امام کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ انہیں قتل کرنے کا حکم دے۔ انہیں غلام بنا لینے کا کہے ان پر احسان کرے اور بغیر عوض کے آزاد کر دے یا مال لے کر یا مسلمان قیدیوں کی صورت میں فدیہ لے کر آزاد کر دے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت حسن بصری، حضرت عطاء اکثر صحابہ اور اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ امام ثوری، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوئی اور ان کی حکومت مضبوط ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے بارے میں یہ حکم ارشاد فرمایا کہ چاہو احسان کرو یا فدیہ لو اور یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضور ﷺ اور آپ کے بعد خلفاء نے اسی پر عمل کیا ہے(1)۔ میں کہتا ہوں یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى الخ کے لئے ناسخ ہے کیونکہ یہ آیت غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قیدیوں پر احسان فرمایا۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ مکہ کے اسی (80) آدمی اسلحہ سے لیس تنعیم پہاڑ سے اترے وہ حضور ﷺ اور صحابہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ حضور ﷺ کے صحابہ نے انہیں پکڑ لیا اور حضور ﷺ نے انہیں قتل کرنے کا حکم نہ دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ میں نے قیدیوں کے احکام علماء کا اختلاف اور اس بارے میں احادیث سورۂ انفال کی آیت مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ میں بیان کر دی ہیں۔ حرب سے جنگ کرنے والے لوگ مراد ہیں۔ اوزار سے مراد اسلحہ ہے۔ معنی ہے حتی کہ جنگ ختم ہو جائے اور مسلمان یا جسے پناہ دی گئی اس کے علاوہ کوئی باقی نہ رہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اوزار سے مراد گناہ ہیں مطلب یہ ہوگا کہ مشرک کفر سے توبہ کر لیں اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے حرب کا معنی جنگ ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ تمہاری جنگ اور قتال مشرکوں کے اسلحہ اور ان کے اعمال کی قباحتوں کو ختم کر دے، یعنی وہ مسلمان ہو جائیں یا اس کا معنی یہ ہے مشرکوں کو قتل کرنے اور قیدی بنانے کے ساتھ انہیں کمزور کر دو یہاں تک کہ تمام دوسری قومیں اور دینوں والے اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ ختم ہونے کو قتل یا قید یا احسان یا فدیہ یا سب کی غایت بنایا ہے، یعنی یہ احکام جاری رہیں گے یہاں تک کہ ان کی شرکت ختم ہو جائے اور مشرکوں کے ساتھ جنگ نہ رہے۔ یہ صورتحال اسی وقت ہوگی جب

حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ایک جماعت حق پر ہوتے ہوئے جنگ کرتی رہے گی اور اپنے مخالفین پر غالب رہے گی یہاں تک کہ ان میں سے آخری آدمی دجال سے جنگ کرے گا' اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(1) امام بغوی نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب سے مجھے مبعوث کیا اس وقت سے جہاد جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا یہاں تک کہ میری امت کا آخری فرد دجال سے جنگ کرے گا۔ ذلک مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلْاَمْرُ فِیْهِ ذٰلِكَ یا اسم اشارہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی ذلک ثابت یا یہ محذوف فعل کا مفعول ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اِفْعَلُوْا بِهِمْ ذٰلِكَ اس صورت میں یہ جملہ سابقہ کلام کی تاکید ہے۔

انتصر کا معنی انتقام لیا، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کفار کو ہلاک کر کے ان سے انتقام لے لیتا اور تمہیں جہاد کا حکم نہ دیتا لیکن اس نے تمہیں حکم دیا کہ جہاد کرو تا کہ تم میں سے بعض کو بعض کے ساتھ آزمائے، یعنی مومنوں کو کفار کے ساتھ آزمائے تا کہ مومن ثواب کے مستحق بن جائیں اور کافروں کو مومنوں کے ساتھ آزمائے، یعنی مومنوں کے ہاتھوں انہیں جلدی سزا دے تا کہ بعض کفر سے باز آجائیں اور بعض جہنم کے مستحق بن جائیں۔ اس جملہ میں جہاد کی حکمت بیان کی، جبکہ مومنوں کو جہاد کا مکلف کیے بغیر کفار کو نیست و نابود کرنا اللہ تعالیٰ کیلئے ممکن تھا۔ بصرہ کے قراء اور حفص نے قتلوا کو مجرد سے ماضی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر سے مراد شہداء ہیں، جبکہ باقی قراء نے مقاتلہ سے قاتلوا پڑھا ہے۔ اس صورت میں واؤ ضمیر سے مراد مجاہدین ہیں۔ فلن یضل یہ جملہ خبر ہے اور اس کا مبتدا اسم موصول ہے مبتدا میں کیونکہ شرط کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے خبر پر فاء کو ذکر کیا، یعنی گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ان کے اعمال ضائع نہیں کرے گا بلکہ ان کی خطاؤں کو معاف کر دے گا اور ان کی نیکیوں پر انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ بزار' بیہقی اور اصفہانی نے ترغیب میں حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا شہید تین قسم کے ہیں ایک وہ آدمی جو اپنی جان اور مال لے کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں نفل پڑھتا ہے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے۔ وہ یہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ جہاد کرے گا اور شہید ہوگا اس کی یہ نیت تھی کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرے۔ اگر وہ مر گیا یا قتل کر دیا گیا تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ عذاب قبر سے اسے نجات مل جائے گی بڑی گھبراہٹ میں امان نصیب ہوگی۔ حورعین کے ساتھ اس کی شادی کی جائے گی۔ عزت والا لباس اسے پہنایا جائے گا اس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا۔

دوسری قسم کا شہید وہ ہے جو اپنی جان اور مال کے ساتھ گھر سے نکلا۔ مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے یہ بھی ارادہ کرتا ہے کہ وہ قتل تو کرے لیکن شہید نہ ہو اگر اس مجاہد کو موت آجائے یا اسے شہید کر دیا جائے تو اس کے گھٹنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ملے ہوں گے، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوں گے۔ شہید کی تیسری قسم وہ ہے جو اپنے مال اور جان کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے' مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ وہ یہ ارادہ رکھتا تھا کہ وہ قتل کرے اور اسے قتل کر دیا جائے۔ اگر وہ مر گیا یا شہید کر دیا گیا تو وہ قیامت کے روز یوں آئے گا کہ وہ تلوار سونتے ہوئے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے ہوگا، جبکہ لوگ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔ یہ شہداء کہیں گے ہمارے لئے جگہ کھلی کر دو کیونکہ ہم نے اپنے مال اور جانیں اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کی ہیں یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے نور کے منبر کے پاس آئیں گے اور ان پر بیٹھ جائیں گے وہ دیکھیں گے کہ لوگوں کے درمیان کیسے فیصلہ ہوتا ہے۔ انہیں موت کا کوئی غم نہ ہوگا اور نہ ہی

برزخ میں انہیں آزمائش میں ڈالا جائے گا نہ انہیں حساب' میزان اور پل صراط پریشان کرے گا۔ وہ جس چیز کا سوال کریں گے انہیں عطا کی جائیگی وہ جس چیز کے بارے سفارش کریں گے ان کی شفاعت تسلیم کی جائے گی جنت میں جو چیز چاہیں گے انہیں وہ دی جائے گی۔ جنت میں جہاں چاہیں گے انہیں وہاں ٹھکانہ دیا جائے گا(1)۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ احد کے دن نازل ہوئی مسلمانوں میں زخمی اور شہید ہر طرف پھیلے ہوئے تھے(2) مشرکوں نے یہ نعرہ لگایا تھا اعل هبل مسلمانوں نے یہ نعرہ لگایا تھا اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ مشرکوں نے کہا اِنَّ لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ کہو اَللّٰهُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ۔

سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ۞ وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۞ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۞

''وہ پہنچا دے گا انہیں بلند مدارج پر اور سنوار دے گا ان کے حالات کو 1؎ اور داخل کرے گا انہیں بہشت میں جس کی پہچان اس نے انہیں کرا دی تھی 2؎ اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور (میدان جہاد میں) تمہیں ثابت قدم رکھے گا 3؎''

1؎ دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت کی طرف راہنمائی کرے گا اور آخرت میں بلند درجات کی طرف راہنمائی کرے گا اور دونوں جہانوں میں ان کے احوال کو درست کرے گا۔ دنیا میں ان کے احوال کی درستگی کا مطلب یہ ہے کہ جنہیں شہید نہیں کیا گیا۔ انہیں شہداء میں داخل کیا جائیگا یا جب وہ جہاد کے لئے نکلے اور اس بات پر راضی ہوئے کہ انہیں شہید کر دیا جائے تو انہیں دونوں جہانوں میں بدلہ دیا جائے گا جہاں تک آخرت میں ان کے احوال درست کرنے کا تعلق ہے تو جنہیں شہید کیا گیا اور جنہیں شہید نہیں کیا گیا سب کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ان کی نیکیاں قبول کی جائیں گی اور ان پر دعوی کرنے والے راضی ہو جائیں گے یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ دے کر ان سے راضی کر دے گا۔

ابونعیم نے سہل بن سعد سے حلیہ میں' بزار اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے دونوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں کے قرضے قیامت کے دن چکائے گا ایک وہ شخص جسے اندیشہ ہو کہ دشمن مسلمانوں کے علاقہ پر حملہ کرے گا اس کے اپنے پاس وسائل نہ ہوں وہ کسی سے قرض لے اس سے اسلحہ خریدے اور جہاد میں اس کے ساتھ قوت حاصل کرے اور قرض ادا کرنے سے پہلے مر جائے اللہ تعالیٰ اس کا قرضہ ادا فرمائے گا۔ دوسرا آدمی وہ ہے جس کا کوئی مسلمان بھائی فوت ہو گیا اسے کفن دینے کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا اس نے قرض لیا اور کفن خریدا اور مر گیا، جبکہ قرض ادا کرنے پر قادر نہ تھا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کا قرضہ بھی ادا کرے گا۔ تیسرا وہ شخص ہے جسے خوف ہوا کہ وہ بدکاری میں نہ پڑے اس نے قرض لے کر عورت سے نکاح کیا وہ مر گیا اور قرض ادا نہ کر سکا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف سے قرض ادا کرے گا(3)۔ طبرانی نے حسن سند کے ساتھ اوسط میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز جب تمام مخلوقات جمع ہوگی جنتیوں کے جنت میں

والے ظلم کو چھوڑ دو تمہارا ثواب اللہ تعالیٰ پر ہے (1)۔

ے جنت میں ان کے مکانات کو واضح فرما دے گا یہاں تک کہ وہ بغیر کسی سے پوچھے اپنے اپنے مکانات تک پہنچ جائیں گے گویا جب سے انہیں پیدا کیا گیا ہے اس وقت سے ان کی رہائش گاہیں ہیں تو جس طرح وہ دنیا میں اپنے گھر اور اہل خانہ تک بغیر راہنمائی کے پہنچ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ جنت میں اپنے گھر' درجہ' بیوی اور خادموں تک پہنچ جائے گا۔ یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا دنیا میں تم اپنی بیویوں اور عورتوں سے متعارف نہیں جتنے جنتی اپنی بیویوں اور گھروں سے متعارف ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ایک طویل حدیث میں اسے روایت کیا ہے۔ اسی طرح طبرانی' ابویعلیٰ اور بیہقی نے بعث میں اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔

ے یہاں اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے رسول کی مدد ہے، یعنی اے مومنو! اگر تم اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے رسول کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ دشمنوں کے خلاف تمہاری مدد فرمائے گا اور اسلام کے حقوق ادا کرنے اور کفار کے خلاف جہاد کرنے میں تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۡ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝

''اور جنہوں نے (حق کا) انکار کیا خدا کرے وہ منہ کے بل اوندھے گریں اور اللہ ان کے اعمال کو برباد کر دے لے یہ اس لئے کہ انہوں نے ناپسند کیا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا پس اس نے ضائع کر دیئے ان کے اعمال ے تو کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ خود دیکھ لیتے کہ کیسا انجام ہوا ان (منکروں) کا جو ان سے پہلے گزرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر تباہی نازل کر دی اور کفار کے لئے اسی قسم کی سزائیں ہیں ے یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے۔ اور کفار کا کوئی مددگار نہیں ہے۔''

لے تعسا ایسے فعل کا مفعول مطلق ہے جس کا حذف کرنا واجب ہوتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے فتعسوا تعسا یہ جملہ الذین اسم موصول کی خبر ہوگا یا جو فعل اسم موصول کو نصب دے رہا ہے اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی ہے ان کے لئے رحمت سے دوری ہے۔ ابو العالیہ نے کہا اس کا معنی ہے ان کے لئے گراوٹ اور پستی ہے۔ ضحاک نے کہا ان کے لئے خسارہ ہے۔ ابن زید نے کہا ان کے لئے دوری ہے۔ فراء نے کہا تعسا بددعا کے طور پر استعمال ہوا اور مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے دنیا میں ان کے لئے لڑکھڑانا ہے اور آخرت میں جہنم میں گرنا ہے، جبکہ ایک آدمی لڑکھڑا جائے اور اس کے کھڑا ہونے کا وہ ارادہ نہ کریں تو اس وقت کہا جاتا ہے۔ تعسا اسکی ضد لعا ہے (2)۔ قاموس میں تعس کا معنی ہلاکت ہے لغزش' گرنا'

اس فعل پر ہے جس نے تعسا کو نصب دی۔

۲؎ ان کے حق میں یہ تباہی اور گمراہی اس لئے مقدر کی کیونکہ انہوں نے قرآن کو ناپسند کیا۔ قرآن کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں توحید اور ایسے احکام کا حکم ہے جو ان چیزوں کے مخالف ہے جس سے وہ مانوس ہیں اور ان کے نفس جن کی خواہش کرتے ہیں۔ احبط اعمالا کو دوبارہ ذکر فرمایا تاکہ اس بات کا شعور دلایا جائے کہ یہ کفر کے لوازمات میں سے ہے، یعنی جب کفر ہوگا تو اعمال ضرور ضائع ہوں گے۔

۳؎ حرف استفہام انکار کے لئے ہے اور اس میں فاء عاطفہ ہے اور جملے کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے اَلَمْ یَخرُجُوْا فَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ۔ فَیَنْظُرُوْا یہ نفی کا جواب ہے یا یہ لم یسیروا کا معطوف ہے۔ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد وہ قومیں ہیں جنہوں نے سابقہ رسولوں کو جھٹلایا، یعنی کیا انہوں نے سابقہ قوموں کے انجام کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں، ان کے گھر والوں، انکی اولادوں اور ان کے اموال کو کیسے ہلاک کر دیا۔ کافرین سے مراد اہل مکہ ہیں۔ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کیا تاکہ ان کے کفر پر مہر لگ جائے، یعنی کافروں کے لئے اسی سزا جیسی سزا ہے، یعنی ھا ضمیر سے مراد تلک العاقبۃ ہے یا اس سے مراد عقوبت اور ہلاکت ہے۔ اس پر دمر کا لفظ دلالت کرتا ہے۔

۴؎ ذلک اسم اشارہ سے مراد مومنوں کی مدد اور کفار پر غلبہ ہے۔ مولیٰ کا معنی دوست اور مددگار ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان کی تائید کرتا ہے انہیں توفیق دیتا ہے ان کے معاملے کو درست کرتا ہے اور شیطان کے وساوس کو ان سے دور کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ آیت میں کافرین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے کفر اور شیطان کے غلبہ کو مقدر کیا۔

اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ وَ كَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ هِیَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْیَتِكَ الَّتِیْۤ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ داخل فرمائے گا جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے (سدا بہار) باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں اور جنہوں نے کفر کیا وہ عیش اڑا رہے ہیں اور محض کھانے (پینے) میں مصروف ہیں ڈنگروں کی طرح حالانکہ آتش جہنم ان کا ٹھکانا ہے ۱؎ اور بہت سی ایسی بستیاں تھیں جو قوت و شوکت میں تمہاری اس بستی سے کہیں زیادہ تھیں جس (کے باشندوں) نے آپ کو نکال دیا ہم نے ان بستیوں کے مکینوں کو ہلاک کر دیا پس کوئی ان کا مددگار نہ تھا۔“

۱؎ یعنی جنہوں نے کفر کیا وہ دنیاوی نعمتوں سے تھوڑے دن لطف اندوز ہوں گے كَمَا تَاْكُلُ میں ما مصدریہ ہے اور تاکل اسکی صفت

۲؎ کَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ مبتدا ہے اور قریہ سے مراد بستی والے ہیں۔مضاف کو حذف کیا اور مضاف الیہ پر مضاف کے احکام جاری کئے گئے ہیں۔اَشَدُّ قُوَّۃً یہ جملہ قریۃ کی صفت ہے۔مضاف الیہ کا اعتبار کرتے ہوئے ہی ضمیر ذکر کی۔اخرجتک فعل کو قریہ کی طرف منسوب کیا اور مراد بستی والے ہیں۔آپ کے بستی سے نکالنے کی نسبت ان کی طرف بطور مسبب ہے کیونکہ حضور ﷺ مکہ مکرمہ سے ان کی اذیتوں کی وجہ سے نکلے تھے۔ابویعلی نے نقل کیا ہے اور بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ مکہ مکرمہ سے غار ثور کی طرف نکلے تو آپ مکہ مکرمہ کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا تو اللہ تعالیٰ کے شہروں میں سے اللہ تعالیٰ کو بہت ہی محبوب ہے اور اللہ تعالیٰ کے شہروں میں سے مجھے بھی سب سے زیادہ محبوب ہے اگر یہ مشرک مجھے نہ نکالتے تو میں تجھ سے نہ نکلتا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔اَهْلَكْنٰهُمْ یہ مبتدا کَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ کی خبر ہے۔ھم ضمیر جمع ذکر کی کیونکہ قریہ سے مراد قریہ والے لوگ ہیں۔فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ میں حال ماضیہ کی حکایت ہے۔یعنی اس وقت ان کے لئے کوئی مددگار نہیں۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّاۗءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ڬ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ ﴿۱۵﴾

''کیا وہ شخص جس کے پاس روشن دلائل ہیں اپنے رب کے پاس سے اس (بدبخت) کی مانند ہے آراستہ کر دیئے گئے جس کے لئے اس کے برے اعمال اور وہ پیروی کرتے رہے اپنی خواہشوں کی ۱؎ احوال اس جنت کے جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس میں نہریں ہیں ایسے پانی کی جس کی بو اور مزہ نہیں بگڑتا اور نہریں ہیں دودھ کی جس کا ذائقہ نہیں بدلتا اور نہریں ہیں شراب کی جو لذت بخش ہے پینے والوں کے لئے اور نہریں ہیں شہد کی جو صاف ستھرا ہے اور ان کے لئے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور (مزید برآں ان کے لئے) بخشش ہوگی اپنے رب کی طرف سے (سوچو!) کیا یہ ان کی مانند ہوں گے جو ہمیشہ آگ میں رہیں گے اور انہیں کھولتا پانی پلایا جائے گا اور وہ کاٹ دے گا ان کی آنتوں کو ۲؎''

۱؎ حرف استفہام انکار کے لئے ہے۔فاء عاطفہ ہے مابعد جملے کا عطف کلام محذوف پر ہے۔تقدیر کلام کا معنی یہ ہوگا کیا مومن جس کا اللہ تعالیٰ مددگار ہے اور کافر جس کا کوئی مددگار نہیں برابر ہو سکتے ہیں تو کیا وہ انسان جو اپنے رب کی جانب سے عطا کردہ واضح دلیل پر ہو۔ان لوگوں جیسا ہو سکتا ہے شیطان نے جن کے لئے برے اعمال کو مزین کیا ہو اور ان لوگوں نے اپنی خواہشات کی اتباع کی ہے۔آیت میں بینۃ سے مراد قرآن یا قرآن اور دوسرے دلائل ہیں۔سوء عمل سے مراد شرک اور نافرمانیاں ہیں۔

۲؎ ضمیر عائد محذوف ہے۔تقدیر کلام یوں ہے وُعِدَ بِهَا الْمُتَّقُوْنَ۔مثل الجنة مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔تقدیر کلام

الْجَنَّةِ كَمَثَلِ مَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ یا تقدیر کلام یہ ہوگی اَمَثَلُ الْجَنَّةِ كَمَثَلِ جَزَاءِ مَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ۔ اس سے پہلے حرف استفہام حذف کر دیا گیا کیونکہ اس کی مثل میں حرف استفہام موجود ہے۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے جو واضح دلیل کو پکڑنے والے اور خواہش نفس کی غلامی کرنے والے کو برابر تصور کرتا ہے اس آدمی کی مثال اس آدمی جیسی ہے جو جنت اور دوزخ میں برابری کا دعویٰ کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا مبتدا کی خبر فِيهَآ اَنْهٰرٌ ہے اور من ماء یہ انہار کی صفت ہے اگر فِيهَآ اَنْهٰرٌ والا جملہ مثل الجنة کی خبر نہ ہو پھر یا تو یہ جملہ مستانفہ ہوگا اور مثل الجنة کی وضاحت کرے گا اور یہ ضمیر عائد محذوف سے حال ہوگا۔ ابن کثیر نے اسن کو قصر کی صورت میں اور باقی قراء نے مد کی صورت میں پڑھا ہے۔ اس لفظ میں یہ دونوں لغتیں ہیں، یعنی نہ اس کا ذائقہ بدلے گا اور نہ ہی خوشبو بدلے گی جس طرح دنیا کے پانی کا ذائقہ اور رنگ زیادہ دیر ٹھہرنے کی وجہ سے بدل جاتا ہے۔ جنت میں دودھ کی نہریں ہوں گی ان کا ذائقہ بھی نہیں بدلے گا جس طرح دنیا کے دودھ کا ذائقہ بدل جاتا تھا اور اس میں لذیذ شراب کی نہریں ہیں۔ لذة یہ لذ کی مونث ہے یا یہ مصدر ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اور پھر خمر کی صفت ہے یا مبالغہ کے اظہار کے لئے مصدر کے ساتھ ہی صفت ذکر کر دی۔ اس شراب میں پینے والوں کے لئے نہ بدبو ہوگی اور نہ ہی نشہ کی وجہ سے سردرد وغیرہ ہوگا، جبکہ دنیا کے شرابوں کی نوعیت الگ ہوتی ہے کیونکہ انہیں پیتے وقت بدبو آتی ہے اور اس میں صاف شہد کی نہریں ہیں اس میں گوند اور مکھی کا فضلہ وغیرہ شامل نہیں ہوگا۔

معاویہ بن حیدہ سے مروی ہے، کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جنت میں پانی، شہد، دودھ اور شراب کے سمندر ہیں پھر ان سے نہریں نکالی جاتی ہیں (1) اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور صحیح قرار دیا۔ اسی طرح امام بیہقی نے اسے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کی نہریں کستوری کے پہاڑ سے نکلتی ہیں (2) اسے ابن حبان، حاکم، بیہقی، طبرانی اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔ مسروق سے مروی ہے کہ جنت کی نہریں بغیر کسی کھائی کے چلتی ہیں (3) اسے ابن مبارک اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شائد تم گمان کرتے ہو گے کہ جنت کی نہریں زمین کے اندر نالوں میں چلتی ہوں گی نہیں اللہ کی قسم وہ زمین کے اوپر بہتی ہیں، اس کے دونوں کناروں پر موتی کے خیمے ہوں گے اور مٹی کستوری کی ہوگی (4)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سیحان! جیحان فرات اور نیل جنت کے دریا ہیں اسے امام مسلم نے روایت کیا (5) حضرت عمرو بن عوف سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار دریا جنت کے دریا ہیں۔ نیل، فرات سیحان اور جیحان۔ چار پہاڑ جنت کے پہاڑ ہیں۔ احد، طور، لبنان، ورقان (6)۔ کعب الاحبار سے مروی ہے کہ نیل کا دریا شہد کا دریا ہے۔ دریائے دجلہ دودھ کا دریا ہوگا۔ دریائے فرات جنت میں شراب کا دریا ہوگا اور دریائے سیحان جنت میں پانی کا دریا ہوگا۔ اسے امام بیہقی نے روایت کیا (7)۔ امام بغوی نے کعب کا قول نقل کیا ہے۔ دجلہ کا دریا جنتیوں کے پانی کا دریا ہے۔ دریائے فرات ان کے دودھ کا دریا ہے اور مصر کا دریا ان کے شراب کا دریا ہے اور دریائے سیحان ان کے شہد کا دریا ہے۔ یہ چاروں دریا کوثر سے نکلتے ہیں۔

وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ کا عطف فِيهَآ اَنْهٰرٌ پر ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ دنیا میں میٹھا اور کڑوا جو پھل بھی ہے وہ جنت

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 10 صفحہ 31 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 7 صفحہ 3217 (ابن حزم)

میں بھی ہوگا۔ یہاں تک کہ جنت میں تنبہ بھی ہوگا۔ اسے ابن ابی حاتم اور ابن منذر نے اپنی تفسیروں میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے جنت میں جو پھل ہیں دنیا میں ان کے صرف نام ہی ہیں (1)۔

اسے ابن جریر، ابن ابی حاتم اور مسدد نے اپنی مسند، ہناد نے زہد میں اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جنتی جنت کا پھل نہیں توڑے گا مگر اس کی جگہ اس جیسا پھل پیدا کر دیا جائے گا (2)۔

فرمایا ان کے لئے ان کے رب کی جانب سے مغفرت ہے، وہ ہمیشہ ان سے راضی رہے گا، جبکہ ان پر احسان بھی فرمائے گا، جبکہ دنیا میں آقا کا غلام کے ساتھ معاملہ مختلف ہوتا ہے کیونکہ آقا دنیا میں کبھی غلام سے ناراض بھی ہو جاتا ہے۔ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ کا عطف محذوف کلام پر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی۔ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ۔

اگر مثل الجنة مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو یا اس کی خبر فِيْهَآ اَنْهٰرٌ ہے تو كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِيْ تِلْكَ الْجَنَّةِ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ یا كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سے بدل ہے اور درمیان میں کلام جملہ معترضہ ہے تاکہ دونوں جماعتوں میں امتیاز قائم ہو جائے جن میں سے ایک کے لئے برے اعمال مزین کیے گئے ہیں اور دوسری جو رب کی طرف سے واضح ہدایت پر ہے مقصود اس کا یہ ہے کہ جو وہ مساوات کا دعویٰ کرتے تھے اس پر انکار کو مزید واضح کیا جائے کہ ایسا کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا۔

وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا کا عطف هو خالد پر ہے۔ واحد کی ضمیر من کے لفظ کی وجہ سے ہے اور سقوا جمع کی ضمیر من کے معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی انہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو کاٹ ڈالے گا اور آنتیں دبر سے نکل آئیں گی۔

ابن منذر نے ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ مومن اور منافق حضور ﷺ کے پاس جمع ہو جاتے تھے۔ حضور ﷺ جو ارشاد فرماتے مومن اس کو سنتے اور یاد کر لیتے منافق سنتے اور اسے یاد نہ کرتے۔ جب مجلس سے باہر نکلتے تو منافق مومنوں سے پوچھتے تھے کہ آپ نے ابھی ابھی کیا فرمایا ہے تو مابعد آیت نازل ہوئی (3)۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۫ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾

”اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو کان لگائے رکھتے ہیں آپ کی طرف حتیٰ کہ جب نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو کہتے ہیں اہل علم سے (کہ ذرا فرمایئے) یہ صاحب ابھی ابھی کیا کہہ رہے تھے یہی وہ (بدبخت) ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور وہ پیروی کرتے ہیں اپنی خواہشوں کی 1۔ اور جو لوگ راہ ہدایت پر چلے اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے ان کے نور ہدایت کو اور انہیں تقویٰ کی توفیق بخشتا ہے 2۔“

1۔ اس کا عطف والذین کفروا پر ہے۔ درمیان میں معترضہ جملے ہیں یہ منافق لوگ ہیں جو حضور ﷺ کا فرمان تو سنتے ہیں لیکن

اسے یاد نہیں کرتے اور نہ ہی اسے سمجھتے ہیں۔ وجہ اس کی سستی اور غفلت ہے یا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ حضور ﷺ کے ارشاد کو حق نہیں سمجھتے۔ یَسْتَمِعُ کی واحد ضمیر من کے لفظ کے اعتبار سے ہے اور خرجوا کی جمع کی ضمیر من کے معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی جب منافق حضور ﷺ کی مجلس سے باہر نکلتے ہیں تو وہ صاحب علم (مسلمانوں) سے کہتے ہیں ابھی ابھی حضرت محمد ﷺ نے کیا کہا ہے انفا یہ انف الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی اس شے کا اگلا حصہ ہے۔ اسی وجہ سے ناک کو بھی انف کہتے ہیں۔ اسی سے استانف اور استنف فعل مشتق ہیں۔ انفا ظرف ہے اور قریبی وقت مراد ہے۔ یہ قال کی ضمیر سے حال ہے۔ ابن کثیر نے انفا کو ہمزہ کے قصر کی صورت میں، جبکہ باقی قراء نے مد کی صورت میں پڑھا ہے۔ دونوں لغتوں کا معنی ایک ہی ہے۔ انہوں نے یہ بات علم حاصل کرنے یا استہزاء کے طور پر کہی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے کلام کو سننے اور سمجھنے میں سستی کی، اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ اسی وجہ سے انہوں نے حضور ﷺ کے کلام کا مذاق اڑایا۔

۲؎ جنہوں نے حضور ﷺ کے کلام سے ہدایت حاصل کی، یعنی مومن تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے کلام کی برکت سے ہدایت، علم، بصیرت اور ان کے شرح صدر میں اضافہ فرمایا اور انہیں تقویٰ عطا فرمایا، یعنی احکامات پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائی اور ان کے لئے ایسی چیزوں کو واضح فرمایا جس کے ذریعے وہ جہنم کی آگ سے بچ سکتے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں تقویٰ کا ثواب عطا فرمایا (1)۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ۝۱۹

"پس کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں قیامت کا کہ آ جائے ان پر اچانک بے شک اسکی نشانیاں تو آ ہی گئی ہیں (تو جب قیامت ان پر آ گئی) تو اس وقت ان کو سمجھنا کب نصیب ہوگا ۲؎۔"

۱؎ ھل نفی کے معنی میں ہے۔ یَنْظُرُوْنَ کی ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں، اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً یہ السَّاعَةَ سے بدل اشتمال ہے۔ معنی یہ ہوگا قیامت اچانک آنے والی ہے کوئی چیز اس کو نہیں روک سکتی اور قیامت کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ جملہ استفہامیہ محذوف شرط کی جزاء ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اِنْ لَّمْ يَتُوْبُوْا وَلَمْ يَتَسَارَعُوْا فِي الطَّاعَةِ فَلَا يَنْتَظِرُوْنَ لِلتَّوْبَةِ وَالطَّاعَةِ اِلَّا وَقْتَ اِتْيَانِ السَّاعَةِ معنی یہ ہوگا اگر وہ توبہ نہ کریں اور اطاعت میں جلدی نہ کریں تو وہ توبہ اور اطاعت کے لئے قیامت آنے کا ہی انتظار کر رہے ہیں، جبکہ اس وقت انہیں توبہ کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ہی وہ اطاعت کی طاقت رکھیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں تم میں سے ایک آدمی (توبہ کرنے کیلئے) سرکش بنانے والی خوشحالی ہر چیز بھلا دینے والے فقر، سٹھیا دینے والے بڑھاپے، تیار کرنے والی موت اور دجال کی آمد کا انتظار کرتا رہتا ہے، جبکہ دجال، بہت بڑی مصیبت ہے جو غائب ہے اسی طرح ایک انسان توبہ کرنے کے لئے قیامت کا انتظار کرتا ہے، جبکہ قیامت سب سے بڑی مصیبت ہے اور سخت کڑوی ہے (2) فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا یہ قیامت کے آنے کی علت بیان کر رہا ہے۔ اشراط کا مطلب علامات ہیں، ان نشانیوں میں سے ایک شق قمر (چاند کا پھٹنا) بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

امام مسلم اور ابن ماجہ نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ درمیانی اور شہادت والی انگلی سے اشارہ کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح بھیجا گیا (1)۔

امام احمد ابن ماجہ اور امام ترمذی نے حضرت انس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ میں تمہیں ایک ایسی حدیث بیان کرتا ہوں جسے میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے جسے میرے سوا کوئی اور بیان نہیں کرے گا۔ میں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کی نشانیاں یہ ہیں کہ علم اٹھا دیا جائے گا' جہالت زیادہ ہو جائے گی' بدکاری عام ہو جائے گی شراب کثرت سے پیا جائیگا' مرد کم ہو جائیں گے اور عورتیں زیادہ ہو جائیں گی یہاں تک کہ پچاس عورتوں کے مقابلہ میں ایک مرد ہوگا (2) ایک روایت میں ہے علم کم ہو جائیگا اور جہالت غالب آ جائیگی۔ متفق علیہ

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ گفتگو کر رہے تھے کہ ایک بدو آ گیا اس نے پوچھا قیامت کب آئے گی تو آپ نے فرمایا جب امانت ختم ہو جائے تو قیامت کا انتظار کر۔ اس نے عرض کی امانت کس طرح ضائع ہوگی؟ فرمایا جب امور نا اہل لوگوں کے سپرد کیے جائیں گے تو اس وقت قیامت کا انتظار کرنا اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے (3) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مال غنیمت چند افراد کو دیا جانے لگے' امانت کو مال غنیمت سمجھا جانے لگے زکوٰۃ کو چٹی شمار کیا جانے لگے، دین کے علاوہ اور مقاصد کے لئے علم پڑھا جائے' مرد اپنی بیوی کی بات مانے اور ماں کی نافرمانی کرے، اپنے دوست کو قریب کرے اور اپنے باپ کو دور کرے۔ مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں، فاسق قوم کا سردار بن جائے۔ قوم کا رئیس سب سے کمینہ انسان ہو اور ایک انسان کمینے انسان کے شر سے بچنے کے لئے اس کی عزت کرے، گانے والی عورتیں اور بجانے والے آلات زیادہ ہو جائیں، شراب کثرت سے پی جائے۔ امت کے بعد والے لوگ امت کے پہلے لوگوں پر لعن طعن کریں تو اس وقت سرخ آندھی' زلزلہ' زمین میں دھنسنا' شکلیں بگڑ جانا' پتھروں کی بارش اور پے در پے نشانیوں کے ظاہر ہونے کا انتظار کرو جس طرح ہار کا دھاگہ کاٹ دیا جائے تو اس کے موتی یکے بعد دیگرے گرتے ہیں۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے (4)۔

حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میری امت پندرہ کام کرے گی تو ان پر مصیبت (قیامت) واقع ہو جائے گی۔ حضرت علی نے ان پندرہ چیزوں کا ذکر کیا لیکن اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ علم دین کے علاوہ اور مقاصد کے لئے سیکھا جائے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ آدمی دوست سے حسن سلوک کرے اور باپ پر ظلم کرے اور فرمایا شراب پیے اور ریشم کا لباس پہنے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا (5)۔ فَاَنّٰى لَهُمْ میں فاء جزائیہ ہے اور اس کی شرط محذوف ہے۔ معنی یہ بنے گا اگر قیامت اچانک آ گئی تو وہ اس وقت وہ کیسے نصیحت حاصل کریں گے اور ذکر کریں گے کیونکہ اس وقت انہیں نصیحت کوئی نفع نہ دے گی۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 406 (قدیمی)

’’پس آپ جان لیں کہ نہیں کوئی معبود بجز اللہ کے اور دعا مانگا کریں کہ اللہ آپ کو گناہ سے محفوظ رکھے نیز مغفرت طلب کریں مومن مردوں اور عورتوں کے لئے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمہارے چلنے پھرنے اور آرام کرنے کی جگہوں کو[1]۔‘‘

[1] انه میں ہ ضمیر، ضمیر شان ہے اور فاعلم میں فاء سببیہ ہے۔ معنی یہ بنے گا جب آپ یہ جان چکے ہیں کہ مومن سعادت مند ہیں اور کافر بدبخت ہیں تو اے محمد ﷺ آپ جس حال پر ہیں اسی پر استقامت کا مظاہرہ کریں وہ کیا چیز ہے جس پر آپ ہیں۔ وہ یہ ہے کہ آپ وحدانیت کا علم رکھتے ہیں، اپنے احوال کی اصلاح کرتے ہیں اور ایسے افعال بجا لاتے ہیں جو قیامت کے روز نفع دینے والے ہیں۔ ان کے ساتھ نفس کی تکمیل ممکن ہے اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کیجئے۔ یہ حکم نفس میں عاجزی اور انکساری پیدا کرنے کے لئے ہے۔ ساتھ ہی اس کمی کو ظاہر کرنے کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مقابل عبادت میں پائی جاتی ہے، جبکہ حضور ﷺ کو گناہوں سے معصوم پیدا کیا گیا اور آپ کی ذات گناہ صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہے۔ اس حکم کی حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے آپ کی امت آپ کی اس سنت (ا) پر عمل کرے۔ حضور ﷺ نے خود بھی ایسا کیا فرمایا میرے دل پر بھی میل سا آ جاتا ہے تو میں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں (1) اسے امام مسلم، امام احمد، ابوداؤد اور نسائی نے اغر مزنی کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں شاید حدیث میں دل پر زنگ آ جانا یہ امکان کی وہ تاریکی ہے جسے صوفی اپنے اندر پاتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے کمالات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی معرفت اس آدمی پر حرام ہے جو اپنے آپ کو فرنگی کافر سے برا نہیں جانتا۔ آپ سے عرض کی گئی اس چیز کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے، جبکہ وہ اپنے آپ کو مومن برحق خیال کرتا ہے اور کافر کو لازمی کافر خیال کرتا ہے کفر پر ایمان کی فضیلت کو تسلیم کرنا یہ ضروریات دین میں سے ہے۔

حضرت مجدد نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہر ممکن جو موجود ہے وہ امکان کی تاریکی سے خالی نہیں، جبکہ وجود کا نور اللہ تعالیٰ کی ذات سے عاریۃً اسے حاصل ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان رکھنے والا عموماً اپنے اندر عدم اور امکان کی جانب تو دیکھتا ہے اور اپنے اندر وجود اور دوسرے کمالات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عارضی چیز پاتا ہے۔ اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اطاعت ہوتی ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا اور اپنے علاوہ جو چیز بھی موجود ہے وہ اسے اللہ تعالیٰ کا فیض ہی خیال کرتا ہے تو اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کو ہر دوسری چیز سے برا ہی خیال کرے گا۔ یہ معرفت اس معرفت کے متضاد نہیں جس میں یہ ہے کہ ایمان

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی)

(ا) حضرت ابوبکر صدیق حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ذکر اور استغفار کو لازم پکڑو۔ ان کی کثرت کیا کرو کیونکہ ابلیس نے کہا میں نے لوگوں کو گناہوں کے ذریعے ہلاک کیا اور انہوں نے مجھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ذکر اور استغفار سے ہلاک کیا۔ جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے انہیں خواہشات کے ساتھ ہلاک کیا، جب کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ یحییٰ بن طلحہ بن عبید اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت طلحہ کو غمگین دیکھا پوچھا کیا وجہ ہے؟ حضرت طلحہ نے جواب دیا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا میں ایک ایسا حکم جانتا ہوں جو بندہ بھی اسے موت کے وقت اپنی زبان سے ادا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور فرما دے گا۔ اس کے رنگ کو روشن کر دے گا۔ اسے وہ چیز عطا کرے گا جو

کفر پر فضیلت رکھتا ہے کیونکہ ملاحظات' حیثیات' علم کی وسعت اور ادراکات مختلف ہیں غافل کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ وجود اور اپنے کمالات کو اپنے نفس کی طرف منسوب کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ لاحول و لا قوة الا باللہ۔

آپ مومنوں کے حق میں دعا کر کے ان کے گناہوں کی بخشش بھی طلب کریں اور انہیں ایسے امور کی ترغیب دیں جو ان کی بخشش کا ذریعہ بن جائیں۔ یہاں حرف جار لام کو دوبارہ ذکر کیا اور ذنب مضاف کو حذف کر دیا۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ مومنوں کو اس کی اشد ضرورت ہے اور ان کے گناہ بھی بہت زیادہ ہیں اور یہ ایک اور جنس ہے۔ امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اس قوم کیلئے بڑا اعزاز ہے کہ اس نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ اپنی امت کے لئے بخشش کی دعا کریں، جبکہ حضور ﷺ ایسے شفاعت کرنے والے ہیں جن کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد تمہارا دنیا میں اپنے اعمال میں ادھر ادھر جانا ہے اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد آخرت میں جنت یا دوزخ کی طرف جانا ہے مقاتل اور ابن جریر نے کہا ہے مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد دن کے وقت کام کاج میں مصروف ہونا اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد رات کے وقت اپنے بستر پر آرام کرنا ہے عکرمہ نے کہا ہے مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد آباء کی پشتوں سے ماؤں کے رحموں میں آنا اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد زمین میں قیام کرنا ہے ابن کیسان نے کہا مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد پشت سے پیٹ کی طرف آنا ہے اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد قبروں میں ٹھہرنا ہے مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارے تمام احوال کو جانتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں (1) اس لئے احتیاط سے کام لو یہاں خطاب مومنوں اور دوسرے لوگوں کو ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۚ﴿۲۰﴾

"اور اہل ایمان کہتے ہیں کیوں نہ اتری کوئی نئی سورت (جہاد کے بارے میں) پس جب اتاری جاتی ہے کوئی واضح سورت اور اس میں جہاد کا ذکر ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے کہ وہ تکتے ہیں آپ کی طرف جیسے تکتا ہے جس پر موت کی غشی طاری ہو۔ پس ان کیلئے بہتر یہ تھا[1]۔"

[1] وہ جہاد کے حریص ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ ہمیں جہاد کا حکم کیوں نہیں دیا جاتا۔ جب ایسی واضح آیت نازل ہوتی ہے جس میں جہاد کا حکم ہوتا ہے۔ قتادہ نے کہا ہر وہ سورت جس میں جہاد کا ذکر ہے وہ محکم ہے (2) کیونکہ قتال کی فرضیت نے ان تمام احکام کو منسوخ کر دیا جس میں صلح کا حکم دیا گیا تھا۔ اسے منسوخ نہیں کیا گیا اسی لئے یہ حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ ہر وہ سورت جس میں قرآن کا ذکر ہے وہ سورت منافقوں پر سب سے شدید ہے۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں کمزوری اور بزدلی ہے وہ آپ کو یوں دیکھتے ہیں گویا ان پر موت غالب آ چکی ہے۔

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۫ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۫ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾

”کہ اطاعت کرتے اور اچھی بات کہتے پھر جب حکم ناطق ہو چکا تو اگر وہ سچے رہتے اللہ تعالیٰ سے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔[1] پھر تم سے یہی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم فساد برپا کرو گے زمین میں اور قطع کر دو گے اپنی قرابتوں کو۔[2]“

[1] ان کے لئے بہتر تو یہ تھا کہ جہاد میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے اور یہ کہتے ہم نے حکم سنا اور اس کی اطاعت کی جب معاملہ سخت ہو گیا، یعنی جن کے ذمہ امور کی تدبیر تھی انہوں نے جہاد کا پختہ ارادہ کر لیا اگر وہ اس التجا میں سچے ہوتے جو انہوں نے جہاد کی رغبت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حضور کی تھی تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ عزم فعل کو الامر کی طرف منسوب کرنا مجاز کے طور پر ہے یا عزم الامر کا معنی ہے جب جہاد لازم اور فرض ہو گیا۔ فَلَوْ صَدَقُوا یہ اِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ کی جزاء ہے ایک قول یہ کیا گیا جزاء محذوف ہے اور یہ جملہ مستانفہ ہے تقدیر کلام یہ ہے فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ لَوْ يَصْدُقُوا اللّٰهَ وَ لَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْراً لَّهُمْ یعنی جب جہاد فرض ہو گیا تو وہ اپنے قول میں سچے ثابت نہ ہوئے اگر وہ سچے ہوتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

[2] فَهَلْ عَسَيْتُمْ میں غائب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے، یعنی اے بزدلو اگر تم جہاد کے حکم میں رسول اللہ کی متابعت سے اعراض کرو تو کیا تم سے یہ توقع کی جانے لگے کہ تم زمین میں فساد برپا کرنے لگو گے اور اپنی رشتہ داری کو ختم کر لو گے، یعنی ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ یہ شرط ایسے جملہ کے درمیان واقع ہو رہی ہے جو جزاء پر دلالت کرتا ہے۔ زمین میں سے فساد برپا کرتے سے مراد کفر اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کرنا ہے۔ قطع رحمی سے مراد مجاہد رشتہ داروں کی مخالفت ہے۔ اَنْ تُفْسِدُوا اپنے متعلقات سے مل کر عسیتم کا مفعول ہوگا اور ھل استفہامیہ انکار کے لئے ہے، یعنی تمہیں ایسا طرز عمل نہیں اپنانا چاہئے کہ تم سے یہ توقع کی جانے لگے کہ کفر، نافرمانی اور قطع رحمی (۱) کے ذریعے تم زمین میں فساد برپا کرو گے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾

”یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی پھر (حق سننے سے) انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔[1] کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں۔[2]“

[1] زمین میں فساد برپا کرنے والے اور قطع رحمی کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے دور کر دیا ہے۔ حق

(۱) حضرت بریدہ سے مروی ہے کہ میں حضرت عمر بن خطاب کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ نے ایک چیخنے چلانے والے آدمی کی آواز کو سنا۔ آپ نے فرمایا اے یرفاء دیکھو یہ آواز کیسی ہے؟ یرفاء نے دیکھا پھر وہ واپس آیا عرض کی قریش کی ایک بچی کی ماں فروخت کی جا رہی ہے۔ آپ نے فرمایا مہاجرین و انصار کو بلاؤ کچھ وقت بھی نہ گزرا تھا کہ گھر اور کمرہ بھر گیا۔ حضرت عمر نے اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف کی پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ حضور ﷺ کی شریعت میں

سننے سے بہرہ کردیا ہے اور حق دیکھنے سے ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا ہے۔ اسم اشارہ مبتدا ہے اور اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر خبر ہے۔ یہ سابقہ جملہ میں جو انکار کا معنی پایا جارہا تھا یہ اس کی علت بیان کررہا ہے ایک قول یہ کیا گیا الذین فی قلوبھم مرض سے مراد منافق ہیں اور مرض سے مراد شک اور نفاق ہے اور فاولی لھم سے مراد ان کے لئے سخت ہلاکت ہے اور اولی ویل سے افعل کے وزن پر ہے یا یہ ولی سے مشتق ہے۔ جس کا معنی قرب ہے۔ یہ آل سے فعلی کے وزن پر ہے۔ اس کا معنی ہے ان کے لئے بددعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناپسندیدہ چیز کو ان پر مسلط کردے یا ان کا معاملہ انہیں کی طرف پلٹ جائے۔ طاعۃ وقول معروف یہ مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ خَيْرٌ لَّهُمْ۔ یا ان کے قول کی حکایت ہے، یعنی وہ کہتے ہیں ہمارا معاملہ اطاعت اور اچھی بات کرنا ہے جو بات انہوں نے کی تھی اگر وہ اس میں سچے ہوتے تو یہ ان کے لئے بہتر تھا لیکن انہوں نے جھوٹ بولا تو کیا اب تم سے توقع رکھی جائے کہ اگر تم لوگوں کے امیر بن جاؤ تو ان پر ظلم کرکے زمین میں فساد برپا کروگے۔ یہ آیت کریمہ بنی امیہ اور بنی ہاشم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس شان نزول پر حضرت علی شیر خدا کی قرأت بھی دلالت کرتی ہے کہ ان تولیتم پڑھا ہے، یعنی تاء اور واؤ کو مضموم پڑھتے ہوئے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اگر تم ظالم حاکم بنادو اور خود بھی فتنہ میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ اور لوگوں پر ظلم کرنے لگو، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے، انہیں بہرہ کردیا ہے اور ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا ہے۔ ابن جوزی نے کہا قاضی ابو یعلیٰ نے اپنی کتاب المعتمد الاصول میں اپنی سند سے صالح بن احمد بن حنبل سے روایت کیا کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا اے میرے ابا جان بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ ہم یزید بن معاویہ کو پسند کرتے ہیں تو حضرت امام احمد بن حنبل نے فرمایا اے بیٹے! کیا کسی مومن کے لئے جائز ہے کہ وہ یزید سے محبت کرے۔ ایک بندہ یزید پر لعنت کیوں نہیں کرتا، جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس پر لعنت کرتا ہے۔ میں نے عرض کی اے میرے والد ماجد اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں کہاں یزید پر لعنت کرتا ہے۔ فرمایا جہاں اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے تو پھر آپ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا۔

۲؎ کیا وہ قرآن حکیم اور اس میں جو نصیحتیں اور تنبیہات ہیں ان میں غور وفکر نہیں کرتے اگر وہ غور وفکر کرتے تو ان کے لئے حق واضح ہو جاتا۔ یہاں استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے اور فاء عاطفہ ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَيَغْفُلُوْنَ فَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ فرمایا یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ یہاں کنایہ کی صورت میں کلام کی دلوں کو الماریوں سے تشبیہ دی اور ان کے مناسب تالوں کو ثابت کیا۔ بطور تشبیہ کے تالوں کو دلوں کی طرف مضاف کیا۔ مقصود یہ دلالت کرنا ہے کہ یہ تالے ان دلوں کے مناسب ہیں اور انہیں کے ساتھ ہی خاص ہیں، عام تالوں جیسے نہیں۔ یہ کلام اصل میں کنایہ ہے اس بات سے کہ ان کے دلوں میں استعداد اور قابلیت ہی نہیں کہ وہ نصیحت حاصل کریں اگر بالفرض وہ غور وفکر کریں بھی تو وہ قرآن کی نصیحتوں کو نہ سمجھ سکیں گے۔ یہاں قلوب کو نکرہ ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے مراد ان کے بعض دل ہیں یا اس بات کا شعور دلایا جارہا ہے کہ سختی اور جہالت کی زیادتی میں ان کا معاملہ مبہم ہے گویا وہ پوشیدہ خزانہ ہیں۔ امام بغوی نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو پڑھا تو یمن کے ایک نوجوان نے عرض کیا بلکہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ

(۱) [illegible]

انہیں کھول دے وہ نوجوان حضرت عمر کے دل میں رہا جب آپ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ نے اس سے (ا) مدد چاہی۔

إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٥﴾

'' بے شک جو لوگ پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹ گئے باوجود یکہ ان پر ہدایت (کی راہ) ظاہر ہو چکی تھی شیطان نے انہیں فریب دیا اور انہیں لمبی زندگی کی آس دلائی [1]۔''

[1] جو ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹ گئے۔ عروہ نے کہا اس سے مراد اہل کتاب کفار ہیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کو پہچان لیا تھا اور آپ کی صفات کو تورات میں دیکھا تھا پھر بھی آپ کا انکار کیا۔ حضرت ابن عباس، ضحاک اور سدی نے کہا اس سے مراد منافقین ہیں (1) فرمایا شیطان نے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو ان کیلئے آسان بنا دیا۔ سول یہ سوال سے مشتق ہے جس کا معنی نرمی چاہنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا شیطان نے انہیں شہوات پر برانگیختہ کیا۔ اس صورت حال میں یہ سول سے مشتق ہے جس کا معنی آرزو ہے۔ اہل بصرہ نے املی کو ماضی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی اُملی جبکہ مجاہد نے واحد متکلم مضارع کا صیغہ پڑھا ہے جو باب افعال سے مشتق ہے۔ یہی قرأت یعقوب سے بھی مروی ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا میں انہیں مہلت دیتا ہوں اس سے پہلے واؤ حالیہ ہوگی یا مستانفہ ہوگی، جبکہ باقی قراء نے باب تفعّال سے واحد مذکر غائب فعل ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔ معنی ہوگا شیطان نے انہیں طویل آرزوئیں دلائیں۔ إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا والا جملہ جملہ مستانفہ ہے جو مقدر سوال کا جواب ہے سوال یہ بنے گا ما سبب ذلک۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ ﴿٢٦﴾ فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ﴿٢٧﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ﴿٢٨﴾

'' یہ اس لئے کہ انہیں نے کہا ان لوگوں کو جنہوں نے ناپسند کیا جو اللہ نے اتارا کہ ہم تمہاری ایک بات میں اطاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے پوشیدہ مشوروں کو جانتا ہے [1]۔ پس ان کا کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی روحوں کو قبض کریں گے اور چوٹیں لگائیں گے ان کے چہروں اور پشتوں پر [2]۔ یہ درگت اس لئے بنے گی کہ انہوں نے پیروی کی اس کی جو اللہ کی ناراضگی کا باعث تھا اور ناپسند کیا اس کی خوشنودی کو پس اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے [3]۔''

[1] شیطان کا ورغلانہ اور اللہ تعالیٰ کا اسے مہلت دینا محض اس سبب سے ہے کہ جن یہودیوں نے حضور ﷺ کا انکار کیا، جبکہ تورات میں حضور ﷺ کے اوصاف پہچان چکے تھے انہوں نے منافقین سے کہا یا منافقوں نے یہودیوں سے کہا یا ان دونوں جماعتوں میں سے ایک نے مشرکوں سے کہا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری اطاعت کریں گے۔ جیسے انہوں نے کہا تھا کہ ہم جہاد میں شرکت نہیں

ابوبکر کے علاوہ کوفہ کے قراء نے اسرار کے ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ سر کی جمع ہے۔ ان کے رازوں میں سے ایک یہ بات بھی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرما دیا۔

۲۔ فَكَيْفَ میں فاء سببیہ ہے اور استفہام تعجب کے اظہار کے لئے ہے اذا ظرفیہ فعل محذوف کے متعلق ہے تقدیر کلام یہ ہے فَكَيْفَ يَحْتَالُوْنَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ترکیب کلام میں يَضْرِبُوْنَ ملائکہ سے حال ہے، یعنی جب فرشتے لوہے کے ہتھوڑوں کے ساتھ ان کے منہ اور پشتوں پر ضربیں لگائیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا۔

۳۔ اس طرح روح قبض کرنے کی محض وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تورات کو چھپایا اور حضور ﷺ کا انکار کیا (1) اور انہوں نے ایسی چیزوں کو ناپسند کیا جو اس کی رضا کا باعث تھے جیسے ایمان، جہاد اور اطاعت وغیرہ تو اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾

"کیا خیال کرتے ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر نہیں کرے گا ان کے دلی کھوٹوں کو ۱۔ اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو دکھا دیں یہ لوگ سو آپ پہچان تو چکے ہیں ان کو ان کے چہرہ سے اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے اور اللہ جانتا ہے تمہارے اعمال کو ۲۔ اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں تاکہ ہم دیکھ لیں تم میں سے جو مصروف جہاد رہتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں اور ہم پرکھیں گے تمہارے حالات کو ۳۔"

۱۔ ام منقطعہ ہے اور بل کے معنی میں ہے۔ کلام الشیطان سولهم یا ام علی قلوب اقفالها کے ساتھ متعلق ہے۔ مرض سے مراد نفاق ہے۔ معنی ہوگا بلکہ جن لوگوں کے دل میں نفاق کا مرض ہے۔ انہوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مومنین پر ان کے کینے کو ظاہر نہیں فرمائے گا۔

۲۔ اگر ہم چاہتے تو ہم آپ کو ان کے بارے میں آگاہ کرتے اور آپ کو ان کی پہچان کرا دیتے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور نحن کو مقدر ماننے کے ساتھ حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وَنَحْنُ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فرمایا تو آپ ان کی نشانیوں سے انہیں پہچان لیتے فلعرفتهم میں لام جواب کے لئے ہے جسے معطوف میں مکرر ذکر کیا امام بغوی نے کہا حضرت انس نے فرمایا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد منافقوں کی کوئی چیز آپ ﷺ پر مخفی نہ تھی۔

فرمایا آپ انہیں گفتگو کے لہجہ سے پہچان لیتے ولتعرفنهم فی لحن القول یہ بھی جواب قسم ہے اور قسم محذوف ہے۔ لحن القول کا معنی ہے کلام کو اپنی اصل جہت سے اشارہ اور مخفی معنی کی طرف پھیر دینا آیت کا معنی ہوگا آپ انہیں پہچان لیں گے کہ وہ آپ کی اور مسلمانوں کی اشارہ کے ساتھ توہین کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور مدح کی صورت میں [illegible]

تھے۔فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے اچھے برے اعمال کو جانتا ہے کیونکہ وہ اعمال جن کی ذات میں قبح پایا جاتا ہے۔ جیسے کفر اور زنا ان کے علاوہ جتنے بھی افعال ہیں وہ سب نیتوں پر منحصر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ اس وجہ سے وہ تمہاری نیتوں کے مطابق تمہیں بدلہ دے گا۔

۳؎ ہم جہاد کا حکم دے کر تمہیں آزمائیں گے۔ یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے تاکہ امر کے متحقق ہونے کے بعد بھی اسے جان لیں جس طرح اس کے متحقق ہونے سے پہلے جانتے تھے کہ یہ امر اسی طرح واقع ہوگا یا اس کا معنی ہے کہ ہم الگ الگ کر لیں یا اس کا معنی ہے تاکہ ہمارے دوست پہچان لیں کہ تم میں سے کون مجاہد ہے اور مشقتوں پر صبر کرنے والا ہے اور تمہاری ان خبروں کو جانچ لیں جو تمہارے اعمال کو خبر دیتی ہیں جس کے پاس ان کا حسن اور قباحت ظاہر ہو جائے یا تمہارے ایمان لانے اور مومنوں کے ساتھ دوستی کو پرکھ لیں کہ اس میں صداقت ہے یا جھوٹ ہے۔ ابوبکر نے آیت میں موجود تینوں افعال کو واحد مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی اور یہ اللہ یعلم کے موافق ہوگا۔ جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور نحن نبلوا کی تقدیر پر آخری فعل وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ کو بھی واؤ کے سکون (ا) کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾

"بے شک جو لوگ خود بھی کفر کرتے رہے اور لوگوں کو بھی روکتے رہے اللہ کی راہ سے اور مخالفت کرتے رہے رسول (کریم) کی باوجود یکہ ظاہر ہو چکی تھی ان کے لئے راہ ہدایت وہ قطعاً اللہ تعالیٰ کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا ۱؎۔"

۱؎ جنہوں نے کفر کیا اور لوگوں کو ایمان لانے اور رسول کی اتباع سے روکا اور حقیقت حال واضح ہونے کے بعد انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی اس سے مراد بنو قریظہ، بنو نضیر اور قریش کے وہ سردار ہیں جنہوں نے غزوہ بدر میں مشرکین مکہ کے لشکر کو کھانا کھلایا۔ یہ ہی بارہ سردار تھے اور اپنی باری پر لشکر کو کھانا کھلاتے تھے۔ فرمایا وہ اپنے اس طرز عمل سے اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائیں گے ان کے اعمال ضائع کر دیئے جائیں گے اور آخرت میں اپنے اعمال کا بدلہ نہیں پائیں گے یا ان کے عمل پر دنیا میں کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا کیونکہ بدر میں انہیں شکست ہوئی تھی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد غزوہ بدر میں کفار کے لشکر کو کھانا کھلانے والے ہیں۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ (1)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (مکرم) کی اور نہ ضائع کرو اپنے عملوں کو ۱؎۔"

ل حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ان میں شک اور نفاق یا ان اعمال پر فخر کر کے انہیں ضائع نہ کرو۔ کلبی نے کہا دکھاوے اور شہرت کے حصول کی خاطر اس فعل کو بجالا کر انہیں باطل نہ کرو۔ حضرت حسن بصری نے کہا نافرمانی اور گناہ کبیرہ کے ذریعے انہیں ضائع نہ کرو۔ ابن ابی حاتم اور محمد بن نصر مروزی نے کتاب الصلوٰۃ میں ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے صحابہ یہ خیال کرتے تھے کہ جب انسان لا الہ الا اللہ پر یقین رکھتا ہو تو کوئی گناہ بھی اسے نقصان نہیں دیتا جس طرح شرک کی صورت میں کوئی اچھا عمل فائدہ نہیں دیتا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو وہ ڈرنے لگے کہ گناہ کی وجہ سے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ امام بغوی نے بھی ان سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ مقاتل نے کہا اسلام قبول کر کے رسول اللہ ﷺ پر احسان نہ جتلاؤ ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے (1)۔

مسئلہ: جس نے نماز، روزہ، حج، عمرہ یا اس جیسا کوئی عمل نفل کے طور پر شروع کیا تو اس پر اس عمل کو مکمل کرنا واجب ہے۔ ظاہر روایت کے مطابق اسے توڑنا جائز نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے۔ عذر کی صورت میں توڑنا جائز ہے۔ ہدایہ، قدوری اور دوسری کتب کے مؤلفین نے یہ بیان کیا ہے۔

کیا نفلی روزہ توڑنے کے لئے مہمان نوازی عذر ہے۔ ایک قول کیا گیا ہے ہاں یہ عذر ہے۔ ایک قول کیا گیا کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا زوال سے پہلے تو یہ عذر ہوگا زوال کے بعد یہ عذر نہیں ہوگا۔ ہاں اگر روزہ نہ توڑنے کی صورت میں والدین کی نافرمانی ہوتی ہو تو دوپہر کے بعد روزہ توڑنا جائز ہے۔ اگر کسی نے نفلی نماز یا روزہ شروع کرنے کے بعد اسے توڑا تو اس کی قضاء واجب ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے، جبکہ امام مالک اور منتقی کی ایک روایت میں امام ابوحنیفہ سے بھی یہی مروی ہے کہ نفلی روزہ کو عذر کے بغیر توڑنا بھی مباح ہے۔ تاہم اس کی قضا واجب ہوگی۔

امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا نفلی عمرہ اور عمرہ کو مکمل کرنا واجب ہے اگر انہیں توڑا تو قضا بھی واجب ہوگی۔ نماز، روزہ اور دوسرے نفلی افعال کا حکم اس سے مختلف ہے۔ ان دونوں ائمہ کے نزدیک انہیں مکمل کرنا مستحب ہے اور اسے انہیں توڑنے کی بھی اجازت ہے اور بعد میں اس کی قضاء بھی نہ ہوگی۔

ہماری دلیل یہ آیت ہے اگرچہ اس کا شان نزول تو یہ ہے کہ اعمال کو شک، نفاق، معاصی، دکھلاوے، شہرت اور اظہار فخر کے ساتھ اعمال کو باطل کرنے سے روکا جا رہا ہے لیکن اپنے الفاظ کے اعتبار سے یہ حکم اسے بھی شامل ہے کہ انسان کسی عمل کو مکمل کرنے سے پہلے فاسد کر کے اسے باطل کر دے کیونکہ جتنا عمل کیا جا چکا ہے وہ عبادت اور عمل ہے اسی طرح اس عمل کو مکمل کرنے کے بعد اسے گناہ کبیرہ، دکھلاوے، شہرت یا فخر کر کے باطل کرنے سے نہی ہے۔

ہمارے پیش نظر احادیث طیبہ بھی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث حضرت عروہ سے مروی ہے جسے وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت حفصہ کی خدمت میں ایک بکری بطور ہدیہ پیش کی گئی، جبکہ ہم دونوں روزے سے تھیں۔ حضرت حفصہ نے مجھے روزہ افطار کرا دیا۔ جب حضور ﷺ تشریف لائے تو ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا اس کی جگہ ایک اور روزہ رکھ لینا (2)۔ اسے امام احمد نے سفیان بن حصین کے واسطہ سے حضرت عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا۔ امام ترمذی نے جعفر بن برقان کے واسطہ سے حضرت عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ سے [illegible]

کہ میں اور حضرت حفصہ روزے سے تھیں، ہمیں کھانا پیش کیا گیا۔ ہم نے اسے پسند کیا اور کھالیا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ حضرت حفصہ نے مجھ سے جلدی کی عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم روزے سے تھیں، ہمیں کھانا پیش کیا گیا، جس کی ہمیں شدید طلب تھی۔ ہم نے اسے کھالیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ ایک اور روزہ رکھ لینا۔

ابوداؤد اور نسائی نے زمیل سے اور انہوں نے عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے اسے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے اسے معلل قرار دیا ہے کیونکہ زمیل کا عروہ سے سماع ثابت نہیں اور نہ ہی یزید کا زمیل سے سماع ثابت ہے۔ امام ترمذی نے کہا اس حدیث کو صالح بن ابی الاخضر اور محمد بن علی بن ابی حفصہ نے زہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ سے اسے روایت کیا ہے۔ مالک بن انس، معمر، عبیداللہ بن عمر، زیاد بن سعد اور کئی دوسرے حفاظ نے زہری سے اور زہری نے حضرت عائشہ سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ اس میں وعدہ کا ذکر نہیں، یہ سند زیادہ صحیح ہے کیونکہ ابن جریج سے مروی ہے کہ میں نے زہری سے پوچھا کیا حضرت عروہ نے حضرت عائشہ سے تمہیں یہ روایت بیان کی ہے تو زہری نے جواب دیا میں نے عروہ سے اس بارے میں کوئی چیز نہیں سنی بلکہ ہم نے سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں ایسے آدمی سے روایت سنی جس نے حضرت عائشہ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

ابن ہمام نے کہا امام بخاری کا قول اس امر پر مبنی ہے کہ آپ کے نزدیک متصل روایت کے لئے ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ ملاقات بھی شرط ہے، جبکہ زیادہ پسندیدہ نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ دونوں راوی ہم عصر ہیں تو اتصال کے لئے یہی کافی ہے اگر اس روایت کا امام بخاری اور امام ترمذی کے نزدیک معلل تسلیم کر ہی لیا جائے تو یہ صرف اس سند تک محدود رہے گا۔ اس حدیث کا معلل ہونا اس وقت لازم آئے گا اگر اس کی کوئی اور سند نہ ہو لیکن ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں جریر بن حازم سے، انہوں نے یحیٰی بن سعید سے، انہوں نے عمرہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ میں اور حضرت حفصہ نے نفلی روزہ کی صورت میں صبح کی۔ ابن ابی شیبہ نے اسے ان سندوں کے علاوہ ایک اور سند سے خصیف سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ نے روزہ کی حالت میں صبح کی، طبرانی نے اپنی معجم میں خصیف کی حدیث عکرمہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ روزے سے تھیں۔ بزار نے ایک اور سند سے حماد بن ولید سے، انہوں نے عبیداللہ بن عمرو سے، انہوں نے حضرت نافع سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ نے روزے کی حالت میں صبح کی۔ لیکن حماد بن ولید ضعیف ہے۔

طبرانی نے ان سب سے مختلف اوسط میں روایت کیا ہے کہ ہمیں موسیٰ بن ہارون نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں محمد بن مہران نے روایت کیا، کہا اسے محمد بن ابی سلمہ مکی نے محمد بن عمرو یہ سے، انہوں نے ابوسلمہ سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو ہدیہ پیش کیا گیا، جبکہ وہ روزے سے تھیں۔ دونوں نے اس تحفہ سے کچھ کھالیا پھر اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کی کسی روز قضاء کر لینا اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔ ابن ہمام نے کہا یہ حدیث ثابت ہوگئی۔ اب اس کو رد کرنے کی کوئی صورت نہیں اگرچہ اس کی تمام سندیں ضعیف ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ اس کی سندیں متعدد ہیں اور بہت زیادہ ہیں اسے

رکھ لینا۔ اسے استحباب پر محمول کریں گے۔ تو یہ بغیر کسی سبب کے امر کا ظاہر تقاضا کے خلاف معنی کرنا ہوگا، جبکہ اس میں ایسے قرائن موجود ہیں جو ظاہر معنی لینے کا تقاضا کرتے ہیں، جبکہ یہ آیت کریمہ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ بھی اس کی تاکید بیان کرتی ہے(1)۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت اس حدیث کی تاکید بیان کرتی ہے، جبکہ دونوں کی مخالفت ظاہر ہے کیونکہ آیت اس میں ظاہر ہے کہ روزہ شروع کرنے کے بعد توڑنا ممنوع ہے، جبکہ روزے کی قضا کے بارے میں کوئی دلالت نہیں۔ جبکہ حدیث تو اس پر دلالت کرتی ہے کہ قضاء کے واجب ہونے کے ساتھ روزہ افطار کرنا جائز ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ روزہ افطار کرنے کے منع کرنے پر آیت کی دلالت قضاء کے واجب ہونے پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ باطل نہ کرنے کا مطلب یہ ہے اسے مکمل کرنا واجب ہے۔ جب کوئی شے واجب ہو تو فوت ہونے کی صورت میں اس کی مثل کی قضا واجب ہوتی ہے اگر اس کی مثل ہو۔ قضاء اس وقت واجب ہوتی ہے جب مکمل کرنا واجب اور افطار کرنا حرام ہو۔ حضور ﷺ کے فرمان آئندہ ایسا نہ کرنا یہ افطار کرنے کی حرمت پر صریح ہے۔ امام ابوحنیفہ سے ظاہر روایت بھی یہی ہے۔

اس باب میں بہت زیادہ دوسری احادیث بھی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جسے دارقطنی نے طلحہ بن یحییٰ سے، انہوں نے اپنی پھوپھی عائشہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے فرمایا میں روزہ رکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کو حلوہ پیش کیا گیا فرمایا میں اسے کھاتا ہوں اور اس کی جگہ ایک اور روزہ رکھوں گا(2)۔ دارقطنی نے کہا الفاظ کی زیادتی کو ابن عیینہ سے محمد بن عمرو ابوالعباس باہلی کے علاوہ کسی راوی نے ذکر نہیں کیا۔ شاید محمد بن عمرو کو شبہ لاحق ہو گیا۔ حافظ نے کہا لیکن نسائی نے محمد بن منصور سے، انہوں نے ابن عیینہ سے روایت کیا ہے۔ امام شافعی نے بھی ابن عیینہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور یہ ذکر کیا کہ ابن عیینہ نے اپنی موت سے ایک سال پہلے اسے ذکر کیا۔ حافظ ابن حجر نے کہا آخری عمر میں ابن عیینہ کے حافظہ میں کچھ خرابی آ گئی تھی۔

انہیں روایات میں سے ایک روایت کو دارقطنی نے اپنی سند سے محمد بن ابی حمید سے، انہوں نے ابراہیم بن عبید سے روایت کیا ہے کہ ابوسعید خدری نے کھانا تیار کیا اور حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دعوت دی۔ ایک آدمی نے کہا میں روزے سے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے بھائی نے تیرے لئے کھانا تیار کیا ہے۔ اب روزہ افطار کر دو اور اس کی جگہ کسی اور دن روزہ رکھ لینا(3) دارقطنی نے کہا یہ مرسل روایت ہے۔ ابن جوزی نے کہا محمد بن ابی حمید کوئی چیز نہیں۔ نسائی نے کہا وہ ثقہ نہیں۔ ابن حبان نے کہا وہ قابل حجت نہیں۔

انہیں روایات میں سے ایک روایت کو دارقطنی نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے ایک صحابی نے کھانا تیار کیا اور حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دعوت دی جب کھانا آ گیا تو ایک صحابی الگ تھلگ ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیرے بھائی نے اتنا اہتمام کیا پھر تم کہتے ہو میں روزے سے ہوں، کھانا کھاؤ اور اس کی جگہ ایک اور دن روزہ رکھ لینا(4) اس کی سند میں عمر بن حلیف ہے۔ ابن عدی نے کہا اس پر حدیث وضع کرنے کی تہمت لگائی جاتی تھی۔ ابن حبان نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

انہیں روایات میں سے ایک روایت کو دارقطنی نے ثوبان کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں روزے سے تھے، طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوا اور قے آنے لگی۔ آپ نے قے کی پھر پانی منگوایا اور وضو کیا پھر روزہ افطار کر دیا۔

میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا قے سے وضو فرض ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر روزہ فرض ہوتا تو تم اسے قرآن میں پاتے کہا پھر آپ نے اگلے دن روزہ رکھ لیا۔ میں نے آپ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کل جو میں نے روزہ افطار کیا تھا یہ اس کی جگہ ہے(1) اس سند میں عتبہ بن سکن ہے۔ دار قطنی نے کہا وہ متروک الحدیث ہے۔ انہیں روایات میں سے ایک روایت وہ ہے جسے دار قطنی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ محمد بن ابی حمید ضحاک بن حمزہ سے، انہوں نے منصور سے، انہوں نے ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک روز نفلی روزہ رکھا پھر اسے توڑ دیا۔ حضور ﷺ نے ایک اور دن اس کی قضا کا حکم دیا۔ یحییٰ نے کہا ضحاک کچھ بھی نہیں۔ ابوزرعہ نے کہا محمد بن حمید جھوٹا ہے۔

امام شافعی اور امام احمد نے کئی احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے پہلی حدیث وہ ہے جسے جویریہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ جمعہ کے روز ان کے ہاں تشریف لائے، جبکہ آپ روزے سے تھیں فرمایا کیا تم نے کل روزہ رکھا تھا عرض کی نہیں فرمایا کل روزہ نہیں رکھو گی۔ عرض کی نہیں۔ فرمایا روزہ توڑ دو۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا(2)۔ امام احمد نے ابو عمر سے روایت کیا کہ حضور ﷺ حضرت جویریہ کے ہاں تشریف لے گئے پھر اسی طرح کی حدیث ذکر کی۔

دوسری حدیث وہ ہے جسے حضرت عائشہ صدیقہ نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ آپ کے پاس تشریف لاتے تو پوچھتے کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے جو تم مجھے کھلاؤ تو ہم کہتے ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں تو آپ فرماتے میں روزے سے ہوں پھر بعد میں کوئی چیز آ گئی تو عرض کی ہمارے پاس یہ تحفہ بھیجا گیا ہے۔ ہم نے آپ کے لئے چھپا رکھا ہے۔ پوچھا کیا ہے؟ عرض کیا حلوہ ہے۔ فرمایا میں نے صبح کے وقت تو روزہ رکھ لیا تھا پھر آپ نے کھانا کھا لیا(3) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ دار قطنی نے اور بیہقی نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ ان کے حجرہ میں تشریف لائے فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ میں نے عرض کی کوئی چیز نہیں۔ فرمایا تو پھر میں روزے سے ہوں۔ حضرت عائشہ نے بیان کیا ایک اور دن آپ تشریف لائے فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے میں نے عرض کی موجود ہے فرمایا تو پھر میں روزہ افطار کرتا ہوں اگرچہ میں نے روزہ رکھ لیا تھا(4)۔

تیسری حدیث ام سلیم کی روایت ہے کہ حضور ﷺ صبح کرتے، جبکہ آپ کا ارادہ روزہ رکھنے کا ہوتا پوچھتے کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ کیا تمہارے پاس کوئی چیز آئی ہے؟ تو ہم عرض کرتے کیا آپ نے صبح کے وقت روزہ نہیں رکھ لیا تھا تو فرماتے یقیناً روزہ رکھا تھا لیکن روزہ جب نذر اور رمضان کی قضا کا نہ ہو تو اس کے توڑنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے(5) اس کی سند میں عبید اللہ عزرمی ہے جو ضعیف ہے۔

چوتھی حدیث ابو جحیفہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت سلمان فارسی اور ابو درداء کے درمیان مؤاخات قائم کی۔ حضرت سلمان ابو درداء کی ملاقات کے لئے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ام درداء خستہ حالت میں ہیں۔ حضرت سلمان فارسی نے پوچھا تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے تو انہوں نے فرمایا تیرے بھائی ابو درداء کو دنیاوی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حضرت ابو درداء تشریف لائے اور حضرت سلمان فارسی کے لئے کھانے کا اہتمام کیا اور حضرت سلمان فارسی سے کہا کھانا کھائیں میں تو روزے سے ہوں۔

حضرت سلمان فارسی نے کہا میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہیں کھائیں گے۔ جب رات آئی ابودرداء عبادت کے لئے تشریف لے جانے لگے اور حضرت سلمان فارسی نے کہا آپ سو جائیں۔ حضرت ابودرداء سو گئے پھر عبادت کے لئے جانے لگے تو حضرت سلمان فارسی نے کہا سو جائیں۔ جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت سلمان نے فرمایا اب اٹھو۔ دونوں نے نماز پڑھی۔ حضرت سلمان فارسی نے حضرت ابودرداء سے کہا بے شک تیرے رب کا تجھ پر حق ہے، تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے، تیرے گھر والوں کا تجھ پر حق ہے۔ ہر حقدار کو حق ادا کرو۔ حضرت ابودرداء حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب بات ذکر کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا سلمان فارسی نے سچ کہا(1)۔

میں کہتا ہوں یہ روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ روزہ توڑنا جائز ہے۔ جہاں تک قضا واجب نہ ہونے کا تعلق ہے ان میں ایسی کوئی بات نہیں۔ حضرت جویریہ والی روایت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ صرف جمعہ کے روز روزہ رکھنا مکروہ ہے، جس طرح حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جمعہ کا روزہ نہ رکھو۔ ہاں اس صورت میں کہ تم اس سے ایک روز پہلے روزہ رکھو یا ایک روز بعد میں روزہ رکھو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ امام مسلم نے ان الفاظ کے ساتھ بھی روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے صرف جمعہ کے روز اکیلا روزہ رکھنے سے منع کیا ہے۔

امام شافعی کے پیش نظر اور احادیث بھی ہیں جو ضعیف ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث حضرت ام ہانی سے مروی ہے، اس کی کئی سندیں ہیں اور کئی الفاظ میں یہ مروی ہے۔ ان میں سے ایک روایت وہ ہے جسے حماد بن سلمہ نے سماک بن حرب سے، انہوں نے ہارون بن ام ہانی سے انہوں نے حضرت ام ہانی سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے مشروب پیا اور حضرت ام ہانی کو عطا کیا تا کہ وہ اسے پی لے تو حضرت ام ہانی نے کہا میں روزے سے ہوں لیکن میں اسے بھی ناپسند کرتی ہوں کہ آپ کا جھوٹا واپس کروں۔ فرمایا اگر یہ رمضان کا قضاء روزہ ہے تو اسے کسی اور دن رکھ لینا اگر یہ روزہ نفلی ہے تو چاہو اس کی قضا کر لینا چاہو تو قضا نہ کرنا۔ امام احمد، امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے سماک سے، انہوں نے ہارون سے، انہوں نے حضرت ام ہانی سے، ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ کی خدمت میں مشروب پیش کیا گیا۔ آپ نے اس میں سے پیا پھر مجھے عطا کیا، میں نے اس کو پیا اور عرض کیا میں نے تو نافرمانی کی۔ آپ نے پوچھا وہ کیسے تو میں نے عرض کی میں تو روزے سے تھی۔ میں نے اسے توڑ دیا ہے۔ فرمایا کیا یہ قضاء کا روزہ تھا؟ میں نے عرض کی نہیں تو فرمایا تو پھر اس کا توڑنا تجھے کوئی نقصان نہیں دے گا۔ سماک بن حرب قابل اعتماد راوی نہیں جب وہ اکیلا ہو۔ امام نسائی نے بھی یہی کہا ہے۔ امام بیہقی نے کہا اس کی سند میں اعتراض ہے۔ ابن قطان نے کہا ہارون مجہول ہے اس کے بارے میں صحیح معلومات نہیں۔

میں کہتا ہوں ہارون کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ہارون حضرت ام ہانی کا بیٹا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ آپ کا پوتا ہے۔ ایک قول کیا گیا یہ آپ کا نواسہ ہے۔ امام احمد اور امام ترمذی کی روایت کے الفاظ قضاء کے واجب نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتے۔

ابوداؤد، دارمی اور دوسرے محدثین نے جریر سے، انہوں نے یزید بن زیاد سے، انہوں نے عبداللہ بن حارث سے، انہوں نے حضرت ام ہانی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا جس روز مکہ مکرمہ فتح ہوا تو حضرت فاطمہ آئیں ۔۔۔ حضور ﷺ ۔۔۔

گئیں اور حضرت ام ہانی حضور ﷺ کے دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ولیدہ ایک برتن لائیں جس میں مشروب تھا۔ میں نے برتن پکڑا اور اس میں سے پی لیا پھر عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں تو روزے سے تھی اور روزہ توڑ دیا۔ آپ نے پوچھا کیا آپ کسی روزے کی قضا کر رہی تھیں عرض کی نہیں تو آپ نے فرمایا اگر وہ نفلی روزہ تھا تو پھر روزہ توڑنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اسے امام احمد نے روایت کیا کہ ہمیں محمد بن جعفر نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے، انہیں جعدہ نے انہیں ام ہانی نے بیان کیا، جبکہ وہ جعدہ کی دادی تھیں کہ حضور ﷺ فتح مکہ کے روز ان کے گھر تشریف لائے۔ آپ کی خدمت میں برتن پیش کیا گیا۔ آپ نے اس میں سے پیا پھر آپ نے مجھے عطا کیا۔ میں نے عرض کی میں تو روزے سے ہوں۔ فرمایا نفلی روزہ رکھنے والا اپنے آپ کا مالک ہوتا ہے اگر چاہو تو روزہ رکھو اگر چاہو تو روزہ توڑ دو اور اسے ابوداؤد طیالسی کی حدیث سے بھی روایت کیا ہے کہ ہمیں شعبہ نے روایت کیا، انہوں نے جعدہ سے، انہوں نے ابوصالح سے، انہوں نے حضرت ام ہانی سے روایت کیا کہ حضور ﷺ ان کے گھر تشریف لائے آپ نے پانی پیا پھر حضرت ام ہانی کو عطا فرمایا تو انہوں نے پانی پی لیا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں تو روزے سے تھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نفلی روزہ رکھنے والا اپنے آپ کا مالک ہوتا ہے اگر چاہے تو روزہ رکھے اگر چاہے تو افطار کرے۔ امام ذہبی نے کہا جعدہ کا ابوصالح سے روایت کرنا معروف نہیں۔ امام بخاری نے کہا اس میں اعتراض کی گنجائش ہے۔ فتح مکہ کے ذکر کی وجہ سے حدیث میں ایک اور خرابی پیدا ہوگئی ہے کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ فتح مکہ تو رمضان شریف میں ہوا تو پھر رمضان شریف میں رمضان کی قضاء یا نفلی روزے کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے؟

ابن ہمام نے امام ابوحنیفہ سے مروی منتقی کی روایت کو پسند کیا اور کہا کہ نفلی روزہ رکھنے والے کے لئے عذر کے بغیر بھی روزہ افطار کرنا جائز ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس سے امام شافعی نے استدلال کیا ہے اور روزہ توڑنے کی صورت میں اس پر قضاء واجب ہوگی۔ اس حدیث کی وجہ سے جس سے امام ابوحنیفہ نے استدلال کیا ہے اس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے گا۔ اور کہا آیت میں ابطال سے مراد اس کو اس حالت سے خارج کرنا ہے جس پر کوئی فائدہ مرتب ہو اور اس کو اس طرح بنا دینا ہے گویا وہ بالکل پایا ہی نہیں گیا۔ جہاں تک قضاء کے ارادہ سے اسے باطل کرنے کی آیت میں اس سے منع کرنے پر کوئی دلالت موجود نہیں۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے فرمان لا تبطلوا میں مصدر نکرہ ہے جو نفی کے تحت داخل ہے جو ہر قسم کے ابطال کو شامل ہوگا۔ جس نے روزہ اور نماز کو شروع کرنے کے بعد توڑا تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس نے عمل کو باطل کر دیا۔ جہاں تک قضاء کا معاملہ ہے وہ ایک اور عمل ہے جو اس عمل کی کمی پوری کرتا ہے۔ اس لئے عذر کے بغیر نفلی روزہ رکھنا جائز نہیں، یہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ احادیث اگرچہ روزہ توڑنے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں تاہم تعارض کی صورت میں آیت کو اخبار آحاد پر مقدم کرنا واجب ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ آیت حرمت ثابت کر رہی ہو اور احادیث روزہ توڑنے کی اباحت کو ثابت کرتی ہوں اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ حرمت ثابت کرنے والی دلیل کو اباحت ثابت کرنے والی دلیل پر مقدم کیا جائے۔ ہماری دلیل یہ بھی بن سکتی ہے کہ نفلی حج اور نفلی عمرہ پر قیاس کریں۔ ان دونوں کو فاسد کرنا جائز نہیں۔ اگر انہیں توڑا جائے تو ان کی قضاء واجب ہوتی ہے۔

مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿٣٥﴾

”بے شک جو لوگ خود بھی کفر کرتے رہے اور دوسروں کو بھی راہ حق سے روکتے رہے پھر وہ مر گئے کفر کی حالت میں تو اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا [1] (اے فرزندان اسلام!) ہمت مت ہارو اور (کفار کو) صلح کی دعوت مت دو تم ہی غالب آؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال (اور کوششوں) کو ضائع نہیں ہونے دے گا [2]“

[1] یہ جملہ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا کے ساتھ متصل ہے۔ یہ اصحاب قلیب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا حکم عام ہے، یعنی جس کی موت بھی کفر پر ہوئی اس کے لئے یہی حکم ہے۔

[2] جہاد سے کمزوری نہ دکھاؤ اور نہ ہی ابتداء میں صلح کا پیغام دو۔ ابوبکر اور حمزہ نے سلم کو سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تدعوا لا نہی کے مقدر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ معنی یہ ہوگا کفار کو صلح کی دعوت دینے میں پہل نہ کر دیا۔ لا تھنوا کے جواب میں ان کے مضمر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صلح میں پہل کرنے سے منع اس لئے کیا کیونکہ یہ بزدلی کی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے صالح مومنوں کے ساتھ مدد کا جو وعدہ کیا ہے اس کی وجہ سے تم غالب رہو گے۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ یہ جملہ تدعون کے فاعل سے حال ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے اس کی معیت بلا کیف ہے کیونکہ ایمان اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا کرتا ہے اور انسان کا انجام بھی اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس کے ساتھ انسان محبت کرے۔ یہاں واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ بھی تدعو کے فاعل سے حال ہے یا اعلون کے فاعل سے حال ہے۔ اعراب میں یہی کیفیت وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ کی ہے۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں کمی نہیں کرے گا یہ وتر یتر ہ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے حق میں کمی کرنا حضرت ابن عباس، مقاتل، قتادہ اور ضحاک نے کہا اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال صالحہ کو باطل نہیں کرے گا (1)۔

اِنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا یُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا یَسْــٴَـلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿٣٦﴾ اِنْ یَّسْــٴَـلْكُمُوْهَا فَیُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ یُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿٣٧﴾

”یہ دنیوی زندگی تو محض ایک کھیل اور تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ اور پرہیزگار بن جاؤ تو وہ تمہیں تمہارے اجر عطا کرے گا اور وہ نہ طلب کرے گا تم سے تمہارے مال [1] اگر وہ طلب کرے تم سے تمہارے مال اور اس پر اصرار کرے تو تم بخل کرنے لگو اور (یوں) ظاہر کر دے گا تمہاری ناگواریوں کو [2]“

[1] دنیاوی زندگی میں جب تک اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہو وہ باطل ہے کیونکہ ذکر کے بغیر اس پر کوئی قابل ذکر فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا دنیا اور دنیا کی ہر چیز ملعون ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے (2)۔ فرمایا دنیاوی زندگی تمہیں ایسی چیزوں سے غافل کر دیتی ہے جو تمہیں دائمی زندگی عطا کر سکتی ہیں۔ فرمایا اگر تم دنیا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام پر عمل کرو اور جن چیزوں سے اس نے تمہیں روکا ہے اس سے رک کر عذاب الہی سے بچو تو اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہیں [illegible]

کا اجر عطا فرمائے گا۔ اس وقت تمہاری دنیاوی زندگی آخرت کی کھیتی ہوگی اور لہو ولعب نہ ہوگی۔ فرمایا وہ تم سے تمہارے اعمال کا سوال نہیں کرتا کیونکہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں۔ وہ تمہیں ایمان لانے اور اطاعت کرنے کا حکم دیتا ہے تا کہ تمہیں جنت کی صورت میں بدلہ عطا فرمائے۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ وَمَآ اُرِیۡدُ مِنۡهُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس آیت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صدقات میں تمام مال صدقہ کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ وہ تو ایک چھوٹا سا حصہ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جیسے مال میں سے چالیسواں حصہ یا اس سے بھی کم کا مطالبہ کرتا ہے جیسے ایک سو بیس بکریوں میں سے ایک بکری اس لئے خوش دلی کے ساتھ زکوٰۃ دو۔ ابن عیینہ کا بھی یہی قول ہے۔ اسی پر اس آیت کا سیاق بھی دلالت کرتا ہے۔ یہ آیت اس وہم کو دور کرتی ہے جو دنیا کی مذمت ایمان اور تقویٰ کی تعریف سے پیدا ہوا تھا۔ اس سے یہ وہم پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمام مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسی وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا تم سے (تمام) مال کا مطالبہ نہیں کرتا پھر تمام کا مطالبہ نہ کرنے کی علت بیان فرمائی اگر وہ تم سے تمام مال کا مطالبہ کرتا اور تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔

ع احفاء کا معنی مبالغہ کرنا اور انتہاء تک پہنچنا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے مونچھوں کو بالکل قریب سے کاٹو۔ فیحفکم کا عطف شرط پر ہے تو تم بخل سے کام لیتے اور سارا مال نہ دیتے۔ تبخلوا یہ شرط کی جزاء ہے۔ یخرج میں ھو ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس کی تائید وہ قرأت بھی کرتی ہے جس میں اس صیغہ کو جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ یا ھو ضمیر بخل کے لئے ہے کیونکہ بخل ہی بغض کا سبب ہے۔ قتادہ نے کہا اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مال کے خرچ کرنے کے مطالبہ سے بغض باہر نکل آتا ہے۔

هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ ۚ وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ ۚ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَكُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ ﴿۳۸﴾

"ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جنہیں دعوت دی جاتی ہے کہ (اپنے مال) خرچ کرو اللہ کی راہ میں پس تم میں سے کچھ بخل کرنے لگتے ہیں اور جو شخص بھی بخل کرتا ہے تو وہ اپنی ذات سے بخل کر رہا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے (کسی کا محتاج نہیں) بلکہ تم (اس کے) محتاج ہو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے (تو اس سعادت سے محروم کر دیئے جاؤ گے) اور تمہارے عوض وہ دوسری قوم لے آئیگا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے لے۔"

لے ھا حرف تنبیہ ہے، انتم مبتدا ہے اور ھولاء اس کی خبر ہے یا ھولاء منادی ہے اور حرف ندا محذوف ہے اور مبتدا کی خبر تدعون ہے یا ھولاء اسم موصول، تدعون اس کا صلہ ہے۔ موصول صلہ مل کر انتم کی خبر ہے، یعنی تم ہی وہ لوگ ہو جنہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہاں مال خرچ کرنے سے مراد ان اموال کا خرچ کرنا ہے جن کا خرچ کرنا فرض ہے۔ فی سبیل اللہ عام ہے جو جہاد زکوٰۃ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو زکوٰۃ اور فرض صدقات کی ادائیگی میں بخل کرتے ہیں تو

اللہ ﷺ ہم سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کا اپنا مال وہ ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑا۔ اسے امام بخاری اور امام نسائی نے روایت کیا(1)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر صبح دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے۔ اے اللہ خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اللہ روکنے والے کو ہلاک کردے۔ متفق علیہ(2)۔ حضرت اسماء سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرچ کرو اور شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمتوں کو شمار کرے گا۔ مال اپنے پاس خزانہ نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی نعمتیں روک لے گا۔ جتنا ہو سکے خرچ کرو۔ متفق علیہ(3)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابن آدم خرچ کرو میں تم پر خرچ کروں گا۔ متفق علیہ(4)۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے صدقات اور طاعات سے غنی ہے، جبکہ تم فقراء ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری دنیاوی اور اخروی ضرورتوں کی وجہ سے ہی تمہیں صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ والا جملہ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ کی علت بیان کر رہا ہے۔

اے عربو! اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کے رسول کی اطاعت اور اسکی راہ میں خرچ کرنے سے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا جو ایمان لے آئے گی اور تقویٰ اختیار کرے گی وہ تمہاری طرح نہ ہونگے بلکہ وہ تم سے زیادہ مطیع ہونگے ان تتولوا کا عطف ان تومنوا پر ہے۔ کلبی نے کہا اس قوم سے مراد کندہ اور نخع کی قوم ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا اس سے مراد عجمی لوگ ہیں۔ عکرمہ نے کہا اس سے مراد فارس اور روم کے لوگ ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ آیا ہے کہ اگر ہم نے اعراض کیا تو انہیں ہماری جگہ رکھ لیا جائے گا پھر وہ ہمارے جیسا طرز عمل بھی نہ اپنا ئیں گے تو حضور ﷺ نے حضرت سلمان فارسی کی ران پر ہاتھ مارا فرمایا یہ اور اس کی قوم۔ اگر دین ثریا کے پاس بھی ہو تو فارس (ا) کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا۔ امام ترمذی اور حاکم نے بھی اسے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ نیز ابن حبان نے اسے روایت کیا۔

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ اشرف المخلوقات۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آپ کی آل اور آپ کے تمام صحابہ پر رحمتیں نازل فرمائے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 5۔ صفحہ 2366 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 7، صفحہ 83 (العلمیۃ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 331 (قدیمی) 4۔ صحیح مسلم، جلد 7، صفحہ 69 (العلمیۃ)

(ا) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، طبرانی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا اگر ایمان ثریا کے پاس بھی ہوا تو فارس کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن مسعود سے ہی ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے، اگر علم ثریا کے ساتھ لٹک رہا ہوگا تو فارس کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ شیرازی نے القاب میں قیس بن سعد بن عبادہ سے روایت کیا انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا۔ طبرانی نے قیس کی حدیث میں اضافہ کیا ہے۔ عرب اسے نہ پائیں گے، فارس کے لوگ اسے پالیں گے۔ شیخ محمد بن یوسف صالح شافعی نے کہا۔ شیخ جلال الدین سیوطی نے کہا اس حدیث کا مصداق امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فارس کا کوئی آدمی بھی علم میں آپ کے مقام تک نہیں پہنچا اور نہ ہی آپ کے اصحاب کے علم تک پہنچا ہے۔ امام ابو حنیفہ [illegible]

تفسیر مظہری کا اختتام سورۂ محمد (ﷺ) کے اختتام کے ساتھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ میرا خاتمہ بھی اسی پر ہو جس پر حضور ﷺ کی امت کے بہترین لوگوں کا خاتمہ ہوا۔ اے اللہ! اس تفسیر کے ختم کا ثواب حضور ﷺ آپ کے صحابہ کرامؓ اولاد عظامؓ ازواج مطہرات اور اولیاء امت کو بطور ہدیہ پیش فرما۔ خصوصاً حضرت شمس الدین حبیب اللہ مظہر کی روح کو عطا فرما جن کے نام پر میں نے اس تفسیر کا نام رکھا ہے۔ نیز آپ کے مشائخ عظام کو ثواب سے نواز۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نوازشات حضور ﷺ کی تمام امت پر ہوں۔
آج منگل ستائیس جمادی الاول 1208ء ہے۔

حسن اتفاق سے تفسیر مظہری کے ترجمہ اور نظر ثانی کا اختتام بھی سورہ محمد (ﷺ) پر ہوا۔ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہی التجا کرتا ہوں جو حضرت مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور اپنے مربی کریم حضور ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ ازہری رحمۃ اللہ علیہ اور سلسلہ عالیہ چشتیہ بہشتیہ کے تمام بزرگوں کے درجات کی بلندی کے لئے دعا گو ہوں۔

محمد بوستان
مدرس دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف